هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

دین الحق

بجواب جاء الحق

حصہ دوم

ابو صہیب مولانا محمد داؤد ارشد مدظلہ العالی



ناشر

مکتبہ عزیزیہ
لاہور



ملنے کا پتہ

نعمانی کتبخانہ
حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
Ph:042-7321865

دین الحق

بجواب

جاء الحق

تالیف

ابوصہیب محمد داؤد ارشد

جلد دوم

ناشر

مکتبہ عزیزیہ

لاہور

ملنے کا پتہ

نعمانی کتب خانہ

حق سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

فون 042 7321865

(پاکستان)

نام کتاب

دین الحق بجواب جاء الحق

از قلم

ابوصہیب محمد داؤد ارشد

تعداد



1100

تاریخ اشاعت

دسمبر ۲۰۰۱

مطبوعہ

موٹروے پرنٹرز لاہور

ناشر

مکتبہ عزیزیہ لاہور

ملنے کا پتہ

نعمانی کتب خانہ



NOMANI KUTAB KHANA

HAQ STREET URDU BAZAR

LAHORE.2 PAKISTAN

TEL; 042- 7321865

بسم الله الرحمن الرحيم



فہرست مضامین دین الحق

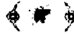






















بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

مولانا ابو انس محمد یحیی گوندلوی

مترجم و شارح صحیح سنن ترمذی وصحیح ابن ماجہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تعالی نے اپنے دین کی تکمیل کے لیے حضرت محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا اور انہیں تمام انسانوں کے لیے معلم اور رسول بنا کر مبعوث کیا جنہوں نے کتاب وسنت کی تعلیم سے پراگندہ دلوں کا تزکیہ کیا اور ان میں کتاب وسنت کا نور بھردیا:

(یَتْلُوا عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَإِنْ کَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِی ضَلَالٍ مُبِینٍ) (الجمعه۲)

یہ تعلیم ایسی اکمل اور اتم ہے کہ اس کا کوئی ایسا پہلو باقی نہیں جو تشنہ تکمیل ہو بلکہ ضرویات دین کو علی وجہ الکمال بیان کر دیا جس میں کسی قسم کی کمی کا تصور ممکن نہیں اللہ تعالی نے فرمایا:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ۳

''میں نے آج (حجتہ الوداع) کے دن تمہارے لیے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا ہے اور میں تمہارے لیے دین اسلام پر راضی ہوگیا ہوں ''۔اسی دین کی پیروی میں دنیاو آخرت کی فلاح اور کامیابی ہے اور یہی دین صراط مستقیم ہے ماسوا گمراہی اور ضلالت ہے۔

(وان هذا صراطی مستقیمافاتبعوه ولا تتبعو االسبل فتفرق بکم عن سبیله ذالکم وصٰکم به لعلکم تتقون) (الانعام۱۵۳)

''بلاشبہ یہی میرا سیدھا اور درست راہ ہے تم اسی راہ کی پیروی کرو کیونکہ وہ تم کو اللہ کے رستہ سے جدا اور الگ کردیں گے تم کو اللہ نے وصیت کی ہے تاکہ تم

پرہیز گار بن جاؤ''

اس رستہ سے انحراف وعدول اور اعراض کرنے والے کواس کے برباد ہونے کے ساتھ سخت سزا کی وعید سنائی ہے

(وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واتقو االلہ ان اللہ شدید العقاب)(الحشر۷)

''رسول تم کو جو دے اسے پکڑلو اور جس سے منع کرے اس سے باز آجاؤ اور اللہ سے ڈرو بلاشبہ اللہ تعالے سخت سزادینے والا ہے ''اس حد تک توتمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ دین اسلام حضرت رسول اکرم ﷺ کی وفات سے قبل مکمل ہو چکاہے اب اس میں کوئی ایسی گنجائش باقی نہیں ہے کہ جس سے یہ دین کسی زیاتی یاکمی کا متحمل ہوکیونکہ معلم کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین کی مکمل تعلیم سے آراستہ کر دیاحضرت سلمان فارسیؓ سے چند مشرکوں نے

(قدعلمکم نبیکم کل شیئی حتی الخراۃ فقال اجل) (مسنداحمد ص مسلم ص ۱۳۰ ج ۱)

''کہاتمہارے نبی نے تمہیں سب کچھ سکھا دیا ہے حتی کہ طہارت بھی تو انہوں نے فرمایا جی ہاں خودحضرت رسول اکرم ﷺ نے فر ما دیا کہ''

(ما ترکت شیئًا مما امرکم اللہ بہ الاوقد امرتکم بہ ولا شیئًامما نھاکم اللہ عنہ الا وقد نھیتکم عنہ)

''اللہ نے جس کا بھی تمہیں حکم دیا ہے میں نے اس میں کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں کہ اللہ تعالی نے جس سے تم کو منع کیا ہے مگر میں نے تم کو اس سے منع کر دیا ہے ''معلوم ہوا کہ جو چیز دین میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی تعلیم کے علاوہ داخل کی جائے وہ دین نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ ہدایت کہلا سکتی ہے۔

بریت کا اظہار

یہی وجہ ہے کہ حضرت رسول اکرم نے دین میں اہواء وخواہشات اور بدعات کے داخل کرنے والوں سے بریت کا اظہار کیا ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں حضرت رسول اللہ ﷺ نے آیت

(ان الذین فر قو ا دینھم وکا نو شیعاً)

تلاوت کی اور فرمایا

(ھم اھل الاھواء واصحاب البدع واصحاب الضلالۃیا عائشہ ان لکل ذنب تو بۃ ما خلاء اصحاب الاھواء والبدع لیس لھم توبۃ وانا بری منھم وھم منی البراء (الا عتصام ص ۶۰ ج ۱)

"جنہوں نے دین میں تفرقہ ڈالا یہ عید گروہ تھے یہ وہ گروہ ہیں جو خواہش پرست بدعتی اور گمراہی والے ہیں اے عائشہ ہر گناہ کی توبہ ہے مگر خواہش پرستوں اور اہل بدعت کی توبہ قبول نہیں میں ان سے بری ہوں اور یہ مجھ سے بری ہیں":

(اھل الاھواء واصحاب البدعۃ)

نتیجہ! دونوں ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو دین کی رعائت ایسے نہیں رکھتے جیسا کہ اس کا حق ہے بلکہ اپنی خواہشات اور بدعات کو دین میں شامل کر لیتے ہیں یہی لوگ ہیں جنہیں بدعتی کہا جاتا ہے

بدعت کی تعریف

اہل لغت کے نزدیک بدعت کی تعریف یہ ہے :

بدع یبدع بد عاً انشاہ علی غیرمثال سابق. (المعجم الوسیط ص ۴۳ ج ۱)

اخترعہ لا علی مثال. (مختار الصحاح ص ۵۶)

بدعت کا مادہ ہے بدع لغت میں اس کا معنی ہے بلا کسی سابقہ مثال کے کسی چیز کو ایجاد کرنا:

(ا بتدع فلان بدعۃ یعنی ابتدأ طریقۃلم یسبق الیھا) .(الارشادالی صحیح

الا عتقاد ص ۲۹۲)

بدعت کالفظ اس وقت بولتے ہیں جب کسی نے ایسے طریقہ کی ابتداء کی ہو جس طرف کسی اور نے پہل اور سبقت نہ کی ہو ۔

اصطلاحی تعریف

ائمہ کرام نے بدعت کی شرعی اور اصطلاحی تعریف یوں کی ہے امام شاطبی فرماتے ہیں :

(طریقةفی الدین مخترعة تضاھی الشرعیة بقصد بالسلوک علیھا المبالغ فی التعبدللهسبحانه تعالی).(الاعتصام ص۳۷ ج ۱)

دین کے اندر ایسا ایجاد کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو اوراس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت میں مبالغے کا قصد اور ارادہ کیا جائے علامہ حوامدی نے بدعت کی تعریف اس طرح کی ہے

(البدعة ھی الحد ث فی الدین بعد الاکمال وما استحدث بعدالنبی ﷺ من الا ھواء والاعمال)(السنن والمبتد عات ص ۱۱)

دین کے کامل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اہواء واعمال ایجاد کئے جانے کا نام بدعت ہے علامہ محمد ابی بکر الرازی فرماتے ہیں :

(البدعة حدث فی الدین بعد الاکمال).(مختارالصحاح ص۵٦)

دین کے مکمل ہونے کے بعد جو چیز دین میں نئی پیدا کی جائے وہ بدعت ہے مذکورہ تعریفات سے واضح ہوا کہ شرع میں اس فعل اور عمل کو بدعت کہتے ہیں جو دین تکمیل اور رسول اللہ ﷺ کے بعد ایجاد ہوا ہو جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جس امر کی کتاب و سنت سے دلیل نہیں وہ بدعت ہے علامہ شاطبی فرماتے

کل ما لایدل علیه دلیل فھو بدعة . (الاعتصام ص ۳٦۰ ج ۱)

جس فعل پر کوئی دلیل دلالت نہ کرے وہ بدعت ہے بدعت کی مذکورہ تعریف کوئی اختراعی اور وضعی تعریف نہیں بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے منقول بدعت کے بارہ

میں صریح اور صحیح نص کے الفاظ کا مفہوم ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

(من احدث فی امرناھذامالیس منه فھورد.(بخاری ص ۳۷۱ ج ۱مسلم ص۷۷ ج ۲۔-)

''جو ہمارے اس امرمیں نیا کام جاری کرے جو اس سے نہ ہو وہ مردود ہے اور فرمایا:''

(من عمل عملاً لیس علیه امرنا فھورد).(مسلم ص)

(جو ایساعمل کرے جس پر ہمارا امر نہ ہوپس وہ مردود ہے'' لفظ امرنانے واضح کردیا کہ بدعت کا تعلق اموردین سے ہے دنیاوی عادی ایجادات سے نہیں

اہل بدعت کی غلط توضیح

اہل بدعت بدعت کے تعین میں مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں ایک گروہ کے نزدیک بدعت صرف اموراعتقادیہ میں ہے جیسا کہ خارجیوں اورقدریوں کی بدعت ہے دوسرا گروہ کہتاہے بدعت اور امور دونوں میں ایک جیسی ہے یہ پہلا گروہ دراصل اعتقادکا نام لے کر احکام میں ہر قسم کی من مرضی کرناچاہتاہے دوسرا گروہ دنیاوی اورعادی امور کوبدعت میں شامل کرکے عقلاً ہر قسم کی بدعت کے جواز کی راہ ہموارکرنا چاہتاہے مگر راقم کہتا ہے ان دونوں گروہوں کا عندیہ اورنظریہ نقلاً اور عقلاً غلط اور باطل ہے شرعًا اس لیے غلط ہے کہ جن احادیث میں بد عات کی وعید آئی ہے اس میں عقیدہ اور عمل کی کوئی تفریق نہیں عقلاًاس لیے یہ تعریف باطل ہے کہ عمل کی بنیادعقیدہ ہوتاہےکوئی عمل عقیدہ سے الگ اور جدانہیں ہوسکتا۔دوسرے گروہ کا نظریہ اس بناپرغلط ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فی امرنا کہہ کردنیاوی اور عادی اموکوبدعت سے مستثنی قراردیاہے۔اور عقلاً اس لئے غلط ہے کہ دنیاوی اورعادی امورمیں حسب حال اورحسب زمانہ تغیروتبدل ہوتارہتاہے مگر دین کا معاملہ توقیفی ہے جس میں اللہ اوررسول کے علاوہ کسی ایک کو کسی قسم کی تبدیلی کرنے کااختیاراورحق نہیں ہے ہمارے دور کےمبتدعہ حضرات اس دوسری قسم پربڑازوردیتے ہیں وہ ریل جہاز

ڈاک، ریڈیواورلاؤڈسپیکرکوبھی بدعت قراردیتے ہیں بالآخرنتیجہ یہ نکالتے ہیں ان کااستعمال بدعت ہے اورانہیں ہرجماعت کے لوگ بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔(جاء الحق ص۲۲۲ج۱)

مذکورہ سائنسی ایجادات کا فی امرناھذامیں داخل کرنامحض فریب ہے اس لئے کہ دنیاوی معالات کوانسانوں کے تجربہ فہم وفراست پر چھوڑاگیاہے،جیساکہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

(انتم اعلم بامُرِ دنیاکم)(مسلم ص۲۴۶ج ۲)

تم اپنے معاملات کوبخوبی سمجھتے ہو۔

اورفرمایا:

(انما انابشرامرتکم بشیء من دینکم فخذوابه واذامرتکم بشیء من رائی فانماانابشر)(مسلم ص۲۶۴ ج۲)

''میں بشرہوں کوئی حکم تمہیں کسی دین کے بارہ میں کروں تواس کوپکڑلو لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے حکم دوں تو میں بشرہوں اورفرمایا:

(اذا حدثتکم عن الله شیئا فخذوا به فانی لن اکذب علی الله عزوجل).

(مسلم ص۲۶۴ ج۲).

جب میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے بیان کروں تو اس پرعمل کرو، میں اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتا۔

دُنیاوی ایجادات کی بنیاد تجربات ہیں جو ہر دور میں جاری رہتے ہیں، اور ہر آنے والا زمانہ ان میں نئی کشش اور جدت پیدا کر دیتا ہے۔ مگر دین کا معاملہ ایسا نہیں کیونکہ اس کی بنیاد تجربہ پر نہیں بلکہ الہام اور وحی پر ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی منقطع ہوچکی ہے مگر دنیاوی امور جب شریعت سے متصادم نہ ہوں میں اصل اباحت ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

(اذا نظرنا الی البدع المتعلقة بامور الدنیا لم تساو البدع المتعلقة بامور الاحکام الفرعیة ولعل البدع المتعلقة بامور الدنیا لا تکره اصلا بل کثیر منها یجزم فیه بعدم الکراهة)(احکام الاحکام ص۱۵ج۱)

دُنیاوی ایجادات کو دیکھتے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ دین احکام کے مساوی اور برابر نہیں، ممکن ہے کہ دینی امور کے متعلقہ ایجادات اصلاً ناپسند ہوں بلکہ بہت سی ایجادات تو ایسی ہیں جن کے ناپسند ہونے کا ہم پختہ فیصلہ دیتے ہیں۔ ہاں البتہ ایسی دنیاوی ایجادات جن کا دین میں نقصان نفع سے زیادہ ہو تو ان سے اجتناب ضروری ہے۔ تاکہ دین کے نقصان کا اندیشہ پیدا نہ ہو۔

شریعت نے منع نہیں کیا

بدعات کے باب میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ معلوم ہونا چاہیئے دلیل وجود اور اثبات کی ہوتی ہے۔ نہی اور منع کی دلیل کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی فعل پہلے ہو رہا ہو اور بعد میں شریعت نے منع کیا ہو جیسا کہ نکاح متعہ اور دیگر منع کردہ امور ہیں جو جاہلیت میں ہو رہے تھے مگر شریعت غرا سے عدم مطابقت اور موافقت کی وجہ سے ان سے منع کر دیا گیا۔

مگر ایسا فعل جو زمانہ نزول وحی کے وقت موجود ہی نہیں تھا بلکہ وہ شریعت کی تکمیل اور صاحب وحی کے بعد وجود میں آیا تو اس کے قبل از وجود منع کرنے اور روکنے کے لیے دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس کے وجود کا زمانہ خود اس کے ناجائز ہونے کی دلیل ہے علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

(كل ما لا يدل عليه دليل فهو بدعة). (الاعتصام ص ۳۶۰ ج ۱).

''ہر وہ امر جس پر دلیل دلالت نہ کرے وہ بدعت ہے'' یہی وجہ ہے کہ وہ عبادت نہیں جس کا وجود صحابہ کے زمانہ مسعود میں نہیں تھا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:

قل عبادة لم يتعبد ها اصحاب رسول الله ﷺ فلا تعبدوها فان الاول لم للاخر مقالا. (الاعتصام ص ۱۳۲ ج ۲).

ہر عبادت جو صحابہ نے نہیں کی تم بھی اسے نہ کرو کیونکہ پہلے صحابہ نے پچھلوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

بدعت کی شناخت یہی ہے کہ اس کا وجود کتاب وسنت سے معلوم نہ ہو اور صحابہ کرام نے بھی اس پر عمل نہ کیا ہو۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

اما اهل السنة والجماعة فيقولون فى كل فعل وقول لم يثبت عن الاصحاب

هو بدعة لانه لو كان خيرا لسبقون اليه انهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير الا وقد بادروا اليها. (ابن کثیر ص ۱۵٦ ج۴).

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہر وہ قول اور فعل بدعت ہے جس کا ثبوت صحابہ سے نہیں، اس لیے اگر بعد والے قول اور فعل میں کوئی اچھائی ہوتی تو صحابہ اس کی طرف سب سے پہلے سبقت لے جاتے اور اس کے کرنے پر پہل کرتے اس لیے کہ انہوں نے کوئی بھی بھلائی کی خصلت نہیں چھوڑی مگر اس کے کرنے میں انہوں نے بڑی تیزی اور عجلت دکھائی ہے

معلوم ہوا کہ اہل بدعت کا یہ کہنا کہ اس کے منع کی دلیل پیش کرو، محض ایک مغالطہ اور دھوکہ ہے۔

درجات بدعت

بلا شبہ دین میں ہر قسم کی بدعت گمراہی ہے جو باعث آگ ہے مگر بدعات گمراہی میں شدید ہونے کے لحاظ سے مختلف درجوں میں ہیں۔ علامہ حوامدی نے تمام بدعات کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے:

۱- **البدعة المکفرہ:** مصیبتوں، تکلیفوں کے وقت اور حاجات کی براری کیلیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اللہ کے ساتھ انبیاء اور صالحین کو بطور استغاثہ کے پکارنا یہ ایسی بدعت ہے جس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے فریب کیا گیا ہے یہ ایسی بدعت ہے جس کے جال اور چنگل میں علماء اور جہلا دونوں گرفتار ہیں بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس بدعت سے محفوظ رکھا ہے درحقیقت یہ نداء ہی تو عین شرک ہے۔

۲- **بدعت محرمہ:** مُردوں سے وسیلہ طلب کرنا، قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، ان پر چراغاں کرنا، نذر و نیاز اور ذبح کرنا، قبر کا طواف کرنا اور بوسہ دینا، علامہ حامد الفقی فرماتے ہیں:۔

یہ دوسری قسم بھی حکم کے اعتبار سے پہلی قسم کی طرح ہے قبر پر نذر و نیاز، اس کا طواف کرنا اور چھونا یہ اللہ کے علاوہ مردوں کی عبادت ہے یہ بھی جشنِ میلاد کی طرح شرکیہ عبادت ہے۔

۳- **بدعت مکروہ:** جیسا کہ نماز جمعہ کے بعد احتیاطی ظہر پڑھنا، اجرت پر تلاوت کرنا، مسجد،

عقیقہ اور ختم جو میت کے لیے کیا جاتا ہے۔ شب برأت اور میلاد النبی کی رات عبادت کرنا۔ اذان کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنا۔ قضاء عمری کی نماز جو رمضان المبارک کے آخر میں پڑھی جاتی ہے وغیرہ۔

۴- بدعت تنزیهه: نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا، قبروں پر پردے لگانا سال کے آغاز اور اختتام اور عاشوراء کے روز خصوصی دعائیں کرنا۔

بہت سے محققین علماء کا مذہب ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حرام ہے ان کا استدلال حدیث کے عموم کے صیغوں سے ہے کہ:

(فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار.) (السنن والمبتدعات ص ۱۲ ملخصاً)

ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔

بدعت کی مذمت

اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کر دی ہے لہٰذا جو چیز تکمیل دین کے وقت دین میں شامل نہیں وہ دین ہے نہ حق بلکہ خالص گمراہی ہے۔

(فماذا بعد الحق الا الضَّلٰل). (یونس ۳۲)

''حق کے بعد گمراہی ہے'' جو ہدایت کی ضد ہے ایسا شخص ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا جو کتاب وسنت کے بغیر ہدایت طلب کرتا ہے۔

(ومن اضل ممن اتبع هوئه بغير هدى من الله). (القصص ۵۰).

'ایسے شخص کے گمراہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ منزل من اللہ دین پر اپنی خواہش کو مقدم رکھتا ہے۔

افرء یت من اتخذ الٰهَهُ هوئه. (الجاشیه ۲۳).

''کیا تو نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو الٰہ بنا لیا'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ آیت: ﴿**یوم تبیض وجوه وتسود**﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تبیض وجوه اهل السنة والجماعة وتسود وجوه اهل البدعة والفرقة. (تفسیر

ابن کثیر ص۳۰۷ ج ۱).

اہل سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے آیت: ﴿ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً﴾ (الانعام ۱۵۹) پڑھی تو فرمایا:

ھم اصحاب الاھواء واصحاب البدع واصحاب الضلالة من ھذہ الامة.

(الاعتصام ص۵۶ ج ۱).

یہ اس اُمت کے خواہش پرست، بدعتی اور گمراہ لوگ ہیں۔

حدیث نبویؐ اور بدعت:

اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کو بدعات سے ڈرایا بلکہ سختی سے منع فرمایا اور واضح کیا کہ **کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار.** (نسائی)'' کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے''۔

یہود ونصاریٰ نے اپنے اپنے دین سے جو سلوک کیا اسی خطرہ کے پیش نظر آپؐ نے اُمتِ محمدیہ کو یہود ونصاریٰ کی اتباع اور پیروی سے منع فرمایا کہ مبادا کہیں یہ اُمت بھی بدعت کی خرافات میں نہ کھو جائے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے اپنے ادیان میں جو خرابی پیدا کی وہ ان کی من مرضی کی آراء کا مسلط کرنا اور دین میں بدعات کا رائج کرنا تھا چنانچہ آپؐ نے واضح کر دیا کہ:

''من عمل عملا لیس علیه امرنا فھو رد''. (مسلم).

ہر وہ عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔

''من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد''. (بخاری).

جو ایسا امر ایجاد کرتا ہے جو دین میں سے نہیں وہ مردود ہے۔

موقف صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین: **یا یُّھا الذین آمنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسوله واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم.** (الحجرات)۔

اے ایماندارو تم اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو بلا شبہ اللہ تعالیٰ سننے والا

جاننے والا ہے۔

صحابہ کرام اللہ کے حکم کے مطابق اللہ اور رسول سے ایک قدم بھی آگے نہ جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں بدعت نہایت مبغوض اور ناپسند امر تھا حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ولم ار من اصحاب رسول الله ﷺ رجلا ابغض اليه حدثن في الاسلام منه.

اصحاب رسول میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس کے نزدیک اسلام میں بدعت سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ امر ہو۔ (السنن والمبتدعات ص۴)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

(**اتبع ولا تبتدع**). (دارمی ص ۵۰ ج ۱) ''تو اتباع کر بدعت پر عمل نہ کر''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

عليكم بالعلم واياكم والتبدع. (دارمی ص ۵۰ ج ۱).

تم علم کو لازم پکڑو ار بدعت سے بچو اور فرمایا:

اتبعوا ولا تبتدعوا فقد كفيتم. (دارمی ص ۶۱ ج ۱).

تم پیروی کرو اور بدعتی نہ بنو تم کفایت کیے جا چکے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی نے کہا کہ فلاں آدمی آپ کو سلام کہتا ہے تو انہوں نے فرمایا: ''مجھے خبر پہنچی ہے کہ وہ بدعتی ہوگیا ہے اگر وہ بدعتی ہوگیا ہے تو اس پر سلام نہ کہنا) (دارمی ص۱۹، مسلم)

ان آثار سے واضح ہوگیا ہے کہ صحابہ کرامؓ بدعت کو نظر تحسین سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ وہ اہل بدعت سے علیک سلیک کو بھی درست نہیں جانتے تھے۔

بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ

بدعت کی مذمت میں جو صحیح احادیث منقول اور ماثور ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی بدعت کو حسنہ اور سیئہ کی طرف تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنے عموم کے اعتبار سے دین میں جو بھی بدعت ایجاد کی جائے گی خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ اصول میں ہو یا فروغ میں۔ عقائد میں ہو یا عبادات



میں تمام کی تمام ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

فایاکم وما ابتدع ضلالة. (السنن والمبتدعات ص ۴).

تم بدعت سے بچو بلا شبہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

مگر اس کے باوجود بدعتی حضرات بدعت کو حسنہ اور سیئہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں دراصل ان کی مذکورہ تقسیم از خود بدعت ہے کتاب وسنت میں بدعت حسنہ کے دلائل کا کوئی وجود نہین بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے بھی کوئی اس تقسیم سے واقف نہیں تھا کیونکہ بدعت کو تو مذکورہ تقسیم عہد صحابہ کے بہت بعد معرض وجود میں آئی ہے بلکہ اس کی اصل شناخت تو عز بن عبدالسلام نے کی ہے۔

اگر بدعت کی مذکورہ تقسیم کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوئی بدعت ایسی نہیں ہوگی جس کو تمام سیئہ کہتے ہوں بلکہ بعض اسے ضرور حسنہ کہیں گے کیونکہ بدعت کو اچھی سمجھ کر ہی اس پر عمل ہوتا ہے گمراہی سمجھ کر کون عمل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بدعتی سرغنے اپنے پیشواؤں کی بدعات پر حسنہ کا لیبل لگا کر ان کو گمراہ کرتے ہیں پھر اسی پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ بدعت کو حسنہ کا لبادہ پہنا کر اس پر عمل کرنے والوں کو ثواب کی نوید سنائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ایک صاحب لکھتے ہیں:

بدعت حسنہ کا برا ہونا تو کیا بلکہ اس پر رسول اللہ ﷺ نے وعدہ ثواب کا دیا ہے۔ (انوار الساطعہ ص ۹۳)۔

نیز ایسی بدعت، بدعت نہیں رہتی بلکہ سنت بن جاتی ہے جیسا کہ فرماتے ہیں بدعت حسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو قائلِ تقسیم بدعت ہو گا جو تقسیم کا قائل نہ ہوگا وہ بدعت حسنہ کو سنت کہے گا۔ (ایضاً ص ۹۵)

پھر اہلِ بدعت کے نزدیک بدعت کے رائج کا کوئی بھی زمانہ متعین نہیں، بلکہ جس دور میں بھی بدعت رائج ہوگی وہ سنت کا درجہ حاصل کرے گی۔ جیسا کہ مولوی عبدالسمیع لکھتے ہیں:

بلکہ ایجاد اس کا جائز ہے قیامت تک کسی زمانہ میں ایجاد ہو اور کوئی ایجاد کرے۔

اس پر موصوف نے تمام مفتیان کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

پس جان لیجئے کہ ان سب مفتیان دین کے نزدیک تا قیامت بدعتِ حسنہ جائز ہے کچھ قرونِ ثلاثہ منحصر نہیں ہے۔ (انوار الساطعہ ص ۹۴ و ۹۵)۔

موصوف کے خیالات کے مطابق ہر کسی کو بدعت حسنہ کے نام پر شریعت سازی کا حق حاصل ہے اور اس کا ایسے حسن کو استعمال کرنا مذموم نہیں بلکہ باعث ثواب ہے۔

ہم کہتے ہیں اس نظریہ سے تو شریعت بیضاء کا کوئی مقام ہی باقی نہیں رہ جاتا بلکہ شریعت کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہو جاتی ہیں اب دین کے نام پر ہر نتھو خیرے کو نیا دین بنانے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جب ایسا ہی کردار یہود ونصاریٰ کے احبار اور رہبان نے ادا کیا تو اصل دین ناپید ہوگیا اور اس کی جگہ ان کی بدعات نے لے لی اور یہی کردار امت محمدیہ کے بدعتی حضرات نے ادا کیا اور بڑی جسارت اور جرأت سے اپنی ایجاد کردہ بدعات کو شریعت کا درجہ دے دیا۔ بلاشبہ یہود نصاریٰ کی اتباع میں اہل بدعت نے کوئی کمی نہیں کی۔

بدعت حسنہ کے دلائل کا تجزیہ

ہاں البتہ اہل بدعت نے اپنی بدعات کے تحفظ کی خاطر قرآن وحدیث کا نام استعمال کیا اور قرآن وحدیث سے اپنی بدعات کے حق میں دلائل تلاش کرنا شروع کردیے۔ اور بڑی جستجو کے بعد اپنے زعم میں چند دلائل جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

مگر وہ دلائل کیا ان کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔

آیئے ملاحظہ کرتے ہیں:

(۱) من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها لا ينقص من اجورهم شيئاً ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها لا ينقص من اوزارهم شيئا. (مسلم)

بدعتی حضرات کا اس حدیث سے یہ استدلال ہے کہ جیسے اچھا طریقہ رائج کرنے سے اجر اور ثواب ملتا ہے تو اسی طرح غلط طریقہ رائج کرنے سے گناہ حاصل ہوتا ہے اہل بدعت کے نزدیک یہ دلیل ان کے موقف میں سب سے اہم ہے مگر یہ دلیل ان کے موقف سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں رکھتی اس لیے کہ اس حدیث میں سنت کا ذکر ہے بدعت کا ذکر نہیں بدعت سنت کی ضد ہے۔

رسول اللہ ﷺ خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

خير الهدى هدى محمد وشر الامور محدثاتها. (مسلم)

بہترین رستہ محمد ﷺ کا ہے اور بد ترین امور بدعت کے ہیں۔

معلوم ہوا کہ سنت خیر ہے اور بدعت شر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خیر وشر دونوں آپس میں ضد ہیں۔ بدعت سنت کی ضد ہونے کو خود اہل بدعت نے بھی تسلیم کیا ہے طائفہ بریلویہ کے مقتدا مولوی عبدالسمیع فرماتے ہیں:

سنت کی ضد بدعت ہے۔ (انوار ساطعہ ص ۶۹)

اسی طرح علامہ شاطبی ناقل ہیں کہ بدعت سنت کی ضد ہے۔ (الاعتصام ص ۹۱ ج ۱)۔

لہٰذا اس حدیث سے بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ غلط ہے کیونکہ یہ دونوں آپس میں ضد ہونے کی وجہ سے دونوں نہ ہم معنی ہوسکتی ہیں اور نہ ایک جگہ اکٹھی ہوسکتی ہیں۔

ثانیا: مذکورہ الفاظ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے مگر اہل بدعت پوری حدیث ذکر نہیں کرتے وہ آخر ایسا کیوں کریں کیا اپنے استدلال کو خود ہی غلط ٹھہرا لیں۔ دراصل یہ حدیث صدقہ وخیرات کے بارہ میں ہے کہ مضر قبیلہ کے چند لوگ حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے چہرے بھوک کی وجہ سے مرجھائے ہوئے تھے فاقہ واضح نظر آ رہا تھا جسے دیکھ کر آپؐ کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا آپ کبھی گھر میں داخل ہوتے اور کبھی باہر آتے اسی بے چینی میں نماز کا وقت ہوگیا نماز پڑھ لینے کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور صدقہ کی ترغیب دی۔ کسی نے دینار کا صدقہ کیا کسی نے درہم کا۔ کسی نے صدقہ میں کپڑے دیئے اور کسی نے گندم اور کسی نے کھجوروں کا صدقہ کیا جس سے آپ کا چہرہ انور خوشی سے چمک اٹھا تو اس موقعہ پر آپؐ نے مذکورہ حدیث بیان فرمائی:۔

اب دیکھئے کیا صدقہ دینا بدعت ہے۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ قرآن وحدیث میں صدقہ کرنے کی فضیلت میں انگنت اور لاتعداد نصوص وارد ہوئی ہیں کیا نصوص کثیرہ کا نام بدعت حسنہ ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ سنت کا معنی بدعت کرنا جہالت یا تحریف معنوی ہے۔

(۲) ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن. (جاء الحق ص ۳۰۱).

جس کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

بدعتی حضرات مذکورہ روایت کو بھی اپنے مدعا میں پیش کرتے ہیں مگر اس حدیث کا بھی بدعت

حسنہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اولاً: اسے حدیثِ رسول باور کرانا مفتی احمد یار خان گجراتی کی علم حدیث سے ناواقفی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ الفاظ رسول اکرم ﷺ کے نہیں ہیں بلکہ حضرت ابنِ مسعود کا قول ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ جب تمام صحابہ کرام نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کی تو اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا کہ یہ بیعت اللہ کے ہاں بھی درست ہے۔ (مستدرک ص۷۸ ج۳)۔

کیا خلافت کی بیعت بدعت ہے جبکہ قرآن وحدیث کے بے شمار دلائل خلافت کے درست ہونے اور بعض واضح احادیث بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر شاہد عادل ہیں۔

ثانیاً: المسلمون میں لام تعریف استغراقی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام کو تمام مسلمان اچھا کہیں وہ اچھا ہے ہمارے خیال میں کوئی ایسی بدعت نہیں جس کے حسنہ ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوا ہو۔ لہٰذا یہ اثر تو بدعت کے عدم جواز پر دلالت کرتا ہے۔

ثالثاً: اس قول کے قائل حضرت عبداللہؓ بن مسعود دین میں ہر قسم کی بدعت کو ناجائز سمجھتے تھے جیسا کہ فرماتے ہیں:

اتبعوا ولا تبتدعوا. (دارمی)

تم اتباع کرو اور بدعتی نہ بنو۔

نیز انہوں نے ایک جماعت کو تسبیح، تحمید اور تکبیر کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

لقد جئتم ببدعة وظلما. (دارمی).

تم بدعت اور ظلم لائے ہو۔ لہٰذا حضرت ابنِ مسعود کے اس قول سے بدعت حسنہ کا وجود کشید کرنا حضرت ابن مسعودؓ کی مراد کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) **من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاه الله ورسوله كان عليه من الاثم.** (رواہ الترمذی انوار الساطعہ ص۶۹)۔

اس روایت سے بھی اہل بدعت نے بدعت حسنہ کا استدلال کیا ہے کہ ناپسندیدہ بدعت قابلِ جرم ہے اور جو ناپسندیدہ نہ ہو وہ درست ہے۔

راقم کہتا ہے یہ استدلال بھی دو وجہوں سے غیر معقول ہے۔

اولاً: تو کوئی بدعت اللہ اور رسول کو پسند نہیں ہے جیسا کہ فرمایا: ”کل بدعة ضلالة“ ہر بدعت گمراہی ہے۔

ثانیاً: بدعتی کو کیسے معلوم ہوگا کہ میری یہ بدعت اللہ اور رسول کو پسند ہے اگر وہ اپنے گمان سے اس بدعت پر اللہ اور رسول کی رضا صادر کرے گا تو یہ اللہ اور رسول پر افتراء ہوگا کیونکہ اسے اللہ اور رسول کی رضا کا تو علم نہیں ہے۔ جب تک وہ خود اپنی رضا کا اظہار نہ کریں تو وحی کے منقطع ہو جانے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس کا علم ہونا ممکن ہی نہیں۔

ثالثاً: یہ روایت ہی غیر معتبر نا قابلِ اعتماد اور حجت کے لائق نہیں ہے اس لئے کہ اس کی سند اتنی گری ہوئی ہے کہ جس سے اس روایت کے من گھڑت ہونے کا شائبہ پڑتا ہے کیونکہ اس سند کے بعض راوی ایسے ہیں جن پر محدثین نے سنگین قسم کی جرح کی ہے۔

(۱) کثیر بن بعداللہ راوی امام شافعی اور ابوداود فرماتے ہیں: جھوٹ کا رکن ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں: متروک ہے۔ امام ابنِ حبان فرماتے ہیں: اس کے پاس عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ من گھڑت ہے اور مذکورہ روایت بھی عن ابیہ عن جدہ ہے۔ (میزان الاعتدال ص ۴۰۷ ج ۲)۔

معلوم ہوا کہ یہ روایت من گھڑت نسخہ والی ہے جو خود من گھڑت ہے۔

(۲) دوسرا راوی مروان بن معاویہ مدلس ہے۔ (تقریب ص ۲۳۲)۔

لہٰذا جب یہ روایت ہی قابلِ اعتماد نہیں تو اس سے استدلال پکڑنا بھی درست نہیں ہے بالخصوص جبکہ یہ روایت پہلے ذکر شدہ صحیح احادیث کے معارض اور مخالف بھی ہے۔

(۴) حضرت عمرؓ نے نمازِ تراویح کی باجماعت ادائیگی کو دیکھ کر فرمایا تھا: ”نعمت البدعۃ“۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ بدعت اچھی بھی ہوتی ہے۔

راقم کہتا ہے یہ استدلال تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے وہ ایسے کہ نماز تراویح کی جماعت خود رسول اللہ ﷺ نے تین دن تک کرائی تھی پھر اس کے فرض ہونے کے اندیشہ سے جماعت کو ترک کر دیا تھا کیا ہم سنتِ رسول کو بدعت کہہ سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نمازِ تراویح کی احیاء پر بدعت کا لفظ محض اس کے دوبارہ احیاء پر بولا تھا کہ جس کام کا ایک عرصہ ترک رہنے کے بعد ہم نے اہتمام کیا ہے وہ اچھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک

یہاں بدعت کا لفظ شرعی اصطلاح کے لیے نہیں تھا بلکہ لغوی معنٰی میں تھا۔

اگر اہل بدعت اس کو لغوی معنی میں نہ بھی مانے تو پھر بھی ان کو حضرت عمرؓ کا مذکورہ فرمان فائدہ مند نہیں ہے وہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین. (ترمذی).

کہ تم پر میری سُنّت اور خلفاء راشدین جو ہدایت یافتہ ہیں کی سُنّت لازم ہے۔

حضرت عمرؓ کے خلیفہ راشد ہونے کا کسی مسلمان کو انکار نہیں ہے اور پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر فرما دیا تھا۔

اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر وعمر. (ترمذی)

''تم میرے بعد ابوبکر وعمر کی اقتدا کرنا''

از روئے شریعت جب ان دونوں کی اقتداء پر نص موجود ہے تو ان کا امر وفعل بدعت کیسے ہو سکتا ہے بدعت تو وہ ہے جس پر شرعی دلیل موجود نہ ہو جب تراویح کی امامت اور حضرت عمرؓ کی اقتداء پر رسول اللہؐ کا فعل اور امر موجود ہے۔

(۵) قرآن کی کتابت وغیرہ

اہل بدعت اپنے مطلب میں قرآنِ کریم کی کتابت کو بھی دلیل بناتے ہیں کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد ہوئی ہے لہٰذا بدعت ہے۔

راقم کہتا ہے یہ دلیل بھی ان کے حق میں مفید نہیں ہے وہ اس لیے کہ قرآنِ کریم کی کتابت خود رسول اللہؐ نے کروائی تھی اور اس کے لیے نہایت ثقہ کاتبوں کی ایک جماعت موجود تھی۔ مگر یہ کتابت منتشر تھی جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دوبارہ لکھوا کر یکجا کر دیا تھا جس کی تفصیل حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں موجود ہے۔

ثانیاً: قرآن کی کتابت اور تدوین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں سے ہوئی جن کی سنت کی پیروی اور ان کی اقتداء کا حکم خود رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا جیسا کہ نمبر۳ میں گزر چکا ہے لہٰذا یہ کام بھی بدعت کے زمرہ میں نہیں آتا۔

قرآن پر اعراب

بعض حضرات کا خیال ہے کہ قرآن پر اعراب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے لگائے گئے تو اس اعتبار سے یہ کام بھی بدعت نہیں کیونکہ یہ کام بھی خلیفہ راشد کے ہاتھوں ہوا ہے مگر اکثر کی رائے ہے کہ

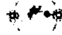
قرآنِ کریم پر اعراب حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے لہذا یہ بھی بدعت ہے۔

راقم کہتا ہے کہ حجاج کے دور میں بہت سے صحابہ کرام بقیہ حیات تھے اگر یہ کام بدعت ہوتا تو صحابہ کرام ضرور اعتراض کرتے مگر کسی ایک نے اس پر اعتراض نہیں کیا گویا کہ یہ اجماع ... تھا اہل اصول کے بقول اجماع خود حجت شرعیہ ہے۔

ثالثاً: اعراب کو بدعت قرار دینا محض جہالت ہے کیا رسول اللہ ﷺ قرآنِ کریم کو بغیر اعراب کے پڑھتے تھے؟ ایسا قطعاً نہیں کیونکہ اعراب کے بغیر تو کوئی عبارت ...ھی نہیں جاسکتی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی قرأۃ اور بعض آیات کے اعراب کی وضاحت احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ حجاج نے تو صرف یہ کیا تھا جس طرح رسول اللہ ﷺ قرآن کو پڑھتے اسے ضبط کر دیا ...۔ جو لوگ اصول قرأۃ سے واقف نہیں وہ بھی قرآن کریم کی تلاوت میں دقت محسوس نہ کریں کیا رسول اللہ ﷺ کی قرأۃ کو مدونہ صورت دے دینا بدعت ہے پھر جب کہ کسی ایک نے اس فعل پر نکیر بھی نہ کی ہو۔

یہ وہ دلائل تھے جو بدعتی حضرات اپنے موقف میں پیش کرتے ہیں مگر آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ ان دلائل میں کوئی ایک دلیل بھی ان کے موقف پر پوری نہیں اترتی لہٰذا بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کی طرف اضافی تقسیم ہے بذاتِ خود بدعت ہے۔

دین الحق کا دوسرا حصہ قارئین کرام کی پیش خدمت ہے یہ جاء الحق کے اس حصے کا جواب ہے جو بدعات سے بھرا ہوا ہے اس کے مولف مفتی احمد یار خان نے دل بھر کر بدعات کی ترجمانی کی ہے اور اپنے طائفہ میں اس کا حق ادا کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدعات کی ایجادات کے علاوہ کوئی اور مشغلہ ہی نہیں کیونکہ اہل بدعت کی نظر میں بہت سے خیر کے امور شریعت نے نامکمل چھوڑے ہیں جن کی تکمیل کا حق ان حضرات کو حاصل ہے وہ جب چاہیں اپنی طرف سے کوئی بدعت جاری کر کے اس کو خالص دین میں داخل کر لیں آخر انہوں



نے اپنی مذمومہ شریعت کو مکمل کرنا ہے انا للہ و انا الیہ رجعون

اللہ تعالی مولا نا محمد داؤدارشد حفظہ اللہ کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے دین الحق لکھ کر اس طائفہ کی معروف بدعات کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور کتاب وسنت کے دلائل اور سلف صالحین صحابہ کرام وتابعین عظام کے عمل سے ان بدعات کا پوسٹ مارٹم کردیا ہے اور دین مصطفی کی حتی المقدور حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا ہے دین الحق ایک نہایت مضبوط علمی کاوش ہے جس میں مولف نے چونکہ ۔چنانچہ سے کام لینے کی بجائے اپنی تحقیق کی بنیاد کتاب وسنت کے نصوص واضح پر رکھی ہے اور طائفہ بریلویہ کے بدعات کے جو ند میں ایک ایک حیلے کے کئی کئی جوابات تحریر کئے ہیں جس سے مؤلف کی وسعت علمی اور سنت سے محبت اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

موصوف نے بدعات کے رد میں کوئی لچک اور نرمی پیدا نہیں کی بلکہ بیباک اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور سنت کے دفاع اور دین خالص کے تحفظ میں اپنی غیرت ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے۔

دین الحق کی دوسری جلد کے مطالعہ سے قارئین کرام محسوس کریں گے کہ مفتی احمدیار خاں کی پارٹی بدعات کے جواز میں کن حدود کو پھلانگ چکے ہیں اور مولا نا محمد داود ارشد نے ان کی بدعات کے سامنے کتاب وسنت کے نصوص کا کتنا مضبوط بند باندھ دیا ہے بلاشبہ ان کی یہ کاوش بدعات کے رد اور کتاب وسنت کے دفاع میں سنگ میل ثابت ہوگی "فجزاہ الله عناد عن سائر المسلمین

اللہ کریم سے دعا ہے کہ موصوف کی اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اوراس کو حق وباطل کے مابین حد فاصل بنادے امین الہ العالمین۔

کتبہ

ابوانس محمد یحیی گوندلوی

مدیر جامعہ تعلیم القرآن والحدیث ساہووالہ سیالکوٹ

۲۹/اپریل ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ عصر استاذ العلماء حضرت حافظ ثناء اللہ الزاہدی حفظہ اللہ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ صادق آباد، کا تبصرہ

الحمدلله رب العالمین والصلاة والسلام علی رسول الله وعلی آله وأصحابه أجمعین. اما بعد:

اسلامی معاشرہ شروع سے ہی دو طرح کے طبقات (حزب اللہ اور حزب الشیطان) پر منقسم رہا ہے کتاب وسنت کے داعی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سرگرم عمل ہیں، اور شرک وبدعت کی داعی جماعتیں بھی شرک و بدعت کی ترویج میں کوشاں ہیں اسی سلسلہ کی کاوشوں میں سے ایک کاوش کتاب (جاء الحق) بھی ہے جو کہ مفتی احمد یار گجراتی کی تالیف کردہ ہے اس میں بریلوی فرقہ کی رسوم وبدعت کو اسلامی بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کئی سالوں سے یہ کتاب مطبوع حالت میں لوگوں کے ہاں زیر مطالعہ ہے ضرورت تھی کہ اس کتاب کے مسائل بدعت وشرک کی عوام الناس کے سامنے حقیقت واضح کی جائے تاکہ لوگ اصل اسلامی عقائد و عبادات سے واقف بھی ہوں اور عمل پیرا ہو کر اسلامی خوشنودی اور محبت اور جنت جیسی گراں قدر نعمتوں سے مشرف ہوں اللہ تعالیٰ نے اس خدمت عظیم کی توفیق ہمارے فاضل دوست مولانا داود ارشد صاحب کو عنایت فرمائی جنھوں نے دین حق کے نام سے موسوم کتاب میں مفتی صاحب کی بدعت کو سنت بنا کر پیش کرنے کی ساری کاوشوں کو عیاں کیا اور کتاب وسنت رسول ﷺ سے تمام بدعات اور شرکیات کا انتہائی سلجھے ہوئے علمی انداز سے رد کیا ہے اللہ تعالیٰ انکی اس خدمت کو قبول ومنظور فرمائے اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے آمین۔

عوام الناس سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں اور اپنے عقائد و عبادات کو کتاب وسنت کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کریں کہ یہی ذریعہ نجات ہے۔

اللهم تقبل حسناتنا واعف عنا سیئاتنا ووفقنا الی الذی تحبه و ترضاه (آمین).

کتبہ العبد الفقیر الی اللہ

حافظ ثناء اللہ الزاھدی

۱۴۲۱/۸/۱۴ھ

صادق آباد

حافظ عبدالغفار روپڑی حفظ اللہ، مدیر تنظیم اہل حدیث کا تبصرہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

بریلوی مکتبہ فکر کے حکیم الامت مفتی اعظم احمد یار گجراتی جو کہ قرآنی آیات کی تحریف میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے آیت فویل للذین یکتبون الکتاب بایدھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا، کا مصداق ہے نے بریلوی شریعت پر ایک ضخیم کتاب جاء الحق و زھق الباطل نامی تحریر کی جو کہ امت بریلویہ کے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ امت بریلویہ کے واعظین وخطباء ومفتیان عظام کا مبلغ علم اور معیار تحقیق یہی کتاب ہے جس میں شکم پرور مسائل قل دسواں چالیسواں کے علاوہ دیگر بدعات پر طبع آزمائی کی گئی اور خرافات ہفوات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب وسنت کے واضح نصوص کی تحریف کر کے شریعت مطہرہ کے صاف و شفاف پانی میں بدعات و رسومات کے گڑ کا پانی ملانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

لیکن چونکہ اللہ تعالی نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اس لئے وہ ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت اور دفاع کیلئے اپنے مقرب بندوں میں سے بعض کو مقرر کر دیتا ہے جو اپنی ذمہ داری سے لحہ بھر بھی غافل نہیں ہوتے۔

لہذا مالک کائنات نے جس طرح میدان بدر میں باطل کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے کیلئے معوذ اور معاذ کو منتخب کیا اسی طرح بدعات وخرافات کے قلمی قلعہ جاء الحق کو مسمار کرنے کیلئے کائنات نے ہمارے فاضل دوست مولانا محمد داود ارشد کو منتخب کیا جنہوں نے دین حق کی تلوار سے باطل کے ایک قلعے کو زمین بوس کر کے بعد میں بدعات کے مورچوں پر دین حق فی تنقید جاء الحق میں دلائل و براہین کی ایسی بمباری کی ہے جس میں جاء الحق وزھق الباطل کا حقیقی نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے فاضل دوست نے ان تھک محنت و کوشش کر کے مختلف کتب میں بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو جمع کر کے دین حنیف کا دفاع کیا ہے اللہ تعالی اس محنت کو قبول فرمائے اور دین حق کے اسی دوسرے حصے کو عوام و خواص میں پہلے حصے کی طرح مقبول عام کرے اور مؤلف کیلئے توشہ آخرت بنائے (آمین)

عبدالغفار روپڑی

وکیل صحابہ پاسبان مسلک علمائے دیوبند حضرت مولانا عبدالروف فاروقی کا تبصرہ

بسم اللہ تعالیٰ

شرک اور بدعات کی علم اور دلائل کے ساتھ تردید توحید وسنت کے ساتھ اعتقادی اور عملی محبت کی دلیل ہے اور اس سلسلے کا آغاز خود اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ نے کیا، صحابہ رضوان علیھم اجمعین نے اس سلسلہ میں انتہائی حمیت دین کا ثبوت دیا اور اپنے یہاں شرک و بدعات کے مراسم کو کسی صورت برداشت نہیں کیا، ائمہ و علماء نے ہر دور میں اس سلسلے کا تحفظ کیا اور اسے آگے بڑھایا یہاں تک کہ ہر طرح کی تکالیف و آلام کو برداشت کر کے بھی اس سلسلے کو قائم رکھا۔ دعوت و دعت کی تاریخ اس کی شاھد ہے۔

برصغیر میں علاقائی و قبائلی رسومات کو جن میں ایک بہت بڑا حصہ ہنود و مجوس کے مذھبی و اعتقادی شعائر سے متعلق تھا، مذھب کا درجہ دے کر انہیں باقاعدہ بدعات کی شکل دینے کی ''خدمت'' بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے مذھبی رھنماؤں نے سرانجام دی۔ یہ یہود و نصاریٰ کی خدمت تھی اور اس سے مشرکانہ مذاھب اور اسلام دشمن تحریکوں کا کام بہت آسان ہوگیا، یہ دراصل اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کا حصہ تھا اور بریلوی مسلک کے کچھ لوگ شعوری طور پر اس سازش کا حصہ بنے تو کچھ لوگ اس سلسلے میں استعمال ہوگئے۔

جناب احمد رضا خان بریلوی جہاں تکفیر مسلمین کے سلسلہ میں سرخیل بلکہ موجد ہیں وہاں بدعات کو رواج دینے اور اعتقادی و عملی شرک کی راہیں کھولنے اور ان کے لئے قرآن و حدیث میں تحریف کے درجے کی تاویلات کر کے عظیم قومی و مسلکی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر تعصب و عناد نے ان کے اتباع کو اپنی زندگیاں اور زندگی کی تمام تر توانیاں اسی ھدم اسلام'' کے لیے محنت میں صرف کرنے کی راہ پر لگادیا۔

اللہ تعالیٰ بھلا کرے اُن علماء کرام کا جنہوں نے بدعات کی تردید میں وقت کا فرض ادا کیا اور تاریخ دعوت وعزیمت میں اپنا کردار بڑی ہی خوش اسلوبی سے ادا کیا ان کی ساعیِ جمیلہ اور علمی خدمات نے جہاں اسلام کا حقیقی چہرہ مسلمانوں کے سامنے روشن رکھا ہے وہاں دلائل کی قوت سے مبتدعین کے تعاقب میں ہر میدان میں مبتدعین کو رسوا کیا ہے، توحید وسنت کی حفاظت کے لیئے علم و دلائل کے اعتبار سے کام کرنے، اسلام کے روشن چہرے کونکھارنے اور مبتدعین کو دلائل وعلم کے میدان میں راہ فرار ااختیار کرنے پر مجبور کرنے والوں کی جب فہرست یا تاریخ مرتب ہوگی تو یقیناً اُس میں حضرت مولانا محمد داؤد ارشد صاحب کا نام ایک محقق، غیرت مند عالم دین اور توحید وسنت کے ایک رضا کار کے طور پر درج کیا جائے گا۔

مولانا محمد داؤد ارشد نے بدعات کو قرآن و حدیث میں علمی خیانت اور معنوی تحریف کر کے سہارا''

دینے والے ایک دینی مجرم مفتی احمد یار گجراتی کا جس انداز سے تعاقب کیا ہے اور اس کی کتاب ''جاء الحق'' کا استدلال کی جس قوت سے ابطال کیا ہے اس پر وہ پوری سُنی قوم کی طرف سے ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔

میں نے اُن کی تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل کتاب ''دین الحق فی تنقید جاء الحق'' کے بعض اھم حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایک خاموش مجاھد اسلام کی عظیم کوشش ہے اور اس کا انداز انتہائی منفرد اور جاندار ہے، مولانا محمد داوٗد ارشد نے قرآن، حدیث، تفاسیر فقہی کتب اور چودہ سو سالہ دینی وعلمی کام سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کو ناقابل تسخیر بنایا ہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے ان کی اس خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے علماء اور عامۃ المسلمین میں اس کی قبولیت کے لیئے دعاگو ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ''بریلویت'' مستقل ایک مکتبہ فکر کا نام ہے اس کے مقاصد۔ نصب العین، سوچ کا انداز، استدلال کا طریق کار کام، اور علمی فکری اور عملی اعتبار سے اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال سے متصادم ایک اپنا جداگانہ طرز فکر ہے۔ اس کا حنفیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں محض مقاصد کے حصول کی خاطر برصغیر کے اکثریتی فقہی مسلک کا لبادہ اوڑھ کر اور اس نام کو استعمال کر کے اس نے اپنے مقاصد

حاصل کرنے اور اپنے معتقدات کو عامۃ المسلمین میں رواج دینے کا پرفریب انداز اختیار کیا۔ لہذا بریلویت کو حنفیت سے جُدا کر کے حنفیت کو اس کے بنیادی علمی سرچشموں اور بریلویت کو اس کے طرز استدلال سے اگر جاننے کی کوشش کی جائے تو دونوں کے درمیان موجود زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

آخر میں پھر میں حضرت مولانا محمد داوٗد ارشد کی اس علمی خدمت پر اُن کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ انہیں اتباع سنت سے نوازیں اور بدعات سے نہ صرف اجتناب بلکہ ان کی تردید کے لیئے محنت کرنے کی توفیق سے نوازے۔

عبدالروف فاروقی۔

۶ محرم ۱۴۲۱ھ

فاروقی صاحب کا تبصرہ اور کتاب سے اتفاق صرف اور صرف بدعات اور اس کے متعلقہ مضامین سے ہے طلاق ثلاثہ اور اس ضمن میں دیگر مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند ہیں

محمد داود ارشد

۳۰ رمضان ۱۴۲۱ھ

۲۷ دسمبر ۲۰۰۰ء

۱۲- پوہ ۲۰۵۷ب





مقدمہ دین الحق

از رشحات قلم:

الشیخ حافظ عبدالرشید اظہر حفظہ اللہ تعالیٰ

اسلام آباد

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم. اما بعد

بنی نوع انسان میں اختلاف و تفاوت ایک مسلمہ حقیقت اور امر واقع ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں میں جاری و ساری سنت۔ جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں یہ اختلاف خلقت، خلق اور عقل وفکر اور نظر و استدلال ہر طرح کا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا، اسکی بنیاد پر دنیا میں فساد برپا کرنے سے پرہیز کرنا، اس نوعیت کا فساد کہیں رونما ہو جائے تو سلیقے کے ساتھ اسے ختم کرنے کی کوشش کرنا یا ادب و احترام کے ساتھ اس سے بچ نکلنا اسلامی آداب و اخلاق کا حصہ اور رضا بالقضاء کا تقاضا ہے۔ رنگ و نسل، تہذیب و ثقافت، علاقہ و زبان اور شعوب و قبائل کے اختلاف کی وجہ سے چشم فلک نے انسانوں میں احمقانہ قتل و غارت گری اور ہلاکت و بربادی کے ایسے بدترین مناظر دیکھے کہ الامان و الحفیظ۔

شہ زوری و کم زوری کے اختلاف کی وجہ سے انسانوں نے اپنے جیسے ذی شعور و مجبور انسانوں پر جو ستم ڈھائے اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حکایت و روایت انسانی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ مالی تفاوت کی وجہ سے آجر و اُجیر اور غنی و فقیر کے مابین حسد و بغض اور نفرت کی جڑیں بڑی لمبی اور گہری ہیں۔ باوجودیکہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں مگر قضاء و قدر پر عدم اعتماد اور توفیق الٰہی سے محرومی انہیں باہم قریب نہیں ہونے دیتی اور انہیں پروردگار کی تقسیم و تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنے دیتی۔

مقام رسالت

وحی و رسالت اور نبوت کا سلسلہ بندوں پر اللہ رب العزت کی بڑی مہربانی اور کرم نوازی ہے جس کے ذریعے اس نے حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا اور حدود و قیود واضح کر دیں۔ انسانیت کوظلم وظلمت سے نکال کر عدل و انصاف اورنور و ہدایت سے سرفراز فرما دیا۔ بندوں کو انکے اختیاری افعال و أعمال کے انجام خیروشر سے آگاہ فرما کر انہیں روشن راہ دکھادی تا کہ وہ ظاہری لذت یا مشقت کو نظر انداز کر کے انجام کارکو مدنظر رکھیں۔ کہ یہی عین سعادت و بصیرت ہے۔

قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربه فصلی بل تؤثرون الحیاة الدنیا والاخرة خیر و ابقی (۱۴. ۱۵. ۱۶. ۱۷ /الأعلی)

بے شک اس نے فلاح پائی جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا مگرتم دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معهم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط الایة ۲۵ الحدید).

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دیکر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (قواعد عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اور فرمایا: **الله الذی انزل الکتاب بالحق و المیزان الخ (۱۷ الشوری).**

اللہ ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی اور ترازوئے عدل و انصاف۔

اور فرمایا۔

إن هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لهم اجرا کبیرا (۹ . بنی اسرائیل).

بے شک یہ قرآن وہ رستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مؤمنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

اور فرمایا فاصبر إن العاقبة للمتقين. (۴۹ هود)

یہ ارشاد و توجیہ اور راہ حق کی نشاندہی اللہ کا اپنے بندوں پر فضل خاص اور اتمام نعمت ہے۔ اور علیم و حکیم ذات کیطرف سے ظلوم و جہول انسان کی دستگیری۔

يريد الله أن يخفف عنكم و خلق الانسان ضعيفا (۲۸. النسآء)

دنیا میں انسانوں کے ما بیناس عظیم الشان نظام عدل و انصاف کے قیام' اختلافی امور میں فیصلہ کرنے اور سلیقہ سکھانے اور حقوق و فرائض کے تعین کیلئے اللہ تعالی نے ایسی نادرۂ روزگار اور ذی وقار شخصیات کا انتخاب فرمایا جو ہر قسم کے عیوب سے مبرا' انگشت نمائی سے بالاتر طمع و لالچ اور ذاتی مفادات سے پاک امانت و دیانت اور تبلیغ رسالت میں اپنی مثال آپ تھیں ان کا وجود مبارک سراپا ھدایت' انکی سیرتیں منارۂ نور' انکی تعلیم اور پیغام نورٌ علی نور تھا۔

فرمایا:

الۤر ☆ كتاب انزلناه اليك لتخرج الناس من الظلمات الي النور باذن ربهم الى صراط العزيز الحميد (۱ . ابراهيم)

یہ ایک کتاب ہے اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ ان کے پروردگار کے حکم سے (یعنی) غالب اور قابل تعریف ذات کے رستے کی طرف۔

حضرت موسی علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ولقد ارسلنا موسى بآياتنا أن أخرج قومك من الظلمات الي النور و ذكرهم بايام الله ان فى ذلك لآيات لكل صبار شكور (۵. ابراهيم).

اور ہم نے موسی کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ اس میں ان لوگوں کیلئے جو صابر و شاکر ہیں۔ (قدرت الٰہی کی) نشانیاں ہیں۔

وحی کا انکار بدنصیبی ہے

مگر اس رحمت و عنایت الٰہی کے باوجود حیوانیت اور بہیمیت سے مغلوب اور بدنصیب انسان بغی

وسرکشی کا شکار ہوا' دنیا کی محبت میں اندھا ہو کر اپنے لئے ھدایت کی بجائے ہلاکت کا سامان کر بیٹھا۔

و ویل للکافرین من عذاب شدید ☆ الذین یستحبون الحیوۃ الدنیا علی الآخرۃ و یصدون عن سبیل اللہ و یبغونھا عوجا ☆ اولئک فی ضلل بعید (ابراھیم ۲-۳)

اور کافروں کیلئے سخت عذاب کی ہلاکت ہے جو آخرت کی نسبت دنیا کو پسند کرتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کے رستے سے روکتے اور اس میں کجی چاہتے ہیں یہ لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

حق و ہدایت کی راہ سے ہٹے ہوئے انسان نے خلقی' خلقی اور طبعی اختلاف کے ساتھ فکری و نظری اور حق و باطل کے اختلاف کا بھی اضافہ کر لیا۔

حق واضح ہے۔ صراط مستقیم روشن ہے' دین میں کوئی کمی ہے نہ اس کی دعوت و تبلیغ میں کوئی کوتاہی بلکہ اس میں دلوں میں راہ پانے کی مکمل صلاحیت ہے مگر بدنصیب لوگوں کے دلوں پر مہریں کانوں میں ڈاٹ اور آنکھوں پر پردے ہیں اور وہ ازلی شقاوت کا شکار ہیں۔

ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی أبصارھم غشاوۃ (البقرۃ:۷)

فرمایا: ولو شآء ربک لجعل الناس امۃ واحدۃ **ولایزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذلک خلقھم و تمت کلمۃ ربک لأملن جھنم من الجنۃ و الناس أجمعین (ھود. ۱۱۸ - ۱۱۹)**

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا' لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے ۔ مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے اور اسی لئے تو اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

نیز فرمایا: **فھدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ و اللہ یھدی من یشآء الی صراط مستقیم (۲۱۳ البقرۃ)**

پس اللہ نے اپنی مہربانی سے مؤمنوں کو اس حق کی راہ دکھا دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔

نیز فرمایا: **ولو شآء اللہ ما اقتتل الذین من بعدھم من بعدما جآء تھم البینت ولکن اختلفوا فمنھم من آمن و منھم من کفر ولوشآء اللہ ما اقتتلوا ولکن اللہ یفعل ما یرید**

(۲۵۳ / البقرة)
اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے' لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم جنگ وقتال نہ کرتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

نیز فرمایا: **ولو شآء الله لجعلهم أمة واحدة ولكن يدخل من يشآء في رحمته** (الآية-۸ الشورى)

اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ایک ہی جماعت کر دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور فرمایا: **و ما تفرقوا الا من بعد ما جآءهم العلم بغيا بينهم** الآية ۱۴ / الشورى)

و عن ابى الدرداء رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم و أيم الله تركتكم على البيضآء ليلها و نهارها سواء. (ابن ماجة).

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم میں تم لوگوں کو روشن شریعت پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جہاں (روشنی کی وجہ سے) دن رات برابر ہیں۔

بدنصیب گروہوں اور گمراہ قوموں کے اس بے جا اختلاف و شقاق' بے دلیل بحث وجدال اور بے مقصد عناد وفساد کے قرآن حکیم نے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں۔

انکار نبوت و رسالت کے اسباب

۱۔ منصب نبوت ورسالت کے لئے اللہ تبارک وتعالی کے انتخاب و اختیار اور منشاء ومشیت پر اعتراض حالانکہ وہ قادر ومطلق ہے جسے چاہے اپنے فضل خاص اور رحمت سے نوازے جب اللہ تعالی نے اپنے مخلوق کے مختلف افراد کو متعدد امور میں اختصاصات سے نوازا ہے۔

مثلاً صحت و توانائی' جسمانی ڈیل ڈول' فکر وفہم' مال و دولت اور حکومت وسلطنت وغیرہ کے بارے میں قسام ازل کے فیصلے قبول ہیں تو اگر اپنے کچھ بندوں کو اس نے نبوت و رسالت اور وحی کیلئے منتخب فرمالیا اور ان کے ذریعے اپنی مخلوق کی فلاح وصلاح کا کام لے لیا اور لوگوں پر حجت قائم کر دی تو یہ بھی اس کا حق ہے کہ وہ حکیم وعلیم' مختار کل اور فعال لما یرید ہے۔

نظام کائنات، انسانوں کے باھم تفاوت اور سنۃ اللہ پر ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت بسہولت سمجھ آجاتی ہے کہ انبیآء و رسل کا انتخاب و اختیار اس ذات وحدہ لاشریک لہ کا ہی حق ہے۔ اس نے جسے چاہا اس اعزاز و اکرام سے نوازا دیا اور انکی پاکیزہ زندگیاں اس حسن انتخاب کی بہترین دلیل ہیں علیہم صلوات اللہ وسلامہ۔

فرمایا: اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا و من الناس ان اللہ سمیع بصیر (۷۵ الحج)
اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

الرسل

نیز فرمایا: رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل و کان اللہ عزیزا حکیما (۱۶۵ النساء)
رسولوں کو (اللہ نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ پر الزام کا موقع نہ رہے۔ اور اللہ غالب وحکمت والا ہے۔

نیز فرمایا: و ربک یخلق ما یشآء و یختار ما کان لھم الخیرۃ الآیۃ (۶۸/القصص).
اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) برگزیدہ کر لیتا ہے انکو اس کا اختیار نہیں، و قالوا لو لا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم ☆أھم یقسمون رحمۃ ربک ☆ (الآیۃ ۳۱۔۳۲ / الزخرف)
اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (مکے اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟

کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟

۲ - کچھ لوگ ضد و عناد اور حسد کا شکار ہوگئے' انہیں اپنا جاہ و جلال اور منصب واقتدار خطرے میں محسوس ہونے لگا ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے انبیاء و رسل اور ان پر آنے والی وحی ورسالت کو تسلیم کر کے انکی تصدیق کر دی تو لوگ ہمیں چھوڑ کر انکو اپنا لیں گے' وہ بیوقوف اپنے ہوا پرستی، حسد وبغض اور عناد کو چھپا بھی نہ سکے بلکہ اپنی زبانوں سے اپنے خلاف حجت قائم کر کے حماقت کا اظہار کر دیا۔

و اذا جاء تھم آیۃ قالوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما أوتی رسل اللہ · اللہ اعلم

حیث یجعل رسالته (۱۲۴ / الانعام).

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ جس طرح رسالت اللہ کے رسولوں کو ملی ہے جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اس بات کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ کہ رسالت کسے عنایت فرمائے۔

اور جب حضرت موسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوات والتسلیمات وحی ورسالت سے سرفراز ہوکر فرعون کے پاس گئے اس کا جواب بھی کچھ اسی نوعیت کے تکبر وخود پسندی اور بے جا اعتراض اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔

و نادي فرعون فی قومه قال یاقوم ألیس لی ملک مصر و هذه الانهار تجری من تحتی افلا تبصرون ☆ أم أنا خیر من هذا الذی هو مهین ولایکاد یبین ☆ فلو لا ألقی علیه أسورة من ذهب أو جآء معه الملائکة مقترنین ☆ (الزخرف / ۵۱ - ۵۳)

اور فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا اے قوم کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہہ رہی ہین (میری نہیں ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ بے شک میں اس شخص سے جو کچھ عزت نہیں رکھتا اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا بہتر ہوں۔ تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہ اتارے گئے۔ یا (یہ ہوتا کہ) فرشتے جمع ہوکر اس کے ساتھ اترتے۔

ایسے ہی خاتم النبیین سیدنا و سید الاولین والآخرین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت و رسالت کی خلعت فاخرہ زیب تن کی جو وجود اطہر کیلئے اس قدر موزوں اور مناسب تھی کہ انگشت نمائی کی کوئی گنجائش نہ تھی اور لوگوں کو دین حق کی دعوت دی، دلائل و براہین اور معجزات سے اپنے دعویٰ نبوت و رسالت کو ثابت کر دیا مخالفین کے پاس کہنے کو جب کچھ بھی نہ رہا تو صفا دید قریش اور کفار مکہ نے بھی وہ ہی پرانی بات کی کہ نبوت ورسالت جیسے عظیم منصب کے لئے آخر اللہ نے اس یتیم کا انتخاب کیوں کیا نہ مکہ وطائف کے کسی عظیم شخص پر یہ عنایت کیوں نہ ہوئی۔

و قالوا لو لا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم . أهم یقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیاة الدنیا و رفعنا بعضهم فوق بعض درجت لیتخذ بعضهم بعضا سخریا و رحمت ربک خیر مما یجمعون (۳۱-۳۲ الزخرف)

اور کہنے لگے یہ قرآن ان دونوں بستیوں (مکہ و طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔ کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت بانٹتے ہیں ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں بانٹ دیا ہے۔ اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔ تا کہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔ اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تیرے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

انکار رسالت کا تیسرا سبب - بشریت انبیاء کرام علیہم الصلوۃ و السلام

انبیاء ورسل اور ان کی اقوام وملل کے مابین سب سے زیادہ متنازع فیہ مسئلہ انبیاء کی بشریت تھا انہیں اپنی وحی رسالت کی طرف حاجت وضرورت کا بھی اعتراف تھا ۔ اللہ تعالی کے اختیار و انتخاب پر بھی ان کا ایمان تھا مگر انہیں یہ غلط فہمی ہوگئی کہ یہ مقام و مرتبہ اولاد آدم میں سے کسی ان جیسے بشر کو بھی حاصل ہوسکتا ہے انکا خیال تھا یہ مقام ملائکہ کے شایان شان ہے۔ انکا خیال تھا کہ بشریت مقام رسالت کے منافی ہے کہ انسان کی روح جس قدر بھی شفاف ہو۔ اس کی قوت فہم و ادراک جس قدر بلند و بالا ہو جائے اور نفس انسانی جتنے بھی مقامات سلوک سر کر لے، کبھی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ فیوض و برکات الہیہ کے نزول کا مرکز اور وحی ورسالت کا اہل بن سکے ان کی نظر میں انسانیت بہر حال اس سے احقر ہے کہ اسے مقام نبوت پر فائز کیا جا سکتا ہیں۔

فقال الملأ الذين كفروا من قومه ما نراک الا بشرا مثلنا ومانراک اتبعك الا الذين هم أرازلنا بادى الرأى و ما نرى لكم علينا من فضل بل نظنكم كاذبين (هود : ۲۷)

تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی ان ہی لوگوں نے کی ہے جو ہم میں ادنی درجے کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہری سے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

كذبت ثمود بالنذر فقالوا أبشرا منا واحدا نتبعه انا اذا لفی ضلل و سعر أ ألقى الذكر عليه من بيننا بل هو كذاب أشر" (سورة القمر أيت ۲۳ . ۲۴ . ۲۵)

ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا اور کہا کہ بھلا ایک آدمی جو ہم ہی میں سے ہے' ہم اسکی پیروی کریں یوں ہوتو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر وحی نازل

ہوئی ہے (نہیں) بلکہ یہ جھوٹا خود پسند ہے۔

و ما قدروا الله حق قدره اذ قالوا ما انزل الله علی بشر من شئ قل من أنزل الکتاب الذی جاء به موسی نورا و هدی للناس تجعلونه قراطیس تبدونها و تخفون کثیرا (الایات – الانعام ۹۱)

اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر جیسی جاننی چاہئے تھی نہ جانی جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے انسان پر کچھ بھی نازل نہیں کیا' کہو! کہ جو کتاب موسیٰ لیکر آئے تھے۔ اسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لئے نورو ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق کر رکھا تھا اس کے کچھ حصے کو تم ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو۔

و اضرب لهم مثلا اصحاب القریة اذ جاء ها المرسلون اذ ارسلنا الیهم اثنین فکذبوهما فعززنا بثالث فقالوا انا الیکم مرسلون ☆ قالوا ما انتم الا بشر مثلنا و ما انزل الرحمن من شئ ان انتم الا تکذبون ☆ (سوره یسن الآیات ۱۳–۱۵)

اور ان سے گاؤں والوں کا قصہ بیان کرو جب ان کے پاس رسول آئے۔ جب ہم نے ان کی طرف دو کو بھیجا تو انہوں نے انکو جھٹلایا۔ پھر ہم نے (انکو) تیسرے سے تقویت دی۔ تو انہوں نے کہا ہم تمہاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ تو وہ بولے کہ تم تو ہماری طرح کے عام آدمی ہی ہو اور رحمٰن نے کچھ نازل نہیں کیا تم تو محض جھوٹ بولتے ہو۔

قالوا ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبد آباء نا فأتونا بسلطان مبین ☆ قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن الله یمن علی من یشآء من عباده الایة (ابراهیم ۱۰ و ۱۱).

وہ بولے تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو تمہارا یہ منشاء ہے کہ جن چیزوں کو ہمارے بڑے پوجتے رہے ہیں ان سے ہم کو روک دو تو ہمیں کوئی واضح دلیل دو۔ رسولوں نے ان سے کہا ہاں ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرما دیتا ہے۔

مایأتیهم من ذکر من ربهم محدث الا استمعوه و هم یلعبون لاهیة قلوبهم واسروا النجوی الذین ظلموا هل هذا الابشر مثلکم أفتأتون السحر و انتم

تبصرون (سورة الانبیاء ۲ -۳).

ان کے پاس کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ظالم لوگ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں کہ یہ تو تمہارے ہی جیسا بشر ہے تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جادو میں کیوں آتے ہو۔

وما منع الناس أن یؤمنوا اذ جآء ھم الھدی الا أن قالوا أبعث اللہ بشرا رسولا (الاسراء ۹۴)

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

انکار رسالت کا انجام

گویا اہل جہل وضلال اور عناد وفساد اصحاب کفر وشرک اور نفاق وشقاق کا اللہ کے فرستادہ چیدہ برگزیدہ رسولوں کے ساتھ سب سے بڑا معرکہ ان کی بشریت کے بارے میں ہی بپا ہوا۔

انبیاء ورسل کے ساتھ اختلاف ان کی نبوت و رسالت پر حرف گری اور طعنہ زنی کا نتیجہ بہر حال مشیت الہی میں مداخلت اللہ تعالی کے انتخاب و اختیار پر عدم اعتماد اور اس کے نازل کردہ دین حق سے روگردانی ہے۔ حق وصداقت اور وحی و رسالت کے انکار کا نتیجہ کفر وشرک اور بدعت کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ گویا یہاں سے اللہ اور اس کے رسولوں کی گستاخی کا دروازہ کھلتا ہے۔

دنیا میں فتنے نازل ہوئے اور فساد برپا ہوتا ہے۔ وحی و رسالت کو نظر انداز کر کے اور انبیاء ورسل کی اطاعت سے روگردانی کر کے حق تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرمایا۔

فما بعد الحق الا الضلال.

نیز فرمایا: **فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ أن تصیبھم فتنۃ أو یصیبھم عذاب الیم (النور ۶۳)**

تو جو لوگ ان کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انکو ڈرنا چاہیئے کہ کہیں ان پر کوئی آفت نہ پڑ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

تخلیق کائنات اور بالخصوص جن وانس کا مقصد تو منشاء ومراد الہی کے مطابق اس کے حضور سجدہ

ریز ہونا اور آداب بندگی بجا لانا ہے جس کا علم وحی و رسالت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ انبیاء و رسل کے ساتھ اختلاف کر کے منشاء مراد الٰہی کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے؟

جن نفوس قدسیہ کے قلوب مطہرہ پر وحی کا نزول ہوا ان سے کٹ کر اور ان پر کسی بہانے سے عدم اعتماد کا اظہار کر کے رضاء الٰہی کا حصول ممکن نہیں۔ انبیاء و رسل کی پیروی دین حق اور صراط مستقیم ہے۔

جن لوگوں نے اس سے صرف نظر کیا وہ شریعت سازی جیسے بدترین جرم میں مبتلا ہوئے اپنے خود ساختہ دین کو حق قرار دے کر غضب الٰہی اور ہلاکت کا شکار ہوئے۔ فرمایا:

فويل للذين يكتبون الكتب بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت أيديهم و ويل لهم مما يكسبون (البقرة ٧٩).

تو ان لوگوں کیلئے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کریں ان کے لئے ہلاکت ہے اس لئے کہ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں ان کیلئے ہلاکت ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

شرائع سماویہ کے کلی یا جزوی انکار، ان کے لانے والے قابل قدر و قابل صد احترام انبیاء ورسل جو دنیا میں معیار حق وصداقت ہیں پر کسی قسم کی حرف گیری کا لازمی نتیجہ متوازی شریعت سازی اور بدعت کی ایجاد ہوتا ہے۔ جو کتاب و سنت کے مطابق شرک کے بعد سب سے بدتر فکری و عملی گمراہی ہے۔ اس سے دین میں تحریف وتغیر کے دروازے کھلتے ہیں اور مسلمانوں مین جھگڑے اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ بدعت کے حاملین دین کے فرائض و واجبات' ذکر وعبادت کے مشروع ومسنون اور مستند طریقے چھوڑ کر اپنے خود ساختہ طریقوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اصل اسلام کے ساتھ لوگوں کا تعلق سطحی سا رہے جاتا ہے۔ اور خود ساختہ بدعات معاشرے میں رواج پا جاتی ہیں۔ اسی لئے شریعت اسلامیہ میں ہر قسم کی بدعت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اللہ اور اس کے رسول نے اس کی پر زور مذمت فرمائی اور حرام قرار دیا۔ فرمایا:

و من يبدل نعمة الله من بعد ماجآءته فان الله شديد العقاب (البقرة ٢١١)

اور رسالت مآب علیہ الصلاۃ و السلام کے لیے الفاظ تو تمام آئمہ وخطباء کی زبان پر جاری رہتے ہیں۔

شر الامور محدثاتها و كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة فى النار (مسلم و نسائى)

بدترین چیز نو ایجاد امور ہیں اور دین میں ہر نو پید چیز بدعت ہے' ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

دراصل بدعت دین مین تحریف ہے جو سراسر حرام ہے۔

بدعت ان مسائل میں سے ہے جس کے بارے میں سلف امت میں قرون ثلاثہ تک اور آئمہ مجتہدین میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ یہ حرام اور دجل ہے۔ نیز سلف صالحین اس کی تقسیم حسنہ و سیئہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ شیطان اور اسکی ذریت کی سعی و جہد مسلسل سے متاخرین میں اس کے حمایتی علماء پیدا ہو گئے اور اس کی پشت پناہی ہونے لگی اس کی حمایت مین تالیفات منظر عام پر آنے لگیں۔ بالاخر مسلمان بالعموم دو گرہوں میں بٹ گئے ایک گروہ اہل سنت و حدیث کا ہے۔ اور دوسرا اہل بدعت کا۔

منکرین رسالت کی تگ و ناز کا میدان بدعت ہے

دوسرے گروہ یعنی اہل بدعت کی اسلام پر عمل کی بجائے تمام تر توجہ نئے اور متوازی دین کی ایجاد پر مرکوز ہوگئی۔ انہوں نے اپنی اس سعی نامشکور سے اسلام اور وحی کے سر چشمہ مصفی کو مکدر کرنے مین کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا' اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم اور دین حق سے ہٹا کر اپنی خود ساختہ شریعت پر چلانے کیلیئے وہ تمام جاہلانہ' مشرکانہ' اور فسطائی حربے استعمال کیئے جو مشرکین مکہ نے رسالتماب فداہ ابی و امی کے خلاف استعمال کیئے تھے۔ تکمیل دین کے چودہ صدیاں بعد اسرائیلی من گھڑت شریعت کے دلائل کو بنیاد بنا کر اہل بدعت کے ایک کم سواد مصنف اور شریعت ساز اہل قلم نے تحریری اعتراف کیا کہ قبوری شریعت پر مبنی حق ان تک اب پہنچا ہے۔ اور کوشش یہ کی اسلام کے نظام عقائد و عبادات کے بالمقابل ایک نیا نظام بدعت متعارف کرا دیا جائے' علم و فضل' دیانت و امانت اور حیاء اور خوف خدا' سنجیدگی و متانت جیسی وہابی عادات سے مکمل احتیاط برت کر دجل و تحریف اور فریب کاری سے کھل کر کام لیا صدق رسول اللہ حیث قال - اذا لم تستحیی فاصنع ما شئت - البخاری الحدیث ۳۴۸۴ - ۶۱۲۰
3484 -6120

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا و هب لنامن لدنک رحمة انک انت الوهاب (آل عمران:۸)

''اے پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے۔ تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دیجیئو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما تو تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔''

مفتی احمد یار خان کی مذکورہ کتاب ''جاء الحق'' اہل بدعت' حاملین قبوری شریعت رضا خانی ٹولے میں ان کے مزاج کے مطابق ہونے کی وجہ سے کافی مشہور و مقبول ہے۔ اس میں مؤلف نے بدعت حسنہ کے جواز اور اس کی تائید پر مستزاد شرک کی ترویج و اشاعت کیلئے بڑی محنت کی ہے۔ انبیاء اور بزرگوں کو حاضر و ناظر' عالم الغیب' سمیع الدعاء حاجت روا' مشکل کشا اور فریاد رس ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مصائب و مشکلات میں انہیں مدد کیلئے پکارنے' ان کی قبروں پر حاضری' دعا و فریاد سجدہ و طواف' نذر و نیاز' عرس و فاتحہ اور ذبح و قربانی جیسے مراسم عبودیت ادا کرنے کو متن اسلامی ثابت کرنے کی بھی سعی لاحاصل کی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو شرک و بدعت آخری اور بدترین مقام پر لا کھڑا کرنے کی اس کتاب میں سب سے زیادہ اور بدترین کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے بعد شرک و بدعت کی تائید و جواز میں جو کتاب میں منظر پر آئی اس کے مصنف نے جاء الحق سے ہی استفادہ کیا اور مفتی صاحب کا نامہ اعمال ہی سیاہ کیا ہے۔ علماء بدعت کی بعد کی تمام کتابوں میں آپ کو تھوڑی بہت جزوی تبدیلی اور حک و اضافہ کے ساتھ اسی کتاب کے دلائل نظر آئیں گے۔

مؤلف دین الحق نے گویا بدعت حسنہ کی تائید میں جملہ دلائل کا علمی و تنقیدی جائزہ لیکر اس قبیل کی تمام کتابوں کی قلعی کھول دی ہے۔ اور مسلک حق کی کما حقہ وضاحت کر دی ہے۔ اور اب اہل فکر و دانش کے پاس اتباع کتاب و سنت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

و من یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی و یتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی و نصله جهنم و سآء ت مصیرا (النسآء ۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مؤمنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلے گا تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر کو ہی چلنے دیں گے اور پھر جہنم میں داخل کریں گے۔ اور برا ٹھکانہ ہے۔

اہل حق کا موقف اور طرز عمل

اس بے ھنگم تشریع اور بے سروپا عقائد سازی جس کے پیچھے حقیقۃ خاتم النبین رسول رب العالمین النبی الامین فداہ ابی و امی و روحی ﷺ کی گستاخی کارفرما ہے نے امت مسلمہ کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیا ہے امام الانبیاء کے فرمان صداقت برہان کے مطابق صرف طائفہ منصورہ اور جماعت حقہ ہی منہج نبوی و منہاج صحابہ پر قائم رہ سکی باقی تمام گروہوں نے یہودی و نصاری کے شریعت سازی کے کلبو کو اپنایا اور مغضوب علیہم اور الضآلین کے مصداق ٹھہرے۔ کچھ جانتے ہیں مگر نہیں مانتے اور کچھ بدنصیب جاننے کی بجائے لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون کی جاہلانہ پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

صراط مستقیم پر گامزن انبیآء و صدیقین شہداء و صالحین کے پیروکاروں کا اپنا الگ طرز عمل ہے۔ وہ صدیاں بیتنے کے باوجود اللہ تعالی کی توفیق خاص سے اتباع رسول اور سبیل المؤمنین سے سرمو تجاوز کرنے اور پرکاہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ۔

" اھدنا الصراط المستقیم ،،

پر مشتمل سورۃ الفاتحہ کی قرأت و تلاوت پر اصرار و تکرار کی برکت ہے۔ اللہ تعالی ہمیں اپنے ہاں منعم علیہم کے رفقہ طیبہ و مبارکہ میں شامل فرمائے۔

طائفہ منصورہ جماعت اہل حدیث کا موقف بالکل واضح ہے۔ کہ ہمارے جملہ عقائد و اُعمال کی تواتر عملی کے ساتھ اسانید موجود ہیں عصر نبوی و عہد صحابہ سے آج تک عقائد و اُعمال کے حاملین و عاملین کے حسب ونسب اور احوال و تراجم بھی معروف ہیں۔

اور جن اسفار مقدسہ اور کتب مبارکہ میں یہ دین حق مرتب و مدون ہے۔ اس کی اسانید بھی متواتر اور محفوظ ہیں اس حد تک واضح اور بیّن موقف اور روشن مسلک کے بعد اہل حق پر طعن و ملامت بدعقیدہ کی پھبتیاں کیا جواز رکھتی ہیں بالخصوص ایسے لوگوں کی طرف سے جن کا دین بے نام ونسب ہے اور کتب رطب و یابس پر مبنی بے اُصل و بے سند ان کے بارے میں ہم کچھ کہہ کر اپنی زبان اور کچھ لکھ کر اپنا قلم آلودہ نہیں کرنا چاہتے کہ ہمارے مولد کا یہی حکم ہے اور ہمارے اسلاف کرام کی بھی سنت ہے۔

فرمایا: خذ العفو وامر بالعرف و اعرض عن الجاھلین (الاعراف ۱۹۹) عفو اختیار

کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کر لو۔
اس چیرہ دستی اور ہوس پرستی کے دور میں

و اذا مروا باللغو مروا کراما (الفرقان ۷۲) اور جب انکو بیہودہ (لوگوں) کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز میں گذر جاتے ہیں

اہل حق نے ہمیشہ اس چیرہ دستی اور ہوس پرستی کے دور میں صبر و سکوت سے کام لیا اور دعوت وعزیمت پر کاربند رہے۔

مگر اہل زیغ وضلال اور دعاۃ شر و فساد کی روز فروزں دسیسہ کاریوں اور حق اور اہل حق پر بے جا حملوں نے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا ہے ہماری نئی نسل میں ایک ایسا گروہ میداں میں نکل آیا ہے جو دفاع کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا قائل ہے۔

و للناس فیمایعشفون و مذاهب

مگر حیرت ہوتی ہے کہ متانت وسنجیدگی کا سر رشتہ انہوں نے بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب دین الحق جس پر بہترین شاہد عدل ہے۔ مخالف کی چیر دستیوں اور جور و جفا کے باوجود اس کی خیر خواہی دعاۃ الحق کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے کہ فرمان نبوی (الدین النصیحۃ) کا یہی تقاضا ہے۔

انگریز نوازی

برصغیر ہندوستان میں انگریزی استعمار کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہاں کے مسلمان تھے۔ ان کی حریت پسندی کسی وقت بھی پردیسی حکومت کیلئے مسئلہ بن سکتی تھی ان کو معلوم تھا کہ بت پرست معاشرے میں ان کے تثلیثی دین کو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر اہل توحید انہیں کبھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اس لئے ان کے ظلم وستم کا نشانہ زیادہ تر مسلمان بالخصوص ازادی کے متوالے اور توحید وجہاد کے علمبردار ہی تھے۔

انگریزی حکومت کی تخم ریزی سے جو گروہ یہاں پیدا ہوئے انہوں نے دین کا حلیہ بگاڑنے

تحریف و تاویل اور دجل سے اسے آپنے آقاؤں کیلئے قابل قبول بنانے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی انگریز مخالف اہل حق پر ظلم ڈھانے' ان کو بد نام کرنے بلکہ انہیں ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

دور غلامی میں جہاں آپکو حکومتی ایوانوں میں مراعات یافتہ جاگیرداروں کی استقبالیہ قطاریں نظر آئیں گی وہاں درباریوں نذاریوں اور حضوریوں قبوریوں کی جبہ و دستار سمیت بدست جماعتیں بھی ملیں گی، اہل حق کے خلاف طوفان بدتمیزی اسی گروہ اشرار بپا نے کیا تھا ان کے آقاء ولی نعمت نے ان کو یہ خدمت تفویض کی تھی اس خدمت کے صلے میں۔

انہیں جائدادیں اور جاگیریں ملیں ۔ وہ جیلانی وگیلانی بخاری وچشتی اور سہروردی سجادہ نشیں بنے اورسب ہی سرکار کی خوشنودی سے شریف قرار پائے کسی کو مجددیت کا منصب بلند ملا۔ اور کسی کے سر میں سودائے نبوت کاذبہ تا قیامت روسیاہ کر دیا گیا۔ کہ مسلمانوں کو باہم لڑانے اور دین میں تحریف و دجل کا اس سے کم کیا صلہ ہوسکتا تھا

وقال الشیطان لما قضی الأمر ان الله وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلوموني ولوموا انفسکم ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخيّ انی کفرت بمآ اشرکتمون من قبل ان الظّالمین لهم عذاب الیم (ابراهیم ۲۲)

''حساب وکتاب کا فیصلہ ہونے کے بعد شیطان کہے گا۔ جو وعدہ اللہ نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا اور جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ جھوٹا تھا، اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا ہاں میں نے تم کو بلایا تم نے میرا کہنا مان لیا۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو ہی ملامت کرو نہ میں تمہاری فریاد رسی کرسکتا ہوں اور نہ تم میری فریادرسی کر سکتے ہو میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے مجھے شریک بناتے تھے بے شک جو ظالم ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

غلبہ حق

مذکورۃ الصدر گروہ کی تکفیر تشریع کا سلسلہ بڑا طویل ہے اور یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے، مشغلہ ان کا ہے تکفیر مسلم ھند، کافر ہے جس کو ہو ان سے ذرہ بھی اختلاف، مفتی احمد یار خان گجراتی کی

کتاب (جاء الحق) بھی سلسلہ دجلی وتحریف اور تکفیر کی ایک کڑی ہے گمراہوں کی ہلاکت و ضلالت اپنی جگہ مگر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب یا اس قبیل کی دوسری کتابیں مثلا تجانب اہل السنہ وغیرہ پڑھ کر کوئی ایک شخص بھی راہ حق سے نہ بھٹکا ہوگا کہ حق یہی ہے جب اس کی شناخت پاکیزہ دلوں میں داخل ہوتی ہے تو پھر نکلتی نہیں ان سے ان کے مؤلفین کا نامہ اعمال ضرور سیاہ ہوا ہوگا مگر کسی مخلص مسلمان کا دل کبھی ایسی واھیات سے سیاہ نہیں ہوسکتا یہ صرف خوش فہمی اور تغافل ہی نہیں بلکہ حقیقت واقعہ ہے کل جو اہل حدیث کو مسجدوں میں داخل نہ ہونے دیتے تھے داخل ہو جائیں تو مسجد دھوتے تھے ان کی مسجد نہ بننے دیتے تھے بن جائے توڑھا دیتے تھے۔ سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے فتوے دیتے تھے۔

ان کی مسجدوں کو ''کفار کی مسجد مثل گھر کے ہے،، قرار دیتے تھے (ملاحظہ ہو ملفوظات ج ا ص ۹۳)

وہابی سے مصافحہ کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے،، فتوے جاری کرتے تھے۔

کل تک خادم الفقراء اور سجادہ نشینان سرعالیہ ملکہ برطانیہ کی مدد سے ہمارا وجود ختم کرنے کے درپے تھے آج چند برسوں کے بعد انہیں اپنا وجود برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش ہے۔

فاما الزبد فيذهب جفاء و اما ما ينفع الناس فيمكث فى الارض (الرعد :١٧)

سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔

''جاء الحق'' کی حقیقت واقعہ اللہ تعالی نے ہمارے حق میں ان کے قلم سے رقم کروائی اور پھر اسے حقیقت کا روپ دیا۔ والحمد اللہ علی ذلک۔

آج کوئی شہر کوئی بستی کوئی محلہ بفضل اللہ ایسا نہیں جہاں توحید کے علمبرداروں کی مسجد یا مدرسہ نہ ہو، حق پھیل رہا ہے۔ باطل سمٹ رہا ہے وہ دن دور نہیں ہے جب توحید کے شرارے شرک کے خس وخاشاک کو بھسم کر دیں گے ہماری نسل نو نے ہر میدان میں قبر پرستوں کو چاروں شانے چت لٹا دیا ہے اب اللہ کی توفیق سے حق پھیل رہا ہے۔ اور اہل حق سوئے منزل گامزن ہیں اور اہل باطل اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور ہیں اس جنگ میں شکست ان کا مقدر ہے۔

نصیحت

کاش وہ نوشتہ دیوار پڑھیں اور یقین کر لیں کہ ان کے روحانی ہستیاں انگریز برصغیر سے جا چکے ہیں توحید خالص کا سراج منیرافق مشرق سے کب کا طلوع ہو چکا اس کی کرنیں شعائیں بن چکی ہیں حشر ونشر قریب ہے اتباع کتاب وسنت کے بغیر شفاعت نبوی نصیب نہ ہوگی اور شفاعت کے بغیر نجات نہ ہوگی۔

فرمایا:

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ و ما نزل من الحق ولایکونوا کالذین أوتو الکتب من قبل فطال علیھم الأمد فقست قلوبھم و کثیر منھم فاسقون (الحدید ۱۶)

کیا ابھی تک مؤمنوں کیلیئے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاد کرتے وقت اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے سنتے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتابیں دی گئیں۔ پھر ان پر مدت گذر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

نیز فرمایا:

فلیحذر الذین یخالفون عن أمرہ أن تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم (النور ۶۳)

تو جو لوگ ان کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیئے کہ ان پر کہیں کوئی آفت نہ پڑ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل نہ ہو جائے۔

و ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ولو أنھم اذ ظلموا انفسھم جآؤک فاستغفروا اللہ و استغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما (النسآء ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے اور یہ جب اپنے اوپر ظلم کر بیٹھے تھے اگر تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کے لئے بخشش مانگتے تو اللہ کو معاف کرنے والا اور مہربان پاتے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول زرین ان کے لئے کتنی بڑی نصیحت ہے فرمایا:

فان تراجع الحق خير من التمادی فی الباطل

یعنی حق کی طرف رجوع کرنا باطل پر اڑے رہنے سے بہتر ہے، اس لئے صرف اپنے باطل پر حق کا لیبل لگانے کی بجائے منزل من اللہ حق کی طرف رجوع کریں۔ اسی میں بھلا ہے۔

مؤلف کتاب

مؤلف کتاب برادر عزیز مولانا محمد داؤد ارشد کو اللہ تعالی نے علم وفضل رشد و ہدایت سے حظ وافر عطا فرمایا ہے نقد و جرح کے رموز و اسرار سے بخوبی واقف ہیں دشمنان دین کی خبر لینا خوب جانتے ہیں دین حق اور اہل حق کی خیر خواہی ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہتی ہے۔ فتنوں اور فتنہ بردازوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں جوں ہی کوئی فتنہ سر اٹھاتا ہے فورا سرکوبی کر دیتے ہیں۔

جزاہ اللہ عنا و عن المسلمین خیرا.

اس منجھے ہوئے ثقہ عالم دین مخلص نوجوان اور سلیقہ شعار مؤلف کی یہ تصنیف لطیف اور سعی مشکور اہل ایمان اور اصحاب توحید کا سرمایہ گراں مایہ اور یشف صدور قوم مؤمنین کا مصداق ہے۔

اللہ تعالی اسے عامۃ الناس کی ہدایت کا سبب بنائے اور مؤلف موصوف کیلئے ذخیرہ آخرت۔

یوم لا ینفع مال و لابنون الامن أتی اللہ بقلب سلیم

اور ہم سب کو اپنی مرضیات بجالانے کی توفیق نصیب فرمائے

و صلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ و صحبہ وسلم تسلیما کثیرا

حافظ عبد الرشید اظہر بن عبد العزیز

یکم ستمبر ۲۰۰۱ - اسلام آباد

خطبۂ رحمت للعالمینؐ

الحمد للّٰه نحمده و نستعينه و نستغفره و نعوذ باللّٰه من شرور انفسنا و من سيات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و اشهد ان محمداً عبده و رسوله اما بعد فان خير الحديث كتاب اللّٰه و خير الهدى هدى محمد و شر الا مور محدثاتها و كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة فى النار.

عرض مؤلف

لیجئے جناب، دین الحق فی تنقید جاء الحق ، (ای الباطل) کا دوسرا حصہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے،

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے دوسرے حصے کی تکمیل و اشاعت کی توفیق بخشی اور توقع سے زیادہ اس کو شہرت اور قبولیت عطاء فرمائی۔

اس حصہ میں رد بدعات اور ان کے جواز پر مفتی صاحب کے جوڑ توڑ کا علمی محاسبہ اور طلاق ثلاثہ وغیرہ پر مکمل و مدلل بحث ہے۔

اللہ کی توفیق سے اس جلد میں خاکسار نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی ضعیف و کمزور روایت کو درج نہ کیا جائے، اگر کسی جگہ ضعیف روایت کو نقل کیا ہے تو اس کے ضعف کو واضح کیا ہے، یا کم از کم ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی مقام پر بھی بنیادی استدلال ضعیف روایت سے نہیں کیا، وللہ الحمد۔

کتاب کی تیاری میں اصل کتاب اللہ اور سنت خیر الانام ﷺ کو بنایا ہے، آثار صحابہ کرام اور اقوال تابعین عظام اور فقہاء و محدثین کی عبارات کو ان کی تائید میں نقل کرتے ہوئے آخر میں مفتی صاحب کی ہر ہر دلیل کو مکمل نقل کر کے اس کا پورا پورا محاسبہ کیا ہے، علمی و تحقیقی جواب دیتے ہوئے ان کی تاویل بلکہ تحریف کو فقہاء احناف کی عبارات اور آئمہ لغت کی شہادت سے رد کرتے ہوئے صحیح و درست بات کی نشان دہی کی ہے،

گو اس سے کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے، مگر عوام الناس کی تفہیم کے لیے یہی مفید تھا، کیونکہ ہمارے مخاطب علماء دین نہیں بلکہ مبتدعین کے تربیت یافتہ بلکہ سند یافتہ جہلا ہیں،

کتاب کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ فصل اول میں بدعت کا رد کرتے ہوئے قرآن و سنت کی روشنی سے ثابت کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر مسنون عمل فلاں کام ہے اور یہ بدعت اس عمل مسنون کو محو کرنے والی ہے، دوسری فصل میں مفتی صاحب کا جواب تحریر کیا جاتا ہے، اور ان کے ایچ پیچ کا رد ہوتا ہے،

فرداً فرداً بدعات کی تردید سے پہلے بدعت کے رد میں ایک مفصل مقالہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں بدعت کی حقیقت اسلام میں اس کا صحیح محل اور آخر میں بدعات کے جواز پر مفتی صاحب کے دلائل کی حقیقت کا بیان ہے،

بدعات کے علاوہ اس حصہ میں طلاق ثلاثہ کے مسئلہ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی صاحب نے اس کو بدعات کے آخر میں درج کیا ہے،

مفتی صاحب کے دلائل کا رد کرتے ہوئے ان کے کسی حوالے پر اعتماد کرتے ہوئے، جواب تحریر نہیں کیا، کیونکہ مفتی صاحب کی راویانہ ثقات کا مسئلہ انتہائی حد تک مایوس کن ہے، وہ قرآن و حدیث کے مفہوم کو بگاڑنے اور اپنی طرف سے حک و اضافہ کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے، تحریف میں وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے،

بہرحال اہل علم جانتے ہیں کہ تصنیف کے میدان میں تخریج کا مرحلہ نہایت کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، مگر یہاں تو معاملہ ہی فروترین تھا، مفتی صاحب نقل درنقل پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی آیت یا حدیث یا کسی محدث وفقہی کی عبارت کو نقل کر کے آخر میں کتاب کا حوالہ دے دیتے ہیں، ابواب و صفحات کا التزام وہ سرے سے غیر ضروری سمجھتے ہیں،

علاوہ ازیں خاکسار کے پاس وسائل بھی نہایت محدود ہیں، کتب اسلامی کا نہایت مختصر ذخیرہ ہونے کے باوجود یہ کتاب دیہات میں بیٹھ کر کیسے تکمیل کے مراحل طے کر کے مرتب ہوگئی؟ یقین جانیئے کہ ایک ایک حوالے کے لیے متعدد لائبریریوں کے چکر لگانے پڑے، ان حالات میں، المعہد العالیہ، (ننگل ساہداں) کی لائبریری خاکسار کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی، پھر وہاں کے

منتظم حضرات کا تعاون بھی اپنے اندر جو خلوص و محبت کی مٹھاس رکھتا تھا اس کا تزکرہ نہ کرنا انتہائی ناسپاسی ہوگی، بفضل الٰہی اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ مفتی صاحب کی کسی بات کو ادھورا نقل کیا جائے نہ ان کی بات کے مفہوم کو بگاڑا جائے، بلکہ ان کے اصل منشاء و مقصود کو سامنے رکھ کر، جواب تحریر کیا جائے، اس بات میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے، اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کتاب میں تکرار نہ ہو مگر پھر بھی بعض مقامات پر بامر مجبوری ایسا ہوگیا ہے،

حسب وعدہ اس جلد میں قدامت اہل حدیث اور رد تقلید کا مضمون درج نہیں ہو سکا، اس کی وجہ کتاب کی ضخامت ہے، کوشش کے باوجود بعض مقام پر مضمون طویل ہوگیا، اس کی وجہ عوام الناس کی تفہیم اور مفتی صاحب کے تمام دلائل کا مکمل محاسبہ ہے،

تقریباً آٹھ صد صفحات کا یہ مضمون، جاء الباطل کے تقریباً اڑھائی صد صفحات کا مکمل و مفصل جواب ہے،

اگر اللہ تعالی کی توفیق شامل حال رہی اور زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ حسب وعدہ دین الحق چار جلدوں میں شائع ہوگی، فریق مخالف نے اگر کسی غلطی کی نشاندہی کی تو اسے خندہ پیشانی سے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا جائے گا، باقی رہے جذباتی حضرات جو دلائل کی بجائے گالیوں سے اتمام حجت کرتے ہیں تو انہیں مخاطب کرنے کا سرے سے ارادہ ہی نہیں،

کوشش کے باوجود اس حصہ میں لہجہ میں ترشی اور سختی آگئی ہے، اس کی وجہ مفتی صاجب کی تاویلات و تحریفات ہیں، حضرت استاذی المکرّم کی خواہش کے احترام میں بعض مقامات پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے، اللہ قبول فرمائے۔

ہمارے فاضل بھائی، مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ، اور حضرت شیخ نے پورے مسودہ کو پڑھا ہے اور مفید مشوروں سے نوازہ، مولانا عبدالرحمن عابد فاضل مدینہ یونیورسٹی نے بھی تقریبا اسی فیصد مسودہ پر نظر ثانی کی، یہ تمام بزرگ شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ ان کے عمل حسنہ کو قبول فرمائے، آمین یا الہ العالمین۔

ہمارے بھائی شفقت علی خاں صاحب (آف ڈنگہ متصل نارنگ) اور محمد زبیر صاحب (آف

صادق آباد) قابل ذکر ہیں جنہوں نے نہایت محنت اور اخلاص سے پروف ریڈنگ کی خدمات سر انجام دیکر راقم کی عملی معاونت فرمائی

فجذاهم الله احسن الجذاء

اے میرے پیارے اللہ تعالیٰ جو دلوں کی چھپی ہوئی بات کو جانتا ہے تیرے علم میں ہے کہ راقم نے یہ کتاب خالص تیری رضا و خوشنودی اور تیرے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کی محبت کے جذبہ میں تحریر کی ہے، اے اللہ اسے قبول فرما اور میرے لیے اسے توشہ آخرت اور کفارہ سیات بنا اور اس عمل حسنہ کے وسیلہ سے تیری جناب میں ملتجی ہوں کہ میری اولاد کو عالم باعمل بنا اپنے نبی کی سنت کا وفادار بنا، اسے ظاہر و باطنی خوبیوں سے نواز دے، وہ جب تک زندہ رہیں تیری توحید پر قائم رہیں۔ اس دار فانی سے دار البقا کی طرف جائیں تو حالت ایمان میں جائیں۔

اے میرے پیارے اللہ انہیں اپنے دین کے خادموں میں منتخب فرما، اے اللہ تو مالک کل ہے جو چاہے کرسکتا ہے، تو علیٰ کل شئی قدیر ہے تیرے خزانوں میں کس چیز کی کمی ہے، تو اپنی رحمت سے جس سے چاہے دین کی خدمت لے لے، اے اللہ جسے تو بلند کرے اسے کون گرا سکتا ہے، جسے تو اپنی رحمت کے لیے منتخب کرلے اسے تیرے پیار سے کون دور کرسکتا ہے۔

اے اللہ قادیانیت دین اسلام میں ایک بدترین فتنہ ہے میری اولاد کو توفیق دینا کہ وہ اس میں گراں قدر خدمات بجا لاسکیں، آمین یا الہ العلمین۔

اے اللہ میرے والدین اور اساتذہ کرام کو معاف فرما ان میں جو فوت ہو چکے ہیں ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور جو بقیہ حیات ہیں ان کی زندگی اور عمل حسنہ میں برکت ڈال دے اور جہاں جہاں علم و فضل کی مسندیں سجائے بیٹھے ہیں، ان میں برکات کاملہ نازل فرما اور ان کی مساعی جمیلہ کو درجہ قبولیت سے نواز دے۔

آمین یا الہ العلمین

آپکی دعاؤں کا محتاج فقیر بارگاہ صمدی ابوصہیب محمد داؤد ارشد

خطیب جامع مسجد محمدی اہل حدیث کوٹلی ورکاں، نزد نارنگ منڈی، شیخوپورہ

۲۷، رمضان ۱۴۲۰ھ

۷ جنوری دو ہزار ۲۰۰۰ء

باب

بدعات اسلام کی نظر میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعثت انبیاء کا مقصد

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد!

ھدایت انسان کی ایجاد نہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے آتی ہے انسان خواہ کتنا بھی عقل مند ہو جائے تب بھی اس کی عقل ناقص ہی رہتی ہے، ہم کسی بھی شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی عقل حرف آخر ہے اور عقل و دانائی اس پر ختم ہو گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کئی ایسی حقیقتیں ہیں جو ہمارے سامنے آچکی ہیں اور ان کی ایک بچہ بھی بخوبی خبر رکھتا ہے جبکہ یہی چیزیں ماضی قریب میں انسان کا دماغ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس ترقی کی معراج میں بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خداداد عقل انسانی یہیں کہیں ختم ہو گئی ہے، عین ممکن ہے کہ آنے والی نسلیں آج کے انسان کی عقل و شعور کا مذاق اڑائیں انہیں حقائق کی بنا پر مذھب کا تعلق انسان کی سوچ و بچار اور عقل و خرد پر نہیں رکھا گیا، بلکہ بنی آدم کی فلاح و بہبود کے لیے اللہ تبارک و تعالی نے انبیاء کرام کا مقدس سلسلہ جاری کیا، جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت خلد سے نکالا گیا تو ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ :۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (البقرة/۳۸)

ترجمہ۔ پس اگر میری طرف سے تم کو ھدایت پہنچے تو جو لوگ میری ھدایت کے تابع ہوں گے سو ان کو کچھ خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے (ثنائی)

اس آیت کریم میں اللہ تعالی نے وحی و نبی کی ضرورت بتادی کہ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف رب العزت کے ہاتھ میں ہے

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا :۔

﴿يَابَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (الأعراف/۳۵)

ترجمہ۔ اے آدم کے بیٹو اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے میرے رسول آویں جو تم کو میرے احکام سناویں تو جو ایمان لاویں گے اور صلاحیت اختیار کریں گے ان پر کوئی خوف نہ ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے،(ثنائی)

اس آیت میں اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ بنی آدم کی اصلاح انبیاء کرام کی تعلیم کی پیروی میں ہے اور اس تعلیم سے اعراض و مخالفت موجب خسران ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص دین میں بدعت ایجاد کرتا ہے تو وہ عملا انبیاء کرام کی تعلیم کو ناقص و ادھورا مانتا ہے اور وہ اپنے قول و عمل سے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ انبیاء کرام کی تعلیم سے زائد ھدایت بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں اپنی طرف سے عبادات اور ان کی کیفیت ایجاد کرنا بدعت ہے حضرت ابو ھریرہؓ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:۔

"لا تخصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالى ولا تخصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان يكون فى صوم يصومه احدكم".

جمعہ کی راتوں کو نوافل کے لیے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے مخصوص نہ کرو مگر یہ کہ کوئی شخص اگر روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن درمیان میں آجائے تو الگ بات ہے۔ (مسلم ص۳۶۱ ج۱)۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے کہہ رکھا ہے۔

"لا يتقدمن احدكم رمضان بصوم يوم او يومين الا ان يكون رجل كان يصوم صومه فليصم ذلك اليوم".

تم میں سے کوئی رمضان سے پہلے ایک یا دو دن کا روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اگر کوئی شخص روزے پہلے رکھ رہا تھا تو وہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔

بخاری ص۲۵۶ج۱، و مسلم ص۳۴۸ ج ۱، و ابوداؤد ص۳۳۹ ج ۱، و ترمذی مع تحفة ص۳۲ ج ۲، و نسائی ص۲۴۸ ج ۱، و ابن ماجہ ص۱۲۰، و مسند احمد ص۲۳۴ ج ۲، و الدارمی ص۸ ج۲،و السنن الکبری ص ۲۰۷ ج ۴، و الدار قطنی ص۱۶۰ ج ۲، و اللفظ للبخاری۔

اب دیکھئے کہ روزہ جیسی عظیم نیکی جس کے متعلق محبوب رب العلمین حضرت محمد ﷺ نے وعدہ دے رکھا ہے کہ ،روزے دار کے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں (بخاری ۲۵۵ و مسلم۲۵۹ ج۱) لیکن اس کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا حق رسول اللہ ﷺ نہیں دے رہے کہ وہ از خود اپنی طرف سے اس کی کیفیت ایجاد کر کے روزے رکھ لے، اسی طرح جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس بات کا علم ہوا کہ مسجد نبوی میں ایک ایسی محفل ذکر ہو رہی ہے جس میں ایک شخص کہتا ہے،سو بار (۱۰۰) اللہ اکبر پڑھو تو حاضرین کنکریوں پر سو دفعہ اللہ اکبر کہتے ہیں، پھر وہ کہتا ہے سو (۱۰۰) دفعہ کلمہ طیبہ کا ورد کرو تو وہ سو(۱۰۰)بار تہلیل پڑھتے ہیں، پھر وہ کہتا ہے سو (۱۰۰) دفعہ سبحان اللہ کہو تو وہ سنگریزوں پر سو بار تسبیح پڑھتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سے سوال کیا تم ان پر کیا پڑھتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھ رہے ہیں، تو آپؓ نے ان سے کہا

"فعدوا سيئاتكم فانا ضامن ان لايضيع من حسناتكم شيء وَيْحكم يا امة محمدﷺ ما اسرع هلكتكم هؤلاء صحابة نبيكم متوافرون و هذه ثيابه لم تبل، و آنيته لم تكسر.......او مفتتحوا باب ضلالة؟.

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کرو ،میں اس بات کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوگا۔

اے امت محمد ﷺ تم پر افسوس ہے کہ کتنی جلدی تم ھلاکت میں پڑ گئے ہو جبکہ ابھی محمد ﷺ کو دیکھنے والے تم میں بہت زیادہ موجود ہیں علاوہ ازیں ابھی تو جناب رسول اکرم ﷺ کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور آپ علیہ السلام کے برتن نہیں ٹوٹے اور تمہاری یہ حالت

ہے کہ تم بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو، سنن لدارمی ص۹۷ ج ۱ ،باب فی کراھیۃ اخذالرای، رقم الحدیث ۲۰۴)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فرمان سے ثابت ہوا کہ اپنی طرف سے از خود کوئی نیکی ایجاد کرنا گمراہی و بدعت ہے، اب اگر کوئی سرپھرا یہ کہتا پھرے کہ لو جی سبحان اللہ، کلمہ طیبہ اور تکبیر کا ورد بھی بدعت ہے، تو دین پھر کس چیز کا نام ہے؟ ہم ان سے بس یہی گزارش کریں گے کہ بھائی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مطلب یہی تھا کہ گو ان اذکار کی بہت کچھ فضیلت ہے اور محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طریقہ جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام سے مروی نہیں بلکہ یہ خود ایجاد بندہ ہیں لہذا بدعت و گمراہی ہے اور یہی فقہ حنفی میں لکھا ہے،

چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفیؒ کنزالدقائق کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

”لا ن ذکر اللہ تعالی اذا قصد بہ التخصیص بوقت دون وقت اوبشئی دون شئی لم یکن مشروعا حیث لم یرد الشرع بہ لانہ خلاف المشروع“.

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی خاص وقت میں مخصوص کرلیا اور دوسرے وقت میں وہ نہ ہوا یا کسی چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر مخصوص کر لیا اور دوسری چیز کے ساتھ وہ نہ کیا، تو وہ مشروع نہ ہوگا اس لیئے کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں آئی لہذا وہ خلاف شرع ہوگا۔ (البحرالرائق ص ۱۵۹ ج ۲)

شریعت کے راستہ پر چلنا ہی ھدایت ہے

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں :۔

(۱) فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى * وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

أَعْمَى ﴾ (طه/١٢٣-١٢٤)

ترجمہ۔ پھر اگر تم کو میری طرف سے ھدایت پہنچے پس جو کوئی میری ھدایت کا پیروکار ہوگا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ بدنصیب اور جو کوئی میری نصیحت سے منہ پھیرے گا پس اس کی تمام زندگی بدنصیبی کی ہوگی اور قیامت کے روز اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔(ثنائی)

(۲) ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلاَ يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلاَّ خَسَارًا ﴾ (بني إسرائيل/٨٢)

ترجمہ۔اور ہم قرآن کو ایمان داروں کے لیے شفاء اور رحمت کرتے ہیں اور ظالم اس سے سراسر نقصان ہی اٹھاتے ہیں (ثنائی)

(۳) ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا * فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴾ (النساء/١٧٤-١٧٥)

ترجمہ۔ لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک راہنما (حضرت محمد ﷺ) تمہارے پاس آچکا اور ہم نے کھلا نور تمہاری طرف اتارا ہے پس جو لوگ اللہ کو مانیں گے اور اسی سے مضبوط تعلق کریں گے تو اللہ ان کو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کرے گا اوران کو اپنی طرف سیدھے راستے پر پہنچادے گا(ثنائی)۔

(٤) قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ * يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴾ (المائدة/١٥-١٦)

ترجمہ۔ تمہارے پاس اللہ کا نور اور روشن کتاب آئی جو لوگ خدا کی رضا مندی کے طالب ہیں اس کتاب کے ذریعے خدا ان کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور ان کو راہ راست دکھاتا ہے (ثنائی)

(۵) ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ﴾ (حم السجدة/٤٤) .

ترجمہ۔ تو کہہ یہ (قرآن) ماننے والوں کے لئے ھدایت اور شفا ہے (ثنائی)

ان آیات بینات سے یہ بات واضح ہوئی کہ بنی آدم کو گمراہی سے نکال کر ھدایت کی طرف لانے والا قرآن اور صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔

کامیابی فقط اتباع رسول ﷺ میں ہے

(۱) ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ(٣١)قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ﴾ (آل عمران/٣١-٣٢) .

ترجمہ۔ تو کہہ دے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے پیچھے چلو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا خدا بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے تو کہہ دے کہ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو کافر خدا کو نہیں بھاتے (ثنائی)۔

اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی نجات اپنے تجویز کردہ راستوں میں نہیں، بلکہ اتباع رسول ﷺ میں ہے۔

(۲) ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُوْلُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ(٥١)وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ

فَأُوْلَـٰـئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴾ (النور/۵۱-۵۲)

ترجمہ۔ پکے ایمانداروں کو جب اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان میں فیصلہ کرے تو ان کا جواب بس یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور تابع ہیں یہی لوگ کامیاب ہیں جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کریں گے اور خدا سے ڈرتے رہیں گے اور بچیں گے بس وہی لوگ کامیاب ہوں گے (ثنائی)

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾ (الأحزاب/۷۱)

ترجمہ۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرے گا وہ ضرور مراد پائے گا (ثنائی)

خلاصہ ان آیات بینات کا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی فقط اتباع رسول میں ہے، آیت اول میں یہ وعدہ دیا جارہاہے کہ اگر اللہ تعالی کی محبت و شفقت حاصل کرنی ہے تو میرے نبی کی پیروی کرو کہ میری رحمت کے حصول کا فقط یہی راستہ ہے

نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر عمل کرنا گمراہی ہے

ارشاد رب العلمین ہے

(۱) ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ (الحجرات/۱)

اے ایمان والو ! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھا کرو اور اللہ ہی سے ڈرتے رہو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے (۴۹۔۱) ثنائی)

اس آیت کا یہی مفہوم ہے کہ شرعی امور میں اللہ تعالی اور رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اجازت کے بغیر کوئی کام از خود نہ کیا کرو ورنہ تم طاغی بدعتی بن جاؤ گے کیوں ؟ اس لئے کہ ایمان کا پہلا اور بنیادی تقاضا یہ ہے، کہ جو شخص اللہ کو رب اور رسول اللہ ﷺ کو اپنا

ہادی مانتا ہو، وہ اپنے اس عقیدے کی سچائی میں اپنی رائے اور خیال کو اللہ و رسول ﷺ کے فیصلے پر مقدم نہ رکھے، چنانچہ فاضل بریلی کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں مولوی نعیم الدین مراد آبادی لکھتا ہے،

اصلاً تم سے تقدیم واقع نہ ہو نہ قول میں نہ فعل میں کہ تقدم کرنا رسول ﷺ کے ادب و احترام کے خلاف ہے (ص ۷۴۵ حاشیہ ۲) خود حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے، کسی چیز میں بھی حضور سے آگے بڑھنا منع ہے کیونکہ یہاں **لَا تُقَدِّمُوْا** مطلق ہے،(نور العرفان ص ۸۲۲)

ان عبارات سے واضح ہے کہ نبی ﷺ سے بڑھ کر یعنی مزید کسی فعل کا کرنا ادب رسول ﷺ کے خلاف ہے، تو معلوم ہوا کہ دین میں جتنی یار لوگوں نے بدعتیں ایجاد کر رکھی ہیں وہ تمام کی تمام اس آیت کی زد میں آتی ہیں اور ان کے کرنے والے بقول مولوی نعیم الدین مراد آبادی رسول اللہ ﷺ کے گستاخ اور بے ادب ہیں اور ان کا وہ فعل احترام نبوی علیہ التحیۃ والسلام کے منافی ہے،

اللہ رب العلمین نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔

(۲) ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدۃ/۳) .

ترجمہ۔آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کی ہے اور میں نے اسلام کو تمہارا مذھب پسند کیا ہے (ثنائی)

تکمیل دین سے تکمیل ھدایت مراد ہے اور، **اَتْمَمْتُ**،کسی چیز کا تمام اس درجہ تک پہنچ جانا ہوتا ہے جب وہ خارج میں کسی کی محتاج نہ ہو اور جو چیز اپنے سے خارج کی محتاج ہو وہ ناقص کہلاتی ہے،

جیسا کہ امام راغبؒ نے صراحت کی ہے :۔

تمام الشئی انتھاؤہ الی حد لایحتاج الی شیء خارج عنه والناقص مایحتاج

الی الشیء خارج عنه. (المفردات فی غریب القرآن ص ۷۵).

قارئین جب آپ نے مذکورہ دلیل فرقانی کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب آیئے مبتدعین کی اختراعات کی طرف کہ یہ حضرات ان بدعات کو دین کا ایک حصہ و جز تصور کرتے ہیں اور ان کے بغیر مسلمانوں کے ایمان کو ادھورا و ناقص قولی و عملی طور پر یقین کرتے ہیں اور منکرین پر نجدیت و وہابیت کا فتویٰ لگاتے ہیں اور اپنے امتیازی مسائل گردانتے ہیں بلکہ اہل سنت کی علامت بتاتے ہیں،

تو آپ ہی بتایئے کہ ان کا یہ قول و عمل مذکورہ آیت قرآنی کی رو سے مردود نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ قرآن نے تو صاف بتا دیا ہے کہ میری ھدایت اپنی ذات میں اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے کہ خارج میں کسی ھدایت کی محتاج نہیں، اور یہ حضرات اس کے بالکل برعکس بدعات کو بھی ھدایت تصور کرتے ہیں

(۳) ﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ﴾ (الشوری/۲۱)

ترجمہ۔ کیا ان لوگوں کے شریک ہیں جنہوں نے ان کے دین میں ایسے کاموں کی اجازت دے رکھی ہے جن کی بابت خدا نے حکم نہیں بھیجا (الشوری ۴۲۔ ۲۱)

وہ لوگ جنہوں نے اپنی طرف سے دین ایجاد کیا یا دین میں ایسی بدعات ایجاد کیں جن کا اللہ رب العزت نے حکم نہیں دیا تھا، اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی قبیح اور بری تھیں اور ان کے موجد و فاعل اس قدر بد باطن اور منحوس تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے آگے فرماتے ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (الشوری/۲۱)

اگر فیصلہ کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ کیا جاتا اور ظالموں کو سخت دکھ کا عذاب ہوگا (۴۲۔۲۱)

(٤) وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ (النحل/۱۱۶)

ترجمہ۔ اور اپنی زبانوں کے جھوٹے بیان سے نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ کے بہتان باندھنے لگو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا کرتے ہیں ہر گز بامراد نہ ہوں گے (۱۶۔۱۱۶)

اس دلیل فرقانی سے معلوم ہوا کہ اپنی نفسی خواہش سے کسی چیز کو حرام کہنا اللہ رب العزت پر جھوٹا بہتان باندھنا ہے اور اسی طرح کسی چیز کو حلال قرار دینا بھی اللہ تبارک و تعالیٰ پر افتراء ہے

الغرض یہ آیت قرآنی بدعات کے رد میں برھان واضح ہے امام ابن کثیر اپنی تفسیر قرآن عظیم میں اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

ویدخل فی هذا کل من ابتدع بدعة لیس له فیها مستند شرعی او حلل شیئا مما حرم الله او حرم شیئا مما اباح الله بمجرد رأیه و تشهیه،(ص ۵۹۰ ج۲)

اور اس میں وہ تمام اشخاص داخل ہیں جنہوں نے دین میں کوئی ایسی بدعت نکالی جس میں ان کے پاس کوئی دلیل شرعی نہیں یا جنہوں نے فقط اپنی رائے اور چاہت سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال یا اللہ تعالیٰ کی مباح کردہ چیز کو حرام قرار دے دیا ہو،۲۔ ۵۹۰)

صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظر میں بدعت

(۱) بدعتی کی حمایت کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

لعن الله من لعن والدیه و لعن الله من ذبح لغیر الله و لعن الله من اوی محدثا و لعن الله من غیر منار الارض،

اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اس شخص پر جو اپنے والدین پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے جو بدعتی کو پناہ دے اور جو زمین کی حدیں تبدیل کرے۔ (صحیح مسلم ص ۱۶۰ ج ۲، و مسند امام احمد ص ۱۱۸ ج ۱ رقم ۹۵۷ و نسائی ص ۲۰۰ ج ۲، و ابو یعلی ص ۲۹۸ ج ۱)۔

(۲) بدعی اعمال اللہ کے ہاں مردود ہیں

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھورد،

جس کسی نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو دین میں نہیں ہے تو وہ کام اللہ کے ہاں مردود ہے۔

(بخاری ص ۳۷۱ ج ۱، و مسلم ص ۷۷ ج ۲، و ابوداوٗد ص ۲۷۹ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۳، و مسند امام احمد ص ۷۳، ۱۴۰ ج ۶،

(۳) بدعتی کی توبہ قبول نہیں جب تک بدعت کو نہ چھوڑے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں :۔

قال رسول الله ﷺ ان الله حجب التوبة عن صاحب كل بدعة.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

(طبرانی اوسط ص ۱۱۳ ج ۵، رقم الحدیث ۴۲۱۴ و مجمع الزوائد ص ۱۹۲ ج ۱۰)۔

علامہ منذری نے اسکی سند کو حسن کہا ہے، الترغیب ص ۸۶ ج ۱، اور ھیثمی نے اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے،

بدعت جاری کرنے والے پر اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں نبی ﷺ نے فرمایا:۔

المدينة حرم من كذا الى كذا لا يقطع شجرها ولا يحدث فيها حدث من احدث فيها حدثا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين.

مدینہ طیبہ حرم ہے فلاں مقام سے لیکر فلاں جگہ تک نہ تو اس کا درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس میں کوئی بدعت ایجاد کی جائے، جو اس میں کوئی بدعت رائج کرے اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔
(صحیح بخاری ص ۲۵۱ ج ا و مسلم ص ۴۴۱ ج ۱)۔

(۵) بدعتی کی فرضی و نفلی عبادات قبول نہ ہوں گی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

المدينه حرم من عير الى كذا فمن احدث فيها حدثا فعليه لعنةالله والملائكة،، والناس اجمعين لا يقبل الله منه صرفا ولاعدلا. (الحديث).

مدینہ طیبہ مقام عیر سے لیکر وہاں (ثور تک، کمافی روایۃ الاخری مسلم ۱/ ۴۴۲) حرم ہے۔ سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، اس کی فرضی عبادات اور نہ ہی نفلی عبادات قیامت کے روز اللہ تعالیٰ قبول کرے گا، صحیح بخاری ص ۱۰۸۴ ج ۲، و مسلم ص ۴۴۲ ج ا۔

حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:۔

المدینة حرم فمن احدث فیھا حدثا او آوی محدثا فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین لا یقبل منه یوم القیامة عدل ولا صرف.

مدینہ منورہ حرم ہے، پس جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو یہاں پناہ دی، اس پر اللہ تعالی کی، ملائکہ کی، تمام لوگوں کی لعنت ہو، اس کی قیامت کے روز کوئی فرضی و نفلی عبادت قبول نہ ہوگی، صحیح مسلم ص ۴۴۲ ج ۱،

فائدہ جلیلہ

حکومت سعودیہ نے جو مبتدعین کے لٹریچر اور ان کے اکابرین پر پابندی لگا رکھی ہے ان کے اس عمل کی دلیل یہ حدیث طیبہ ہے

بدعت کا لغوی معنی

(۱) علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں :۔

والبدعة. الحدث وما ابتدع من الدین بعدالاکمال،

یعنی بدعت ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو (لسان العرب ص۶ ج ۸)

(۲) علامہ زمخشری المتوفی سن ۵۳۸ ھ جو کہ بلاشبہ لغت عرب میں امام اور حجت ہیں فرماتے ہیں، ابدع الشی وابتدعہ، اخترعہ۔

یعنی بدعت ایک نئی من گھڑت چیز کو کہتے ہیں، اساس البلاغۃ ص ۱۷

(۳) امام راغب فرماتے ہیں :۔

والبدعة فی المذھب ایراد قول لم یستن قائلھا وفاعلھا فیه بصاحب الشریعة واما ثلھا المتقدمه واصولھا المتقنة.

بدعت کا مذھب میں اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا قائل اور فاعل صاحب شریعت

کے نقش قدم پر نہ چلا ہو اور شریعت کی سابق مثالوں اور اس کے اصول پر وہ گامزن نہ ہو، المفردات فی غریب القرآن ص ۳۹۔

(۴) علامہ وحیدالزمان حیدرآبادی فرماتے ہیں :۔

ایک نئی چیز نکالنا یا پیدا کرنا جس کی کوئی مثال پہلے نہ ہو، لغات الحدیث جلد اول ص ۲۸ ب

ان محکم اور ٹھوس حوالاجات کتب لغویہ سے ثابت ہوا کہ لغت میں بدعت کا اطلاق ایسے قول و فعل پر ہوتا ہے جس کی ایجاد بلا کسی سابقہ مثال کے ہو، انہیں معنوں میں قرآن حکیم میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے

بدیع السمٰوٰت والارض

نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا (البقرہ ۱۱۷) ترجمہ احمد رضا خان بریلوی)

اب ظاہر ہے کہ یہاں قرآن نے بدیع کا لفظ بغیر کسی مثال سابق کی ایجاد پر بولا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم فرمایا کہ

قل ما کنت بدعا من الرسل ،

تم فرماؤ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ،(الاحقاف ۹) ایضا)

اس آیت کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبانی یہی بات کہلائی ہے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں، یعنی میں کوئی پہلا رسول تو نہیں جس کی سابقہ زمانہ میں مثال نہ ملتی ہو بلکہ رسالت کا سلسلہ تو ابتدا آدم سے ہی چلا آرہا ہے، خود حضرت مفتی صاحب یہاں تک ہمارے ساتھ متفق ہیں لکھتے ہیں کہ، مرقاۃ شرح مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں ہے

قال النووی البدعۃ کل شئی عل علی غیر مثال سبق،

بدعت وہ کام ہے جو بغیر گزری مثال کے کیا جائے ، جاء الباطل ص ۲۲۴ ج ۱،

(نوٹ) امام نووی کی اس عبارت کے لیے دیکھئے شرح مسلم ص ۲۸۵ ج ۱،

(جاء الباطل میں یہ لفظ عبل ہے جو غلط ہے) (ی)

بدعت کا شرعی معنی

شریعت میں بدعت ایسے قول و فعل کو کہتے ہیں جو دین میں اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے اختراع کیا گیا ہو

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الهدی هدی محمد ﷺ و شر الا مور محدثاتها و کل بدعة ضلالة (الحدیث)

اما بعد! بہترین کلام اللہ تعالی کی کتاب ہے اور بہترین ھدایت محمد ﷺ کی ھدایت ہے اور بدترین وہ کام ہیں جو نئے گھڑے جائیں (اور ہر نیا کام بدعت ہے)اور ہر بدعت گمراہی ہے (صحیح مسلم ص ۲۸۵ ج ۱، و ابن ماجہ ص ۶ واللفظ لہ،

اس حدیث کے ایک اور طریق میں اس کی صاف وضاحت ہے کہ

ان اصدق الحدیث کتاب اللہ واحسن الهدی هدی محمد و شر الامور محدثا تها و کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار،الحدیث،

بلاشبہ سب سے سچی بات اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سب سے بہترین ھدایت حضرت محمد ﷺ کی ہے اور بدترین کام وہ ہیں جو نئے ایجاد کیے جائیں اور ہر نیا ایجاد شدہ کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں (لے جانے والی) ہے، سنن نسائی ص ۱۸۸ ج ۱۔

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے بدعت اور ھدایت کا تقابل کر کے بات کو واضح کر دیا ہے کہ آنخضرت ﷺ کی ھدایت کے خلاف جو بھی ایجاد کیا جائے گا وہ بدعت ہے، اس سے یہ بات بھی کھل گئی کہ ہر بدعت بُری نہیں تاکہ جدید سائنسی ایجادات کو اس میں شامل کر لیا جائے، جیسا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہا اور محدثین کے خلاف ہے، حدیث میں کل محدث

بدعۃ (مشکوۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے، اس میں دینی یا دنیاوی کی قید نہیں، جاء الباطل ص ۲۲۳،

کیا بدعت شرعی میں دین کی قید ہے؟

اولا حضرت مفتی صاحب نے جو بھی رقم فرمایا ہے یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، پھر اس پر جو حدیث نقل کی ہے اس کے الفاظ بھی صحیح درج نہیں کئے جبکہ درست الفاظ ،محدثۃ) ہیں ثانیا ان کی درج کردہ حدیث وہی ہے جو ہم پہلے بحوالہ عرض کر چکے ہیں ان کا حق تھا، پوری حدیث عوام کے سامنے لاتے تاکہ وہ خود فیصلہ کر لیتے کہ ھدایت رسول ﷺ کے بالمقابل یہ لفظ بولا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ ھدایت رسول ﷺ فقط دینی امور میں ہے، دنیاوی امور میں تو انہوں نے خود کہا ہے کہ ،

انتم اعلم بامر دنیا کم، صحیح مسلم ص ٢٦٤ ج ٢،

تم اپنی دنیا کے امور کو زیادہ جانتے ہو،

ثالثا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث میں دین کی قید موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھورد،

جس کسی نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی، بخاری ص ۳۷۱ ج ۱، و مسلم ص ۷۷ ج ۲، و ابوداؤد ص ۲۷۹ ج ۲ ، و ابن ماجہ ص ۳، و مسند احمد ص ۷۳ و ص ۱۴۰ ج ۲ ،حافظ ابن حجر اس حدیث کا معنٰی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، **من اخترع فی الدین** (یعنی جو دین میں اختراع کی جائے) فتح الباری ص ۲۳۰ ج ۵)

فی امرنا ھذا، کا معنی ملا علی قاریؒ نے، ای فی دین الاسلام، کیا ہے، مرقاۃ ص ۲۲۵ ج ۱، شیخ عبدالحق محدث دھلوی حنفی نے ، دردین ما ، کیا ہے ، اشعۃ اللمعات ص ۱۳۴ ج ۱ ،یعنی دین اسلام میں، یہی معنی اس حدیث کا بریلوی مکتب فکر کے معروف شیخ الحدیث مولوی غلام رسول

سعیدی صاحب نے، شرح صحیح مسلم ص ۱۵۵ ج ۵ ، میں کیا ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے یہی معنی کیا ہے، مرات المناجیح ص ۱۴۵ ج ۱،

ان حنفی تراجم سے ثابت ہو گیا کہ دین کی قید ہماری اختراع نہیں بلکہ نبی رحمت رسول مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیان کردہ ہے

اور اس سے انکار محض مبتدعین علماء بریلویہ کی ضد ہے، اور بس!

اکابرین علماء اھل حدیث

اس حدیث سے اکابرین علمائے اہل حدیث نے بھی یہی سمجھا ہے کہ .فی امرنا ھذا، سے مراد امر دین ہے چنانچہ حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دھلویؒ کے شاگرد خاص اور شارح سنن ابی داؤد حضرت مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں ،فی امرنا ھذا، ای فی دین الاسلام ، عون المعبود ص ۳۲۹ ج ۴ ،

یعنی، فی امرنا ھذا، سے دین اسلام مراد ہے مولانا عبیداللہ رحمانیؒ نے بھی یہی لکھا ہے ، مرعاۃ المفاتیح ص ۲۳۶ ج ۱ ،

حضرت مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی فرماتے ہیں

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھورد،

جو دین میں نیا کام جاری کرے وہ مردود ہے (فتاوی اھل حدیث ص ۶۵۵ ج ۲)

علماء بریلویہ

مولوی غلام رسول سعیدی کا حوالہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، اسی طرح فریق ثانی کے ایک نامور مولوی عبدالسمیع رامپوری لکھتے ہیں ،

یہ صحیحین کی حدیث ہے یعنی جس نے نکالی ہمارے اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنت کے مخالف ہے وہ بات اس کی رد ہے ،

(انوار ساطعہ مع براھین قاطعہ ص ۴۴ ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی سن ۱۹۸۷ء،)

مفتی صاحب کے مجدد ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خاں صاحب تمباکو کی حلت و

حرمت پر بحث کرتے ہوئے اسے حلال و مباح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں، رہا اس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعث ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ امور دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے،

رسالہ حقۃ المرجان لمھم حکم الدخان ص ۳، مندرجہ فتاوی رضویہ ص ۴۱ ج ۱۱، واحکام شریعت حصہ سوم مسئلہ نمبر ۳۷، ص ۲۶۰،

مولوی محمد صدیق حنفی بریلوی لکھتا ہے کہ

(بدعت) دین میں جو نیا کام بغرض ثواب جاری کیا جائے،

بدعت کی حقیقت صفحہ ۴۱

بریلویت کا مشہور واعظ مولوی منور حسین عثمانی رضوی لکھتا ہے

بدعت کا اصطلاحی معنی ہے امور دینیہ میں جو کام ثواب کے لیے ایجاد کیا جائے، رد شرک وبدعت ص ۳۲۷، فریق ثانی کے جید علماء سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ شرعی بدعت فقط وہی ہے جو دین میں نکالی جائے اور بقول مولوی احمد رضا خاں گو حقہ بدعت ہے مگر دنیاوی امور میں ہونے کی وجہ سے اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی بدعت دین میں داخل نہیں، لہذا اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے۔

علماء سلف سے بدعت شرعی کی تعریف

حضرت مفتی صاحب نے ایک یہ بھی دعوی کیا ہے کہ علماء سلف محدثین فقہاء عظام سے بدعت شرعی کے معنی میں دین کی قید مروی نہیں! حالانکہ یہ مفتی صاحب کا خالص مغالطہ اور سو فی صد غلط بیانی ہے، اس بدایونی جھوٹ کے متعلق ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، لیکن مبتدعین کی مزید تسلی کے لئے ہم اس مقام پر چند اور عبارات اکابر بھی نقل کرتے ہیں تاکہ مفتی صاحب کی مکاری و عیاری سے پورا پورا پردہ اٹھ سکے علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ

البدعة كل ما قيل او فعل مما ليس له اصل فيما نسب اليه ﷺ وهو الدين كل مالم يات فى القرآن ولا عن رسول الله ﷺ (یعنی بدعت اسے کہتے

ہیں جس کی اصل رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو اور دین میں قرآن و سنت سے اس پر کوئی دلیل نہ ہو،

الاحکام فی اصول الاحکام ص ۷۴ ج ۱،

اما ابن رجب فرماتے ہیں کہ

والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشریعة یدل علیه فاما ما کان له اصل مین الشرع یدل علیه فلیس ببدعة شرعا و ان کان بدعة لغة،

یعنی بدعت سے مراد نو ایجاد چیز جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو جو اس پر دلالت کرے، بہر حال جس کی شریعت میں کوئی اصل ہو جو اس پر دلالت کرے وہ شرعی بدعت نہیں اگرچہ وہ لغت کے اعتبار سے بدعت ہو،

جامع العلوم والحکم ص ۱۲۷ ج ۲

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

والبدعة علی قسمین، تارة تکون بدعة شرعیة کقوله، فان کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة و تارة تکون بدعة لغویه، کقول امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی الله عنه عن جمعه ایاهم علی صلاة التراویح واستمرارهم، نعمت البدعة هذه،

اور بدعت کی دو قسمیں ہیں (۱) بدعت شرعی، جیساکہ روسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، (۲) بدعت لغوی، جیساکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تراویح اکھٹے پڑھنے کے متعلق فرمایا کہ یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے، تفسیر ابن کثیر ص۱۶۱ ج ۱ طبع بیروت ۱۳۸۸ھ علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ

طریقة فی الدین مخترعة تضا هی الشریعة یقصد بالسلوك علیها المبالغة فی التعبد لله سبحانه،

یعنی دین کے اندر ایسا نو ایجاد طریقہ جو شریعت اسلامیہ کے مشابہ ہو اور اس پر عمل

کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ کرنا مقصود ہو، للاعتصام ص ۳۷ ج ۱

علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں کہ

والبدعة الحدث ومابتدع من الدین بعد الاکمال.

بدعت نئی چیز کو کہتے ہیں جو دین میں اس کی تکمیل کے بعد نکالی گئی ہو (لسان العرب ص ٦ ج ۸،

امام ابن الاثیر اپنی معروف کتاب ،النھایہ، میں فرماتے ہیں

کل محدثة بدعة إنما یرید ماخالف اصول الشریعة ولم یوافق السنة،

کل محدثۃ بدعۃ (کی حدیث) کا معنی یہ ہے کہ جو چیز اصول شریعت کے خلاف ہو اور سنت مصطفیٰ ﷺ کے موافق نہ ہو، کذافی لسان العرب ص٦ ج ۸۔

علامہ مرتضٰی الزبیدی حنفی (المتوفی سن ۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس شرح قاموس ص ۲۷۱ ج ۵ ، میں انہیں الفاظ سے بدعت شرعی کا معنی کیا ہے

آخر میں ہم علامہ وحیدالزماں مرحوم حیدر آبادی کی ایک عبارت بھی ذکر کردیتے ہیں، کیونکہ مبتدعین اکثر ان کی ادھوری عبارات ذکر کر کے فتح حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں چنانچہ آپ بدعت کی تحقیق اور تنقیح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اور قول محقق یہ ہے کہ بدعت لغوی کی دو قسمیں ہیں حسنہ اور سیئہ لیکن بدعت شرعی ہمیشہ سیئہ ہوتی ہے جیسے حدیث میں ہے،

کل بدعة ضلالة (لغات الحدیث جلد اول کتاب ،ب، ص ۳۰ مادہ بدع،

قارئین آپ نے ان محکم اور ٹھوس حوالہ جات کو جب بغور پڑھ لیا ہے تو پھر آپ اس نتیجہ پر بھی یقیناً پہنچ چکے ہوں گے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو چیز دین میں نئی نکالی گئی ہو اگر چہ وہ عقیدہ یا عمل یاحال ہو تو وہ بدعت ہے۔

بدعت کے شرعی معنی پر مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

فرماتے ہیں اگر مان بھی لیا جائے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اسی کو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے مستحبات، نوافل واجبات فرائض سب دینی کام ہیں کہ اس کو آدمی ثواب کے لیے کرتا ہے اور دنیا کا کوئی کام نیت خیر سے کیا جائے اس پر ثواب ملتا ہے (یہ ہے مفتی صاحب کے اعتراض کا خلاصہ خیر سے اس پر انہوں نے بزعم خود دلائل بھی دیئے ہیں) جاء الباطل ص ۲۲۳،

الجواب

اولاً اسلام دو چیزوں کا نام ہے، عقائد اور اعمال، پھر اعمال میں دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے تو دوسرے کا حقوق العباد سے، مفتی صاحب نے خیر سے جن کاموں کو دنیاوی قرار دیا ہے کہ مسلمان سے خندہ پیشانی سے ملنا صدقہ کا ثواب رکھتا ہے، اپنے بچوں کو پالنا نیت خیر سے ہو تو ثواب ہے لہذا مسلمان کا ہر دنیاوی کام دینی ہے اب بتاؤ کہ نیت خیر سے پلاؤ کھلانا بدعت ہے یا نہیں، جاء، الباطل ص ۲۲۳۔

حالانکہ یہ خالص شرعی اور دینی کام ہیں ہم حکیم الامت کے مکتب فکر کے علماء سے پوچھتے ہیں کہ، حقوق العباد، دین اسلام میں داخل ہیں کہ نہیں؟ اگر جواب مثبت میں ہے، تو بتائیے پھر مسلمان سے ناراض رہنا بال بچوں کی پرورش نہ کرنا بے دینی ہے کہ نہیں؟ اگر ہے یقیناً ہے، تو پھر بتائیے جس شخص کا یہ عقیدہ و نظریہ ہو کہ حقوق العباد کا غصب کرنا جائز ہے؟

یہ قول و عمل بدعت میں شامل ہے کہ نہیں؟ اگر مفتی صاحب کی پیروی میں اسے بدعت میں شامل نہیں کرتے تو ذرا قرآن کی ان آیات بینات کا مفہوم تو بیان کر دیجئے گا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهاً بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ حَرَمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ.(الانعام ۱۴۰)

ترجمہ۔ بے شک تباہ ہوئے وہ جو اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں احمقانہ جہالت سے اور حرام

ٹھہراتے ہیں وہ جو اللہ نے انہیں روزی، دی اللہ پر جھوٹ باندھنے کو بے شک وہ بہکے اور راہ نہ پائی (احمد رضا خاں)

ثانیاً علماء بریلویہ بتائیں انہوں نے کتب اصول میں کہیں مباح کی بھی تعریف پڑھی ہے، لایثاب علیہ و لا یعاقب، توضیح ص ۲۶)۔ طبع نولؔ کشور

یعنی نہ تو اس کے کرنے پر ثواب ہوتا ہے نہ عذاب، مزید دیکھئے، خلاصۃ الافکار ص ۱۵۹ وفتاوٰی شامی ص ۱۲۳ و ص ۶۵۳ ج ۱ واصول السرخسی ص ۱۱۲ ج ۱، وغیرہ، خود حضرت مفتی صاحب نے جاء الباطل، ص ۳۱۹ ج ۱، میں ایک عبارت ذکر کی ہے جس میں تصریح ہے کہ مباح میں ثواب متعلق نہیں ہوتا، اس سے بڑھ کر ہم فریق ثانی کی اور کیا تسلی کر سکتے ہیں

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

فرماتے ہیں دینی کام کی قید لگانا آپ کے لیے کوئی مفید نہیں کیونکہ دیوبند کا مدرسہ وہاں کا نصاب دورہ حدیث تنخواہ لیکر مدرسین کا پڑھانا، امتحان اور تعطیلات کا ہونا آج قرآن پاک میں اعراب لگانا قرآن و بخاری چھاپنا مصیبت کے وقت ختم بخاری کرنا جیسا کہ پندرہ روپیہ لیکر کرایا جاتا ہے بلکہ سارا فن حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کو کاغذ پر جمع کرنا۔ اس میں رکوع بنانا اس کے تیس سیپارے کرنا وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ ہوا تھا، جاء الباطل ص ۲۲۴ ج ۱

الجواب

یہ عبارت بریلویت کے حکیم الامت کے مغالطہ کا منہ بولتا ثبوت ہے، تفصیل حسب ذیل ہے

اولاً مفتی صاحب کا دینی مدارس کو بدعت میں شامل کرنا صرف وہم ہے کیونکہ حضور ﷺ کی زندگی مبارکہ میں مسجد نبوی کے ملحقہ ایک صفہ بنوایا گیا تھا جہاں لوگ دینی تعلیم پاتے

تھے، معلوم نہیں مفتی صاحب تاریخ سے اتنے بے خبر کیوں ہیں؟ خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے،

خیر کم من تعلم القرآن و علمه.

تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے

(بخاری ص ۷۵۲ ج ۲ و مشکوۃ ص ۱۸۳)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بیعت عقبہ کے بعد اسی غرض سے مدینہ بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں، مسند امام احمد ص ۲۹۱ ج ۴، وبخاری مع فتح الباری ص ۵۶۸ ج ۸،

نظام حکومت قائم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جو امراء و عمال مقرر فرمائے ان کا سب سے مقدم فرض کتاب و سنت کی تعلیم دینا قرار پایا، چنانچہ، استیعاب، تذکرہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، میں ہے

بعثه رسول الله ﷺ قاضیا الی الجندین بالیمن یعلّم الناس القران و شرائع الاسلام، (الاستیعاب بر حاشیہ الاصابہ ص ۳۵۶ ج ۳)

آپ نے ان کو یمن کے ایک حصہ کا قاضی مقرر فرما کر بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو قرآن مجید اور احکام اسلام کی تعلیم دیں،

چنانچہ انہوں نے وہاں جاکر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں لوگوں کو تعلیم الاسلام اور تفقہ فی القرآن پر توجہ دلائی اور فرمایا جب قرآن پڑھ چکنا تو مجھ سے پوچھ لینا کہ جنتی کون ہے؟ اور جہنمی کون ہے؟

جب وہ لوگ قران کی تعلیم سے فارغ ہوگئے تو انہوں نے آپ سے یہی سوال کیا، سنن دارمی ص ۸۳ ج ۱، اس کے بعد اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تعلیم قران کے متعلق کوئی خاص یا جدید انتظام نہیں کیا گیا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی دور خلافت میں نہایت وسیع پیمانہ پر تعلیم قران کا سلسلہ شروع کیا تمام مفتوحہ علاقوں میں

تعلیم قرآن کے لیے مکاتب قائم کئے اور بعض علاقوں میں قرآن مجید کی جبری تعلیم کا انتظام کیا، چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا، خاص اس کام پر مامور کیا کہ بدوؤں کے قبائل میں دورہ کرکے ہر شخص کا امتحان لے اور جسکو قرآن مجید یاد نہ ہو اس کو سزا دے (اصابہ تذکرہ اوس بن خالد)

اگران دلائل سے بھی کسی طالب حق کی تسلی نہیں ہوئی تو ایسے متلاشی حق کے لیئے مزید عرض ہے کہ جب نبی ﷺ کی زندگی مبارکہ کے آخری دور میں وفود کا سلسلہ شروع ہوا، تو جو مہاجر آتے انہیں مدینہ کے انصار قرآن و سنت پڑھاتے، چنانچہ وفد عبدالقیس جب واپس گیا تو انہوں نے اعتراف کیا،

ان الانصار یعلمونا کتاب ربنا و سنة نبینا،

یعنی انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت سکھاتے تھے۔

مسند احمد ص ۴۳۲ ج ۳ رقم ۱۵۱۳۱)

ثانیاً انہیں دلائل سے معلم مقرر کرنا بھی ثابت ہو گیااور معلم کو اجرت دینا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے، اگر علماء بریلی کو شکم پروری سے فرصت ہو تو کبھی کبھار سیرت نبی کریم ﷺ کو بھی پڑھ لیا کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ جنگ بدر کے قیدیوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے سے فدیہ لیا گیا جس کی مقدار ایک ہزار سے لیکر چار ہزار درھم تھی اہل مکہ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے جبکہ اہل مدینہ لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھے اس لئے یہ طے کیا گیا کہ جس کے پاس فدیہ نہ ہو وہ مدینے کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے جب یہ بچے اچھی طرح سیکھ جائیں تو یہی اس کا فدیہ ہوگا،

الرحیق المختوم ص ۳۷۸، وضیاء النبی ص ۳۹۵ ج ۳، مؤلفہ پیر کرم شاہ بریلوی،

ثالثاً، قرآن پاک کے اعراب کو بدعت میں شامل کرنا انتہا درجہ کا سفلہ پن ہے کیونکہ ہر صاحب عقل جانتاہے کہ عربی زبان کی ایک سطر بھی بغیر اعراب کے نہیں پڑھی جاسکتی اور ہماری طرف سے پوری دنیا کے متبذعین بریلویہ کے علماء کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ بغیر اعراب کے عربی کا صرف ایک جملہ پڑھ کر دکھادیں کہ جملہ پڑھا جائے اور اس پر اعراب نہ پڑھے جائیں،

جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب سنئے کہ نبی ﷺ قران کو پڑھا کرتے تھے (سورۃ القیمۃ آیت ۱۸)

بلکہ صحابہ کرام نے تو نبی ﷺ کی قرات کو اس قدر محفوظ رکھا تھا کہ آنحضرت ﷺ مالک یوم الدین ،یا، ملک یوم الدین ، پڑھا کرتے تھے ،دیکھئے ابن کثیر ص ۲۴،

رابعا، قرآن و بخاری کو دین مصطفیٰ کی اشاعت اور اسلام کی حفاظت و برتری اور کفار کو دعوت اسلام اور مسلمانوں کو دین سے روشناس کرانے کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے اور تحریری طور پر کفار کو دعوت اسلام دینا سنت مصطفیٰ ﷺ ہے اگر اعتبار نہ ہو تو سیرت مصطفیٰ ﷺ میں بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط کا مطالعہ ضرور کریں،علاوہ ازیں قران و حدیث کو حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی مبارکہ میں تحریری طور پر لکھا جاتا تھا، پھر ہمارے نزدیک قران و حدیث زبانی ہوں یا کسی کاتب نے لکھے ہوں یا کسی پریس میں چھپے ہوں، وہ قران ہونے میں برابر ہیں، یہ نہیں جو زبانی پڑھ رہا ہے یا خطی ہے وہ قران ہی نہیں، نعوذ باللہ من ھذا، تو پھر اعتراض کیسا ،

خامسا، ظاہر ہے کہ قران عربی مبین میں ہے اور اس کی عملی تفسیر نبی کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ بھی عربی میں ہی معرض وجود میں آیا تھا، اہل عرب اور صحابہ کرام کی چونکہ مادری زبان ہی عربی تھی، وہ تو اپنی زبان پر عبور رکھتے تھے، جبکہ ایک عجمی قرآن و حدیث میں اس وقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ عربی زبان میں شد بد حاصل نہ کرلے،

سادسا، قرآن کی جمع و ترتیب اور رکوعات کو بدعات میں شمار کرنا غلط محض ہے جمع قران کے سلسلہ میں دین الحق ، ص ۵۵۳ حصہ اول، میں ہم نے صراحت کردی ہے اسے وہاں ہی دیکھئے البتہ جمع حدیث کے متعلق راقم کچھ عرض کردیتا ہے

کیا علم حدیث بدعت ہے

حضرت مفتی صاحب کا فن حدیث کو بدعات میں شمار کرنا ان کی کم آگہی کی واضح برہان ہے کیونکہ عرف عام میں حدیث تو نبی رحمت رسول مکرم ﷺ کے مقدس فرمان ، فعل اور تقریر

کو کہا جاتا ہے خود مفتی صاحب لکھتے ہیں ،اصطلاح میں صرف حضور کے فرمان اور کام کو حدیث کہا جاتا ہے ،(مراۃ المناجیح ص ۱۴۴ ج ۱)

اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ آپ علیہ السلام کے اقوال و افعال حجت شرعیہ ہیں اور آپ کی پیروی اسلام ہے (جس کے دلائل آگے آرہے ہیں)

جب آپ نے انہیں ہی بدعات میں شامل کرلیا تو بقایا آپ کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے حضرت مفتی جی! نبی کریم ﷺ کی حدیث اگر بدعات میں شامل ہیں تو انہیں دین سے خارج کر کے ہمیں کتے کی حرمت تو ثابت کر کے دکھا دیجئے کیونکہ قران میں اس کے حرام ہونے کی وضاحت نہیں ہے !اگر علماء بریلویہ کہہ دیں کہ نہیں نہیں ان کی تحریر کا مقصد فقط اس قدر ہے کہ حدیث کی جمع و ترتیب اور حافظے سے تحریر میں انتقال بدعت ہے، کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں نہ تھی، تو جواباً عرض ہے کہ حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کی ابتدا تو حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی مبارکہ میں شروع ہو چکی تھیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے ۸ھ، میں فتح مکہ کے موقعہ پر انسانی حقوق اور مکہ کی عزت و حرمت کے بارے میں مسائل کو بیان فرمایا تو ایک یمنی آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے یہ احکام لکھوا دیجئے تو آپ علیہ السلام نے حکم فرمایا کہ ،اکتبوالابی شاہ ، میری حدیث ابو شاہ کو لکھ دو ، بخاری کتاب العلم)

(۲)رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ جہینہ کو ایک حدیث لکھوا کر بھجوائی کہ مردہ سے نفع حاصل نہ کرو (ابوداؤد ص ۲۱۳ ج ۲، وترمذی مع تحفہ ص ۴۵ ج ۳ ،و سنن نسائی ص ۱۸۳ ج ۲، وابن ماجہ ص ۲۶۶ ،)

(۳) رسول اللہ ﷺ نے ملک یمن کے شہر جرش کے لوگوں کو کھجور اور منقی کو ایک ساتھ بھگونے سے منع فرمایا تھا کہ اس میں نشہ کا اندیشہ تھا، مسلم شریف ص ۱۶۴ ج ۱،

(۴)نبی ﷺ نے ہر قبیلہ والوں کو دیت کے مسائل کی تفصیلات لکھوائیں اور یہ بھی لکھوایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ امر جائز نہیں کہ بلااجازت اصل مالک کے کسی غیر کے آزاد کردہ غلام کا والی بن جائے ،(صحیح مسلم ص ۴۹۵ ج ۱۔)

(۵) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے ایک صحیفہ لکھا اور اس صحیفہ کے مسائل یہ ہیں (۱) تحدید حرم (۲) ایجاد بدعت پر لعنت (۳) بدعتی کی تکریم اور اس کو جگہ دینے پر لعنت (۴) ذمہ اور عہد کے وفانہ کرنے پر لعنت (۵) کسی دوسرے کے آزاد کردہ غلام کو اپنا مولا بنانے پر لعنت (۶) اونٹوں کے متعلق مسائل (۷) مسائل جراحات اور دیت (۸) زمین کی حد فاصل اور امتیازی نشانات کے مٹانے اور چوری کرنے پر لعنت (۹) ذبح لغیر اللہ کی حرمت (۱۰) احکام ذمیاں وغیرہ بھی مرقوم ہیں، (بخاری ص ۴۵۱ ج ۱، ومسلم ص ۴۹۵ ج ۱۔ وغیرہ،)

اسی طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خود بھی احکام قضا کی حدیثیں جمع کی تھیں جو کتاب قضایا کے نام سے موسوم تھی، (مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰،)

(۶) نبی کریم ﷺ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ تمام حدیثیں قلم بند کروادی تھیں جن کا تعلق مسائل زکوٰۃ سے تھا اس کا نام کتاب الصدقہ تھا، لیکن اس کو ابھی حکام کے پاس روانہ نہ کرپائے تھے کہ آپ علیہ السلام کا انتقال ہوگیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے دور خلافت میں اسے نافذ کیا اور اس کے مطابق زکوٰۃ کے وصول کرنے کا انتظام رکھا، سنن ابوداؤد مع عون ص ۸ ج ۱،

(۷) نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری دور میں احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ اہل یمن کے پاس حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی معرفت روانہ کیا تھا، سنن نسائی ص ۲۴۷ ج ۲، رقم الحدیث ۴۸۵۷)

ان چند مثالوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنے فرمودات وھدایات کو لکھنے کا حکم و ارشاد فرمایا اور قلم بند کروایا بھی تھا ہم ان ہی چیزوں کو حدیث کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، انتھی کلام الرحمانی، صیانۃ الحدیث ص ۳۹،

مفتی صاحب کا اکابر اہل حدیث کو چیلنج

فرماتے ہیں ہم نے مولوی ثناء اللہ امرتسری کو اپنے مناظرہ میں کہا تھا کہ آپ حضرات چار

چیزوں کی صحیح تعریف کر دیں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو جامع مانع ہو، تو جس قدر چاہیں ہم سے انعام لیں، بدعت، شرک، دین، عبادت،

اور اب بھی اپنے رب کے بھروسہ پر کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چاروں چیزوں کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذھب بچ جائے، جاء الباطل ص ۲۲۴،

الجواب

اولاً مفتی صاحب نے یہ چیلنج جس انداز سے کیا ہے وہ ان کی لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ایسی تعریف ہو جس پر کوئی اعتراض نہ ہو، اے جی اعتراض تو ہر چیز پر ممکن ہے، لوگوں نے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام علیہم السلام تک معاف نہیں کیا، قران کے رد میں لکھی گئی کتب، ستارش پرکاش، ترک اسلام، تنویر الاذھان فی فصاحت القران، وغیرہ سے غالبا علماء بریلوی بھی واقف ہوں گے جن کا جواب کسی بریلی کے نام نہاد مفسر قران اور مجدد مائۃ حاضرہ وغیرہ اور گجرات کے بقلم خود حکیم الامت نے نہیں دیا بلکہ ان کا جواب تحریر کرنے والے سچے محبّ قرانِ اور شرک و بدعت سے نفرت دلانے والے اور پکے متبع سنت تھے جن پر آپ اور آپ کے مجدد ملت اور اس کی ذریت خبیثہ کفر کے فتوے لگا رہی تھی، یہ تمام حقائق تاریخ کی امانت ہیں،

ثانیاً، بدعت کی جامع مانع تعریف ہم نے کر دی ہے جس کا جواب انشاء اللہ کسی رضوی علامہ فہامہ سے ممکن نہیں

شرک کی تعریف

ثالثاً، شرک کی تعریف بھی سن لیجئے، شرک کا لغوی معنی ہے، خلط الملکین، مفردات القران ص ۲۵۹، یعنی حصہ دار، قران میں ارشاد ہوتا ہے

(۱) ولم یکن له شریك فی الملك ،(بنی اسرائیل ۱۱۱)

اور نہ ملک میں اس کا کوئی شریک ہے، ثنائی)

اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ رب العزت اپنی ذات اور تمام صفات میں، منفرد، واحد اور اکیلا ہے اس کی ذات اور ہستی میں کوئی ایک شریک نہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

(۲) ولااشرك بربی احدا، (الکھف ۳۸)

اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا، (ثنائی)

(۳) ویقول یٰلَیتَنِی لم اشرک بربی احدا، (الکھف ۴۲)

اور کہتا تھا ہائے میری کم بختی میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا (ثنائی)

(٤) و لا يشرك بعبادة ربه احداً. (الكهف ١١٠)

ترجمہ۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بناوے (ثنائی)

(٥) يهدى الى الرشد فامنا به ولن نشرك بربنا احداً (الجن ٢)

ترجمہ۔ ہم آئندہ کو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، (ثنائی)

(٦) وان المسجد لله فلا تدعوا مع الله احداً (الجن ١٨)

ترجمہ۔ اور تمام مسجدیں اللہ کیلئے ہیں پس ان میں اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو، (ثنائی)

(٧) قل انما ادعوا ربی ولا اشرك به احداً (الجن ٢٠)

ترجمہ۔ تو کہہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا، (ثنائی)

(٨) قل انی لن يجيرنى من الله احد ولن اجد من دونه ملتحداً (الجن ٢٢)

ترجمہ۔ تو کہہ دے بذات خود مجھے بھی اللہ کے سوا کوئی پناہ نہیں دے گا اور اس کے سوا میں کہیں پناہ نہیں پاؤں گا (ثنائی)

(٩) قل هو الله احد☆ الله الصمد☆ لم يلد و لم يولد☆ولم يكن له كفواً

احد. (الاخلاص)

اے رسول تو کہہ کہ بات یہ ہے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنا نہ کسی سے وہ جنا گیا نہ اس کا کوئی ہمسر ہے

ان آیات بینات میں اس بات کو کھل کر ،اَحَدًا اور اَحَدًا، سے بیان کر دیا کہ کوئی بھی ہو اگرچہ نبی ہو یا فرشتہ یا کوئی اور نیک شخصیت اللہ تعالیٰ کا کسی طرح بھی شریک و سہیم نہیں، نہ ذات میں اور نہ ہی صفات و افعال میں کیونکہ رب العلمین ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے، وحدہ لا شریک ہے۔

عبادت کی تعریف

رابعاً، عبادت نہایت درجے کی عاجزی اور تذلل کو کہتے ہیں

اقرب الموارد میں ہے،

عبدالله طاع له و خضع و ذل و خدمه وا لتزم شرائع دينه و وحده،

یعنی عبداللہ (اللہ کی عبادت کی) کے معنی ہیں اس کی اطاعت کی اور اس کے احکام کے آگے سر جھکایا اور اس کی خدمت (دین) کی اور اس کے دین کے احکام پر مستقل طور پر عمل کرنے لگا اور اس کی توحید کا اقرار کیا،

لسان العرب میں ہے، معبد اذا کان مذلا بکثرۃ الوطء ص ۲۷۳ ج ۳)

یعنی لغت میں عبادت کا معنی اطاعت ہے جو خضوع و خشوع سے ہو، چنانچہ اس راستے کو جو بہت پائمال ہو اور اس پر آمدورفت زیادہ ہو، طریق معبد، کہتے ہیں) نیز کہا، المعبد المذلل والتعبد التذلل، مزید کہا ہے، طریق معبد ملوک مذلل، ص ۲۷۴

یہی معنی علامہ زمخشری نے ،اساس البلاغۃ، میں عبادت کا، مذلل، کیا ہے ،ص ۲۹۱)

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ عبادت کے لفظی معنی ہیں اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار اوراصطلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے بذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے اسی وجہ سے قران میں عبادت کا لفظ تکبر و غرور کے بالمقابل بولا

گیا ہے

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم دٰخرین. (المومن ۶۰)

ترجمہ۔ جولوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے،

ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادتہ ولا یستحسرون(الانبیاء ۱۹)

ترجمہ۔ جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے ،

انما یؤمن بایتنا الذین اذا ذکروابھا خرواسجداً و سبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون (السجدہ) آیت نمبر ۱۵.

ترجمہ۔ ہمارے احکام وہی لوگ مانتے ہیں کہ جب ان کو اس احکام کی بابت نصیحت کی جائے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیحیں پڑھتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے (ثنائی)

اس طرح کے مزید مقامات بھی قران مجید میں موجود ہیں جن میں عبادت کے بالمقابل تکبر و غرور کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ تکبر و غرور کے معنی اپنے آپ کو اللہ تعالی کے مقابلہ میں بڑا سمجھنا اور اللہ تعالی کے سامنے اپنی گردن کو جھکانے سے عار کرنا ہے ، تو عبادت کے معنی اللہ تعالی کے سامنے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی پیروی کرنا ہے اسی وجہ سے قران و حدیث میں بندے کا ہر وہ کام جس سے اللہ تعالی کی اطاعت ہو عبادت ہے ،اس میں انسان کی نیت و ارادہ کا موقوف ہونا بھی ازبس ضروری ہے، مثلا اگر زید اپنی شہرت کے لیے کسی نیک کام کے لیے لاکھوں روپے دے ڈالے تو وہ عبادت نہیں ہو گی لیکن اگر اللہ تعالی کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی تعمیل میں ایک روپیہ بھی کسی محتاج و فقیر کو دے تو عنداللہ وہ عبادت ہے ، تعلیم الرسول میں یہ حکم و ارشاد واضح ہے،

انما الاعمال بالنیات،

اعمال کا دارو مدار نیت پر موقوف ہے (بخاری ص ۲ج او مسلم ص ۱۴۰ ج ۲)

چنانچہ اس تعلیم محمدی میں پاک روزی کھانا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی عبادت ہے (سورۃ البقرہ آیت ۱۷۲) سورہ ہود میں توکل یعنی کام کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو اللہ کے سپرد کردینا عبادت کہا گیا ہے (ہود ۱۲۲) اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے (مریم ۶۶) کسی شکستہ دل سے تسکین و تشفی کی بات کرنا اور گناہ گار کو معاف کردینا بھی عبادت ہے (البقرہ ۱۶۳)

ان دلائل کے ساتھ اگر کتب احادیث کا مطالعہ کر کے عبادات کو شمار کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے مگر ہم اس پر اصولی گفتگو کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے احکام کی پیروی ہی شریعت حقہ میں عبادت شمار ہوتی ہے چنانچہ وہ لوگ جو اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کے بالمقابل کسی پیرو فقیر و درویش وغیرہ کی بات کو حجت و دلیل جانتے ہیں اسے قرآن نے مشرک کہا ہے،

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وان الشیٰطین لیوحون الیٰ اولیئھم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون. (الانعام آیت ۱۲۱)

ترجمہ۔ اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو (احمد رضا خاں)

اس کے حاشیہ میں بریلویت کا مفسر قرآن مولوی نعیم الدین مرادآبادی لکھتا ہے کیونکہ دین میں حکم الٰہی کو چھوڑنا اور دوسرے کے حکم کو ماننا اللہ کے سوا اور کو حاکم قرار دینا ہے (ف ۲۴۲ ص ۲۰۷) اس آیت کی تفسیر میں مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی فرماتے ہیں کہ،

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حلال کیے ہوئے کو حرام کیا یا حرام کیے ہوئے کو حلال کیا، وہ مشرک ہو جائے گا، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال اعتقاد کرے، تب وہ کافر و مشرک ہوگا اور اگر وہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کاموں

کو اپنی نفسی خواہش سے کرتا ہو، لیکن وہ ان کاموں کو حرام ہی جانتا ہو تو وہ فاسق اور مرتکب معصیت کبیرہ ہوگا۔ کافر و مشرک نہیں ہوگا، تبیان القرآن ص ۶۴۲ ج ۳

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے احکام کی بجاآوری کا نام ہی عبادت ہے اور اس کی مخالفت اور غیر کی اتباع ہی دراصل اس کی عبادت میں شریک ٹھہرانا ہے اور یہی شرک ہے اور اس کا فاعل مشرک ہے

خود مفتی صاحب کو ہمارے اس بیان پر اعتبار ہے چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص شیطان کی پیروی میں کسی مسلمان سے مذھبی نفرت رکھتا ہے تو ایسا انسان مشرک ہے ان کے اصل الفاظ یہ ہیں جو شرک کرے وہ مشرک جو مشرکوں سے دینی محبت کرے وہ کافر ہے، جو مسلمانوں سے مذھبی نفرت رکھے وہ بھی مشرک و کافر ہے (نور العرفان ص ۲۲۷ طبع ادارہ کتب اسلامیہ گجرات)

دین کی تعریف

دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے، ایک تو یہ کہ غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تسرف سیاست و فرمانبروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ، (البقرة آیت ۱۹۲)

اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے کفر اور ہوے دین واسطے اللہ کے (۲۔۱۹۲) (شاہ رفیع الدین)

دوسرا مفہوم طاعت، فرمانبرداری غلامی ہے

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ، (الزمر آیت ۳)

خبردار، ہو واسطے اللہ کے عبادت خالص، (۳۹۔۳) شاہ رفیع الدین،

تیسرا مفہوم وہ عادت و طریقہ ہے جس کی انسان پیروی کرے،

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ، (یوسف آیت ۷۶)

وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتا تھا (۱۲۔۷۶)

وحید الزمان

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اس طرز عمل اور اس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری اور اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے، ہماری پہلی درج کردہ آیت سے واضح ہے کہ اس کا مستحق فقط اللہ کی ذات ہے، یعنی انسان اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام کی اطاعت کرے،

لیجئے جناب یہ ہے، ہماری طرف سے آپ کے چیلنج کا جواب! جس کا جواب الجواب انشاء الرحمٰن پوری دنیا کے مبتدعین بریلویہ پر قیامت کی صبح تک ادھار رہے گا،

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل بھی سنت میں داخل ہے

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں نبی ﷺ نے فرمایا

فانه من يعش منكم بعدی يرى اختلافاً كثيرا وإياكم ومحدثات الامور فانها ضلالة فمن ادرك ذلك منكم فعليه بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهدين عضوا عليها بالنواجذ.

الحدیث ترمذی مع تحفہ ص ۳۷۸ ج ۳، و ابوداؤد ص ۲۷۹ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۵، و سنن دارمی ص ۵۷ ج ۱، و مسند احمد ص ۱۲۶ و ۱۲۷، و حاکم ص ۹۴ و ۹۷ ج ۱۔

جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ کثرت سے اختلاف دیکھے گا لہذا تم بچاؤ اپنے آپ کو (دین اسلام میں) نئے نئے نکلے ہوئے کاموں سے کیونکہ نئے کام گمراہی ہیں پس جو شخص تم میں سے پائے ایسے زمانے کو تو اس پر لازم ہے کہ وہ میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو جو

ھدایت یافتہ ہیں، مضبوطی سے پکڑے اور اپنی ڈاڑھوں سے محکم طور پر قابو میں رکھے ،

ملا علی قاری حنفی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں

فانھم لم یعملوا الابسنتی فالاضافة الیھم اما لعملھم بھا اولاستنبا طھم و اختیار ھم ایاھا. (مرقاۃ ص ۲۴۲ ج ۱)

اس واسطے کہ حضرات خلفاء راشدین نے در حقیقت نبی ﷺ کی سنت پر ہی عمل کیا پس سنت کی اضافت ان کی طرف یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا یااس لئے کہ انہوں نے خود استنباط و اجتہاد کر کے اس کو اختیار کیا۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

فرماتے ہیں کہ :۔

یہ بھی محض دھوکا ہے اس لئے کہ ہم نے مرقاۃ اور اشعۃ اللمعات کے حوالے سے ثابت کیاہے کہ بدعت وہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا ،اس میں صحابہ کرام و تابعین کا ذکر نہیں نیز اس لیئے کہ مشکوۃ باب قیام شھر رمضان میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں تراویح کی باقاعدہ جماعت کا حکم دیا پھر تراویح کی جماعت کو دیکھ کر فرمایا ،

نعمت البدعة ھذہ .

یہ تو بڑی اچھی بدعت ہے ،

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مبارک فعل کو بدعت حسنہ فرمایا ہے، جاء الباطل ص ۲۲۶ ج ۱

الجواب

اولاً فرار کے لئے مفتی صاحب نے جو مخلص تلاش کیاہے، وہ کارآمد نہیں کیونکہ ہم نے حدیث مصطفیٰ پیش کی ہے، اس کے جواب کے لیئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے، مگر مفتی

الجواب

اولًا صحابی رضی اللہ عنہ نے کس چیز کو بدعت کہا ہے اس کی تفصیل راقم نے، دین الحق ص ۵۵۴ ج ۱، میں کردی ہے اسے وہاں ہی ملاحظہ کرلیا جائے

ثانیاً، حضرت حکیم الامت کو مغالطہ دینے میں بھی خوب مہارت ہے اور اس کمال میں وہ تمام بریلوی علماء سے زیادہ ملکہ رکھتے تھے

بات تو صرف اتنی سی تھی کہ امام ابومالک تابعیؒ نے اپنے والد محترم سے ایک فرضی مسئلہ پوچھا تھا اور اس فرضی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اسے بدعت قرار دیا مگر مفتی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام اس پر عمل پیرا تھے،

جبکہ حدیث اس کی نفی کرتی ہے چنانچہ سنن نسائی میں ہے،

قال صلیت خلف رسول اللہ ﷺ فلم یقنت و صلیت خلف ابی بکر فلم یقنت و صلیت خلف عمر فلم یقنت و صلیت خلف عثمان فلم یقنت و صلیت خلف علی فلم یقنت ،الحدیث ،

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ ،حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ،حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ،حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں (اور یہ تمام) قنوت نہیں پڑھا کرتے تھے (۱۔۱۲۸،رقم الحدیث ۱۰۸۱)

مگر مفتی صاحب کا طرز استدلال ہی نرالا ہے کہ اس روایت سے ثابت کررہے ہیں کہ صحابہ کرام میں قنوت نازلہ ہمیشہ اور بلاسبب پڑھی جاتی تھی پھر اس الٹی سمجھ پر عمل صحابہ پر بدعت سیئہ کا فتوی لگا رہے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون) علماء بریلویہ کا فہم ہی عجیب تر ہے اثبات پر آئیں تو مولوی احمد رضا کے ایجاد کردہ عمل کو بھی بدعت تسلیم نہ کریں اور نفی پر اتریں تو عمل صحابہ کو بھی بدعت سیئہ قرار دے دیں

ثالثًا، متن روایت کے کن الفاظ کا معنی، بدعت سیئہ، ہے یقین جانئے کہ یہ مفتی صاحب

صاحب ہمیں مرقاہ وغیرہ کی ایک عبارت سے ٹرخا رہے ہیں جو ان کی بے بسی کی واضح برھان ہے

حضرت حکیم الامت اور مفتی صاحب، حضرت محمد ﷺ خود خلفاء راشدین کے طریقہ وعمل کو اپنی سنت میں داخل کر رہے ہیں تو غیر معصوم علماء کے اقوال انہیں سنت سے خارج نہیں کر سکتے۔

ثانیاً، رہا آپ کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرنا تو اس کے لئے عرض ہے،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تراویح کو بدعت کہنا لغوی ہے نہ کہ شرعی! جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ، علامہ شاطبیؒ، اور امام ابن رجبؒ نے صراحت کی ہے دیکھئے۔ مرقاۃ المفاتیح ص ۳۲۷ و ۳۲۸ ج ۴۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

قیام رمضان کی صورت میں مین تراویح کا وجود تو خود حضرت رسول اکرم ﷺ کے دور مسعود میں تھا تو پھر تراویح بدعت شرعی کیسے ہوگئی؟ دراصل رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک کے بعد نماز تراویح کا باجماعت اہتمام نہیں رہا تھا۔ جب یہ حضرت، کے زمانہ میں دوبارہ ہوا تو اس پر حضرت عمرؓ نے نعمت البدعۃ ہذہ! فرمایا کہ اس کا از سر نو آغاز اچھی بات ہے۔ (محمد یحیی گوندلوی)

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مشکوۃ شریف، باب القلوب (درست القنوت ہے ابوصہیب) میں حضرت ابومالک اشجعی سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے اپنے والد سے نماز فجر میں قنوت نازلہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا اے بیٹے یہ بدعت ہے دیکھو زمانہ صحابہ کی چیز کو آپ بدعت سیئہ کہہ رہے ہیں اگر زمانہ صحابہ کی ایجادات بدعت نہیں ہوتیں تو قنوت نازلہ بدعت سیئہ کیوں ٹھہری، جاء الباطل ص ۲۲۶،

کا افترا ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

بخاری جلد دوم کتاب فضائل القران باب جمع القران ،میں ہے کہ حضرت صدیق نے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو قران پاک جمع کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ ،کیف تفعلون شیئا لم یفعلہ رسول اللہ ﷺ قال ھو خیر ،آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں جو حضور علیہ السلام نے نہ کیا۔صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ کام اچھا ہے،حضرت زیدبن ثابت نے بارگاہ صدیقی رضی اللہ عنہ میں عرض کیا کہ قران کا جمع کرنا بدعت ہے آپ بدعت کیوں ایجاد کررہے ہیں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ بدعت تو ہے مگر حسنہ ہے یعنی اچھی ہے،جاء الباطل ص ۲۲۷،

الجوب

اولاً بخاری کی مذکورہ روایت تو کجا کسی بھی معتبر روایت میں یہ الفاظ نہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ قران جمع کرنا بدعت ہے ،یہ مفتی صاحب کا افترا اور ایجاد بندہ ہے اپنے خانہ ساز مذھب کو حضرت زید کی طرف منسوب کرنا مفتی جی کی جرات ہے ، سنیوں کہو جھوٹے پر ہزار بار لعنت ہو۔

قارئین کرام روایت کے اسی ٹکرے سے ہی مفتی صاحب کا استدلال ہے کہ خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فعل کو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بدعت قرار دیا ہے مگر ہمارا یہ چیلنج ہے کہ یہ قول حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قطعاً نہیں !جب یہ قول ہی ان کا نہیں تو مفتی صاحب کا استدلال خود بخود باطل و مردود ہوگیا ،آیئے حدیث مبارکہ کے پورے متن کو ملاحظہ کریں ،حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے،

ارسل الی ابوبکر مقتل اھل ا لیمامۃفاذا عمر بن الخطاب عندہ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقرإ القران وانی

اخشى ان استحر القتل بالقرإ بالمواطن فيذهب كثير من القران وانى ارى ان تأمر بجمع القران ،فقلت لعمر كيف تفعل شيئا لم يفعله رسول الله ﷺ قال عمر هذا والله خير فلم يزل عمر يرا جعنى حتى شرح الله صدرى لذلك ورايت فى ذلك الذى راى عمر قال زيد قال ابوبكر انك رجل شاب عاقل لانتهمك كنت وقد تكتب الوحى الرسول الله ﷺ فتتبع القرآن فاجمعه فوالله لو كلفونى نقل جبل من الجبال ماكان اثقل على ممامرنى به من جمع ا لقران قلت كيف تفعلون شيئا لم يفعله رسول الله ﷺ قال هو والله خير فلم يزل ابوبكر يرا جعنى حتى شرح الله صدرى للذى شرح له صدر ابى بكر و عمر رضى الله عنهما فتتبعت القران اجمعه من العسب واللخاف و صدور الرجال حتى و جدت آخر سورة التوبة مع ابى خزيمة الانصارى لم اجدها مع احد غيره، لقد جائكم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم،التوبة آيت ١٢٨، ١٢٩، حتى خاتمه برآئة فكانت الصحف عند ابى بكر حتى توفا ه الله ثم عند عمر حياته ثم عند حفصة بنت عمر رضى الله عنه،

جب یمامہ کے جہاد میں بہت سارے مسلمان شہید ہوگئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے میری طرف پیغام بھیجا، میں گیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ان کے پاس تھے، تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (گفتگو شروع کی) کہا کہ میرے پاس عمر فاروق رضی اللہ عنہ آئے اور فرمانے لگے یمامہ کے جہاد میں قران پاک کے حافظ بہت زیادہ شہید ہوگئے ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو اسی طرح ہی جہادوں میں حافظ شہید ہو جائیں اور قران کا بہت سا حصہ (جو ان کے سینوں میں محفوظ ہے) ہاتھ سے جاتا رہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں

کہ آپ قرآن مجید کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا حکم دید یجئے اس وقت میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا یہ تو بتلاؤ جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کروگے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالی کی قسم ہے یہ کام بہتر ہے،

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے برابر اس کے لئے کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالی نے میرے سینہ کو بھی کھول دیا، میں نے بھی اسی میں مصلحت سمجھی جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سمجھی تھی، حضرت زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا تو ایک جوان عقل مند شخص ہے اور مجھے تیری ذات پر اعتماد بھی ہے جبکہ تو نبی ﷺ کے لئے وحی لکھا بھی کرتا تھا لہذا

تو ایسا کر کہ قرآن کو تلاش کر اور اکٹھا کر، اللہ تعالی کی قسم اگر یہ لوگ مجھ سے یہ کہتے کہ پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اٹھا لا تو تب بھی مجھ پر اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا کہ یہ کام دشوار تھا جو انہوں نے مجھے جمع قرآن کے متعلق حکم فرمایا تھا، تب میں نے ان سے یہ کہا کہ تم لوگ وہ کام کیوں کرتے ہو جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالی کی قسم ہے یہ کام بہت اچھا ہے،

اور برابر مجھ سے یہ بات کہتے رہے تب اللہ تعالی نے میرے دل میں بھی یہ بات ڈال دی جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ڈالی تھی

میں نے قرآن پاک کی تلاش شروع کی تو کہیں کھجور کی چھڑیوں پر کہیں باریک پتھروں پر لکھا پایا کچھ لوگوں کو زبانی یاد تھا،

سورۃ توبہ کی آیت لقد جاء کم من انفسکم سے آخر سورت تک میں نے صرف حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس (لکھی ہوئی) پائی پھر یہ مصحف (جو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کے پاس رہا پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس اوران کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، بخاری شریف کتاب الفضائل القران باب جمع القران، ص ۷۴۵ جلد دوم،

قارئین کرام ہم نے آپ کی تسلی کے لیے متن حدیث پورے کا پورا نقل کردیا، بتایئے اس میں کہاں حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جمع قران بدعت ہے، معلوم ہوا کہ یہ مفتی صاحب کا جھوٹ ہے

ثانیاً، جمع قران کے متعلق راقم نے دین الحق کی جلد اول کے ص ۱۵۵ پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے، قارئین وہاں سے ہی ملاحظہ کرلیں

البتہ بریلوی عوام پر اتمام حجت کے لئے اس مقام پر چند عبارات علماء بریلویہ کی عرض کردی جاتیں ہیں تاکہ حق وباطل میں فرق ہو جائے، چنانچہ بریلویہ کے مشہور مفسر قران پیر کرم شاہ الازھری بھیروی لکھتے ہیں کہ،

ہمارا یہ دعوی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق قران کی سورتوں اور سورتوں کی آیتوں کو مرتب فرمایا اور یہ موجودہ ترتیب وہی ترتیب ہے اس کے لیئے متعدد دلائل ہیں .... تو ثابت ہوا کہ قران کریم عہد رسالت میں مکمل طور پر مرتب فرمادیا گیا تھا اور تمام صحابہ اسی کی پیروی اور پابندی کیا کرتے تھے، ضیاء القران ص ۱۵ ج ۱،

خود حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں

جس وقت جو آیت اتری حضور علیہ السلام کے حکم کے مطابق اونٹ کی ہڈیوں پر کھجور کے پٹھوں پر اور مختلف کاغذوں پر لکھ لیتے تھے اور یہ چیزیں متفرق طور پر لوگوں کے پاس رہیں ترتیب خود حضور علیہ السلام نے دی تھی، حضور علیہ السلام کی وفات سے کچھ روز پہلے نزول قران کی تکمیل ہوئی (مگر) قران کریم کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکا البتہ مرتب ہوگیا (تھا) تفسیر نعیمی ص ۱۱ و ۱۲ ج ۱۔

مفتی صاحب کا سوال؟

فرماتے ہیں ۔ھدایت ضروریہ ،جو حضرات ہر بدعت یعنی نئے کام کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ وکلیہ کے کیا معنی کریں گے کہ، الاصل فی الاشیا الاباحۃ ،تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہے، یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے ہاں اگر کسی چیز کو شریعت منع کردے تو وہ حرام یا منع ہے یعنی ممانعت سے حرمت ثابت ہوگی نہ کہ نئے ہونے سے یہ قاعدہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ و اقوال فقہاء سے ثابت ہے غالبًا کوئی مقلد کہلانیوالا تو اس کا انکار نہیں کرسکتا ۔قران فرماتا ہے۔

یا یھا الذین امنوا لاتسئلواعن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم وان تسئلوا عنھا حین ینزل القران تبدلکم عفااللہ عنھا، المائدہ آیت ۱۰۱.

ترجمہ۔ اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو کہ جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تم کو بری لگیں اور اگر ان کو اس وقت پوچھو گے کہ قران اتر رہا ہے تو ظاہر کردی جائیں گی اللہ ان کو معاف کر چکا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کا کچھ بیان نہ ہوا ہو حلال ہونے کا نہ حرام تو معافی میں ہے اسی لئے قران کریم نے حرام عورتوں کا ذکر فرما کر فرمایا،

واحل لکم ماورآء ذلکم ،

ان کے سوا باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں ،

نیز فرمایا۔

وقدفصل لکم ما حرم علیکم،

تم سے تفصیل وار بیان کردی گئیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ہیں،

یعنی حلال چیزوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں تمام چیزیں ہی حلال ہیں، ہاں چند محرمات ہیں جن کی تفصیل بتادی ان کے سوا سب حلال،

مشکوۃ کتاب الاطعمۃ باب آداب الطعام فصل دوم میں ہے،

الحلال ما احل أللہ فی کتبہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وماسکت عنہ فھو مماعفی عنہ .

حلال وہ جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی وہ معاف،

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چیزیں تین طرح کی ہیں ایک وہ جن کا حلال ہونا صراحۃ قران میں مذکور ہے دوسرے وہ جن کی حرمت صراحۃ آگئی ہے تیسرے وہ جن سے خاموشی فرمائی یہ معاف ہے، جاء الباطل ص ۲۲۹۔

کیا اشیاء میں اصل اباحت ہے

اولاً: اشیاء میں اصل اباحت ہے کہ نہیں اس اصول میں خود اکابرین احناف میں بھی بہت سا اختلاف ہے،

چنانچہ مشہور حنفی فقہیہ امام علاء الدین (المتوفی س ۱۰۸۸ھ) فرماتے ہیں۔

علی ما ھو ا المنصور من ان الاصل فی الاشیاء التوقف .

یعنی منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔

درمختار مع فتاوی شامی ص ۱۰۵ ج ا۔

ثانیاً۔صحیح بات یہ ہے کہ حلال وحرام میں اصل اباحت ہے جیسا کہ ذیل کی حدیث سے واضح ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال کان اھل الجاھلیہ یاکلون اشیاء ویترکون اشیاء تقذرا فبعث اللہ نبیہ ﷺ وانزل کتابه واحل حلاله وحرم حرامه فما احل فھو حلال وماحرم فھوحرام وما سکت عنه فھوعفو و تلا قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الٰی اخرالا یة ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

زمانہ جاہلیت کے لوگ بعض چیزیں کھاتے تھے اور بعض کو برا جان کر چھوڑ دیتے تھے تو اللہ تعالی نے اپنے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ پر قران پاک نازل کیا حلال کو حلال اور حرام کو حرام کیا لہذا اس نے جو حلال کیا وہ حلال ہے اور جو حرام کیا وہ حرام ہے اور جس

سے سکوت کیا وہ معاف ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ

اے نبی تو کہہ دے کہ میں وحی شدہ چیزوں میں کسی کھانے والی چیز میں سے کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے مردار، بہتے خون ،سور کے گوشت کے کیونکہ وہ ناپاک ہے اور اس جانور کے جو خدا کے سوا اور کے نام پر پکارا جائے ،

سنن ابی داوٗد مع عون المعبود ،ص ۴۱۷ ج ۳،

اس روایت سے ثابت ہوا کہ حلال وحرام میں اصل اباحت ہے اور اس کی تائید قرانِ حکیم سے بھی ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے

خلق لکم مافی الارض جمیعاً،

جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں سب کا سب ،(البقرہ ۲۹)

ثالثاً ۔فریق ثانی نے جس قدر بدعات ایجاد کررکھی ہیں ان کا تعلق کسی چیز کی حلت وحرمت سے نہیں (اگر ایسا ہوتا تو شاید اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی) بلکہ ان کا تعلق عبادات سے ہے اور بریلوی علماء سے لیکر عوام الناس تک انہیں عبادت سمجھ کر کرتے ہیں اور اباحت کے قانون کو عبادت میں جاری کرنا مفتی صاحب کی سینہ زوری ہی نہیں بلکہ جہالت بھی ہے ، کیونکہ عبادات ممنوع الاصل ہیں ،علامہ شاطبی فرماتے ہیں

ولا یصح ان یقال فیما تعبد انه مختلف فیه علی قولین هل علی المنع ام هو علی الاباحة بل هو امرزائد علی المنع لان التعبدیات انما وضع الشارح فلا یقال فی صلوة سادسة مثلاانها علی الاباحة فللمکلف و ضعها علی احد القولین لیتعبد بها لله لانه باطل باطلاق،

امور تعبدیہ کے بارے مین یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع الاصل ہیں یا مباح الاصل ،(کیونکہ یہ اس اختلاف کے تحت نہیں ہیں)اس لئے کہ امور تعبدیہ کو شارع علیہ السلام نے مقرر کیا ہے ،

فرض کریں کہ اگر کوئی انسان چھٹی نماز ایجاد کرے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اباحت اصلیہ کے قول کی وجہ سے یہ مباح اور جائز ہے اور مکلّف کو اس کے جاری کرنے کا حق

ہے کیونکہ یہ بالکل باطل ہے، ملخصاً۔ الاعتصام ص ۳۰۱ ج ۱،

علامہ شاطبی مرحوم کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اباحت کا قانون عبادت میں جاری کرنا سراسر زیادتی اور جہالت ہے،

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ

ولهذا كان احمد وغير من فقهاء اهل الحديث يقولون ان الاصل فى العبادات التوقيف ولا يشرع منها الا ما شرعه الله تعالىٰ،

یعنی اس وجہ سے امام احمد بن حنبل وغیرہ فقہاء اہل حدیث میں سے یہ کہتے ہیں کہ عبادات میں اصل توقف ہے، اور کوئی عبادت نہیں مگر وہی جسے اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا ہے، مجموع فتاوٰی ابن تیمیہ ص ۱۷ ج ۲۹،

آیئے اس ضابطہ و کلیہ کی علمائے بریلویہ سے تصدیق ملاحظہ کریں، مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی فرماتے ہیں کہ

اپنی عقل سے عبادت کے طور طریقے وضع کرنا جائز نہیں ہے، لوگ اپنی عقل سے عبادت کے طریقے وضع کر لیتے ہیں، پھر اسکی تائید میں دلائل شرعیہ تلاش کرتے ہیں، اور ان کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت نہ کریں اس کو لعنت ملامت کرتے ہیں، اسی کا نام احداث فی الدین اور بدعت سیئہ ہے، عبادت صرف اسی طریقہ سے کرنی چاہئے جس طریقہ سے رسول اللہ ﷺ نے عبادت کی ہے اور جس طرح آپ نے ہدایت دی ہے اور جماعت صحابہ کا اس پر عمل رہا ہے، تبیان القرآن ص ۱۵۷ ج ۱ طبع فرید بک سٹال لاہور ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ مصنوعی زاہدوں اور جعلی صوفیوں نے جو خود ساختہ شریعت وضع کرلی ہے، اس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے، نیکی اور فضیلت حاصل کرنے کا اصل اور صحیح طریقہ وہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور جو راستہ ہمارے لیے مقرر کیا اور جس طریقہ پر صحابہ کرامؓ گامزن رہے اور اخیار تابعین نے جس کو اپنایا،

تبیان القرآن ص ۲۸۰ ج ۳ طبع فرید بک سٹال لاہور ۱۴۲۰ھ ۲۰۰۰ء

سعیدی صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ عبادات اصل میں ممنوع الاصل ہیں مگر کمال

ہے کہ حضرت مفتی صاحب شریعت کے تمام احکام میں اباحت کے قائل ہیں، اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم انہیں کسی اہل حدیث مدرسہ میں ترجمہ قرآن پڑھنے کا مشورہ ضرور دیتے۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی دلیل سورۃ المائدۃ کی آیت (۱۰۱) ہے اور اس کا تعلق خاص رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہے کہ لوگ عجیب وغریب سوالات پوچھا کرتے تھے جس سے آپ علیہ السلام کبیدہ خاطر ہوا کرتے تھے، مقصود آیت فقط اتنا ہے کہ تم لوگ بہت سوال نہ کیا کرو

اللہ تعالیٰ خود بخود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لئے ضروری سمجھتا ہے ان کا نزول کردے گا، اگر مفتی صاحب خود غور فرماتے تو، حین ینزل القران (۵۔۱۰۱) کے الفاظ انہیں اس امر کی راہنمائی کے لئے کافی تھے اور اس کے معنی کو ذرا وسعت دیں تو اب بھی یہی حکم ہے کہ بلاوجہ اور غیر ضروری مسائل میں جستجو اور سوال نہیں کرنا چاہیئے آج بھی لوگ پوچھا کرتے ہیں (۱) شداد کا باغ کیسا تھا) (۲) حضرت سلیمان علیہ السلام سے جس چیونٹی نے بات کی تھی وہ مذکر تھی یا مونث (۳) براق کی شکل کیسی تھی (۴) اصحاب کھف کے کُتے کی شکل اور رنگ کیا تھا (۵) قرآن کے اعراب کی تعداد کیا ہے (۶) موسیٰ علیہ السلام نے جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا وہ گائے تھی یا بیل (۷) حضرت نوح علیہ السلام نے جو کشتی بنائی تھی وہ کس درخت کی لکڑی تھی وغیرہ،

ایسی فضول اور بے مقصد تحقیقات میں پڑنے سے وقت کا زیاں اور منشاء الٰہی جو شریعت کے نزول کا ہے فوت ہو جاتا ہے

اصل مقصد تو قرآن کا اعمال صالحہ خشیت اللہ اور تقویٰ وطہارت ہے

دوسری دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی دوسری دلیل سورۃ النساء کی آیت (۲۴) ہے اور اس سے مفتی صاحب کا استدلال کہ ان عورتوں کے علاوہ جن کا اس آیت میں ذکر ہے باقی میں اباحت ہے جس سے چاہے نکاح کرسکتا ہے اس کے متعلق، دین الحق ص ۲۷ جلد اول کو دیکھ لیا جائے، مفتی صاحب کی تردید کے لئے اتنا ہی جواب کافی ہے، تاہم اس جگہ ہم مزید بھی عرض کردیتے ہیں

(۱) تین بار کی مطلقہ

حتی تنکح زوجا غیرہ ،البقرہ، ۲۳۰.

(۲) مشرکہ عورت،

ولاتنکحوا المشرکٰت حتی یؤمن،البقرہ، ۲۲۱

(۳) چار کے بعد پانچویں عورت، (۴) جس سے لعان ہو چکا ہو،

اور ان چار میں دو نمبر دین الحق کی پہلی جلد کے بھی شمار کرلیں، تو بقول مفتی صاحب ان چھ قسم کی عورتوں سے سورۃ النساء کی آیت کی وجہ سے نکاح میں اباحت ہے ،انا للہ وانا الیہ راجعون ،کسی نے کیا خوب کہاہے ،نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان ،

مفتی صاحب کی تیسری دلیل کا جواب

مفتی صاحب کی یہ دلیل سورۃ الانعام کی آیت (۱۱۹) ہے' جس میں ہے کہ تم اس سے کیوں نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام ذکر کیا جائے، اس کے متعلق فقط اتنا عرض ہے کہ یہ آیت حلت وحرمت کے بارہ میں ہے اور یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ حلت میں اصل اباحت ہے، مگر عبادت میں اصل اباحت نہیں اور مفتی صاحب کی جماعت کی جملہ بدعات کا تعلق حلت وحرمت سے نہیں بلکہ عبادات سے ہے لہذا مفتی صاحب کی یہ دلیل دعوی اور اپنے عمل کے موافق نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت' حلال وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی وہ معاف ہے، کا تعلق بھی حلت وحرمت کے ساتھ ہے عبادات میں اس کا سرے سے کوئی واسطہ نہیں ،

مفتی صاحب کی بڑ

مفتی صاحب نے اباحت کا اصول بیان کرنے سے قبل ایک تمھید باندھتے ہوئے یہ شیخی بھی ماری ہے کہ کوئی مقلد کہلانے والا تو اس کا انکار نہیں کرسکتا ،جاء الباطل ص ۲۲۹،

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ حنفیہ میں کئی بزرگ اباحت کے قائل ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ

جمھور فقہاء احناف کا یہ قول نہیں بلکہ چند ایک کا ہے جب کہ جمھور کا موقف ،توقف کا ہے چنانچہ صاحب درمختار فرماتے ہیں ،

ان الصحیح من مذھب اھل السنة ان الاصل فی الاشیاء التوقف والاباحة رائی المعتزلة ،

بلاشبہ اہل سنت کا خالص اور صحیح مسلک یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کی رائے ہے ،الدرالمختار مع الردالمحتار ص ۱۶۱ ج ۴ کتاب الجھاد باب استیلاء الکفار ،

درمختار کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے ،درمختار بحرعلم کی وہ درمختار ہے کہ جب سے تصنیف ہوئی مشارق و مغارب ارض میں فتوائے مذھب حنفی کا گویامدار اس کی تحقیقات عالیہ پر ہوگیا ،اللہ عزوجل رحمت فرمائے علامہ سید ابن عابدین شامی فرماتے ہیں ۔ درمختار نے تمام عالم میں آفتاب چاشت کی طرح شہرت پائی مخلوق ہمہ تن اس سے گرویدہ ہوکر اپنے مہمات میں اس کی طرف التجا لائی یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے مطلوب بنائیں اور اس کی طرف رجوع لائیں کہ یہ دامن مذھب کی زرنگار گوٹ ہے، وہ تصیح و تنقیح کے مسائل جمع ہیں کہ بڑی بڑی کتابوں میں مجتمع نہیں ،آج تک اس انداز کی کتاب تصنیف نہ ہوئی ،

العطا یا النبویة فی الفتاوی الرضویة ، ص ۳۸۲ ج ۳ .طبع احمد رضا اکیدیمی سن ۱۴۱۱ھ،

فقہ حنفی کے اتنے پائے کے مصنف سے مفتی صاحب کا دعوی ایک دیوانے کی بڑ ثابت ہوگیا ، بلکہ اس عبارت کی روشنی میں سوچئے کہ مفتی صاحب کا مسلک اباحت! کس کا ہے اور اس کے مختلف فیہ ہونے میں تو شاید کوئی کوڑھ مغز ہی شک کرے۔چہ جائے کہ ایک حکیم الامت ،مفتی اعظم اور مفسر قرآن ،

بدعات کے دلائل اوران کا علمی و تحقیقی جائزہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل ،

فرماتے ہیں ،رب تعالی فرماتا ہے ،

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعواہ رافۃ ورحمۃ ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الاابتغاء رضوان اللہ ،

پھر فرماتا ہے ،

فاتینا الذین امنوا منھم اجرھم .

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے بدعت حسنہ، یعنی تارک الدنیا ہو جانا ایجاد کیا، رب نے اس کی تعریف کی بلکہ اس پر اجر بھی دیا، ہاں جو اسے نبھا نہ سکے ان پر عتاب آیا فرمایا گیا ،

فما رعوھا حق رعایتھا،

دیکھو ایجاد بدعت پر عتاب نہیں ہوا بلکہ نہ نبھانے پر ،معلوم ہو کہ بدعت حسنہ اچھی چیز ہے اور باعث ثواب ،جاء الباطل ص ۲۱۵،

الجواب

اولاً حضرات گرامی آپ مفتی صاحب کی عبارت کو مکرر پڑھیئے اور غور کیجئے کہ حضرت جی نے آیات قران کا آخر ترجمہ کیوں نہیں کیا !اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ترجمہ سے قارئیں اصل حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے اور جواز بدعت کے استدلال کو غلط جان کر بریلویت کا دامن چھوڑ جائیں گے، اب آیئے الفاظ قران کا معنی ومفہوم پڑھئیے ۔ارشاد ہوتا ہے

پھر ہم نے ان کے قدموں پر ان کے پیچھے (اور) رسول بھیجے اور (سب سے) پیچھے عیسی علیہ السلام کو بھیجا اور اسے انجیل دی اور ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی مہربانی اور رحم ڈالا اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا مگر یہ کہ اللہ تعالی کی رضا کو حاصل کریں، پر اس کی وہ نگداشت نہ کرسکے جو اس کا حق تھا سو ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کا اجر دیا اور بہت ان میں سے فاسق تھے ،سورۃ الحدید آیت ۲۷)

قارئین کرام دیکھئے اللہ رب العزت تو یہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے دین عیسوی کو بگاڑ دیا اور اس میں بدعات ایجاد کی ،ہاں بدعات کی ایجاد میں ان کا مقصد رضا الہی تھا اگر بقول مفتی صاحب اللہ تعالی نے ان کی یہاں تعریف کی ہے تو یہ تو ہر بدعتی کہتا ہے، یہاں تک کہ آج بھی جس قدر مبتدعین ہیں وہ تمام کے تمام یہی کہتے ہیں کہ ہمارا مقصود رضا الہی ہے، قادیانیوں کو ہی لے لیجئے وہ

بھی اپنے مخصوص عقائد کو رضا الٰہی کا ہی نام دیتے ہیں کسی قادیانی نے بھی آج تک یہ دعوی نہیں کیا کہ میں نے قادیانیت کو اللہ تعالی کی نافرمانی اور اس کے ساتھ کفر کرتے ہوئے اور اس کے غضب کو دعوت دینے کے لئے قبول کیا ہے !تو کیا صرف اتنی سی بات کو ہی لیکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ بدعات درست ہیں کیونکہ ان کا مقصود ر لٰہی ہے۔

ثانیاً مفسرین حضرات نے اس کا یہ معنی بھی بیان کیا ہے کہ ہم نے ان پر یہ بدعات فرض نہ کی تھیں بلکہ فرض تو شریعت حقہ پر چل کر رضا الٰہی کا حصول کیا تھا۔چنانچہ امام ابن کثیر فرماتے ہیں

وقوله تعالى (الاابتغاء رضوان الله) فيه قولان (احدهما) انهم قصدوابذلك رضوان الله قاله سعيد بن جبير و قتادة (والاخر) ماكتبنا عليهم ذلك انما كتبنا عليهم ابتغاء رضوان الله .

یعنی اللہ تعالی کا فرمان۔

الا ابتغاء رضوان الله ،

میں دو قول ہیں ایک یہ کہ ان بدعات سے ان کا مقصود رضاالٰہی تھا (یہ امام سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا ہے ،دوسرا یہ کہ بدعات ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھیں بلکہ فرض تو ان پر رضا الٰہی کا حصول تھا،

تفسیر ابن کثیر ص ۳۱۵ ج ۴ ،

اگر اس دوسرے معنی کو تسلیم کر لیا جائے تو مفتی صاحب کا استدلال ہی ختم ہو جاتا ہے اور اگر بالفرض نہ بھی مانا جائے تو تب بھی مفتی صاحب کا استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ان پر شرعی حکم بیان نہیں کیا جارہا بلکہ ان کے دلی خیال اور ایجاد بدعت کی وجہ اور دین میں اختراعات کا پس منظر بیان کیا جارہا ہے کہ شریعت سازی میں ان کی نیت فقط رضاالٰہی کا حصول تھا اور اس کا ہمیں اعتراف ہے کہ مبتدعین کے عوام سادہ لوح ہوتے ہیں وہ ان بدعات کو دین سمجھ کر کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالی کو راضی کرنا ہوتا ہے

اور یہی ہمارا اکابرین بریلویت سے اصولی و بنیادی اختلاف ہے کہ بریلوی عوام ان بدعات کو خالص اور ٹھیٹھ اسلام تصور کرتے ہیں اور ان کے ساتھ فرائض جیسا معاملہ کرتے ہیں منکرین پر ارکان

اسلام کو گھٹانے کا الزام لگاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گیارہویں نہ دینے سے اللہ تعالی اور پیر صاحب کا غضب نازل ہوتا ہے اور بھینس کے دودھ میں خون آنا شروع ہو جاتا ہے، مرگیا مردود فاتحہ نہ درود وغیرہ (ان کی پوری تفصیل آگے آرہی ہے)

ثالثاً، مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں بدعت پر تو اللہ تعالی راضی ہوئے اور ان کو اجر سے نوازا الخ تو یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ

فاتینا الذین امنوا منهم اجر هم ،

کا تعلق ، ابتدعوها) سے قطعاً نہیں بلکہ ،

و جعلنا فی قلوب الذین اتبعوه ،

سے ہے اور آیت قرآنی کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی خالص پیروی کی اور دین عیسوی پر چلے اور نیک اعمال بجا لائے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تصدیق کر ایمانداروں میں شامل ہوگئے ان کو اللہ تعالی نے اجر سے نوازا جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَتْلُوْنَ آيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ☆ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ اُوْلٰئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ(ال عمران ۱۱۳ او ۱۱۴)

ترجمہ۔ سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں (احمد رضا) ۳۔ ۱۱۳و۱۱۴)

یہی مضمون سورۃ الحدید کی اگلی آیت (۲۸) میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ گے تو دوہرا اجر پاؤ گے ایک حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے کا، چنانچہ جملہ مفسرین کرام نے، اجرھم، کی یہی تفسیر بیان کی ہے کہ اجر ان لوگوں کو ملا جو دین عیسوی پر قائم رہے نہ کہ مبتدعین کو چنانچہ علامہ زمخشری حنفی فرماتے ہیں ،

یر ید اهل الرحمة و الرأفة الذین اتبعوا عیسی ، کشاف ص ۴۸۲ ج ۴ ،

علامہ نسفی حنفیؒ لکھتے ہیں

ای اهل الرافة والرحمة الذین اتبعوا عیسی علیه السلام او الذین اٰمنوا بمحمد ﷺ، **(مدارک التنزیل ص ۱۵۹ ج ۵ ،)**

اجر ان لوگوں کو ملا جن کے دلوں میں اللہ تعالی نے رافت و رحمت ڈالی تھی اور دین عیسوی کے پیروکار تھے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے ،

مگر اس کے برعکس مفتی صاحب اس بات پر بضد ہیں مبتدعین کو اجر ملا الخ اگر بالفرض مفتی جی کے بیان کردہ مفہوم کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اجر کس چیز کا ملا؟؟ بدعت کی ایجاد پر یا بدعت پر عمل کرنے کا؟ یقیناً بریلوی علماء کہیں کہ بدعت پر عمل کرنے کا، کیونکہ نیکی پر محض اعتقاد سے اجر نہیں ملتا بلکہ اس پر عمل سے اجر ملتا ہے، جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا، تو اب سنئے کہ بدعت پر تو انہوں نے کما حقہ عمل ہی نہیں کیا ارشاد ہوتا ہے۔

فما ر عوها حق رعا یتها ، ۵۷-۲۷

اسے نہ نباہا جیسا کہ اس کے نباہنے کا حق تھا (احمد رضا)

معلوم ہوا کہ مبتدعین کو اجر ملنے کا مفہوم مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے

رابعاً، اگر اجر مبتدعین کو ملا تو آگے جو اللہ رب العزت نے

و کثیر منهم فسقون ،

کہہ کر مذمت کی ہے، وہ کن لوگوں کے متعلق ہے؟ کیونکہ فسق کا فتوی تو کسی دین کے فرض واجب رکن کے ترک پر ہی لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ مفتی صاحب نے بھی وجوب کے تارک پر فاسق کا فتوی لگایا ہے (جاء الباطل ص ۹۷ ج ۲)

بدعت کو مبتدعین بریلویہ بھی کتابوں میں تحریر کی حد تک دین میں واجب کا درجہ نہیں دیتے، بلکہ ان کے علماء نے صاف لکھا ہے کہ بدعات کے ساتھ فرض واجب کا سا معاملہ کرنا بدعت سیئہ ہے چنانچہ معروف بریلوی عالم مولوی غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمہ کراچی فرماتے ہیں۔

اگر کوئی شخص صلوۃ وسلام (اذان سے پہلے) نہ پڑھے تو اس پر اعتراض اور ملامت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اعتراض اور ملامت صرف واجب اور فرض کے ترک پر کی جاتی ہے اگر اذان سے پہلے یا بعد صلوۃ وسلام نہ پڑھنے پر ملامت کی جاتی رہی تو یہ اس نفلی عبادت کو فرض اور واجب قرار دینے کے مترادف ہوگا اور یہ بعینہ بدعت سیئہ ہے۔

(شرح صحیح مسلم ص ۵۴۸ ج ۲ مطبوعہ فرید بک سٹال لاھور سن ۱۹۹۴م)

سعیدی صاحب کی اس طولانی عبارت سے واضح ہوا کہ بدعات کے منکر پر نکیر کرنا بدعت سیئہ ہے کیونکہ ملامت فقط فرائض یا واجبات میں ہی کی جاسکتی ہے

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تو اب بغور سنئے کہ قرآن کریم نے فاسق مبتدعین کو قرار دیا ہے چنانچہ تفسیر جامع البیان ،میں ہے کہ

الذین غیر دین عیسی ،یعنی فاسق وہ لوگ ہیں جنھوں نے دین عیسوی کو بگاڑ دیا تھا ،ص ۴۶۰)

لیجئے جناب اس دلیل فرقانی نے تو بات ہی صاف کر دی کہ مبتدعین جنہوں نے دین عیسوی میں رہبانیت (ترک دنیا) کی بدعت نکالی تھی وہ فاسق تھے اور یہ مبتدعین بریلویہ پر اقبال ڈگری ہے کیونکہ اس آیت سے بدعتی کی مذمت ثابت ہوگئی۔

خامساً۔ مفسرین کرام نے اس آیت کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا ہے انہوں نے نذر مان کر رہبانیت کی بدعت ایجاد کی تھی چنانچہ علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں ۔

(رهبانية ابتدعوها) ای اخر جوها من عند انفسم و نذروها ،

یعنی قرانی الفاظ ،رھبانیۃ ابتدعوھا ، کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے (دین میں چند چیزیں) نکالیں اور ان کی نذر ومنت مانی، (مدارک التنزیل ص ۱۵۹ ج ۵،)

اس تفسیر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انہوں نے جان کو مشقت میں ڈال کر عبادت کرنے کی ایک ایسی نذر مانی جس کا اللہ تعالی نے حکم نہیں دیا تھا اور جان کو مشقت میں ڈالنے والی نذر ماننا بدعت ہے اور اس کے کرنے سے حضرت محمد مصطفی ﷺ نے منع فرمایا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ كان يقول لاتشددوا على انفسكم فيشدد عليكم، فان قوما شددواعلى انفسهم فشددالله عليهم فتلك بقايا هم فى الصوامع والديار ،رهبانية ابتدعوها ماكتبنا ها عليهم ،

رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سختی مت کرو اپنی جانوں پر ورنہ تم پر بھی سختی ہوگی، کیونکہ بعض لوگوں نے سختی کی تھی، اپنی جانوں پر، تو اللہ تعالی نے بھی ان پر سختی کی، تو یہ سختی ان کی نشانیوں میں سے باقی ہے ان کے گرجاؤں اور عبادت خانوں میں' رہبانیت جو انہوں نے خود ایجاد کی جس کو ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔

سنن ابوداؤد ص ۳۱۶ ج ۲، و مسند احمد ابویعلی ص ۲۱ ج ۴ رقم الحدیث ۳۶۸۲)

اس حدیث نے آیت قرآنی کا مفہوم واضح کردیا کہ تکالیف شاقہ کی نذر ماننے کی انہوں نے بدعت ایجاد کی تھی اور بانی اسلام نے اس سے منع فرمایا ہے خود اللہ رب العزت فرماتے ہیں۔

يريد الله بكم اليسر ولايريد بكم العسر ، البقره ۱۸۵)

اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں ۲/۱۸۵)

وما جعل عليكم فى الدين من حرج،سوره الحج آيت ۷۸.

تمہارے دین میں اس (اللہ نے) تنگی نہیں کی (۲۲-۷۸)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

ان الدين يسر ولن يشاد الدين احد الا غلبه

بے شک دین (اسلام) آسان ہے جو شخص سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کردے گا (بخاری ص ۱۰ ج ۱، ونسائی مجتبیٰ ص ۲۶۸ ج ۲)

الغرض سابقہ امم کے مبتدعین کے بدعی اعمال کے نقش قدم پر چلنے سے اللہ تعالیٰ اور رسول بر حق نے منع فرمادیا ہے،

اور منع فرمانے کے باوجود جو شخص ان کی پیروی کرے اور ان کے عمل سے حجت لائے گا وہ نادان و جاہل اور گمراہ ہوگا، العیاذ باللہ،

مفتی صاحب کا ایک مغالطہ

مذکورہ دلیل قرآنی درج کرنے کے بعد مفتی صاحب نے آگے مزید دلیل نقل کرنے کی بجائے، یہاں ایک عجیب بحث کی ہے، فرماتے ہیں، مشکوۃ باب الاعتصام کی پہلی حدیث ہے کہ،

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد،

جو شخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے ایجاد کرے جو دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے ہم نے ما کے معنی عقیدے اس لیئے کیئے ہیں کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع میں بے نمازی گنہگار ہے بے دین یا کافر نہیں، بداعتقاد یا تو گمراہ ہے یا کافر۔ اس کے ماتحت مرقاۃ میں ہے۔

والمعنی ان من احدث فی الاسلام رایا فهو مردود علیه اقول فی وصف هذا الامر اشارة الی ان امر الاسلام کمل،

معنی یہ ہیں کہ جو اسلام میں ایسا عقیدہ نکالے کہ دین سے نہیں وہ اس پر رد ہے، میں کہتا ہوں کہ ھذا الامر کے وصف میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کا معاملہ مکمل ہو چکا۔

ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا۔ جاء الباطل ص ۲۱۵،

الجواب

مفتی صاحب نے اس پر خاصی لمبی گفتگو کی ہے اور ان کی تحریرات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اعمال میں نئی ایجادات کو بدعت شرعی نہیں کہتے، اب ترتیب وار ان خرافات کا جواب سنیئے

اولاً۔ علماء بریلویہ ہی وضاحت کرسکتے ہیں کہ، عالم الغیب، نور بشر، حاضر و ناظر، مختار کل وغیرہ جیسی بدعات کا تعلق عقیدے سے ہے یا بقول شخصے محض دل لگی کا سامان ہے۔

ثانیاً۔ فقہاء احناف نے بدعت کی یہ تعریف ذکر کی ہے کہ **مااحدث علی خلاف الحق المتلقی عن رسول الله ﷺ من علم او عمل او حال بنوع شبهة واستحسان وجعل دینا قویماً وصراطاً مستقیمًا** بدعت وہ چیز ہے جو اس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو جو رسول کریم ﷺ سے اخذ کیا گیا ہو خواہ وہ علم ہو یا عمل یا حال ہو اور کسی شبہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دین قویم اور صراط مستقیم بنا لیا گیا ہو، فتاوی شامی ص ۵۶۱ ج ۱ و البحرالرائق ص ۳۴۰۹، ج ۱،

اس کی شرح میں علامہ طحطاوی حنفی فرماتے ہیں

باعتبار علم کے بدعتی کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن رؤیت باری تعالی کا منکر ہو، اور بدعتی باعتبار عمل کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قبیلہ میں نیک کام کے لئے اذان دیتا ہو، اور بدعتی باعتبار حال کے یہ ہے کہ کوئی شخص اس نظریہ سے خاموش رہتا ہو کہ چپ رہنا عبادت ہے۔(حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۸۱ طبع مصر س ۱۳۵۶ھ، وصفحہ ۳۰۳ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی باب فی بیان الاحق بالامامۃ

مگر گجرات کے بریلوی حکیم الامت کا باوا آدم ہی نرالا ہے وہ عقیدے کے علاوہ اعمال میں بدعات کو تسلیم ہی نہیں کرتے،

ثالثاً، علم حدیث میں یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ حدیث کے غریب الفاظ کا معنی کرنے کے لئے اس کے تمام طرق پر نگاہ رکھنی بھی ضروری ہے اور زیر بحث حدیث کے الفاظ میں صراحت سے عمل کے الفاظ موجود ہیں۔

من عمل عملا ليس عليه امرنا فهورد ،

جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے کوئی دلیل نہیں تو اس کا وہ کام مردود ہے،

بخاری ص ۱۰۹۲ ج ۲، ومسلم ص ۷۷ ج ۲، وخلق افعال العباد ص ۲۹، ومسند امام احمد ص ۱۴۶ و ۲۵۶ ج ۶، ودارقطنی ص ۲۲۷ ج ۴،

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ بدعت فقط عقیدے میں ہی نہیں ہوتی بلکہ افعال میں بھی ہوتی ہے اگر کسی رضوی محقق کو اب بھی اعتبار نہ ہو تو خود مفتی جی کی حسب ذیل عبارت کو پڑھ لیں،

بدعت کے شرعی معنی ہیں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو حضور علیہ السلام کے زمانہ حیات ظاہری میں نہ ہو بعد میں ایجاد ہوئے نتیجہ نکلا کہ بدعت شرعی دو طرح کی ہوئی ،بدعت اعتقادی اور بدعت عملی۔ جاء الباطل ص ۲۱۴،

اس عبارت میں حضرت مفتی صاحب نے صاف اقرار کیا ہے کہ بدعت اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہوتی ہیں، مگر آگے چل کر وہ اس سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ بزعم خود اس پر دلائل بھی لاتے ہیں، ان کی اس دو رخی تحریر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں ،انہیں عادت ہے بھول جانے کی، یہ عادت فقط مفتی صاحب کی ہی نہیں بلکہ جملہ مبتدعین کی ہے کہ وہ ایک اصول بڑی دھوم دھام سے قائم

کرتے ہیں، پھر آگے چل کر اسی کے خلاف دوسرا گھڑ لیتے ہیں، اس عمل وکردار میں یہ مبتدعین بے بس ہیں، کیونکہ جب انسان شریعت سازی کرے، تو اس سے اس طرح کی ہیرا پھیریاں یقیناً ہوتی ہیں اللہ رب العزت نے کیا خوب کہا ہے،

ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا،

اور اگر قرآن اللہ تعالی کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف ہوتا (النساء ۸۲)

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوۃ باب العلم میں ہے،

من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجور هم شي و من سن في الاسلام سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من اوزار هم شي،

جو کوئی اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے اس کو اس کا ثواب ملے گا اور اس کا بھی جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے ثواب سے کچھ کم نہ ہوگا اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ جاری کرے اس پر اس کا گناہ بھی ہے اور ان کا بھی جو اس پر عمل کریں اور ان کے گناہ میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی،

معلوم ہوا کہ اسلام میں کار خیر ایجاد کرنا ثواب کا باعث ہے اور برے کام نکالنا گناہ کا موجب۔ جاء الباطل ص ۲۱۷،

الجواب

اولاً، مفتی جی نے اپنے تبصرے (معلوم ہوا کہ سے لیکر آخر تک) کو بھی متن حدیث کے بالمقابل ترجمہ میں درج کیا ہے تاکہ سادہ لوح عوام یہ سمجھ لیں کہ یہ بھی حدیث کے ٹکڑے کا ہی ترجمہ ہے، مزید یہ کیا کہ اس کے درمیان کوئی قومہ بھی نہیں ڈالا تاکہ اناڑی تو کجا کوئی اچھا خاصہ اردو دان بھی اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے، مفتی جی کا یہ کردار بالکل اس یہودی کی طرح ہے جس نے آگے پیچھے سے تو تورات پڑھ دی تھی اور آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر چھپا دیا تھا۔

ثانیاً ۔ یہ مفتی صاحب کے دعویٰ کی دلیل قطعی طور پر نہیں ہے کیونکہ حدیث میں سنت حسنہ اور سیئہ کا ذکر ہے اس میں بدعت حسنہ اور سیئہ کا ذکر نہیں، لہذا یہ مفتی صاحب کی بدعت حسنہ کی دلیل کیسے بن گئی ،جبکہ سنت کا لفظ لغت عرب میں ،عادت،طور،طریقہ ،اخلاق وکردار اور طبعیت پر بولا جاتا ہے ،تو ثابت ہوا کہ یہاں پر سنت حسنہ کا لفظ ایسے آدمی پر بولا گیا ہے، جو اچھی عادات وکردار کا مالک ہے ایسا مزاج اور طور طریقے رکھنے والا قابل تحسین ہے اور اس کے برعکس کرنے والا مذموم ہے الغرض یہاں بدعت حسنہ وسیئہ کا کوئی ذکر ہی نہیں ،

ثالثاً ۔ مذکورہ حدیث میں یہ مراد نہیں کہ کسی امتی کا جاری کردہ عمل بھی سنت ہے کیونکہ امتی کی یہ شان نہیں بلکہ اس کا کام تو سنت پر چلنا اور اس سے تمسک کرنا ہے ،ارشاد ہوتا ہے

انما كان قول المؤمنين اذا دعوا الى الله و رسوله ليحكم بينهم ان يقولوا سمعنا و اطعنا و اولئک هم المفلحون (النور ۵۱)

ترجمہ۔ مسلمانوں کی بات تو یہی ہے جب اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان میں فیصلہ فرمائے کہ عرض کریں ہم نے سنا اور حکم مانا اور یہی لوگ مراد کو پہنچے (احمد رضا۔۲۴۔۵۱)

اس آیت قرآنی نے صراحت کر دی کہ امتی کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے ایک اور آیت قرآنی میں امت مرحومہ کو خیر الامت کہا گیا کہ یہ دین کی داعی ہے ارشاد ہوتا ہے

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون بالله ولو امن اهل الكتٰب لكان خيراً لهم منهم المومنون واكثرهم الفٰسقون (ال عمران)آیت ۱۱۰ .

ترجمہ ۔ تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،(احمد رضا) ۳۔۱۱۰)اس دلیل فرقانی سے معلوم ہوا کہ امتی کا کام سنت جاری کرنا نہیں بلکہ سنت کی طرف دعوت دینا ہے خود مذکورہ حدیث میں من سن فی الاسلام کی بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

من دعا الی ھدی ۔جس نے ھدایت کی طرف دعوت دی ،صحیح مسلم ص ۳۴۱ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۹،

ان الفاظ نے ،من سن فی الاسلام ، کے لفظوں کا معنی بتادیا کہ سنت وطریقہ جاری کرنا مراد نہیں بلکہ ہدایت کی طرف دعوت دینا اور اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو عمل کی تلقین کرنا مراد ہے۔

رابعاً۔اس حدیث میں حسنہ کی قید موجود ہے اہل سنت کے نزدیک کسی امر شرعی میں حسن یا قبیح نہیں پایا جاسکتا جب تک اس کا ثبوت شریعت سے نہ ہو جبکہ بدعات کی تو بانی اسلام نے ،کل بدعة ضلالة ، کہہ کر جڑ کاٹ دی ہے لہذا ان میں حسن کہاں سے ثابت ہوگا۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ

کل بدعة ضلالة و ان راها الناس حسنة،

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے خواہ لوگ اسے اچھا ہی سمجھتے ہوں، المدخل للبیہقی (۱۹۱) وعلم اصول البدع ص۹۲

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اس دلیل کو مفتی صاحب نے مستقل شکل دے کر تو بیان نہیں کیا البتہ الجھی ہوئی بحث میں اس کو بیان کیا ہے جسے ہم نے سلجھا کر الگ ایک دلیل کے طور پر بیان کردیا ہے کیونکہ اکثر اہل بدعت جملہ بدعات کے جواز پر اسی سے استدلال کرتے ہیں

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ۔

ماراه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن

جس کام کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ تعالی کے نزدیک بھی اچھا ہے ، جاء الباطل ص ۲۱۹،

الجواب

اولاً ۔ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے علامہ زیلعی حنفی فرماتے ہیں ،

ولم اجده الاموقوفاعلی ابن مسعود ،

نہیں پایا میں نے اس روایت کو مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر موقوف ،

(نصب الرایہ ص ۱۳۳ ج ۴،)

ثانیاً۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ الفاظ حضرت محمد مصطفی ﷺ کا فرمان نہیں بلکہ صحابی

رسول کا قول ہے جو گو سند کے اعتبار سے حسن درجہ کا ہے (الدرایہ ص۱۸۷ ج۲) مگر اس سے بدعات پر استدلال قطعاً درست نہیں، وجہ یہ کہ آج کے تمام مبتدعین ،قادیانی ،منکرین حدیث ،نیچری ،شیعہ وغیرہ اپنے اعمال کو حسن ہی جانتے ہیں، اور اگر اس سے تمام مسلمان مراد ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ عنداللہ بھی محمود ہوگی، تو اس سے مفتی صاحب اور ان کی جماعت کو ذرا بھی فائدہ نہیں، کیونکہ بدعات کی تحسین تمام مسلمانوں نے نہ کبھی کی ہے اور نہ کرتے ہیں اور نہ ہی کریں گے انشااللہ، اور اگر علماء بریلویہ اس سے کوئی مخصوص گروہ مراد لیں تو پھر اس سے صحابہ کرام کی مقدس جماعت مراد ہوگی جیسا کہ اسی حدیث کے ایک طریق میں اس کی وضاحت موجود ہے،

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

ان الله نظر فی قلوب العباد فوجد قلب محمد ﷺ خیر قلوب العباد فاصطفاہ لنفسه فابتعثه بر سالته ثم نظر فی قلوب العباد بعد قلب محمد فوجد قلوب اصحابه خیر قلوب العباد فجعلهم و زراء نبیه یقاتلون علی دینه فما رای المسلمون حسنا فھو عندالله حسن ومارا ؤہ سیئا فھو عندالله سیئٌ ،

یعنی اللہ تعالی نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دل کو تمام بندوں سے اچھا پایا تو اللہ تعالی نے انہیں چن لیا اپنے لئے اور انہیں رسالت دیکر مبعوث فرمایا پھر آپ ﷺ کے بعد بندوں کے دلوں میں دیکھا تو محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کو تمام بندوں سے اچھا پایا تو انہیں اپنے نبی کا وزیر بنایا جو اس کے دین (کے لئے حق) پر جہاد کرتے ہیں سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالی کے نزدیک بھی اچھی ہوگی ،

(مسند امام احمد ص ۳۷۹ ج ۱ رقم الحدیث ۳۵۸۹)

امام حاکمؒ نے اس سے مزید بھی الفاظ نقل فرمائے ہیں

ما رای المسلمون حسنا فھو عندالله حسن و ماراہ المسلمون سیئا فھو عندالله سیی وقد رای الصحابة جمیعا ان یستخلفوا ابا بکررضی الله عنه ،

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالی کے ہاں بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان

برا جانیں وہ اللہ تعالی کے ہاں بھی بری ہوگی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا لہذا ان کی خلافت اللہ کے ہاں بھی اچھی ہوگی،

(مستدرک حاکم ص ۷۸ ج ۳، ونصب الرایہ ص ۱۳۳ ج ۴،)

ان دونوں روایات سے یہ بات کما حقہ ثابت ہوگئی کہ، المسلمون، سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقدس گروہ ہے بلکہ ایک روایت میں وہ اس کی تاکید بھی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلو فرماتے ہیں

من كان مستنا فليستن بمن قدمات فان الحى لاتؤمَن عليه الفِتنةُ اولئك اصحاب محمد ﷺ كا نوا افضلَ هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما و اقلها تكلفا اختار هم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوالهم فضلهم واتبعوهم على اثر هم و تمسكو ابمااستطعتم من اخلاقهم و سيرهم فانهم كانوا على الهدىٰ المستقيم (رواه رزين /قال فى تنقيح الرواة ،ص ۴۵ ج ۱ ، رواه ايضاً الطبرانى فى الكبير مختصراً ورجاله رجال الصحيح ،)

جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے وہ ان لوگوں کی پیروی کرے جو وفات پا گئے ہیں کیونکہ زندہ پر فتنوں سے امن نہیں کیا جاتا اور وہ لوگ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے صحابہ کرام ہیں جو اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں، اور نیک دل والے اور نہایت گہرے علم والے تھے، اور بہت کم تھے تکلف و بناوٹ میں، اللہ تعالی نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین قائم کرنے کے لئے چن لیا، پس ان کی عظمتوں کو پہچانو! اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو، ان کے اخلاق اور سیرت کو جس قدر ممکن ہو پکڑے رکھو، کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے،، روایت کیا اس کو رزین اور طبرانی نے معجم کبیر میں ،(مشکوۃ ص ۳۲،)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ، مار المسلمون حسنا، سے ان کی مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقدس گروہ تھا اور یہ وہی مضمون ہے جسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے،

فعليكم بسنتى و سنة الخلفاالرشدين.

یعنی میری اور میرے خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو ۔(ترمذی مع تحفۃ ص ۳۷۸ ج ۳ ، وابوداؤد ص

۲۷۹ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۵ ، و دارمی ص ۵۷ ج ۱ ، و مسند احمد ص ۱۲۶ ج ۴،)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دوسری روایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور اس سے اعراض کو انہوں نے بدعت سے موسوم کیا ہے۔

اتبعوا و لا تبتدعوا فقد کفیتم.

(ہمارے)نقش قدم پر چلو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت نکالو کیونکہ (اسلام مکمل ہو چکا ہے)تم کفایت کئے گئے ہو، (مجمع الزوائد ص ۱۸۶ ج ۱ باب الاقتدا بالسلف،)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ روایت سے صحابہؓ کا مقدس گروہ مراد ہے اور یہ بات ہم بآواز بلند کہتے ہیں کہ مبتدعین کی جملہ بدعات کی صحابہ کرام سے تحسین ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اور مبتدعین حضرات اپنے رفقاء سمیت بھی مل کر ان بدعات کا ثبوت صحابہ کرامؓ سے مہیا نہیں کر سکتے!

معلوم ہوا کہ اس روایت سے ان کا استدلال باطل ہے

ثالثاً۔اگر بالفرض دومنٹ کے لیئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ،المسلمون، میں الف لام استغراقی ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگ شریک وسہیم ہیں تو اس سے اجماع امت مراد ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ جس کو تمام مسلمان اچھا جانیں وہ عنداللہ بھی اچھا ہوگا، اختلاف کی صورت میں اچھا ہونے کا دعوی کس دلیل پر قائم ہے، جبکہ ایجاد بدعت پر کبھی تمام مسلمان متفق نہیں ہوئے اور نہ آئندہ ممکن ہے انشاء اللہ۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

وفی حدیث مرفوع و لاتجمع امتی علی الضلالۃ ،

اور حدیث مرفوع میں ہے کہ میری امت گمراہی پر متفق نہ ہوگی ،

جاء الباطل ص۲۱۹،

الجواب

اولاً۔اس سے امت کا اجماع مراد ہے اور وہ بھی علماء اسلام کا نہ کہ عوام کا ،چنانچہ ملا علی القاری حنفی التوفی سن ۱۰۱۴ھ،اس کی شرح میں فرماتے ہیں

فالحديث يدل على ان اجتماع المسلمين حق والمراد اجماع العلماء ولاعبرة باجماع العوام لانه لايكون عن علم .

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں کا اجماع حق اور صحیح ہے اور اجماع سے مراد علماء کا اجماع ہے عوام کا نہیں کیونکہ انہیں (دین) کا علم نہیں ، مرقاۃ ص ۲۴۹ ج ا (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)

ثانیاً۔ اگر ہم سے پوچھتے ہو تو ہمارے نزدیک فقط صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہی حجت شرعی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہوا ہے

مااناعليه واصحابى، الحديث .

یعنی جنت میں وہ گروہ جائے گا جس نے میری اور میرے صحابہ کی پیروی کی ، ترمذی کتاب الایمان باب ماجاء فی افتراق هذه الامة)

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کسی زمانہ میں بھی اجماع کا دعوی صحیح نہیں کیونکہ اس کے علم کا ہمیں یقینی علم ناممکن ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فقہاء سکوت کو اجماع کہہ دیتے ہیں حالانکہ اس میں اختلاف کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی ،یا کسی ایک علاقہ اور شہر کے اتفاق واتحاد کو وہ اجماع کا نام دے دیتے ہیں حالانکہ وہ امت کا ایک جزو ہیں اور جزو کل نہیں ہوسکتا، انہیں حقائق کے پیش نظر حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں

من ادعى الاجماع فقد كذب، (رواه عبد الله ابن الامام احمد عن ابيه فى، مسائله ص ۳۹۰، علم اصول البدع ص ۱۳۵)

اجماع کا دعوی کرنے والا کاذب ہے،

امام شافعیؒ نے اسے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے۔

مالايعلم فيه خلاف فليس اجماعاً،،

جس مسئلہ میں اختلاف کا علم نہ ہوتو اس میں اجماع نہیں ہوسکتا، اعلام الموقعین ص ۲۴ ج ۱،
ہاں اگر کسی قطعی ویقینی خبر سے اجماع جہری ثابت ہوتو وہ حجت ہے مگر شرط یہ ہے کہ قران و حدیث کے خلاف نہ ہو کیونکہ قران وسنت کے خلاف نہ اجماع حجت ہے نہ قیاس۔

ثالثاً۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں سلیمان بن سفیان راوی ہے، ترمذی مع تحفہ ص ۲۰۷ ج ۳،

جو کہ متکلم فیہ ہے چنانچہ امام دوری امام ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ثقہ نہیں دوسری روایت میں کہا، لیس بشئی (ہیچ محض ہے) امام ابن مدینی فرماتے ہیں، منکر احادیث روایت کرتا ہے، امام ابوحاتم کا کہنا ہے، ضعیف الحدیث ہے اور ثقات سے منکر احادیث بیان کرتا ہے، امام ابوزرعہ فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے، امام دولابی کا کہنا ہے ثقہ نہیں امام بخاری فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے دارقطنی کا فیصلہ ہے ضعیف ہے، تھذیب ص ۱۷۰ ج ۴، طبع مکتبہ فاروقیہ ملتان،

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوۃ کے شروع میں ہے

انماالاعمال بالنیات وانمالامرئ مانوی.

اعمال کا دارو مدار نیتوں پہ ہے اور انسان کے لیئے وہی ہے جو نیت کرے، وجہ استدلال میں فرماتے ہیں، ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو جائز کام نیت ثواب سے کیا جائے وہ عنداللہ بھی کار ثواب ہے۔ جاء الباطل ص ۲۱۹۔۲۲۰،

الجواب

اولاً۔ اس حدیث میں فقط نیت فاسد اور نیت صالحہ کا بیان ہے، بدعات سے اس کا کیا تعلق ہے؟

مفتی صاحب کا استدلال فقط اتنی بات پر ہے کہ چونکہ بریلوی مکتب فکر کے عوام وخواص ان بدعات کو خلوص دل سے نیک کام جان کر کرتے ہیں لہذا یہ بدعات کار ثواب ہیں، ہم پوچھتے ہیں کیا مکہ کے مشرکین بتوں کو سجدہ گناہ اور کفر سمجھ کر کرتے تھے؟ کیا آج کے بت پرست ہندواور آگ

کی پرستش کرنے والے اسے دین داری اور صالحیت نہیں جانتے؟ اس سے بھی نیچے آیئے تو کیا آج کے مسلمان قبروں پر سجدہ عبادت جان کر نہیں کرتے؟ اور اس میں ان کی نیت صاف ہوتی ہے، قوالی کو تو خود مفتی صاحب نے اپنے استاد کے کہنے پر ترک کردیا تھا، تذکرہ اکابر اہل سنت ص ۵۸)

تو کیا اس میں ان کی نیت صالحہ نہ تھی کہ استاذ نے منع کردیا، اس سے بھی بڑھکر سنئے کہ مثال کے طور پر ایک شخص کا مقصد تو یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوہ عورتوں کی پرورش ہے، مگر اس نیک کام کے لیئے وہ چوری اور رہزنی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتا ہے، تو گو اس کا مقصد اور نیت نہایت پاکیزہ ہے، مگر کوئی مبتدعین کا مفتی بھی مذکورہ حدیث کی بنا پر اس کے فعل کو جائز قرار نہیں دے گا، بلکہ صاف فتوی صادر کرے گا شریعت کی نگاہ میں وہ چور اور رہزن ہے اس پر حدود قائم ہوں گی۔

لیکن اس کے برعکس ایک دوسرا شخص حقیقت میں تو لوگوں کو ٹھگ کر روپیہ کمانا چاہتا ہے، لیکن عوام پر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیئے مسجد میں بیٹھ کر علم دین کی تعلیم دیتا ہے، مواعظ و نصائح کے دریا بہاتا ہے اور اپنا وقت ذکر الٰہی میں صرف کرتا ہے، تو گو اس کے یہ افعال نہایت مقدس ہیں مگر وہ گندا مقصد و نیت جس کے لئے اس نے یہ روپ دھارا ہے اس کے حسن عمل کی پونجی کو نہ صرف برباد کردیتا ہے بلکہ اس پر فریب دینداری سے اس کا جرم اور بھی زیادہ سنگین ہوجاتا ہے اور یہی صورت آنحضرت ﷺ نے مذکورہ حدیث میں ہجرت کی مثال دیکر بیان فرمائی ہے کہ گو ہجرت ایک نیک اور دین کا اہم رکن ہے لیکن اگر کوئی شخص ہجرت اس بنا پر کرتا ہے کہ وہ کسی حسین و جمیل خاتون سے شادی کرے گا تو اس کی ہجرت عنداللہ غیر مقبول اور عبادت نہ ہوگی بلکہ شرعی طور پر وہ جس مقصد کے حصول کے لئے گیا تھا وہی عنداللہ لکھا بھی جائے گا۔

ثانیاً۔ جس طرح نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کسی فعل کو کرنا سنت ہے اسی طرح کسی کام کو ترک کرنا بھی سنت ہے لہذا آپ علیہ السلام کے کسی فعل کے چھوڑنے کی اتباع بھی سنت ہے اسی حدیث، انما الاعمال بالنیات، کی شرح میں ملاعلی القاری الحنفی لکھتے ہیں

والمتابعة كما تكون في الفعل يكون في الترك ايضاً فمن واظب على فعل لم يفعله الشارع فهو مبتدع

یعنی پیروی جس طرح فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی پیروی ہوتی ہے پس جس

نے کسی ایسے کام میں مواظبت کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے (مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۴۱ ج ۱،

شیخ عبدالحق محدث دھلوی حنفی فرماتے ہیں ۔

اتباع همچنا ن که در فعل واجب است در ترک نیز می بایدپس آنکه مواظبت نماید بر فعل آنچه شارع نکرده باشد مبتدع بود، کذا قال المحدثون.

یعنی پیروی جس طرح فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی واجب ہوگی سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی جو شارع علیہ السلام نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا اسی طرح محدثین کرام نے کہا ہے

اشعۃ اللمعات ص ۳۶ ج ۱ طبع مکتبہ نورانی پشاور،

مولوی قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوۃ میں فرماتے ہیں کہ اور اتباع کرنا آنحضرت ﷺ کا جیسے فعل آنحضرت ﷺ میں حرام ہے ویسے ہی جو حضرت نے کبھی نہ کیا ہو اس فعل کے نہ کرنے میں بھی اتباع لازم ہے مظاہر حق ص ۱۲۱۹

طبع نول کشور

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ جن افعال کو نبی کریم ﷺ نے ترک کیا ہے ان کا چھوڑنا ہی سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے اور یہی ہم کہتے ہیں کہ آج مبتدعین کی جملہ بدعات جنہیں وہ کرتے ہیں ان کے دواعی ومحرکات آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں بھی موجود تھے مگر آپ علیہ السلام نے ان کو چھوڑا اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی پیروی کرنا سنت کی پیروی ہے اور اس کی مخالفت بقول محدثین کرام بدعت ہے

لہذا مفتی صاحب کا نیت صالحہ سے ایجاد بدعت پر استدلال غلط ٹھہرا،

مفتی جی کا ایک سنت کو بدعت کہنا

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں

روزہ افطار کرتے وقت زبان سے دعا کرنا (اللھم لک صمت) الخ اور سحری کے وقت دعا مانگنا

کہ (اللھم بالصوم لک غداً نویت) بدعت ہے، جاء الباطل ص ۲۲۱ ج ۱،

الجواب

اولاً حضرت مفتی صاحب علم حدیث سے نہ صرف کہ کم آگہی رکھتے تھے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سرے سے ہی کورے چٹے تھے بلاشبہ روزہ رکھنے کی دعا کسی حدیث سے ثابت نہیں اور اسے یار لوگوں نے اختراع کر رکھا ہے، مگر روزہ افطار کرنے کی دعا کو مفتی صاحب کا بدعت قرار دینا زیادتی ہے کیونکہ یہ دعا تو سنن ابوداؤد مع عون ص ۲۷۸ ج ۲، میں موجود ہے مانا کہ یہ سند کے اعتبار سے مرسل ہے لیکن مراسیل تو احناف کے نزدیک حجت ہیں خود مفتی صاحب کو اس اصول و ضابطے کا اقرار ہے، جاء الباطل ص ۷ ج ۲)

لہذا اس پر بدعت کا فتوی صادر کرتے وقت مفتی صاحب کو بخوبی غور کرنا چاہیے تھا۔

ثانیاً، ایک حسن حدیث میں حسب ذیل دعا مروی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ افطاری کی وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے،

ذَهَبَ الظَّمَا وَابْتَلَّتْ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰه،

یعنی پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا اگر اللہ نے چاہا، ابو داؤد مع عون ص ۲۷۸ ج ۲، ومستدرک حاکم ص ۴۲۲ ج ۱، و بیہقی ص ۲۳۹ ج ۴ ودارقطنی ص ۱۸۵ ج ۲، والسنن الکبریٰ للنسائی ص ۶/۸۲ (رقم الحدیث ۱۰۱۳۱)

اس حدیث کو حاکمؒ و ذہبیؒ نے صحیح اور امام دارقطنیؒ اور علامہ البانیؒ نے ارواء الغلیل ص ۳۹ ج ۴ (۹۲۰) میں حسن کہا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ علی الاطلاق روزہ افطار کرنے کی دعا کو بدعت کہنے والا علوم اسلامیہ سے جاہل ہے اور وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے مبتدعین کا ہیرو کہا جائے۔

باب

فرداً فرداً بدعات پر تنقید

محفل میلاد کی شرعی حیثیت

شریعت کوکسی بڑے سے بڑے انسان کی موت و حیات سے اس طرح کوئی دلچسپی نہیں کہ ان کی (ثواب جان کر سالگرہ) منائی جائے یا نوحہ وغم کرکے ان کی برسی رچائی جائے بلکہ صاف ارشاد فرمایا:۔

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ماکسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون(البقرہ،۱۳۴)

ترجمہ۔یہ جماعت گزر چکی ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال کا(۲۔۱۳۴)

آخر اتنے انبیاء کرام اس دنیا میں آئے جن کی تعداد خود رسول اللہ ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ھزار بیان فرمائی ہے ،مشکوۃ ص ۵۱۱،اور بعض کو نہایت بے دردی سے شہید بھی کردیا گیا (البقرہ آیت نمبر ۶۱) ال عمران۱۱۲)

اور تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا اسلام کا اہم اور بنیادی رکن ہے پہلے پارے کے ابتداہی میں متقی کی تعریف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا،

وماانزل من قبلک(البقرہ)

اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں (سب پر ایمان لاتے ہیں)

ایک دوسرے مقام پر بعض انبیاء کرام کا ذکر بیان فرما کر ارشاد ہوا،

قولوا امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھم و اسمعیل و اسحٰق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ و عیسیٰ و ما اوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احدٍمنھم و نحن لہ مسلمون (البقرہ، ۱۳۶)

ترجمہ۔(مسلمانو ں) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو(صحیفے) ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پرنازل ہوئے ان پر جو(کتابیں) موسی اورعیسی کو عطا ہوئیں ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان(سب پرایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی اللہ واحد کے فرمانبردار ہیں ،۲-۱۳۶۔

اس آیت کریم میں انبیاء کرام کے متعلق ایک اصل الاصول بتادیا کہ اسلام میں بعض انبیاء کرام کے انکار کی گنجائش قطعاً موجود نہیں بلکہ سورۃ النساء میں اسے کفر سے تعبیر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذین یکفرون باللہ و رُسُلِہٖ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رُسُلِہٖ و یقولون نؤمن ببعض و نکفر ببعضٍ و یریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلاً☆اولئک ھم الکٰفرون حقاً واعتدنا للکٰفرین عذاباً مھیناً. (النساء ۱۵۰-۱۵۱)

ترجمہ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کونہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں وہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے،(۴-۱۵۰-۱۵۱)

ان آیات بینات کی رو سے ہم اس بات کے مکلف ٹھہرائے گئے ہیں کہ تمام انبیاء کرام پر ہم یکساں ایمان لائیں، اب اگر ہم ایک ایک کی عید میلاد منائیں تو دن میں بیسیوں دفعہ ہمیں محفل میلاد سجانا پڑیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تیئس سالہ زمانہ رسالت اور خلافت راشدہ میں ایسی کوئی محفل نظر نہیں آتی بلکہ خیر القرون کے پورے زمانہ میں دو عیدوں کے علاوہ ہمیں تیسری کوئی عید نظر نہیں آتی ،عید میلاد کا انعقاد تو کجا کسی صحابی سے کوئی قول منقول نہیں کہ یہ بھی ثواب کا کام ہے حالانکہ ہم محبت نبوی ﷺ میں صحابہ کرام کی گرد راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

بقول مفتی احمد یار خان اس کی ابتدا چھٹی صدی ہجرئی میں ہوئی اور اس کا موجد مظفرالدین ابو سعید کوکبری (المتوفی ۶۳۰ھ) تھا ،چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں۔

جس بادشاہ نے پہلے اس کو ایجاد کیا وہ شاہ اربل ہے ،جاء الباطل ص ۲۳۷، اسی طرح بریلویت کا معروف عالم دین مولوی عبد السمیع، رامپوری لکھتا ہے، میلاد شریف کا معین کرنا بعد میں ہوا یعنی چھٹی صدی کے آخر میں ،انوار ساطعہ مع براھین قاطعہ ص ۱۶۳ طبع کراچی سن ۱۹۸۷ء، حافظ سیوطی نے الحاوی للفتاوٰی ص ۱۲۹ج ۱ میں بھی یہی مؤقف اختیار کیا ہے کہ اس کا موجد بادشاہ اربل ہے، ممکن ہے کہ موصل میں ابو سعید کوکبری نے سب سے اول اس کا انعقاد کیا ہو مگر اس کے موجد فاطمی خلفاء تھے، جیسا کہ علامہ مقریزی نے، المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والاثار ص ۴۹۰ ج ۱ میں علامہ

ابوالعباس احمد بن علی القلقشندیؒ نے، صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء ص ۴۹۸ ج ۳ میں، لکھا ہے، الغرض عید میلاد کے بانی رافضی ہیں، بہرحال جو بھی ہو یہ اسلام میں ایک ایسی بدعت ہے جس کے خیر القرون میں نہ ہونے کا بریلوی علماء کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ

مولانا غلام رسول سعیدی صاحب حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ فرماتے ہیں

سلف صالحین یعنی صحابہ اور تابعین نے محافل میلاد نہیں منعقد کیں بجا ہے، شرح صحیح مسلم ص ۱۷۹ ج ۳،

پھر اس کی تاویل کرتے ہوئے عذر گناہ بدتر از گناہ، فرماتے ہیں

صحابہ اور تابعین کے محافل میلاد منعقد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ دن رات دین کے اہم کاموں میں مشغول رہتے تھے مثلاً اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کرنا، کافروں کو مسلمان کرنا، مرتدوں اور دین کے باغیوں کو تہہ تیغ کرنا، حدود الہیہ قائم کرنا اور اسلام کا سورج جو کہیں غروب نہ ہوتا تھا ان تمام شہروں میں نظم ونسق قائم کرنا، بلفظہ شرح مسلم ص ۱۷۹ ج ۳،

راقم عرض کرتا ہے کہ کیا آج ان اہم دینی کاموں کی ضرورت ختم ہوگئی ہے جہاد تو قیامت تک جاری رہے گا اسی طرح کفار کو مسلمان بنانا اور حدود الہی کو قائم کرنا بھی منسوخ نہیں ہوا تو پھر آپ حضرات ان اہم اور غیر معمولی شریعت حقہ کے ارکان کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں جبکہ ان کے کرنے والے کے ساتھ رب تعالی کا وعدہ بھی ہے۔

یایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃٍ تنجیکم من عذاب الیمٍ☆تؤمنون باللہ و رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ذلکم خیرٌ لکم ان کنتم تعلمون☆ یغفرلکم ذنوبکم و یدخلکم جنٰتٍ تجری من تحتھاالانھٰر و مسٰکن طیبۃ فی جنٰتِ عدنٍ ذلک الفوز العظیم(الصف ۱۰ تا ۱۲).

ترجمہ۔مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے (وہ یہ کہ) اللہ رب العزت اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں، جس میں نہریں بہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں داخل کرے گا

یہ بڑی کامیابی ہے (۶۱۔۱۰ تا ۱۲)۔

الغرض جو شخص اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کرتا ہے اس سے تو اللہ تعالی نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کا منکر پکا کافر اور دین اسلام سے خارج ہے اب اگر کوئی شخص ان اہم کاموں کو ترک کر کے محافل میلاد منعقد کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا میلاد منانا بقول سعیدی صاحب اسی وجہ سے ہوگا کہ وہ ان اہم اور غیر معمولی دین کے کاموں سے غفلت کرے گا کیونکہ جنھوں نے غفلت نہ کی تھی ان کا دامن ان بدعات سے پاک تھا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد نہ کرنے والا اور اس سے غفلت کرنے والے کے متعلق علماء بریلویہ کیا فرماتے ہیں، ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ،علامہ فاکہانی رحمہ اللہ سے اس کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ

لا اعلم لهذا المولد اصلاً في كتاب ولا سنة ولا ينقل عمله عن احد من علماء الامة الذين هم القدوة في الدين المتمسكون بالاثار المتقدمين بل هو بدعة احدثها البطالون وشهوة نفسي اعتنى بها الا كالون،

یعنی کتاب اللہ اور سنت نبویہ میں اس میلاد کا، میں کوئی اصل نہیں جانتا اور علمائے امت جو کہ دین میں (آنے والوں کے لیے) نمونہ اور متقدمین کے آثار کو تھامنے والے تھے، ان میں سے کسی ایک سے بھی اس کا عمل منقول نہیں بلکہ یہ بدعت ہے، جسے باطل پرستوں اور نفسانی خواہشات کے خوگر اور پیٹ کے پجاریوں نے گھڑا ہے، المورد في الكلام على المولد، بحواله حسن المقصد في عمل المولد، مندرجه الحاوی للفتاوی ص ۲۲۳ ج ۱ طبع دار الفكر،

امام ابن الحاج فرماتے ہیں کہ

ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلک من اکبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلون في شهر ربيع الاول من المولد وقد احتوى على بدع محدمات،

یعنی لوگوں کی نئی بدعات میں سے جسے وہ سب سے بڑی عبادات اور شعائر اسلامیہ کے اظہار کا اعتقاد کرتے ہیں، ایک یہ بھی ہے جو ماہ ربیع الاول میں مجلس میلاد کا قیام ہے اور یہ بہت سی بدعات اور محرمات کو شامل ہے۔

المدخل ص ۲۲۹ ج ۲۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ

لم يفعله السلف مع قيام المقتضى له وعدم المانع فيه لو كان خيرا محضا او راجحا لكان السلف رضى الله عنهم احق به منا فانهم كانوا اشد محبة لرسول الله صلى الله عليه وسلم وتعظيما له منا، و هم على الخير احرص و انما كمال محبته و تعظيمه فى متابعة وطاعته واتباع امره واحياء سنة باطنا و ظاهرا و نشر ما بعث به و الجهاد على ذلك بالقلب والبد و اللسان فان هذه طريقة السابقين الاولين من المهاجرين والانصار و الذين اتبعوهم باحسان.

یعنی سلف صالحین نے محفل میلاد کا انعقاد اس تقاضے کا قیام اور رکاوٹ و مانع کے نہ ہونے کے باوجود نہیں کیا اور اگر یہ محض خیر و بھلائی یا راجح بات ہوتی تو سلف صالحین ہماری نسبت اس کے زیادہ حق دار تھے، وہ ہماری نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم میں زیادہ سخت اور نیکی کے کاموں میں زیادہ حریص تھے، آپ کی محبت اور تعظیم کا کمال آپ علیہ السلام کی ظاہراً و باطناً اطاعت کرنے آپ علیہ السلام کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنے اور جو احکامات دیکر آپ علیہ السلام کو بھیجا گیا انہیں پھیلانے اور ان امور پر دل ہاتھ زبان کے ساتھ جہاد کرنے میں ہے، اور یہی طریقہ انصار و مہاجرین کا ہے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور ان کے اچھے طریقے کے ساتھ پیروی کرنے والوں کا تھا۔ (اقتضاء الصراط المستقيم لمخالفة اصحاب الجحيم ص ۶۱۵ ج۲)

الغرض اس بدعت کا وجود خیر القرون میں نہ تھا اس کی ایجاد شیعوں نے کی اور ان کی پیروی کرتے ہوئے چھٹی صدی ہجری میں ایک مسرف بے دین بادشاہ مظفرالدین ابوسعید کوکبری نے اس کو سیاست دانوں کی طرح استعمال کیا' میلاد کی تقریب منانے کے لئے ماہ صفر میں ہی تیاری شروع کر دیتا ہر قسم کے قوال گانے بجانے والے حضرات اکھٹے ہو جاتے بقول حافظ ابن کثیر جس میں وہ خود بھی رقص (ناچ) کرتا تھا۔ البدایہ ص ۲۵۶ ج ۱۳ مترجم۔

اور جس دنیا پرست مولوی نے اس کے لئے مواد جمع کیا، وہ عمر بن دحیۃ ابوالخطاب المتوفی سن ۶۳ تھا، اسکے متعلق حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں

کثیر الوقیعة فی الائمة و فی السلف من العلماء خبیث اللسان احمق شدید الکبر قلیل النظرفی امور الدین متھاونا،

وہ ائمہ دین اور علماء سلف کی شان میں کثرت سے گستاخیاں کرتا تھا، گندی زبان کا مالک تھا، احمق اور بڑا متکبر تھا، کم علم اور دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سست تھا، لسان المیزان ص ۲۹۶ ج ۴،

حافظ ابن حجرؒ نے ص ۲۹۵، میں ابن نجار کے حوالے سے صراحت کی ہے کہ محدثین اس کے جھوٹے اور ضعیف ہونے میں متفق ہیں، لسان، اب جس کا جی چاہے وہ خیرالقرون کی اتباع کرے یا شعیوں و رافضیوں کی ایجاد کردہ بدعت اور نفس پرست بادشاہ اور احمق و متکبر مولوی کی سیاسی عیاری کی؟ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

محبت رسول ﷺ کا معیار

محبت کا معیار نعرہ بازی نہیں اور نہ ہی یہ موسمی چیز ہے کہ ربیع الاول میں تو یہ سیلاب بن کر آئے اور باقی سارا سال آپ کو احساس تک نہ ہو کہ ہمارا کوئی رسول بھی ہے، محبت و الفت دائمی تعلق کا نام ہے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے،

ان ربی رحیم و دود، سورہ، ھود آیت نمبر ۹۰.

بیشک میرا پروردگار رحم کرنے والا (اور) محبت کرنے والا ہے،

اب ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت نے مخلوق پر رحم کرنے اور اس سے محبت کرنے کا کوئی خاص دن اور وقت متعین نہیں کیا بلکہ وہ ہمہ وقت مخلوق پر مہربان اور محبت کرنے والا ہے اسی طرح خالق ارض و سماء نے بہشت میں مومن کو ملنے والی حوروں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

فجعلنھن ابکارا عربا اترابا (الواقعة ۳۶، ۳۷)

پھر ہم نے ان کو کنواریاں بنایا شوہر سے محبت کرنے والیاں اور ہم عمر،

اس فرمان رب تعالی کا بھی یہی منشا ہے کہ وہ حوریں مومن کی فرمانبردار اور مطیع ہونگی، ان کے اشاروں پر مر مٹنے والیاں اور غیر معمولی الفت و محبت کرنے والیاں ہونگی وہ تعمیل ارشاد میں ہمہ تن

گوش ہوں گی کیونکہ محبت والفت ہے ہی اسی چیز کا نام، ایسے ہی محبت رسول کا ہم سے تقاضا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں ان کی سیرت اور اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا محور بنائیں ان کے اقوال وافعال کو بلا شرکت غیر قبول کریں ان کے اعمال کو بغیر قیل و قال کے لائحہ عمل بنائیں ان کے حکم کو بغیر حیل وحجت کے تسلیم کریں ان کی ممانعت کو نص جان کر ترک کر دیں الغرض بڑی سادگی ہے ان کی تشریح وتوضیح کو حرف آخر قرار دیں یہی ان کی ذات مقدسہ سے والہانہ عقیدت ومحبت ہے

خودسید الثقلین امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ایک حدیث میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اے میرے بیٹے اگر تجھ سے یہ بات ہو سکے کہ صبح و شام کسی کے لئے اپنے دل میں کھوٹ نہ رکھے تو پھر ایسا کر، پھر فرمایا اے میرے بیٹے،

ذلک من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی و من احبنی کان معی فی الجنة ، رواه الترمذی

یعنی یہ کام میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا، مشکوۃ ص ۳۰۔

محبت رسول ﷺ کی آڑ میں لیڈروں کی سیاسی چالیں

جن لوگوں کو نماز روزہ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ سارے اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، وہ آج کل ہماری قوم کے لیڈر اور قائدین بن جاتے ہیں اور عوام سے ووٹ طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں کلمہ طیبہ اور قران کریم آپ کے ووٹ کے حق دار ہیں، آپ حضرات نے ہمیں کیا، ان کو ووٹ دینا ہے پھر اقتدار میں آکر یہ لوگ عوام سے کیئے ہوئے تمام وعدے بھول جاتے ہیں، ہاں البتہ کوئی نا کوئی ایسا فعل وعمل کرتے ہیں جس سے ان کا مقصود نمائش و دکھلاوہ ہوتا ہے وہ کبھی عید میلاد کا ڈھونگ رچاتے ہیں تو کبھی معراج کے نام پر کوئی سیمینار منعقد کرتے ہیں تو کبھی بنک بیلنس کی شرح سود کو منافع کا نام دیتے ہیں تو کبھی عوام کی دولت ہڑپ کرنے کی غرض سے چارے کے کھیت پر عشر لگا کر دین دار طبقہ سے داد تحسین وصول کرتے ہیں، انہیں طبقہ ملوک کے متعلق حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کیا خوب کہا ہے،

وهل افسدالدین الاالملوک ،واحبار سوءٍ ورھبا نہا،

ماہر نفسیات قسم کے یہ لوگ حقیقی معنوں میں عوام کے دین سے محبت وعقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور جاہل عوام کو خوش کرنے نیز اپنے اقتدار کو لمبا کرنے کے لئے یہ حضرات دین میں ایسے ایسے تصرفات کرتے ہیں کہ عقل وخرد اور ارباب حل وعقد تک کو یہ لوگ مات کرجاتے ہیں بادشاہی کے نشے سے چور یہ لوگ ،اکبر کا دین الٰہی ۓ تک مرتب کردیتے ہیں قرآن جیسی نعمت جو کہ کلام الٰہی ہے کو مخلوق کہتے ہوئے یہ لوگ کوئی عار محسوس نہیں کرتے اگر بادشا ہوں کا مرتب کردہ اسلام اور ان کے تصرفات کو قبول کرنے کا دروازہ کھول دیا جائے تو یقین جانئے

کہ اسلام کا حلیہ ہی بگڑ جائے اور دین اسلام کے بنیادی و اساسی عقائد وقواعد اور ضوابط بلکہ عبادات تک کا جنازہ نکل جائے ،ان لوگوں کے سامنے جس نے بھی حق کا علم بلند کیا انہیں جیل دیکھنا پڑی یا تختہ دار پر لٹکا دیا گیا،

اسی لئے شریعت حقہ میں صاف کہا گیا ہے کہ خلافت فقط تیس سال ہی رہے گی اس کے بعد بادشاہی وملوکیت پھیل جائے گی اور قابل **عمل** فقط خلفاء الراشدین ہی ہوں گے ۔صرف انہیں کا بنایا ہوا اصول و ضابطہ ہی تمہارے لئے نمونہ و اسوہ ہوگا وہی صرف دلیل کے لائق ہوگا کیونکہ ان کا عمل سنت خیر الانام میں داخل ہوگا ارشاد ہوتا ہے ۔

فعلیکم بسنتی و سنۃالخلفاء الراشدین .

یعنی میری اور میرے خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو، ترمذی ص ۳۷۸ ج ۳، و ابوداؤد ص ۲۷۹ ج ۲ ، و ابن ماجہ ص ۴، و دارمی ص ۵۷ ج ۱، ومسند احمد ص ۱۲۶ ج ۴۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی ۔

ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لناعیدا لاولنا واخر نا ،

معلوم ہوا کہ مائدہ آنے کے دن کو حضرت مسیح علیہ السلام نے عید کا دن بنایا آج بھی اتوار کو عیسائی اسی لئے عید مناتے ہیں کہ اس دن دسترخوان اترا تھا اور حضور علیہ السلام کی تشریف آوری اس مائدہ سے بڑھ کر نعمت ہے لہذا ان کی ولادت کا دن بھی یوم العید ہے

الجواب

اولاً: اسے کہتے ہیں دو اور دو، چار روٹیاں، حضرت مفتی صاحب کو محفل میلاد کے لئے اگر کوئی

دلیل ملی ہے تو وہ بھی عمل نصاری سے بہت خوب کہتا کبوتر باز با باز

ثانیاً: معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے آیت قرآنی کا ترجمہ کیوں بیان نہیں کیا ہم تو یہی جانتے ہیں کہ کھتری کی طرح اس میں بھی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔

ثالثاً: آیت قرآنی کے الفاظ ، لاولنا و اخرنا، میں کون لوگ مراد ہیں اگر عیسائی ہیں یقیناً وہی مراد ہیں جیسا کہ مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

دیکھئے مدارک ص ۲۲ ج ۲

(والکشاف ص ۲۹۳ ج ۱)

چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین پیر کرم شاہ صاحب بھیروی فرماتے ہیں

لاولنا و اخرنا،

سے مراد یہ ہے کہ جو اس مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے ایمان لا چکے اور جو بعد میں ایمان لائیں گے یہ سب کے لئے فرحت و شادمانی کا دن ہوگا ،ضیاء القرآن ص ۵۲۳ ج ۱۔

پیر کرم شاہ صاحب کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ اس کے مخاطب ہی عیسائی ہیں اور عمل نصاری سے حجت پکڑنا کم فہمی کی دلیل ہے کیونکہ دین عیسوی منسوخ ہو چکا ہے اور ان کے کسی قول وفعل کو پکڑنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تصدیق لازم ہے اگر بے تصدیق ہی منہ اٹھا کر ان کے پیچھے چل دیئے تو نتیجہ برا نکلے گا،ارشاد ہوتا ہے

یا یھا الذین امنوا إن تطیعوا الذین کفروا یردوکم علی اعقابکم فتنقلبوا خسرین (ال عمران ۱۵۰)

مسلمانو!ں اگر تم کافروں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں پھیر دیں گے اور تم گھاٹے میں جا پڑو گے (۳۔۱۵۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے پیچھے چلنا ان کی ایسی باتوں پر عمل کرنا جس کی اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ نے تصدیق نہیں کی ،خسارے کا موجب اور عذاب الہی کو دعوت دینا ہے، اس تمہید کے بعد ہم پورے جزم و یقین اور وثوق سے کہتے ہیں کہ کسی نعمت و انعام پر عید منانا رسول اللہ ﷺ نے نہیں بتایا اور عمل نصاری کی اللہ تعالی اور ان کے رسول برحق حضرت محمد مصطفی ﷺ نے تصدیق نہیں کی۔

رابعاً: اگر ہر نعمت و انعام رب تعالی پر عید منانا تسلیم کر لیا جائے تو عیدوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا ، کیونکہ انعام باری تعالی بے حد اور بے شمار ہیں

،ارشاد ہوتا ہے

وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا (ابراھیم ۳۴)

اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کرسکو گے (احمد رضا) ۱۴۔۳۴)

یہی مضمون سورۃ النحل کی آیت (۱۸) میں بیان ہوا ہے کہ اللہ رب العزت کی نعمتوں کو شمار نہیں کیا جاسکتا ،جب انعامات کو شمار نہیں کیا جاسکتا تو پھر ہر نعمت پر عید منانے کے کیا معنی ہوئے ،اگر فریق ثانی اس بات پر بضد ہے کہ معلوم نعمتوں پر عید منانا ہی عین اسلام ہے تو ہم تاریخ اسلام پر نظر کر کے اور قرآن وسنت سے ثابت کردیتے ہیں کوئی دن بھی نعمت الٰہی سے خالی نہیں ہوتا، تو کیا فریق ثانی تمام دنوں میں عید منانے کے لئے تیار ہے؟ اگر وہ تیار ہیں تو ہم دین الحق کے اگلے ایڈیشن میں پورے سال کی فہرست مہیا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

خامساً: احسانات وانعامات رب تعالی کی تحدیث عید سے نہیں بلکہ شکر سے ہوتی ہے

جس کی ضروری تفصیل مفتی صاحب کی دوسری دلیل کے جواب میں انشاء الرحمٰن آرہی ہے۔

سادساً: اگر یہ حکم منسوخ نہیں تو بریلوی مکتب فکر کے علماء عیسائیوں کا بڑا دن بھی اسی طرح تزک واحتشام سے کیوں نہیں مناتے ،کیونکہ کل انبیاء کرام پر ایمان لانا اسلام کا بنیادی رکن ہے اور اگر منسوخ ہوگیا ہے تو پھر اس سے دلیل لانا فضول ہے۔

سابعاً: مائدہ تو کھانے کی چیز تھی، جو بنی اسرائیل کو بغیر کسی محنت ومشقت سے ملا تھا، اور یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ پیٹ پالنے کی نعمت غیر مترقبہ پر خوش ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن نے دعا مسیح سے بیان کیا ہے۔ مگر یار لوگوں نے اس پر جشن وجلوس اور دیگر لوازمات کا بھی اضافہ کرلیا ہے، اور یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ہم امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مائدہ کی خوشی پر قیاس کررہے ہیں، یہ ہیں عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹھیکے داری کا دعوٰی کرنے والے،ویسے میلاد کی یہ دلیل نقل کی جائے علم نفسیات سے زیادہ تعلق رکھتی ہے کہ ان لوگوں کے پیٹ کی آگ کس ترقی پر ہے ثامناً ہمارے شیخ فرماتے ہیں کیا متقدمین آئمہ کرام صحابہ اکرام یا تابعین عظام میں سے کسی ایک نے اس آیت کی تفسیر جشن میلاد سے کی ہے؟ ہرگز نہیں کی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس تفسیر سے نابلد تھے یا امت بریلویہ اس آیت کی تفسیر اپنی رائے سے کر کے خود کو من قال فی القرآن برائہ کے مصداق ٹھہرا رہے ہیں؟ (محمد یحیٰی گوندلوی)۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

واما بنعمة ربک فحدث،

اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کرو ،اور حضور علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے کہ رب تعالی نے اس پر احسان جتایا ہے ان کا چرچا کرنا اسی آیت پر عمل ہے، جاء الباطل ص۲۳۱)۔

الجواب

اولاً، یہاں تحدیث نعمت کا ذکر ہے نا کہ نبی ﷺ کے یوم پیدائش کے روز عید منانے اور جلوس نکالنے کا۔

ثانیاً، یہاں جس نعمت کا ذکر ہے وہ دین اسلام کی نعمت ہے۔

چنانچہ علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں۔

ای حدث بالنبوة التی اتاک الله ،وھی اجل النعم والصحیح انھا تعم جمیع نعم الله علیه ویدخل تحته تعلیم القرآن والشرائع.

یعنی نبوت کا اظہار کیجئے جواللہ تعالی نے آپ کو عطاء کی ہے اور یہ نعمت اجل ہے اور صحیح یہ ہے کہ تمام نعمتیں جواللہ تعالی نے آپ علیہ السلام پر کی ہیں اُس میں داخل تعلیم القرآن اور شریعت (کی نعمت)

تفسیر المدارک ص ۳۷۶ ج ۵ ،۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔

ماعلمت من خیر فحدث اخوانک .

یعنی جو بھلائی کی باتیں آپ کو معلوم ہیں وہ اپنے بھائیوں سے بیان کرو ، ابن کثیر ص۵۲۴ ج ۴،

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جس نعمت کا ذکر ہے وہ آپ کی نبوت اور آپ علیہ السلام کو ملنے والے احکام شریعت ہیں۔

نبی علیہ السلام کی نبوت کی تشہیر کرنی آپ پر ایمان کی دعوت دینی کفار کو اسلامی تعلیم بیان کر کے حقانیت اسلام واضح کرنے کو عید میلاد سے کیا نسبت ہے، یار لوگوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے کہ اس سے عید میلاد کے جلوس پر استدلال کیا جارہا ہے

ثالثاً، اگر تسلیم کرلیا جائے کہ یہاں نعمت سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے کی ہے تو تب بھی یہ ہمارے مخالف نہیں اور مفتی صاحب کے موافق نہیں کیونکہ یہاں نعمت کے اظہار کا ذکر ہے، نعمت پر عید منانے بالخصوص میلاد النبی کا ذکر نہیں اور اظہار نعمت عید سے نہیں بلکہ احکام الٰہی کی پیروی سے ہوتی ہے جس کا خود مفتی صاحب کو اقرار ہے، دیکھئے نور العرفان ص ۹۷۶،

اسلام میں تحدیث نعمت کا طریقہ

جو لوگ تحدیث نعمت کا نام عید رکھ لیں اور پھر اسے خالص حق باور کرائیں ! ان کی علمی بے مائیگی کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں! کیونکہ تحدیث نعمت کہتے ہیں کسی نعمت الٰہی کا اظہار کرنا، مثلاً زید کا کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے علم و دین سے نوازا یا کسی مال دار کا کہنا کہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ اسی طرح کے فقرات ہم روز مرہ کی گفتگو میں کہہ کر تحدیث نعمت کرتے ہیں مگر کوئی جاہل سے جاہل اور عقل و خرد سے ذرہ بھی مس رکھنے والا یہ نہیں کہتا کہ زید اور بکر نے عید منائی ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک نعمت کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کر رہا ہے

قرآن مجید میں اکل حلال اور اجتناب حرام کو نعمت الٰہی کا شکریہ کہا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیباً وا شکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون،

(النحل ۱۱۴).

تو اللہ کی دی ہوئی روزی حلال پاکیزہ کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسے پوجتے ہو (۱۶۔۱۱۴) احمد رضا)۔

اس حکم قرانی کے موافق اگر کوئی انسان محنت مزدوری کر کے حلال روزی کما کر بال بچوں کا پیٹ

پالتا ہے اور انہیں کوئی حرام کا لقمہ نہیں کھلاتا۔ تو وہ اللہ تعالی کی نعمت کا شکریہ ادا کر رہا ہے مگر اسے کوئی بچہ بھی کہنے کو تیار نہیں کہ وہ عید منا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا یہ نیک عمل نص قرآنی سے تحدیث نعمت میں شامل ہے۔ مگر عید سے خارج ہے۔

اس دلیل کے تحت حضرت مفتی صاحب نے جو مجہول اور فضول بحث کی ہے اس کا جواب علمی طور پر گو ہماری اس ساری بحث میں موجود ہے اور ہر وہ شخص جسے قرآن و سنت سے لگاؤ اور تھوڑی سی عقل و خرد رکھتا ہو وہ بھی ان کی حقیقت کو بخوبی جانتا ہے مگر ہم اس کو نیچے قولہ، اور اقول، کے تحت نقل کر کے جوابات عرض کر رہے ہیں کہیں ان کے معتقدین یہ باور نہ کرائیں کہ حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن اور مفتی اعظم صاحب کی یہ باتیں لاجواب ہیں۔

قولہ آج کسی کے فرزند پیدا ہو تو ہر سال تاریخ پیدائش پر سالگرہ کا جشن کرتا ہے، جاء الباطل ص ۲۳۱۔

اقول، مفتی صاحب بھی عجب کمال کے بندے تھے یہ دلیل ان پر قائم کی جارہی ہے جن کے نزدیک سالگرہ بھی ناجائز و حرام ہے حضرت الامام محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوریؒ شارح جامع الترمذی فرماتے ہیں۔

ہماری شریعت محمدیہ میں سالگرہ کرنا پایا نہیں جاتا نہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانہ میں کسی کی سالگرہ کی گئی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نہ تابعینؒ کے زمانہ میں کی گئی لہذا ممنوع ہے،

فرعون مردود سالگرہ کیا کرتا تھا، فرعونی رسم ہے، واللہ اعلم بالصواب کتبہ محمد عبدالرحمٰن پنجابی ،فتاوی نذیریہ ص ۱۹۹ ج ۱، وفتاوی علماء حدیث ص ۳۴۴ ج ۱۱،) (سید محمد نذیر حسین)

قولہ، کسی کو سلطنت ملے تو ہر سال اس تاریخ پر جشن جلوس مناتا ہے تو جس تاریخ کو دنیا میں سب سے بڑی نعمت آئی اس پر خوشی منانا کیوں منع ہوگا؟ جاء الباطل ص ۲۳۲،

اقول، اس کا جواب بھی اوپر آچکا ہے آج بھی ۱۴ اگست کو یوم پاکستان منایا جاتا ہے مگر کوئی بھی اسے دین کا جزو اور حصہ تصور نہیں کرتا نہ ہی نماز روزہ کی طرح عبادت کا درجہ دیکر بغرض ثواب و نجات کرتا ہے، اور اس میں شمولیت اختیار نہ کرنے والے کو منکر عصمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ آج تک کسی بریلوی عالم و مفتی نے بھی نہیں کہا جبکہ عید میلاد النبی ﷺ کو مبتدعین نماز

روزہ کی طرح عبادت کا درجہ دیکر کرتے ہیں، اور اس عمل حسنہ سے وہ تقرب الٰہی چاہتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو با قاعدہ عید کی طرح نماز بھی ادا کرتے ہیں جیسا کہ قومی اخباروں میں ہر سال کسی نا کسی جگہ کی خبر چھپتی ہے۔ نیز اس کے منکر کو آپ حضرات بے دین تک کہہ دیتے ہیں اور علماء بریلوی نے اس کو اہل سنت کی علامت قرار دے رکھا ہے جبکہ یوم پاکستان منانا اور اسکی تقریب کے انعقاد کو قومی تہوار تو کہا جاتا ہے لیکن اسے عبادت اور ثواب جان کر کوئی بھی نہیں کرتا اور نہ ہی اہل سنت کی علامت ہے اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو برطانیہ وغیرہ دیگر ممالک میں رہنے والے بریلوی مکتب فکر کے عوام (جو یوم پاکستان میں شامل نہیں ہوتی) کو آپ بریلویت سے خارج ہونے کا فتوی صادر کریں، دیدہ باید، پھر یوم پاکستان منانا بھی ہمارے ہاں لغو اور بیہودہ عمل ہے جو غیر مسلم اقوام کی اندھی تقلید ہے۔

قولہ، خود قران کریم نے حضور علیہ السلام کا میلاد جگہ جگہ ارشاد فرمایا، فرماتا ہے (لقد جاء کم رسول الایۃ) اے مسلمانو تمہارے پاس عظمت والے رسول تشریف لے آئے، اس میں ولادت کا ذکر ہوا، پھر فرمایا، من انفسکم، **حضور علیہ السلام** کا نسب نامہ بیان ہوا کہ وہ تم میں سے یا تمہاری بہترین جماعت میں سے ہیں، حریص علیکم، سے آخر تک حضور علیہ السلام کی نعت بیان ہوئی آج میلاد شریف میں یہی تین باتیں بیان ہوتی ہیں غرضیکہ بہت سی آیات ہیں جن میں حضور علیہ السلام کی ولادت پاک کا ذکر فرمایا گیا، معلوم ہوا کہ میلاد کا ذکر سنت الٰہی ہے اب اگر جماعت کی نماز میں امام یہی آیات ولادت پڑھے تو عین نماز میں میرے آقا کا میلاد ہوتا ہے دیکھو امام صاحب کے پیچھے مجمع بھی ہے اور قیام بھی ہو رہا ہے پھر ولادت پاک کا ذکر بھی ہے، جاء الباطل ص ۲۳۲۔

اقول، اولا مفتی صاحب کا عید میلاد کو فقط تین باتوں میں ہی مشروط قرار دینا امر واقع اور حقائق کے خلاف ہے، اگر راقم اپنی طرف سے کچھ عرض کرے تو بریلوی علماء کو یقین آنا تو کجا الٹا ننھ بن مطعون کرنے لگ جائیں گے، اصلاح کی بجائے ناصح کو برا بھلا کہنا ان کے فرقے کا امتیازی وصف اور کمال ہے اور اسی ہنر و سلیقہ سے ہی ارباب عقل و خرد پہچان کرتے ہیں خیر بریلویت کے معروف عالم دین مولوی غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ فرماتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض شہروں میں عید میلاد کے جلوس کے تقدس کو بالکل پامال کردیا گیا ہے، جلوس تنگ راستوں سے گزرتا ہے اور مکانوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں سے نوجوان لڑکیاں اور عورتیں شرکاء جلوس پر پھول وغیرہ پھینکتی ہیں اور اوباش نوجوان فحش حرکتیں کرتے ہیں جلوس میں مختلف گاڑیوں پر فلمی گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی ہے اور نوجوان لڑکے (بلکہ لڑکیاں) فلمی گانوں کی دھنوں پر ناچتے ہیں اور نماز کے اوقات میں جلوس چلتا رہتا ہے مساجد کے آگے سے گزرتا ہے اور نماز کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا اس قسم کے جلوس میلاد النبی کے تقدس پر بدنما داغ ہیں، انتھی بلفظہ شرح صحیح مسلم ص ۱۷۰ ج ۳، طبع فرید بک سٹال لاہور سن ۱۴۱۵ھ و ۱۹۹۵ء۔

سعیدی صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی مذکورہ بتائی ہوئی باتوں کے علاوہ ان میں بے حیائی و فحاشی جیسی منکرات بھی شامل ہیں اور نماز جیسے اسلامی رکن تک کو ترک کردیا جاتا ہے۔

ثانیاً، آپ علیہ السلام کی سیرت و کردار اور افعال و اقوال کو بیان کرنا بلاشک وشبہ باعث نزول رحمت ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سیرت اور سنت خیر الانام ﷺ کو معلوم کرے اور اس کو اپنی زندگی کیلئے مشعل راہ بنائے، ہر وقت کوئی ایسی گھڑی نہیں جس میں آپ علیہ السلام کی سیرت طیبہ سننا ممنوع ہو، یہ بات محل نزاع سے خارج ہے بلکہ خاص بارھویں ربیع الاول کو عید منانا اور اس میں دیگر لوازمات کا انعقاد کرنا باعث نزاع ہے کیونکہ محفل میلاد و عید میلاد النبی اور چیز ہے جبکہ تذکرہ ولادت باسعادت امر دیگر ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ مفتی صاحب تذکرہ حبیب بلکہ سیرت مصطفیٰ کا نام عید رکھ رہے ہیں حالانکہ ایک اناڑی بھی جانتا ہے عید کا معنی ہوتا ہے بار بار آنا مقصد یہ کہ ایک ایسی خوشی جو بار بار آئے اور اسے انسان بطور تہوار وجشن کے منائے جبکہ تذکرہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی یاد آنا یا کسی کو یاد کرنا مثلاً قرآن حکیم میں ہے حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا مجھ سے کسی بات کے متعلق نہ پوچھنا۔

(۱) حتی احدث لک منه ذکرا، (الکهف. ۷۰)

جب تک میں خود اس کا ذکر نہ کروں (احمد رضا)

کیا ان الفاظ قرآنی کا یہ منشا ہے کہ جب تک میں کسی بات پر عید نہ مناؤں تو مجھ سے اس کے متعلق نہ پوچھنا یا یہ مقصد ہے کہ جب تک بات کا تذکرہ نہ کروں تب تک سوال نہ کرنا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

(۲) او لایذکر الانسان انا خلقنه من قبل ولم یک شیئاً (مریم ۶۷).

کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا اور وہ کچھ بھی چیز نہ تھا۔

اب اگر کوئی شخص اپنی خلقت پر غور کرتا ہے تو کیا وہ اپنی خلقت کی عید مناتا ہے اور اگر بقول مفتی صاحب اگر پیش امام نماز میں اس کی قرات کرتا ہے تو کیا وہ نماز میں تخلیق بنی آدم کی عید مناتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے آپ علیہ السلام سے کہا۔

(۳) قالو تا الله تفتؤا تذکر یوسف ، (یوسف ۸۵).

بولے خدا کی قسم آپ ہمیشہ یوسف کی یاد کرتے رہیں گے (احمد رضا)۔

بقول مفتی صاحب اس آیت کا تو یہی مطلب ہوگا کہ اے ابا حضور آپ قبر میں جانے تک یوسف علیہ السلام کی عید مناتے رہیں گے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شریعت حقہ کا حکم ہے جب لین دین کرو تو معاہدہ ضبط تحریر میں لاؤ اور اس پر دو گواہ مقرر کرو، اگر دو عادل مرد گواہ دستیاب نہ ہوسکیں، تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا لو، اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

(۴) ان تضل احد هما فتذکر احدهما الاخری ، البقره ۲۸۲).

کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے (احمد رضا)

اسلام میں یہ حکم ہے کہ سواری پر سوار ہوتے۔

تذکروا نعمة ربکم ، الزخرف ۱۳). تم اپنے رب کی نعمت کا تذکرہ

تو کیا گواہی کے وقت ایک عورت کا دوسری کو یاد کروانا، اور سواری پر سوار ہوتے وقت ذکر نعمت سے مراد عید منانا ہے، اور بقول حکیم الامت اگر پیش امام نماز میں ان کی تلاوت کرے تو عین نماز میں سوار ہونے کی اور گواہ کی عید منائی جارہی ہے، تف ہے ایسی عقل پر اور حیرت ہے ایسے

مفتی پر اور تعجب ہے ایسے مفسر قرآن پر جو آسان سی بات بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک اور مقام پر فرعونیوں سے ایک مرد مومن نے کہا۔

(۶) فستذ کرون ما اقول لکم (المومن ۴۴).

تو جلد وہ وقت آتا ہے کہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے یاد کروگے (احمد رضا)

اس آیت کا تو مفتی صاحب کے معتقدین یہی معنی کریں گے کہ جلد ہی میرے کہنے پر تم عید مناؤ گے، اسی طرح عدت میں پیغام نکاح کا بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالی فرماتے ہیں۔

(۷) علم الله انکم ستذ کرو نهن ،(البقره ۲۳۵) .

اللہ جانتا ہے کہ اب تم ان کی یاد کروگے، (احمد اضا)۔

جب حضرت ابراھیم علیہ اسلام نے بتوں کو توڑا اور قوم نے توڑنے والے کی جستجو کی تو کہنے والوں نے کہا۔

(۸) فتی یذکر هم یقال له ابراهیم ، الانبیاء ۶۰ .

ایک جوان کہ ذکر کرتا تھا ان کا کہتے ہیں اس کو ابراھیم (شاہ رفیع الدینؒ)۔

بقول مفتی صاحب اس آیت کا تو یہی معنی ہوگا کہ (نعوذ باللہ من ذلک) ابراھیم علیہ السلام بتوں کی عید منایا کرتے تھے۔

فلسفہ جہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو عبادت خانوں کو گرا دیا جاتا۔

(۹) و مسجد یذکر فیها اسم الله کثیرا.

اور مسجدیں جن میں اللہ رب العزت کا بکثرت نام لیا جاتا ہے (الحج ۴۰)۔

تو کیا اس کا یہ معنی کریں گے کہ اگر جہاد نہ ہوتا تو مساجد کو بھی گرا دیا جاتا جن میں اللہ رب العزت کی بکثرت عیدیں منائیں جاتیں ہیں، نعوذ باللہ ان بریلوی خرافات سے اللہ تعالی کی پناہ، اسی طرح ذبح کا حکم بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

(۱۰) ولا تا کلوا مما لم یذکر اسم الله .

اور اسے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو (احمد رضا)۔

تو کیا اس کا یہ معنی ہے کہ جس پر اللہ کے نام کی عید نہ منائی گئی ہو وہ نہ کھانا۔ کیا ان تمام آیات کا یہ مفہوم ہے کہ یاد کا معنی عید منانا ہے کیا اللہ کی بھی عید منائی جاتی ہے اور بتوں کی بھی؟ نہیں یہ مفہوم نہیں بلکہ موصوف کی بدعات کے جواز میں تفسیر بالرائے ہے جس کا سلف صالحین سے ذرہ برابر اشارہ نہیں ملتا۔

تلک عشرۃ کاملۃ

بلکہ یہ مقامات عشرۃ بتا رہے ہیں کہ ذکر سے مراد عید لینا غلط ہے اور اس غلطی کی وجہ سے مفتی صاحب کو کلمہ طیبہ میں بھی عید میلاد نظر آرہی ہے، تذکرہ حبیب ﷺ کا نام بھی وہ عید رکھ رہے ہیں بلکہ عین نماز میں مناقبت کی آیات کی قرآت کو وہ عید سے تعبیر فرماتے ہیں مگر یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ ذکر آنحضرت ﷺ خاص بارھویں ربیع الاول میں ہی کیوں خاص کر رہا ہوں، افسوس کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جس نے کلمہ پڑھا ہے، وہ ہر دن میں حضور ﷺ کو یاد کرتا ہے کم از کم نماز کی التحیات میں تو وہ علی النبی کہہ کر اور آخر میں درود پڑھکر آپ ﷺ کی یاد کا اعادہ کرتا ہے مگر کوئی کوڑھ مغز بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ ہر روز عید میلاد مناتا ہے۔

جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے اسی طرح مفتی صاحب کو ہر بات میں عید ہی عید نظر آتی ہے کہ مریم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اور کہتے ہیں قرآن کریم نے تو انبیاء کا بھی میلاد بیان فرمایا ہے (جاء الباطل ص ۲۳۲)۔

حالانکہ بیان کرنے اور منانے میں بہت سا فرق ہے کہیں قرآن نے انبیاء کا میلاد منانے کا بھی حکم فرمایا ہے تو بیان کیجئے، ورنہ مفتی صاحب کے چیلے گھر میں ہی اپنے مفتی کی ہفوات پر شرمندہ ہو جائیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

رب تعالیٰ فرماتا ہے۔

قل بفضل الله و برحمته فبذلک فلیفر حوا.

یعنی اللہ کے فضل و رحمت پر خوب خوشیاں مناؤ، معلوم ہوا کہ فضل الٰہی پر خوشی منانا حکم الٰہی

ہے اور حضور علیہ السلام رب کا فضل بھی ہیں اور رحمت بھی، لہذا ان کی ولادت پر خوشی منانا اسی آیت پر عمل ہے اور چونکہ یہاں خوشی مطلق ہے (لہذا) ہر جائز خوشی اس میں داخل ہے، جاء الباطل ص ۲۳۴)۔

الجواب

اولاً : فرح کا معنی خوب خوشیاں مناؤ، کرنا مفتی صاحب کی قرآن میں معنوی تحریف ہے کیونکہ فرح کا معنی خوشی منانا نہیں بلکہ فقط خوشی ہے، فیروز الغات اردو ص ۹۲۷) اور اس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے کہ جب کسی نعمت پر خوش ہو کر اللہ کا شکریہ ادا کرے، تو اسے عربی میں فرح کہتے ہیں ارشاذ ہوتا ہے۔

فرحین بما اتھم اللہ من فضلہ، ال عمران ۱۷۰).

جو کچھ اللہ تعالی نے ان کو دیا ہے اس پر خوش ہیں۔

مفتی صاحب کے استاذ المکرم مولوی محمد نعیم الدین مراد آبادی فرماتے ہیں فرح کسی پیاری اور محبوب چیز کے پانے سے دل کو جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کو فرح کہتے ہیں، حاشیہ ترجمہ قرآن بر مولوی احمد رضا خان بریلوی ص ۳۱۱)۔

یہی معنی لغت عرب کی عظیم الشان ڈکشنری، لسان العرب ص ۵۴۱ ج ۲، میں کیا گیا ہے علامہ فیومی فرماتے ہیں، الفرح لذۃ القلب، یعنی فرح دل کی لذت کو کہا جاتا ہے، المصباح المنیر ص ۴۶۶) ان عبارات سے معلوم ہوا کہ فضل الہی اور رحمت رب تعالی پر مومن کا دل فرحت پاتا ہے اور اس سے کسے انکار ہے اور کون کرتا اور کر سکتا ہے۔

ثانیاً : اب آیئے مذکورہ آیت کا سیاق و سباق بھی ملاحظہ ہو تا کہ ساری حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آجائے، ارشاد ہوتا ہے۔

یایھا الناس قد جآء تکم موعظۃ من ربکم و شفاء لما فی الصدور وھدًی ورحمۃ للمؤمنین☆قل بفضل اللہ و برحمۃ فبذٰلک فلیفرحوا ھو خیرٌ مما یجمعون (یونس ۵۷. ۵۸).

ترجمہ۔ اے لوگو بے شک تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور اس (

بیماری) کی شفا (آئی ہے) جو سینوں میں ہوتی ہے اور مسلمانوں کے لیئے ھدایت اور رحمت (آئی ہے) کہو کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے پس چاھیئے کہ اسی سے خوش ہوں یہ اس چیز سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے ہیں ، (۱۰۔ ۵۷، ۵۸،) ترجمہ مرزا حیرتؒ دھلوی ۔

ان آیات بینات سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ، یہاں خوشی مطلق ہے، جہالت محض ہے، بلکہ اس مقام پر یہ کہا جارہا ہے اللہ رب العزت کی طرف سے قرآن جیسی نعمت آئی ہے جو جامع فوائد اور مواضع حسنہ پر مشتمل ہے جس میں توحید کی تعلیم ہے جو دل کے عقائد فاسدہ کے لیئے شفا ہے اور جو اس پر ایمان لائے اس کے لیئے رحمت ہے، پس چاھیئے کہ مومن مال و دولت کی بجائے اللہ رب العزت کی طرف سے آنے والی کتاب پر خوش ہوں کہ یہ دنیا کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے ان آیات کا یہی معنی جملہ کتب تفسیر میں لکھا مثلاً ہے ابن جریر، ابن کثیر، فتح القدیر، درمنثور، کشاف، مدارک، خازن، معالم، کبیر، وغیرہ، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ۔

معنی آیت یہ ہے کہ ساتھ فضل اور رحمت میری کے اتری نصیحت اور شفا، پس اس کے خوش ہوویں کہ وہ بہتر ہے اس سے کہ جمع کرتے ہیں مال و دولت دنیا کی سے کہ زوال پانیوالا اور فنا ہونے والا ہے۔

موضح القرآن ص ۲۰۳ ، مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاھور ،

بریلویت کے معروف مفسر قرآن اور حضرت مفتی صاحب کے استاذ المکرّم جناب مولوی نعیم الدین مراد آبادی صاحب فرماتے ہیں۔

معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو اللہ کے فضل و رحمت پر خوش ہونا چاھیئے کہ اس نے انہیں مواعظ اور شفا صدور اور ایمان کے ساتھ دل کی راحت وسکون عطا فرمائے حضرت ابن عباسؓ وحسنؒ وقتادہؒ نے کہا کہ اللہ کے فضل سے اسلام اور اس کی رحمت سے قرآن مراد ہے۔

حاشیہ کنز الایمان ص ۳۱۱ ف ۱۳۹ ،طبع بمبئی۔

الفاظ قرآنی اور بریلویت کے مفسر قرآن کی اقبال ڈگری سے ثابت ہوا کہ مذکورہ آیت کی فرحت کا تعلق قرآن سے ہے لیکن یہ فرحت کس طرح ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کے لیئے نہ چراغاں کی، نہ جلسے وجلوسوں کی اور نہ دھمالیں اور بھنگڑا ڈالنے کی اور نہ ڈیک پر انڈین گانے لگا کر ناچنے کی

ضرورت ہے، کیونکہ فرحت کا دل سے تعلق ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔

ثالثاً: فرحت کو عید قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی عنھم اجمعین تکمیل نزول قرآن کو، عید قرآن، قرار دیتے اور اس لحاظ سے اسلام میں ایک تیسری عید تکمیل قرآن کی ہوتی مگر وہ لوگ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم وضروری جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ کامیابی فقط اسی عمل میں ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے یا کرنے کا حکم فرمایا ہے علاوہ ازیں وہ یہ بھی بخوبی جانتے تھے فرحت ،سرور کو کہا جاتا ہے ،تہوار منانے کا نام فرحت نہیں،اسی معنی میں یہ لفظ قرآن میں مستعمل ہوا ہے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے دلی خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا۔

(۱) فرح المخلفون بمقعدھم .

پیچھے رہ جانے والے اس پر خوش ہوئے ،(التوبہ ۸۱)۔

کیا منافقین نے اس پر عید منائی تھی۔

ایک جگہ فرمایا اگر ہم انسان کو نعمت دیکر چھین لیں تو وہ ناشکرا ہوتا ہے اور اگر کسی مصیبت کے بعد نعمت دنیا سے نوازیں تو۔

(۲) انه لفرح فخور.

بے شک وہ خوش ہونے والا بڑائی مارنے والا ہے، (ہود ۱۰)۔

تو کیا اس آیت کی رو سے انسان نعمت ملنے پر عید مناتا ہے۔

(۳) کل حزب بما لدیھم فرحون .

ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے (الروم ۳۲)۔

تو کیا یہاں بھی فرحت سے عید منانا ہی تسلیم کریں گے؟ جبکہ خود مفتی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں ہر فرقہ اپنے جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق سمجھ کر خوش ہو رہا ہے،نور العرفان ص ۶۵۰۔

(۴) و انا اذآ اذقنا الانسان منا رحمة فرح بھا .

اور جب آدمی کو اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ دیتے ہیں اس پر خوش ہو جاتا ہے (الشوری

۴۸)۔

(۵) فلما جاء تهم رسلهم بالبينت فرحو ابما عندهم من العلم .

تو جب ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لائے تو وہ اسی پر خوش رہے جو ان کے پاس دنیا کا علم تھا،(المومن ۸۳)۔

(۶) حتى اذا فرحوا بما او توا .

یہاں تک جب وہ خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا،(الانعام ۴۴)۔

(۷) و فرحو ا بالحيوة الدنيا.

اور کافر دنیا کی زندگی پر اترا گئے (الرعد ۲۶)۔

(۸) وجرين بهم بريح طيبة و فر حوا بها .

اور وہ اچھی ہوا سے انہیں لیکر چلیں اور اس پر خوش ہوئے (یونس ۲۲)۔

(۹) ويتو لو اوهم فرحون .

اور خوشیاں مناتے پھر جائیں،(التوبہ ۵۰)۔

(۱۰) ان الله لايحب الفرحين .

بے شک اللہ تعالی اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا،(القصص ۷۶)۔

قرآن حکیم کے یہ مقامات عشرۃ جن کا ترجمہ ہم نے مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا نقل کیا ہے اگر کسی بریلوی علامہ فہامہ میں جرأت ہے تو ان میں ،فرحوا ،کے لفظ کا معنی عید منانا ثابت کرے ،معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا ،فرح ، کا معنی عید کرنا اپنی طرف سے اختراع اور من گھڑت ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مواھب اللدنیہ اور مدارج النبوۃ وغیرہ میں ذکر ولادت میں ہے کہ شب ولادت میں ملائکہ نے (حضرت) آمنہ خاتون رضی اللہ عنہا کے دروازے پر کھڑے ہو کر صلاۃ و سلام عرض کیا ، ہاں ازلی راندہ ہوا شیطان رنج وغم میں بھاگا بھاگا پھرا ، اس سے معلوم ہوا کہ میلاد سنت ملائکہ بھی ہے



اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بوقت پیدائش کھڑا ہونا ملائکہ کا کام ہے، اور بھاگا بھاگا پھرنا شیطان کا فعل، اب لوگوں کو اختیار ہے کہ چاہے تو میلاد پاک کے ذکر کے وقت ملائکہ کے کام پر عمل کریں یا شیطان کے، جاء الباطل ص ۲۳۳۔

الجواب

اولاً، واقعی امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیدائش کے روز بھاگا بھاگا پھرنا شیطانوں کا ہی کام ہے، خیر سے بریلوی مکتب فکر کے جید مولوی اسی دن ہی جلوس کی قیادت کر کے قریہ قریہ بستی بستی بلکہ پورے شہر کا چکر لگاتے ہیں، شاید یہ لوگ اپنے پرانے یار کی اقتدا میں ایسا کرتے ہیں،

سنبھل کر رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں، کہ اس نواح میں سودہ برہنہ پا بھی ہے،

ثانیاً، سند کے اعتبار سے یہ حکایت گو قابل اعتماد نہیں مگر ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ صلوۃ و سلام سے عید میلاد ثابت نہیں ہوتی کیونکہ نص قرآنی سے صلوۃ تو عام ایماندار لوگوں پر بھی فرشتے پڑھتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

هو الذی یصلی علیکم و ملئکته،(الاحزاب ۴۳).

وہی (اللہ تعالیٰ) ہے کہ درود بھیجتا ہے تم پر وہ اور اس کے فرشتے (احمد رضا خاں)

اس آیت کی رو سے بریلوی مکتب فکر کے مولوی یہ ماننے کے لیئے تیار ہیں؟ کہ مومنوں کی اللہ رب العزت اور اس کے ملائکہ عید میلاد مناتے ہیں اگر نہیں یقیناً نہیں تو معلوم ہوا کہ صلوۃ و سلام سے مفتی صاحب کا عید میلاد ثابت کرنا غلط ہے،

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

ان الله و ملائكته يصلون على الصفوف الاول (الحديث)

یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پہلی صف والے (نمازیوں) پر، مسند امام احمد ص ۲۹۶ ج ۴، و ابوداؤد ص ۹۷ ج ۱، و سنن نسائی ص ۹۳ ج ۱، و ابن خزیمہ ۳/۲۴، و ابن حبان (۲۱۵۸)

یہی حدیث ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، سنن ابوداؤد ص ۹۷ ج

۱، وابن ماجہ ص ۷۲، و بیہقی ص ۱۰۳ ج ۳، وصحیح ابن حبان ص ۲۹۷ ج ۴، وغیرہ میں مروی ہے ، ان احادیث صحیحہ کی رو سے کیا بریلوی علماء یہ ماننے کے لیئے تیار ہیں کہ پہلی صف والے نمازیوں کی اللہ رب العزت اور اس کے فرشتے عید میلاد مناتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قرآن کریم کی متعدد آیات سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ نیک بندوں پر اللہ رب العزت اور اس کے فرشتے سلام بھیجتے ہیں' مشتے نمونہ از خروارے چند آیات پیش خدمت ہیں۔

(۱) وسلم علی عبادہ الذین اصطفی .

اور سلام اس کے چنے ہوئے بندے پر،(النمل ۵۹)۔

(۲) سلم علیکم بما صبر تم .

سلامتی ہو تم پر تمہارے صبر کا بدلہ (الرعد ۲۴)۔

(۳) تحیتھم فیھا سلم .

اس میں ان کے ملتے وقت کا اکرام سلام ہے،(ابراھیم ۲۳)

اس آیت کے حاشیہ میں مفتی صاحب کے استاذ المکرّم فرماتے ہیں۔

اللہ تعالی کی طرف سے اور فرشتوں کی طرف سے،خزائن العرفان ص ۳۷۴۔

(۴) وقال لھم خزنتھا سلم علیکم .

اور اس (جنت) کے داروغہ ان سے کہیں گے سلام تم پر (الزمر ۷۳)۔

(۵) ولقد جآء ت رسلنا ابراھیم بالبشری قالوا سلما .

اور بے شک ہمارے فرشتے ابراھیم کے پاس مژدہ لیکر آئے بولے سلام (ھود ۶۹)۔

(۶) سلم علی ابراھیم .

سلام ہو ابراھیم پر (الصفت ۱۰۹)۔

(۷) سلم قولا من رب رحیم .

ان پر سلام ہوگا مہربان رب کا فرمایا ہوا (یس ۵۸)۔

(۸) سلم علی نوح فی العلمین .

نوح پر سلام ہو جہاں والوں میں (الصفت ۷۹)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی صاحب کا استاذ المکرّم فاضل مراد آبادی لکھتا ہے ، یعنی ملائکہ اور جن و انس سب ان پر قیامت تک سلام بھیجا کریں گے ،خزائن العرفان ص ۶۵۰۔

(۹) سلم علی موسی و هرون .

سلام ہو موسیٰ اور ھارون پر (الصفت ۱۲۵)۔

(۱۰) سلم علی اِل یاسین .

سلام ہو الیاس پر (الصفت ۱۳۰)۔

یہ دس آیات قرآنیہ(جن کا ترجمہ بھی ہم نے بریلویت کے اعلی حضرت مولوی احمد رضا خاں کا نقل کیا ہے) جن میں اللہ رب العزت نے پانچ انبیاء کرام کا نام لیکر اور سورۃ النمل میں تمام انبیاء کرام پر اور بقیہ آیات قرآنیہ میں اپنے محبوب برگزیدہ اولیاء کرام پر اپنی طرف سے اور ملائکہ کی جانب سے سلام بھیجنے کی صراحت کی ہے، تو کیا ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالی اور اس کے فرشتے تمام انبیاء کرام کی بالخصوص عید میلاد مناتے ہیں؟ پھر اس میلاد میں اللہ رب العزت کے منتخب انبیاء و رسل ہی خاص نہیں بلکہ تمام اھل جنت کی ہر سال عید میلاد منائی جاتی ہے جیسا کہ آیات نمبر۲،۳،۴، ۷، کا مفاد ہے۔

اگر علماء بریلویہ اس من گھڑت تفسیر کو ماننے کے لیئے تیار نہیں ،تو وہ اور ان کے حکیم الامت اور مفتی اعظم ایسی دلیل خصم کو کیوں حجت باور کراتے ہیں؟ جوخود ان کے ہاں غیر معتبر اور مردود ہے

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

خود حضور علیہ السلام نے مجمع صحابہ کے سامنے منبر پر کھڑے ہوکر اپنی ولادت پاک اور اپنے اوصاف بیان فرمائے ،جس سے معلوم ہوا کہ میلاد سنت رسول اللہ ﷺ بھی ہے چنانچہ مشکوۃ جلد دوم باب

فضائل سید المرسلین فصل ثانی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، شاید حضور علیہ السلام تک خبر پہنچی تھی کہ بعض لوگ ہمارے نسب پاک میں طعن کرتے ہیں۔

فقام النبی ﷺ علی المنبر فقال من انا ،

پس منبر پر قیام فرما کر پوچھا بتاؤ میں کون ہوں؟

سب نے عرض کیا آپ رسول اللہ ہیں فرمایا میں محمد ابن عبداللہ بن عبد المطلب ہوں ،اللہ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو ہم کو بہتر مخلوق میں سے کیا ، پھر ان کے دو حصے کیئے عرب وعجم ہم کو ان میں سے بہتر یعنی عرب میں پیدا کیا ،پھر عرب کے چند قبیلے بنا ئے ، ہم کو ان کے بہتر یعنی قریش میں پیدا کیا ،پھر قریش کے چند خاندان بنائے ہم کو ان میں سے سب سے بہتر خاندان یعنی بنی ہاشم میں سے کیا ، اسی مشکوۃ اسی فصل میں ہے کہ ہم خاتم النبیین ہیں اور ہم حضرت ابراھیم کی دعا حضرت عیسی کی بشارت اور اپنی والدہ کا دیدار ہیں جوانہوں نے ہماری ولادت کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور چمکا جس سے شام کی عمارتیں ان کو نظر آئیں ، اس مجمع میں حضور علیہ السلام نے اپنا نسب نامہ اپنی نعت شریف اپنی ولادت پاک کا واقعہ بیان فرمایا یہ ہی میلا د شریف میں ہوتا ،ایسی صدہا احادیث پیش کی جاسکتی ہیں ، جاء الباطل ص ۲۳۴

الجواب

اولاً: حسب ونسب میں طعن کرنے والے کون تھے ؟یقیناً بے ایمان خبیث کافر ہی تھے جیسا کہ ملاعلی القاری الحنفی نے ،مرقاۃ ص ۵۷ ج ۱۱ میں ،شیخ عبدالحق محدث دھلوی نے ، اشعۃ اللمعات ص ۴۹۸ ج ۴ میں ، حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی ص ۲۹۳ ج ۴ میں صراحت کی ہے ،

اور کفار کے طعن کے جواب میں حضرت محمد مصطفی ﷺ کی عظمت بیان کرنی اور کفار کی بد زبانی کا منہ توڑ جواب دینا ہر مسلمان پر بالعموم اور علماء وقت پر بالخصوص فرض ہے اس میں کسی مسلمان کو نہ کلام ہے نہ ہوسکتا ہے ،جب بے نظیر کے دور حکومت میں پیپلز پارٹی نے امریکہ کے دباؤ میں آکر گستاخ رسول کی سزا کو ختم کرنے کی ناپاک سازش کی تو راقم رات بھر چین سے آرام نہ کرسکا

اور سن ۱۹۹۴ء میں شاتم رسول کے واجب القتل ہونے پر آٹھ خطبات جمعہ پڑھائے تھے، اللہ تعالی میرے اس عمل حسنہ کو قبول فرمائے اور میرے لیئے اسے ذریعہ نجات اور کفارہ سیات بنائے اور اس عمل سے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی شفاعت سے بہرا مند کرے اور اپنے نبی محمد مصطفی ﷺ کی جنت میں رفاقت نصیب فرمائے، آمین یا الہ العالمین

الغرض کسی سبب اور داعیہ کی وجہ سے عظمت مصطفیٰ بیان کرنا یا بلاتعین دن و ماہ آپ کی سیرت و اخلاق عوام الناس کو بتانا محل نزاع سے خارج ہے

ثانیاً: عظمت و شان اور رفعت مقام کو بیان کرنا منکرین دین اسلام کے اعتراضات کے جوابات دینے کو تہوار منانے سے کیا نسبت؟ ہم روز مرہ کی زندگی میں کہتے ہیں فلاں شخص بڑا سخی ہے فلاں انسان علوم دین میں گہری نظر رکھتا ہے زید اپریل ۱۴ تاریخ کو پیدا ہوا، بکر ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، ان الفاظ سے کوئی کوڑھ مغز بھی یہ نتیجہ نہیں اخذ کرتا کہ فلاں بندے کی سالگرہ منائی جارہی ہے، مگر رضاخانی مولویوں کا طرز استدلال ہی نرالا ہے کہ وہ عظمت بیان کرنے کو سالگرہ اور تہوار کا نام دے رہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

ثالثاً، ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا ہے مردود شیطان رشدی نے امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذات مقدسہ و طاہرہ پر کیچڑ اچھالا تھا، جس سے پورے عالم اسلام میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر مسلمان کلمہ گو نے اس پر زبردست احتجاج کیا عالم اسلام کے اس اضطراب کو کوئی صاحب دماغ عید میلاد کہنے کی جسارت نہیں کر سکا، ہاں اگر بریلوی مولوی اس کا نام عید رکھ لیں تو بات الگ ہے، کیونکہ حقائق کے خلاف چلنا ان کا دین و ایمان ہے مگر جس کے دل میں محبت رسول ہے وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ شاتم رسول کے اعتراضات کے جوابات کو (خوشی) سے تعبیر کرے یہ فقط گجرات کے بقلم خود مفتی اعظم اور حکیم الامت کا ہی خیال فاسد ہے جو غالباً محبت رسول ﷺ کی چاشنی سے ویسے ہی بے بہرا تھا۔

ورنہ وہ اس حدیث سے میلاد کے جواز پر استدلال نہ کرتے اور ان کے غلط استدلال کے سامنے ان کی ایمانی رمق رکاوٹ بن جاتی ۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

صحابہ کرام ایک دوسرے کے پاس جاکر فرمائش کرتے تھے کہ ہم کو حضور علیہ السلام کی نعت شریف سناؤ معلوم ہوا کہ میلا د سنت صحابہ بھی ہے چنانچہ مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین فصل اول میں ہے کہ حضرت عطا ابن یسار فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ مجھے حضور علیہ السلام کی وہ نعت سناؤ جو کہ توریت شریف میں ہے انہوں نے پڑھ کر سنائی اسی طرح حضرت کعب احبار فرماتے ہیں ہم حضور علیہ السلام کی نعت پاک توریت میں یوں پاتے ہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں میرے پسندیدہ بندے ہیں نہ کج خلق نہ سخت طبیعت ان کی ولادت مکہ مکرمہ میں اور ان کی ہجرت طیبہ میں ان کا ملک شام میں ہوگا ان کی امت خدا کی بہت حمد کرے گی کہ رنج وخوشی ہر حال میں خدا کی حمد بیان کرے گی۔

(مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین) جاء الباطل ص ۲۳۴۔

الجواب

اولاً: حدیث میں لفظ، اخبرنی، ہے، مشکوۃ ص ۵۱۲۔

جو کہ خبر (ج اخبار) سے مشتق ہے اور یہ معروف لفظ ہے، ایسا واقعہ جس کا انسان کو علم نہ ہو اور کسی دوسرے ذریعے سے اسے اطلاع ہو وہ خبر ہے، قرآن میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بیوی محترمہ سے کہا۔

قال لاهله امكثو ا انی انست نارا لعلی اتیکم منها بخبر ، (القصص ۲۹)

اپنی گھر والی سے کہا تم ٹھہرو مجھے طور کی طرف سے ایک آگ نظر پڑی ہے شاید میں وہاں سے کچھ خبر لاؤں (احمد رضا)۔

مگر مفتی صاحب اس کے برعکس خبر کا معنی نعت کرتے ہیں، شکر ہے کہیں مفتی اعظم نے اس کا معنی بیری کا درخت کر کے، لسان العرب ص ۲۲۸ ج ۴، اور تاج العروس ص ۱۶۷ ج ۴، وغیرہ کا حوالا نہیں دے دیا، اگر ایسا کرتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

ثانیاً: امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت طیبہ آپ کے اخلاق و کردار کو معلوم کرنے

اور پوچھنے سے عید میلاد کو کیا نسبت ہے؟ ہر روز علماء سے عوام نبی کریم ﷺ کے حالات زندگی دریافت کرتے ہیں مگر کوئی اناڑی بھی اسے تہوار کا نام نہیں دیتا، ناجانے مفتی صاحب کس کیفیت میں کتاب کو تحریر کرتے رہے کہ دعوی اور دلیل میں ذرا سی بھی مناسبت موجود نہیں۔

ہم مبتدعین کے علماء سے ناصحانہ گزارش کرتے ہیں کہ آخر دنیا سے ہر انسان کو کوچ کر کے اللہ تعالی کے حضور پیش ہونا ہے اس لیئے اپنے اعمال کی اصلاح کیجئے اور اس طرح کے غیر متعلقہ دلائل سے بدعات کے جواز پر استدلال کر کے اپنی آخرت برباد نہ کیجئے کہ شریعت انسان کے گھر کی نہیں بلکہ اس کا بنانے والا اللہ تعالی اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والا انبیاء کرام علیہم السلام کا مقدس گروہ تھا آپ حضرات اس کو اپنے ہاتھ میں لیکر شریعت سازی کرتے ہیں جو کہ آپ کو قطعاً زیبا نہیں اور یہ عمل اخروی زندگی میں مہنگا پڑے گا، اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو سمجھ کی توفیق عطا فرمائے، آمین یاالہ العالمین۔

ثالثاً، اگر حدیث میں یہ ہوتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم خاص ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کو اکٹھے ہو کر ایک دوسرے سے نعت سنتے اور اس سننے سے ان کا مقصود عید میلاد ہوتا تو ہم اس کو قبول کرتے اور، علیکم بسنتی، کے تحت اس کو سنت جانتے مگر حدیث میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں، حالانکہ ان کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا انکار نہیں کیا جاسکتا

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

یہ تو مقبول بندوں کا ذکر تھا، کفار نے بھی ولادت پاک کی خوشی منائی، تو کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہی کرلیا، چنانچہ بخاری جلد دوم کتاب النکاح۔

باب وا مھاتکم التی ارضعنکم و مایحرم من الرضاعة، میں ہے۔

جب ابولھب مرگیا تو اس کو اس کے گھر والوں نے خواب میں برے حال میں دیکھا، پوچھا کیا گزری؟ ابولھب بولا کہ اس کلمے کی انگلی سے پانی ملتا ہے، کیونکہ میں نے ثوبیہ لونڈی کو آزاد کیا تھا۔

بات یہ تھی کہ ابولھب حضرت عبداللہ کا بھائی تھا اس کی لونڈی ثوبیہ نے آکر اس کو خبر دی کہ

آج تیرے بھائی کے گھر فرزند پیدا ہوا ہے اس نے اس خوشی میں اس لونڈی کو انگلی کے اشارے سے کہا جاتو آزاد ، یہ سخت کافر تھا جس کی برائی قرآن میں آرہی ہے مگر اس خوشی کی برکت سے اللہ نے اس پر یہ کرم کیا کہ جب دوزخ میں پیاسا ہوتا ہے تو اپنی انگلی کو چوستا ہے ، پیاس بجھ جاتی ہے حالانکہ وہ کافر تھا، جاءالحق ص ۲۳۵۔

الجواب

اولاً: سند کے اعتبار سے یہ روایت گو کمزور ہے مگر ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ شریعت حقہ کا کوئی حکم کسی (سوائے نبی کے) شخص کی خواب سے ثابت نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً: خود صاحب خواب (یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ) کو خواب اس وقت آیا جب وہ مسلمان نہ تھے اور انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس خواب کو دلیل بنا کر عید میلاد نہ منائی اور نہ جلوس و چراغاں کا اہتمام کیا، کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ابولھب نے لونڈی کو آزاد رشتے داری کی وجہ سے کیا، نہ کہ نبی و رسول کی ولادت جان کر خوشی کی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ابولھب کے عمل کی نبی کریم ﷺ نے تحسین نہیں کی ۔

ثالثاً: یہ خواب نص قرآنی کے مخالف ہے کیونکہ قرآن مجید نے صاف کہہ رکھا ہے کہ دوزخیوں کو ایسا کھانا ملے گا جس سے بھوک اور پیاس ختم نہ ہوگی ۔

لایسمن ولایغنی من جوع ،.

کہ نہ فربہی لائیں اور نہ بھوک میں کام دیں (الغاشیہ ، ۷) ۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی صاحب کا استاذ المکرّم فاضل مراد آبادی لکھتا ہے یعنی ان سے غذا کا نفع حاصل نہ ہوگا کیونکہ غذا کے دو ہی فائدے ہیں ایک یہ کہ بھوک کی تکلیف رفع کرے دوسرے یہ کہ بدن کو فربہ کرے یہ دونوں وصف جہنمیوں کے کھانے میں نہیں بلکہ وہ شدید عذاب ہے ، ف ۶ ص ۸۶۳۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے ۔

لایذوقون فیھا بردا ولاشرابا ،(النبا،۲۴).

اس میں کسی طرح کی ٹھنڈک کا مزہ نہ پائیں گے اور نہ کچھ پینے کو (احمد رضا)۔

ان آیات بینات سے ثابت ہوا کہ کفار کو دوزخ میں کھانے کو ایسی چیزیں ملیں گی جن سے ان کی بھوک دور نہ ہوگی اور وہ دوزخ میں کبھی بھی کوئی ٹھنڈک نہ پائیں گے، ان واضح نصوص کو بریلوی مکتب فکر کے علماء ایک خواب سے رد کرنے کی کوشش میں ہیں کہ ابولھب کو انگلی چوسنے سے ٹھنڈک مل جاتی ہے، حالانکہ ان کے نزدیک صحیح حدیث جو کہ خبر واحد ہو اس سے بھی نص کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، مگر یہاں خودغرضی دیکھئے کہ خواب کی بنا پر قرآنی آیات کو پس پشت ڈالا جارہا ہے۔

رابعاً: اگر بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ابولھب نے لونڈی کو آزاد نیکی جان کر کیا تھا (حالانکہ اس نے فقط رشتے داری کے ناطے سے لونڈی آزاد کی تھی) اور اس کا یہ عمل اللہ تعالی کے حضور مقبول بھی ہوا تو تب بھی یہ خواب مخالف قرآن ہونے کی وجہ سے مردود ہے کیونکہ قرآن نے یہ بات واضح سے واضح تر بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار نہ کی اور آپ علیہ السلام کی مخالفت کی ان کے اعمال ضائع گئے، ارشاد ہوتا ہے،

ان الذين كفروا و صدوا عن سبيل الله وشآقوا الرسول من بعدما تبين لهم الهدى لن يضروا الله شيأً و سيحبط اعمالهم (محمد ۳۲).

جن لوگوں کو سیدھا رستہ معلوم ہوگیا (اور) پھر بھی انہوں نے کفر کیا اور (لوگوں) کو خدا کی راہ سے روکا اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی وہ اللہ تعالی کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے اور اللہ تعالی ان سب کا کیا کرایا اکارت کردے گا ۴۷۔۳۲۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ابولھب کا لونڈی آزاد کرنے کا عمل ضائع ہوگیا، مگر خواب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عمل کی وجہ سے اسے جہنم میں سکون ملتا ہے یہ خواب چونکہ نص قرآنی کے مخالف ہے لہذا اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

خامساً: ابولھب شاتم رسول تھا جیسا کہ سورۃ لھب کے شان نزول سے ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ کی شان میں ادنی سے ادنی گستاخی بھی ایک مسلمان و مومن کے اعمال کو برباد کردیتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

یا یھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعضٍ ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون. (الحجرات ، ۲) .

ترجمہ۔اے اہل ایمان اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے رو برو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو کہ) تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو،(۴۹۔۲) ۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلمان بھی اگر نبی ﷺ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا، تو اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ،اور جو شخص کافر ہو اور علی الاعلان وہ جناب رسالت مآب ﷺ کی توھین کرتا ہو اس کا عمل کیوں ضائع نہ ہوگا ؟ خود مفتی صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ،

جب ان کی بارگاہ میں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہیں تو دوسری بے ادبی کا ذکر ہی کیا ،نور العرفان ص ۸۲۲،

اس آیت نے تمام عقدے ہی حل کر دیئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خواب امر واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ ابولھب کے شاتم رسول ہونے کی وجہ سے تمام نیکیاں اکارت گئیں الغرض اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ لونڈی کو آزاد کرنا ابولھب کی نیکی تھی تو نص قرآنی سے اس کی یہ نیکی تباہ و برباد ہوگئی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا خواب چونکہ نص قرآنی کے مخالف ہے لہذا اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور اس کو دلیل بنا کر عید میلاد النبی کا ثبوت نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یقین کو شک زائل نہیں کرسکتا۔

باب مجلس میلاد میں کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

محفل میلاد میں قیام کرنا دو باتوں پر مشتمل ہے

(۱) آپ علیہ السلام کے تذکرہ اور ذکر ولادت پر کھڑا ہونا واجب ہے کیونکہ یہ آپ کی تعظیم

میں شامل ہے،

(۲) چونکہ آنحضرت ﷺ خود تشریف لاتے ہیں اور جناب رسالت مآب کی تشریف آوری پر کھڑا ہونا مسنون ہے۔

پہلی بات پر تبصرہ

ذکر ولادت پر کھڑے ہونے کی قرآن وسنت اور آثار صحابہ کرام میں اصل نہیں پائی جاتی اور خیرالقرون میں اس کا وجود نہ تھا اس کی ایجاد بھی عید میلاد کے ساتھ ہوئی پھر آہستہ آہستہ اس کو فرض و واجب قرار دیا جانے لگا، چنانچہ معروف بریلوی مکتب فکر کا مولوی عبدالسمیع، محمد یحییٰ مفتی مکہ سے نقل کرتا ہے۔

یجب القیام عند ذکر ولادة ﷺ (انوار ساطعه ص ۲۶۷).

آنحضرت ﷺ کی ولادت کے ذکر کے وقت کھڑا ہونا واجب ہے۔

اسی طرح رضا خانی مجموعہ فتاوی یعنی غایۃ المرام ص ۵۵، ۵۶، ۶۷، ۷۱، میں لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر محفل میلاد میں تشریف لاتے ہیں تعظیم کے واسطے کھڑا ہونا فرض ہے قیام نہ کرنے والا کافر ہے، بحوالہ راہ سنت ص ۱۴۹۔

جبکہ قیام میلاد پر صحابہ کرام کا عمل نہ تھا بلکہ ادلہ شرعیہ سے اس کا قطعاً کوئی وجود ہی نہیں ملتا مولانا عبدالحی حنفی (جو کہ میلاد کے جواز کے قائل اور علماء بریلوی کے نزدیک معتمد ہیں) فرماتے ہیں۔

بیان ولادت نبوی ﷺ کے وقت جو قیام کیا جاتا ہے اس کی شرعاً کوئی معتمد بہ اصل نہیں ہے، مجموعہ فتاوی عبدالحی ص ۲۵۸ ج ۳۔

اس کے بے اصل ہونے کے علاوہ شریعت مطہرہ میں تذکرہ حبیب کبریا ﷺ کے وقت درود و سلام پڑھنا سنت خیر الانام ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔

قال رسول الله ﷺ رغم انف رجل ذکرت عنده فلم یصل علی،

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کی ناک خاک آلودہ ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا تو اس نے مجھ پر درود شریف نہ پڑھا ،

الحدیث مسند احمد ص ۲۵۴ ج ۲ رقم ۷۴۰۲، وترمذی مع تحفۃ ص ۲۷۱ ج ۴ ، ومستدرک حاکم ص ۵۴۹ ج ۱ ،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کے ذکر کے وقت درود شریف پڑھنا سنت مصطفیٰ ﷺ ہے اسکے برعکس جو شخص ذکر رسالت مآب کے وقت قیام کرتا ہے وہ تعظیم النبی (ﷺ) کے لئے درود کو ناکافی جانتا ہے جبھی تو وہ قیام کو لازم وضروری جانکر کھڑا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدعت ہے جو سنت (درود پڑھنے) کو مٹانے کی ناپاک سعی ہے۔

دوسری بات کا جواب

اولاً، ذکرولادت کے وقت امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا محفل میلاد میں آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں ،ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین علماء بریلوی کو کھلا چیلنج ہے وہ کوئی ایسی آیت یا صحیح حدیث ہو (جس میں تاویل اور تحریف معنوی کو دخل نہ ہو) پیش کریں جس میں صراحت ہو کہ میں محفل میلاد میں ذکر ولادت پر تشریف لاتا ہوں یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اکھٹے ہوکر سرتوڑ کوشش کرنے کے باوجود ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتے ،

یہی وجہ ہے کہ اکابرین امت نے ذکر ولادت کے وقت قیام کو بدعت قرار دیا ہے چنانچہ قاضی شہاب الدین (المتوفی ۸۴۰) دولت آبادی فرماتے ہیں ۔

وما یفعله الجهال علی راس کل حول فی شهر الربیع الاول لیس بشئی و یقومون عند ذکر مولده ﷺ و یزعمون ان روحة ﷺ یجئی فزعمهم باطل بل هذا الاعتقاد شرک وقد منع الائمة الاربعة مثل هذا .

اور جو کچھ جاہل لوگ ربیع الاول کے مہینہ میں کرتے ہیں (یہ تمام) بے اصل ہے اور کھڑے ہوتے ہیں آپ ﷺ کی ولادت کے بیان پر اور یہ گمان کرتے **ہیں** کہ نبی ﷺ کی روح آتی ہے تو یہ ان کا عقیدہ باطل اور شرکیہ ہے اور آئمہ اربعہ نے ان جیسے عقائد (اختیار) کرنے سے منع فرمایا

ہے۔ فتاوی نذیریہ ص۲۱۵ ج ا

تحفة القضاة ص بحوالہ ساطعہ ص ۲۴۱ .

قاضی نصیرالدین فرماتے ہیں کہ

وقد احدث بعض جهال المشائخ امورا كثيرة لانجد لهااثرا في كتاب ولا في سنة منها القيام عند ذكر ولادة سيد الانام عليه التحية والسلام.

آج کل جاہل صوفیوں نے بہت سی باتیں ایجاد کرلی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا ان میں سے ایک (یہ بھی ہے) کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت کھڑے ہونا ،

طریقة السلف ص بحوالہ فتاوی نذیریہ ۲۱۵۔۱۴

صاحب سیرت شامی فرماتے ہیں

جرت عادة كثير من المحبين اذا سمعوا بذكر وضعه ﷺ ان يقوموا تعظيماله ﷺ و هذا القيام بدعة لااصل لها،

آج بہت سے محبان کی عادت ہوچکی ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت کا ذکر سنتے ہیں تو آپ علیہ السلام کی تعظیم کے لیئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ کھڑا ہونا بدعت ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے، سیرت شامی بحوالہ انوار ساطعہ ص ۲۳۸، وکذا فی فتاوی نزیریہ ص ۲۱۵ ج ا ۔

مولانا عبدالحی مرحوم لکھنوی فرماتے ہیں ۔ قیام میلاد بدعت ہے،

مجموعة الفتاوی ص ۲۵۸ ج ۳، مفہوماً۔

آنحضرت ﷺ اپنے لیئے قیام کو ناپسند کرتے تھے

ان تمام ابحاث کو ایک طرف رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی آمد پر قیام کو پسند کرتے تھے یا کہ مکروہ و ناجائز جانتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ان تمام پیچیدگیوں کو حل کر دیتی ہے آپ فرماتے ہیں ۔

لم یکن شخص احب الیھم من رسول الله ﷺ وکانوا اذا رأوه لم یقوموا لما یعلمون من کراھیه لذلک .

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اور کوئی شخص محبوب نہ تھا لیکن جب وہ آپ علیہ السلام کو (آتے) دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ علیہ السلام (قیام کو) مکروہ جانتے ہیں، ترمذی مع تحفہ ص ۷ ج ۴، ومسند احمد ص ۱۳۲ و ۱۳۴ ج ۳، رقم ۱۱۹۳۶ و ۱۱۹۶۲) وادب المفرد للبخاری ص ۲۴۴، ومسند ابویعلی ص ۴۸ ج ۴، رقم ۳۷۷۲۔

یہ حدیث اپنے معنی ومفہوم میں بالکل واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ قیام تعظیمی کو مکروہ جانتے تھے ،اتباع رسول کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ علیہ السلام تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کو مکروہ جانتے تھے تو ہم صحابہ کرام کی پیروی کرتے ہوئے ذکر ولادت کے وقت قیام نہ کریں ۔

مسئلہ

انسان کی حالت دوطرح کی ہوتی ہے فاضل یا مفضول ،اگر کسی کا تعلق پہلے گروہ سے ہے تو وہ اتباع رسول ﷺ کی پیروی میں اپنے لیئے قیام کو ناپسند کرے اور اگر اس کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے تو وہ صحابہ کرام کی پیروی میں کسی کے لیئے قیام نہ کرے

مفتی صاحب کا اعتراض

ان احادیث میں مطلق قیام سے منع نہیں فرمایا گیا ورنہ ہم نے جو احادیث اور اقوال فقہاء نقل کیے اس کے خلاف ہوگا بلکہ حسب ذیل امور سے ممانعت ہے اپنے لئے قیام چاہنا لوگوں کا دست بستہ سامنے کھڑا رہنا اور پیشوا کا درمیان میں بیٹھا رہنا ، اشعۃ اللمعات ، میں ہے قیام تعظیمی کرنا اور نہ کرنا زمانہ اور حالات اور اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح صحابہ کرام نے کبھی تو حضور کے لئے قیام کیا اور کبھی نہیں ۔

آپ کا قیام سے کراھت فرمانا تواضعاً و انکساراً تھا لہذا اس میں ہمیشہ کھڑے ہونے کی نفی ہے ، جاء الباطل ص ۲۵۹۔

الجواب

اولاً ،آپ کی پیش کردہ روایات کا جواب آگے اللہ تعالی کے فضل وکرم سے آرہا ہے کہ وہ اپنے معنی ومفہوم میں بریلوی مکتب فکر کی قطعاً دلیل نہیں علاوہ ازیں ان میں سے بعض ضعیف بھی ہیں، رہا اقوال فقہاء تو وہ چونکہ صحیح صریح احادیث کے مخالف ہیں لہذا مردود ہیں ، اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں،

ثانیاً: مفتی صاحب کا اشعۃ اللمعات سے نقل کرنا کہ صحابہ کرام بھی آپ علیہ السلام کے لیئے قیام کرتے تھے الخ دلیل کا محتاج ہے یقین جانئے پوری دنیا کے مبتدعین اگر اکھٹے ہوکر سرتوڑ کوشش کریں تو پھر بھی یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کرسکتے کہ کبھی کبھار صحابہ کرام نبی کریم علیہ السلام کے لیئے تعظیماً کھڑے ہوتے تھے۔

ثالثاً ، اسے مفتی صاحب کا تواضع و انکسار پر محمول کرنا بھی فضول ہے کیونکہ مسند احمد میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے فرمان نبوی موجود ہے۔

فقال رسول الله ﷺ لایقام لی ،انما یقام لله تبارک و تعالی .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے لئے قیام نہ کیا کریں کیونکہ قیام فقط اللہ تبارک و تعالی کے لئے ہے ،الحدیث مسند احمد ص ۳۱۷ ج ۵۔

اس حدیث نے تو تمام الجھنیں صاف کردیں کہ قیام تعظیمی فقط اللہ تعالی کے لیئے خاص ہے، مگر افسوس مفتی صاحب اسے تواضع پر محمول کررہے ہیں، اور بزعم خود ہوائی فائرنگ سے اس مضبوط ومستحکم دلیل کو توڑنے کی سعی لاحاصل کررہے ہیں،

اے جی کیا نبی کریم ﷺ کی تواضع و انکساری قابل اتباع اور نمونہ نہیں؟ جو آپ خصم کو حجت باور کرارہے ہیں ،حکیم الامت صاحب نبی کا ہر قول وفعل اسوہ حسنہ (مگر جس کی شریعت نے تخصیص کردی ہو) ہے لیکن یہ عقل وخرد کی باتیں مفتی صاحب کی بلا جانے ،حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایک ایسی منحوس اور خبیث چیز ہے جو انسان کو فہم وشعور سے خالی کر کے خبطی بنا دیتی ہے۔

آخر اللہ تعالی کے نبی (ﷺ) نے کہا ہے بدعتی پر اللہ ،اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے ،بخاری ص ۲۵۱ ج ۱ ، ومسلم ص ۴۴۱ ج ۱۔

ذکر ولادت کے وقت قیام کرنے پر مفتی صاحب کے دلائل اور ان کے جوابات

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ مشکوۃ کتاب الجهاد باب حکم الاسرا اور باب القیام میں ہے کہ جب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو حضور علیہ السلام نے انصار کو حکم دیا، قوموا الی سیدکم، اپنے سردار کے لیئے کھڑے ہو جاؤ، یہ قیام تعظیمی تھا۔ جاء الباطل ص ۲۴۹۔

الجواب

اولاً: مفتی صاحب نے ترجمہ حدیث غلط کیا ہے درست یہ ہے کہ اپنے سردار کی طرف کھڑے ہو، شرح صحیح مسلم ص ۴۸۳ ج ۵۔ مؤلفہ مولوی غلام رسول سعیدی طبع ربیع الثانی سن ۱۴۱۵ھ

اس بے ایمانی کا پس منظر یہ ہے کہ محدثین کرام نے یہ کہا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ زخمی تھے تو ان کو اتارنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا، یہی وجہ ہے کہ، قوموا الی سیدکم، (اپنے سردار کی طرف اٹھو) فرمایا، قوموا لسیدکم، (اپنے سردار کی تعظیم کے لیئے کھڑے ہو جاؤ) نہیں فرمایا، دیکھئے مرقاۃ ص ۸۳ ج ۹،

اس معنی کی تائید مسند احمد کی حسب ذیل روایت سے ہوتی ہے، قوموا الی سیدکم فانذلوہ، یعنی اپنے سردار کی طرف اٹھو اور اسے گدھے سے اتارو، الحدیث مسند امام احمد ص ۱۴۲ ج ۶۔

اس حدیث میں قیام کی وجہ تعظیم نہیں بلکہ سواری سے اتارنا بتائی گئی ہے ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلہ سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس سے استدلال کرتے ہیں اور پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ معنوی تحریف کرتے ہوئے بھی ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا، ہیں بزعم خویش ماشاء اللہ حکیم الامت اور مفسر قرآن۔

ثانیاً، مبتدعین کا موقف ہے کہ ذکر ولادت کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لاتے ہیں چنانچہ بریلوی مکتب فکر کا باوا آدم مولوی احمد رضا خان لکھتا ہے، تشریف آوری حضور کے اختیار میں ہے اور قیام تعظیمی ذکر قدوم (تشریف لانا، فیروز اللغات ص ۹۵۲، ابوصہیب) شریف کے لیئے ہے،

فتاوی رضویہ ص ۱۴۷ ج ٦،

مفتی صاحب کا حق تھا پہلے دلائل صحیحہ سے محفل میں آنا ثابت کرتے اور بعدہ قیام تعظیمی کے لیئے ثبوت دیتے، لیکن مفتی صاحب نے نہ تو آنے پر کوئی دلیل قائم کی ہے اور نہ ہی قیام تعظیمی کے لئے روایت نقل کی ہے

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

فرماتے ہیں کہ مشکوہ باب القیام میں بروایت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہے

فاذا قام قمنا قیاما حتی نراہ قد دخل بعض بیوت ازواجہ ،

جب حضور علیہ السلام مجلس سے اٹھتے تو ہم بھی کھڑے ہوجاتے تھے

یہاں تک کہ ہم دیکھ لیتے تھے کہ آپ اپنی کس بیوی پاک کے گھر میں داخل ہوگئے ، جاء الباطل ص ۲۴۹۔

الجواب

غالبًا مفتی صاحب نے کبھی مجلس برخاست ہوتی نہ دیکھی تھی، جبھی تو اس حدیث سے قیام تعظیمی پر استدلال فرمارہے ہیں، اے جی جب مجلس برخاست ہو جائے تو سب ہی اٹھ جاتے ہیں، اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے ملاعلی القاری حنفی فرماتے ہیں ۔

ای لانفضاض المجلس لا للتعظیم لانهم ماکانوا یقومون له مقبلا فکیف یقومون له مدبراً.

یعنی صحابہ کرام مجلس برخاست ہونے کے لیئے کھڑے ہوتے تھے، ناکہ تعظیم کے لیئے کیونکہ صحابہ کرام استقبال کے لیئے کھڑے نہ ہوتے تھےتو (گھرکو) لوٹتے وقت کیسے کھڑے ہوتے ہوں گے ، مرقاۃ ص ۸٦ ج ۹ ۔

یہی مولوی قطب الدین حنفی مرحوم نے ترجمہ مشکوۃ مظاہر حق ص ٦۷ ج ۴ میں کہا ہے۔

قارئین کرام مبتدعین کا دعوی تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے لیئے محفل میلاد میں قیام کیا جاتا ہے، مگر لیکن دلیل مجلس برخاست کے قیام کی دی جارہی ہے، جو چاہے حسن کرشمہ ساز کرے۔

تنبیہ

صاحب مشکوۃ نے مذکورہ حدیث کو بلاحوالہ نقل کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اسے سنن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے، فتح الباری ص ۴۴۲ ج ۱۱، راقم الحروف کے سامنے ابوداؤد کے تین نسخے ہیں (۱) عون المعبود (۲) مولانا فخرالحسن صاحب کا (۳) مولانا محمود حسن خان صاحب کا، لیکن راقم کو ان تینوں سے یہ روایت نہیں مل سکی، ہاں البتہ علامہ ھیثمی نے اسے، مسند بزار، سے نقل کر کے صراحت کی ہے کہ یہ مرسل ہے،

کیونکہ محمد بن ھلال اپنے والد ھلال بن ابی ھلال سے بیان کرتا ہے اور یہ تابعی ہے، مجمع الزوائد ص ۴۳ ج ۸، علاوہ ازیں ھلال مجہول راوی ہے جیسا کہ علامہ ذھبی نے صراحت کی ہے، میزان الاعتدال ص ۳۱۷ ج ۴، الغرض یہ روایت ارسال اور جہالت راوی کی وجہ سے ضعیف ہے لہذا مفتی صاحب کا استدلال ہی باطل ہے کیونکہ ضعیف روایت حجت نہیں ہوتی۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عین نماز پڑھاتے ہوئے جب حضور علیہ السلام کو تشریف لاتے دیکھا تو مقتدی بن گئے، اور بیچ نماز میں حضور علیہ السلام امام ہوئے، مشکوۃ باب مرض النبی، معلوم ہوا کہ بزرگان دین کی تعظیم عبادت کی حالت میں بھی کی جائے، جاء الباطل ص ۲۵۰۔

الجواب

اولاً : مفتی صاحب نے محض سن کر اس روایت کو درج کیا ہے مراجعت کا تکلف نہیں کیا، کیونکہ مشکوۃ میں، مرض النبی، کا کوئی باب نہیں بلکہ، وفات النبی، کا ہے، دیکھئے ص ۵۴۶، لیکن قصہ امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ کی روایت اس میں نہیں بلکہ، باب ما علی الماموم، میں یہ روایت ہے، دیکھئے مشکوۃ ص ۱۰۱۔

خیر مفتی صاحب کی شخصیت بالکل اس ضرب المثل کی طرح تھی۔

اونچی دوکان پھیکا پکوان۔

ثانیاً : روایات کا اس میں خاصہ اختلاف ہے کہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امام رہے یا مقتدی بن گئے لیکن حق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آمد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکبر تھے اور رسول اللہ ﷺ امام، تفصیل کے لیئے دیکھئے

'مرعاۃ المفاتیح ص ۹۵ ج ۴، چونکہ مفتی صاحب کو اس حقیقت کا اعتراف ہے اس لیئے یہاں دلائل کی ضرورت نہیں، قارئین کرام جب آپ نے اس حقیقت کو بخوبی جان لیا تو اب بریلوی مکتب فکر کے مجدد ملت اعلی حضرت مولوی احمد رضا خاں کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے' کہتا ہے۔

مولوی برکات احمد کے انتقال کے بعد مولوی سید امیر احمد خواب میں زیارت حضور ﷺ سے مشرف ہوئے کہ گھوڑے پر تشریف لے جاتے ہیں عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کہاں تشریف لے جاتے ہیں، فرمایا برکات احمد۔

کے جنازہ کی نماز پڑھنے، الحمدللہ یہ جنازہ مبارکہ میں نے پڑھایا۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، واللہ ذو الفضل العظیم.

ملفوضات احمد رضا خاں بریلوی ص ۲۷ ج ۲۔

مولوی احمد رضا خاں کی اس بات سے واضح ہوا کہ اس کی اقتدا میں آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی، اب بتایئے کہ اس نے ایک غیر فرضی نماز میں رسول اللہ ﷺ کا ادب کیوں نہ کیا؟ اور وہ گستاخی رسول کا مرتکب کیوں ہوا؟ اس نے امامت آنحضرت ﷺ کو کیوں تفویض نہ کی اور مقتدی بن کر نماز جنازہ کیوں نہ پڑھا؟

ثالثاً: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو آنحضرت کی تشریف آوری کے وقت حالت قیام میں تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے آنے کا احساس کیا تو پیچھے لوٹنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قم مکانک، اپنی جگہ کھڑا رہ، صحیح مسلم ص ۱۷۹ ج ۱، اس فرمان سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی آمد پر تعظیماً ابوبکر رضی اللہ عنہ قطعاً کھڑے نہیں ہوئے بلکہ نماز کی حالت ہی پہلے سے ہی قیام کی تھی، مگر مفتی صاحب اسے قیام تعظیمی پر محمول کر رہے ہیں۔

اگر علماء بریلوی کہیں کہ مفتی صاحب کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ حالت نماز میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ادب کیا تھا تو راقم عرض کرتا ہے بجا فرمایا مگر مولوی احمد رضا خاں تو بے ادب ثابت ہوگیا جو کہ یہ کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میری اقتدا میں نماز جنازہ پڑھی، پھر اس بے ادبی پر نابکار و نالائق کلمہ الحمدللہ کہہ کر شکریہ ادا کر رہا ہے، گویا بدنصیب اس گستاخی پر ندامت کی بجائے فخر و تکبر کر رہا ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مسلم جلد دوم باب حدیث توبہ (کعب) ابن مالک ،کتاب التوبہ میں ہے۔

فقام طلحه ابن عبيدالله يهرول حتى صافحني و هناني.

پس ابن عبیداللہ کھڑے ہوگئے اور دوڑتے ہوئے آئے مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی ،جاء الباطل ص ۲۵۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے تھے بلکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی تھی اور اس کی مبارک باد دینے کے لیئے دوڑ کر گئے تھے ، اور یہ ہمارے نزدیک بھی **جائز** ہے، اختلاف تعظیمی قیام میں ہے اس کی دلیل دیکھیئے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوۃ کتاب الادب باب المصافحۃ میں ہے کہ زید بن حارثہ دروازہ پاک مصطفیٰ علیہ السلام پر حاضر ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

فقام اليه رسول الله ﷺ عريانا فاعتنقه و قبله .

ان کی طرف حضور علیہ السلام بغیر چادر شریف کے کھڑے ہوگئے ،پھر ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا ،جاء الباطل ص ۲۵۱۔

الجواب

اولاً ، راقم الحروف نے جب مفتی صاحب کی اس دلیل کو پڑھا تو میری محبت رسول اللہ ﷺ کی حس ایمانی نے کہا کہ یہ روایت مردود ہے ،عظمت مصطفیٰ ﷺ کے ٹھیکے دارو تمہارے بقلم خود حکیم الامت نے کمال عیاری سے متن روایت میں معنوی تحریف کی ہے اس مردود عبارت کا معنی یہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طرف رسول اللہ ﷺ ننگے کھڑے ہوئے ، استغفرالله ، لاحول ولاقوة الابالله العلیٰ العظيم الف الف مرة ۔

اس کی سند میں پہلا مجروح راوی ابراھیم بن یحیی ہے ،ترمذی مع تحفہ ص ۳۹۹ ج ۳، اسے امام ابو حاتم نے ضعیف اور امام ازدی نے منکر الحدیث کہا ہے،تھذیب ص ۱۵۴ج ۱، و میزان ص ۷۴ ج ۱ ،حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ،لین الحدیث ،ہے تقریب ص ۱۶۔

دوسرا راوی ابراھیم کاوالد یحیی بن محمد ہے اسے ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے امام ساجی کا کہنا ہے کہ اس کی مرویات میں مناکیر اور خطائیں ہیں اور تلقین کو قبول کر لیتا تھا، تھذیب ص ۲۷۳ ج ۱۱ ، و تقریب ص ۲۷۸۔

امام عقیلی فرماتے ہیں،

فی حدیثه منا کیر وا غالیط و کان ضریرا فیما بلغنی انه یلقن .

اس کی روایات میں مناکیر اور خطائیں ہیں موصوف نابینا تھا مجھے خبر پہنچی ہے کہ لقمہ کو قبول کرلیتا تھا، الضعفاء الکبیر ص ۴۲۷ ج ۴ ، ومیزان الاعتدال ص ۲۰۶ ج ۴ ۔

تیسرا راوی اس میں محمد بن اسحاق ہے جو کہ بلاشبہ ثقہ ہیں مگر زبردست مدلس ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ۔

مشهور بالتدليس من الضعفاء والمجهولين وعن شرمنهم وصفه بذلك احمد والدارقطنی و غير هما ،

یعنی ضعیف ومجہول اور ان سے بھی بدتر سے تدلیس کرنے میں مشہور ہے اس کی صراحت امام احمد بن حنبل اورا مام دارقطنی نے کی ہے ، طبقات المدلسین ص ۵۱، جبکہ زیر بحث روایت صیغہ عن سے بیان کررہا ہے ،

الغرض جس روایت کی سند میں دو مجروح راوی ہوں تیسرا زبردست مدلس ہو ،اس کے مردود ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے ،

اس روایت کو حافظ ذھبیؒ نے ،منکر ،محدث مبارک پوری نے ضعیف، اسی طرح مولانا احمد حسن اور امام العصر محمد ناصرالدین البانی رحمہ اللہ تعالی نے ضعیف کہا ہے، میزان ص ۲۰۷ ج ۴ ، وتحفۃ الاحوذی ص ۳۹۹ ج ۳ ، وتنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوۃ ص ۲۸۸ ج ۳ ، وضعیف سنن ترمذی ص ۳۲۶۔

ثانیاً ، یہ روایت صحیح حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے بھی قابل اعتماد نہیں ، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نبوت سے پہلے بچپن میں) کعبہ کی تعمیر کے لیئے قریش کے ساتھ پتھر ڈھو رہے تھے اس وقت (کرتہ عربی کے نیچے) تہبند باندھے ہوئے تھے آپ علیہ السلام کے چچا عباس نے کہا بھتیجے اپنا تہبند کھول کر کندے کے اوپر اور پتھر کے نیچے رکھ لو (تا کہ پتھر کو منتقل کرنے میں آسانی رہے) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ علیہ السلام نے تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لیا ، اسی وقت غش کھا کر (زمین پر) گر پڑے ، اس کے بعد آپ کبھی ننگے نہیں دیکھے گئے ، بخاری ص ۵۲ ج ۱ ، و مسلم ص ۱۵۴ ج ۱ ، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رحمت دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پنڈلیاں ننگی ہونے کو اللہ تعالیٰ نے گوارہ نہیں کیا اور اسی وقت آپ معجزانہ طور پر غش کھا کر زمین پر گر پڑتے ہیں پھر صحابی کہتا ہے کہ اس کے بعد آپ کو کبھی بھی ننگے نہیں دیکھا گیا مگر روایت مذکورہ میں زمانہ نبوت میں آپ ﷺ کے ننگے ہونے کی صراحت ہے ، جو اس صحیح حدیث کے صریحا معارض اور خلاف واقعہ ہے ۔

ثالثاً ، کیا مفتی صاحب نے یا ان کے کبھی کسی مرید و شاگرد نے بھی کبھی ایسا کیا ہے کہ جب کوئی محبوب دروازہ کھٹکھٹائے تو ننگے جا کر اس کا استقبال کیا ہو ، جب آپ ایسے فعل کو اپنے لیئے پسند کرنے کے لیئے تیار نہیں تو پھر عظمت مصطفیٰ کے متعلق آپ نے کیسے باور کر لیا ہو ۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوۃ ۔ اسی باب میں ہے کہ جب حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں ،

قام الیھا فاخذ بیدھا فقبلھا و اجلسھا فی مجلسہ ،

ان کے لیئے کھڑے ہو جاتے اور ان کا ہاتھ پکڑتے ان کو چومتے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے الخ

جاء الباطل ص ۲۵۱ ،

الجواب

اولاً : بلاشبہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے مگر یہ مبتدعین کی دلیل قیام تعظیمی کی قطعاً نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم کے لیئے قیام نہ فرماتے تھے بلکہ ان کو بٹھانا اور مجلس میں جگہ دینا مقصود ہوتا تھا، آج بھی اگر کسی کی بیٹی آئے خواہ وہ عالمہ فاضلہ ہی کیوں نہ ہو تو اس کا والد اس کی تعظیم کے لیئے قطعاً کھڑا نہیں ہوتا۔

علامہ البانی رحمہ اللہ تعالی اس پر پُر مغز گفتگو کرنے کے بعد، علامہ عصام شافعیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

ومن ذلک قیامه ﷺ الی ابنته فاطمة اذا دخلت علیه و قیامها الیه ﷺ اذا دخل علیها ،فانه صحیح الاسناد، ولکن لیس فیه القیام المتنازع فیه ، لانه قام الیها لیجلسها فی مجلسه،وقامت الیه لتجلسه فی مجلسها

،وهذا ممالاخلاف فیه ألست تری القائلین باستحباب القیام المزعوم لایقوم احدهم لابنه ولوکان عالماً ،فاضلاً ؟!بل قال العصام الشافعی کما فی شرع المناوی علی ،الشمائل.

وقد اتفق الناس فی القدیم والحدیث علی استهجان قیام الوالد لولده وان عظم ،ولو وقع ذلک من بعض الا باء لاتخذه الناس ضحکة و سخروا منه .

قیام تعظیمی کے قائلین کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب نبی ﷺ پر آپ علیہ السلام کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوتیں تو آپ علیہ السلام اُس کی طرف کھڑے ہوتے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے تو وہ بھی آپ علیہ السلام کے لیئے قیام کرتیں تھیں، اور یہ صحیح الاسناد ہے۔

لیکن اس میں متنازعہ قیام کی دلیل نہیں کیونکہ آپ علیہ السلام اس لیئے کھڑے ہوتے تھے تاکہ اسے اپنی مجلس میں بٹھائیں اور اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی بٹھانے کے لیے کھڑی ہوتیں اور یہ ایسی چیز ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ قیام کو مستحب جانئے والے بھی اپنے بیٹے کے لیئے کھڑے نہیں ہوتے اگر چہ وہ عالم و فاضل ہی ہو

، بلکہ عصام شافعی نے کہا ہے ،جیسا کہ شرح شمائل للمناوی میں ہے کہ اگلے پچھلے تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ والد کا اولاد کے لیئے کھڑا ہونا معیوب ہے خواہ اولاد صاحب عظمت ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی والد سے ایسا سرزد ہوتو لوگ اسے مذاق بنالیں گے اور ایسے شخص کو تمسخر کریں گے۔ سلسلہ الا حادیث الضعیفۃ و الموضوعۃ واثرھا السئ فی الامۃ ص ۶۳۷ ج ۳۔

ثانیاً: ہم خداداد فراست دینیہ اور اس کے علم کو کام میں لاکر اپنے ایمان و دین کی محکمی سے کہتے ہیں کہ دین اسلام کی تعلیم میں والدین کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے تعظیم کروانے کی کوئی اصل نہیں، اور کوئی بریلوی مائی کا لعل اس کا ثبوت قرآن وسنت سے قطعاً نہیں دے سکتا۔

جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا تو اب معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعت حقہ کے اصول و ضوابط کے تحت بھی یہی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ اپنی بیٹی کی تعظیم کے لیئے قطعاً کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ قیام کا مقصد ان کو بٹھانا ہوتا تھا۔

اگر بریلوی مکتب فکر کے مولوی اس حقیقت سے انکار کریں توان سے کہیے کہ آپ اس سنت پر عمل کیوں نہیں کرتے کہ جب بیٹی گھر آئے تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں۔

حدیث سے ثابت ہے ،چھوٹے پر رحم اور تکریم بڑے کی جائے ،حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یوقر کبیرنا ، الحدیث .

ہماری (امت سے) نہیں ہے جو (شخص) چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی عزت نہیں کرتا ،مسند احمد ص ۲۵۷ ج ۱، وترمذی باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان ،مگر مبتدعین کا باوا آدم ہی نرالا ہے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے خلاف چلنا ہے ،پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے ۔یہ الگ بات ہے

یہ سب سنت سے انحراف کی پھٹکار اور بدعت سے لگاؤ کا نتیجہ ہے ،اللہ معاف کرے۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

مشکوۃ کتاب الایمان فصل ثالث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک خوشخبری سنائی ۔

فقمت اليه و قلت بابی وامی انت احق بها .

تو میں کھڑا ہوگیا اور میں نے کہا کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں آپ اسی کے لائق ہیں ، جاء الباطل ص ۲۵۱ ج ۱ ۔

الجواب

مذکورہ روایت کا ماحاصل یہ ہے کہ ایک مجلس میں صحابہ کرام میں اس بات کا تذکرہ چل پڑا کہ نجات کس چیز میں ہے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ افسوس کہ رسول اللہ ﷺ وفات پاگئے ہیں اور ہم نے اس کے متعلق دریافت ہی نہیں کیا،تب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں نے اس بات کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تب میں اٹھ کر ان کی طرف کھڑا ہوا ، الحدیث ، مشکوۃ کتاب ایمان ومسند احمد ص ۶ ج ۱ ۔

اور یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے، آج بھی اگر مجلس میں کوئی بات کرے تو بعض لوگ اٹھ کر اس کی طرف چلے جاتے ہیں، اور کوئی اناڑی سے اناڑی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ اس کی تعظیم کے لیئے کھڑا ہوا ہے بلکہ ہر صاحب دماغ یہی کہے گا کہ اسکے اٹھنے کا مقصود اس کی طرف متوجہ ہونا ہے ، چنانچہ اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے ملاعلی القاری حنفی فرماتے ہیں ۔

(فقمت) ای من كمال الفرح متوجها (اليه) و متمثلابين يديه .

(میں کھڑا ہوا) یعنی کمال خوشی سے ان کی طرف متوجہ ہوا (طرف ان کی) اور سیدھا کھڑا ہو گیا ان کے آگے ۔ مرقاۃ ص ۱۱۵ ج ۱ ۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی مرحوم معنی کرتے ہیں ۔

پس ایستادم بسوے ابوبکر رضی اللہ عنہ و رفتم بجانب او اشعۃ اللمعات ص ۷۳ ج ۱ ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھ کر متوجہ ہوئے ۔(تعظیماً قطعاً قیام نہ کیا تھا)۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

کوئی کافر اگر اپنی قوم کا پیشوا ہو ۔ اور اس کے اسلام لانے کی امید ہو تو اس کے آنے پر اس کی تعظیم کے لیئے کھڑا ہونا سنت ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو حضور علیہ السلام نے کھڑے ہو کر ان کو سینے سے لگایا ۔ کتب تواریخ ۔ جاء الباطل ص ۲۵۲۔

الجواب

اگر کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعظیم کے لیئے کھڑے ہوئے تھے تو ہم اسے قبول کرنے کے لیئے تیار ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ روایت اصول حدیث کی رو سے صحیح و صریح ہو کوئی ایچ پیچ نہ ہو غرض کہ مبتدعین کے ہاتھ کی صفائی نہ ہو۔اب ہم عرض کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پاس اسلام قبول کرنے کے لئے گئے تو آپ علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے ۔ چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین مولوی غلام رسول سعیدی صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ فرماتے ہیں ۔

میں نے (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) دروازہ کھٹکھٹایا ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دروازہ کھول دو ۔اگر اللہ تعالی نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اس کو ہدایت عطا فرمائے گا ۔پھر دروازہ کھولا اور دو شخص مجھے بازو سے پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو ۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اسلام قبول کرلو میں نے کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک لرسول اللہ ۔

شرح صحیح مسلم ص ۹۱۵ جلد ششم بحوالہ اسد الغابہ ص ۵۸ ج ۴)

اس کا واضح مفاد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام اپنی اسی حالت (بیٹھنے) میں ہی رہے تب ہی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے تھے جو مفتی صاحب کے موقف کے صریحا

خلاف ہے۔

کیا کھڑے ہو کر کھانا مکروہ ہے

مفتی صاحب فرماتے ہیں چند جگہ قیام مکروہ ہے اولاً آب زمزم اور وضو کے سوا اور پانی کو پیتے وقت کھڑا ہونا بلا عذر مکروہ ہے۔ جاء الباطل ص۲۵۲۔

الجواب

اولاً: صحیح سند سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

کنا نا کل علی عهد رسول الله ﷺ و نحن نمشی و نشرب و نحن قیام.

یعنی ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں چلتے پھرتے کھاتے تھے اور کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔

ترمذی مع تحفۃ ص ۱۱۱ ج ۳، و ابن ماجہ ص ۲۳۷، وسنن دارمی ص ۱۶۲ ج ۲، ومسند امام احمد ص ۱۲ و ۲۴ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر کھانے پینے کا جواز موجود ہے گو ممانعت کی روایات بھی موجود ہیں مگر وہ کراہت تنزیہ پر محمول ہیں اور مذکورہ روایت بیان جواز مع الکراہت کے لئے ہے یہی بریلوی مکتب فکر کا موقف ہے چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں۔

ان تمام احادیث آثار اور اقوال علماء کا بغور مطالعہ کرنے سے بات معلوم ہوتی ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا پینا کراہت کے ساتھ جائز ہے اور مستحب یہی ہے کہ بیٹھ کر کھانا پینا چاہیے۔ کیونکہ کسی حدیث میں بھی نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر کھانے پینے کا حکم نہیں دیا۔ شرح صحیح مسلم ص ۲۷۹ ج ۶۔

لیکن کمال ہے کہ مفتی صاحب اسے مکروہ (حرام) کہہ رہے ہیں، گویا کہ اس بارہ میں ان کے اپنے گھر میں یہ تضاد موجود ہے۔

خلاصہ کلام

حضرت مفتی صاحب نے قیام تعظیمی میں کل آٹھ دلائل پیش کیے ہیں، مگر ان میں سے ایک میں بھی قیام تعظیمی کا ثبوت نہیں، کیونکہ تمام کی تمام روایات کا زیر بحث موضوع سے دور کا بھی

واسطہ نہیں اور ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام کو چیلنج ہے کہ کوئی ایسی حدیث صحیح صریح پیش کرو جس میں یہ ہو کہ امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذکر کے وقت قیام کرنا سنت یا مستحسن ہے۔

یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذکر مصطفیٰ کے وقت قیام کرتے تھے، یا خیر القرون میں اس پر عمل تھا، یا آئمہ اربعہ میں کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا ارشاد فرمایا ہو۔ یقین جانئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے اس جگہ پر مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ

رب تعالیٰ فرماتا ہے ۔اے مسلمانوں ہمارے نبی کی مدد کرو اور انکی تعظیم کرو، تعظیم میں کوئی پابندی نہیں بلکہ جس زمانہ میں اور جس جگہ جو طریقہ تعظیم کا ہو اس طرح کرو بشرطیکہ شریعت نے اس کو حرام نہ کیا جیسے کہ تعظیمی سجدہ ورکوع ۔ جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۱۔

مفتی صاحب جیسے رب تعالیٰ نے تعظیم کا حکم دیا ہے اسی طرح اس نے اپنے نبی کی زبانی اس کی تشریح و توضیح بھی کردی ہے ۔ اس بات کو آپ نے خود تسلیم کرلیا ہے کیونکہ آپ نے بھی تعظیمی سجدہ ورکوع کو حرام کہا ہے اسی طرح ہم کہتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے تعظیمی سجدہ کو ناجائز و حرام کہا ہے اسی طرح اپنے لئے قیام تعظیمی کو بھی منع فرمایا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث اس کا واضح اور کھلا ثبوت ہے ۔ لہذا ثابت ہوا کہ ذکر ولادت کے وقت قیام فرمان رسول ﷺ کی مخالفت اور بدعت قبیحہ ہے ۔

تعظیم رسول ﷺ کا مفہوم

مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت سورۃ الفتح (۹) کی ہے جس میں لفظ ۔تو قروہ ۔ استعمال ہوا ہے اور وقار کا معنیٰ سنجیدگی اور عظمت آتا ہے (المنجد ص ۱۱۴۰)

امام راغب نے اس کا معنیٰ سنجیدگی اور حلم کیا ہے، المفردات ص ۵۲۹، علامہ ابن منظور بھی اس کا معنیٰ ، الحلم والرزانۃ لکھتے ہیں، لسان العرب ص ۲۹۰ ج ۵۔

اور ۔ وقر، کے معنیٰ کسی صاحب مرتبہ کے مرتبہ کو ملحوظ رکھنا اور اس کے منافی کوئی بات نہ کرنا کے لئے آتا ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دھلوی نے اس آیت کا معنیٰ ہی اس طرح کیا ہے

مضبوطی و قوت دو اس کے دین کو اور عزت اور بزرگی اس کے حکم کو۔ موضح القرآن ص ۵۳۲۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تعظیم رسول اللہ ﷺ کا یہ معنی نہیں کہ انسان صرف زبان سے محبت کا دم بھرے اور عملی طور پر آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو بالائے طاق رکھ دے، بلکہ تعظیم یہ ہے کہ انسان آپؐ کے اقوال و افعال کا اتباع کرے لہذا تعظیم یہ تھی ہے کہ قیام نہ کیا جائے کیونکہ آپؐ اس کو مکروہ جانتے تھے۔

باب۔مسئلہ ایصال ثواب

کن چیزوں کا میت کو ثواب پہنچتا ہے

اللہ تعالی فرماتا ہے کہ۔

(۱)الا تزر وازرۃ وزر اخری☆ وان لیس للانسان الا ماسعی☆ وان سعیه سوف یری☆ ثم یجزٰہ الجزآء الاوفی (النجم آیت ۳۸ تا ۴۱)

ترجمہ۔یعنی کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔ (۵۳۔۳۸ تا ۴۱)

(۲) من عمل صالحاً فلنفسه ومن اسآء فعلیها ثم الیٰ ربکم ترجعون. (الجاثیة آیت ۱۵).

ترجمہ۔جو کوئی نیک عمل کرے گا تو اپنے لئے اور جو برے کام کرے گا تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔(۴۵۔۱۵)۔

واضح رہے کہ پہلی آیت میں اللہ تبارک وتعالی نے یہ اصول بتایا ہے کہ انسان کو وہ ملے گا جس کی اس نے سعی وکوشش کی۔اور دوسری آیت میں یہ قانون اور دستور بتایا کہ جس نے نیکی کی اسے اس کا بدلہ ملے گا اور اس کی نیکی اس کے نفس کے لئے ہی ہے۔

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل۔

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۵ (۲) سورۃ الاعراف آیت ۸

(۳) سورۃ القارعۃ آیت ۸تا ۹ (۴) سورۃ القصص آیت۸۴

(۵) سورۃ الروم آیت۴۴ و ۴۵ (۶) سورۃ الاحزاب آیت ۲۴

(۷) سورۃ سبا آیت۴ (۸) سورۃ المومن آیت ۱۷

(۹) سورۃ البینہ آیت ۷و ۸ (۱۰) سورۃ البقرہ آیت۲۸۶

(۱۱) سورۃ النمل آیت۸۹، ۹۰ (۱۲) سورۃ القصص آیت ۶۷

(۱۳) سورۃ العنکبوت آیت ۷ (۱۴) سورۃ العنکبوت آیت ۵۸

(۱۵) سورۃ الروم آیت ۱۵ (۱۶) سورۃ لقمن آیت ۸و ۹

(۱۷) سورۃ الفتح آیت۲۹ (۱۸) سورۃ النساء آیت ۱۲۱و۱۲۲

(۱۹) سورۃ السجدہ آیت ۱۹ (۲۰) سورۃ فاطر آیت ۷

(۲۱) سورۃ حم السجدہ آیت ۸ (۲۲) سورۃ الشوریٰ آیت۲۲و۲۳

(۲۳) سورۃ الجاثیہ آیت۳۰ (۲۴) سورۃ محمد آیت۲ و۱۲

(۲۵) سورۃ التغابن آیت ۹ (۲۶) سورۃ الطلاق آیت ۱۱

(۲۷) سورۃ البروج آیت ۱۰ (۲۸) سورۃ البقرہ آیت ۶۲

(۲۹) سورۃ النساء آیت۱۲۲ (۳۰) سورۃ المائدہ آیت ۹

(۳۱) سورۃ یونس آیت ۹ (۳۲) سورۃ الرعد آیت ۲۹

(۳۳) سورۃ النحل آیت ۹۷ (۳۴) سورۃ الکہف آیت ۱۰۷

(۳۵) سورۃ مریم آیت ۶۰ (۳۶) سورۃ طہٰ آیت۷۵ و ۷۶

(۳۷) سورۃ الانبیاء آیت ۹۴ (۳۸) سورۃ الحج آیت ۱۴

(۳۹) سورۃ الفرقان آیت ۷۰ (۴۰) سورۃ یونس آیت ۲۶

(۴۱) سورۃ ابراھیم آیت ۲۷ (۴۲) سورۃ العصر آیت ۳

یہ آیات فرقانیہ

ہم نے سرسری طور پر نشان دہی کی ہے ۔ ان کو مکرر قران پاک سے نکال کر ایک نظر دیکھ لیا جائے ۔تو آپ حضرات کے لئے بہتر اور مفید ہوگا۔ جہاں مسئلہ کی سمجھ آئے گی وہاں آپ کو تلاوت قرآن کا اجر بھی ضرور ملے گا ان شاء اللہ ۔

حضرات محترم ان آیات میں اللہ رب العزت نے یہ مسئلہ کھل کر بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ عمل صالح کریں گے انہیں بہشت عطاء کروں گا ۔انہیں اعلی وارفع مقام پر فائز کروں گا اور انکا اخروی ٹھکانا بہتر ہوگا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ۔لیکن قرآن کی کسی آیت میں یہ اصول و دستور نہیں بتایا گیا کہ جس عمل میں انسان کا عمل و دخل نہ ہو ۔اس کا اجر وثواب بھی انسان کو مل جاتا ہے جیسا کہ ہم ابتدا میں الفاظ قرآن کریم نقل کر چکے ہیں کہ انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نے سعی وکوشش کی تھی ۔

انسان کی اولاد میں بھی چونکہ والدین کی سعی وکوشش کا دخل ہوتا ۔اور اولاد کی دینی تربیت کا سہرا والدین پر ہوتا ہے لہذا اولاد والدین کی طرف سے صرف وخیرات وغیرہ کرے تو یہ درست اور حق ہے اور اس پر قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں ۔لیکن کوئی ایسی ذات جس کا انسان سے باپ یا ماں کا رشتہ نہیں اسے ایصال ثواب کرنے کی شرعی طور پر کوئی دلیل موجود نہیں ۔ہم پوری ذمہ داری سے ساری دنیا کے مبتدعین کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ وہ قرآن کی کسی آیت یا حدیث صحیح سے والدین کے علاوہ ایصال ثواب ثابت نہیں کر سکتے ۔

اولاد میں والدین کی سعی شامل ہے

حضرت ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

ان من اطیب ما اکل الرجل من کسبه وولده من کسبه .

بہت پاکیزہ خوراک آدمی کی وہ ہے جو اس کے کسب سے ہو اور اس کی اولاد بھی اس کے کسب سے ہے۔

ابوداؤد مع عون ص ۳۱۲ ج ۳، (۳۵۲۲) ونسائی ص ۲۰۳ ج ۲، وترمذی مع تحفہ ص ۲۸۷ ج ۲، و دارمی (۲۵۳۷) ومسند احمد ص ۳۱، ۴۲، ۹۳، ۲۲۰، ج ۶، و بیہقی ۴۸۰ ج ۷، و ابن ماجہ (۲۱۳۷) و عبدالرزاق (۱۶۶۴۳) وغیرہ۔

یہ حدیث اس بات کی گواہ ہے کہ انسان کی سعی وکوشش میں اس کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ آیات قرآنیہ میں جو انسان کواس کی کوشش وکاوش کا ہی بدلہ ملنے کا ذکر ہوا ہے اس میں اولاد خود بخود داخل ہے۔ جس سے نیابت کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے لیکن شریعت اسلامیہ میں نیابت فقط حج اور روزہ میں ثابت ہے۔ جس کی ضروری تفصیل آگے اپنے مقام پر آرہی ہے۔

ایصال ثواب کا مشروع طریقہ

قرآن وسنت میں جس قدر اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

دعا

کے بارے سب کا اتفاق ہے کہ اگر میت مشرک وکافر نہ ہوتو اس کے حق میں مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرنا مسنون ہے اور مومن کے لئے مفید ہے، اور بعدوالوں کا اسلاف کے لئے دعا کرنا حکم شرعی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

والذین جآءو من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنا انک رءوف رحیم.(الحشر آیت ۱۰).

ترجمہ۔ اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے (۵۹۔۱۰)۔

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ خود صاحب قرآن کی عملی زندگی ہمارے سامنے حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے کہ آپ علیہ السلام فوت شدگان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے

تھے، الغرض فوت شدگان کے لئے دعا کرنی مسنون ومشروع فعل ہے اور ہر اذان کے بعد امت مرحومہ رسول اللہ ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ سے، وسیلہ، فضیلت اور مقام محمود کی دعا کرتی ہے الغرض زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے بہترین تحفہ دعا ہے۔

لیکن بعض حضرات دعا کو ایصال ثواب کے زمرہ میں لاتے ہیں، جو درست نہیں کیونکہ دعا اور ایصال ثواب میں ایک جوہری فرق ہے۔ دعا شفاعت کی قسم سے ہے اور ایصال ثواب اہدا کے ضمن سے ہے علاوہ ازیں دعا زندوں و مردوں کے لئے کی جاسکتی ہے جبکہ ایصال ثواب فقط مردوں کے ساتھ خاص ہے۔

صدقہ جاریہ

سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثة الامن صدقة جاريةاوعلم ينتفع به او ولد صالح يد عوله .

یعنی جب انسان وفات پاجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع (ختم) ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں باقی رہتی ہیں، صدقہ جاریہ، یا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔

صحیح مسلم ص ۴۱ ج ۲، و ابوداؤد ص ۴۲ ج ۲، و ترمذی مع تحفہ ص ۲۹۸ ج ۲، و نسائی ص ۱۲۳ ج ۲، و مسند احمد ص ۳۷۲ ج ۲، و بیہقی ص ۲۷۸ ج ۶۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے تین چیزوں میں حصر فرما دیا ہے کہ ان چیزوں کا میت کو ثواب پہنچتا ہے۔ گو اس سلسلہ میں مزید بھی احادیث صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں جس میں صدقہ جاریہ کے ضمن میں آنے والی چیزوں کی تعداد تقریباً دس تک پہنچتی ہے (۱) علم سکھلانا (۲) نیک بچے کی دعا (۳) قرآن مجید چھوڑنا (۴) مسجد بنوانا (۵) سرائے تعمیر کرانا (۶) نہر جاری کرانا (۷) کوئی صدقہ جو زندگی میں بحالت صحت کیا ہو (۸) مردہ سنت کو جاری کرنا (۹) جہاد میں مرنا (۱۰) درخت لگانا یا کھیتی بونا۔ دیکھئے، ابن ماجہ (۲۴۱) و ابن حبان (۹۳) و ابن ماجہ (۲۴۲) و ابن

خزیمہ (۲۴۹۰) وادب المفرد ص ۲۰، ۲۱۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو حقیقت ان تین اقسام کے درمیان ہی گھومتی ہے فرق صرف تفصیل اور اجمال کا ہے۔ الغرض مذکورہ تمام صورتیں صدقہ جاریہ میں شامل ہیں صرف دعا صدقہ جاریہ کے بجائے شفاعت کی قسم میں داخل ہے۔ حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوریؒ (شارع سنن ترمذی) فرماتے ہیں۔

عبادات مالیہ کا بھی ثواب میت کو پہنچنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور تمام علمائے اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے کہ عبادات مالیہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔

بخاری ص ۱۸۶ ج ۱، ومسلم ص ۱۴۱ ج ۲، میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میری ماں یکا یک مرگئی اور میرا گمان ہے کہ اگر وہ بات کرتی یعنی بات کرنے کا اس کو موقع ملتا تو وہ صدقہ کرتی۔ سو اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب اس کو پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں

بخاری ص ۳۸۶ ج ۱۔ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میری ماں وفات پا گئی ہے اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اس کو نفع پہنچے گا؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا میرے پاس ایک باغ ہے آپ کو گواہ رکھتا ہوں کہ میں نے اس باغ کو اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔

مسند احمد اور نسائی میں سعد بن عبادہ سے روایت ہے کہ ان کی ماں مرگئی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟

آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے کہا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا پانی پلانا۔ ابوداؤد ص ۲۳۶ ج ۱، کی روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا پانی۔ پس انہوں نے ایک کنواں کھودوایا اور کہا کہ یہ کنواں ام سعد کے واسطے ہے، یعنی اس کا ثواب سعد کی ماں کو پہنچے۔

ان احادیث صحیحہ صریحہ سے عبادات مالیہ کا ثواب میت کو پہنچنا صاف طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کتاب الجنائز ص ۹۵۔

نیابت

ایصال ثواب کی تیسری صورت نیابت ہے یعنی میت کی طرف سے کوئی شخص نائب و قائم مقام ہوکر کام کرے اس سلسلہ میں حسب ذیل امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

(۱) نائب کے اندر نیابت کی اہلیت موجود ہو، احادیث نیابت میں یا تو بچے کا ذکر ہے یا ولی کا یا قریبی کا، اجنبی کے بارے میں کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔

(۲) نیابت صرف مسلمان کی طرف سے کی جاسکتی ہے۔

(۳) عبادات شرعیہ میں کوئی شخص دوسرے کا قائم مقام نہیں ہوسکتا جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے ارشاد ربانی ہے کہ۔ کوئی شخص دوسرے انسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

نیز۔ نیابت کا یہ عمل عقل و حکمت کے بھی خلاف ہے کیونکہ بندگی کی روح تقوی اور اخلاص ہے، عجز و انکساری خشوع و خضوع حضور قلب اور انابت الی اللہ یہ سب صفات عامل کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ یہ دل کے اعمال ہیں جو صاحب دل ہی کے ساتھ متصف ہوسکتے ہیں اس لئے نائب کسی طرح بھی وہ قلبی کیفیات اپنے اندر نیابت کے وقت پیدا نہیں کرسکتا جو منوب عنہ کے ساتھ مخصوص ہیں یہ ممکن ہے کہ مالی عبادات میں کوئی دوسرے کی طرف سے زکوۃ اور قرض ادا کر کے منوب کو سبکدوش کردے لیکن دیگر عبادات میں تو اس قسم کی نیابت ممکن ہی نہیں کیونکہ اعمال کی قبولیت کے لئے اوصاف کی ضرورت ہے نائب ان میں نیابت کر ہی نہیں سکتا، اگر نیابت عبادات بدنیہ میں جائز ہوتی تو اعمال قلبیہ میں بھی درست ہونی چاہیئے جیسے ایمان، صبر، شکر، توکل، خوف، رجاء، وغیرہ اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح دراز ہوا تو سارا دین ہی نیابت پر چل سکتا ہے، پھر نہ فرد کے ایمان کی اہمیت نہ اعمال کے لئے ریاضت کی حاجت نہ صبر و استقامت کی ضرورت، بس سارے امور دین نیابت اور وکالت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ذریعے سے طے پاتے رہیں گے، اسی طرح نہ اصل قاتل سے قصاص کی ضرورت نہ اصل مجرمین پر حدود کے اجرا کی کوئی دلیل رہے گی، بس نائبین ہی کافی رہیں گے۔



نیابت کا مشروع طریقہ

نیابت کے بارے میں صحیح ومسند احادیث کے مجموعہ سے حج اور روزہ میں نیابت جائز وثابت ہے دیگر امور میں نہیں۔

صحیح بخاری ص ۲۵۰ ج ۱، میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو جھینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی اور حج کئے بغیر مرگئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا بتاؤ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتی؟ اللہ کا حق ادا کرو، اللہ اپنے حق کے وفا کا زیادہ مستحق ہے۔ مسلم ص ۳۶۲ ج ۱، ومسند احمد ص ۲۲۷، ۲۵۸، وبیہقی ص ۲۵۵ ج ۴، ودار قطنی ص ۳۶۲ ج ۲، کی روایت میں ایک ماہ روزے کا بھی ذکر ہے، واضح رہے کہ زندہ کی طرف سے نیابت کے لئے اس کے عجز اور استطاعت کی شرط بھی ضروری ہے یعنی آدمی زندہ ہو لیکن اتنا مجبور ومعذور ہو کہ اپنا فرض خود پورا نہ کر سکتا ہو تو اپنی زندگی ہی میں کسی کو نائب بنا کر فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو سکتا ہے جیسا کہ بخاری ص ۲۵۰ ج ۱ میں ہے کہ ایک عورت نے کہا میرے باپ پر حج فرض ہے، لیکن وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتے، کیا میں اپنے والد کی طرف سے حج کروں؟

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں۔

اس صورت کو حج بدل کہا جاتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ حج بدل کرنے والا شخص اپنا حج کر چکا ہو جیسا کہ ابوداؤد ص ۲۵۲ ج ۱، میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص سے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ لبیک عن شبرمة۔ شبرمہ کی طرف سے میں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا میرا بھائی میرا قریبی ہے آپ نے پوچھا تو نے اپنا حج ادا کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اپنا حج ادا کرو پھر شبرمہ کی طرف سے کرنا۔

اگر اولاد والدین کی وصیت یا بغیر وصیت کے حج کرے تو جائز ہے، اسی طرح والدہ یا والد نے صدقہ دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور فوت ہوگئے ہیں تو اولاد کو ان کی طرف سے صدقہ دینا چاہیئے البتہ حج بچے کے سوا دوسرے بھی اس کی طرف سے کر سکتے ہیں۔

روزہ میں نیابت کی دلیل

حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت جائز ہے البتہ اس میں ضروری ہے کہ منوب عنہ کی وفات ہو چکی ہو، زندہ شخص کی طرف سے روزہ رکھنے کی اجازت ثابت نہیں۔

بخاری ص ۲۶۲ ج۱، میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں مرگئی ہے اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہیں! کیا میں اپنی ماں کی طرف سے سب قضا روزے ادا کردوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو مرجائے اور اس پر روزے ہوں اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ صحیح بخاری شریف ص ۲۶۲ ج ۱۔

حافظ ابن حجرؒ، فتح الباری ص ۱۵۶ ج ۴، میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ بعض اہل ظاہر قضا روزوں کے وجوب کے قائل ہیں اہل حدیث کا مسلک بھی یہی ہے کہ میت کی طرف سے روزے رکھے جاسکتے ہیں، باب من مات وعلیہ صوم۔

نیابت اور اہدا کا فرق

بعض حضرات ایصال ثواب کے ثبوت میں حج بدل نیز روزہ اور صدقہ والی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جبکہ نیابت اور اہدا میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نیابت میں عامل اپنے آپ کو دوسرے شخص کے قائم مقام قرار دیتا ہے مثلاً حج جس میں یوں کہتا ہے۔

لبیک عن فلان۔ اے اللہ میں فلاں شخص کی طرف سے حاضر ہوں اور اہداء ثواب کی صورت یہ ہے کہ حج اپنی طرف سے کرے اور بعد میں کہے یا اللہ میرے اس حج کا ثواب فلاں شخص کو دے، پہلی شکل تو ثابت اور منصوص ہے اور دوسری شکل بقول مولانا اسماعیل شہیدؒ بدعت حقیقیہ ہے۔

چنانچہ۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح، میں لکھتے ہیں کہ۔

زندوں کا مردوں کو عبادت کا ثواب بخشنا بدعت حقیقیہ ہے، بخلاف مالی عبادات میں نیابت کے کہ وہ اصل میں صحیح ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی عبادات میں حج اور صدقہ کے سوا ایصال ثواب کے قائل

نہیں

علماء حنابلہ بھی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا قول نقل کرتے ہیں۔

وقال شیخنا لم یکن من عادہ السلف اهداء ذلک الی موتی المسلمین بل کانوا یدعون لهم فلا ینبغی الخروج عنهم .

یعنی مردوں کو ثواب بخشنا اہل سلف کا دستور نہ تھا، وہ صرف ان کے لئے دعا کرتے تھے لہذا ان کے طریقہ سے نکلنا جائز نہیں۔

نیز موافقات میں علامہ ابو اسحاق کا یہ قول کتنا جامع ہے کہ اہداء ثواب کے منع کی دو وجہیں ہیں، اول شریعت میں مال کے ہبہ کا ثبوت ہے، ثواب کے ہبہ کا نہیں، جب اہداء ثواب کی کوئی دلیل ہی نہیں تو اس کا قائل ہونا بھی غلط ہے، دوم ثواب اور عقاب شارع علیہ السلام کے مقرر کردہ ہیں نیز جزا عمل کے تابع ہے جیسا عمل ویسی جزا، جزاء بما کانوا یعملون (سورہ السجدہ آیت ۱۷)، بدلہ ہے اس کا جو وہ عمل کرتے تھے، اس میں عامل کو کوئی اختیار نہیں۔

سوم، ثواب اللہ کا فضل و انعام ہے عامل کو اس میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں، لہذا اپنے عمل کے ثواب کو کسی دوسرے کے لئے ہدیہ اور ہبہ کرنے کا عامل کو حق نہیں۔

شبہات اور ان کا ازالہ

(۱) کسی بھائی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ثواب کی طرح مال بھی اللہ کا فضل ہے اور جب مال کا ہبہ کرنا جائز ہے تو ثواب کا ہبہ کرنا بھی جائز ہونا چاہیئے لیکن یہ شبہ حقیقت کے خلاف ہے اس لئے کہ مال تو ایک محسوس و مقبوض اور قابل انتقال چیز ہے ایک کے قبضہ سے لیکر دوسرے کے قبضہ میں دی جاسکتی ہے، لیکن ثواب تو غیر محسوس اور مرئی شے ہے اور قلب کی اس کیفیت کے تابع ہے جو عامل کو کرنے سے حاصل ہوتی ہے، لہذا اس کا انتقال ممنوع و محال ہے اس لئے ثواب کو مال پر قیاس کرنا ہی قیاس مع الفارق ہے، یہ صحیح ہے کہ جزا عمل کے تابع ہے لیکن عامل کو جزاء سے انتفاع اور استمتاع کا حق ہے نہ کہ انتقال و ہبہ واہداء کا، اس فرق کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے تاکہ خلط مبحث نہ ہو۔

(۲) اسی طرح یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کی طرف سے قربانی کی اور اس کا ثواب امت مرحومہ کو پہنچایا، تو یہ قیاس بھی بے محل اور غلط ہے اس لئے کہ اول تو قربانی ایک مالی صدقہ ہے جس میں نیابت جائز ہے اور آنحضرت ﷺ کی حیثیت امت کے لئے ایسی ہے جیسے گھر والوں کے لئے قیم اور ولی کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک مرد اپنے پورے گھر والوں کی طرف سے قربانی کرسکتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی اور اپنی آل اور اپنی امت کی طرف سے قربانی فرمائی اس کا حق سب سے زیادہ آپ علیہ السلام ہی کو پہنچتا تھا۔ آپ علیہ السلام سب سے اولی ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے۔

النبی اولی بالمومنین من انفسھم (الاحزاب ٦)

نبی ﷺ مومنین کے ساتھ ان کی جانوں سے بھی زیادہ اولی ہیں۔

الغرض اس حدیث سے اھداء ثواب پر استدلال غلط اور بے محل ہے کیونکہ اس سے نیابت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اھداء، نیابت اور اھداء دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

(۳) تیسرا شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نے ابلّہ شہر والوں کو کہا، کون شخص اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ میرے لئے مسجد عشار میں دو یا چار رکعت پڑھے اور کہے کہ یہ ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کے لئے ہے۔

اس قصہ سے ایصال ثواب کا ثبوت پیش کرنا کئی وجہ سے غلط ہے اول تو یہ روایت ہی نہایت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے اس کی سند میں ایک راوی، ابراھیم بن صالح بن درھم ہے۔

سنن ابی داود مع عون المعبود ص ۱۹۰ ج ۴۔

اور یہ راوی ضعیف ہے۔

امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی متابع موجود نہیں، عقیلی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں مشہور نہیں اور اس کی (مذکورہ) روایت غیر محفوظ ہے، دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، تھذیب التھذیب ص ۱۱۱ ج ۱، ومیزان ص ۳۷ ج ۱، وخلاصہ ص ۴٦ ج ۱، حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے' فیہ ضعف، یعنی اس راوی میں ضعف پایا جاتا ہے، تقریب ص ۱۳،

(۴) چوتھا شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بخاری میں ہے کہ ایک مرد نے کہا میری ماں مرگئی ہے

اگر صدقہ کروں تو اس کے لئے مفید ہوگا ؟ فرمایا ہاں! پھر اس نے ایک باغ صدقہ کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ناگہاں مرگئی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو صدقہ کرتی، کیا اس کی طرف سے کفایت کرے گا، فرمایا، ہاں، پہلی روایت میں یہ بھی ہے کہ اگر وہ کلام کرتی تو صدقہ کرتی۔ صحیح بخاری شریف ص ۱۸۶ ج ۱، وص ۳۸۶ ج ۱۔

یہ تمام احادیث اور اسی قسم کی جملہ احادیث صحیحہ اولاد کے بارے میں ہیں اور ان سب میں نیابت کی صورت متحقق ہے، یہ دونوں عورتیں صدقہ کا پختہ ارادہ کر چکی تھیں اگر ان کو فرصت ملتی تو صدقہ ضرور کرتیں۔ لہذا ان کی اس نیت کو ان کی اولاد نے نائب بن کر پورا کیا، ایسی نیابت جائز اور ثابت ہے لیکن اس حدیث سے اھداء ثواب کا کچھ تعلق نہیں۔

ازافادات شیخ العرب والعجم حضرت حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ تعالی۔

فرقہ بریلویہ کے لئے لمحہ فکریہ
اور ان کے اکابرین کو کھلا چیلنج

اس ساری تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بدنی عبادت کا ثواب پہنچانا کسی بھی حدیث صحیح سے ثابت نہیں اور یہ کہ مالی عبادت میں نیابت سے میت کو ثواب پہنچتا ہے۔

اس لئے ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ کوئی ایسی حدیث صحیح مرفوع ثابت کرو جس میں غیر اولاد کی طرف سے مالی عبادت کا ثواب پہنچانا ثابت ہو، اگر آپ حضرات ایسی کوئی حدیث صحیح مرفوع ثابت کردیں تو ہم اپنے موقف کو غلط تسلیم کرنے کے علاوہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے آپ کی قرآن دانی اور حدیث فہمی کے قائل ہو جائیں گے۔

مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت مل کر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود ایسی کوئی حدیث صحیح مرفوع ثابت نہیں کرسکتے۔

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا

قارئین کرام اگر یہ حضرات اپنے موقف پہ کوئی حدیث پیش نہ کرسکے اور یقیناً پیش نہیں کرسکیں گے، تو اسی ایک بات سے ہی ان کے گیارہویں کے دلائل اور قبروں پر نذر و نیاز کی حقیقت بھی کھل

جائے گی کہ یہ سب بے بنیاد اور بدعات قبیحہ اور اپنی طرف سے شریعت حقہ میں لاحقہ و اضافہ ہے۔

قرأة قرآن

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ بدنی عبادت کا ایصال ثواب کرنا کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں اور قرأۃ قرآن بھی بدنی عبادت ہے۔

ہم پورے جزم و یقین کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ میت کے لئے قرأۃ قرآن کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں، قرآن پاک کی کسی آیت سے یا حدیث نبوی سے میت کے لئے قرآن پڑھنے کی صراحت نہیں، نہ ہی کسی صحابی رضی اللہ عنہ و تابعی سے ایسا قول و عمل منقول ہے، بلکہ خیرالقرون کے زمانہ میں سرے سے یہ رواج ہی نہ تھا اور نہ ہی سلف صالحین کی عادت تھی کہ وہ مردوں کی روح کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کرتے ہوں۔

حافظ ابن کثیرؒ، امام شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔

و من هذه الآية الكريمة استنبط الشافعي رحمه الله و من اتبعه ان القراة لايصل اهداء الثوابها الى الموتى لانه ليس من عملهم ولا كسبهم ولهذا لم يندب اليه رسول الله ﷺ امته ولا حثهم عليه ولا ارشد هم اليه بنص ولاايماء ولم ينقل ذلك عن احد من الصحابة رضى الله عنهم ولو كان خيرا لسبقونا اليه وباب القربات يقتصر فيه على النصوص ولايتصرف فيه بانواع الا قيسة والاراء ، فاما الدعاء والصدقة فذاك مجمع على و صولهما و منصوص من الشارع عليهما.

یعنی آیت (وان لیس للانسان الا ماسعی) سے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے متبعین نے استنباط کیا ہے کہ قرآن شریف پڑھنے کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا، کیونکہ یہ مردوں کا عمل و کسب نہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو اس کا حکم نہیں دیا اور اشارۃ و صراحۃ بھی اس طرف امت کی راہنمائی نہیں فرمائی نہ اس کی ترغیب انہیں دی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے یہ بات ثابت نہیں کی گئی، اگر میت کے لئے قرآن خوانی کوئی کار خیر ہوتا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے پہلے اس کی سعادت حاصل کر لئے ہوتے، اعمال خیر میں صرف نصوص پر ہی انحصار کیا جاتا ہے، رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہیں ہوتا، البتہ دعا اور صدقہ کے بارے میں اتفاق ہے

،شارع علیہ السلام کی طرف سے واضح نص موجود ہے ،کہ ان کا ثواب میت کو پہنچتا ہے ۔
تفسیر ابن کثیر ص ۲۵۸ ج ۴ ، زیر آیت و ان لیس للانسان الا ماسعیٰ)

قل دسواں چالیسواں وغیرہ کی بحث

رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارکہ ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، ہم صرف اسی کی پیروی کے مکلّف ہیں جس طرح کسی فعل کی پیروی سنت ہے اسی طرح جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا اس کا ترک کرنا بھی سنت اور اسلام کی عین تعلیم ہے ۔ اس کی پوری تفصیل ہم نے ابتدا میں بدعت کے جواز پر مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کے جواب میں عرض کردی ہے اسے وہاں سے ایک بار مکرر پڑھ لیجئے۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا ہے کہ قل وغیرہ کا جو طریقہ مبتدعین میں رائج ہے اور جس ضابطہ سے یہ لوگ ایصال ثواب کرتے ہیں یہ رسم دور نبوی میں تو کجا پورے زمانہ خیر القرون میں نہیں پائی جاتی تھی ۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی حنفی فرماتے ہیں کہ

نبی ﷺ کی عادت نہ تھی کہ میت کے لئے نماز (جنازہ) کے علاوہ وقت میں جمع ہوں ، اور قرآن خوانی کریں اور ختم پڑھیں، قبر ہو خواہ کوئی دوسری جگہ ہو اور یہ ساری چیزیں بدعت و مکروہ (حرام) ہیں۔

شرح سفر السعادت ص ۲۷۳ ترجمہ از فارسی عبارت)

ومدارج النبوت ص ۴۲۱ ج ۱،طبع نول کشور ، واشعۃ اللمعات ص ۷۴۵ ج ۱ ، واللفظ لہ)

شیخ اپنی معروف کتاب ، جامع البرکات ، میں فرماتے ہیں کہ

ششماہی یا چہل روز دریں دیار پزند و درمیان برادران بخشش کنند و آں بھاجی میگویند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نہ خورند۔

بحوالہ فتاوی رضویہ ص ۲۳۰ ج ۴،

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ تعین ایام کے ساتھ کھانا سامنے رکھ کر ختم دینا اور مرنے والے کی

روح کو ایصال ثواب کرنا ، نبی ﷺ سے ثابت نہیں تو اب سنیئے کہ جس فعل کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے نہ ہو وہ کام بدعت سیئہ اور گمراہی ہے ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ

من عملعملا لیس علیه امرنا فهورد .

یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے کرنے کا ہم نے ارشاد نہیں فرمایا تو وہ کام مرذود ہوگا۔

بخاری ص۱۰۹۲ ج ۲ ، ومسلم ص ۷۷ ج ۲ ، ومسند احمد ص ۱۴۶ ج ۶ ، ۲۵۶، ودار قطنی ص ۲۲۷ ج ۴،

بلکہ ایک روایت کے الفاظ ہیں

من صنع امرا علی غیر امرنا فهورد.

یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہماری سنت کے علاوہ ہے وہ مردود ہے ۔

ابوداؤد ص ۲۷۶ ج ۲ ، وبیھقی ص۲۵۲ ج ۱۰ ،

یہ حدیث اس بات کی برہان قاطع ہے کہ جس فعل کو کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم اور ارشاد نہیں فرمایا، یا جس عمل پر کوئی ثبوت رسول اللہ ﷺ سے نہیں وہ بدعت ومردود ہے ، ہمارا یہ دعوی ہے کہ رسم قل وغیرہ چونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں لہذا بدعت وگمراہی ہے ، اور ہماری طرف سے عام دعوت فکر ہے کہ اگر مبتدعین اس کا ثبوت کسی حدیث صحیح یا حسن سے دے دیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تعین ایام کے ساتھ کسی بھی مرنے والے کے قل وغیرہ اس کیفیت کے ساتھ کیے ہوں کہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر قرآن کریم کی تلاوت کر کے آخر میں دعا کے ذریعے اسے ایصال ثواب کیا ہو، تو ہم اسے قبول کرتے ہوئے قل وغیرہ کو قبول کرلیں گے اور جماعتی سطح پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کریں گے ۔

مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات ملکر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا ثبوت نہیں دے سکتے ۔

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا .

مرنے والے کے وارثوں سے مسنون سلوک

مسنون اور شرعی اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ مرنے والے کے گھر میں کھانا پکا کر بھیجا جائے ، چنانچہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اصنعوا لا ل جعفر طعاما فانه قد اتا هم امر يشغلهم.

یعنی (جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر پہنچی تو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جس نے ان کو مشغول کردیا ہے ۔ سنن ابوداؤد (۳۱۲۶) وترمذی معہ تحفہ ص ۱۳۴ ج ۲، و ابن ماجہ ص ۱۱۶ ، ومسند احمد ص ۲۰۵ ج ۱ ، وبیھقی ص ۶۱ ج ۴، ومستدرک حاکم ص ۳۷۲ ج ۱ ، وسنن دارقطنی ص ۷۹ ج ۲ ،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے والے کے وارثوں کے گھر کھانا بھیجنا مسنون طریقہ ہے مگر مبتدعین کا اس حدیث کے برعکس عمل ہے وہ یہ کہ جب کوئی فوت ہوجاتا ہے تو دفن کرنے کے بعد عزیز و اقارب اور دوست و احباب یہ پوچھنے لگ جاتے ہیں کہ رسم قل وغیرہ کب ہوگی؟ جس پر میت کا وارث انہیں اگلے روز یا اس کے بعد کے دن، کی تاریخ وغیرہ دے دیتا ہے، جس پر مقررہ تاریخ پر تمام رشتہ دار اور برادری وغیرہ جمع ہوجاتی ہے اور ایک دعوت کا سماں ہوتا ہے اور شادی وغیرہ جیسی دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے اور عمدہ عمدہ کھانے پکائے جاتے ہیں اور ختمی ملا جمع ہوکر پہلے موت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں پھر بعد میں کہا جاتا ہے کہ اس قدر تلاوت قرآن اور کلمہ طیبہ وغیرہ پڑھا گیا ہے جسے مولوی صاحب حسب روایت وصول کرتے ہیں اور دعا کے ذریعہ کھانا سامنے رکھ کر مردے کی روح کو بخشتے ہیں جس قدر کسی بدعتی فاضل کا علم رسمیہ زیادہ ہوگا اس قدر اس کا ختم بھی لمبا ہوتا جائے گا اور کھانے پر دعا سے قبل قرآۃ بھی لمبی و طویل ہوتی جائے گی آخر مولوی صاحب ختم شریف کو مکمل کرلیں گے تو تمام حاضرین کی فروٹ وغیرہ سے ضیافت کی جاتی ہے ۔ اور بعد میں کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے جسے تمام حاضرین تناول کرتے ہیں اور مرنے والے کا گھر اس کی وفات کے اگلے روز ہی ایک ضیافت خانہ بن جاتا ہے اور کوئی شخص کسی مجبوری سے نہ کرسکے یا کسی کا کرنے والا نہ ہو تو اس کے بارے مبتدعین میں ایک معروف مثل ہے کہ فاتحہ نہ درود مرگئے مردود ، فیروز اللغات ص ۹۲۱،

اس لعن وطعن سے بچنے کی غرض سے کئی حضرات غربت و تنگ دستی کے باوجود قرض لیکر رسم قل کرتے ہیں۔

بیان کیا مجھ سے مجی و اخی مناظر اسلام فاتح بریلویت حضرت قاضی عبد الرشید راشد حفظہ اللہ نے (آف جلھن ضلع گوجرانوالہ) کہ

میرے ہمسائے ایک نیک مخلص بزرگ رہتے تھے گھر میں افلاس اور غربت تھی اور اکثر بیمار رہا کرتے تھے اللہ تعالی نے انکو آخری عمر میں ایک بچہ اور ایک بچی عطا فرمائی تھی بیماری اور غربت کی بناء پر اگر کوئی انکو دے جاتا تو ان کے گھر کھانا پکتا تھا وگرنہ وہ بیچارے .... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ مختصر کنبہ رمضان المبارک میں شام کیوقت لال مرچ کیساتھ اکثر روزہ افطار کیا کرتا۔

آخر وقت آیا کہ وہ بزرگ فوت ہوگئے اسوقت انکا بچہ دوسری کلاس میں پڑھتا اور بچی پہلی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اور ان کی بیوہ بوڑھی جس کو اللہ تعالیٰ نے شادی کے پینتس ۳۵ سال بعد اولاد دی تھی بہت غمگین اور حزین خاطر تھی۔ کہ لوگوں کے اصرار پر اس بزرگ کا قل کا ختم دیا گیا مولوی صاحب ختم دے کر کافی فروٹ اپنے رومال میں لیکر جا رہے تھے کہ میری ملاقات ہوگئی میں سب کچھ سمجھ گیا میری مولوی صاحب کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا مولوی صاحب کیا یہ مال وہی نہیں جس کے بارے قرآن نے کہا کہ یتیموں کا مال کھا کر اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھرتے ہیں یہ بچے یتیم ہیں اور عورت بوڑھی بیوہ ہے آپ نے اس سے یہ پوچھا ہے کہ شام کیلئے آپ کے گھر آٹا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہنس کر کہنے لگے لوگ ہم کو بلاتے ہیں تو ہم آتے ہیں نہ بلائیں تو نہ آئیں میں نے کہا سچ کہا ہے کسی نے کوئی کسی کا مرے تیری عید ہوگئی مردہ جنت گیا رسید ہوگئی۔

اسی طرح ہمارے محلہ میں ایک اور غریب آدمی تھا اس کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے زکوۃ و خیرات لیکر اپنا وقت پاس کرتا تھا اس کے مکان کی چھت گر گئی کچا مکان تھا چھت گرنے سے اس کا ایک بچہ نیچے آکر فوت ہوگیا غربت کا یہ عالم تھا کہ مکان پر چھت ڈلوانا تو درکنار گھر میں کھانے کیلئے کچھ نہ تھا میں نے کچھ ساتھیوں سے مشورہ کر کے جماعتی طور پر باضابطہ چندہ اکٹھا کر کے اسکو

گندم اور نقدی وغیرہ دی مگر افسوس کہ کھانے والوں اور پیٹ کے پجاریوں نے اس کو مجبور کر کے بچے کے رسم ختم پر نقدی خرچ کرا دی...... انا للہ وانا الیہ راجعون......

قاضی عبد الرشید راشد جلھن ضلع گوجرانوالہ

۷ محرم ۱۴۲۱ھ

الغرض یہ حضرات قل وغیرہ کو نماز روزہ سے بھی زیادہ وقعت دیتے ہیں اگر اعتبار نہ ہو تو کسی بھی قل و دسواں میں شرکت کر کے دیکھ لیں کہ محفل قل میں تو تل دھڑنے کو جگہ نہ ہوگی لیکن ان کی مساجد میں نمازی حضرات کی کمی بے دینی کی حد تک ہے، راقم الحروف کو متعدد بار ایسا موقع ملا ہے کہ مبتدعین کا پیش امام اذان دیکر انتظار کرتے کرتے تھک کر آخر اعلان کرتا ہے کہ دو نمازی حضرات آجائیں تو جماعت ہی ہو جائے۔

آخر سوال یہ ہے کہ عوام کے ذہن میں یہ باتیں کس نے راسخ کی ہیں کہ نماز سے لا پرواہی اور قل کا اس قدر التزام کہ اسے اہل سنت کی علامت اور امتیازی مسئلہ بنا دیا جائے، یقیناً بریلوی مکتب فکر کے عوام کے عمل و رسوم میں ان کے قائدین کا کردار ہے جنہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔

حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے، اللہ توفیق دے، وصایا شریف ص ۸

فقہائے احناف کی صراحت

فرقہ بریلویہ خود کو حنفی المذھب کہتے ہیں بلکہ ان کا دعوی ہے کہ دنیا میں اگر کوئی مکتب فکر خالص حنفی ہے تو وہ مولوی احمد رضا خاں بریلی کی نسبت سے معروف بریلوی مکتب فکر ہے۔

جبکہ دیوبندی وغیرہ کو یہ حضرات گلابی وہابی سے تعبیر کرتے ہیں، دیکھئے جاء الباطل ص ۶ ج ۱،

الغرض یہ گروہ خود کو خالص و اصلی حنفی باور کراتے ہیں، اسی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے چند عبارات کتب فقہ حنفیہ سے نقل کی جاتی ہیں تاکہ ثابت ہو جائے کہ مبتدعین کی اس پیٹ پوجا کی تردید ان کی کتب میں پائی جاتی ہے اور شکم پروری کے اس طریقہ کی اکابر احناف نے جڑ کاٹ

کررکھ دی ہے اور ایصال ثواب کے نام سے عوام کے مال کو کھانا حرام و مکروہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ امام فخر الدین حسن بن منصور المتوفی سن ۲۹۵ھ، حنفی فرماتے ہیں کہ

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ایام المصیبۃ لانہا ایام تاسف فلا یلیق بہا ماکان للسرور.

اور مکروہ ہے مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا کیونکہ جو کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے، فتاوی قاضی خاں ص ۴۰۵ ج ۳ علی حامش عالم گیر، کتاب الحظر والا باحۃ،

علامہ محمد بن شہاب کردری الحنفی متوفی سن ۸۲۷، فرماتے ہیں کہ

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ ثلاثۃ ایام و اکلہا لا نہا مشروعۃ للسرور......

ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الا ول و الثالث و بعد الا سبوع والاعیاد و نقل الطعام الی القبر فی المواسم و اتخاذ الدعوۃ بقراۃ القرآن و جمع الصلحاء أ و لقرا للختم أو لقراۃ سورۃ الانعام او للاخلاص فالحا صل ان اتخاذ الطعام عند قراۃ القرآن لاجل الاکل یکرہ.

اور مکروہ ہے تین دن تک ضیافت اور اس کا کھانا بھی، اس لئے ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے......اور مکروہ ہے پہلے دوسرے اور تیسرے روز کھانا تیار کرنا، اور ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقع پر اور اسی طرح موسم بموسم قبروں کی طرف کھانا لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرآن کو پڑھنے کے لئے نیک لوگوں اور قاریوں کو جمع کر کے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے، یا سورۃ الانعام اور اخلاص (قل ھواللہ) کی تلاوت کے لئے کھانا تیار کرنا بھی مکروہ ہے الغرض قرآۃ قرآن کے وقت کھانا کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

فتاوی بزازیہ علی حامش فتاوی عالم گیریہ ص ۸۱ ج ۴، آخر کتاب الجنائز،

علامہ ابن ھمام الحنفی متوفی سن ۸۶۱، شرح ھدایہ میں فرماتے ہیں کہ

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اہل المیت لانہ شرع فی السرور لافی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ.

اور مکروہ ہے اہل میت کے گھر کھانا تیار کرنا، اس لئے کہ ضیافت کا کھانا تو خوشی کے موقع پر

ہوتا ہے نا کہ غمی میں ،اور یہ بدترین بدعت ہے ، فتح القدیر ص ۱۰۲ ج ۲، آخر فصل فی الدفن۔

علامہ سراج الدین اودی حنفی متوفی فرماتے ہیں کہ

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ایام فی المصیبة .

یعنی تین دن تک مصیبت والے گھر میں (جن کا فوت ہوگیا ہو) کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ۔ فتاوی سراجیہ ص ۷۵۔

علامہ قہستانی حنفی فرماتے ہیں کہ

ویکره اتخاذ الضیافة فی هذه الایام و کذا اکلها کما فی خیرة الفتاوی،

یعنی خیرۃ الفتاوی میں ہے کہ ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا اور تناول کرنا دونوں مکروہ ہیں ، جامع الرموز ص ۴۴۳ ج ۳ ، آخر الکراھیۃ ،

برصغیر کے پانچ صد علماء کے مرتب کردہ فتاوی ھندیہ میں ہے کہ

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ایام کذا فی التتار خانیه .

یعنی فتاوی تتار خانیہ میں ہے کہ میت کے گھر تین دن تک کھانا تیار کرنا مکروہ ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ ص ۱۶۷ ج ۱، باب مسائل التعزیۃ ،

علامہ شامی حنفی فرماتے ہیں کہ

و قال ایضاً ویکره اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور، وهی بدعة مستقبحة، وروی الامام احمد و ابن ماجه باسناد صحیح عن جریر بن عبدالله قال ، کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت و صنعهم الطعام من النیاحة ، و فی البزازیة ، ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث و بعد الأسبوع و نقل الطعام الی القبر فی المواسم، و اتخاذ الدعوة لقراة القرآن و جمع الصلحاء والقرأ للختم أو لقرأة سورة الانعام أو الاخلاص ، والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراة القرآن لاجل الأكل یکره ، وفیها من کتاب الا ستحسان وان اتخذ طعاما للفقراء وکان حسنا ، وأطا ل فی ذلک فی المعراج

،وقال وهذه الافعال كلها للسمعة والريا ء فيجترز عنها لانهم لا يريدون بها وجه الله تعالى ، وبحث هنا في شرح المنية بمعا رضة حديث جرير المار بحديث آخر فيه، أنه عليه السلام ذعته امرأة رجل ميت لمارجع من دفنه فجاء وجي بالطعام، اقول فيه نظر، فانه واقعة حال لاعموم لها مع احتمال سبب خاص بخلاف مافي حديث جرير،

علی أنه بحث فی المنقول فی مذهبنا و مذهب غيرنا كا الشافعية والحنابلة استدلالً بحديث جرير المذكور علی الكراهة ، ولاسيما اذا كان فی الورثة صغار أوغائب ، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلک غالبا من المنكرات الكثيرة كايقاد الشموع والقناديل التی توجد فی الافراح ، وكد ق الطبول والغنا ء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان ، و أخذ الأجرة علی الذكرو قرإة القرآن، وغير ذلک مماهو مشاهد فی هذه الأ زمان وماكان كذلک فلا شک فی حرمته و بطلان الوصية به .

یعنی علامہ ابن ہمام نے ، فتح القدیر، میں کہا ہے کہ اہل میت کی طرف سے کھانے کی ضیافت مکروہ ہے اس لئے کہ یہ تو خوشی کے موقعہ پر مشروع ہے نا کہ غمی کے موقعہ پر، امام احمداور امام ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میت کے گھر جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرنے کو نوحہ میں شمار کرتے تھے ، اور فتاوی بزازیہ میں ہے کہ پہلے اور تیسرے دن کھانا تیار کرنا مکروہ ہے اسی طرح ہفتہ کے بعد اور تہوار کے موقعہ پر قبر کی طرف کھانا لے جانا ،اور ختم کے لئے قاریوں اور نیک لوگوں کو جمع کر کے قرأۃ قرآن کے لئے دعوت کرنا ،یا سورۃ الانعام اور اخلاص کی تلاوت کے لئے ، مکروہ ہے۔

الغرض قرأۃ قرآن کے وقت کھانا کھلانا مکروہ ہے ، اور فتاوی بزازیہ کی کتاب الاستحسان میں ہے کہ اگر فقرا کے لئے کھانا تیار کرے تو اچھا ہے اور معراج الدرایہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی

ہے اور پھر کہا ہے کہ یہ تمام افعال نمود و نمائش اور ریا و بناوٹ کے لئے ہیں لہذا ان سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے ساتھ اللہ تعالی کی رضا مقصود نہیں ہے، اور شارح منیہ نے اس پر بحث کرتے ہوئے حدیث جریر پر یہ معارضہ قائم کیا ہے ایک دوسری حدیث سے کہ آپ علیہ السلام کی ایک عورت نے دعوت کی جب اس کے خاوند کو دفن کر کے آنحضرت ﷺ واپس لوٹے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ

میں کہتا ہوں کہ اس استدلال میں کلام ہے کیونکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس میں عموم نہیں بلکہ کسی خاص سبب کا احتمال ہے، بخلاف حدیث جدیر رضی اللہ عنہ میں جو ہے وہ عموم ہے۔

ہمارے مذھب اور غیر کے مذھب جیسا کہ شافعیہ اور حنبلیہ وغیرہ میں یہ بحث منقول ہے او ران کا استدلال مذکورہ حدیث جریر سے ہے کہ یہ افعال مکروہ ہیں بالخصوص جب وارثوں میں نابالغ یا غیر حاضر بھی ہوں، قطع نظر اس کے کہ ان میں بہت سی منکرات کے، جو ان مواقع پر کی جاتی ہیں جیسا کہ شمعیں اور قندیلیں جلانا، ڈھول بجانا خوش الحانی کے ساتھ (میت کی مدح میں) قصیدہ گانا عورتوں اور بے ریش لڑکوں کا جمع ہونا، ختم اور قرأۃ قرآن کی اجرت لینا وغیرہ جن کا اس زمانہ میں مشاہدہ ہو رہا ہے اور اس طرح کی چیزوں کا حرام ہونا اور ایسی وصیت کے باطل ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔

فتاوی شامی ۲۴۰ تا ص ۲۴۱ ج ۲ باب کراھیة الضیافة من اھل المیت۔

تنبیہ

علامہ شامی نے جو عبارت شارح منیہ علامہ ابراھیم حلبی حنفی متوفی سن ۹۵۶ھ، کی نقل کر کے جواب دیا ہے، ہمارے نزدیک یہ جواب ادھورا اور ناقص ہے، کیونکہ علامہ حلبی نے اس روایت کو مسند احمد اور سنن ابی داؤد سے نقل کیا ہے کہ

استقبله داعی امراته،

یعنی میت کی بیوی کا ایک قاصد رسول اللہ ﷺ کو کھانے کی دعوت دینے آیا، حلبی کبیر ص ۶۰۹،

مگر علامہ ابراھیم کو حدیث کے الفاظ نقل کرنے میں وہم ہوا ہے (یا غالباً مشکوۃ ص ۵۴۴ سے نقل کی ہے) کیونکہ حدیث میں الفاظ ،داعی امراتہ، کے نہیں بلکہ، داعی امراۃ، یعنی کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی، چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت حسب ذیل کتب حدیث میں موجود ہے۔

دلائل النبوۃ للبیھقی ص ۳۱۰ ج ٦، و ابوداوٗد ص ۱۱۷ ج ۲ طبع کراچی، و ابوداوٗد ص ۱۱۷ ج ۲ طبع مکتبہ امدادیہ، و ابوداوٗد (۳۳۳۲) طبع بیروت، وطبع دارالسلام الریاض و ابوداوٗد مع عون (۳۳۲٦) و ابوداوٗد مع بذل المجھود ص ۲۳۹ ج ۴، والسنن الکبری للبیھقی ص ۵۳۳ ج ۵، و دارقطنی ص ۲۸٦ ج ۴، و مسند احمد ص ۲۹۴ ج ۵، وشرح معانی الاثار ص ۳۵۲ ج ۲، و نصب الرایہ ص ۱٦۸ ج ۴، لہذا سرے سے اس روایت سے استدلال ہی غلط ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری فرماتے ہیں کہ۔

مشکوۃ کی حدیث مذکورہ میں، داعی امراتہ، صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے ، داعی امرأۃ، ہونا چاہیئے، دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ حدیث مشکوۃ میں ابوداوٗد سے نقل کی گئی ہے اور ابوداوٗد میں، داعی امراتہ، نہیں ہے بلکہ، داعی امراۃ، ہے، کتاب الجنائز ص ۷۷۔

رجوع الی المقصد

ملا علی القاری حنفی مشکوۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

قررہ اصحاب مذھبنا من انہ یکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول اوالثالث او بعد الاسبوع کما فی البزازیۃ و ذکر فی الخلاصۃ انہ لایباح اتخاذ الضیافۃ عند ثلاثۃ ایام ......وقال ابن الھمام یکرہ اتخاذ الضیافۃ من اھل المیت و الکل عللوہ بانہ شرع فی السرور لافی الشرور وقال وھی بدعۃ مستقبحہ.

یعنی ہمارے مذھب حنفی کے فقہاء کرام نے اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن اور اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ، فتاوی بزازیۃ میں ہے اور خلاصہ میں ہے کہ تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے۔

اور علامہ ابن ھمام نے (فتح القدیر میں) کہا کہ میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے اور

ان تمام کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ طعام کا کھلانا تو خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نا کہ غمی میں اور مزید کہا ہے کہ یہ بدترین بدعت ہے، مرقاۃ المفاتیح ص ۲۲۳ ج ۱۱۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ

فتح العزیز میں ہے کہ سوم کا مقرر اور اسے ضروری سمجھنا شرعاً ثابت نہیں اور صاحب نصاب الاحتساب نے ان کو مکروہ لکھا ہے بلاتقرر یوم (دن) اور بغیر رسوم دنیاوی میت کو ثواب پہنچائیں تو باعث خیر ہے اورمیت اپنی موت کے قریب ثواب کی زیادہ محتاج ہوتی ہے جہاں تک ہوسکے ثواب پہنچانا چاہیئے اور شیخ عبدالحق محدث دھلوی، شرح سفرالسعادت، میں تحریر فرماتے ہیں۔

اور عادت نہیں تھی کہ میت کے لئے غیر وقت نماز میں جمع ہوں اور قرآن پڑھیں اور ختم کریں نہ قبر پر نہ اور کہیں اور یہ سب بدعت اور مکروہ ہے اہل میت سے تعزیت کرنا اور انہیں تسلی دینا اور صبر کی تعلیم کرنا سنت اور مستحب ہے لیکن تیجے کے دن اس مخصوص صورت سے جمع ہونا اور تکلفات مروجہ کرنا اور یتامیٰ کے مال سے بے وصیت مال صرف کرنا بدعت اور حرام ہے،

مجموعۃ الفتاوی ص ۳۴۲ ج ۱، مترجم طبع ایچ ایم سعید سن ۱۴۰۴ھ،

شیخ الاسلام، کشف الغطاء، میں فرماتے ہیں کہ

آنچه متعارف شده از پختن اهل مصیبت طعام را درسوم و قسمت نمودن آں میاں اهل تعزیت وا قران غیر مباح و نامشروع است و تصریح کرده بران درخزانه چه شریعت دعوت نذد سرور است نه نذد شرور و هو المشهور عندالجمهور،

بحوالہ فتاوی رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴، واحکام شریعت ص ۲۹۴،

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم لکھتے ہیں کہ

بعد مردن من رسوم دینوی مثل دهم و بستم و چهلم و ششماهی و برسینی هیچ نه کنند، که رسول اللهﷺ زیاده از سه ماتم کردن جائز نداشته اندو حرام ساخته اند،

یعنی میرے مرنے کے بعد دنیاوی رسمیں مثلاً دسواں اور بیسواں اور چالیسواں اور ششماہی اور

سالانہ (یعنی عرس) کچھ بھی نہ کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے زیادہ سوگ کرنے کو جائز نہیں رکھا بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

وصیت نامہ ملحقہ مالا بدمنہ ص ۱۵۲ طبع برکت علی اینڈ سنز سن ۱۹۳۴۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی فرماتے ہیں کہ

دیگر از عادات شنیعه ما مردم اسراف است درما تمها و سیوم و چهلم و ششماهی و وفاتحه سالینه وایں همه را درعرب اول وجود نه بود مصلحت آں ست که غیر تعزیت وارثان میت تاسه روز و اطعام شاں یک شب وروز رسمے نباشد.

اور ہم لوگوں کی بری عادتوں میں سے ہے کہ موت کے بعد تیسرے چہلم ششماہی اور سالانہ فاتحہ کے موقع پر اسراف کرنا اور یہ عرب (یعنی اسلام) کے ابتدائی دور میں ان امور کا کوئی وجود نہ تھا اور مصلحت اسی میں ہے کہ تین دن تک میت کے وارثوں کی تعزیت اور ان کی صبح و شام کھانے کے بغیر اور کوئی رسم نہ ہو۔

تفہیمات الھیہ ص ۲۴۷ ج ۲۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں کہ فقہاء نے میت کے ایصال ثواب سے منع نہیں کیا بلکہ حکم دیا جیسا کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں، جس کو فقہاء منع کرتے ہیں وہ چیز ہی اور ہے، وہ میت کے نام پر برادری کی روٹی لینا یعنی قوم کے طعنہ سے بچنے کے لئے جو میت کے تیجے دسویں وغیرہ میں برادری کی دعوت عام کی جاتی ہے وہ ناجائز ہے۔

اس لئے کہ یہ نام ونمود کے لئے ہے اور موت نام ونمود کا وقت نہیں، اگر فقراء کو بغرض ایصال ثواب فاتحہ کر کے کھانا کھلایا تو سب کے نزدیک جائز ہے، شامی کتاب الجنائز باب الدفن میں ہے یعنی میت والوں سے دعوت لینا مکروہ ہے کیونکہ یہ تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔

دعوت لینے کے وہ ہی معنی کہ برادری مجبور کرے کہ روٹی کر، پھر فرماتے ہیں یہ سارے کام محض دکھاوے کے ہوتے ہیں لہذا ان سے بچے کیونکہ اس سے اللہ کی رضا نہیں چاہتے۔

صاف معلوم ہوا کہ فخریہ طور پر برادری کی دعوت منع ہے، پھر فرماتے ہیں اگر اہل میت نے

فقرا کے لئے کھانا پکایا تو اچھا ہے، یہ فاتحہ کا جواز ہے، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کا اپنے تیجہ دسویں سے منع فرمانا بالکل درست ہے وہ فرماتے ہیں رسوم دنیاوی جو تیجہ وغیرہ وہ نہ کریں، رسوم دنیا کیا ہیں، عورتوں کا تیجہ وغیرہ کو جمع ہوکر رونا پیٹنا نوحہ کرنا وہ واقعی حرام ہے، اسی لئے فرماتے ہیں کہ تین دن سے زیادہ تعزیت جائز نہیں، اس جگہ ایصال ثواب اور فاتحہ کا ذکر نہیں، جس کا مقصد یہ ہوا کہ تیجہ وغیرہ میں ماتم نہ کریں، جاء الباطل ص ۲۶۸ ج ا۔

الجواب : اولاً : یہ بات بھی درست ہے کہ اہل میت سے برادری کے نام روٹی لینا اور مرنے والے کا عزیز و اقارب اور تعلق داروں کے لئے دعوت کا انتظام کرنا غلط ہے، مولوی احمد رضا خاں بریلوی سے جب اسی طرح کا سوال ہوا کہ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں اکثر بلاد میں رسم ہے کہ میت کے روز وفات سے اس کے اعزہ واقارب و احباب کی عورتیں اس کے جمع ہوتی ہیں اس اہتمام کے ساتھ جو شادیوں میں کیا جاتا ہے پھر کچھ دوسرے دن اکثر تیسرے دن واپس آتی ہیں بعض چالیسویں تک بیٹھتی ہیں اس مدت اقامت میں عورات کے کھانے پینے پان چھالیہ کا اہتمام اہل میت کرتے ہیں جس کے باعث ایک صرف کثیر زیر بار ہوتے ہیں اکثر اس وقت انکا ہاتھ خالی ہوتو اس ضرورت سے قرض لیتے ہیں یوں نہ ملے تو سودی نکلواتے ہیں اگر نہ کریں تو مطعون و بدنام ہوتے ہیں یہ شرعاً جائز ہے یا کیا، بینوا توجروا۔

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم . الحمدلله الذی ارسل نبينا الرحيم الغفور بالرفق و التيسير و اعدل الامور فسن الدعوة عندالسرور دون الشرور ﷺ وبارک عليه و علی اله الکرام و صحبه الصدور.

سبحان اللہ، اے مسلمان یہ پوچھتا ہے، جائز ہے یا کیا، یوں پوچھ کہ یہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں سخت وشنیع خرابیوں پر مشتمل ہے۔

اولاً۔ یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ قبیحہ، امام احمد نے اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں بہ سند صحیح حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

كنا نعد الا جتماع الى اهل الميت و صنعهم الطعام من النياحة .

ہم گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مردے کی نیاحت سے شمار کرتے تھے، جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق۔

اس کے بعد خاں صاحب نے تقریباً بیس کتب فقہ حنفیہ سے اس کے حرام و مکروہ ہونے کی صراحت نقل کی ہے، فتاوی رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴۔

الغرض یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے اور ختم وقل وغیرہ کو جواز کا لبادہ پہنانے کا ایک بہانا ہے کیونکہ قل وغیرہ کی رسم کا یہ بنیادی جزو اور پتھر ہے کہ میت کے فوت ہونے کے دن سے ایک دودن چھوڑ کر قل کے نام پر دعوت کی جاتی ہے جس میں عزیز و اقارب اور دوست و احباب جمع ہوتے ہیں اور حسب دستور کھانا تیار کیا جاتا ہے اور قل کا ختم پڑھ کر تمام حاضرین کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو رشتہ دار کھانے کو نہ کھائے یا اس دعوت میں شامل نہ ہو اس سے ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے یہ جھوٹا بہانا ہے کہ کھانا فقط فقراء کو ایصال ثواب کی نیت سے کھلایا جاتا ہے۔

بلکہ کھانا تمام حاضرین تناول کرتے ہیں، خواہ کوئی امیر ہو یا غریب بلکہ جس کھانے پر فاتحہ پڑھی گئی ہو اسے بطور تبرک حاضرین میں تقسیم کیا جاتا ہے جسے لوگ خوشی سے کھاتے پیتے ہیں۔

الغرض مفتی صاحب کا یہ لکھنا کہ فاتحہ کا کھانا صرف فقراء کو کھلایا جاوے۔ فقط کاغذی کاروائی ہے، ورنہ یہ لوگ کیوں فتوی نہیں دیتے کہ قل وغیرہ میں شامل امیر و دولت مند حضرات اگر کھانا تناول کریں گے تو ان کا کھانا حرام اور سور کی طرح مردار ہے، مگر یہ حضرات کبھی بھی ایسا فتوی صادر کرنے کو تیار نہیں ہوں گے کیونکہ جب امراء کے لئے منع کا فتوی ہوگا تو مولویوں کے لئے جواز کا فتوی کیسے ہوگا

ثانیاً: حضرت مفتی صاحب نے جس انداز اور ترتیب سے، فتاوی شامی، سے عبارت نقل کی ہے، اس ترتیب اور انداز میں قطعاً نہیں، قارئین کرام ہم پہلے شامی کی مفصل عبارت نقل کر چکے ہیں اسے ایک بار مکرر ملاحظہ کرلیں کہ آیا عبارت کا اسلوب یہی ہے جو مفتی صاحب بیان کر رہے ہیں

حضرات محترم جب آپ نے عبارت کو پڑھ لیا ہے تو پھر غور کیجئے کہ مفتی صاحب نے عبارت میں ہیر پھیر کر کے مفہوم کو بگاڑا ہے کہ نہیں! اگر بگاڑا ہے اور یقیناً بگاڑا ہے تو اس پر ہم، یہی کہہ

سکتے ہیں کہ حکیم الامت جیسے القاب اختیار کرنے کا مقصد صرف اس طرح کی عیاریاں کرنا ہے۔

اب آیئے ہم آپ کو علامہ شامی کی مفصل عبارت کا مفہوم سمجھا دیں، تا کہ حق واضح ہو جائے۔

علامہ شامی نے پہلے ''فتاوی بزازیہ'' سے اس کا مکروہ (حرام) ہونا نقل کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ فتاوی بزازیہ کی کتاب الاستحسان میں ہے کہ اگر کھانا پکا کر فقرا کو کھلایا جائے تو اچھا ہے، معراج الدرایہ شرح ھدایہ، سے اس کی تردید نقل کرتے ہوئے فرماتے ہین کہ یہ سارے کام محض دکھاوے کے لئے ہوتے ہیں لہذا ان سے بچنا چاہیئے۔

اس کے بعد علامہ شامی نے مفصل رد تحریر کیا ہے، مگر مولف جاء الباطل نے اپنے روایتی کردار سے اس عبارت کو ہی بگاڑ دیا ہے۔

ثالثاً: حضرت قاضی ثناء اللہ مرحوم پانی پتی کی عبارت کا یہ مفہوم نکالنا کہ انہوں نے قل و دسواں سے منع نہیں کیا بلکہ دنیاوی رسوم سے منع کیا، مفتی صاحب کی جہالت اور تعصب کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ قاضی صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ قل و دسواں وغیرہ نہ کرنا کہ یہ تمام دنیاوی رسوم ہیں یعنی قاضی صاحب انہیں دنیاوی رسوم میں داخل کرکے اس پر حرمت کا فتوی لگا رہے ہیں،

مگر افسوس مفتی صاحب اس کا مطلب بگاڑ کر اپنے پیٹ کی خاطر ان پر افترا کر رہے ہیں یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات قاضی صاحب سے وہ بات ثابت نہیں کر سکتے جو مفتی صاحب نے ان کی طرف منسوب کی ہے، اللہ تعالی مبتدعین کو ھدایت اور سمجھ عطا کرے، آمین یا الہ العلمین۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

تفسیر روح البیان پارہ ۷ سورۃ الانعام زیر آیت، وھذا کتاب انزلناہ مبارک، میں ہے

وعن حمید الاعرج قال من قرء القرآن و ختمه ثم دعا امن علی دعائه اربعة الاف ملک ثم لایذالون یدعون له و یستغفرون و یصلون علیه الی المساء او الی الصباح.

حضرت اعرج سے مروی ہے کہ جو شخص قرآن ختم کرے پھر دعا مانگے تو اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں پھر اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اور مغفرت مانگتے رہتے ہیں، شام یا صبح تک۔

یہ مضمون نووی کی کتاب الاذکار کتاب تلاوت القرآن میں بھی ہے، معلوم ہوا کہ ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، اور ایصال ثواب بھی دعا ہے لہذا اس وقت ختم پڑھنا بہتر ہے۔ جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً: امام الاعرج (حمید بن قیس مکی) اتباع تابعین سے ہیں ظاہر ہے کہ اتباع تابعین سے کسی کا قول شرعی طور پر حجت نہیں ہے۔

ثانیاً: روایت کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں اس میں صاف بیان ہے کہ جو قرآن کو ختم کرے اس کے لئے فرشتے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، کسی اور کے لئے قطعاً نہیں۔

ثالثاً: روایت میں اس کا بھی ذکر قطعی طور پر نہیں کہ کھانا سامنے رکھ کر دعا کی جائے تو تب فرشتے آمین کہتے ہیں، جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے علاوہ ازیں اس کی سند میں قذعہ بن سوید راوی ہے، دارمی ۲/۵۶۰ کتاب فضائل القرآن باب فی ختم القرآن رقم الحدیث (۳۴۸۱) جو کہ ضعیف ہے تقریب ص ۲۸۲ تفصیل کے لئے دیکھئے تھذیب ص ۳۷۶ ج ۸۔

رابعاً: اس روایت کی صحت کو بالفرض اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو تب بھی یہ مبتدعین کی دلیل قطعی طور پر نہیں بن سکتی، کیونکہ روایت میں بہر حال اس کا ذکر نہیں کہ جب کوئی وفات پا جائے تو اس کے لئے کھانے پر قرآن خوانی کرتے ہوئے آخر میں اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرو، تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور مرنے والے کو یہ ایصال ثواب کچھ نفع و فائدہ پہنچاتا ہے۔

خامساً: مفتی صاحب کا ایصال ثواب اور دعا کو ایک قرار دینا، غلط ہے کیونکہ اس کا قرآن و سنت سے ثبوت نہیں، علاوہ ازیں دعا شفاعت کی قسم سے ہے اور ایصال ثواب ہدیہ کے قبیل سے ہے۔

دوسری دلیل

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

انوار ساطعہ ص ۱۴۵، اور حاشیہ خزانۃ الروایات ، میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا ، یہ تیجہ ششماہی اور برسی کی اصل ہے۔

جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱ ،

الجواب

اولاً : کتاب انوار ساطعہ ، ایک بریلوی مولوی عبدالسمیع رامپوری کی بدعات کے دفاع اور جواز میں تصنیف کردہ ہے، اور حاشیہ خزانۃ الروایات ، کوئی حدیث کی کتاب ہی نہیں ، الغرض یہ روایت محض من گھڑت اور بے اصل ہے اور کوئی محقق بریلویت اس کو ثابت نہیں کرسکتا ، ہم ثبوت دینے والے رضوی علامہ فہامہ کی قرآن فہمی اور حدیث دانی کے علاوہ جماعتی سطح پر ، تیسرے ، ساتویں اور چالیسویں روز صدقہ کرنے اور برسی منانے کو مسنون تسلیم کر لیں گے ، مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں دے سکتے ، قیامت تک مہلت ہے تجربہ کر دیکھئے ۔ واضح رہے کہ من گھڑت روایات خود بریلوی مذہب کے جید علماء کے نزدیک بھی قابل استدلال نہیں ہوتیں جیسا کہ آگے انگوٹھے چومنے کی بحث میں ہم نے ، علماء بریلویہ کا اعتراف ' کے زیر عنوان ان کی عبارات نقل کی ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ ، خزانۃ الروایات ، فقہ حنفی کی کتاب ہے اور کتب فقہ میں مروی روایات کا سرے سے کوئی اعتبار ہی نہیں ، جیسا کہ ہم نے ، دین الحق ص ۷۱، ۶۵۲ ، ج ۱ ، میں تفصیل عرض کردی ہے ۔

جب آپ اس بات کو بخوبی جان گئے ہیں کہ فقہ حنفی میں مرویات کو دلیل بنانا تو کجا سرے سے وہ قابل اعتماد ہی نہیں ،

تو پھر سنئے کہ ہم اپنے دین و ایمان کی محکمی اور خدا داد قرآن و سنت کے علم کو بروئے کار

لاتے ہوئے پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ بات عرض کرتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت اور بلاسند ہے، اور اس کو بسند صحیح ثابت کرنے والے محقق بریلویہ کو منہ مانگا انعام دیں گے۔

ثانیاً: اس من گھڑت روایت میں ایام کی تخصیص ہے اور خود مفتی صاحب کے گرو مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے اعتراف کر رکھا ہے کہ شریعت میں ثواب پہنچانا ہے دوسرے دن ہو خواہ تیسرے دن باقی یہ تعین عرفی ہے، جب چاہیں کر لیں انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت و بدعت ہے، فتاوی رضویہ بحوالہ توضیح البیان ص ۱۴۲۔

تعجب ہے کہ ان ایام کی تعین کو ضروری جاننے کو تو خاں صاحب بھی جہالت و بدعت قرار دیں؟ اگر ان کے نزدیک یہ حدیث ثابت ہوتی تو وہ اسے ضرور واجب یا کم ازکم سنت ہی قرار دیتے مگر انہوں نے اسے بدعت کہہ کر اس روایت کو من گھڑت تسلیم کر لیا ہے۔

ثالثاً۔ اس من گھڑت روایت میں بھی فقط ایصال ثواب کا ذکر ہے، محفل چہلم وقل وغیرہ کا اس میں سرے سے بیان ہی نہیں نہ ہی ختم قرآن اور دعا کا ذکر! جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے۔

خاں صاحب فرماتے ہیں کہ

ثواب پہنچانا صرف نیت ہی سے نہ ہو بلکہ اس کی دعا بھی ہو، فتاوی رضویہ ص ۲۱۸ ج ۴۔ جب کہ روایت ان تمام امور سے ساکت ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

نووی نے کتاب الاذکار باب تلاوۃ القرآن میں فرمایا کہ انس بن مالک ختم قرآن کے وقت اپنے گھر والوں کو جمع کر کے دعا مانگتے، حکیم بن عتبہ فرماتے ہیں کہ ایک مجمع کو مجاہد و عبدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا اور فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ آج ہم قرآن پاک ختم کر رہے ہیں، اور ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، حضرت مجاہد سے بروایت صحیح منقول ہے کہ بزرگان دین ختم قرآن کے وقت مجمع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس وقت رحمت نازل ہوتی ہے، لہذا تیجہ و چہلم کا اجتماع سنت سلف ہے، جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اثر کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں

کان اذا ختم القرآن جمع اھله و ولده فدعالھم.

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ جب قرآن مجید ختم کرتے تو اپنے اہل بیت اور اولاد کو جمع کرتے اور ان کے لئے دعا کرتے ،مجمع الزوائد ص ۱۷۵ج ۷۔

ظاہر ہے کہ اس اثر کو مبتدعین کے مروجہ ختم سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ قرآن حکیم کو پورا پڑھ کر آخر میں اولاد کے حق میں دعائے خیر کرنا ، بات ہی دیگر ہے جب کہ مبتدعین کسی شخص کے مرنے پر متوفی کے ایصال ثواب کے لئے قرآۃ قرآن کرتے ہیں پھر اس قرأۃ کے ثواب کو پہنچانے کی غرض سے قل وغیرہ کی مجلس کا انعقاد ہوتا ہے جس میں پیش امام طعام کو سامنے رکھ کر چند آیات قرآنی متعدد مقامات سے تلاوت کرنے کے بعد حاضرین سے قرأۃ قرآن کا اجر وثواب وصول کر کے مرنے والے کو دعا کے ذریعہ بخشتا ہے۔

ایمان سے کہنا کہ اس عمل کو اثر انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے دور کا بھی کوئی تعلق و واسطہ ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر نا معلوم کہ مفتی صاحب نے کس مناسبت سے اسے یہاں بیان کر دیا ہے، غالبًا انہوں نے قرأۃ کے بعد دعا کو محل استدلال بنایا ہے، حالانکہ تلاوت قرآن کے بعد دعا نہ ہی تو موضوع بحث ہے اور نہ ہی اس سے مبتدعین کا عمل ثابت ہوتا ہے

ثانیاً ۔ حکم بن عتیبۃ کے قول کو نقل کرنے میں بھی مفتی صاحب نے متعدد اغلاط کی ہیں ۔

تفصیل میں جانے سے قبل آیئے پہلے اصل عبارت ملاحظہ کریں ۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ

وا خرج ابن ابی داود عن الحکم بن عتیبة قال ارسل الی مجاھد و عندہ ابن ابی امامة و قالا انا ارسلنا الیک لانا اردنا ان نختم القرآن، والدعا یستجاب عند ختم القران .

یعنی ابن ابی داؤد نے حکم بن عتیبۃ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا مجھے مجاہد نے پیغام بھیجا اور میں گیا تو ان کے پاس ابن ابی امامہ بھی موجود تھے ،مجاہد اور ابن ابی امامہ دونوں نے مجھ سے کہا

ہم نے تم کو اس لئے بلوایا ہے کہ ہم قرآن ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔بحوالہ اتقان فی علوم القرآن ص ۱۴۵ ج ا۔

دیکھئے مفتی صاحب نے (۱) حکم کو حکیم بنادیا (۲) عتیبہ کو عتبہ لکھ دیا ،(۳) ابن ابی امامہ کو ابن ابی لبابہ سے بدل دیا (۴) وعبدہ کو اپنی طرف سے داخل کردیا (۵) اور ارسل الی ، کا معنی ایک مجمع کو مجاہد وعبدہ ابن ابی لبابہ نے بلایا ، کیا ہے ، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ہے جناب مبتدعین کا شیر بہادر حکیم الامت جو عربی کی ڈیڑھ سطر سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتا ، اسے کہتے ہیں ع ۔لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

ثالثاً : مبتدعین کی رسم قل وغیرہ میں تین چیزیں اس کی جزوتصور کی جاتی ہیں جن کے بغیر یہ حضرات ختم کو ناقص و ادھورا تصور کرتے ہیں (۱) تعین ایام (۲) قرأۃ قرآن (۳) اور دعا کے ذریعہ ثواب پہنچانا ، لیکن زیر بحث روایات کو اگر درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو تب بھی ان کے مذعوم دعوے ثابت نہیں ہوتے ، کیونکہ زیر بحث روایات میں نہ ہی تو کسی کو ثواب بخشنے کا بیان ہے اور نہ ہی تعین ایام ، خواہ عرفی ہی ہوں ، کا تذکرہ ہے اور نہ ہی میت کو ثواب بخشنے کی غرض سے تلاوت قرآن کا بیان ہے اس کے باوجود حضرت مفتی صاحب اسے کھینچ تان کے یہ باور کرانے کے درپہ ہیں کہ تیجہ و چہلم کا اجتماع سنت سلف ہے ، جاء الباطل ص ۲۶۲ ج ا۔

اے جی بتاؤ مذکورہ روایات کے کن الفاظ کا یہ معنی ہے جسے آپ سلف صالحین کی سنت قرار دے رہیں ہیں؟

چوتھی دلیل

در مختار بحث قرأۃ للمیت باب الدفن میں ہے،

فی الحدیث من قرء الاخلاص احد عشر مرة ثم وهب اجرها للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات.

حدیث میں ہے کہ جو شخص گیاراں بار سورۃ اخلاص پڑھے پھر اس کا ثواب مردوں کو بخشے تو اس کو تمام مردوں کے برابر ثواب ملے گا۔ جاء الباطل ص۲۶۳ ج۱۔

شامی میں اسی جگہ ہے،

و یقر ء من القران ما تیسر له من الفاتحة و اول .

جو ممکن ہو قرآن پڑھے، سورۃ فاتحہ بقرہ کی اول آیات اور آیۃ الکرسی اور امن الرسول اور یٰس اور ملک اور سورۃ تکاثر اور سورۃ اخلاص بارہ یا گیارہ یا سات یا تین دفعہ پھر کہے کہ یا اللہ جو کچھ میں نے پڑھا اس کا ثواب فلاں کو یا فلاں لوگوں کو پہنچا دے۔

الجواب

اولاً۔ صاحب درمختار نے روایت کے درست الفاظ نقل نہیں کیئے جبکہ درست الفاظ یہ ہیں کہ

من مر علی المقابر فقرأ قل هو الله أحد إحدی و عشرين مرة ثم وهب اجره للاموات اعطی بعدد الاموات.

فردوس الاخبار للدیلمی ص ۳۸ ج ۴، وتذکرۃ الموضوعات ص۲۹۲۔

اور بعض روایات میں، احدی وعشرین، کی بجائے، احد عشرۃ، کے الفاظ ہیں، کنز العمال (۴۲۵۸۹) ص۲۷۶۔ ۱۵۴ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان وکشف الخفاء ص ۲۸۲ ج ۲، و سلسلہ احادیث الضعیفہ ص۴۵۲ ج ۳۔

ظاہر ہے کہ یہ روایت متن کے لحاظ سے مضطرب ہے۔

ثانیاً: اس کی سند میں دو راوی، عبداللہ بن احمد اور اس کا والد احمد بن عامر الطائی ہیں، تسدید القوس علی ھامش مسند فردوس ص ۳۸ ج ۴،

اور یہ دونوں کذاب راوی ہیں جیسا کہ امام سخاوی کے حوالے سے علامہ البانی نے بیان کیا ہے، سلسلہ احادیث الضعیفہ (۱۲۹۰) علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال ۳۹۰ ج ۲ میں اور علامہ محمد طاہر فتنی نے قانون الموضوعات و الضعفاء ص ۲۳۶ ،۲۷۱، میں صراحت کی ہے کہ عبداللہ بن احمد بن عامر کے والد کے پاس ایک مجموعہ اباطیل تھا جس سے وہ آئمہ اہل بیت سے من گھڑت روایات نقل کرتا تھا جس کی کوئی اصل نہ تھی اور احمد بھی وہی روایات نقل کرتا ہے۔

الغرض یہ روایت من گھڑت اور بے اصل ہے، جو اس کی صحت کا مدعی ہے، وہ عبداللہ اور اس کے والد احمد کی عدالت و ثقاھت ثابت کرے، تو ہم اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

علامہ البانی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ

اگر اس روایت کی کوئی اصل ہو تو یہ موضوع بحث میں حجت ہوگی جس سے اختلاف ختم ہوجائے گا (یعنی ہم قبول کرلیں گے) سلسلہ احادیث الضعیفہ ص ۴۵۳ ج ۳۔

ثالثاً: اس روایت میں تو یہ ہے کہ، من مر علی المقابر، جو شخص قبرستان سے گزرے، تو وہ گیارہ بار قل ھو اللہ، پڑھ کر اموات کو ثواب بخشے۔

صاحب درمختار اور اس کے شارح علامہ شامی نے بھی، فتاوی شامی ص ۲۴۳ ج ۲، میں اسے زیارت قبور کے بارے میں کہا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب اس من گھڑت روایت سے کھانے پر قرأۃ ثابت کر کے ختم کا ثبوت دے رہے ہیں، جو کہ ان کی زیادتی ہے، کیونکہ روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو مبتدعین کے عمل کی دلیل بن سکے کہ تعین ایام کے ساتھ میت کے ورثا ایک محفل قل وغیرہ کی منعقد کر کے ختم دلوائیں اور قرأۃ قرآن کروا کر میت کی روح کو ثواب پہنچائیں۔

رابعاً: یہ من گھڑت روایت سنت متواترہ کے مخالف و معارض ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو قبرستان جانے کے لئے مسنون دعا، اسلام علیکم الخ مشکوۃ ص ۱۵۴، سکھائی ہے۔

خامساً: اسی طرح جو مفتی صاحب نے، فتاوی شامی، سے عبارت نقل کی ہے کوئی حدیث مرفوع نہیں، نہ ہی وہ کسی صحابی کا فتوی ہے بلکہ علامہ شامی نے اسے، شرح اللباب، سے نقل کیا ہے، فتاوی شامی ص ۲۴۳ ج ۲۔

اور یہ بات کسی شک شبہ سے بالا تر ہے کہ شارح، صاحب اللباب، کا قول کوئی دلیل شرعی

نہیں جو مفتی صاحب خصم کو باور کرا رہے ہیں۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب کو جب من گھڑت روایات کے کیسہ دلائل سے مروجہ ختم ثابت ہوتا نظر نہ آیا تو انہوں نے عبارات اکابر کو اپنا مددگار و معاون جان کر انہیں نقل کر دیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دھلوی نے یہ لکھا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کا تیجہ ہوا تھا ۔جاء الباطل ص ۲۶۳ ج ۱۔

حالانکہ تعین ایام کو خود حضرت شاہ عبدالعزیز بدعت سے تعبیر کرتے ہیں، فتاوی عزیزی ص ۹۳ ج ۱۔

اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اگر کسی نے بفرض محال تیجہ کیا ہے تو اس سے مسئلہ کیسے ثابت ہو گیا، لوگ تو امام حسین رضی اللہ عنہ کا ماتم بھی کرتے ہیں! تو کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ماتم کرنا یا ماتم کرنے کا جواز ثابت ہو جائے گا، ہرگز نہیں، اسی طرح اگر کسی نے حضرت شاہ ولی اللہ کا تیجہ کیا ہے تو حضرت کا دامن اس سے صاف ہے، کیونکہ حضرت نے کھل کر اس کی تردید کی ہے، دیکھئے تفہیمات ص ۲۴۷ ج ۲۔

شریعت میں مکاشفہ کی حیثیت

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

مولوی محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند، تحذیر الناس ص۲۴ پر فرماتے ہیں کہ جنید کے کسی مرید کا رنگ یکایک متغیر ہوگیا، آپ نے سبب پوچھا تو بروے مکاشفہ اس نے یہ کہا کہ اپنی ماں کو دوزخ میں دیکھتا ہوں حضرت جنید نے ایک لاکھ پانچہزار بار کلمہ پڑھا تھا۔ یوں سمجھ کر بعض روایات میں اس قدر کلمے کے ثواب پر وعدہ مغفرت ہے، آپ نے جی ہی جی میں اس مرید کی ماں کو بخش دیا اور اس کی اطلاع نہ دی، بخشتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ وہ جوان ہشاش بشاش ہے، آپ نے سبب پوچھا اس نے عرض کیا کہ اپنی ماں کو جنت میں دیکھتا ہوں، آپ نے اس پر فرمایا کہ اس جوان کے مکاشفہ کی صحت تو مجھ کو حدیث سے معلوم ہوئی اور حدیث کی تصحیح اس کے مکاشفہ سے ہوگئی،

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کلمہ طیبہ ایک لاکھ پانچہزار بخشنے سے مردے کی بخشش کی امید ہے اور تیجہ میں چنوں پر یہ ہی پڑھا جاتا ہے، تمام عبارات سے فاتحہ اور تیجہ وغیرہ کے تمام مراسم کا جواز معلوم ہوا، جاء الباطل ص۲۶۴ ج ۱۔

اولاً: معلوم ہوا کہ ولی اللہ عالم الغیب نہیں ہوتے، تب ہی جنید کو بار بار پوچھنا پڑا کہ حالت غیر کیوں ہے اور اب ہشاش و بشاش کیوں ہو۔

ثانیاً: یہ نقل مطابق اصل نہیں کیونکہ، تحذیز الناس، میں ایک لاکھ یا پچھتر ہزار (۷۵) کے الفاظ ہیں، صفحہ۴۴، یعنی ایک لاکھ بخشا، یا ۷۵ ہزار مفتی صاحب غالباً اردو عبارت سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتے تھے کہ فقرہ، ایک لاکھ یا پچھتر ہزار بار کبھی کلمہ پڑھا تھا، سے یہ کشید کرلیا کہ ڈیڑھ لاکھ کلمہ طیبہ کبھی پڑھا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً: یہ قصہ محض بے سند اور بریلوی مکتب فکر جیسی سوچ رکھنے والے لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اسے ہم دین کا ایک حصہ و جزو کس دلیل سے بنالیں، جب کہ مولانا قاسم صاحب نے بھی اسے بے دلیل نقل کیا ہے۔

رابعاً: اس حکایت بیہودہ میں جو روایت نقل کی گئی ہے وہ بھی محض سینہ گزٹ ہے حدیث کی

کسی کتاب میں اس کا قطعاً وجود نہیں، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو اسے ثابت کریں ورنہ آئندہ کبھی اس کا نام نہ لینا۔

خامساً: کشف و مکاشفہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو کسی دینی و شرعی معاملہ میں بطور حجت و سند تسلیم کرلیا جائے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

لم یبق من النبوة الاالمبشرات، قالوا، وما المبشرات ؟ قال، الرؤیا الصالحة.

یعنی نبوت سے کچھ بھی باقی نہیں رہا، مگر مبشرات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ مبشرات کیا ہیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نیک خواب۔

صحیح بخاری (۶۹۹۰) باب المبشرات۔

یہ حدیث حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، ام کرز رضی اللہ عنہا، حذیفہ رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا، اور انس رضی اللہ عنہ، جیسے جلیل القدر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ دیکھئے، فتح الباری ص ۳۱۶ ج ۱۲، اروا الغلیل (۲۵۳۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسے وحی سے مناسبت رہی ہو مگر سچے خواب، اور یہ ظاہر ہے کہ کشف و مکاشفہ او رالھام وغیرہ خواب نہیں کیونکہ یہ حالت بیداری میں ہوتے ہیں جبکہ خواب کا معاملہ نیند سے تعلق رکھتا ہے، تو ثابت ہوا کہ کشف و الھام بے اصل اور شیطانی وسواس ہوتے ہیں، جو وہ اپنے پیاروں اور یاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے اگر خواب کے علاوہ بھی کوئی چیز وحی سے مناسبت رکھنے والی باقی ہوتی تو نبی ﷺ بیان فرماتے، مگر آپ علیہ السلام نے تو فقط خواب میں ہی حصر فرمادیا کہ اس کے علاوہ باقی کچھ رہا ہی نہیں۔

لہذا مفتی صاحب کا مکاشفہ وغیرہ پیش کر کے کلمہ طیبہ کا ایصال ثواب ثابت کرنا، سودمند نہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

فرماتے ہیں کہ مشکوۃ باب آداب طعام میں ہے کہ حضور علیہ السلام جب کھانے سے فارغ ہوتے تو فرماتے،

الحمدلله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه غير مكفي ولا مودع ولا مستغنا عنه ربنا،

جس سے معلوم ہوا کہ کھانے کے بعد دو چیزیں مسنون ہیں حمد الٰہی کرنا اور صاحب طعام کے لئے دعا کرنا اور فاتحہ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور غالباً اس قدر کا انکار مخالفین بھی نہیں کرتے ہوں گے، رہا کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اس کی بہت سی احادیث آئی ہیں، مشکوۃ باب المعجزات فصل دوم میں ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کچھ خرمے حضور علیہ السلام کی خدمت میں لایا اور عرض کیا کہ اس کے لئے دعائے برکت فرمادیں۔

فضمهن ثم دعا لي فيهن بالبركة.

آپ نے ان کو ملایا اور دعائے برکت کی۔ جاء الباطل ص ۲۶۴ ج ۱۔

کیا کھانے کے بعد کی دعا مسنون سے ختم ثابت ہوتا ہے؟

الجواب

اولاً: کھانا کھا کر اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنا اور دعوت کرنے والے کیلئے نیک دعا کرنا محل بحث سے خارج ہے کیونکہ اختلاف تو ہے تیجہ وغیرہ سے، جسے آپ حضرات دن تعین کر کے کھانا وغیرہ پر قرأۃ قرآن کرتے ہیں اور آخر میں دعا کے ذریعہ سے ایصال ثواب کرتے ہیں، اسی طرح دوسری حدیث ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ میں بھی ایصال کا ثواب کی غرض سے دعا کرنے کا بیان نہیں بلکہ بطور برکت آنحضرت ﷺ کے دعا کرنے کا ذکر ہے اور یہ چیز محل نزاع سے خارج ہے۔

ثانیاً: جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ روایات میں دعا ایصال ثواب کی غرض سے نہ تھی، تو اب سنیئے کہ ان روایات کو تیجہ و دسواں وغیرہ رسوم سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں کیونکہ نہ تو یہ کسی کے وصال پر ایسا ہوا ہے اور نہ ہی محفل تیجہ میں قرآن خوانی کا ذکر ہے اور نہ ہی تعین ایام کا ذکر ہے بلکہ یہ روایت تو تعین ایام کو رد کرتی ہے کیونکہ اس کے ابتدائی الفاظ کچھ اس طرح کے ہیں۔

كان اذا رفع مائدته.

یعنی جب کھانا کھا کر فارغ ہوتے تو تب یہ کلمات پڑھتے تھے۔ بخاری (۵۴۵۸) ومشکوۃ ص ۳۶۵۔

حضرت امام بخاری نے اس پر عنوان ، باب ما یقول اذا فرغ من طعامہ ، قائم کیا ہے بلکہ امام ابو عاصم کی روایت میں ، اذا فرغ من طعامہ ، کے الفاظ ہیں ، بخاری (۵۴۵۹) اس ساری بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آنحضرت ﷺ جب بھی کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ کلمات پڑھا کرتے تھے ، کسی جگہ و وقت کا تعین نہ تھا۔

مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اس سے تیجہ وغیرہ کی رسوم ثابت کرنے کے درپے ہیں ،سوال یہ ہے کہ اگر اس دعا سے مبتدعین کی بدعت تیجہ وغیرہ ثابت ہوتی ہے، تو کیا یہ حضرات جب بھی کھانا کھاتے ہیں، کسی کا تیجہ ہی کر کے کھاتے ہیں ، اگر نہیں یقیناً نہیں تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی ،اگر بدعتی صبح کا ناشتہ ، دوپہر کا کھانا اور ڈینر کھا کر یہ مسنون دعا کرے یا مفتی صاحب کا کوئی مرید کسی کی دعوت ولیمہ تناول فرما کر مذکورہ دعا مانگے تو کیا وہ تیجہ و دسواں وغیرہ ہوجائے گا؟ قطعاً نہیں ۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوۃ باب المعجزات فصل اول میں ہے کہ غزوہ تبوک میں لشکر اسلام میں کھانے کی کمی ہوگئی حضور علیہ السلام نے تمام اہل لشکر کو حکم دیا کہ جو کچھ جس کے پاس ہو لاؤ سب حضرات کچھ نہ کچھ لائے ، دستر خوان بچھایا گیا اس پر یہ سب رکھا گیا۔

فدعاء رسول الله ﷺ بالبركة ثم قال خذوا في اوعيتكم.

پس اس پر دعا فرمائی اور فرمایا کہ اب اس کو اپنے برتنوں میں رکھ لو، اسی مشکوۃ اسی باب میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کچھ کھانا بطور ولیمہ پکایا ،لیکن بہت لوگوں کو بلایا گیا ۔

فراءيت النبي ﷺ وضع يده على تلك تحديسة و تكلم بماشاء الله .

اس کھانے پر دست مبارک رکھ کر حضور علیہ السلام نے کچھ پڑھا۔

اسی مشکوۃ کے اسی باب میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوہ خندق کے دن کچھ تھوڑا

کھانا پکا کر حضور علیہ السلام کی دعوت کی حضور علیہ السلام ان کے مکان پر تشریف لائے ،

فا خرجت له عجيناً فبصق فيه وبارک .

آپ کے سامنے گندھا (لفظ ' گوندھا ، ہے ، ارشد) آٹا پیش کیا گیا تو اس میں لعاب شریف ڈالا اور دعائے برکت کی ۔

اس قسم کی بہت سی روایات پیش کی جاسکتی ہیں مگر اتنے پر کفایت کرتا ہوں، جاء الباطل ص ۲۶۵ ج ا۔

کیا معجزہ احکام میں دلیل شرعی ہے؟

الجواب

اولاً : یہ تو آنحضرت ﷺ کے معجزات کے قبیل کی احادیث ہیں، انہیں تیجہ وغیرہ کی رسوم سے کیا نسبت، کیونکہ احکام شرعیہ میں معجزات حجت نہیں ہوتے ، جو اس کا مدعی ہے کہ احکام میں بھی معجزہ معتبر ہے، وہ دلیل شرعی پیش کرے، کیونکہ معجزہ کا تعلق خاص نبی سے ہوتا ہے، جو اللہ تعالی کا فعل نبی کے ہاتھوں پر صادر ہوتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں اور راس کا نبی سے خاص ہونا مبتدعین کو بھی مسلم ہے ورنہ یہ لوگ تیجہ وغیرہ کی رسوم میں کھانے میں اپنا لعاب وتھوک کیوں نہیں ڈالتے جبکہ اسی حدیث میں آنحضرت ﷺ کا گوندھے ہوئے آٹے میں لعاب ڈالنا ثابت ہے۔

ثانیاً: کھانے پر آنحضرت ﷺ کی دعا برکت کیلئے تھی، کسی کو ایصال ثواب پہنچانے کی غرض سے نہ تھی، جیسا کہ مبتدعین کا عمل ہے، تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی، جب کہ دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔

ثالثاً: یہ کسی کے مرنے پر دن وغیرہ مقرر کر کے نہ تو قرأۃ قرآن وغیرہ کا ذکر ہے اور نہ ہی ایصال ثواب کا بیان ہے، بلکہ یہ تو برکت کی غرض سے دعا تھی ۔

جسے مفتی صاحب کھینچ تان کر ایصال ثواب کی طرف لے آئے ہیں، فرض کیجئے کہ زید کے پاس کل پونجی دس روپے رہ جاتی ہے اور وہ دعا کرتا ہے کہ اے میرے مالک و خالق ان میں برکت ڈال دے۔

تو کیا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند پارٹی اسے تیجہ وقل کہے گی، نہیں ہرگز نہیں، کیونکہ برکت کی دعا اور ایصال ثواب میں بعد المشرقین ہے، اور ان کا آپس میں سرے سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں۔

ساتویں دلیل

جس کیلئے دعا کرنا ہو اس کو سامنے رکھ کر دعا کرنا چاہیے، جنازے میں میت کو سامنے رکھ کر نماز جنازہ پڑھتے ہیں، کیونکہ اسی کیلئے دعا ہے، اس کو سامنے رکھ لیا، اسی طرح سامنے کھانے کو رکھ کر دعا کی تو کون سی خرابی ہے، اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں، حضور علیہ السلام نے اپنی امت کی طرف سے قربانی فرما کر مذبوحہ جانور سامنے رکھ کر پڑھا۔

اللهم هذا من امة محمد،

اے اللہ یہ قربانی میری امت کی طرف سے ہے۔

حضرت خلیل اللہ نے کعبہ کی عمارت سامنے لے کر دعا کی۔

ربنا تقبل منا.

اب بھی عقیقہ کا جانور سامنے رکھ کر ہی دعا پڑھی جاتی ہے، لہذا اگر فاتحہ میں بھی کھانا سامنے رکھ کر ایصال ثواب ہو تو کیا حرج ہے، جاالباطل ص۲۶۶ ج ا۔

کیا قربانی کی دعا سے ختم ثابت ہوتا ہے؟

الجواب

اولاً: ان افعال میں کسی کو ایصال ثواب کرنے کی غرض سے دعا کرنا مقصود نہیں بلکہ اپنے عمل کو قبول کرنے کی اپنے رب سے التجاء ہے جیسا کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کعبہ کو تعمیر کرتے وقت دعا کی تھی ایسے ہی نماز جنازہ میں بخشش کی دعا ہے نا کہ کسی کو ایصال ثواب کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

ثانیاً: عقیقہ کے وقت جانور کو پیش کر کے دعا کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہاں اگر کوئی احیاناً ایسا کر دے کہ اے میرے مالک قبول فرما تو اس میں بھی اس کا مقصود ایصال ثواب کرنا نہیں بلکہ

اپنے عمل حسنہ کو قبول کرنے کی التجا ہے، ثم اقول، عقیقہ کا نام کس منہ سے لیتے ہو اسے تو آپ کے امام ابو حنیفہ جاہلیت کی رسم کہتے ہیں۔ تاریخ بغداد ص ۱۱۴ ج ۱۳۔

امام محمد فرماتے ہیں کہ

و لا یعق عن الغلام و عن الجاریة،

یعنی عقیقہ نہ بچے کی طرف سے کیا جائے اور نہ ہی بچی کی طرف سے، الجامع الصغیر ص ۵۳۴۔

مولانا عبد الحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ عقیقہ غیر مشروع یا مکروہ ہے، التعلیق المجد ص ۲۸۸ حاشیہ ۱۲۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب بدائع الصنائع میں علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ

و ذکر فی الجامع الصغیر و لا یعق عن الغلام و لا عن الجاریة وانه اشارة الی الکراهة.

یعنی جو امام محمد نے الجامع الصغیر میں کہا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقیقہ مکروہ ہے، بدائع الصنائع ص ۶۹ ج ۵، وفتاوی عالم گیری ص ۳۶۲ ج ۵۔

ثالثاً: قربانی کرتے وقت جو دعا رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، اس پر بفضلہ تعالی اہل حدیث عمل پیرا ہیں، مگر اس سے آپ کا رسم قل ثابت کرنا سینہ زوری ہے کیونکہ یہ دعا و التجا اللہ سے اپنے عمل کو قبول کرنے کی تھی نا کہ کسی کو ایصال ثواب کی غرض سے تھی اور اس پر حدیث کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ امر بکبش اقرن یطأ فی سواد و یبرک فی سواد و ینظر فی سواد فاتی به لیضحی به قال فقال لها عائشة هلمی المدیة ثم قال اشحذ یها بحجر ففعلت ثم اخذها واخذ الکبش فاضجعه ثم ذبحه ثم قال باسم الله اللهم تقبل من محمد و ال محمد و من امة محمد ثم ضحی به .

رسول اللہ ﷺ نے ایک سینگدار مینڈھا لانے کا حکم فرمایا، جو سیاہی میں چلتا ہو، اور سیاہی میں بیٹھتا ہو، اور سیاہی میں دیکھتا ہو، چنانچہ ایسا مینڈھا قربانی کیلئے لایا گیا، آپ علیہ السلام نے

فرمایا کہ اے عائشہ چھری لاؤ، پھر فرمایا پتھر سے تیز کردے، میں نے تیز کردی تو آپ علیہ السلام نے چھری لے لی، مینڈھے کو پکڑا پھر اسے لٹایا اور ذبح کیا، اور فرمایا کہ

باسم الله تقبل من محمد و آل محمد و من امة محمد ،

چنانچہ اس طرح سے آپ نے قربانی کی۔صحیح مسلم ص ۱۵۶ ج ۲، و ابو داؤد ص ۳۰ ج ۲، ابن حبان (۵۸۸۵) ، وبیھقی ص ۲۸۶ ج ۹۔

یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قربانی نبی کریم ﷺ نے گھر میں دی تھی جبھی تو حضرت اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو چھری اور اس کو تیز کر کے لانے کا حکم فرمایا، پھر اس قربانی میں جہاں آپ علیہ السلام خود شریک تھے وہاں ہی امہات المومنین اور دیگر اہل بیت او رامت اسلامیہ بھی شریک تھی جس پر حدیث کے الفاظ،

اللهم تقبل من محمد و من آل محمد و من امة محمد،

دلالت کرتے ہیں، او ر یہ چیز زندوں کی طرف سے قربانی ثابت کرتی ہے نہ کہ مردوں کی جانب سے جو ایصال ثواب کا معاملہ پیش آیا۔

امت مرحومہ کے جلیل القدر آئمہ کرام نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے اور ایصال ثواب کی بجائے یہ ثابت کیا ہے کہ پورے گھرانے کی طرف سے ایک ہی قربانی کفایت کر جاتی ہے۔

تفصیل کیلئے دیکھئے،نووی شرح مسلم ص۱۵۶ ج ۲،و تحفة الاحوذی ص۳۵۸،و مرعاة ص ۷۶ ج ۵۔

لیکن مبتدعین کی عیاریاں دیکھئے کہ جو چیز اس سے ثابت ہوتی ہے اسے تو یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ صاف کہتے ہیں کہ پورے گھرانے کی طرف سے ایک قربانی کرنی درست نہیں اور نہ ہی پورے اہل بیت کی طرف سے ایک قربانی کفایت کرتی ہے۔

چنانچہ دشمن توحید و سنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں سے سوال کیا جاتا ہے کہ قربانی ولی کرے تو سب گھر والوں کی طرف سے ہوجائے گی؟

الجواب: ایک قربانی نہ تو سب گھر والوں کی طرف سے ہوسکتی ہے نہ سوا مالک نصاب کے کسی اور پر واجب ہے، فتاوی رضویہ ص ۳۹۲ ج ۸۔

امام طحاوی حنفی نے مذکورہ حدیث کا یہ مفہوم تسلیم کر کے پھر اس کا یہ رد تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے یا آنحضرت ﷺ سے مخصوص ہے، شرح معانی الاثار ص ۳۳۳۔ ج ۲

امام طحاوی کے دعوی نسخ کا رد تو محدث مبارک پوریؒ نے بخوبی کیا ہے، جس کا جواب ممکن نہیں، تحفۃ الاحوذی ص ۳۵۸ ج ۲۔

لیکن ہم نے جو بات یہاں عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کا تعلق ایصال ثواب کی بجائے پورے گھر کی طرف سے ایک قربانی کفایت کرنے سے ہے۔ امام طحاوی نے بھی اس کا یہی مفہوم تسلیم کیا ہے، اگر اسکا ایصال ثواب سے کوئی تعلق ہوتا تو امام طحاوی اس کی صراحت کرتے۔

باقی رہا امت کی جانب سے قربانی کرنا تو یہ آنحضرت ﷺ سے خاص ہے جس کی ضروری تفصیل محدث مبارک پوریؒ نے عرض کر دی ہے جہاں تک راقم کے مطالعہ کا تعلق ہے کسی قابل ذکر عالم نے اس کے جواز کا فتوی نہیں دیا کہ کوئی عامی بھی امت کی طرف سے قربانی کر سکتا ہے امت مرحومہ کا یہ تعامل ثابت کر رہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے خاص ہے۔

رابعاً۔ حنفیہ کا اس حدیث کے بارے میں یہی موقف ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

جیسا کہ امام طحاوی نے، شرح معانی الاثار ص ۳۳۳ ج ۲، میں بیان کیا ہے، تو کیا کسی منسوخ حکم سے بھی استدلال کرنا درست ہے؟

خامساً۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قربانی کرنے والا ذبح کے وقت تکبیر وتسمیہ کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اللھم تقبل منی (یعنی الٰہی میری طرف سے اس قربانی کو قبول کیجئے) مگر مبتدعین جس امام کی تقلید کا دعوی کرتے ہیں میری مراد ان سے ابو حنیفہ ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسے کلمات کا کہنا مکروہ ہے، نووی شرح مسلم ص ۲۵۶ ج ۲۔

امام صاحب کا یہ فتوی باواز بلند کہہ رہا ہے کہ مفتی صاحب کے محل استدلال کے الفاظ کو ان کے مذعومہ پیشوا ماننے کو تیار نہیں۔

مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اپنے امام کے فتوی کے خلاف دعوی کر کے خود کو غیر مقلدوں کی صف میں شامل کر رہے ہیں حالانکہ ان کا قول ہے کہ غیر مقلدیت مردودوں کا راستہ ہے، جاء الباطل ص ۲۵۴ ج ۲۔

یہ بات ہم مبتدعین پر چھوڑتے ہیں کہ مفتی صاحب اپنے امام کی تقلید کو ترک کر کے مردود بن گئے تھے یا نہیں؟ ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

عقلی دلیل

فرماتے ہیں کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے فاتحہ دو عبادتوں کے مجموعہ کا نام ہے تلاوت قرآن اور صدقہ، اور جب یہ دونوں کام علیحدہ علیحدہ جائز ہیں تو ان کو جمع کرنا کیوں حرام ہوگا، بریانی کھانا کہیں بھی ثابت نہیں مگر حلال ہے کیوں اس لئے کہ بریانی چاول گوشت گھی وغیرہ کا مجموعہ ہے، اسکے سارے اجزا حلال تو بریانی بھی حلال، جاء الباطل ص ۲۶۵ ج ا۔

الجواب:

اولاً۔ بحث عرس میں ہم نے اس ضابطہ پر کھل کر بات کی ہے کہ دو چیزوں کے مل جانے سے چونکہ کیفیت بدل جاتی ہے او رکیفیت بدل جانے سے حکم شرعی بھی بدل جاتا ہے، اسے وہاں ہی ملاحظہ کرلیا جائے، رہا مفتی صاحب کا بریانی کی مثال دینا، تو یہ بھی ہمارے موقف کی تائید ہے، بھائی اللہ تعالی آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا کرے، چاول، گھی اور گوشت وغیرہ جب علیحدہ علیحدہ تھے تو بریانی نہ تھی جب ان کا مجموعہ تیار ہوگیا تو اسے بریانی کا نام دے دیا گیا، گویا ان کی صورت بدلنے سے ان کا نام بھی بدل گیا۔

ثانیاً۔ مبتدعین پر لازم ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مردہ کیلئے بطور ایصال ثواب قرآن پڑھنا ثابت کریں، یقین جانئیے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، اسی طرح صدقہ کو دن مقرر کر کے کرنا بھی ان پر آج تک ادھار ہے، حضرت جی یہ تو منفرد بھی ثابت نہیں مگر آپ اس کے مجموعہ کی بات کرتے ہیں، حضرت جی پہلے ان کا انفرادی طور پر کرنا تو ثابت کیجئے، مجموعہ کی بات بعد میں ہوگی۔

اور میت کیلئے قرآن خوانی کی جو روایت آپ نے بحوالہ درمختار پیش کی ہے اسکی حقیقت پہلے عرض کر دی گئی ہے کہ یہ من گھڑت اور افترا علی الرسول کے قبیل سے ہے۔

مفتی صاحب کا ایک سوال

قرآن کریم تو مسلمانوں کیلئے رحمت او رشفاء ہے، شفاء و رحمة للمومنین، پھر اگر اسکی تلاوت کردینے سے کھانا حرام ہوجائے تو قرآن رحمت کہاں رہا، زحمت ہوا، مگر ہاں مومنین کیلئے رحمت ہے کفار کیلئے زحمت۔

ولایزید الظلمین الا خساراً.

اس سے ظالم تو نقصان میں رہے ہیں کہ اس کے پڑھے جانے سے کھانے سے محروم ہوگئے، جاء الباطل ص۲۶۶ ج۱۔

کیا قراۃ قرآن مبتدعین کے لیے رحمت ہے؟

الجواب: اولاً۔ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب نے نہایت غلط بات کہہ کر منکرین بدعات پر کفر کافتوی لگایا ہے، حالانکہ محض قرآن کی تلاوت سے ہم کھانے کو حرام نہیں کہتے بلکہ آپ کی رسومات بدعت ہونے کی وجہ سے حرام کہتے ہیں، کیونکہ یہ دین میں نیا کام ہے اور دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے جیسا کہ ابتدا میں ہم عرض کر چکے ہیں، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جو امام کے پیچھے قرأة کرے اس کے منہ میں آگ ہو، جاء الباطل ص۳۰ ج۲۔

کیوں جناب قرآن تو رحمت ہے آپ اس کی تلاوت سے منہ میں آگ کیسے دے رہے ہیں۔ حالانکہ امام کے پیچھے سورت فاتحہ کی قراتِ واجب ہے۔

فما کان جوابکم فھو جوابنا.

خاکسار کو رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ احمد یار مفتی اعظم اور مفسر قرآن بلکہ حکیم الامت وغیرہ ہوکر بھی غلط بیانی کرتے ہوئے شرم و حیا محسوس نہیں کرتا؟ آیئے مذکورہ آیت قرآن کو ملاحظہ کریں ارشاد ہوتا ہے،

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَاراً،

سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۲،

اور ہم (اللہ) قرآن کو ایمانداروں کی شفا اور رحمت کرتے ہیں اور ظالم اس سے سراسر نقصان ہی اٹھاتے ہیں (ثنائی) ۱۷۔۸۲،

قارئین کرام غور کیجیے اللہ تعالیٰ کیا کہہ رہا ہے اور مفتی کیا بتا رہے ہیں آیئے ہم آپ کو قرآن کے الفاظ کا مفہوم بتائیں، اللہ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا کرے، بریلوی بھائیو ضد اور تعصب کی پٹی اتار کر ملاحظہ کرو،

قرآن کو اللہ نے شفاء و رحمت کہا، کیوں؟ اس لیے کہ جن لوگوں نے کتاب اللہ کو مان کر اسے اپنا دستور العمل بنا لیا ان کے لئے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی، تمدنی، کفر و شرک اور نفاق جیسی ان گنت امراض کا علاج ہے، مگر جو ظالم اسے رد کر کے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں وہ خسارے میں جاتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ قرآن کے نزول سے قبل جب تک وہ اس سے واقف نہ تھے، ان کا خسارہ محض جہالت کا خسارہ تھا مگر قرآن نے نازل ہو کر حق و باطل میں فرق کر دیا تو ان پر اتمام حجت ہوگئی، اب اگر وہ اسے رد کر کے گمراہی پر اصرار کرتے ہیں، تو وہ جاہل نہیں بلکہ ظالم و باطل پرست ہیں، اب ان کی حیثیت جاہل کی نہیں بلکہ اس شخص کی سی ہے جو زہر اور تریاق کو دیکھ کر زہر کا انتخاب کرنے والے کی ہوتی ہے، یہ خسارہ جہالت کا نہیں بلکہ شرارت کا ہے جو بہرحال جہالت کے خسارے سے بڑھ کر ہی ہونا چاہیئے پھر قرآن کے الفاظ میں، ظالم اور خسارہ، کے الفاظ ہیں، ان کی وضاحت بھی ہم ضروری جانتے ہیں، واضح رہے کہ قرآن کی رو سے سب سے بڑھکر ظالم وہ لوگ ہیں، جو اللہ پر افترا کرتے ہیں، جیسا کہ سورہ انعام (آیت ۲۱و۹۳) اور متعدد مقام پر اس مسئلہ کو بیان کیا ہے، ظاہر ہے کہ افترا کا مطلب تو یہی ہے کہ اپنے پاس سے شریعت سازی کر لی جائے اور دین میں وہ مسائل ایجاد کیئے جائیں جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق علیہ السلام نے بیان نہیں کیا، دوسرے لفظوں میں دین میں بدعات ایجاد کی جائیں، یہ محکمہ خیر سے آپ کے پاس ہے، اور آپ نے ہی دین میں بدعات ایجاد کر کے رکھی ہیں،

اور انشاء اللہ بدعت پسند پارٹی ہی خسارے میں رہے گی، کیونکہ قرآن کو قبر پر یا تیجہ وغیرہ پر ختمی ملانے ہی پڑھا تھا اور یہی اس کے لیے قیامت کے روز خسارے کا موجب بن جائے گا، جب یہ لوگ حوض کوثر کی طرف جائیں گے تو انہیں روک دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ کے سوال کرنے پر

فرشتے جواب دیں گے کہ

انک لا تدری ما احدثوا بعدک، بخاری ۴۶۲۵) یعنی آپ ﷺ کو معلوم نہیں تیرے بعد ان لوگوں نے دین میں کیا کیا بدعات ایجاد کرلی تھیں، الحدیث، بخاری ص۶۶۵ ج۲ و مسلم ص۳۸۴ ج۲ اصل خسارہ تو اخروی ہی ہے، دنیا کا خسارہ کوئی خسارہ ہی نہیں، ہم اللہ کے دیئے ہوئے مال سے حلال و طیب کھا کر اپنے مولیٰ حقیقی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں توحید و سنت کی نعمت عظمیٰ سے نوازہ اور قوم کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے بچالیا،

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ کَثِیْراً مِنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، سورہ التوبة آیت ۳۴،

مسلمانو! بہت سے پادری اور درویش ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، (ثنائی) ۹۔۳۴)

وہ دن بھی کیا خوب ہوگا جب اہل توحید بہشت میں ہونگے اور بدعت پسند پارٹی کو حوض کوثر کی طرف جانے سے روک دیا جائے گا،

اور اہل توحید و سنت ان کے اخروی خسارے کو دیکھ کر ان پر قہقے اڑائیں گے،

فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ، عَلَی الْاَرَائِکِ یَنْظُرُوْنَ، هَلْ ثُوِّبَ الْکُفَّارُ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ،

سورہ المطففین آیت ۳۴ تا ۳۶

پس آج ایمان والے ان کافروں پر ہنسیں گے، تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے، کہ کیا اب ان منکروں نے جیسا یہ کرتے تھے، پورا پورا بدلہ پالیا ہے؟ (۸۳ ب ۳۴ تا ۳۶)

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے اس استدلال میں مرزا غلام احمد قادیانی کی پیروی کی ہے وہ اپنی تالیف، کشتی نوح میں لکھتا ہے کہ۔

پھر یہ امت خیر الامم کس وجہ سے ہوئی بلکہ شر الامم ہوئی کہ ہر ایک شر کا نمونہ ان کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا، کیا ضروری نہیں کہ اس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں نظر آوے ص۴۴۔

مرزا جی کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ نبوت رحمت ہے اگر اس امت پر ختم نبوت کا عقیدہ رکھا جائے تو یہ رحمت سے بعید ہو کر شر الامم کہلائے گی۔

کیونکہ برائی تو ان میں ہر ایک موجود ہے جبکہ نبوت جیسی رحمت نہ رہی، حالانکہ متنبی قادیان کو اتنا بھی علم نہیں کہ ہم نبوت کی رحمت سے محروم نہیں بلکہ وہ اتم درجہ ہم میں موجود ہے، تو ہم شر الامم کس طرح ہوگئے، اسی طرح حضرت مفتی صاحب بھی قرآن خوانی کو رحمت قرار دیکر قل کے منکرین کو زحمت کا طعنہ دے رہے ہیں، حالانکہ قرآن کے رحمت ہونے سے انکار نہیں بلکہ قل و دسواں وغیرہ کی رسومات سے انکار ہے، جن کے رحمت ہونے پر مفتی صاحب ابھی تک کوئی دلیل شرعی قائم نہیں کر پائے، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو قرآن کی کسی آیت یا حدیث صحیح سے یہ ثابت کریں کہ قرآن خوانی کا ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے اور مرنے والے کے حق میں وہ رحمت ہو کر اس کی زحمت کو دور کر دیتا ہے، تو ہم اسے قبول کرنے اور اپنے سابقہ موقف کو بدلنے کے لئے تیار ہیں، مگر یاد رہے کہ دنیا بھر کے منکرین سنت اس کا ثبوت سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک نہیں دے سکتے۔

باب۔ نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعا

انسان کی وفات کے بعد اس کیلئے مغفرت کی دعا کرنا حسن سلوک کے قبیل سے ہے اس کیلئے کوئی خاص وقت متعین نہیں، انفرادی صورت میں انسان اس کیلئے جب چاہے دعا کر سکتا ہے اس میں کوئی شرعی روک ٹوک اور برائی نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

ربنا اغفرلی ولوالدی و للمؤمنین یوم یقوم الحساب (ابراھیم آیت ۴۱)

ترجمہ۔ اے ہمارے پروردگار قیامت کے دن مجھے اور میرے ماں باپ کو اور مومنوں کو بخش دے۔۱۴-۴۱۔

والذین جاء و من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رء وف رحیمٌ. (الحشر – ۱۰)

ترجمہ۔(وہ یہ) دعا کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔۵۹-۱۰۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا.

ترجمہ۔ اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں داخل ہوئے اور تمام مومن مرد اور ایمان والی عورتوں کو معاف فرما، اور ظالم لوگوں کیلئے اور زیادہ تباہی بڑھا۔۷۱-۲۸۔

ان آیات کے ساتھ اس فرمان نبوی کو بھی شامل کر لیجئے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة، من صدقة جارية اوعلم ينتفع به، او ولد صالح يدعو له.

جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کیلئے اعمال (کا ثواب) منقطع ہو جاتا ہے مگر تین (عملوں کا ثواب جاری رہتا ہے) صدقہ جاریہ، علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں یا نیک اولاد جو اس کیلئے

(مغفرت کی) دعا کرے۔

صحیح مسلم شریف ص۱۴۱ ج ۲۔

ان نصوص شرعیہ سے ثابت ہوا کہ میت کے حق میں دعا مفید ہے، لیکن اجتماعی طور پر میت کیلئے دعا کا ثبوت صرف نماز جنازہ اور دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر کرنے کی صورت میں ہی ہے۔

جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں رسول اللہ ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس (کی قبر) پر ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کیلئے دعائے مغفرت کرو اور اس کیلئے ثابت قدم رہنے کا سوال کرو اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔

سنن ابی داوٗد مع عون المعبود ص ۲۰۹ ج ۳۔

میت کیلئے ان مواضع کے علاوہ شریعت نے اجتماعی طور پر دعا کا طریقہ نہیں بتایا، چنانچہ کنز الدقائق میں نماز جنازہ کی ترتیب میں لکھا ہے

وھی اربعة تکبیرات بثناء بعد الاولیٰ و صلوٰة علی النبی ﷺ بعد الثانیة و دعاء بعد الثالثة .

یعنی نماز جنازہ کی چار تکبیریں ہیں پہلی کے بعد ثنا دوسری تکبیر کے بعد نبی ﷺ پر درود شریف اور تیسری کے بعد دعا ہو۔

کنز الدقائق مع البحر الرائق ص۱۸۳ ج ۲۔

اہل علم اور احباب عقل وخرد جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خیر القرون کے جملہ مسلمانوں نے لاکھوں جنازے پڑھے پڑھائے مگر مولوی احمد رضا خاں تک کسی فرد واحد سے بھی ثابت نہیں کہ اس نے جنازے کے فوراً بعد مروجہ طریقہ سے اجتماعی طور پر میت کیلئے دعا مانگی ہو۔

انہیں حقائق کے پیش نظر حضرات فقہاء احناف نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس عمل کو مکروہ قرار دیا ہے چنانچہ فقہ حنفی کے نامور امام ابو بکر حامد الحنفی (م ۲۶۴ھ) فرماتے ہیں

ان الدعا بعد صلوٰة الجنازة مکروہ .

یعنی نماز جنازہ کے بعد دعا (مانگنا) مکروہ ہے۔ محیط باب الجنائز و برجندی ص۱۸۰ ج۱۔

مفتی صاحب کا اعتراض

ابو بکر حامد کی جو عبارت پیش کی گئی ہے، یہ قنیہ کی عبارت ہے، مگر قنیہ غیر معتبر ہے مقدمہ شامی بحث رسم المفتی میں ہے کہ صاحب قنیہ ضعیف روایت بھی لیتا ہے اس سے فتویٰ دینا جائز نہیں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے، بذل الجوائز، میں فرمایا کہ قنیہ معتزلی بد مذہب تھا، اگر قنیہ کی عبارت صحیح مان لی جائے تو خود مخالفین کے بھی خلاف ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا منع ہے تو بعد دفن بھی دعا ناجائز ہونا چاہیئے کیونکہ یہ وقت بھی نماز کے بعد ہی ہے۔ جاء الباطل ص۲۸۱۔

/

کیا کلام الٰہی کے علاوہ ہر کتاب کا ہر کلمہ قطعی حق ہوتا ہے؟

الجواب: اولاً ہم نے قنیہ سے نقل ہی نہیں کیا تاکہ یہ بہانہ نہ بنایا جا سکے، اور علماء نے صراحت کی ہے کہ جب قنیہ کی مطابقت مل جائے تب اس کی روایات پر عمل جائز ہے، مولانا عبد الحی لکھنوی فرماتے ہیں

صرح ابن و هبان وغیره انه معتزلی الاعتقاد حنفی الفروع وتصانیفه غیر معتبرة مالم یو جد مطابقتها لغیرها.

یعنی ابن وھبان وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ صاحب قنیہ اعتقاد میں معتزلی تھا اور فروع میں حنفی، اور اس کی کتب غیر معتبر ہیں جب تک اس کی کوئی دوسرا مطابقت نہ کرے، الفوائد البھیہ ص۲۱۳۔

علامہ لکھنوی کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ قنیہ کا صرف وہی حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی دوسرے فقہاء نے تائید نہ کی ہو۔

خود مفتی صاحب کے ہاں تو قنیہ کلی طور پر معتمد علیہ ہے چنانچہ انہوں نے آنے والے کیلئے تعظیماً قیام کی مشروعیت کو قنیہ سے ہی نقل کیا ہے دیکھئے جاء الباطل ص ۲۵۰ جلد اول، سوال یہ ہے کہ

مبتدعین کیلئے تعظیمی قیام میں آخر وہ ثقہ ومعتبر کیوں ہے؟

علاوہ ازیں راقم عرض کرتا ہے کہ کتاب اللہ کے علاوہ اور کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے مضامین کا ہر ہر لفظ اور فقرہ قطعاً حق وثواب اور واجب الاتباع ہو، خیر القرون سے لیکر تا حال علماء نے دینی کتب تحریر کی ہیں، مگر کسی ایک نے بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ اس کا ہر ایک جملہ قطعی حق اور واجب الاتباع ہے، اور اس میں شک کرنے والا کافر اور دین اسلام سے خارج ہے، کیونکہ یہ مقام تو کتاب اللہ کا ہے۔

جس کو اللہ تعالی نے جبریل امین علیہ السلام کے واسطے سے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل فرمایا۔ در مختار میں ہے

ویابی الله العصمة ، لکتاب غیر کتابه،

یعنی عصمت کو اللہ نے کسی کتاب کیلئے مقرر ومعین نہیں فرمایا سوائے اپنی کتاب کے۔

اس کی شرح میں ابن عابدین شامی فرماتے ہیں،

وهذا اعتذار منه رحمه الله تعالى ، اى إن هذا الكتاب وان كان مشتملا على ماحرره المتأخرون و على التحقيقات المذكورة لكنه غير معصوم، اى غير ممنوع من وقوع الخطأ والسهو فيه، فان الله تعالى لم يرض، اولم يقدر العصمة لكتاب غير كتابه العزيز الذى قال فيه ، لايأتيه الباطل من بين يديه ولامن خلفه فغيره من الكتب قد يقع فيه الخطا والزلل لأنها من تاليف البشر والخطأ والذلل من شعارهم.

یعنی صاحب دُر کا قول مذکورہ اپنی طرف سے عذر ہے ان کا مقصود یہ ہے کہ میری کتاب گو متاخرین کی تحریرات اور تحقیقات پر مشتمل ہے لیکن پھر بھی سہو ونسیان سے محفوظ نہیں اس لئے کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب کیلئے مقرر نہیں فرمایا کہ اس کے آگے پیچھے سے باطل نہیں آسکتا اس کی کتاب کے علاوہ جتنی کتب ہیں سب میں خطا و زلل واقع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ کتابیں بشر کی تالیفات سے ہیں اور وہم نسیان بشریت کا شعار ہے۔

(فتاوی شامی ص ۲۷ ج ۱۔)

یہ عبارت اس بات کی برہان واضح ہے کہ بشر کی تصنیف کردہ کتاب اغلاط سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی کہ یہ شان کتاب اللہ کی ہے اور اگر کوئی شخص کسی بشری تصنیف کو قطعی حق اور غلطی سے پاک مانتا ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں اسے کلام الٰہی قرار دے رہا ہے علامہ شامی نے مذکورہ عبارت کیساتھ ہی ، تنبیہ، کے عنوان سے ، علامہ عبد العزیزؒ کی شرح اصول بزدوی سے نقل کیا ہے۔

إني صنفت هذه الكتب فلم آل فيها الصواب ولا بد أن يوجد فيها ما يخالف كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺ قال الله تعالى لو كان من عند غير الله لو جدوا فيه اختلافا كثيراً ، فما و جد تم فيها مما يخالف كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺفاني راجع عنه إلى كتاب الله تعالى و سنة رسوله ﷺ، قال المزنى قرأة كتاب الرسالة على الشافعي ثمانين مرة فما من مرة الاو كان يقف على خطأ فقال الشافعي هيه ، ابى الله ان يكونا كتاباً صحيحا غير كتابه.

یعنی امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں حق وصواب کو بیان کرنے کی کمی نہیں کی پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ان میں ایسی چیز پائی جائے گی جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے خلاف ہو کہ اللہ تعالی کا کہنا ہے کہ اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پایا جاتا لہذا اگر میری کتب میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف پایا جائے تو میں یقیناً ان سے رجوع کرنے والا ہوں۔

امام مزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے اپنے استاذی المکرّم امام شافعیؒ کے سامنے انکی کتاب الرسالۃ (جو انہوں نے اصول پر تصنیف کی ہے) کو اسی ۸۰ بار پڑھا تو ہر بار وہ خطا پر مطلع ہوئے پھر حضرت امام نے فرمایا ھیٰاۂ اللہ تعالی نے کسی کتاب کے صحیح ہونے کو مقرر ومعین نہیں فرمایا سوائے اپنی کتاب کے، فتاوی شامی ص ۲۷ ج ۱۔

ان اکابرین کی تصریحات میں اس بات کی واضح صراحت ہے کہ کسی بشری تصنیف میں غلطی کا نہ ہونا ناممکن ہے لہذا اگر قنیہ میں چند ایک روایات حنفیہ کے مخالف ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کلی طور پر ناقابل قبول ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا لفظ ، بعد، سے یہ کشید کرنا کہ قبر پر دعا بھی تو نماز کے بعد ہی ہے، تو

یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ، بعد، کا معنی پیچھے ہوتا ہے جو کہ قبل کی ضد ہے، المفردات ص ۵۳۔

آئمہ لغت نے صراحت کی ہے یہ (ساتھ) کے معنی میں بھی آتا ہے علامہ مرتضی زبیدیؒ فرماتے ہیں

وتاتی بمعنی مع کقوله تعالی فمن اعتدی بعد ذلک، ای مع ذلک.

یعنی بعد کا لفظ ساتھ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اللہ رب العزت کا فرمان ہے

فمن اعتدی بعد ذلک.

میں بعد بمعنٰی ساتھ ہے۔

تاج العروس من جواہر القاموس ص ۳۰۲ ج ۲۔

علامہ فیومی فرماتے ہیں

وتانیٰ بمعنی مع کقوله تعالی، عتل بعد ذلک، ای مع ذلک.

یعنی یہ کبھی ساتھ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے اللہ رب العزت کا قول

عتل بعد ذلک

(اس کے ساتھ ساتھ وہ حرامی بھی ہے۔)

میں بعد ساتھ کے معنی میں آیا ہے۔ المصباح المنیر ص ۵۳ ج ۱۔

منجد میں ہے

و تاتی بعد بمعنی حتیٰ الان،

یعنی یہ لفظ بعد ازاں کے معنی میں بھی آتا ہے۔ منجد ص ۲۰۶۔

لیجیے جناب اس موخر الذکر حوالے نے سارے معاملات ہی حل کر دیئے کہ یہ لفظ متصل کے معنی میں بھی آتا ہے،

فقہائے احناف کی صراحت

اب ہم پھر اپنے اصل مقصد کی طرف عود کرتے ہوئے فقہاء احناف کے مزید اقوال نقل کرتے ہیں۔

امام شمس الائمہ حلوائی الحنفی (المتوفی ۴۵۴ھ) اور بخارا کے مفتی و قاضی علامہ شغدی الحنفی (المتوفی ۴۶۱ھ فرماتے ہیں کہ

(۲) لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ. قنیہ ص ۵۶ ج ۱.

نہ ٹھہرے کوئی شخص نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے۔

امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی (المتوفی ۴۵۲ھ لکھتے ہیں کہ

(۳) لایقوم بالدعاء فی قرأۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ و قبلھا، خلاصۃ الفتاوی ص ۲۲۵ ج ۱

نہ دعا مانگی جائے میت کیلئے قرآن پڑھکر نماز جنازہ سے پہلے اور بعد میں،

علامہ سراج الدین اودی الحنفی (المتوفی فی حدود ۷۰۰ھ) لکھتے ہیں

(۴) اذا فرغ من الصلوٰۃ لایقوم بالدعاء . فتاوی سراجیہ ص ۲۳

جب نماز جنازہ سے فارغ ہوجائے تو دعا کے واسطے نہ ٹھہرے۔

امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفی (م ۸۲۷ھ) فرماتے ہیں

(۵) لایقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ دعا مرۃ . فتاویٰ ھندیہ ص ۲۸۳ ج ۱.

نہ ٹھہرے نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کیونکہ اس نے ایک مرتبہ (نماز جنازہ کے اندر) دعا کر لی ہے۔

امام شمس الدین محمد خراسانی کوھستانی الحنفی (م ۹۲۴ھ) لکھتے ہیں کہ

(۶) ولا یقوم داعیا لہ ، جامع الرموز ص ۱۲۵ ج ۱.

اور (نماز جنازہ کے بعد) نہ ٹھہرے میت کیلئے دعا مانگنے کے واسطے۔

علامہ ابن نجیم الحنفی کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں

(۷) ولا یدعوا بعد التسلیم ، البحر الرائق ص ۱۸۳ ج ۲.

نہ دعا کرے نماز جنازہ سے سلام پھیرنے کے بعد۔

مفتی محمد نصیر الدین الحنفی لکھتے ہیں کہ

(۸) و بعد ایستادہ نماند برائے دعا، فتاوی برهنه ص ۳۶

اور بعد نماز جنازہ کے دعا کرنے کیلئے نہ ٹھہرے۔

ملا علی القاری الحنفی (م ۱۰۱۴ھ) مشکوٰۃ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ۔

(۹) ولایدعوا للمیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانہ یشبہ الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ.

نہ دعا کرے میت کیلئے نماز جنازہ کے بعد کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔ مرقاۃ ص ۶۴ ج ۴ وحاشیہ مشکواۃ ص ۱۴۷

مفتی سعد اللہ صاحب الحنفی (م ۱۲۹۴ھ) لکھتے ہیں۔

(۱۰) خالی از کراهت زیر انکه اکثر فقها بوجه زیادة بودن بر امر مسنون منع میکنند، فتاوی سعدیه ص ۱۳۰.

یعنی جنازہ کے بعد دعا کراہت سے خالی نہیں کیونکہ اکثر فقہاء اس وجہ سے منع کرتے ہیں کہ یہ امر مسنون سے زائد ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں

(۱۱) بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے، نفع المفتی والسائل ص ۶۱۔

نواب قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں

(۱۲) اور دعا نہ کرنا میت کیلئے بعد نماز جنازہ کے اس لئے کہ یہ مشابہ ہوتا ہے ساتھ زیادتی کے نماز جنازہ میں، (مظاہر حق ص ۵۵ ج ۲۔) مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۴ء

عبارات فقہاء پر مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہو۔ جاء الباطل ص ۲۸۰۔

الجواب

مفتی صاحب کو جھوٹ لکھتے وقت ذرا بھر شرم نہیں آئی کہ فقہاء کی عبارات میں تو، بعد صلوٰۃ الجنازہ، کے الفاظ لکھتے ہیں، دیکھئے نمبر ۱، ۲، ۳ و ۵ و ۹۔ اذا فرغ من الصلوٰۃ، دیکھئے نمبر ۴، اور ، بعد التسلیم ، دیکھئے نمبر ۷) کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی صاحب کمال عیاری سے چوتھی تکبیر کے بعد او رسلام پھیرنے سے پہلے پر محمول کر رہے ہیں جو کہ ان کی سینہ زوری ہے۔

دوسرا اعتراض

دوم یہ کہ دعائیں زیادہ لمبی نہ ہوں جس میں دفن میں بہت تاخیر ہو۔

جاء الباطل ص ۲۸۰۔

الجواب

اولاً۔ اس اعتراض میں مفتی صاحب کو یہ مُسلّم ہے کہ عبارات فقہاء کا تعلق نماز جنازہ کے بعد سے ہے۔

ثانیاً۔ مفتی جی نے ہی لکھا ہے کہ بعد نماز جنازہ دعا جائز بلکہ سنت ہے جاء الباطل ص ۲۸۱، بتایئے اگر یہ مسنون ہے تو اس کیلئے تاخیر کیوں درست نہیں؟

ثالثاً۔ فقہاء احناف میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعاؤں سے ہے اور مختصر قسم کی دعائیں جائز ہیں، یہ مولوی احمد رضا کا خود گھڑا ہوا فلسفہ ہے اور مفتی صاحب نے بغیر سوچے سمجھے اندھے مقلد کی طرح پلے باندھ لیا ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرے یہ کہ اسی طرح صف بستہ بحثیت نماز دعا کی جاوے کہ دیکھنے والا سمجھے نماز ہو رہی ہے، یہ زیادتی کے مشابہ ہے لہذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کراھت جائز ہے، جاء الباطل ص ۲۸۱۔

الجواب

اولاً۔ لایقوم بالدعاء، کا یہ معنی کرنا کہ کھڑے ہو کر دعا نہ کرے مفتی صاحب کا انتہاء درجے کا مغالطہ یا قلت فہم کا نتیجہ ہے، کیونکہ یہاں فقط ،یقوم، ہی نہیں بلکہ ،یقوم بالدعا، ہے اور قام یقوم، جب باء کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے، قائم رہنا، کسی چیز پر استقامت اختیار کرنا، قرآن میں ہے۔

قام کے معنی پر آئمہ لغت کی تصریحات راقم نے دین الحق کی جلد اول ص ۵۹۰ میں، جمع بین الصلوٰتین، میں مفتی صاحب کی چوتھی دلیل کے جواب میں، اقامت کا معنی و مفہوم، کے زیر عنوان پیش کردی ہیں مزید تفصیل مقصود ہو تو وہاں ملاحظہ فرمائیں اس مقام پر بھی اتمام حجت کیلئے اس معنی کی وضاحت کردی جاتی ہے تا کہ بریلویت کے حکیم الامت مفسر قرآن اور مفتی اعظم کا علمی حدود اربعہ بخوبی معلوم ہو جائے،

علامہ فیومی (المتوفی ۷۷۰ھ) فرماتے ہیں

قام بالامر یقوم به قیام فهوقوام وقائم و استقام الامور (، المصباح المنیر ص ۵۲۰ ج ۲.)

الغرض ۔ لایقوم بالدعاء، کا لغوی معنی ہوگا دعا قائم نہ کرے اس کیلئے ٹھہرے نہ، بلفظ دیگر دعا نہ مانگے۔

ثانیاً فقہاء کرام کی عبارات میں لایقوم، ہی نہیں (جس سے یہ مغالطہ دیا جاسکے کہ نفس دعا سے منع نہیں کر رہے بلکہ کھڑے ہو کر دعا کرنے سے منع کیا ہے) بلکہ ان میں سے، البحر الرائق، کے الفاظ تو، لایدعوا بعد التسلیم، ہیں ان میں تو مطلق دعا کی نفی کی گئی ہے، خواہ کھڑے ہو کر کی جائے یا صف بستہ اس کو ادا کیا جائے یا صفوف توڑ کر وقفہ سے مانگی جائے یا اور کسی بھی حالت میں ہو کیونکہ، لایدعوا، عام ہے۔

مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل

مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنازہ فصل ثانی میں ہے

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء

جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اسکے لئے خالص دعا مانگو۔

ف، سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دعا کی جاوے بلا تاخیر جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کیلئے دعا مانگو وہ ف کے معنی سے غفلت کرتے ہیں صلیتم شرط ہے اور فاخلصوا،

اس کی جزا، شرط اور جزا میں تغایر چاہے نہ یہ کہ اس میں داخل ہو، پھر صلیتم ماضی ہے اور دعا کا حکم نماز پڑھ چکنے کے بعد ہے۔

الجواب

اولاً۔ اسکی سند میں محمد بن اسحاق امام مغازی ہیں، سنن ابو داؤد ص۱۰۰ ج۲، و بیہقی ص۴۰ ج۴، و ابن ماجہ، وغیرہ گو ہمارے اہل حدیث کے نزدیک ثقہ ہیں مگر احناف انہیں دجال و کذاب اور نامعلوم کیا کیا کہتے ہیں، مگر یہاں اس کی روایت سے استدلال کر لیا ہے، اسے عیاری کہیں یا کہ مکاری یا خودغرضی سے تعبیر کریں، جو مزاج یار میں آئے۔

ثانیاً۔ مفتی جی آپ بوجہ پیرانہ سالی ایک بات بھول گئے ہیں وہ یہ کہ جب اذا ماضی پر داخل ہوتا ہے تو وہ اسے خالص استقبال کے لئے کر دیتا ہے، شرح جامی میں ہے،

و منها اذا وهی اذا كانت زمانية للمستقبل ای للزمان المستقبل وان كانت داخلة علی الماضی.

اور (ظروف مبنیہ) میں سے اذا ہے جب وہ زمانیہ ہو تو استقبال کیلئے ہوگا اگر چہ ماضی پر داخل ہوا ہو، شرح جامی ص۲۳۶ طبع دھلی ۱۲۶۹ھ۔

مثلاً لفظ جاء، ماضی ہے لیکن جب اس پر، اذا، آجائے گا تو خالص استقبال کیلئے ہو جائے گا، قرآن میں ہے،

اذا جاء نصر الله والفتح. (النصر آیت ۱)

ترجمہ۔ جب اللہ کی مدد اور فتح آئے، (احمد رضا خاں)

ماضی کو مضارع کے معنی میں قرآن میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے، دیکھئے البقرہ ۱۴، التکویر آیت ۱) العنکبوت ۴۸ وغیرہ۔

اور مذکورہ حدیث میں لفظ صلیتم (جو کہ ماضی ہے) سے قبل حرف اذا آیا ہے لہذا معنی اس حدیث کا یہ بنے گا کہ جب تم نماز جنازہ پڑھو تو میت کیلئے خلوص دل سے دعا کرو۔

چنانچہ احناف کے سرخیل او رمبتدعین کے معتمد علیہ مولانا عبد الحق محدث دھلوی مرحوم اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

چوں نماز گزا رید بر میت پس خالص کنید برائے وے دعا، اشعة اللمعات ص ۷۳۱ ج ا طبع مکتبه نورانی پشاور،

حضرت شیخ نے ،اذا صلیتم، کا معنی

چوں نماز گزارید، کیا ھے گزارید گزادن، گزاریدن، گزاشتن،

مصادر سے مضارع جمع حاضر کا یا امر جمع حاضر کا صیغہ ہے،یعنی جب تم نماز ادا کرو یا پڑھو الخ اگر اس کا وہ ترجمہ ہوتا جو حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن جناب مفتی اعظم الحاج احمد یار خان نے کیا ہے، جب تم نماز پڑھ لو......تو شیخ کی عبارت اس طرح ہوتی،

چوں نماز گزاریدیه برمیت،

یعنی جب نماز ادا کرلو یا پڑھ لو۔مزید دیکھئے، دین الحق ص ۶۸۵ ج ا، یہ حدیث بالکل اس حدیث کی طرح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ، اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم، الحدیث مسلم ص ۱۷۴ ج ا، وابوداؤد مع عون ص ۳۶۷ ج ا وغیرہ، اس کا معنی مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی اس طرح کرتے ہیں، جب تم نماز پڑھنے لگو تو سب سے پہلے اپنی صفیں درست کرو، شرح صحیح مسلم ص ۱۱۶۶ ج ا

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا حرف فا پر موشگافی کرنا تو اس کا جواب مولانا سرفراز خاں صاحب نے بہت اچھا دیا ہے آپ فرماتے ہیں، مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہے تو یہ مسلم ہے کہ یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے،

فاذا طعمتم فانتشروا،

میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ، اور کبھی یہ تغایر جزو کل کا ہوتا ہے جیسے،

و اذا قرأة القرآن فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم،

مطلق قرآن کا پڑھنا کل ہے اور صرف،

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم،

کا پڑھنا جزو ہے ، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اعوذ باللہ الخ قرآن کریم کے بالکل مغایر ہے اسی طرح کبھی یہ تغایر اطلاق وتقید کا ہوتا ہے جیسے،

اذا سالتمو ھن متا عا فاسئلو ھن من ورآء حجاب،

میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ، من وراء حجاب، کے ساتھ مقید ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اس سوال کے بالکل متغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی بھی اہل علم پر یہ مخفی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا ہے کہ مطلق نماز جنازہ (جس میں فاتحہ اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور با وضو ہو کر قبلہ رخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ سبھی کچھ ہے) کل ہے اور میت کیلئے دعا جزو ہے، اور شرط و جزا کیلئے اتنا تغایر کافی ہے اور اگر مفتی صاحب اذا قمتم الی الصلوٰۃ (الایۃ) اور اذا قرأۃ القرآن (الایۃ) اور اذا سالتمو ھن (الایۃ) وغیرہ میں ارادہ وغیرہ مقدر تسلیم کرتے ہیں وہ فرمائیں کہ اذا صلیتم علی المیت (الحدیث) میں ارادہ کے نکالنے سے کیا چیز مانع ہے؟ وجہ فرق بین ہونی چاہے۔

الغرض یہ مفتی صاحب کے صواب دید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدر نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کرلیں یا جزو، وکل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں، یہ ان کی مرضی ہے، باقی حرف الی نماز کے قیام کیلئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر بخوف طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ف سے تاخیر ہی معلوم ہوئی، حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، تو یہ ان کا کہنا اصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔

اولاً۔ اس لئے کہ جیسے تاخیر وتعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبی بھی ہوتی ہے اور جزا کیلئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے شرط سے متاخر ہو، بلکہ بسا اوقات جزا شرط کیلئے علت ہوتی ہے اور علت کا معلول پر مقدم ہونا ایک بین امر ہے، علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ،

اذا الجزأ قد تکون علۃ للشرط کان وجد النھار فالشمس طالعۃ، شرح تلویح ص ۱۴۲،

کبھی جزا شرط کیلئے علت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال (وان وجد النھار فالشمس طالعۃ) اگر دن موجود ہے تو اس لئے کہ سورج نکل چکا ہے۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ میت کیلئے نماز جنازہ میں دعا کی جاتی ہے تو وہ ثناء اور درود شریف کے بعد

کی جاتی ہے اوراس میں جملہ جزائیہ کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقق ہے اور علماء نے تصریح کی ہے۔

التراخی بزمان وان قل، هامش تلویح ص ۲۴۱،

کہ تراخی بہت قلیل زمانہ میں بھی متحقق ہو جاتی ہے، راہ سنت ص ۲۱۶۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

اسی مشکوٰۃ میں اسی جگہ ہے

قراء علی الجنازہ بفاتحة الکتاب،

حضور علیہ السلام نے جنازہ پر سورۃ فاتحہ پڑھی، اس کی شرح میں

اشعۃ اللمعات میں ہے۔ **و احتمال دارد کہ برجنازہ بعداز نماز یا پیش از از بقصد تبرک خوانده باشد چنانکه آلان متعارف است،**

ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورۃ فاتحہ نماز کے بعد یا نماز سے پہلے برکت کیلئے پڑھی ہو جیسا کہ آج کل رواج ہے، جاء الباطل ص ۲۷۵۔

الجواب

اولاً۔ مذکورہ عبارت سے قبل شیخ فرماتے ہیں کہ

ظاهر آن است که مراد قرأة فاتحه درنماز جنازه باشد،

اس حدیث کا ظاہر یہی ہے کہ فاتحہ کو نماز جنازہ کے اندر پڑھا، اشعۃ اللمعات ص ۶۳۱ ج ۱۔

جب حضرت محدث دھلوی مرحوم کو اس کے اصلی و حقیقی معنی کا اقرار ہے کہ مراد اس سے نماز جنازہ کے بیچ میں فاتحہ پڑھنا ہے تو اب ان حقیقی و اصلی معنی کو ترک کرنے کی ان کے پاس کیا دلیل ہے، محض احتمال تو کوئی دلیل نہیں، جبکہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، جاء الباطل ص ۲۷۴۔

پھر حضرت محدث دھلوی تو برکت کا احتمال پیش کرتے ہیں، جسے مفتی صاحب کھینچ تان کے دعا بنا رہے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مگر یہ چیزیں بریلوی مکتب فکر کے حکیم

الامت اور مفسر قرآن کو کون سمجھائے۔

ثانیاً۔ یہ روایت ہی ضعیف ہے خود مفتی صاحب فرماتے ہیں

یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ اس کی اسناد میں ابراھیم بن عثمان واسطی ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے، جاء الباطل ص۲۴۳ ج ۲۔

مفتی صاحب نے اس حدیث کو یہاں تو استدلال میں پیش کرلیا ہے، جب کہ جاء الباطل کے حصہ دوم میں اسکوخود ہی ضعیف قرار دیا ہے، چونکہ وہاں تو مخالفین کے دلائل میں اس کا ذکر تھا او یہاں اسے اپنی دلیل کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا لہذا خاموشی اختیار کر لی ہے، تف ہے ایسی دیانت داری پر اور، لعنت ہو ایسی عصبیت پر، اللہ رب العزت بچائے اس جیسی ہیرا پھیری کرنے سے اور دین کے معاملہ کو کھیل کود بنانے سے آمین یا الہ العالمین۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

فتح القدیر کتاب الجنائز باب صلوٰۃ الجنائز میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے منبر پر قیام فرما کر غزوہ موتہ کی خبر دی اور اسی اثناء میں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی،

فصلی علیه رسول الله ﷺ و دعا له و قال استغفروا له،

پس اس پر نماز جنازہ پڑھی اور ران کیلئے دعا فرمائی او رلوگوں سے فرمایا کہ تم بھی ان کیلئے دعائے مغفرت کرو۔

دعا کے واؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا نماز کے علاوہ تھی۔

مواھب الدنیہ جلد دوم القسم الثانی (فیما اخبر الغیوب) میں یہی واقعہ نقل فرما کر کہا،

ثم قال استغفروا استغفروا، جاء الباطل ص ۲۷۵ ج ۱

<u>الجواب</u>: اولاً۔ بلاشبہ امام ابن ھمام نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر ص۸۰ ج۲ میں اس روایت کو درج کیا ہے، مگر باب کا عنوان، فصل فی الصلوٰۃ علی المیت، ہے، علی الجنازہ، نہیں ہے،

ثانیاً۔ یہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے حالانکہ احناف کے نزدیک مسجد نبوی بلکہ تمام مساجد میں جنازہ جائز نہیں، ھدایہ، میں ہے کہ،

ولا یصلی علی میت فی مسجد، یعنی مسجد میں نماز جنازہ نہ پڑھا جائے، ھدایہ مع فتح القدیر ص۹۰ ج۲۔

دشمن توحید وسنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے،

جنازہ مسجد میں رکھ کر اس پر نماز مذہب حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔

العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویۃ ص۵۷ ج۴،

ثالثاً۔ حنفیہ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ ناجائز اور حرام قطعی ہے، چنانچہ بریلوی مکتب فکر کے باوا آدم مولوی احمد رضا خاں نے خاص اس مسئلہ کے رد میں

النھی الحاجز عن تکرار صلاۃ الجنائز،

اور

الھاذی الحاجب عن جنازۃ الغائب،

کے عنوان سے دو عدد رسائل لکھے ہیں جو اس کے فتاوی کی جلد چہارم میں مندرج ہیں، موخر الذکر میں خاں صاحب نے دو سو تیس دلائل کتب فقہ حنفیہ سے اسکے عدم جواز پر دیئے ہیں ص۶۸ ج۴۔

اگر مفتی صاحب مذکورہ روایت سے نماز جنازہ کے بعد دعا ثابت کرتے ہیں تو اسی روایت سے جنازہ غائبانہ ثابت ہوگا، جو کہ مفتی جی کے تقلیدی مذہب میں ناجائز ہے۔**فما کان جوابکم فھو جوابنا،**

رابعاً۔ افسوس کہ مفتی جی نے فتح القدیر سے روایت کے الفاظ تو نقل کر لئے ہیں، لیکن آگے جو امام ابن ھمام نے اس روایت پر جرح کی تھی، اسے بے ڈکار ہضم کر گئے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں

وھذا مع ضعف الطرق فما فی المغازی مرسل من الطریقین و مافی الطبقات ضعیف بالعلاء وھو ابن زید و یقال ابن یزید اتفقوا علی ضعفہ،

یعنی مغازی واقدی میں یہ روایت مرسل طرق سے مروی ہے پھر اس کے ساتھ ضعیف بھی ہے اور طبقات ابن سعد میں علاء (کے سبب ضعیف) ہے اور وہ ابن زید (ہے) اور رکہا جاتا ہے کہ وہ ابن

یزید ہے اس کے ضعیف ہونے پر تمام متفق ہیں، فتح القدیر ص۸۱ ج ۲۔

علامہ ابن ھمام کے علاوہ ملا علی القاری حنفی نے مشکوٰہ کی شرح، مرقاہ ص۴۶ ج ۴ میں، علامہ حلبی حنفی نے منیۃ المصلی کی شرح غنیۃ المستملی ص۵۸۴ میں علامہ زیلعی حنفی نے تخریج ھدایہ، نصب الرایہ ص۲۸۴ ج ۲ میں، اور مبتدعین کے پیرو مرشد مولوی احمد رضا خان بریلوی نے، الھادی الحاجب عن جنازۃ الغائب، میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھئے فتاوی رضویہ ص۴۳ ج ۴۔

اس کے غیر معتبر ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں (۱) یہ مرسل ہے اور مراسیل محدثین کے ہاں ضعیف ہیں، دیکھئے دین الحق ص۶۵ (۲) اس کی سند میں واقدی ہے جو کہ کذاب روای ہے، دین الحق ص۸۶ (۳) واقدی کا استاذ عبدالجبار ہے جو کہ مجھول ہے، میزان الاعتدال ص۵۳۴ ج ۲۔

جس روایت کی سند میں ایک راوی کذاب، دوسرا مجھول ہو، اور اس کا طریق بھی مرسل ہو، اس کے ضعیف و متروک ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

خامساً۔ اس میں جنازہ کا ذکر نہیں بلکہ فقط دعا کا بیان ہے چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ایک صفحہ بھر میں اس بحث کو لکھا ہے آخر اپنے راگ کی تان اس پر توڑ تا ہے کہ باجماع فریقین یہاں صلاۃ بمعنی دعا ہے، ملخصاً فتاوی رضویہ ص۴۷ ج ۴۔

جب اصل نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب، امید ہے کہ مبتدعین اپنے پیرو مرشد کی گواہی پر مطمئن ہو جائیں گے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

منتخب کنز العمال کتاب الجنائز میں ابراھیم ہجری سے روایت کرتے ہے

قال رائیت ابن ابی اوفی و کان من اصحاب الشجرۃ ماتت ابنته الی ان قال ثم کبر علیھا اربعاً ثم قال بعد ذلک قدر مابین التکبیر تین وقال رائیت رسول اللہ ﷺ کا ن یصنع ھکذا۔

میں نے ابن ابی اوفی کو دیکھا یہ بیعت الرضوان والے صحابی ہیں کہ ان کی دختر کا انتقال ہوا پھر ان پر چار تکبیریں کہیں پھر اس کے بعد دو تکبیروں کے فاصلہ کی بقدر کھڑے ہو کر دعا کی اور فرمایا

میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا، جاء الباطل ص ۲۷۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس حدیث سے مبتدعین کے حکیم الامت کا بعد نماز جنازہ کی دعا پر استدلال کرنا معنوی تحریف ہے کیونکہ اس میں جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دعا کا بیان نہیں بلکہ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے دعا کا بیان ہے، مسند احمد میں ہے کہ

ثم کبر علیھا اربعاً ثم قام بعد الرابعة قدر مابین التکبیر تین یدعو، الحدیث.

(عورتوں کو صبر کی تلقین کے بعد) پھر عبد اللہ بن ابی اوفی نے نماز جنازہ پر چار تکبیریں کہیں پھر چوتھی تکبیر کے بعد دو تکبیروں کی مقدار آپ ٹھہرے اور دعا کی (بیٹی کیلئے) الحدیث مسند احمد امام احمد ص ۳۵۶ ج ۴۔

مستدرک حاکم کی روایت میں ہے

ثم صلی علیھا فکبر علیھا اربعاً ثم قام بعد الرابعة قدر ما بین التکبیرتین یستغفر لھا ویدعوا. الحدیث

اس کے بعد آپ نے بیٹی پر نماز جنازہ پڑھا اور چار تکبیریں کہیں اور چوتھی تکبیر کے بعد آپ دو تکبیروں کی مقدار کھڑے رہے (اور بچی کیلئے) استغفار اور دعا فرماتے رہے۔ مستدرک حاکم ص ۳۶۰ ج ۱

اب بھی اگر کسی بدعتی کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ اس بات پر ہی بضد ہے کہ جنازہ کے بعد ہی دعا کی گئی تھی تو وہ اٹھائے بیہقی شریف جس میں مذکورہ روایت سے بھی بڑھکر صراحت ہے۔

امنا عبداللہ بن ابی اوفی علی جنازة ابنته فکبر اربعا فمکث ساعة حتی ظننا انه سیکبر خمسا ثم سلم عن یمینه و عن شماله.

یعنی عبداللہ بن ابی اوفی نے ہمیں اپنی بیٹی کی نماز جنازہ کی امامت کرائی جس میں انہوں نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے حتی کہ ہم نے خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے مگر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

السنن الکبریٰ ص ۴۳ ج ۴، و ریاض الصالحین ص ۲۵۵، واللفظ لہ

اس روایت نے مبتدعین کی جملہ تاویلیں اور ہیرا پھیریوں پر پانی پھیر دیا ہے، یہی روایت سنن ابن ماجہ میں قدرے الفاظ کے اختلاف سے مروی ہے کہ

صليت مع عبدالله بن ابی اوفی الاسلمی صاحب رسول الله ﷺ علی جنازة ابنة له فكبر عليها اربعا فمكث بعد الرابعة شيئا قال سمعت القوم يسبحون به من نواحی الصفوف فسلم ثم قال اكنتم ترون انی مكبر خمسا قالوا تخوفنا ذلك قال لم اكن لافعل و لكن رسول الله ﷺ كان يكبر اربعا ثم يمكث ساعة فيقول ماشاء الله ان يقول ثم يسلم، ص ۱۰۹/

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی عبداللہ بن ابی اوفی کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی ان کی بیٹی پر، تو انہوں نے چار تکبیریں کہیں، پھر چوتھی تکبیر کے بعد ذرا ٹھہرے، میں نے لوگوں سے سنا کہ وہ صفوں کے کناروں سے سبحان اللہ کہہ رہے تھے (اس وجہ سے شاید عبداللہ بھول گئے ہیں) آخر انہوں نے سلام پھیر دیا پھر کہا کیا تم سمجھتے تھے کہ میں پانچ تکبریں کہوں گا؟ مقتدیوں نے کہا ہم اسی سے ہی ڈرے، عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں ایسا کرنے والا نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ چار تکبیریں کہتے تھے پھر تھوڑی دیر ٹھہرتے اور جو اللہ کو منظور ہوتا وہ کہتے پھر سلام پھیرتے۔

سنن ابن ماجه كتاب الجنائز باب ماجاء فی التكبير علی الجنائزة اربعاً .

اس روایت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے اور مفتی صاحب کے استدلال بلکہ خیانت و بے ایمانی کا ایسا کچومر نکالا ہے کہ مبتدعین کو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔

ثانیاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت پرلے درجے کی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ابراھیم بن مسلم الکوفی معروف الھجری ہے اور اسے محدثین کرام کی جماعت نے ضعیف و متروک کہا ہے چنانچہ امام ابن معین فرماتے ہیں کہ اس کی روایات ہیچ محض ہیں امام ابو زرعہ کہتے ہیں وہ ضعیف ہے ابو حاتم اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں امام بخاری اسے منکر الحدیث قرار دیتے ہیں امام ترمذی اس کی تضعیف کرتے ہیں امام نسائی کا کہنا ہے کہ منکر الحدیث ہے اس کی روایات کو لکھا ہی نہ جائے امام ابو احمد الحاکم کہتے ہیں محدثین کرام اسکی روایات کی تضعیف کرتے ہیں اور میرے نزدیک اس کی روایات قابل احتجاج نہیں، امام احمد امام ابن سعد، سعدی، حربی، وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں امام علی ابن حسن بن جنید اس کو متروک الحدیث فرماتے ہیں، تھذیب ص ۱۶۴ ج ۱ طبع فاروقی کتب خانہ۔

حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ موقوف روایات کو مرفوع بنادیا کرتا تھا، تقریب ص۱۶، علامہ ذھبی نے محدث ابن عیینہؒ کا چشم دید واقع نقل کیا ہے کہ موصوف شطرنج کھیلا کرتے تھے، میزان ص۶۶ ج۱، امام ابن عدی نے، الکامل ص۲۱۴ ج۱ میں امام عقیلی نے، الضعفاء الکبیر ص۶۵ ج۱ میں اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے، الغرض ہجری کی وجہ سے یہ روایت ہی ضعیف ہے لہذا سرے سے یہ قابل التفات ہی نہیں، خلاصہ کلام یہ کہ مذکورہ روایت مفتی صاحب کی عدم دلیل کے باوجود ضعیف ہے، اللہ اللہ خیر سلا۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

بیہقی میں ہے

وعن المستظل بن حصين ان علياً صلى على جنازة بعد ماصلى عليه.

مستظل بن حصین سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دعا مانگی۔ جاء الباطل ص۲۷۵ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا ترجمہ غلط کیا ہے، کیونکہ اس میں دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا بیان ہے، امام بیہقی نے اس روایت کو درج ہی دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کے باب میں کیا ہے، پھر اس روایت کے اجمال کو دور کرنے کیلئے انہوں نے اس سے پہلے دو روایات مزید نقل کی ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ نے ایک نماز جنازہ پڑھایا بعد میں مزید لوگ آئے تو انہوں نے کہا۔

فقالوا يا امير المومنين لم نشهد الصلوٰة عليه فصلى بهم فكان امامهم قرظة بن كعب، السنن الكبرىٰ ص ۴۵ ج ۴.

انہوں نے کہا کہ اے امیر المومنین! ہم اس کی نماز جنازہ میں شامل نہیں ہوسکے تو آپ رضی اللہ عنہ نے انکے ساتھ (مکرر) نماز پڑھی اور ان کے امام قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔

الغرض مفتی صاحب کی مذکورہ دلیل فقط نماز جنازہ کو دوبارہ پڑھنے کے بیان میں ہے، جو ان کے تقلیدی مذہب پر حجت تامہ ہے مگر مفتی صاحب اس روایت سے دعا کا استدلال کر رہے ہیں،

اے جی اس بات کی وضاحت تو کیجئے کہ امامت کا تعلق نماز سے ہے یا کہ دعا سے؟ جو کہ آپ اس سے دعا بعد نماز جنازہ ثابت کرنے کے درپے ہیں،

ثانیاً۔ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سلسلہ اسناد میں امام سفیان ثوری ہیں جو کہ بلاشبہ ثقہ حافظ عابد ہیں مگر مدلس ہیں ان کی تدلیس کی بحوالہ صراحت دین الحق جلد اول ص ۴۱۱ میں گزر چکی ہے وہاں سے دیکھ لی جائے، ہاں البتہ یہاں بریلوی مکتب فکر پر حجت قائم کرنے کی غرض سے ان کے محدث اعظم کا ایک حوالہ نقل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ مولوی محمد شریف آف کوٹلی لوہاراں (تلمیذ احمد رضا) لکھتا ہے کہ

سفیان کی روایت میں تدلیس کا شبہ ہے، فقہ الفقیہ ص ۱۳۴،

اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر صیغہ عن سے مروی ہے لہذا حجت نہیں، الغرض یہ روایت مفتی صاحب کے مخالف بھی ہے اور عدم دلیل کے علاوہ ضعیف بھی!

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مدونۃ الکبریٰ میں ہے

یقول ھکذا کلما کبرو اذا کان التکبیر الاخر قال مثل ذلک ثم یقول اللھم صلی علی محمد .

ہر تکبیر پر اسی طرح کہے کہ جب آخری تکبیر ہو تو اسی طرح کہے پھر کہے اللھم صلی علی محمد۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعد نماز جنازہ درود شریف پڑھے، جاء الباطل ص ۲۷۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ مالکی فقہ کی کتاب ہے، معلوم نہیں کہ مفتی صاحب حنفی ہو کر مالکی کتب سے تے خوری کیوں کر رہے ہیں،

ثانیاً۔ مفتی جی نے جو حوالہ پیش کر کے مطلب نکالا ہے وہ حقیقتاً عبارت کا مفہوم نہیں بلکہ مفتی صاحب کا اپنا تصور اور قطع و برید ہے کیونکہ مذکورہ عبارت سے قبل ایک دعا کا ذکر ہے اور مطلب عبارت کا یہ ہے کہ ہر تکبیر کے بعد وہ دعا پڑھے اور جب آخری تکبیر ہو تو وہ دعا پڑھے او ر درود شریف بھی، ثم ینصرف، پھر سلام پھیر دے،

دیکھئے مدونۃ الکبریٰ ص ۱۵۹ مطبع خیریہ،

مگر مفتی صاحب کمال عیاری سے اسے بعد نماز جنازہ پر محمول کر رہے ہیں جو کہ ان کی صریحاً بدیانتی ہے، افسوس کہ مفتی صاحب کا لقب تو حکیم الامت مفتی اعظم ہے اور ہیرا پھیریاں کرنے میں یہود سے بھی سو ہاتھ آگے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، اس سے ثابت ہوا کہ یہ شخص حکیم الامت کی بجائے مریض الامت اور مفتی اعظم کی بجائے متفنی اعظم تھا،

ثالثاً۔ اگر بالفرض انہوں نے ایسا لکھا بھی ہو تو ہم پر قرآن وسنت کے علاوہ کسی کا قول وعمل حجت نہیں، ایسے اقوال جو مخالف قرآن وحدیث ہیں انہیں اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

مبسوط شمس الائمہ سرخسی جلد دوم ص ۶۷ باب غسل لمیت میں روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک جنازے پر بعد نماز پہنچے اور فرمایا۔

ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء.

اگر تم نے مجھ سے پہلے نماز پڑھ لی ہے تو دعا میں مجھ سے آگے نہ بڑھو یعنی آؤ میرے ساتھ مل کر دعا کرو۔

جاء الباطل ص ۲۷۶ ج ۱

الجواب

اولاً۔ یہ روایت حدیث کی کس کتاب میں مروی ہے؟ اس کا ثبوت مبتدعین پر ادھار ہے، اگر علماء بریلی کہہ دیں کہ مبسوط میں علامہ سرخسی نے نقل تو کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء احناف نقل احادیث میں معتبر نہیں جس کی ضروری تفصیل دین الحق جلد اول کے ص ۷۱ میں راقم نے کر دی ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا متن روایت کے بالمقابل یہ لکھنا، آؤ میرے ساتھ مل کر دعا کر لو، غلط بیانی ہے کیونکہ روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو، یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع اور خانہ ساز عبارت ہے جو کہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

ثالثاً۔ یہ دعا کب کی گئی، دفن سے پہلے یا بعد، قبرستان میں، یا مسجد میں، یا گھر میں، اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، مفتی صاحب کا اسے خاص بعد از جنازہ باور کرانا ایجاد بندہ ہے، وبس۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

مشکوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں ہے

قیل یارسول اللہ ﷺ ای الدعا اسمع قال جوف اللیل الاخر و دبر الصلوات المکتوبات.

حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کون سی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ فرمایا کہ آخر رات کے درمیانی حصہ میں اور فرض نمازوں کے پیچھے۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ بھی فرض نماز ہے پھر اس کے بعد کیوں دعا نہ کی جاوے، جاء الباطل ص ۲۷۷ ج ۲۔

الجواب

اولاً۔ اس روایت میں اجتماعی دعا بعد از نماز جنازہ کا قطعاً بیان نہیں ہے، کیونکہ مفتی جی کا دعویٰ تو خاص ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعی خاص ہے اور اہل بینش جانتے ہیں کہ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا مثلاً اگر بکر کہے کہ زید گھر سے چلا گیا ہے تو اس فقرے کا یہ معنی لینا کہ زید ضرور بھر ضرور حج بیت اللہ کیلئے گیا ہے، غلط ہے، اس لئے کہ حج کو جانا ایک خاص سفر ہے اور زید کے گھر سے جانے سے اس کے بیت اللہ جانے کی دلیل نہ ہوگا۔

ثانیاً۔ دبر الصلوٰۃ، کا معنی سلام پھیر کر اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر امام کا دعا منگوانا اور مقتدیوں کا آمین آمین کہنا، لغت کی کس کتاب میں لکھا ہے، جان من لغت میں دبر کسی چیز کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔

علامہ زبیدی فرماتے ہیں

الدبر من کل شی عقبہ و موخرہ و من المجاز جئتک دبرا لشھر ای آخرہٗ.

یعنی دبر ہر چیز کی انتہا اور آخری حصہ کو کہتے ہیں اور مجاز میں سے ہے آیا تیرے پاس مہینے کا، دبر، سو اس کا معنی ہے مہینے کا آخر آیا۔ تاج العروس ص ۱۹۷ ج ۳۔

علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

الدبر نقيض القبل و دبر كل شي، عقبه و مؤخره.

یعنی دبر (پچھلا حصہ) قبل (اگلے حصے) کی ضد ہے اور معنی اسکا ہر چیز کا آخری حصہ ہے۔

لسان العرب ص ۲٦۸ ج ۴

علامہ فیومی فرماتے ہیں

الدبر خلاف القبل من كل شي و منه يقال الاخر امر. دبر

یعنی دبر قبل کے خلاف ہے، تمام چیزوں میں، اور اسی، وجہ سے الاخر امر، کو دبر کہتے ہیں۔

المصباح المنیر ص ۱۸۸۔

مولوی فیروز الدین کہتے ہیں

دبر (ع-ا-مث) کسی چیز کا پچھلا حصہ، فیروز اللغات ص ٦۱۵۔

الغرض کسی چیز کے آخری حصہ کو دبر کہتے ہیں اور آخری حصہ تب ہی ممکن ہے جب وہ اسکا جزو ہوگی ورنہ اس سے علیحدہ کہلائے گی، جب آپ نے اس چیز کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب آیئے ہم آپ کو دبر الصلوٰۃ کا معنی و مفھوم بتاتے ہیں کہ تشھد میں درود کے بعد اور سلام سے پہلے حصہ کو دبر الصلوٰۃ کہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سید دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دعائیں مانگا کرتے تھے، سلام کے بعد اذکار تو آپ علیہ السلام سے منقول ہیں مگر دعائیں مروی نہیں، گویا سنت فعلی نے، دبر الصلوٰۃ، کا معنی متعین کر دیا کہ تشھد میں درود کے بعد اور سلام سے پہلے حصہ کو، دبر الصلوٰۃ، کہا جاتا ہے۔

ثالثاً۔ مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس پر دو وجہ سے کلام ہے (۱) سند میں ابن جریج ہیں، ترمذی مع تحفۃ ص ۲۵۸ ج ۴، جو کہ زبردست مدلس ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ طبقات کے تیسرے درجے میں انہیں شمار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

و صفه النسائي و غيره بالتدليس، قال الدارقطني، شر التدليس تدليس ابن جريج، فانه قبيح التدليس، لايدلس الافيما سمعه من مجروح.

یعنی اس کے مدلس ہونے کی امام نسائی وغیرہ نے صراحت کی ہے امام دارقطنی فرماتے ہیں بدترین تدلیس ابن جریج کی ہے کیونکہ وہ نہیں تدلیس کرتے مگر مجروح راویوں سے،

طبقات المدلسین ص ۴۱ رقم ۸۳) تقریب میں فرماتے ہیں کہ ابن جریج ثقہ اورفقیہ ہیں لیکن تدلیس کرتے ہیں تقریب ص ۱۶۵) علامہ ذہبی فرماتے ہیں ابن جریج مدلس ہیں۔

میزان الاعتدال ص ۶۵۹ ج ۲۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ابن جریج گو ثقہ ہیں مگر زبردست اور بدترین قسم کی تدلیس کرتے ہیں اور زیر بحث روایت میں وہ سماع کی صراحت کے بغیر صیغہ عن سے بیان کررہے ہیں لہذا حجت نہ ہوئی۔

(۲) حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے عبد الرحمان بن سابط ہے اور اس کی کسی صحابی سے ملاقات ثابت نہیں، حافظ ابن حجر، الاصابۃ، میں فرماتے ہیں۔

لایصح له سماع من صحابی .

یعنی انکا کسی صحابی سے سماع ثابت نہیں۔ص ۱۴۸ ج ۳، القسم الرابع من حرف العین، وکذافی مرعاۃ ص ۳۲۶ ج ۳۔

فن حدیث کے عظیم الشان امام یحییٰ بن معینؒ کے حوالے سے امام ابو حاتم فرماتے ہیں۔

قیل لیحییٰ سمع من ابی امامة؟ قال، لا،

یعنی امام یحییٰ بن معینؒ سے کہا گیا کیا عبدالرحمان نے حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے سماع کیا ہے تو انہوں نے کہا نہیں، مراسیل ابن ابی حاتم ص ۱۲۸، امام یحییٰ کے اس قول کو حافظ ابن حجر نے بھی، تھذیب ص ۱۶۳ ج ۶، میں نقل کرکے اس پر خاموشی اختیار کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا بھی یہی رجحان ہے، آیئے ہم آپ کو حنفیت کے نامور وکیل جناب علامہ زیلعیؒ سے اس کی تصدیق کروا دیتے ہیں، چنانچہ موصوف تخریج ھدایہ، میں امام ابن قطان کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ

واعلم ان ما مایرویه عبد الرحمان بن سابط عن ابی امامة لیس بمتصل وانما هو منقطع، لم یسمع منه.

معلوم ہونا چاہیئے کہ عبد الرحمٰن بن سابط جو حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتا ہے وہ متصل نہیں بلکہ منقطع ہے کیونکہ اس نے حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی سنا نہیں،

نصب الرایۃ ص ۲۳۵ ج ۲

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس میں ابن جریج کی بدترین تدلیس کے علاوہ سند کے لحاظ سے روایت منقطع ہے۔

مفتی صاحب کی نویں دلیل

مشکوۃ کتاب الدعوات میں ہے کہ

الدعاء ھوالعبادۃ۔ اسی جگہ یہ بھی ہے۔ الدعاء مخ العبادۃ، دعا عبادت بھی ہے، یادعا اصل عبادت ہے۔

دعا مانگنے کے لئے کوئی وقت وغیرہ کی پابندی نہیں، تو اس کی کیا وجہ ہے کہ نماز جنازہ سے پہلے تو دعا جائز اور دفن کے بعد بھی جائز مگر نماز کے بعد اور دفن سے پہلے حرام؟

نماز جنازہ بھی کوئی جادو ہے کہ اس کے پڑھتے ہی دعا کرنا۔ ایصال ثواب کرنا سب حرام اور دفن میت اس جادو کا اتار ہے کہ دفن ہوا اور سب جائز ہوگیا۔ لہذا ہروقت دعا اور ایصال ثواب جائز ہے کسی وقت کی پابندی نہیں ہیں۔ جاء الباطل ص ۲۷۸ ج ۱

الجواب

اولاً، میت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کو ایک باور کرانا مفتی صاحب کی خلط مبحث ہے کیونکہ دعا تو شفاعت کے زمرے میں آتی ہے اور ایصال ثواب ہدیہ کے قبیل سے ہے۔

ثانیا مذکورہ روایات کو بعد از نماز جنازہ کے متعلق کہنا مفتی صاحب کی غلط بیانی ہے کیونکہ ان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو کہ جنازہ کے بعد دعا، عبادت ہے یا عبادت کا مغز ہے، جب اس حدیث میں ایسا کوئی لفظ ہی نہیں تو پھر یہ آپ کے دعوے کی دلیل کیسے ہوئی، جان من دلیل عام سے حکم خاص ثابت نہیں ہوتا،

ثالثاً۔ آپ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد اجتماعی طور پر دعا مانگنا فرض اور واجب نہیں ہے چنانچہ دشمن توحید وسنت مجدد بدعات مولوی احمد رضا خان فاضل بریلی لکھتا ہے۔

نماز (جنازہ) کے علاوہ دعا شرعا ضروری وواجب نہیں جس کے لئے قیام ودرنگ (دیر) پسند کریں شرع میں جتنی دعا ضروری تھیں یعنی نماز جنازہ وہ ہوچکی،

بذل الجوائز علی الدعا بعد صلاۃ الجنائز مندرجہ فتاوی رضویہ ص ۲۷ ج ۴، جب بقول مولوی احمد رضاخان بعد نماز جنازہ اجتماعی دعا واجب تو کجا سرے سے ضروری ہی نہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ مغز کیسے ہوئی، کیا کسی چیز کا مغز بھی غیر ضروری ہوتا ہے، مفتی جی آیئے ہم آپ کو حدیث کا مفہوم سمجھائیں۔ نماز میں جو دعا فرض و واجب ہے وہی اس کا مغز ہے جنازہ میں میت کے حق میں دعا فرض ہے اور یہی اس کا مغز ہے عام نمازوں (سنن و فرائض) میں فاتحہ کی دعا فرض ہے۔ اور یہی ان کا مغز ہے۔

رابعا- رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ جنازہ ہی کوئی ایسا منتر ہے جس سے دعا للمیت منع ہوگی، تو جوابا عرض ہے کہ آپ کے نزدیک بھی چوتھی تکبیر کے بعد دعا کرنا منع ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۱، تو صراحت کیجئے اس کے بعد کیوں ناجائز ہے اگر بریلوی مکتب فکر کے علماء کہہ دیں کہ اس کا ثبوت شریعت میں نہیں: تو ہم بھی کہتے ہیں اس کا بھی ثبوت شریعت سے نہیں ہے۔

تنبیہ اول

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت۔ الدعاء مخ العبادۃ، کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی صراحت کی ہے،

هذا حديث غريب من هذا الوجه لا نعرفه الا من حديث ابن لهيعة،

یعنی یہ روایت غریب ہے (یعنی صرف اسی ایک ہی سند سے مروی ہے) اس وجہ سے کہ اسے ہم نہیں جانتے مگر ابن لھیعۃ کی حدیث سے،

ترمذی مع تحفۃ ص ۲۲۳ ج ۴، اور امام ترمذی نے، السنن، کے باب الرخصۃ فی استقبال القبلۃ بغائط و بول، میں صراحت کی ہے کہ ابن لھیعۃ محدثین کرام کے نزدیک ضعیف ہے اسے امام یحیی القطان نے ضعیف کہا ہے، ترمذی مع تحفۃ ص ۲۱ ج ۱، علاوہ ازیں عبد اللہ بن لھیعۃ۔ زبردست قسم کے مدلس تھے امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ، کان صالحا ولکنہ یدلس عن الضعفاء، یعنی ضعفاء سے تدلیس کرتا تھا، کذافی طبقات المدلسین صفحہ ۵۴، اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر عن سے مروی ہے الغرض ابن لھیعۃ کے ضعف و تدلیس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے،

تنبیہ ثانی

دفن کے بعد قبر پر قراۃ قرآن کا مسئلہ

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں مفتاح الصلاۃ صفحہ۱۱۲ مصنف مولانا فتح محمد صاحب برہان پوری میں ہے کہ جب نماز جنازہ سے فارغ ہوں تو مستحب ہے کہ امام یا کوئی اور صالح آدمی سورۃ بقرہ کا شروع رکوع مفلحون تک جنازے کے سرہانے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات امن رسول میت کے بائیں طرف پڑھے کہ حدیث میں آیا ہے بعض احادیث میں دفن کے بعد واقعہ ہوا ہے میسر ہو تو دونوں وقت پڑھے جائز ہے، جاء الباطل ص۲۷۶۔

الجواب: اولاً، دفن کے بعد قبر پر سورہ بقرہ کی تلاوت کرنے کی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور مرفوع مروی ہے، موقوف روایت کو امام بیہقی نے، السنن الکبریٰ ص۵۶ ج۴ میں اور مرفوع کو امام طبرانی نے، معجم کبیر ص۳۴۰ ج۱۲ (۱۳۶۱۳) میں اور بیہقی نے، شعب الایمان ص۱۶ ج۷ (۹۲۹۴) میں روایت کیا ہے، بعض نے مرفوع کی تضعیف کرکے موقوف روایت کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ یہ روایت دونوں ہی طریق سے سخت ضعیف ہے، ہمارے شیخ اور استاذی المکرّم مولانا محمد یحییٰ گوندلوی فرماتے ہیں کہ

مرفوع روایت یحی بن عبد اللہ بن الضحاک البابلتی کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کا استاد ایوب بن نھیک کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ خطا کرتا تھا ابو حاتم وغیرہ کہتے ہیں ضعیف ہے، ازدی کہتے ہیں متروک ہے (میزان ص۲۹۴ ج۱، علاوہ ازیں اس روایت میں انقطاع بھی ہے۔

موقوف روایت میں راوی عبد الرحمٰن بن علاء بن الجلاج کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور کسی محدث سے انکی توثیق نہیں ہوسکی، البانی نے اسکو مجہول کہا ہے اور ترمذی سے بھی اس کے مجہول ہونے کا اشارہ نقل کیا ہے (مشکوۃ البانی ص۴۹۲ وص ۵۳۸ ج۱) اور اسی بناء پر حوالہ مذکورہ ص ۵۳۸ ج۱ میں اس روایت پر ضعیف کا حکم لگایا ہے۔

جن محدثین کرام نے اس پر سکوت کیا ہے غالبا ان کے پیش نظر ابن حبان کی توثیق ہے مگر

اکیلے ابن حبان کی توثیق کسی صحت روایت کیلئے کافی نہیں کیونکہ مجاہیل کی توثیق میں ان کا مذہب معروف ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ راوی جس سے صرف ایک راوی نے روایت کی ہوں وہ ان کے ہاں ثقہ ہے جبکہ وہ متروک اور کذاب نہ ہو ان کا مذہب ہے کہ جب تک قدح اور جرح معلوم نہ ہوں تو راوی ثقہ ہے جیسا کہ فرماتے ہیں۔

لان العدل من لم يعرف منه الجرح ضد التعديل فمن لم يعلم بجرح فهو عدل اذا لم يتبين ضده اذ لم يكلف الناس معرفة ماغاب عنهم وانما كلفوا الحكم بالظاهر من الاشياء غير المغيب عنهم (كتاب الثقات ص ۱۳ ج ۱)

یہی وجہ ہے کہ انکی ثقات میں بہت سے راوی ایسے ہیں جن پر اسلاف نے مجہول ہونے کا حکم لگایا ہے، میزان الاعتدال ص۹۹ ج ۲ وص۱۵۱ ج۲، اور دیگر بہت سی جگہوں مین ابن حبان کے اس قاعدے کو ذکر کر کے راوی کو مجہول قرار دیا ہے حالانکہ ابن حبان کے نزدیک وہ ثقہ ہے۔ بنابریں قاعدہ یہی ہے کہ ابن حبان اکیلے کی توثیق صحت روایت کے لئے کافی نہیں ہوتی، عبد الرحمٰن بن علاء کی روایت ترمذی میں موجود ہے مگر امام ترمذی نے اس پر کوئی حکم نہیں لگایا ہے بلکہ صرف یہی فرمایا ہے انما نعرفہ من ہذا الوجہ (ترمذی مع تحفہ ص ۱۲۸ ج ۲ حالانکہ، ضعیف روایت کو حسن کہنے کا تساہل امام ترمذی کا معروف ہے۔

ثانیاً۔ روایت ضعیف ہونے کے ساتھ مفتی صاحب کے موقف کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس میں ہے جب تم مجھے قبر میں داخل کرلو تو پھر یہ کچھ پڑھو۔ جبکہ مفتی صاحب اسے بعد از نماز جنازہ کی دعا کی دلیل بنارہے ہیں۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

ثالثاً۔ راقم عرض کرتا ہے کہ قراۃ قرآن عبادت ہے، اور قبر محل عبادت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جائے، مسلم ص۲۶۶ ج۱، اس سے ثابت ہوا کہ قبر سورہ بقرہ پڑھنے کی جگہ نہیں ہے، یہ حدیث بالکل اس حدیث کی طرح ہے جس میں آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گھروں کو قبرستان نہ بناؤ! ان میں نماز پڑھا کرو، صحیح مسلم ص۲۶۵ ج۱، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح قبرستان میں قرآن بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اور ہر نماز کے بعد دعا مسنون ہے جاء الباطل ص ۲۷۷، اس عبارت کے بعد انہوں نے جوف اللیل کی روایت کو پیش کیا ہے جس سے غالباً ان کا مقصود اجتماعی طور پر دعا مانگنے کو ضروری قرار دینا ہے حالانکہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی طور دعا مانگنا مسنون تو کجا بدعت ہے اس کا شریعت حقہ سے قطعاً ثبوت نہیں ملتا، چنانچہ مولانا عبدالحق محدث دھلوی حنفی، سفر السعادۃ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ،

اما این دعا که آئمه مساجد بعد ازسلام میکنند و مقتد یان آمین آمین میگو یند چنانچه الآن در دیار عرب و عجم متعارف ست ازعادت پیغمبر خدا ﷺ نه بود و درین باب هیچ حدیث ثابت نه شد،،

یعنی یہ دعا جو ائمہ مساجد میں سلام پھیرنے کے بعد کرتے ہیں اور مقتدی آمین آمین کہتے ہیں چنانچہ عرب وعجم کے ممالک میں رائج ہے یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ سے نہیں اور اس باب میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہوئی، شرح سفر السعادۃ ص ۹۰ طبع مکتبہ رضویہ سکھر ۱۳۹۸ھ۔

علامہ حموی الاشباہ والنظائر کی شرح میں فرماتے ہیں،

وصرح ابن حجر بان الاجتماع للدعاء برفعه بدعة اقول ماقال ابن حجر هو الحق الذی لامرية فيه فان تعريف البدعة صادق عليه .

یعنی ابن حجر نے اسکی تصریح کی ہے کہ ہاتھ اٹھا کر جمع کے ساتھ دعا کرنا بدعت ہے، میں احمد کہتا ہوں کہ ابن حجر نے جو کہا ہے وہ بالکل حق ہے جس میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ بدعت کی تعریف اجتماعی دعا پر صادق آتی ہے۔ حموی شرح الاشباہ ص ۴۰۰

مولانا عبدالحی لکھنوی جو کہ ماضی قریب میں حنفیت کے نامور وکیل گزرے ہیں فرماتے ہیں

یہ طریقہ جو فی زمانا مروج ہے کہ امام سلام کے بعد رفع یدین (ہاتھ اٹھا کر) کے ساتھ دعا مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں حضور سرور عالم ﷺ کے زمانے میں نہ تھا جیسا کہ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس کی تصریح کی ہے، مجموعۃ الفتاوی عبدالحی مترجم ص ۲۳۲ ج ۱۔

مذکورہ دونوں عبارات تو بریلوی علماء کے لیے خاکسار نے نقل کی ہیں، سلفی علماء کے لیے عرض ہے کہ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ، **اما دعا الامام والماموین جمیعا عقیب الصلاۃ بدعۃ، لم یکن علی عھد النبی ﷺ، بل انما کان دعاؤہ فی صلب الصلاۃ، فان المصلی یناجی ربہ فاذا دعا حال مناجاتہ لہ کان مناسباً۔**

یعنی نماز کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا بدعت ہے، نبی ﷺ کے زمانہ میں یہ طریقہ نہ تھا، بلکہ آپ علیہ السلام کی دعا نہ تھی مگر نماز کے اندر (مانگتے تھے) کیونکہ نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے، پس مناجات کے وقت دعا کرنا اس کے لئے مناسب ہے، مجموع فتاویٰ ص۵۱۹ج۲۲

قبروں پر مزارات کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

پہلی حدیث

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

نھیٰ رسول اللہ ﷺ ان یجصص القبر وان یقعد علیه و ان یبنیٰ علیه.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اور اس پر عمارت تعمیر کرنے اور اس پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے منع فرمایا۔

صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۲، و مسند امام احمد ص ۲۹۵ ج ۳، و ابوداود ص ۱۰۴ ج ۲، و نسائی (مجتبیٰ) ص ۲۳۱ ج ۱، و ابن ماجه ص ۱۱۳، و ترمذی مع تحفه ص ۱۵۵ ج ۲، و السنن الکبریٰ للبیهقی ص ۴ ج ۴، مستدرک حاکم ص ۳۷۰ ج ۱، و صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۳۱۵۴.

یہ حدیث قبور پر مزارات تعمیر کرنے کے رد میں نص صریح ہے، اس صحیح حدیث سے مفتی صاحب نے جس طرح جان چھڑانے کی سعی لاحاصل کی ہے وہ قابل دید ہے ان کے خرافات کا ترتیب وار جواب ملاحظہ کریں۔

پہلا عذر

جواب۔ قبر کو پختہ کرنے سے منع ہونے کی تین صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ قبر کا اندرونی حصہ جو کہ میت کی طرف ہے اس کو پختہ کیا جائے، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا،

ان یجصص القبور ۔فرمایا گیا، یہ نہ فرمایا گیا، علی القبور ، جاء الباطل ص ۲۹۰ ج ۱۔

قبر اور مقبرہ کا معنی ومفہوم

الجواب: اولاً۔ حدیث میں قبر کا لفظ ہے جو کہ میت کے دفن کرنے کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

القبر مقر الميت.

یعنی میت کے قرار کی جگہ کو قبر کہتے ہیں، مفردات ص ۳۹۰، اور یہ فقط اندر کے حصے کو ہی نہیں کہتے بلکہ سارے مقبرے کو ہی کہا جاتا ہے جیسے زندہ انسان کے گھر کو اس کی قرار گاہ بولا جاتا ہے، کوئی باشعور انسان گھر کی چھت کو قرار گاہ سے خارج نہیں کہہ سکتا اسی طرح قبر کی اوپر والی سطح بھی قبر میں ہی شامل ہے، علامہ زمخشری حنفی نے تو اس پر امثلہ بھی دی ہیں کہ

وهذا مقبر فلان والبقيع مقبرة المدينة.

یعنی یہ فلاں شخص کی قبر ہے اور بقیع اہل مدینہ کا قبرستان ہے، اساس البلاغۃ ص ۳۵۲۔

کیوں جناب جب انسان قبر کے تعارف میں کہتا ہے، یہ فلاں شخص کی قبر ہے، تو اشارہ اوپر ڈالی گئی مٹی کی طرف کرتا ہے یا ہاتھ قبر کے اندر داخل کر کے کہتا ہے کہ یہ زید کی قبر ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔

(۱) نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها، الحديث،

یعنی میں پہلے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کرتا تھا مگر اب کیا کرو، صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱، و مشکوٰۃ ص ۱۵۴۔

تو کیا مفتی صاحب اس حدیث کا یہ معنی کریں گے کہ میں تمہیں پہلے تو قبر کی زیارت سے منع کرتا تھا مگر اب اوپر ڈالی گئی مٹی کو علیحدہ کر کے لحد کی زیارت کیا کرو۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

(۲) فزوروا القبور فانها تذكر الموت،

یعنی قبروں کی زیارت کیا کرو کہ یہ موت کو یاد دلاتی ہیں، صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱، و مشکوٰۃ ص ۱۵۴۔

اب اس کا تو مفتی صاحب یہی معنی کریں کہ مقبرے کے اندر والی جگہ لحد کی زیارت کیا کرو کہ یہ موت کو یاد دلاتی ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ ہمیں،

السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین و المسلمین و اناان شاء الله بکم للاحقون نسا ل الله لنا و لکم العافیة.

کی دعا سکھاتے تھے،

اذا خرجوا الی المقابر،

جب قبرستان کی طرف جاتے، صحیح مسلم ص۳۱۴ ج۱، ومشکوٰۃ ص۱۵۴۔

اس کا معنی تو مفتی صاحب یہی کرتے ہونگے جب نبی ﷺ لحدوں کی طرف جاتے الخ۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے،

لعن زوارات القبور،

قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ مسند احمد ص۳۳۷ ج۲ و ترمذی مع تحفہ ص۱۵۶ ج۲، وابن ماجہ ص۱۱۴، وسنن الکبریٰ للبیھقی ص۷۸ ج۴۔

اس حدیث کا مفتی صاحب غالباً یہی معنی بیان کرتے رہے ہونگے کہ لحدوں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون.

اس طرح کی ہم بیسیوں امثلہ پیش کر سکتے ہیں جن میں مقبرہ کو قبر کہا گیا ہے، الغرض قبر فقط اندر کے حصہ لحد کو ہی نہیں کہا جاتا بلکہ سارے مقبرے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور مفتی صاحب کا اسے لحد سے ہی خاص کرنا دعوی بلا دلیل ہے اور وہ کسی دلیل شرعی سے اپنے دعوی کو قطعاً ثابت نہیں کر سکتے۔

ثانیاً۔ حدیث میں، ان یجصص القبر، اور بعض روایات میں، القبور، کے الفاظ ہیں، اگر اندر کا حصہ لحد ہی مراد ہوتا تو حدیث کے الفاظ۔

ان یجصص فی القبور، کے ہوتے نا کہ، ان یجصص القبر، کے، کیونکہ جب قبر کے اندر کا حصہ بولا جاتا ہے تو اس کیلئے جملہ، فی القبور، ہی مناسب ہے جیسا کہ عذاب قبر اور منکر نکیر کے

سوالات کی احادیث میں اسی طرح کے الفاظ مروی ہیں۔ مشکوٰۃ ص ۲۴

مفتی صاحب کا دوسرا عذر

دوسرے یہ کہ عامۃ المسلمین کی قبور پختہ کی جاویں کیونکہ یہ بے فائدہ ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ہر قبر کو پختہ کرنے سے منع فرمایا، جاء الباطل ص ۲۹۰۔

کیا یہ حکم خاص ہے

الجواب: اولاً۔ اس عذر میں خیر سے مفتی صاحب کو یہ مسلم ہوا کہ، ان یجصص، میں لحد نہیں مقبرہ مراد ہے، ورنہ اس تاویل بلکہ تحریف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ثانیاً۔ حدیث کے الفاظ عام ہیں، انہیں خاص کرنے کی مبتدعین کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، محض اپنے قیاس فاسد سے اسے مقید کر رہے ہیں جبکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں۔

ثالثاً۔ معتقدین ہمیشہ اپنے زعم میں نیک وصالح کی قبر پر ہی مزارات تعمیر کرتے ہیں گو وہ نیک وصالح ہو یا نہ ہو یہ الگ بات ہے۔

جب شریعت نے عموم سے قبور پر تعمیر عمارت سے منع فرمایا تو اولیاء کی قبور اس سے مستثنیٰ نہ رہیں۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی الحنفی (م ۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں۔

آنچه بر قبور اولیاء عمارت هائے رفیع بنا میکنند و چراغان روشن می کنند وازیں قبیل هر چه میکنند حرام است، مالابدمنه ص ۹۵.

وہ جو کچھ بھی حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر کیا جاتا ہے کہ اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور اسی طرح کی تمام چیزیں جو کرتے ہیں حرام ہیں۔

تیسرا عذر

تیسرے یہ کہ قبر کو سجاوٹ تکلف یا فخر کیلئے پختہ کیا، یہ تینوں صورتیں منع ہیں اور اگر نشان باقی رکھنے کیلئے کسی ولی اللہ کی قبر پختہ کی جائے تو جائز ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت عثمان بن

مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پختہ پتھر کی بنائی جیسا کہ پہلے باب میں عرض کیا گیا ہے، لمعات میں اسی، ان یجصص القبر ، کے ماتحت ہے، لمافیہ من الزینۃ والتکلف ، کیونکہ اس میں محض سجاوٹ اور تکلف ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر اس لئے نہ ہو تو جائز ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۰ ج ۱۔

کیا مزار تعمیر کرنے کی ممانعت سجاوٹ کی وجہ سے ہے

الجواب: اولاً۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر نصب کرنے کا جواب آگے مفتی صاحب کی پہلی دلیل کے زیر عنوان آرہا ہے۔

ثانیاً۔ یہ توجیہ مفتی صاحب کی اپنی من گھڑت ہے جسے شارع علیہ السلام نے قطعاً بیان نہیں فرمایا، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ اس تخصیص پر کوئی نص پیش کریں، محض اپنی آراء سے حدیث کے عموم کو خاص نہیں کیا جاسکتا، شیخ عبدالحق محدث دھلوی کی عبارت کو مفتی صاحب نے الٹا سمجھا ہے یا عوام الناس کو مغالطہ دیا ہے کیونکہ شیخ تو یہ کہہ رہے ہیں۔

ان یجصص القبور، لمافیہ من الزینۃ و التکلف، لمعات بحوالہ حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۴۸ .

یعنی قبور کو چونا گچ کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس میں تکلف اور سجاوٹ ہے۔

دیکھئے ان کی عبارت کا مفہوم تو یہ ہے کہ قبر کو پختہ کرنا سجاوٹ اور تکلف ہے، مگر مفتی صاحب اس کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ تکلف وسجاوٹ کی وجہ سے ممانعت ہے، اگر یہ نہ ہوں تو تب قبور پر مزارات کی تعمیر جائز ہے، لعنت اللہ علی الکاذبین۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ حالانکہ سجاوٹ لور تکلف والا محض مغالطہ ہے جس قدر مزارات کی تعمیر میں سجاوٹ اور تکلف کیا جاتا ہے وہ دوسری عمارتوں میں نہیں، کسی بھی مزار کو دیکھ لو اس پر کتنا نقش ونگار ہوا ہوگا اور کتنے لاکھ روپے اس کی سجاوٹ پر صرف ہوئے ہونگے۔ (محمد یحیٰ گوندلوی)۔

ثالثاً۔ نماز اسلام کا بنیادی رکن اور اللہ تعالی کی بہترین عبادت ہے اس کو بھی اگر نمائش کیلئے پڑھا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے، جیسا کہ رب العزت نے سورۃ النساء (۱۴۲) میں منافقین کی نماز کا تذکرہ فرمایا ہے۔

الغرض اگر نمائش کا حکم فقط مزارات کے متعلق ہی ہوتا تو ایک بات تھی اور مفتی صاحب کو مفید تھی مگر اس کا حکم تو دین اسلام کے ہر حکم وعمل پر لاگو ہوتا ہے مزارات کی تخصیص ہی کیا ہے۔

چوتھا عذر

ان یبنیٰ علیہ، یعنی قبر پر عمارت بنانا منع فرمایا، اس کے بھی چند معنی ہیں، اولاً تو یہ کہ خود قبر پر عمارت بنائی جاوے اس طرح کہ قبر دیوار میں شامل ہوجاوے، چنانچہ شامی باب الدفن میں ہے۔

و تکره الزيادة عليه لمافي المسلم نهى رسول الله ﷺ ان يجصص القبر و ان يبنى عليه.

قبر کو ایک ہاتھ سے زیادہ اونچا کرنا منع ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے قبر کو پختہ کرنے اور اس پر کچھ بنانے سے منع فرمایا۔

درمختار میں ہے کہ،

وتكره الزيادة عليه من التراب لانه بمنزلة البناء.

قبر پر مٹی زیادہ کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمارت بنانے کے درجہ میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قبر پر بنانا یہ ہے کہ قبر دیوار میں آجاوے اور گنبد بنانا یہ حول القبر یعنی قبر کے اردگرد بنانا ہے، یہ ممنوع نہیں۔ جاء الباطل ص۲۹۱ ج۱۔

قبر پر عمارت تعمیر کرنے کا مفہوم

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب نے اس عبارت میں جو جو ہیرا پھیریاں کی ہیں ان کی تفصیل میں جانے سے پہلے آیئے ذرا فتاوی شامی کی عبارت کا معنی ومفہوم معلوم کرلیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فتاوی شامی درمختار کی شرح ہے علامہ حصفکی نے درمختار میں لکھا تھا کہ

ويهال التراب عليه و تكره الزيادة عليه من التراب لانه بمنزلة البناء.

یعنی قبر پر مٹی ڈالتے وقت (قبر سے نکالی گئی مٹی سے) زیادہ مٹی ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ یہ عمارت کے مشابہ ہے۔

(وتکرہ الزیادہ) کی شرح میں علامہ ابن عابدین نے اس کی دلیل درج کرتے ہوئے صحیح مسلم

سے حدیث جابر نقل کی ہے، وبس، دیکھئے فتاوی شامی ص۲۳٦ ج۲۔

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) علامہ حصکفی نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ عمارت وہی منع ہے جس کی دیوار میں قبر آجائے بلکہ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ زیادہ مٹی ڈالنا بھی عمارت کے مشابہ ہے، نہ یہ کہ حقیقتاً زیادہ مٹی ڈالنا ہی عمارت ہے۔

معلوم نہیں مفتی صاحب کی عربی اتنی کمزور کیوں تھی، یا جان بوجھ کر اس قدر سطحی باتیں لکھ کر عوام الناس کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر ادھر ادھر کے مسائل میں الجھا کر پلہ چھڑانے کی کوشش کرتے تھے، ورنہ ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عربی میں، بمنزلۃ، سے کسی سے مشابہت دینا مقصود ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔

انت منی بمنزلة هٰرون من موسیٰ، بخاری ص۵۲٦ ج۱، و ص٦۳۳ ج۲، و مسلم ص۲۷۸ ج۲، و مشکوٰة ص۵٦۳.

(اے علی رضی اللہ عنہ) تو میرے ساتھ ایسے ہی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ھارون،

تو کیا اس حدیث کا یہ معنی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل حضرت ھارون علیہ السلام کی طرح تھے، نہیں بلکہ یہاں رسول اللہ ﷺ نے فقط تشبیہ دی ہے۔

بالکل اسی طرح علامہ حصکفی نے زیادہ مٹی ڈالنے کو، بناء، کے مشابہ قرار دیا ہے نہ کہ زیادہ مٹی ڈالنا ہی، بناء علی القبر، ہے۔

(۲) وتکرہ الزیادۃ علیہ، علامہ شامی کی عبارت نہیں بلکہ درمختار کی ہے اور علامہ شامی نے اسے شرح کی غرض سے نقل کیا ہے اور اوپر خط بھی کھینچ دیا ہے تاکہ اشتباہ نہ رہے مگر مفتی جی کا خبط دیکھئے کہ وہ اسے علامہ شامی کی عبارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ ان یبنیٰ علیہ، کے یہ اچھوتے معنے آج تک کسی محدث ومفسر نے بیان نہیں کیئے، یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع ہے، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ کسی مسلمہ محدث وفقہی اورلغوی سے اس کا ثبوت دیں ورنہ گھر میں ہی شرما چھوڑیں۔

آیئے ہم آپکو ایک بات بتائیں جو آپ بوجہ پیری کے بھول گئے ہیں وہ یہ کہ لفظ بنیٰ کا اطلاق

کسی عمارت کے بنانے پر ہوتا ہے، اور بناء کسی تعمیر کی بلندی پر بھی دلالت کرتا ہے، قرآن میں ہے

الذی جعل لکم الارض فر اشاو السماء بناءً. (البقرہ ۲۲)

وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا۔

انہیں حقائق کے پیش نظر آئمہ لغت نے اس کا ایک معنی قبہ بھی کیا ہے۔

دیکھئے تاج العروس ص ۴۶ ج ۱۰، ولسان العرب ص ۹۶ ج ۱۴۔

جب آپ نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب معلوم ہونا چاہے کہ ،بنیٰ، کا لفظ جب ،علیہ، کی طرف مضاف ہو تو کسی چیز کے اردگرد عمارت بنانا ہوتا ہے قرآن میں ہے

فقالوا ابنو علیهم بنیاناً. (الکھف ۲۱)

اور کہنے لگے کہ ان پر عمارت بنادو۔

اس آیت کی تفسیر میں خود مفتی صاحب نے ،روح البیان، سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا کہ اصحاب کھف پر ایسی دیوار بناؤ جو ان کی قبر کو گھیرے، جاء الباطل ص ۲۸۴ ج ۱۔

کیوں جناب گھیرنے کیلئے حول القبر دیوار کا ہونا شرط ہے کہ نہیں؟ اگر ہے یقیناً ہے تو پھر، ان یبنیٰ علیہ، کا معنی کسی چیز کے اردگرد قبہ نما عمارت بنانا، ثابت ہوگیا، اس چیز کو ہی فقہاء نے، فوق القبر، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، امام فخر الدین قاضی خاں حنفی التوفی ۲۹۵ھ اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ولا یجصص القبر لماروی عن النبی ﷺ انه نهی عن التجصیص و التفضیض و عن البناء فوق القبر قالوا اراد بالبناء السفط الذی یجعل علی القبر فی دیارنا، لماروی عن ابی حنیفة رحمة الله انه قال لایجصص القبر ولا یطین ولا یرفع علیه بناء وسفط.

یعنی قبر کو پختہ نہ کیا جائے کہ نبی ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، چاندی کے پانی سے مرصع کرنے اور اس کے اوپر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، فقہاء کرام کہتے ہیں کہ ،بناء، سے مراد ایسا قبہ ہے جیسا کہ ہمارے دیار میں قبروں پر (مزارات) تعمیر کیئے جاتے ہیں، کیونکہ امام ابو حنیفہؒ نے قبر کو پختہ کرنے، اس کی لپائی کرنے، اس پر عمارت بلند کرنے اور قبہ وغیرہ سے روکا ہے، فتاوی قاضی خاں

برحاشیہ عالم گیری ص۱۹۴ ج۱ طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ ۱۹۸۴ء)

پانچواں عذر

اس بنانے کی تفسیر خود دوسری حدیث نے کردی جو کہ مشکوۃ باب المساجد میں ہے

اللھم لاتجعل قبری و ثنا یعبد اشتد غضب الله علی قوم ن اتخذوا قبور انبیاء ھم مسجد.

اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے اس قوم پر خدا کا سخت غضب ہے جس نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبر کو مسجد بنانا اس پر عمارت بنا کر اس کی طرف نماز پڑھنا حرام ہے یہ ہی اس حدیث سے مراد ہے، قبروں پر کیا نہ بناؤ مسجد، قبر کو مسجد بنانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی عبادت کی جاوے، یا کم از کم اس کو قبلہ بنا کر اس کی طرف سجدہ کیا جاوے، علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح بخاری میں فرماتے ہیں

قال البیضاوی لما کانت الیھود و النصری یسجدون لقبور الانبیاء تعظیما لشانھم و یجعلونھا قبلۃ یتوجھون فی الصلوٰۃ نحوھا و اتخذوھا او ثاناً لعنھم و منع المسلمین عن مثل ذلک.

بیضاوی نے فرمایا کہ جبکہ یہود و نصاری پیغمبروں کی قبروں کو تعظیما سجدہ کرتے تھے اور اس کو قبلہ بنا کر اس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور ان کی قبور کو انہوں نے بت بنا کر رکھا تھا لہذا اس پر حضور علیہ السلام نے لعنت فرمائی اور مسلمانوں کو اس سے منع فرمایا گیا۔

یہ حدیث معترض کی پیش کردہ حدیث کی تفسیر ہوگئی، معلوم ہوگیا کہ قبہ بنانے سے منع نہیں فرمایا بلکہ قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا۔ جاء الباطل ص۲۹۱ ج۱۔

کیا وثن اور عمارت ہم معنی ہے؟

اولاً: ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی مذکورہ شرح علامہ بیضاوی کی اپنی رائے ہے، جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ یہ رائے ان صحیح احادیث کے خلاف ہے، جیسا کہ حضرت ابو

سعید خدریؓ فرماتے ہیں حضرت نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ "ان یبنی علی القبر" صحیح ابن ماجه ص ۲۶۱ ج ۱ کہ قبر پر عمارت نہ کی جائے۔

اور یہ حدیث کہ:

نهی النبی ﷺ ان یبنی القبور او یعقد علیها او یصلی علیها

رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر عمارت بنانے سے اور ان پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے یا ان کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے سے منع فرمایا، مسند ابویعلی ص ۶ ج ۲۔

اس حدیث میں مطلقاً قبر پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ مطلقاً اس پر بیٹھنے یا اس کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ ظاہر ہے جو قبر پر کسی نیت سے بھی بیٹھتا ہے یا قبر کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتا ہے تو وہ اس حدیث کی وعید میں شامل ہے، اس طرح جو شخص بھی خواہ کسی نیت سے قبر پر عمارت تعمیر کرتا ہے، خواہ اس کی نیت تعظیم کی ہو یا نہ ہو بہر حال وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہے جس سے واضح ہے کہ علامہ بیضاوی کی توضیح بالکل غلط ہے، (محمد یحییٰ گوندلوی)۔

ثانیاً۔ وثن، کیلئے عمارت شرط نہیں یہ مفتی صاحب کی زیادتی ہے، لغت عرب کی معروف اور مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

قال ابن الاثیر الفرق بین الوثن والصنم ان الوثن کل ماله جثة معمولة، من جواهر الارض اومن الخشب والحجارة کصورة الادمی تعمل و تنصب فتعبد.

یعنی امام ابن اثیر نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں یہ فرق ہے کہ وثن کہتے ہیں ہر وہ چیز جس کا جثہ (جسم) جواہر الارض سے ہو خواہ وہ لکڑی ہو یا پتھر، انسانی صورت کی بناوٹ جیسا وضع کیا گیا ہو اور اسے گاڑ کر پرستش کی جائے۔ لسان العرب ص ۴۴۲ ج ۱۳۔

یہی معنی لغت عرب کی عظیم الشان ڈکشنری، تاج العروس ص ۳۵۸ ج ۹، میں کیا گیا ہے۔

علامہ فیومی فرماتے ہیں

الوثن الصنم سواء کان من خشب اوحجر اوغیره.

یعنی وثن بت کو کہتے ہیں خواہ وہ لکڑی کا ہو یا پتھر کا یا کسی اور چیز کا، المصباح المنیر ص ۶۴۷ ج ۲۔

علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ ”وکل ما یعبد من دون اللہ فھو وثن صنما کان او غیر صنم“ یعنی اللہ کے علاوہ جس کی بھی عبادت کی جائے وہ وثن ہے خواہ وہ صنم ہو یا نہ ہو۔ (التمہید ص۴۵ ج ۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس چیز کی بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کی جائے اسے وثن و بت کہتے ہیں، عمارت کو وثن نہیں کہتے، اور نبی علیہ السلام اسی کی دعا کر رہے ہیں کہ اللہ میری قبر کو وثن نہ بنانا کہ لوگ میری قبر کی عبادت کریں، اللہ تعالی کا اس قوم پر سخت غضب ہے جنہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو مسجد بنایا۔ (موطا امام مالک صفحہ ۱۵۹)

مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ اس حدیث میں لفظ ،مسجد، کا معنی عبادت ہے ان کے الفاظ ہیں کہ

قبر کو مسجد بنانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی عبادت کی جاوے، جاء الباطل ص۲۹۱ ج ۱۔

لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس سے معلوم ہوا کہ کسی قبر کو مسجد بنانا اس پر عمارت بنا کر اس کی طرف نماز پڑھنا حرام ہے، ص۲۹۱ ج ۱۔

غلط بیانی ہے کیونکہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں عمارت سے منع فرمایا ہے اور مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت میں عبادت سے منع فرمایا، ظاہر ہے کہ عمارت کی عبادت تفسیر نہیں ہوسکتی، الغرض مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت کا الگ مقام ومحل ہے کیونکہ وثن اسے کہتے ہیں جس کی عبادت کی جائے خواہ وہ کچی قبر ہی کیوں نہ ہو جبکہ زیر بحث مسئلہ قبر پر قبہ تعمیر کرنے کا ہے، لہذا ان دونوں کو آپس میں گڈ مڈ نہیں کیا جاسکتا۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے دوھری اذان کی صحیح حدیث کو اس بہانے سے ناقابل عمل قرار دے دیا تھا کہ اس کے الفاظ میں تعارض ہے، دیکھئے جاء الباطل ص۲۰۳ ج ۲۔

جبکہ یہاں ان کے عذرات میں شدید قسم کا تعارض ہے، کہتے ہیں قبر کو نہیں بلکہ لحد کو پختہ کرنے کی ممانعت ہے۔ (۲) پھر اس کے الٹ فرماتے ہیں کہ ہے تو قبر کو ہی پختہ کرنے کا ذکر مگر عامۃ المسلمین کی قبور کا بیان ہے۔

(۳) کبھی یہ کہہ کر پلہ چھڑانے کی فضول کوشش کرتے ہیں کہ ایسی عمارت کی ممانعت ہے جس

میں قبر کا کچھ حصہ شامل کر لیا جائے، (۴) پھر ان تمام ہفوات کے معارض یہ ڈھکوسلہ گھڑتے ہیں کہ ایسی عمارت کی ممانعت ہے جو صاحب قبر کی عبادت کیلئے بنائی جائے۔

اس قسم کے واھیات عذر پیش کرتے ہیں کہ جو آپس میں ہی ٹکرا کر پارہ پارہ ہوگئے ہیں۔

ہماری طرف سے دنیا بھر کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ مفتی صاحب کے ان اعتراضات کی آپس میں موافقت ثابت کردیں، جب یہ ثابت نہ کرسکیں اور کبھی بھی ثابت نہ کرسکیں گے تو پھر جان لینا چاہیئے کہ انکے پاس کوئی تسلی بخش جواب تو کجا دل کو بہلانے کیلئے بھی کوئی بہانہ نہیں۔

رابعاً۔ ہمارا تو یہ مشاہدہ ہے کہ عوام مزارات پر جاکر قبروں پر سجدہ کرتے ہیں اور صاحب قبر کو حاجت روا مشکل کشا اور مالک کل تصور کرتی ہیں ان کی قبور کا طواف کرتے ہیں، چنانچہ ملا علی القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ مشکوٰۃ کی شرح میں، حدیث اللھم لاتجعل قبری وثنا، کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

ای لاتجعل قبری مثل الوثن فی تعظیم الناس و عودھم للزیارۃ بعد بدئھم و استقبالھم نحوہ فی السجود کما نسمع و نشا ھداالان فی بعض المزارات و المشاھد.

یعنی اللہ میری قبر کو وثن کی طرح نہ بنانا، لوگوں کی تعظیم، زیارت کیلئے گھومنے، نا گاہ استقبال کرنے اور سجدہ جیسی چیزوں سے، جیسا کہ ہم اب بعض مزارات پر (ایسے افعال کا کیا جانا) دیکھتے اور سنتے ہیں۔ مرقاۃ المفاتیح ص ۲۲۸ ج ۲۔

بریلوی مکتب فکر کے شیخ الحدیث اور شارح صحیح مسلم مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں کہ ان پڑھ لوگوں کو اولیاء اللہ کی نذریں مانتا دیکھ کر، ان کے مزارات مقدسہ کا طواف اور سجدہ کرتے دیکھ کر اور مزارات کی تعظیم میں رکوع کی حد تک ان پڑھ لوگوں کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک بڑے عرصہ سے رنج اور قلق رہتا ہے ہر چند کہ ان میں سے کوئی چیز کفر اور شرک نہیں ہے (نعوذ باللہ ابو صھیب) لیکن ان کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، شرح صحیح مسلم ص ۵۴۴ ج ۵، طبع فرید بک سٹال الطبع الرابع ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء۔

سعیدی صاحب نے اس عبارت میں قبروں پر سجدہ کرنا ان کا طواف کرنا اور نذر جیسی خالص

عبادت کا ہونا تسلیم کر لیا ہے گو اس کے کفر و شرک ہونے سے انکار کیا ہے مگر حرمت کا اقرار کر لیا ہے، پھر دل کو بہلانے کیلئے ان افعال قبیحہ کا مرتکب عوام کو قرار دے دیا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کیا حدیث میں اس بات کی تخصیص ہے؟

اگر نہیں قطعاً نہیں تو پھر آپ حضرات ان حرکات کی وجہ سے موجودہ دور کے جملہ مزارات کو وثن وصنم اور بت تسلیم کیوں نہیں کرتے!

کیا آپ کسی معتبر دلیل شرعی سے ثابت کر سکتے ہیں کہ وثن وصنم اور بت فقط وہی ہے جس کی خواص نذریں مانیں ان کی قبور کا طواف کریں ان پر سجدہ کریں، اگر ایسا کوئی ثبوت آپ کے پاس ہی نہیں، تو پھر آپ ہمت کر کے آج ہی ان مزارات پر کفر و شرک اور بقول آپ کے فعل حرام، کی وجہ سے وثن وصنم اور بت ہونے کا جماعتی طور پر اعلان کیجئے اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر اس کے خلاف دعوت وتبلیغ کا کام کریں اور ان پڑھ لوگوں کو مزارات پر جا کر اس بات کا قائل کریں کہ آپ کی یہ حرکات شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں۔

مگر قارئین کرام آپ اس بات کو جان لیں کہ بریلوی مکتب فکر جماعتی اس کام کو کبھی بھی نہیں اپنائے گا کیونکہ ایسی دعوت وتبلیغ سے خود بریلوی مذھب کو ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہو جائے گا، اور مبتدعین کے عوام نجدی نجدی کر کے ان کے ایسے پیچھے پڑیں گے کہ انہیں جان کا جنجال پڑ جائے گا اور ان کے علماء یہ کہہ کر میدان چھوڑ دیں گے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔

کیا مزار تعمیر نہ کرنے کا حکم تقویٰ کی وجہ سے ہے؟

یہ ممانعت حکم شرعی نہیں بلکہ زہد وتقوی کی تعلیم ہے جیسے کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں کہ رہنے کے مکانات کو پختہ کرنے سے بھی روکا گیا، بلکہ گرادیئے گئے۔ جاء الباطل ص۲۹۱ ج ا۔

الجواب: اولاً۔ اس اعتراض میں مفتی صاحب کو یہ تو اقرار کرنا پڑا کہ قبروں پر عمارتیں بنانے کی ممانعت موجود ہے مگر اس ممانعت کو وہ زہد وتقوی پر محمول کر رہے ہیں جبکہ پہلے اعتراضات میں سرے سے ہی اس حدیث سے مزارات کی ممانعت کے منکر تھے۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض مفتی صاحب کے اس اعتراض کو تسلیم کر لیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ کیا

بریلوی مکتب فکر کے تمام لوگوں میں بالخصوص علماء میں یکسر زہد وتقوی ختم ہوگیا ہے کہ وہ اس پر عمل پیرانہیں ہیں، اور ان کے بڑے بڑے جید علماء نے آخر مرتے وقت یہ کیوں وصیت نہ کی کہ میری تربت پر مزار تعمیر نہ کرنا کہ یہ زہد وتقوی کے منافی ہے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، جاء الباطل ص۲۷۴ ج۱، تو یہاں آپ نے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی کس دلیل شرعی سے لیا ہے۔

کیا مزارات کی تعمیر پر کوئی صحیح حدیث تو کجا کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی موجود ہے کہ آپ ان میں موافقت کی یہ صورت پیدا کر کے، حدیث جابر رضی اللہ عنہ کو زہد وتقوی پر محمول کر رہے ہیں، اگر نہیں یقیناً نہیں! تو پھر یہ مجازی معنی ہم بلا قرینہ و دلیل کیسے تسلیم کر لیں، اے جی آپ کا فقط احتمال پیدا کرنا کوئی دلیل نہیں بلکہ آپ کے احتمال کی دلیل درکار ہے، جو آپ کے پاس قطعاً نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب دعوی کرتے ہوئے تو آسمان پر جا ٹھہرتے ہیں اور دلیل دیتے ہوئے تحت الثری پر بھی نہیں رکتے۔

رابعاً۔ رہا مفتی صاحب کا پختہ مکان کا عذر لنگ، تو راقم عرض کرتا ہے کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ پختہ مکان تعمیر کرنے کی ممانعت پر کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، اور مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت ضعیف ہونے کے علاوہ ان کے مذہب کی دلیل بھی نہیں، تفصیل آگے ان شاء الرحمٰن، مفتی صاحب کا اصل موضوع سے انحراف، کے زیر عنوان آرہی ہے۔

ساتواں عذر

جب بنانے والے کا یہ اعتقاد ہو کہ اس عمارت سے میت کو راحت یا فائدہ پہنچتا ہے تو منع ہے کہ غلط خیال ہے اور اگر زائرین کی آسائش کیلئے عمارت بنائی جاوے تو جائز ہے۔ جاء الباطل ص۲۹۱ ج۱۔

کیا زائرین کی آسائش کیلئے مزار بنانا جائز ہے؟

الجواب: اولاً۔ اس اعتراض میں بھی قبر پر عمارت تعمیر کرنے کی ممانعت کا مفتی صاحب نے اقرار کرلیا ہے مگر یہاں زہد وتقوی کی بجائے عوام کے غلط خیال پر اسے قیاس کر رہے ہیں، مگر ان کے

اس قیاس پر کوئی دلیل شرعی سرے سے موجود نہیں بلکہ یہ ان کا اپنا قیاس ہے جو غلط اور لغو ہے۔

ثانیاً۔ سوال یہ ہے کہ زائرین کو فقط قبر پر عمارت سے ہی آسائش پہنچتی ہے اگر یہی مقصود ہے تو قبرستان میں درخت لگائے جاسکتے ہیں جس پر ملکی دولت بھی خرچ نہ ہوگی اور ملک کی معیشت پر بوجھ پڑنے کی بجائے، غریب عوام کا روپیہ ملک وقوم کی بہتری کیلئے صرف ہوگا، معلوم ہوا کہ زائرین کی آسائش مقصود ہی نہیں ورنہ یہ بتائیں کہ کتنے اولیاء کی قبروں پر انہوں نے مزار کی بجائے درخت لگائے ہیں، ثابت ہوا کہ مفتی صاحب نے پلہ چھڑانے کیلئے ایک بہانہ تلاش کیا ہے! وبس۔

ثالثاً۔ زیارت قبور کا اگر یہ مقصود ہو کہ مُردوں کے واسطے استغفار اور دعا کی جائے، قبروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو اور اپنی موت اور آخرت یاد پڑے، تو تب یہ کام جائز اور امر مستحب ہے، مگر ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے لوگ زیارت قبور کی بجائے میت سے فیض حاصل کرنے، ان کے نام کی نذریں چڑھانے کی غرض سے مزارات پر جاتے ہیں، اور ایسے زائرین کیلئے وہاں آسائش کیلئے مزارات تعمیر کرنا، اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔

چنانچہ فقہ حنفی کی معروف کتاب، درمختار میں ہے

واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام و ما یوخذ من الدراهم والشمع والذیت و نحوها الی ضرائح الاولیاء الکرام تقربا الیهم فهو بالاجماع باطل و حرام.

معلوم ہونا چاہیئے کہ اکثر عوام مُردوں کے نام پر جو نذریں دیتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اولیاء کرام کا تقرب حاصل کرنے کیلئے مالی نذرانے پیش کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر چراغ اور تیل جلاتے ہیں وغیرہ یہ سب چیزیں بالاجماع باطل اور حرام ہیں۔

باطل وحرام کی شرح میں علامہ عابدین حنفی فرماتے ہیں

لوجوه منها انه نذر لمخلوق و النذر للمخلوق لایجوز لانه عبادة و العبادة لاتکون لمخلوق و منها ان المنذور له میت و المیت لایملک و منها انه ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون الله تعالی و اعتقاده ذلک کفر.

یعنی اس کے باطل وحرام ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مزارات پر

چڑھاوے مخلوق کی نذریں ہیں اور مخلوق کی نذریں جائز ہی نہیں کیونکہ نذر (بھی) عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں، اور ایک یہ کہ جس کی نذر دی جاتی ہے وہ مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، ایک وجہ یہ ہے کہ نذر دینے والا شخص مردوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔ فتاوی شامی ص۴۳۹ ج۲۔

كتاب الصوم باب، مطلب فى النذر الذى يقع للاموات من اكثر العوام من شمع اوزيت او نحوه، طبع ايچ ايم سعيد كمپنى كراچى.

اس حقیقت کا خود مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے فرماتے ہیں کہ

فقہاء اس کو حرام کہتے ہیں جو کہ اولیاء کے نام کی نذر شرعی مانی جائے اسی لئے فرماتے ہیں، تقرباً الیھم، نذر شرعی عبادت ہے اور وہ غیر اللہ کیلئے ماننا یقیناً کفر ہے۔ جاء الباطل ص۳۰۷ ج۱۔

جب بریلوی مکتب فکر کے حکیم الامت مفتی اعظم اور نام نہاد مفسر قرآن کو اس کے کفر کا اقرار ہے تو پھر ہم اس مقام پر علماء بریلویہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ آپ پاک و ھند کے کسی مزار پر تشریف لے جائیں، وہاں آپ زائرین سے سوال کریں کہ یہاں آپ کس مقصد کے حصول کیلئے آئے ہیں؟ یقین جانئے کہ آپکو تمام زائرین یہی کہیں گے میں تو دعا کرنے آیا تھا کہ میری فلاں مصیبت وغم دور ہو کیونکہ یہاں اس کے وسیلہ و برکت سے دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اور میں نے نذر مانی ہے کہ اگر مصیبت دور ہوئی تو میں اس کے نام کی ایک دیگ اتاروں گا، یا یہاں لاکر بکرا ذبح کروں گا، بعض ایسے بھی ہونگے جنہوں نے ہاتھ میں ککڑ پکڑا ہوگا اور وہ قبر پر کہہ رہے ہوں گے کہ لے لے ککڑ دے دے پتر۔

بعض لوگ اس کی قبر پر جبیں رگڑ رہے ہونگے اور زبان حال سے کہہ رہے ہونگے کہ داتا میری فلاں مراد پوری کردے، کئی حضرات بکرا پکڑے جا رہے ہونگے آپ کے سوال کرنے پر جواب دیں گے کہ میں نے فلاں وجہ سے داتا کی نذر مانی تھی۔ بعض مقام پر کئی کم بخت آپ کو قبر کا طواف کرتے بھی ملیں گے۔

یہ ہماری بدظنی نہیں آیئے فقہاء احناف سے اس کی تصدیق کروا دیتے ہیں، علامہ ابن نجیم حنفی،

شارح کنزالدقائق، اپنی شرح میں شیخ قاسم کی، شرح الدرر، سے نقل کرتے ہیں کہ

واما النذر الذی ینذرہ اکثر العوام علی ما ھو مشاھد کان یکون لانسان غائب او مریض او لہ حاجۃ ضروریۃ فیاتی بعض الصلحاء فیجعل سترۃ علی راسہ فیقول یا سیدی فلان ان رد غائبی اور عوفی مریض او قضیت حاجتی فلک من الذھب کذا، او من الفضۃ کذا او من الطعام کذا او من الماء کذا او من الشمع کذا او من الذیت کذا فھذا النذر باطل بالاجماع لوجوہ منھا انہ نذر مخلوق والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق ومنھا ان المنذور لہ میت والمیت لایملک ومنھا ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالی واعتقادہ ذلک کفر.

یعنی اکثر عوام نذر مانتی ہے اور مشاہدہ ہے وہ کسی غائب انسان کے لئے ہوتی ہے یا مریض کے لئے یا اس کے لئے کہ کوئی ضروری حاجت ہوتی ہے تو بعض نیک لوگوں کی قبروں پر آ کر اس کا غلاف اپنے مرید رکھ کر کہتے ہیں کہ اے میرے آقا! اگر میرا غاب واپس کر دیا گیا یا میرا مریض شفا یاب ہو گیا یا میری حاجت پوری کر دی گئی تو تیرے لیے اتنا سونا یا اتنی چاندی یا اتنا غلہ یا اتنا پانی یا اس قدر شمع یا اتنا تیل نذر دوں گا، یہ نذر اجماع کے ساتھ باطل ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کے لئے نذر ماننا جائز نہیں، اس لئے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کے لئے نذر مانی ہے وہ مردہ ہے، اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، تیسرا یہ کہ نذر ماننے والے نے یہ یقین کیا کہ میت اللہ کے علاوہ متصرف فی الامور ہے تو اس کا یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ (البحر الرائق ص ۲۹۸ ج ۲)۔

آپ کو لاکھوں میں ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہ ہوگا جو یہ کہے کہ میں نے نذر تو اللہ کی مانی تھی مگر ساتھ یہ قید لگائی تھی اس کا ثواب شیخ کی روح کو ملے یا اس کے جوار میں بنی ہوئی مسجد کے لوگوں کو یہ کھانا کھلاؤں گا جیسا کہ بریلوی علماء نے اس کفر و شرک کی یہ تاویل کر رکھی ہے۔

جب یہ صورت حال ہے تو کیا آپ اس صریح کفر و شرک کی آسائش کیلئے مزارات تعمیر کرواتے ہیں، آپ حضرات کا محض کتابوں میں یہ لکھ دینا کہ ان پڑھ لوگوں کو اولیاء اللہ کی نذریں

مانتا دیکھ کر، ان کے مزارات مقدسہ کا طواف اور سجدے کرتے دیکھ کر اور مزارات کی تعظیم میں رکوع کی حدتک ان پڑھ لوگوں کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک بڑے عرصہ سے رنج وقلق رہتا ہے، شرح مسلم ص۵۴۴ ج۵۔

کافی نہیں ہے کیونکہ اس بیماری کی اصل جڑ مزارات ہیں نا کہ ان پڑھ ہونا کیونکہ عوام تو اہلحدیث کے بھی علوم اسلامیہ سے نا واقف ہوتے ہیں، مگر وہ ان تمام افعال شنیعہ سے بفضلہٖ تعالیٰ محفوظ رہتے ہیں اس کے برعکس آپ حضرات نے انہیں ایسی لائن پر چلایا ہے جو شریعت کی اصل راہ کو ہی بھلا دینے والی ہے اور انسان اس پر چل کر گمراہ ہو کر کفر و شرک کی وادی میں غوطہ زن ہونے لگتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ ایسے لوگوں کی آسائش کے بہانے سے مزارات کی تعمیر کا جواز فراہم کرنا خالص توحید دشمنی ہے۔

تنبیہ اول

حضرت مفتی اعظم نے مذکورہ توجیہات بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ہم نے یہ توجیہیں اس لئے کیں کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے خاص خاص قبروں پر عمارات بنائی ہیں، اس کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منتقیٰ شرح موطا امام مالک میں ابو عبد سلیمان علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زینب (بنت) جحش کی قبر پر قبہ بنایا حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے اپنے بھائی عبدالرحمان کی قبر پر قبہ بنایا محمد بن حنفیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر قبہ بنایا او رجس نے قبہ بنانا مکروہ کہا ہے تو اس کیلئے کہا جو کہ اس کو فخر و ریا کیلئے بنائے ، جاء الباطل ص۲۹۲ ج۱۔

کیا صحابہ کرامؓ نے خاص خاص قبروں پر قبے بنائے تھے؟

الجواب: اولاً۔ منتقیٰ کے مولف کا نام ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی (المتوفی ۴۷۴ھ) ہے معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے کہاں سے اس عبارت کو نقل کر کے نام علامہ باجی کا لگا دیا ہے۔

ثانیاً۔ علامہ باجی کی منتقیٰ، موطا کی شرح ابن عبدالبر کی تلخیص ہے، مقدمۃ تحفۃ الاحوذی

ص ۸، اورامام ابن عبدالبر کی شرح کو دیکھ لیا گیا ہے اس میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں، دیکھئے التمھید لمافی الموطا من المعانی والاسانید ص ۱۴ ج ۵.

اس تحریر کے بعد راقم نے مولانا عطاء اللہ حنیف رحمتہ اللہ کی لائبریری میں جا کر علامہ باجی کی شرح موطا کو بھی دیکھ لیا تھا، مگر اس میں ایسی کوئی روایت نہیں، یہ سب مبتدعین کے مفتی کی سینہ گزٹ باتیں اور کذب و افترا ہے، اللہ انہیں سمجھ کی توفیق دے، ابو صھیب۔ (۱۲-جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ)

الغرض یہ اور اسی طرح کی جملہ روایات بے سند ہیں، فریق ثانی پہ لازم ہے کہ وہ انکی کوئی صحیح و متصل سند ثابت کریں ورنہ اکابرین امت پر جھوٹ بولنے سے گریز کرے کہ کل اللہ تعالی کو کیا جواب دیں گے۔

ثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ خارج میں ان کی کوئی صحیح و معتبر سند موجود ہے (جو کہ حقیقت میں قطعاً نہیں) تو جواب ان کا یہ ہے کہ یہ روایات موقوف ہیں جو کہ حدیث مرفوع متصل کے معارض نہیں ہوسکتیں، خود حضرت حکیم الامت مفتی اعظم اور مفسر قرآن الحاج احمد یار خاں گجراتی فرماتے ہیں

حدیث مرفوع کے مقابل اجتہاد صحابی قبول نہیں، جاء الباطل ص ۱۸۹ ج ۱۔

مولانا غلام رسول سعیدی الحنفی بریلوی فرماتے ہیں کہ

یاد رکھیے کہ جب کوئی مسئلہ حدیث سے ثابت ہو اور اس کے معارض اور مخالف کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں اس حدیث پر عمل کرنا ہی صحیح دین ہے اور کوئی شخص اپنی جگہ پر کتنا ہی بڑا بزرگ اور عالم دین کیوں نہ ہولیکن جب وہ حدیث صریح کے خلاف کوئی بات محض اپنی رائے سے بلا دلیل کہتا ہو تو صحیح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں اس کی ذاتی رائے کو چھوڑ دینا ہی ھدایت اور راہ استقامت ہے بعد کا کوئی شخص علم و فضل میں کتنا ہی فائق کیوں نہ ہو صحابہ سے نہیں بڑھ سکتا اور جب اصول یہ ہے کہ قول صحابی بھی اگر حدیث رسول کے معارض ہو تو حدیث کے مقابلہ میں اس قول کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ذکر بالجہر ص ۱۰۵۔

اگر حدیث رسول کے خلاف صحابہ رضی اللہ عنھم بھی کوئی بات محض اپنی رائے سے کہیں تو حضور

ﷺ کے مقابلہ میں ان کی رائے کا بھی کوئی اعتبار نہ ہوگا، ایضاً ص۱۲۵ طبع فرید بک سٹال ۷ ۱۳۹ھ ۱۹۷۷ء۔

یہی کچھ یہاں ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض ان اقوال کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی یہ احادیث صحیحہ وصریحہ کے معارض ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔

تنبیہ ثانیہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آنحضرت ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے اور بذعم خود مفتی صاحب نے اس کا جواب بھی عنایت فرمایا ہے جس کی پوری تفصیل آگے ان شاء الرحمٰن آرہی ہے لہذا اسے ہم یہاں غیر متعلقہ مقام پر ذکر کرنا مناسب نہیں جانتے، اس لئے قارئین ورق الٹ کر اسے وہاں سے ہی ملاحظہ کرلیں۔

مزارات کے رد میں دوسری حدیث

معروف تابعی حضرت ابی الھیاج الاسدی کوفی فرماتے ہیں

قال لی علی الا ابعثک ما بعثنی علیه رسول اللهﷺ ان لاتدع تمثالا الا طمسته ولا قبر مشرفا الاسویته.

مجھے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا میں تجھے اس کام کے واسطے نہ بھیجوں جس کیلئے مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا وہ یہ کہ کوئی فوٹو اور مجسمہ مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اسے (عام قبروں) کے برابر کر دینا۔

صحیح مسلم ص۳۱۲ ج۱، ومسند احمد ج۱ ص ۹۶ و ۱۱۱ و ۱۲۹ و ۱۴۵، و ترمذی مع تحفہ ص۱۵۴ ج۲، و ابوداود ص۱۰۳ ج۲، و نسائی (مجتبی) ص ۲۳۱ ج۱، و السنن الکبری للبیهقی ص۳ ج۴، و مستدرک حاکم ص۳۶۹ ج۱، و ابو یعلی ص۱۹۹ ج۱.

اس صحیح وصریح حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو

اونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا، اس صحیح حدیث سے انکار کیلئے مفتی صاحب نے جو چور دروازے نکالے ہیں انکی حقیقت ترتیب وار ملاحظہ کریں۔

مفتی صاحب کا پہلا عذر

جن قبروں کو گرانے کا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا وہ کفار کی قبریں تھیں اس کی چند وجوہ ہیں اولاً تو یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم کو اس کام کیلئے بھیجتا ہوں جس کیلئے مجھے حضور علیہ السلام نے بھیجا۔

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جن قبروں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گرایا وہ مسلمانوں کی قبریں نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ ہر صحابی کے دفن میں حضور علیہ السلام شرکت فرماتے تھے۔

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کوئی کام بھی حضور علیہ السلام کے بغیر مشورہ کے نہ کرتے تھے لہذا اس وقت جس قدر قبور مسلمین بنیں، وہ یا تو حضور کی موجودگی میں یا آپ کی اجازت سے، تو وہ کون سے مسلمانوں کی قبریں تھیں جو کہ ناجائز بن گئیں اور ان کو مٹانا پڑا! ہاں عیسائیوں کی قبور اونچی ہوتی تھیں، بخاری شریف ص۶۱ مسجد نبوی کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

امر النبی ﷺ بقبور المشرکین فنبشت .

حضور علیہ السلام نے مشرکین کی قبروں کا حکم دیا پس اکھیڑ دی گئیں۔

بخاری شریف ص۶۱ میں ایک باب باندھا، باب ھل ینبش قبور مشرکی الجاھلیۃ ، کیا مشرکین زمانہ جاہلیت کی قبریں اکھیڑ دی جاویں اسی کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری شرح جلد دوم ص۲۶ میں فرماتے ہیں ما سوا انبیاء اور ان کے متبعین کے کیونکہ انکی قبریں ڈھانے میں ان کی اہانت ہے، اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ جو قبرستان ملک میں آگیا اس میں تصرف کرنا جائز ہے اور پرانی قبریں اکھاڑ دی جاویں بشرطیکہ محترمہ نہ ہوں۔

اس حدیث اور اس کی شرح نے مخالف کی پیش کردہ حدیث علی رضی اللہ عنہ کی تفسیر کر دی ہے کہ مشرک کی قبریں گرائی جاویں دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کیوں ذکر ہے مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفار کی قبریں ہی مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میت کا فوٹو بھی ہوتا ہے۔

(جاء الباطل ص۲۹۴ ج ۱)

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب کو پہلی بات تب مفید تھی جب وہ دلائل سے ثابت کردیتے کہ قبروں پر قبہ بنانے کی ممانعت پہلے کی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قبوں کے گرانے کا حکم بعد میں ملا تھا، جب اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں تو پھر یہ اعتراض ہی لغو ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا نبش قبور اور تسویہ قبور کو ایک قرار دینا ان کی جہالت محض ہے، بات یہ ہے کہ جب انسان راہ ھدایت سے بھٹک جاتا ہے تو وہ عقل و خرد سے کورا اور علم دین سے بے بہرہ ہوجاتا ہے۔

آیئے ہم آپکو انکی حقیقیت سمجھا دیں اللہ تعالی آپ حضرات کو سمجھنے اور سوچ و بچار کی توفیق عطا کرے۔

لفظ سوّی حالت اور مقدار کی برابری کیلئے آتا ہے اور یہ وسیع المفہوم لفظ ہے جس میں درست اور ٹھیک ٹھاک کرنا سب کچھ آجاتا ہے، قرآن میں ہے کہ

الذی خلقک فسوٰک فعدلک (الانفطار آیت ۷)

جس نے تجھے پیدا کیا پھر ٹھیک بنایا پھر ہموار فرمایا۔ (احمد رضا خاں بریلوی)

اس آیت کا مقصود تو یہ ہے کہ انسان کو ایسا پیدا کیا جس کے اعضاء اور قد و قامت میں مناسبت پیدا فرمائی اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے کہ دیگر قبور سے اس کی موافقت و مناسبت پیدا کردی جائے اور اونچے اونچے بنے ہوئے مزارات کو گرا کر انہیں عام قبروں کے برابر کر دیا جائے تا کہ امتیاز نہ رہے۔

چنانچہ علامہ ماردینی حنفی المتوفی ۷۴۵ھ اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

الاسویته بالقبور المعتادة: الجوھر النقی علی البیھقی ص ۳ ج ۴.

برابر کرنے کا یہ معنی ہے کہ ان کو ان قبروں کے ساتھ برابر کردیا جائے جن کا شریعت کی عادت سے ثبوت ہوچکا ہے۔

جب آپ نے تسویہ قبور کا معنی معلوم کرلیا تو اب آیئے ہم آپ کو نبش قبور کا معنی بھی لغت عرب کے مسلّم آئمہ سے دکھادیں تا کہ حق واضح ہوجائے۔ **واللہ یھدی من یشاء۔**

علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

نبش استخرجه بعد الدفن نبش الموتی استخراجهم، (لسان العرب ص ۳۵۰ ج ۶)

یہی معنی علامہ محمد مرتضی زبیدی نے کیا ہے ان کے الفاظ ہیں۔

اذا استخرجه بعد الدفن نبش الموتی استخراجهم، (تاج العروس ۳۵۳ ج ۴).

ان دونوں عبارتوں کا مفہوم یہ ہے کہ، نبش، کہتے ہیں کسی مدفون چیز کو (زمین کھود کر) باہر نکالنا اور،نبش الموتی، کا معنی ہے کہ مردے کو باہر نکالنا۔

یہ دونوں کتب عربی لغات میں امھات الکتب ہوتیں ہیں اور ان کے بیان کردہ معنی کو آج تک چیلنج نہیں کیا گیا کیونکہ یہ لوگ لغات عرب کی فصاحت و بلاغت سے کما حقہ واقف ہیں وہ اس زبان کی باریکیاں اور حقیقی و مجازی معنی جاننے کی وجہ سے اپنے فن میں امام تسلیم کیئے گئے ہیں، ان سے بھی بڑھکر لغت عرب کے مسُلّم امام جناب علامہ زمخشری حنفی (التوفی ۵۳۸ھ) جو کہ بلا کے ادیب اور انشاء پرواز تھے جن کے اقوال کو آئمہ لغت بھی بطور حجت پیش کرتے ہیں وہ نبش کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

نبش الارض عما تحتها نبشا و منه نبش القبر.

یعنی،نبش الارض، کا معنی زمین کھود کر اس کے نیچے جو چیز (مدفون) ہے اسے باہر نکالنا اور اسی سے ہی محاورہ،نبش القبر، ہے۔ اساس البلاغۃ ص۴۴۳۔

اسی کے قریب قریب ہی علامہ فیومی نے، المصباح المنیر ص ۵۹۰ ج ۲۔ میں معنی کیا ہے۔

جب آپ نے ،نبش القبور، کے معنی کو بخوبی سمجھ لیا ہے تو اب ٹھنڈے دل سے ہماری گزارشات کو ملاحظہ کریں، حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری شریف ص ۶۱ ج ۱ میں ایک باب باندھا ہے کہ

باب هل تنبش قبور مشرکی الجاهلیة و یتخذ مکا نها مساجد الخ.

اس باب کے تحت حضرت امام متعدد احادیث لائے ہیں ، اور مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کر

وہاں مسجد نبوی کی تعمیر کا واقعہ بھی انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب نبی کریم حضرت محمد مصطفی ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تو وہاں چند دن گزارنے کے بعد مسجد نبوی بنانے کا ارادہ فرمایا تو

فارسل الی ملاء من بنی النجار فقال یابنی النجار ثامنونی بحا ئطکم هذا قالوا والله لانطلب ثمنه الا الی الله عز وجل فقال انس فکان فیه ما اقول لکم قبور المشرکین و فیه خرب و فیه نخل فامر النبی ﷺ بقبور المشرکین فنبشت ثم بالخرب فسویت و بالنخل فقطع النخل. الحدیث.

یہی حدیث امام مسلم نے اپنی صحیح ص۲۰۰ ج۱ میں روایت کی ہے، آیئے اس کا ترجمہ ایک بریلوی مترجم مولوی غلام رسول سعیدی صاحب کے قلم سے ملاحظہ کریں۔

اور بنو نجار کے سرداروں کو بلایا جب وہ آئے تو فرمایا، تم اپنا باغ مجھے فروخت کر دو انہوں نے عرض کیا بخدا ہم آپ سے باغ کی قیمت نہیں لیں گے، ہم اس کا معاوضہ خدا سے چاہتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس باغ میں جو چیزیں تھیں انہیں میں بتاتا ہوں اس میں کھجوروں کے درخت مشرکین کی قبریں اور کھنڈرات تھے رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درخت کاٹنے کا حکم دیا، وہ کاٹ دیئے گئے، مشرکین کی قبریں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور کھنڈرات ہموار کر دیئے گئے۔ الحدیث شرح صحیح مسلم ص۶۳ ج۲، طبع فرید بک سٹال ۱۹۹۴ء۔

اس حدیث نے تمام عقدے حل کر دیئے کہ نبش القبور کہتے ہیں قبروں کو اکھاڑ کر پھینک دینا، جب مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ دیا گیا تو انکی ہڈیوں کو بقول بریلوی مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب بھیروی کے کہ ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا اور ان پر مٹی ڈال دی گئی۔ ضیاء النبی ص۱۵۰ ج۳ طبع ضیاء القران پبلی کیشنز ۱۴۱۵ھ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تسویہ قبور کا حکم الگ ہے اور نبش القبور کا واقعہ مشرکین کی قبروں کے ساتھ ایک خاص ضرورت کے تحت پیش آیا اور مفتی صاحب کا ان دونوں کو ایک باور کرانا اور نبش القبور کو تسویہ قبور کی تفسیر قرار دینا۔

(جاء الباطل ص۲۹۴ ج۱)

ان کی جہالت محض ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ تو قبوں کو گرانے کا ہے اور نبش القبور میں کفار کی قبروں کو اکھاڑ کر پھینک دینے کا بیان ہے، انہیں ایک باور کرانا مفتی صاحب کا خالص شیطانی وسواس ہے، جس کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں، معلوم نہیں کہ اس طرح کی ھیرا پھیریاں اور انکار حدیث کیلئے اسی طرح کی عیاریاں انہیں شیطان کی طرف سے القا ہوتی تھیں۔

ثالثاً۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث کے انکار کیلئے مفتی صاحب نے مذکورہ مکاری سے بھی بدتر ایک عذر یہ بھی کر رکھا ہے کہ اس میں فوٹو کا بھی ذکر ہے حالانکہ مسلمان کی قبر پر فوٹو نہیں ہوتا، بلکہ کفار کی قبروں پر میت کا فوٹو ہوتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اول تو ہم مفتی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ حدیث میں اس کا کب ذکر ہوا ہے، جو قبر پر تصویر ہو اسے مٹا دینا، یہ آپ کی زیادتی ہے اور بات کو گڈ مڈ کرنے کی سعی لاحاصل ہے، ان دونوں کا حکم الگ الگ ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ

ولا صورة في بيت

کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا، سنن نسائی ۲۳۱ ج ۱، وبیھقی ص ۳ ج ۴، والسنن الکبریٰ للنسائی ص ۶۵۳ ج ۱۔

ان الفاظ سے حدیث کا معنی متعین ہوگیا کہ گھروں میں کوئی تصویر مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور قبرستان میں کوئی بھی اونچی قبر گرائے بغیر نہ رہنا۔

یہ بات ہم مبتدعین کی صواب دید پر چھوڑتے ہیں کہ اس دور میں بالعموم اور آج کل بالخصوص مسلمانوں کے گھروں میں تصاویر ہوتی ہیں یا نہیں۔

کیا یہ حکم کفار کی قبروں کے متعلق تھا؟

دوم۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بالغرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص کفار کی اونچی قبریں گرانے کا حکم دیا تھا تو تب بھی یہ بات مبتدعین کو مفید نہیں کیونکہ ایک اور طریق میں اسی حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ہی رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ان افعال سے منع

فرمایا ہے اور اس کے فاعل کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کان رسول الله ﷺ فی جنازة فقال ایکم ینطلق الی المدینة فلا یدع بها وثنا الا کسره ولا قبراً الاسواه ولا صورة الالطخها؟ فقال انا یارسول اللهﷺ فانطلق فهاب اهل المدینة فرجع فقال علی رضی الله عنه انا انطلق یارسول اللهﷺ، قال فانطلِقْ فانطلق ثم رجع فقال یارسول اللهﷺ لم ادع بها و ثنا الا کسرته ولا قبرا الا سویته ولا صورة الالطختها، ثم قال رسول الله ﷺ من عادلصنعه شئی من هذا فقد کفر بما انزل علی محمد ﷺ، الحدیث.

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے آپ علیہ السلام نے فرمایا، تم میں سے کون ہے جو مدینہ میں جا کر کوئی بت توڑے بغیر نہ رہے اور کوئی اونچی قبر کو (عام قبروں) کے برابر کرے بغیر نہ رہے اور ہر تصویر کو مٹا دے، چنانچہ ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں اس کام کیلئے تیار ہوں چنانچہ وہ گیا اور اہل مدینہ سے ڈر کر بھاگ آیا، اس پر حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جا کر یہ کام کرتا ہوں چنانچہ وہ گئے پھر واپس آ کر کہا میں نے ہر بت کو توڑ ڈالا، ہر اونچی قبر کو عام قبروں کے برابر کردیا اور ہر تصویر کو مٹا ڈالا ہے اس رپورٹ کے بعد اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کہا آئندہ جو شخص بھی ان چیزوں میں سے کسی ایک کی طرف پلٹا کہ اسے کیا تو اس شخص نے دین سے کفر کیا جو محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا گیا۔ الحدیث مسند امام احمد ص ۸۷ و ۱۳۸ ج ۱، ومسند طیالسی (۹۶) علامہ منذری نے اس کی سند کو جید کہا ہے، (الترغیب ص ۴۵ ج ۴)۔

کیوں جناب کیا آنحضرت ﷺ کے اس آخری فقرے کا تعلق بھی کفار سے ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں! تو پھر آپ اس حکم کو کفار کی قبروں کے ساتھ خاص کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں! جسے اللہ کے پیارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ اپنی امت کے متعلق کہہ رہے ہوں اور اس فرمان کا انکار کر کے دوبارہ قبروں کو اونچی تعمیر کرنے والے کو دین اسلام کا باغی قرار دے رہے ہوں، افسوس مفتی صاحب حکیم الامت اور مفسر قرآن ہو کر علل حدیث میں اس قدر کمزور کیوں تھے؟ یا جان بوجھ کر پیٹ کی خاطر

ایسی تاویلیں کر کے اپنی آخرت برباد کرتے رہے۔ اللہ ھدایت اور سمجھ کی توفیق دے آمین۔

دوسرا عذر

اونچی قبر کو زمین کے برابر کردو، اور مسلمان کی قبر کیلئے سنت ہے کہ زمین سے ایک ہاتھ اونچی رہے اسکو بالکل پیوند زمین کرنا خلاف سنت ہے، ماننا پڑے گا کہ یہ قبور کفار کی تھیں ورنہ تعجب ہے کہ سیدنا علی تو اونچی قبریں اکھڑ وائیں اوران کے فرزند محمد ابن حنفیہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر قبہ بنائیں، اگر کسی مسلمان کی قبر اونچی بن بھی گئی تب بھی اس کو نہیں اکھیڑ سکتے کیونکہ اس میں مسلمان کی توہین ہے۔

اولاً۔ اونچی نہ بناؤ مگر جب بن گئی تو نہ مٹاؤ، قرآن پاک چھوٹا سائز چھاپنا منع ہے، دیکھو شامی کتاب الکراھیت، مگر جب چھپ گیا تو اس کو پھینکو نہ جلاؤ کیونکہ اس میں قرآن کی بے ادبی ہے احادیث میں وارد ہے کہ مسلمان کی قبر پر بیٹھنا وہاں پاخانہ کرنا، وہاں جوتے سے چلنا ویسے بھی اس پر چلنا پھرنا منع ہے مگر افسوس ہے کہ نجدی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے مزارات گرائے اور معلوم ہوا ہے کہ اب جدہ میں انگریز عیسائیوں کی اونچی اونچی قبریں برابر بن رہی ہیں۔

صدق رسول اللہ ﷺ یقتلون اھل الاسلام و یترکون اھل الاصنام .

ہر ایک کو اپنی جنس سے محبت ہوتی ہے۔جاء الباطل ص۲۹۵ ج۱۔

الجواب: اولاً۔ بجا فرمایا جناب نے کہ ہر ایک کو اپنی جنس الخ غالباً اس محبت و پیار اور آپس میں رشتہ شرک کی وجہ سے ہی آپ حضرات عیسائیوں کی تقلید میں مزارات تعمیر کرتے ہیں، مبارک ہو۔

ثانیاً۔ جدہ میں کفار کی اونچی اونچی قبور بننے کی خبر پر ہم، لعنت اللہ علی الکاذبین، ہی کافی سمجھتے ہیں۔

ثالثاً۔ قبر کو قرآن کے چھوٹے سائز پر چھاپنے کی ممانعت پر قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ فتاوی شامی نبی ﷺ کی لکھی ہوئی نہیں جس کا ہر حکم و فیصلہ حجت اور دلیل شرعی ہو۔ یہ علامہ ابن عابدین کا اپنا قیاس ہے، جب کہ قبور کو اونچا کرنے کی ممانعت کا قول امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کا ہے، جو حضور علیہ السلام کی بات کو دلیل شرعی نہ جانے اور آپ علیہ السلام کے فرمان کو فتاوی شامی کے قول و اقوال کے برابر جانے۔ ایسے آدمی کا دین اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

رابعاً۔ یہ قرآن ہے یا حدیث کہ جب قبر اونچی بن جائے تو اسے گرایا نہ جائے کہ اس میں مسلمان کی توہین ہے، جب یہ باتیں قرآن وسنت ہی نہیں بلکہ گجرات کے بقلم خود مفتی اعظم کی قیاسات فاسدہ ہیں تو انہیں کون مانتا ہے۔

کمال ہے کہ حضو علیہ السلام تو اونچی قبروں کو گرانے کا حکم دیں، مگر مفتی صاحب کہتے ہیں کہ جب بن جائیں تو گرانا جائز نہیں، میں پوچھتا ہوں کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا تو آنحضرت ﷺ کو یہ بات نہ سوجھی کہ یہ بن گئی ہیں انہیں رہنے دو اور آئندہ نہ بنانا۔

خامساً۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ۔

قال الشافعی فی الام ورایت الائمۃ بمکۃ یامرون بھدم ما یبنیٰ.

یعنی حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام ص ۲۷۷ ج ۱ باب ما یکون بعد الدفن، میں تحریر کیا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں اماموں کو قبروں پر عمارات ڈھانے کا حکم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (شرح صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۱)۔

ہم مبتدعین سے پوچھتے ہیں کہ کہیں یہ آئمہ بھی نجدیوں اور وہابیوں کے تھے جو حضرت امام شافعی کے زمانہ میں قبروں سے قبوں کو گرا رہے تھے۔

سادساً۔ قبر کی اونچائی ایک ہاتھ ہونے پر کوئی حدیث موجود نہیں، اسے مفتی صاحب کا سنت قرار دینا آنحضرت ﷺ پر افترا ہے۔

نبی ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی قبر ایک بالشت رکھی تھی، دیکھئے الفتح الربانی ص ۷۵ ج ۷، سنن بیہقی کی ایک حسن حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک بھی زمین سے تقریباً ایک بالشت اونچی بنائی گئی تھی۔ السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۴۱۰ ج ۳۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب فتاوی عالم گیری میں ہے کہ

ویسنم القبر قدر الشبر. عالم گیری ص ۱۷۶ ج ۱.

یعنی قبر کو کوہان کی طرح بنایا جائے اور وہ بھی صرف ایک بالشت۔

مگر سنت خیر الانام ﷺ اور فقہاء احناف کی تصریحات کے برعکس مفتی صاحب کی تحقیق ہی نرالی

ہے کہ قبر ایک ہاتھ اونچی ہونی سنت ہے۔

سابعاً۔ تسویہ قبور کا معنی و مفہوم تفصیل سے گزر چکا ہے نیز آگے بھی آرہا ہے، لہذا اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ثامناً۔ رہی یہ حدیث کہ یقتلون اہل الاسلام الخ تو اس کی مکمل بحث اپنے مقام پر موجود ہے اسے وہاں سے ہی دیکھ لیا جائے، ہاں البتہ اس چیز کا شکوہ کیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ نجدیوں کے رد میں اس طرح کی احادیث مبتدعین ساری زندگی منبر پر بڑے ترنم سے گنگناتے رہا کرتے ہیں مگر الفاظ حدیث انہیں یاد نہیں ہوتے اور یہ خدا کی طرف سے لعنت کی پھٹکار ہے، آیئے حدیث کے اصل الفاظ ملاحظہ کریں۔

یقتلون الاسلام و یدعون اهل الاوثان. (صحیح بخاری ص ۴۷۲ ج ۱)

تیسری حدیث

معروف تابعی حضرت ثمامہ بن شفیؒ بیان کرتے ہیں کہ

کنامع فضالة بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالة بقبره فسوی ثم قال سمعت رسول اللهﷺ یا مر بتسو یتها.

یعنی ہم (صحابی رسول) حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ روم کی سرزمین کے مقام رودس پر تھے، تو ہمارے ایک ساتھی کا انتقال ہوگیا حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے ان کی قبر کو عام قبروں کے ساتھ برابر کرنے کا حکم فرمایا، پھر کہا میں نے رسول اللہﷺ سے سنا ہے کہ آپ علیہ السلام قبر کو (عام مقابر کے ساتھ) برابر کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

صحیح مسلم ص ۳۱۲ ج ۱، و ابوداؤد ص ۱۰۵ ج ۱، و نسائی (مجتبیٰ) ص ۲۳۱ ج ۱، و بیہقی ص ۳ ج ۴، و السنن الکبری للنسائی ص ۶۵۳ ج ۱۔

فائدہ جلیلہ

اس صحیح و صریح حدیث سے مفتی صاحب کے اس زعم باطل کا رد بخوبی ہوگیا کہ تسویہ قبور کا حکم کفار کی قبروں سے ہے، علاوہ ازیں یہی روایت امام المغازی محمد بن اسحاقؒ کے طریق سے بھی مروی ہے جس کے الفاظ ہیں کہ۔

فلما دفناه قال خففوا عنه التراب فان رسول الله ﷺ کان یامرنا بتسویة القبور.

جب ہم انہیں دفن کر چکے تو حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، قبر پر سے مٹی تھوڑی او رہلکی کرو کیونکہ آنحضرت ﷺ ہمیں قبروں کو برابر کرنے کا حکم فرماتے تھے ، السنن الکبری للبیھقی ص ۴۱۱ ج ۳۔

اس حدیث کے الفاظ نے ،تسویہ قبور، کا معنی و مطلب بھی واضح کر دیا کہ زمین کے ساتھ برابر کرنا نہیں (جیسا کہ مفتی صاحب کا زعم باطل ہے، جاء الباطل ص ۲۹۴ ج ۱)

بلکہ قبر پر تھوڑی مٹی ڈالنا اور عام قبروں کے برابر کرنا مقصود و مطلوب ہے، یہی معنی فقہاء احناف نے کیا ہے، چنانچہ علامہ حلبی حنفی شرح منیہ میں فرماتے ہیں کہ

فالمراد ماکانوا یفعلونه من تعلیة القبور بالبناء الحسن الرفیع.

یعنی تسویہ سے مراد اونچی قبروں اور اس پر بلند و بالا اور عالی شان بنائی گئی عمارت کو گرانا ہے۔ حلبی کبیر ص ۵۹۹۔

یہی بات علامہ ابن ہمام الحنفی (المتوفی ۶۸۱) نے ھدایہ کی شرح میں تحریر کی ہے ان کے الفاظ ہیں

فهو علی ماکانوا یفعلونه من تعلیة القبور بالبناء الحسن العالی و لیس مرادنا ذلک القدر بل قدر مایبدو من الارض و یتمیز عنها.

یعنی یہ حدیث اونچی قبروں اور اس پر بلند و بالا اور عالی شان بنائی گئی عمارات کو گرانے کے متعلق ہے نا کہ قبر مسنم (کوہان نما) کی مقدار کو گرانا ہے بلکہ ایسی مقدار ہے جو زمین سے اتنی اونچی ہو جو کہ عام قبروں سے ممتاز ہو۔ فتح القدیر ص ۱۰۱ ج ۲۔

علامہ ابن نجیم حنفی (المتوفی ۹۷۰) کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

ویسنم قدر شبر و قیل قدر اربع اصابع و ما ورد فی الصحیح من حدیث علی ان لادع قبر امشرفا الاسویته فمحمول علی مازاد علی التسنیم، البحرالرئق ص ۱۹۴ ج ۲.

یعنی قبر کو کوہان نما بالشت کی مقدار میں بلند کرے اور کہا گیا کہ چار انگلیوں کی مقدار جتنی بلند ہو اور جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں بلند قبر کو برابر کرنا آیا ہے وہ مقدار سے زائد پر محمول ہے۔

چوتھی حدیث

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

نھی نبی اللہ ﷺ ان یبنی علی القبور او یقعد علیھا او یصلی علیھا.

یعنی اللہ تعالی کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قبروں پر عمارت بنانے اور ان پر بیٹھنے اور ان پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

مسند ابویعلی الموصلی ص٦ ج٢ رقم الحدیث ١٠١٦، وسنن ابن ماجہ ص١١٣، وا للفظ لہ، علامہ ھیثمی حنفیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، (مجمع الزوائد ص٦١ ج٣)۔

پانچویں حدیث

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ

نھی رسول اللہ ﷺ ان یبنی علی القبر او یجصص.

رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر عمارات بنانے اور انہیں پختہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل ص٢٩٩ ج٦۔

گو یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح نہیں مگر راقم نے اسے دیگر صحیح احادیث سے موافقت کی وجہ سے بطور شاھد پیش کیا ہے

اتباع رسول ﷺ کا تقاضا

اتباع رسول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قیاسات کو ترک کر کے آپ علیہ السلام کے اسوہ حسنہ اور اقوال کو زندگی کا محور بنائے اور انہیں کے نقش قدم پر چلے، سنت خیر الانام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے جس فعل سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے اس سے رک جائے کہ، یہی ھدایت اور راہ استقامت ہے اور اسی کا ہی خالق ارض وسماء نے حکم فرمایا ہے کہ

و ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا و اتقوا اللہ ان اللہ

شدیدالعقاب. (الحشر ۷)

سو جو تم کو رسول اللہ ﷺ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ عذاب دینے میں سخت ہے (۵۹-۷)

آج مبتدعین جس قدر مزارات کے شرعی فوائد اور دینی مصلحتیں بیان کرتے ہیں اگر ان میں کوئی معقولیت ہوتی تو رحمۃ للعالمین ﷺ ہرگز اس سے منع نہ فرماتے، کیا یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے بڑھکر دینی مصلحتیں اور فوائد شرعی جانتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ تمام فوائد و مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہیں جو ارشاد نبوی کے مخالف ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہیں اور یہ اس قابل ہیں کہ انہیں اٹھا کر حدود شریعت سے باہر پھینک دیا جائے۔ تاکہ یہ مصطفوی شریعت کو مکدر نہ کر دیں۔

انہیں حقائق کے پیش نظر، خیر القرون میں، اور آئمہ اربعہ میں سے بلکہ تمام آئمہ کرام میں سے کسی فقیہ و محدث نے قبر پر مزارات کی تعمیر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا، چنانچہ علامہ ابن عابدین حنفی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) جو متاخرین احناف میں وسیع النظر اور درمختار کے شارح ہیں فرماتے ہیں کہ

اما البناء فلم أرمن اختار جوازہ، فتاوی شامی ص۲۳۷ ج۲.

مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے (قبر) پر عمارت بنانے کے جواز کو پسند کیا ہو۔

مزارات اور امام ابو حنیفہؒ

حضرت امام کے شاگرد خاص اور فقہ حنفیہ کی روٹیاں پکانے والے بزرگ امام محمد فرماتے ہیں کہ۔

ولا نری ان یزاد علی ماخرج منه و نکرہ ان یجصص او یطین او یجعل عندہ مسجد الی ان قال ان النبی ﷺ نھی عن تربیع القبور و تجصیصھا قال محمد و به ناخذ و ھو قول ابی حنیفه.

ہم اس بات کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر پختہ بنائی جائے یا اس پر لپائی کی جائے کیونکہ نبی ﷺ نے قبر کو مربع بنانے سے منع فرمایا ہے یہی میرا اور میرے استاذ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ کتاب الاثار ص۴۹ طبع کتب

خانہ مجید یہ۔

قارئین کرام کیا کسی حنفی مقلد کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے امام ابو حنیفہ کا قول وفتوی رد کر دے بالخصوص جب اس فتوی کی بنیاد احادیث صحیحہ پر ہو۔ اور لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے وہ پھر بھی حنفی کا حنفی ہی کہلاتا رہے، پھر لطف کی بات تو یہ کہ خود پکے حنفی کہلاتے ہوں اور دیگر کو گلابی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہوں، خیر سے اس مسئلہ میں تو بریلوی مبتدعین ہی ثابت ہوئے مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ۔

غیر مقلد مردودوں کا راستہ ہے۔ جاء الباطل ص۲۵۴ ج۲۔

لہذا تقلید سیدھا جنت کا راستہ ہے اور غیر مقلدیت ٹیڑھا راستہ ہے جو دوزخ تک پہنچائے گا۔ جاء الباطل ص۲۵۵ ج۲۔

ان ارشادات کی روشنی میں مبتدین اپنا اخروی ٹھکانا سوچ لیں کیونکہ ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

اس مورچہ کو مفتی صاحب نے دسویں صدی ہجری کے ایک صوفی کی بے سند نقل کو درج کر کے فتح حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے کہ

اب تو رجسٹری ہوگئی کہ خود امام مذھب ابو حنیفہؒ کا فرمان مل گیا ہے کہ قبر پر قبہ وغیرہ بنانا جائز ہے۔ جاء الباطل ص۲۸۷ ج۱۔

اللہ اکبر، امام صاحب کے شاگرد خاص امام محمد کی نقل سے تو قبوں کے مکروہ ہونے کی رجسٹری نہ ہوئی اور بے سند قول سے ہوگئی، ہم پوچھتے ہیں کہ جس قول سے آپ حضرات رجسٹری کروار ہے ہیں اس کی سند تو پیش کیجئے ورنہ ناحق اپنے امام کو اپنی بدعات میں ملوث نہ کیجئے

اکابر احناف کی تصریحات

فقہاء احناف نے کتب فقہ میں اس بات کو کھول کر اور صاف آئینہ کی طرح پیش کیا ہے کہ قبر پر عمارت وقبہ بنانا اسکو پختہ کرنا مکروہ ہے بلکہ انہوں نے اس معاملہ میں اس قدر احتیاط کی ہے کہ قبر پر زیادہ مٹی ڈالنے اس کی لپائی کرنے سے بھی روکا کہ یہ چیزیں بھی، بناء علی القبر، کے مشابہ ہیں اگر

کسی بدبخت نے ایسا کام کیا تو اسے گرانا واجب ہے۔ ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں

ویجب الھدم و ان کان مسجد،

گرانا واجب ہے خواہ مسجد ہی کیونکہ نہ ہو۔ مرقاۃ ص۶۹ ج۴۔ یعنی اگر کسی عیار اور ہوشیار نے قبور کے آس پاس مسجد کے نام سے ہی قبے اور گنبد بنوائے ہوں تو ان کو بھی مسمار کر دینا واجب ہے کہ منافقین کی تعمیر کردہ مسجد بھی تو آخر مسجد ہی تھی جسے اللہ رب العزت نے قرآن میں مسجد ضرار کے نام سے موسوم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے اسے گرا دیا، اس بات کو یہیں پہ ختم کر کے آپ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ اور چلیں اور حنفی اکابر کی تصریحات کو ملاحظہ کریں۔

حضرت علامہ ابراھیم حلبیؒ منیۃ المصلی کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

ویکرہ تجصیص القبر و تطینه و به قالت الائمة الثلا ثة .... وعن ابی حنیفة انه یکرہ ان یبنی علیه بناء من بیت اوقبة او نحو ذلک لما مرمن الحدیث انفا.

قبروں کو پختہ بنانا اور ان کی لپائی کرنا مکروہ ہے اور یہی تینوں اماموں کا قول ہے اور حضرت امام ابو حنیفہ سے روایت ہے کہ قبر پر مکان یا قبہ یا اسی طرح کی کوئی اور عمارت تعمیر کرنا مکروہ ہے اور مذکورہ حدیث جو ابھی گزری ہے اس کی دلیل ہے۔ حلبی کبیر ص۵۹۹ طبع لاھور سہیل اکیڈمی ۱۹۸۷ء۔

علامہ جلال الدین الخوارزمی فرماتے ہیں کہ

و کرہ ابو حنیفة البناء علی القبر و ان لم یعلم بعلامة .

اور امام ابو حنیفہؒ قبر پر عمارت بنانے کو مکروہ جانتے ہیں خواہ اس سے نشانی کرنا ہی کیوں نہ مقصود ہو۔ الکفایۃ شرح ھدایہ ص۱۰۰ ج۲۔

علامہ ابن عابدین، درمختار کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

وعن ابی حنیفة یکرہ ان یبنی علیه بناء من بیت اوقبة او نحو ذلک لماروی جابر رضی اللہ عنه، نھی رسول اللہ ﷺ عن تجصیص القبور، و ان یکتب علیھا وان یبنی علیھا ، رواہ مسلم وغیرہ.

یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے وہ قبر پر عمارت بنانے کو مکروہ جانتے تھے خواہ مکان

ہو یا گنبد یا اسی طرح کی کوئی اور چیز کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اس پر لکھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا، اسے روایت کیا ہے امام مسلم وغیرہ نے، فتاوی شامی ص ۲۳۷ ج ۲۔

علامہ سراج الدین اودی حنفی اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں کہ

ویکرہ البناء علی القبور.

قبروں پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔ فتاوی سراجیہ ص ۲۴۔

علامہ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں کہ

ویکرہ ان یزاد علی التراب الذی اخرج من القبر لان الزیادۃ علیہ بمنزلۃ البناء الی ان قال ولا یجصص بحدیث جابر نھی رسول اللہ ﷺ ان یجصص القبر وان یقعد علیہ وان یبنی علیہ.

اور قبر سے نکالی گئی مٹی سے زیادہ ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ یہ بناء (عمارت) کے مشابہ ہے (پھر آگے فرمایا) اور قبر کو پختہ نہ کیا جائے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے اس پر عمارت تعمیر کرنے اور بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (البحر الرائق ص ۱۹۴ ج ۲)

امام قاضی خاں حنفی (المتوفی ۵۹۲) فرماتے ہیں کہ

ولا یجصص القبر لما روی عن النبی ﷺ انہ نھی عن التجصیص والتفضیض وعن البناء فوق القبر الیٰ عن قال، لماروی عن ابو حنیفۃ انہ قال ولا یجصص القبر ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء.

قبر کو پختہ نہ بنایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے قبر کو پختہ کرنے اور چاندی کے پانی سے مرصع کرنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا (پھر آگے فرمایا) اس لئے بھی کہ امام ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ قبر کو پختہ نہ کیا جائے نہ ہی اس کی لپائی کی جائے اور نہ ہی اس پر عمارت بنائی جائے۔

فتاوی قاضی خان بر حاشیہ عالم گیری ص ۱۹۴ ج ۱۔

فتاوی عالمگیری جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے پانچ سو فقہاء و علماء نے مرتب کیا تھا اور آج کل کے حنفی علماء عموماً اور بریلوی علماء خصوصاً پاکستان میں اس کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، دیکھئے علمی محاسبہ صفحہ۲ حصہ اول مولفہ حافظ احسان الحق بریلوی طبع عاشق مدینہ اکیڈمی فیصل آباد، ۱۴۱۰ھ۔

فقہ حنفی کی اس معتبر و مستند کتاب میں ہے کہ

ویسنم القبر قدر الشبر ولا یربع ولا یجصص.......... ویکرہ ان یبنی علی القبر،فتاوی عالم گیری ص۱۶۶ ج ۱ طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ ۱۹۸۴ء۔

قبر ایک بالشت اونٹ کی کوہان نما بنائی جائے، اور قبر کو مربع اور پختہ نہ بنایا جائے اور اس پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

کتب فقہ حنفیہ سے اس طرح کی مزید بیسیوں عبارات پیش کی جاسکتی ہیں مگر پہلے ہی مضمون بہت لمبا ہوگیا ہے ویسے بھی یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ ہم فقہاء احناف کی عبارات کو جمع کریں ایک دیانتدار حنفی کیلئے تو یہی عبارات کافی ہیں متعصب و جاہل کیلئے دلائل کا انبار بھی بے سود ہے۔

مکروہ کا مفہوم آئمہ احناف کے نزدیک

حضرت مفتی صاحب نے عبارات فقہاء کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا، حالانکہ انکا یہ اخلاقی فرض تھا کہ وہ مقلد ہونے کی وجہ سے ان عبارات کا جواب بھی عنایت کرتے اور ان کو قبول نہ کرنے کی معقول وجوہات بیان کرتے۔ گمان غالب یہی ہے کہ مفتی صاحب نے عدم ذکر ہی مناسب جانا اور اس جان کے وبال کو ہاتھ نہ لگانے میں ہی عافیت جانی خیر جو بھی ہو ہماری بلا جانے۔

ممکن ہے کہ مفتی صاحب کا کوئی معتقد اور مبتدعین کے اکابرین فقہاء کی عبارات کو مکروہ تنزیہیہ پر محمول کر کے انہیں کو جواز کا لبادہ پہنا دیں لہذا اس مقام پر مکروہ کے مفہوم کو بھی واضح کردینا ہم مناسب خیال کرتے ہیں تاکہ متبعین سنت خیر الانام ﷺ، مبتدعین کے فریب سے محفوظ ہوجائیں،

علامہ ابن نجیم حنفی (المتوفی ۹۷۰ھ) جن کے متعلق حنفی علماء الامام، نحریر الفھامۃ ، فقیہ عصرہ، وحید دھرہ، محرر مذھب نعمانی، ابو حنیفہ ثانی وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں، کنز الدقائق، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں۔

واعلم ان المکروہ اذا اطلق فی کلامھم فالمراد منه التحریم الاان ینص علی کراهة التنزیه فقد قال المصنف فی المستصفی لفظ الکراهة عند الاطلاق یرا د بها التحریم قال ابو یوسف قلت لابی حنیفةؒ اذا قلت فی شئ أکرہ فما رائیک فیه قال التحریم.

یعنی معلوم ہونا چاہیئے کہ جب فقہاء کرام مطلق مکروہ کا لفظ اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے انکی مراد تحریم (حرام) ہوتا ہے، مگر یہ کہ وہ کراھت تنزیہ کی صراحت کردیں، تحقیق مصنف نے المتصفی، میں کہا ہے کہ کراھت کا لفظ جب مطلق بولا جائے تواس سے ان کی مراد تحریم (حرام ہونا ہے) قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے کہا کہ جب آپ کسی چیز کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ میں اسے مکروہ جانتا ہوں تو اس سے آپ کا کیا مقصود ہوتا ہے تو انہوں نے کہا تحریم (حرام) ہوتا ہے۔ البحرالرائق ص۱۳۱ ج۱ طبع المکتبہ الماجدیہ کوئٹہ۔

یہی عبارت علامہ ابن عابدین نے درمختار کی شرح میں مکروہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے، البحر، سے نقل کر کے سکوت کیا ہے۔

فتاوی شامی ص۲۲۴ ج۱، طبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۱۴۰۶ھ۔

علامہ جلال الدین الخوارزمیؒ حنفی (المتوفی) ھدایہ کی شرح میں فرماتے ہیں

و ذکر محمدؒ فی المبسوط ان ابا یوسف قال لابی حنیفة رحمةالله اذا قلت فی شیء أکرهه فما رأیک فیه قال التحریم.

یعنی امام محمد نے (اپنی تصنیف کردہ کتاب) المبسوط میں بیان کیا ہے کہ قاضی ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے کہا کہ جب آپ کسی چیز کے متعلق مکروہ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے آپ کی کیا مراد ہوتی ہے، تو انہوں نے کہا کہ تحریم (حرام) ہوتا ہے، الکفایہ ص۴۴۰ ج۸ طبع المکتبۃ الرشیدیہ کوئٹہ۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ فقہاء احناف کی کتابوں میں مکروہ کا جو لفظ لکھا جاتا ہے اس سے ان کا مقصود کراہت تحریمی ہوتا ہے، خاص کر جب امام ابو حنیفہ یہ لفظ بولتے ہیں تو بقول ان کے اس سے میری مراد تحریم ہوتی ہے۔

آیئے اس ضابطہ و دستور کی تصدیق ہم بریلویت کے سرخیل اور اعلیٰ حضرت بلکہ مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں سے کرادیں، چنانچہ لکھتا ہے

ان الکراھة فی کلام الامام للتحریم.

یعنی امام ابو حنیفہ کے کلام میں مکروہ کا لفظ تحریم (حرام) کیلئے آتا ہے،

فتاوی رضویہ ص۴۴۵ ج۱۔

اقول مطلق الکراھة للتحریم.

میں کہتا ہوں کہ مطلق کراہت تحریم کیلئے ہے فتاوی رضویہ ص۴۰۸ ج۱۔

ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ جب مطلق کراہت کہا جائے تو ہمارے مذھب میں اصل یہی ہے کہ اس سے کراہت تحریمی ہے اور تنزیہی پر اسے محمول کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، اصل الفاظ خاں صاحب کے یہ ہیں، بے قیام دلیل ہمارے مذہب میں اصل وہی کراہت تحریم ہے۔

کما مرعن نص المحقق علی الاطلاق و کتب المذھب طافحة بذلک.

تو کراہت تنزیہ کی طرف پھیرنا محتاج دلیل ہے، فتاوی رضویہ ص۸۷۱ ج۱ طبع مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی ۱۴۰۹ھ موافق ۱۹۸۹۔

امید ہے کہ علماء بریلی اپنے اعلیٰ حضرت کی گواہی سے مطمئن ہو جائیں گے

توہمات بریلویہ

یہ بات بالکل صحیح و درست ہے کہ بریلوی عوام میں دین کا شعور کم ہے، اور یہ لوگ اوہام باطلہ کو احکام سمجھ کر ان پر سختی سے عمل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بدعات اس گروہ کے امتیازی مسائل ہیں! کیوں نہ ہوں جب ان کے خطیب و پیشوا ہی دین اسلام کے علم سے ناواقف ہیں میں نہیں کہتا کہ ان میں صاحب علم نہیں ہیں یقیناً ہیں مگر اکثریت ان پڑھ کی ہے یقین جانئے کہ ہمارے قریب ایک

گاؤں میں ایک بریلوی مکتب فکر کا پر جوش اور رد وہابیت میں سرگرم ایک شخص امامت کراتا اور جمعہ پڑھاتا ہے اور آئے دن اہل حدیث کے خلاف کوئی نہ کوئی من گھڑت مسئلہ بیان کرتا رہتا ہے۔

مگر اس بچارے کا مبلغ علم یہ ہے کہ ناظرہ قرآن تک نہیں پڑھا، وکفی باللہ شہیدا، اس طرح کا ہی ایک وہم مفتی صاحب نے بھی قطع و برید کر کے پیش کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں مجھ سے ایک بار کسی نے کہا کہ اگر اولیاء اللہ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں کچھ طاقت تھی تو نجدی وہابیوں نے اپنی قبروں کو کیوں نہ بچایا؟ معلوم ہوا کہ یہ محض مردے ہیں پھر ان کی تعظیم و توقیر کیسی؟ میں نے کہا حضور علیہ السلام سے پہلے کعبہ معظّمہ میں تین سو ساٹھ بت تھے اور احادیث میں ہے کہ قریب قیامت ایک شخص کعبہ کو گرادے گا، آج لاھور میں مسجد شہید گنج سکھوں کا گردوارہ بن گئی، بہت سی مساجد ہیں جو کہ برباد کر دی گئیں تو اگر ہندو کہیں کہ اگر خدا میں طاقت تھی تو اس نے اپنا گھر ہمارے ہاتھوں سے کیوں نہ بچا لیا، اولیاء اللہ یا ان کی مقابر کی تعظیم ان کی محبوبیت کی وجہ سے ہے نہ کہ محض قدرت سے جیسے کہ مساجد اور کعبہ معظّمہ کی تعظیم، ابن سعود نے بہت سی مسجدیں بھی گرادیں جیسے کہ مسجد سیدنا بلال کوہ صفا پر وغیرہ۔ جاء الباطل ص۲۹۶ ج۱۔

الجواب: اولاً۔ مفتی صاحب کا فرمانا کہ شاہ ابن سعود نے بہت سی مساجد گرادیں ہیں ان کا زبردست مغالطہ اور صریح بہتان ہے جو لوگ حج کر کے آئے ہیں وہ بخوبی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ خاندان سعود نے مساجد کو کتنا شاندار اور عمدہ بنا رکھا ہے اور نمازی حضرات کی سہولتوں کو کس قدر مدنظر رکھا گیا ہے۔

ثانیاً۔ قبر کی توہین سے اعراض مسلم! اے جی مزارات کی تعمیر پر بھی کوئی دلیل پیش کیجئے تاکہ اصل اختلافی مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے مگر معلوم یوں ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے الٹا چلنے اور حقائق کے برعکس تحریرات لکھنے کی قسم اٹھا رکھی تھی، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر مزارات کی تعمیر جائز ہوتی تو نبی ﷺ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو ان کے گرانے کیلئے نہ بھیجتے۔

ثالثاً۔ مساجد کے متعلق یہ کسی کا عقیدہ ہے اور نہ ہی شرعی مسئلہ کہ ان کی توہین کرنے والے کو ضرور بالضرور دنیا میں ہی سزا ملے گی اور اس پر عذاب الٰہی نازل ہوگا۔

رابعاً۔ رہا کعبہ میں بتوں کا معاملہ تو گزارش ہے کہ وہاں بت انہوں نے کعبہ کی توہین کیلئے نہیں

رکھے تھے بلکہ ان کے عقیدے کے مطابق بیت اللہ رب تعالی کا گھر تھا اور بت خالق کائنات کے ایلچی اور اس تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ مانعبدھم الالیقربونا الی اللہ زلفیٰ (الزمر آیت:۳) ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا ان بتوں کو نصب کرنے سے مقصد توہین نہیں بلکہ تعظیم تھا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جس نے کعبہ کو گرانے کیلئے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تھا اس کا حشر کیا ہوا تھا، مفتی صاحب ویسے تو بریلوی مکتب فکر میں مفسر قرآن کے نام سے مشہور ہیں مگر معلوم نہیں انہیں قرآن پاک میں سورۃ الفیل میں ابرھہ کا حال کیوں نظر نہیں آیا؟ کہ جس نے کعبہ اللہ کی توہین کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ہی تباہ و برباد کر دیا اور اسے پیچھے آنے والوں کے لیے نشانہ عبرت بنایا۔

ہم آج بھی اللہ تعالی کے فضل و کرم اور رخداد ادفراست، اپنے دین و ایمان کی محکمی سے یہ کہتے ہیں کہ بالفرض کوئی بے ایمان اگر آج بھی بیت اللہ کی توہین کرے وہ اس دنیا میں ہی عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتا اور کوئی کافر اس کو گرا نہیں سکتا۔

قرب قیامت کعبہ کے گرائے جانے کی حدیث کا مفتی صاحب نے کوئی حوالا نہیں دیا۔

اگر مفتی صاحب کا اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی کعبہ کو گرادے گا، بخاری رقم الحدیث ۱۵۹۱ و مسلم رقم الحدیث ۲۳۰۵ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ علامات قیامت سے ہے اور یہ انتہائی قرب قیامت کے وقت ہوگا جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ پھر کعبہ کی دوبارہ تعمیر نہ ہوگی، مسند احمد ۴۵۲/۲) اور یہ کہ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بیت اللہ کا حج نہ کیا جائے گا، (بخاری رقم الحدیث ۱۵۹۳)۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ کعبہ کو گرائے جانے کا حادثہ اس وقت پیش آئے گا جب دنیا میں اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا، جسے حدیث میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ قیامت بد ترین مخلوق پر قائم ہوگی، (مسلم شریف رقم الحدیث ۷۴۹۵)

خلاصہ کلام یہ کہ کعبہ کو گرایا جانا علامات قیامت سے ہے، اے جی کسی حدیث میں مزار کو گرانا بھی علامات قیامت میں شمار کیا گیا ہے تو بیان کیجئے ورنہ اللہ کا خوف کیجئے۔

خامساً۔ مزارات کے متعلق مبتدعین کے عوام اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر فلاں بزرگ کی قبر

اور مزارات سے غلاف اتار کر دکھا دو بلکہ اس کی قبر کے آس پاس لگائے گئے درختوں سے مسواک ہی توڑ دو تو ہم مانتے ہیں کہ واقعی وہابیوں کی باتیں درست ہیں، مجھے یقین کامل ہے کہ اسی طرح کی ہی کرامت مفتی صاحب نے بھی کسی مزار کے متعلق بیان کی ہوگی تو کسی پاس کھڑے موحد نے ان کی تردید کر دی ہوگی مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اپنا بیان تو نقل نہیں کیا اور بچارے موحد کی بات کو دھر لیا ہے۔

بیان کیا مجھ سے محبی واخی محمد رفیق صاحب (آف بھاگوڈیال من مضافات نارنگ منڈی) نے کہ یہاں کے مبتدعین نے ہم سے شرط لگائی کہ فلاں گاؤں (مریدکے،نزدیک) میں ایک ولی کی قبر ہے، اگر آپ وہاں کے مزار کے قریب لگائے گئے درخت سے فقط ایک شاخ توڑ کر زندہ پلٹ آئیں تو تب ہم مان جائیں کہ اولیاء کرام مشکل کشاء حاجت روا اور تصرف فی الامور نہیں ہوتے، ان کا کہنا ہے کہ مغرب کے قریب یہ شرط لگائی گئی تھی، میں اسی وقت ہی ایک ساتھی کولیکر چل پڑا اور راتوں رات ہم نے ستر کلومیٹر کا سفر طے کیا (جس میں تقریباً پندرہ کلومیٹر پیدل بھی چلنا تھا) اور علی الصبح ہم شاخ توڑ کر واپس پہنچ گئے، مبتدعین اہل توحید کو زندہ دیکھ کر، فبهت الذی کفر، کا مصداق بن گئے۔

قبور پر مزارات کے تعمیر کرنے کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب الدفن میں بروایت ابوداؤد ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت عثمان ابن مظعون کو دفن فرمایا تو ان کی قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب فرمایا اور فرمایا

اعلم بها قبر اخی و ادفن الیه، من مات من اهلی.

ہم اس سے اپنے بھائی کی قبر کا نشان لگائیں گے اور اس جگہ اپنے اہل بیت کے مُردوں کو دفن کریں گے۔

بخاری کتاب الجنائز باب الجرید علی القبر میں تعلیقا (بلا سند) ہے حضرت خارجہ فرماتے ہیں ہم زمانہ عثمان میں تھے۔

ان اشد نا و ثبة الذی یثب قبر عثمان بن مظعون حتی یُجاوزہ.

ہم میں بڑا کودنے والا وہ تھا جو کہ عثمان ابن مظعون کی قبر کو پھلانگ جاتا۔

مشکوٰۃ کی روایت سے معلوم ہوا کہ عثمان ابن مظعون کی قبر کے سرہانے پتھر تھا اور بخاری کی روایت سے معلوم ہوا کہ خود قبر عثمان کا تعویذ اس پتھر سے تھا اور دونوں روایات اس طرح جمع ہوسکتی ہیں کہ مشکوٰۃ میں جو آیا کہ قبر کے سرہانے پر پتھر لگایا اس کے معنی یہ نہیں کہ قبر سے علیحدہ سر کے قریب کھڑا کر دیا بلکہ یہ کہ خود قبر میں ہی سر کی طرف سے لگایا یا مطلب یہ کہ قبر ساری اس پتھر کی تھی مگر سرہانے کا ذکر کیا ان دونوں احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی خاص قبر کا نشان قائم رکھنے کیلئے کچھ اونچی کردی جائے یا پتھر وغیرہ سے پختہ کر دی جائے تا کہ معلوم ہو کہ یہ کسی بزرگ کی قبر ہے، جاء الباطل ص۲۸۳۔

کیا حضرت عثمان کی قبر کو پختہ کیا گیا تھا؟

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا جو نتیجہ نکالا ہے وہ متن روایت کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ روایت میں تو فقط اتنا ہی بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دفن کرنے کے بعد نبی ﷺ نے نشانی کی غرض سے قبر کے سرہانے کی طرف ایک بھاری پتھر رکھ دیا مگر مفتی صاحب اس سے قبر کو پختہ اور اونچی بنانے کا استدلال کر رہے ہیں جو کہ غلط بیانی ہی نہیں بلکہ معنوی تحریف کا آئینہ دار ہے آیئے پہلے مکمل متن حدیث ملاحظہ کیجئے۔

معروف تابعی حضرت مطلب بن عبداللہ مخزومی" بیان کرتے ہیں

لما مات عثمان بن مظعون اخرج بجنازته فدفن فامر النبی ﷺ رجلا ان یاتیه بحجر فلم یستطع حمله فقام الیها رسول الله ﷺ و حسر عن ذراعیه قال کثیر قال المطلب قال الذی یخبرنی ذلک عن رسول الله ﷺ قال کانی انظر الی بیاض ذراعی رسول الله ﷺ حین حسر عنهما ثم حملها فوضعها عندراسه و قال اتعلم بها قبر اخی وادفن الیه من مات من اهلی.

یعنی جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ان کا جنازہ نکالا گیا اور دفن کیا گیا تو نبی ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا جو آپ علیہ السلام کے پاس پتھر لائے (تاکہ علامت کیلئے رکھا جائے) تو وہ شخص اس پتھر کو اٹھا نہ سکا پھر رسول ﷺ خود اس پتھر کی طرف (اٹھانے کیلئے) کھڑے ہوئے اور نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی آستین چڑھائیں (یعنی پتھر اٹھانے کیلئے بازو اقدس سے قمیض کے کپڑے کو تہہ کیا) مطلب بیان کرتے ہیں جس شخص نے مجھے خبر دی تھی اس نے کہا گویا میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں کی سفیدی کو دیکھ رہا ہوں جس وقت آپ علیہ السلام نے دونوں ہاتھوں کو کھولا اور اس پتھر کو اٹھا کر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کے سرہانے کی طرف رکھا اور فرمایا اس پتھر سے ہم اپنے بھائی کی قبر کو شناخت کریں گے اور میرے اہل بیت سے جو وفات پائے گا اس کو اس (کی قبر کے) پاس دفن کریں گے۔ سنن ابوداؤد مع عون

ص۲۰۳ ج ۳، و السنن الکبری للبیھقی ص۴۱۲ ج ۳۔

قارئین دیکھئے حدیث سے واضح ہے کہ دفن کے بعد آپ علیہ السلام نے قبر کے سرہانے پتھر رکھا یہی روایت ابن عدی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے الفاظ ہیں

لما دفن النبی ﷺ عثمان بن مظعون احتمل صخرة عظیمة فجعلها الی جنب قبره.

نبی ﷺ نے جب حضرت عثمان بن مظعون کو دفن کر لیا تو آپ علیہ السلام ایک بھاری پتھر اٹھا کر لائے اور اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے ایک طرف رکھ دیا۔ الکامل فی الضعفاء الرجال ص۲۰۸۹ ج ۵۔

یہی روایت قدرے الفاظ کے اختلاف سے سنن ابن ماجہ میں ہے کہ

ان رسول اللہ ﷺ اعلم قبر عثمان بن مظعون بصخرة.

بے شک رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کا نشان ایک پتھر کے ساتھ کیا۔ سنن ابن ماجہ ص۱۱۳۔

گو پہلی روایت بھی کسی تشریح و توضیح اور حاشیہ آرائی کی محتاج نہ تھی لیکن ابن عدی اور ابن ماجہ کی روایات نے مفتی صاحب کی کلی فقاہت کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا ہے کہ پتھر کو نصب فقط نشانی کی غرض سے کیا گیا تھا نہ کہ قبر کو پختہ کرنے کیلئے اور اس کی عظمت کے چرچا کیلئے۔

ثانیاً۔ رہا بخاری شریف کا حوالہ تو یہ ہمارے مخالف نہیں اور مفتی صاحب کے موافق نہیں کیونکہ مبتدعین کے اکابر کی قبور کو پھلانگنا آج ناممکنات سے ہے اسی خصم کی دلیل سے ان پر ڈگری ہے کہ ان کے مزاذات شریعت حقہ کی تعلیم سے انحراف ہے۔

ثالثاً۔ آج بھی کسی نوجوان کی قبر کو پھلانگنا ہر کسی سے ممکن نہیں کیونکہ قبر تیار ہونے کے بعد تقریباً آٹھ فٹ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے اور ڈیڑھ فٹ کے قریب اونچی بھی ہوتی ہے اور پھلانگنے کیلئے تقریباً دس فٹ کا ایسا جمپ درکار ہے جس کی اونچائی آٹھ فٹ تک ۲۴ انچ ہو، ایسی جست لگانا ہر کس و ناکس کا فعل نہیں ہوسکتا، اگر مبتدعین کو اس حقیقت سے انکار ہے تو وہ ایک ایسی مجلس منعقد کریں جس میں وہ عام آدمی سے اس طرح کی چھلانگ لگوا دیں، تو ہم اپنے دعوی کو واپس لے لیں

گے۔

رابعاً۔ مفتی صاحب اختلاف قبر کی لمبائی میں نہیں حسب ضرورت بنائی جاتی ہے اور اس کا بنانا اور کشادہ تیار کرنا شریعت حقہ کا حکم ہے۔

سر دست اختلاف تو قبر پر مزارات تعمیر کرنے میں ہے جس کی دلیل دینے کی بجائے آپ ادھر ادھر سے لاتعلق روایات پیش کر رہے ہیں آپ کے اس کردار سے معلوم ہوا کہ مزار کی تعمیر کی دلیل دینے سے آپ قاصر ہیں۔

خامساً۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی فرمایا ہے اور یہ بات مبتدعین کے عقیدہ کے موافق سخت قسم کی توہین اور گستاخی ہے۔ تفصیل، دین الحق، کے حصہ سوم میں آئے گی۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشائخ کرام اولیاء عظام علماء کرام کی مزارات کے ارد گرد یا اس کے قریب میں کوئی عمارت بنانا جائز ہے اس کا ثبوت قرآن کریم او رصحابہ کرام رضی اللہ عنھم و عامۃ المسلمین کے عمل اور علماء کے اقوال سے ہے قرآن کریم نے اصحاب کہف کا قصہ بیان فرماتے ہوئے کہا

قال الذین غلبوا علی امرھم لنتخذن علیھم مسجداً.

''وہ بولے جو اس کام میں غالب رہے کہ ہم تو ان اصحاب کہف پر مسجد بنائیں گے۔''

قرآن کریم نے ان لوگوں کی دو باتوں کا ذکر فرمایا ایک اصحاب کہف کے گرد قبہ اور مقبرہ بنانے کا مشورہ کرنا دوسرے ان کے قریب مسجد بنانا او رکسی بات کا انکار نہ فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ دونوں فعل جب بھی جائز تھے اور اب بھی جائز ہیں جیسا کتب اصول سے ثابت ہے کہ، شرائع قبلنا یلزمنا۔ جاء الحق ص ۲۸۳ و ۲۸۴ ج ۱۔

کیا اہل کتاب کا عمل دین میں حجت ہے؟

الجواب ۔اولاً۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کی تعریف نہیں کی حالانکہ ان کا یہ عمل اگر نیکی اور عمل حسنہ کے زمرہ میں تھا تو اس کی تحسین کا یہی موقعہ تھا مگر قرآن نے ان کے مشورہ کی حکایت

بیان کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے مگر مفتی صاحب ان کی تحسین کر رہے ہیں جبھی تو ان کے عمل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب سے منع فرمایا ہے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

لاتصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم، الحدیث.

یعنی اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب نہ کرو۔ صحیح بخاری ص۱۰۹۴ ج۲۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اسلام نے ان کے فعل کی تردید نہیں کی، غلط بیانی ہے اور یہ ان کی جہالت کا کرشمہ ہے ورنہ صحیح حدیث میں ان کے اس عمل کی وجہ سے نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنھا نے رسول اللہ ﷺ سے حبشہ کے ان گرجوں کا ذکر کیا جو انہوں نے وہاں دیکھے تھے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا

اولئک قوم اذا مات فیھم العبد الصالح اوالرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً و صور وافیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عنداللہ.

یعنی وہ ایک ایسی قوم ہے جب ان میں کوئی نیک بندہ (یا فرمایا نیک انسان) وفات پاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں ان کی تصاویر آویزاں کرتے یہ لوگ (اسی وجہ سے) اللہ تعالی کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔ صحیح بخاری ص۶۲ ج۱، وصحیح مسلم ص۲۰۱ ج۱، ونسائی ص۸۲ ج۱۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی ولی و بزرگ اورمشائخ کی قبور پر مسجد بنانے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اور اسی وجہ سے ہی یہود و نصاری قیامت کے روز (کما فی روایۃ المسلم والبخاری والنسائی) اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہونگے۔

مگر مفتی صاحب الٹی گنگا بہاتے ہوئے یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کے عمل کی سرے سے تردید ہی نہیں کی گئی، اے جی تردید کس بلا کا نام ہے، اللہ تعالی کے رسول برحق ﷺ تو ان کے بدترین مخلوق ہونے کی خبر دے رہے ہیں اگر آپ کو بھی بدتر بننے کا شوق ہے تو جی بھر کر اس فعل شنیع کا پرچار کیجئے۔

ثالثاً، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ شرائع قبلنا یلزمنا، جاء الباطل ص۲۸۴ ج۱ یعنی ہم سے پہلی

شریعتیں ہم پر بھی لاگوں ہیں، غلط بیانی ہے کیونکہ کتب اصول میں یہ بات متعدد دلائل سے لکھی ہوئی ہے کہ اسلام سے قبل کی شرائع ہمارے لئے شریعت نہیں امام ابن حزمؒ نے اس پر قرآن و سنت سے نصف صد کے قریب دلائل بیان کیئے ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے۔ الا حکام فی اصول الاحکام ص۔١٦ ج ۵، یہی وجہ ہے کہ متعدد حنفی اہل علم نے بھی مذکورہ آیت سے مزارات کے تعمیر کے استدلال کو فاسد کہا ہے۔ چنانچہ علامہ محمود آلوسی حنفی التوفی ۱۲۷۰ھ فرماتے ہیں کہ

واستدلال بالاية على جواز البناء على قبور الصلحاء و اتخاذ مسجد عليها و جواز الصلاة في ذلک......... وهو قول باطل عاطل فاسد كاسد فقد روى احمد ابو داوٗد و الترمذى والنسائى و ابن ماجة عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لعن الله تعالى زائرات القبور والمتخذين عليها المساجد والسرج.

یعنی اس آیت سے (بعض لوگوں نے) نیک لوگوں کی قبروں پر عمارت تعمیر کرنے اور ان پر مساجد بنانے اور ان میں نماز پڑھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ (ان کا یہ استدلال) باطل' عاطل' فاسد' کاسد' ہے اس لئے کہ امام احمد، امام ابو داوٗد امام ترمذی امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالی کی لعنت ہو، قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر، قبروں پر مساجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغ جلانے والوں پر، روح المعانی ص ۲۳۷ ج ۱۵۔ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان،

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اس دلیل کے تحت حضرت مفتی صاحب لمبی چوڑی تحریر رقم فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم محمد مصطفی ﷺ کو حجرے میں دفن کیا گیا اگر یہ ناجائز تھا تو صحابہ پہلے اس کو گرا دیتے پھر دفن کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کے گرد کچی اینٹوں کی دیوار کھینچ دی گئی پھر ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں تمام صحابہ کرام کی موجودگی میں اس عمارت کو پتھروں سے مضبوط کیا گیا، ۵۵۷ھ میں آس پاس پانی تک بنیاد رکھ کر سیسہ لگا کر اس کو بھر دیا، ۶۷۸ھ میں سلطان قلاؤں صالح نے یہ گنبد سبز جو اب تک موجود ہے بنوایا، پھر وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ

روزہ مطہر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بنوایا تھا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ا۔

کیا آنحضرت ﷺ کا روضہ صحابہؓ نے تعمیر کیا تھا؟

الجواب اولاً۔ روضہ اقدس پر دیگر قبور کو قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے حجرے میں اس وجہ سے دفن کیا گیا کہ

قال ناس یدفن عندالمنبر و قال آخرون یدفن بالبقیع فجاء ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنه فقال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول مادفن نبی قط الافی مکانه الذی توفی فیه فحفرله فیه.

یعنی لوگوں نے کہا کہ آپ علیہ السلام کو منبر کے پاس دفن کیا جائے اور دوسروں نے کہا کہ آپ علیہ السلام کو البقیع کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے اسی دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ نبی صرف اسی جگہ دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہوتی ہے سو اسی مقام پر آپ ﷺ کی قبر کو کھودا گیا۔ موطا امام مالک ص ۲۱۲۔

اسی کے ہم معنی روایات امام ترمذی نے السنن مع تحفہ ص ۱۳۹ ج ۲ میں امام ابن عبدالبر نے، التمہید ص ۳۹۹ ج ۲۴ میں، امام بیھقی نے دلائل النبوۃ ص ۲۶۱ ج ۷ میں نقل کی ہیں۔

اس حدیث کی رو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اتفاق سے آپ ﷺ کی قبر کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے حجرے میں بنوایا گیا، رہا مفتی صاحب کا اس پر یہ معارضہ بلکہ ڈھکوسلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے حجرے کو گرا کیوں نہیں دیا تھا، اس کے جواب میں ہم مبتدعین سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے ضد کی پٹی اتار کر حقیقت کی دنیا میں آکر اس کی وجوہات ملاحظہ کریں (ا) اسی حجرے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کی رہائش بھی تھی۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کا حجرہ نبی ﷺ کا مسکن ہونے کی وجہ سے آثار متبرکہ تھا اسے گرانے کی کون جسارت کر سکتا تھا، ۸۸ھ میں ولید بن عبدالملک کے زمانہ امارت میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام حجرے (بجز حجرہ عائشہ رضی اللہ عنھا) توڑ کر مسجد نبوی میں شامل کئے تو

تمام مدینہ طیبہ میں کہرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور ﷺ کی ایک اور یادگار مٹ گئی، ابن سعد بحوالہ سیرۃ النبی ص۱۱۹ ج ۲۔

(۳) آنحضرت ﷺ کو گھر میں ہی دفن کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ نہ بنالیں چنانچہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ علیہ السلام کو کسی میدان میں اس لئے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت میں میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی داروگیر مشکل تھی (اس لئے حجرے میں دفن کیا گیا)۔ بخاری باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ وابی بکر وعمر الخ ص۱۸۶ ج ۱۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا بخاری شریف سے یہ نقل کرنا کہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ امارت میں دیوار گر گئی تو صحابہ کرام نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ تو یہ ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ عروہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں، تھذیب ص۱۸۲ ج ۷، علاوہ ازیں یہ واقعہ ۸۸ھ کا ہے تاریخ ابن کثیر ص۱۴۲ ج ۹ مترجم، مدینہ منورہ میں تمام صحابہ کرام کے بعد فوت ہونے والے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ تھے جو ۷۸ھ میں فوت ہوئے، چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

وھو آخر من مات من الصحابة بالمدینة وقال عمرو بن علی و یحیٰ بن بکیر وغیر ھما مات سنة ۷۸.

جن صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی ان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سب سے آخری ہیں اور امام عمرو بن علی اور یحیٰ بن بکیر وغیرہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی، تھذیب ص۳۸ ج ۲۔

الغرض انکی وفات کے تقریباً دس سال بعد ولید نے ازواج مطہرات کے حجرے خرید کر مسجد میں شامل کئے اس کے اس فعل کو اس دور کے جید فقہاء مدینہ نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اعیان بنی ہاشم وغیرہ نے چیخنا چلانا شروع کیا اور اسی طرح آہ و بکا لوگوں نے شروع کردی جیسی رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت کی گئی تھی، البدایہ والنھایہ مترجم ص۱۴۲ ج ۹۔

مگر مفتی صاحب اس کے برعکس اسے صحابہ کا فعل باور کراتے ہیں، لعنت اللہ علی الکاذبین۔

ثالثاً۔ قبر نبوی ﷺ میں ایسا نہیں ہوا کہ قبر مبارک پہلے بنی ہو اور اس پر عمارت بعد میں تعمیر

ہوئی ہو بلکہ آپ کی وفات حجرہ میں ہوئی تھی اور سابقہ احادیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا پھر حسب تحقیق شاہ عبدالحق محدث دھلوی وغیرہ ایک المناک سانحہ کی وجہ سے آپ کی قبر اقدس کے ارد گرد نہائت گہری دیوار سیسہ اور رانگ گلا کر اس کو بھر دیا اور مضبوط دیوار قائم کی۔

جذب القلوب ص ۸۶ بحوالہ راہ سنت ص ۱۹۱۔

پھر بقول مفتی صاحب سلطان قلاؤں صالحی نے ۶۷۸ھ میں سبز گنبد تعمیر کروایا جو اب تک موجود ہے۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

بتایئے تعمیر مزار اقدس میں کون کون صحابی شامل تھا۔

کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں سب سے آخر میں وفات پانے والے حضرت ابوطفیل عامر بن واثلۃ رضی اللہ عنہ ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

مات سنة عشرة ومائة على الصحيح وهو آخر من مات من الصحابة.

یعنی صحیح تحقیق یہی ہے کہ ان کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی اور وہ صحابہ میں سے سب سے آخر میں وفات پانے والے تھے۔ تقریب ص ۱۲۰۔

یہی بات امام مسلمؒ نے بھی کہی، کذا فی التھذیب ص ۸۲ ج ۵۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام کا دور تو ایک سو دس ہجری میں ختم ہو جاتا ہے اور گنبد کی تعمیر بقول مفتی صاحب ۶۷۸ھ میں ہوئی ہے اس کے باوجود مفتی صاحب شرم و حیاء کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیدہ دلیری سے لکھتے ہیں، روزہ مطہرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بنوایا تھا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم چھ سو سال بعد دوبارہ روضہ اقدس کی تعمیر کے لئے دنیا میں آئے تھے، نہیں قطعاً نہیں یہ مفتی صاحب کی غلط بیانی اور تاریخ سے ناواقفی ہے۔

مفتی جی قرآن و حدیث بلکہ فقہ و تاریخ سے تو ناواقف تھے ہی مگر اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اردو بھی صحت سے لکھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اسی تحریر میں بریلویت کا حکیم الامت لفظ روضہ کو حرف، ز، سے لکھ رہا ہے۔

لطف پر لطف ہے املا میں میرے یار کے یار
حاء حطی سے گدرح لکھتا ہے ھوز سے ھمار

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

بخاری جلد اول کتاب الجنائز اور مشکوۃ باب البکاء علی المیت میں ہے کہ حضرت حسن ابن حسن ابن علی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا۔

ضربت امراته القبة علی قبره سنة .

تو ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک سال تک قبہ ڈالے رکھا۔

یہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے زمانہ میں سب کی موجودگی میں ہوا کسی نے انکار نہ کیا، نیز حسن کی بیوی ایک سال تک وہاں رہیں، پھر گھر واپس آئیں اس سے بزرگوں کی قبر پر مجاوروں کا بیٹھنا بھی ثابت ہوا۔ جاء الباطل ص ۲۸۵ ج ۱۔

کیا صحابہؓ کے دور میں قبروں پر قبے بنائے گئے

الجواب ۔اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کے پورے الفاظ ہی درج نہیں کئے ورنہ انکے اس دعوے کی قلعی کھل جاتی کہ کسی نے انکار نہ کیا۔

آگے جانے سے پہلے آیئے متن روایت ملاحظہ کریں۔

لما مات الحسن بن الحسن بن علی ضربت امراته القبة علی قبره سنة ثم رفعت فسمعوا صائحا یقول الاهل وجدوا ما فقدوا فاجابه اٰخر بل یئسوا فانقلبوا.

یعنی حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن کی وفات ہوئی تو ان کی بیوی نے سال بھر اس کی قبر پر خیمہ لگایا پھر اسے اٹھالیا اس نے سنا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ کیا تو نے اس چیز کو پالیا ہے جس کو گم کیا تھا، دوسرے نے جواب دیا نہیں بلکہ بے نیل و مرام واپس لوٹ آئی ہے، صحیح بخاری ص ۱۷۷ ج ۱، ومشکوۃ ص ۱۵۲۔

غور کیجئے اس میں قبر پر مزار تعمیر کرنے کا ثبوت کہیں بھی نظر نہیں آرہا پھر اس دور کے لوگ اس عورت کے اس عمل پر قہقہہ اڑا رہے ہیں، اسی وجہ سے امام بخاری نے اسے باب

مایکره من اتخاذ المسجد علی القبور،

کے زیر عنوان درج کیا ہے، مگر مفتی صاحب الٹی گنگا بہا رہے ہیں۔

ثانیاً۔ امام بخاری نے اسے تعلیقا (بلا سند) بیان کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اسکی سند کو درج کیا ہے جس میں خیر سے ایک راوی، محمد بن حمید رازی تیمی ہے۔

تغلیق التعلیق علی صحیح بخاری ص ۴۸۲ ج ۲، اس کے متعلق امام یعقوب فرماتے ہیں کثیر المنا کیر ہے، امام بخاری کا کہنا ہے، فی حدیثہ نظر (اس کی حدیث میں نظر ہے) امام نسائی کا فیصلہ ہے ثقہ نہیں، امام جوزجانی فرماتے ہیں کہ غیر ثقہ ہونے کے علاوہ بد مذہب بھی تھا۔

امام صالح جزرہ کہتے ہیں میں نے شاذکونی اور ابن حمید سے بڑھکر کسی کو جھوٹ پر دلیر نہیں پایا، امام ابو زرعہ فرماتے ہیں جھوٹا ہے، امام ابونعیم کا کہنا ہے محدث ابو حاتم کے گھر ابن خراش اور فقہاء کی ایک جماعت جمع تھی تو ابن حمید کا تذکرہ ہوا تو تمام اس بات پر متفق ہوئے کہ ابن حمید حدیث میں سخت ضعیف ہے اور وہ ایسے لوگوں سے روایت بیان کرتا ہے جس سے اس کا سماع نہیں ہوا، امام ابن خراش کا کہنا ہے واللہ وہ جھوٹ بولتا تھا، امام ابوحاتم فرماتے ہیں کذاب ہے، امام حمزہ کنانی فرماتے ہیں ہیچ محض ہے دوسری بار کہا کذاب ہے امام ابن حبان کا کہنا ہے ثقات سے مقلوب روایات بیان کرنے میں منفرد ہے۔

تھذیب ص ۱۳۱ ج ۹، و میزان ص ۵۳۰ ج ۳۔

جس روایت میں راوی اتنا بڑا کذاب ہو، اس کی روایت کا کیا اعتبار ہے؟ اور اس کے باطل و موضوع ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

ثالثاً۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن کی وفات ۵۰ سال کی عمر میں ۹۷ھ میں ہوئی (تقریب، وتھذیب) حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی، البدایہ والنھایہ ص ۲۵۳ ج ۹ مترجم، پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مدینہ طیبہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ تھے جو کہ ۷۸ھ میں فوت ہوئے، لیکن باایں ہمہ مفتی صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھا کے زمانہ میں سب کی موجودگی میں ہوا کسی نے انکار نہ کیا، جاء الباطل ص ۲۸۵، اے جی مدینہ میں حسن کی وفات کے وقت کوئی صحابی نہ تھا، یہ آپ کی زیادتی ہے۔

مفتی صاحب کا اصل موضوع سے انحراف

جب مفتی صاحب کا مذکورہ ھیرا پھیریوں سے کیسہ دلائل خالی ہوگیا تو انہوں نے ادھر ادھر کی کتابوں سے عبارات نکال کر فتح حاصل کرنے کی سعی لاحاصل شروع کر دی آخر میں امام شعرانی کی کتاب میزان سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قبر پر عمارت بنانا جائز ہے پھر فرماتے ہیں اب تو رجسٹری ہوگئی کہ خود امام مذھب ابو حنیفہ کا فرمان مل گیا، جاء الباطل ص ۲۸۷،

اللہ ،اکبر، دسویں صدی ہجری کے ایک صوفی کی بے سند نقل سے مفتی صاحب قبوں کے جواز پر رجسٹری کروا رہے ہیں اور حضرت امام محمدؒ کی نقل جو امام صاحب کے شاگرد خاص اور محرر مذھب حنفیہ ہیں ان کی روایت سے قبوں کی عدم تعمیر پر رجسٹری ماننے سے انکاری ہیں۔

خیر مفتی صاحب اس طرح کی بے مقصد عبارات نقل کرتے کرتے آخر میں پھر پلٹا کھا کر قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے متفی اجتہاد کو بروئے کار لاکر فرماتے ہیں، حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خود زندہ لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی، ایک صحابی نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السلام ناراض ہوئے یہاں تک کہ اس کے سلام کا جواب نہ دیا جب اس کو گرادیا تب جواب سلام دیا، دیکھو مشکوۃ کتاب الرقاق فصل ثانی، اسی مشکوۃ کی کتاب الرقاق میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بندے کے مال میں بے برکتی ہوتی ہے تو اسے اس کو اینٹ گارے میں خرچ کرتا ہے لیکن ان احکام کے باوجود عام مسلمانوں نے بعد میں پختہ مکان بھی بنائے اور مسجدیں بھی ،تعجب ہے کہ جو حضرات اولیاء اللہ کی قبروں کے پختہ کرنے یا ان پر قبہ بنانے کو حرام کہتے ہیں وہ اپنے مکان کیوں عمدہ اور پختہ بناتے ہیں جاء الباطل ص ۲۸۸ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر نے مفتی جی کی زندگی میں ہی ان سے پختہ مکان بنانے کی ممانعت والی حدیث کا حوالہ مانگا تھا، راہ سنت ص ۲۰۳۔

مگر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے دم نہیں مارا الغرض یہ ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ثانیاً۔ البتہ جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ اس کے الفاظ بھی

نقل کر دیتے تاکہ ساری حقیقت قارئین کرام کے سامنے کھل کر آجاتی ، اے جی پختہ مکان کی وجہ سے ترک سلام نہ ہوا تھا بلکہ اس لئے ہوا تھا کہ گنبد اور قبہ بنایا تھا، آیئے مکمل متن روایت ملاحظہ کریں

عن انس بن مالک رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ خرج فرآی قبة مشرفة فقال ماهٰذه قال له اصحابه هٰذه لفلان رجل من الانصار قال فسکت و حملها فی نفسه حتی اذا جاء صاحبها رسول الله ﷺ یسلم علیه فی الناس اعرض عنه صنع ذلک مراراً حتی عرف الرجل الغضب فیه والا عراض عنه فشکا ذلک الی اصحابه فقال والله انی لانکر رسول الله ﷺ قالوا خرج فرآی قبتک فرجع الرجل الی قبته فهدمها حتی سواها بالارض فخرج رسول الله ﷺ ذات یوم فلم یرها فقال مافعلت القبة قالوا اشکا الینا صاحبها اعراضک عنه فاخبرناه فهد مها فقال اما ان کل بناء وبال علی صاحبه الاما الا ماله یعنی مالا بدمنه.

یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (باہر کو) نکلے تو آپ علیہ السلام نے ایک گنبد اونچا دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا فلاں انصاری کا مکان ہے یہ سن کر آپ خاموش رہے اور اس بات کو اپنے دل میں ہی رکھا جب وہ آپ کے پاس آیا اور مجلس عام میں آپ کو سلام کیا تو آپ نے اس سے اعراض کیا اور چند بار ایسا ہی کیا یہاں تک کہ اسے آپ علیہ السلام کی ناراضگی معلوم ہوگئی، اس نے اس کا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے شکوہ کیا اور کہا اللہ تعالی کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ ایسا نہیں پاتا جیسا کہ پہلے آپ میرے ساتھ محبت کرتے تھے لوگوں نے کہا آپ ایک بار باہر نکلے تھے تو تیرا گنبد دیکھا تھا (شاید اسی وجہ سے ناراضگی ہو) یہ سن کر وہ انصاری اپنے گنبد کی طرف آیا اور اس کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا، پھر ایک روز آپ علیہ السلام باہر کو نکلے اور اس گنبد کو نہ دیکھا آپ نے فرمایا اس گنبد کے ساتھ کیا کیا گیا، لوگوں نے عرض کی اس نے ہم سے شکایت کی تھی آپ کی بے التفائی کی تو ہم نے اسے بتایا تو اس نے اس کو منہدم کر دیا تو آپ نے فرمایا ہر مکان اس کے مالک مکان پر وبال ہے مگر وہ جس کے بغیر گزارہ نہ ہو۔

سنن ابی داود مع عون ص۵۳۰ ج۴، ومسند امام احمد ص۲۲۰ ج۳، ومشکل الآثار ص۴۱۶ ج۱۔
غور کیجئے اس میں تو گنبد کی وجہ سے ناراضگی بتائی گئی ہے مگر مفتی صاحب اسے پختہ مکان پر محمول کرر ہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً۔ روایت مذکورہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے ابوطلحہ الاسدی ہیں اس کی کسی محدث سے توثیق منقول نہیں، تھذیب ص ۱۳۸ ج ۱۲۔
حافظ ابن حجر نے تقریب ص ۳۰۲ میں اسے مقبول کہا ہے، یعنی متابعت کے وقت ورنہ لین الحدیث ہے، محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر نہایت نفیس بحث کی ہے باذوق حضرات مراجعت کریں

سلسلة الاحاديث الضعيفة والموضوعة و اثرها اليسئى فى الامة ص ۲۱۲ ج ۱ رقم ۱۷۶

اسی طرح مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت اما لم الخ (جب بندے کے مال میں بے برکتی ہوتی ہے تو اس کو اینٹ گارے میں خرچ کرتا ہے۔ جاء الباطل ص۲۸۸) بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں عبد الاعلی بن ابی المساور ، راوی ہے شعب الایمان للبیھقی ص۳۹۴ ج۷، رقم الحدیث (۱۰۷۱۹) امام یحییٰ، ابوداؤد فرماتے ہیں ہیچ محض ہے، ابن نمیر اور نسائی متروک کہتے ہیں دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، علامہ ذھبی فرماتے ہیں کہ اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، میزان الاعتدال ص۵۳۱ ج۲، الغرض یہ روایت ضعیف ہے، تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوۃ ص۱۷۰ ج۴۔

علاوہ ازیں روایت کا مفہوم یہ ہے کہ دین سے منہ پھیر کر دنیاوی شان وشوکت کیلئے خرچ کرے، دیکھئے مرقاۃ ص۳۸۳ ج۹، اور اس میں کیا شک ہے کہ انسان کو اللہ تعالی نے سب کچھ دیا ہو اور وہ راہ للہ کچھ خرچ نہ کرے اور اپنی ساکھ کیلئے بے دریغ دولت بہائے تو واقعی اس کے مال میں بے برکتی ہے۔ آمنا وصدقنا

کیا تکمیل شریعت کے بعد کوئی حکم منسوخ ہوسکتا ہے

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اول زمانہ میں تعلیم قرآن و اذان و اقامت پر اجرت لینا حرام تھا حدیث و فقہ میں موجود ہے مگر بعد کو ضرورتاً جائز کیا گیا۔ جاء الباطل ص ۲۸۸۔

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کی اول زمانہ سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں ہی پہلے یہ حرام تھا بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی تو پھر اعتراض کیسا، کیونکہ اجازت تو اللہ اور اس کے رسول نے دی، مفتی صاحب اور ان کے فقہاء کون ہیں جو اس کی ممانعت کا فتوی صادر کریں۔

ثانیاً۔ اگر مفتی صاحب کی مراد یہ ہے کہ شریعت میں اس کی ممانعت ہی ہے مگر مرور زمانہ کی وجہ سے اس کے جواز کا فتوی دیا گیا، تو ہم اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ شریعت کا کوئی حکم و فیصلہ منسوخ کرنے کا کسی امتی کو قطعاً حق نہیں ہے کیونکہ نسخ امت کے فعل سے نہیں بلکہ وحی سے ہوتا ہے، اس لئے کہ نسخ کی تعریف ہی یہ ہے کہ پہلے حکم کو باطل کر کے دوسرے حکم کو اس کا قائم مقام کرنا، دیکھئے مجمع بحار الانوار ص۳۵۲ ج۳، و تاج العروس ص۲۸۲ ج۲، و لسان العرب ص۵۸ ج۳) نسخ کی تعریف بیان کرتے ہوئے علامہ فیومی فرماتے ہیں، **النسخ الشرعی ازالة ماکان ثابتا بنص شرعی،**

یعنی نسخ شرعی اسے کہتے ہیں کہ ایسے حکم کو زائل کرنا جو اس سے پہلے کتاب و سنت کی نص سے ثابت تھا، المصباح المنیر ص۶۰۳ ج۲۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ شریعت کے کسی حکم کو زائل اور کالعدم کرنا ہی نسخ ہے اور اللہ تعالی اور اس کے انبیاء کرام کے احکام کو معدوم کرنے کا کسی امتی کو اللہ تعالی نے حق نہیں دیا کیونکہ امتی تو پیروی کرنے کا مکلّف ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں۔

لا یحل لمسلم یومن باللہ والیوم الآخر أن یقول فی شئ من القرآن و السنة، هذا منسوخ الابیقین، لان اللہ عزو جل یقول، وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ، و قال تعالی، اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم، فکل ماانزل اللہ تعالی فی القران أوعلی لسان نبیه ففرض اتباعه فمن قال فی شئ من ذلک، انه منسوخ فقد أوجب

ألایطاع ذلک الأمر، وأسقط لزوم اتباعه، و ھذہ، معصیة اللہ تعالی مجردة، و خلاف مکشوف، الاأن یقوم برھان علی صحة قوله، والا فھو مفتر مبطل.

یعنی کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں جو اللہ تعالی اور قیامت کے روز پر ایمان رکھتا ہو وہ قرآن و حدیث کے کسی حکم کے بارہ میں کہے کہ یہ منسوخ ہے، مگر یقین کے ساتھ (یعنی نص کے ساتھ) اس لئے اللہ عزوجل کہتے ہیں کہ میں نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اللہ کے حکم سے پیروی کی جائے، اور کہا اللہ تعالی نے، پیروی کرو اس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی، الغرض ہر وہ چیز جو اللہ تعالی نے قرآن میں نازل فرمائی ہے یا اپنے نبی کی زبان پر (خبر دی) اسکی اتباع فرض ہے پس جو شخص ان میں سے کسی کے متعلق کہتا ہے کہ یہ منسوخ ہے جب کہ اللہ نے اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور وہ اس فرض کی اتباع کو ساقط (گراتا) کرتا ہے تو یہ اللہ تعالی کی معصیت محض اور ثابت شدہ نص کے خلاف ہے، اِلاّ یہ کہ وہ اپنے قول پر کوئی دلیل لائے ورنہ مفتری اور باطل پرست ہے۔

الاحکام فی اصول الاحکام ص۸۳ و۸۴ ج۴۔

ثالثاً۔ باقی رہا تعلیم قرآن وسنت پر اجرت کا مسئلہ تو اس کے متعلق راقم آخر میں ان شاء الرحمٰن مقالہ سپرد قلم کرے گا جس میں فریقین کے دلائل کا محاکمہ کر کے مفتی صاحب کے شبہات دور کردیئے جائیں گے، یہاں فقط راقم اپنی تحقیق کا خلاصہ ہی درج کر دیتا ہے۔

اجرت معاوضہ کو کہتے ہیں اور تبلیغ دین کا معاوضہ اللہ ہی دے گا اور اسی کی طرف ہی دھیان رکھنا چاہیے، ہاں البتہ اگر انسان دینی اشغال کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کرسکتا ہو اور اس کی مالی حالت بھی کمزور ہو تو وہ گزارہ لے سکتا ہے کہ اجرت حقیقت میں مال کی خاطر کی جاتی ہے نہ یہ کہ کام اصل مقصود ہوتا ہے اور جو کچھ لیا جائے وہ صرف ضرورت کی بنا پر لیا جائے پس (اس میں یہ پابندی ہے) توسع اور فراخی سے کام نہ لینا چاہیے مثلاً اس ذریعہ سے جائداد جمع کی جائے یا بہت امیرانہ خرچ اختیار کیا جائے یا اپنے اہل قرابت یا متعلقین کے ساتھ ضروری سلوک سے زیادہ کیا جائے یہ صورتیں غیر مناسب ہیں اس طرح کام کا اندازہ کرے اگر واقعی شغل زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ اپنا کوئی مستقل کام نہیں کرسکتا تو گزارہ لے ورنہ بچے، غرض اس معاملہ میں جتنی احتیاط ہو تھوڑی ہے۔ دیکھیئے فتاوی اہل حدیث ص۳۰۰ ج۲۔

باب قبروں پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا اور چراغاں کرنے کا بیان

کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے یا زمانہ جاہلیت کی؟

اسلام نے انسان کو زندگی گزارنے کے طور طریقے بتائے ہیں اور اپنا ایک کامل معاشرہ دیا ہے اس کے مرنے کے بعد بھی دین نے اس کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیا ہے اس کی میت کو غسل، کفن دفن اور دعا (جنازہ) کا طریقہ بتایا ہے۔

ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اس کی مزید تشریح وتوضیح کرتے ہوئے ان امور کی اپنی زندگی مبارکہ میں عملی تفسیر کردی ہے، جب اسلام کے احکام ہر لحاظ سے پورے کردیئے گئے تو اللہ رب العزت نے تکمیل دین کی نعمت کی خوش خبری دی، سورۃ المائدۃ آیت ۳)

بانی اسلام نے دین اسلام میں حک و اضافہ سے منع فرمایا اور اسے بدعت سے تعبیر کیا اور اس کے قائل و فاعل کو جہنم کی دردناک آگ کی وعید شدید سنائی۔

جس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں دین کی تعلیم محیط ہے اسی طرح انسان کی اخروی زندگی کے متعلق بھی شریعت نے قواعد وضوابط بیان فرمائے ہیں۔

ان قوانین کی پابندی ہی اصل دین ہے اور ان سے انحراف اور حک و اضافہ دراصل دین سے کھلی بغاوت ہے،انسان کی یہ بغاوت اللہ تعالی کے ہاں اتنی مذموم اور گھناؤنی ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کی وعید رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ صحیح بخاری ص۲۵۱ ج۱، ومسلم ص۴۴۱ ج۱۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر قبروں پر چراغاں کرنے میں کوئی دینی مصلحت ہوتی، پھول اور چادر چڑھانے سے میت کو کچھ اخروی فائدہ ہوتا تو رسول کریم ﷺ ضرور چڑھاتے، کیونکہ آپ مومنوں کیلئے رؤف ورحیم تھے، ارشاد ہوتا ہے۔

لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمومنين

رءوف رحیم ☆ توبہ ۱۲۸.

(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمھاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ ۹۔۱۲۸

الغرض اگر چادر اور پھول وغیرہ سے میت کو اخروی فائدہ ہوتا تو آپ ﷺ کی شفقت اور مہربانی کا تقاضا تھا کہ آپ علیہ السلام اسے بیان فرماتے، قارئین آپ قرآن کو الحمد سے لیکر والناس کی سین تک پڑھ جائیے، اور پورے ذخیرہ احادیث کو وسیع النظری سے دیکھ لیجئے کہیں بھی آپ کو ایسا کوئی ارشاد نہیں ملے گا۔

ہم اپنی خداداد فراست اور اپنے دین و ایمان کی محکمی سے یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان رسوم کی شریعت حقہ میں کوئی اصل نہیں ان کی ایجاد دین اسلام کی تکمیل کے صدہا سال بعد بدعتی صوفیاء کے ذریعہ سے ہوئی اس کا رشتہ اسلام کی بجائے زمانہ جاہلیت کی مذموم رسوم سے ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاوی عالم گیری، میں ہے

وایقاد النار علی القبور فمن رسوم الجاهلية.

یعنی قبروں پر آگ جلانا جاہلیت کی رسموں میں سے ہے۔ فتاوی عالم گیری ص۱۶۷ ج۱۔

حضرت محمد مصطفی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے

اللہ تعالی کے ہاں بدترین وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے، بخاری کتاب الدیات باب من طلب دم امرئ بغیر حق، ص۱۰۱۶ ج۲۔

اس صاف و شفاف تعلیم کے برعکس مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ علماء، اولیاء اور صالحین کی قبروں پر عمارت بنانا اور ان پر غلاف اور عمامہ اور کپڑے چڑھانا جائز کام ہیں، جاء الباطل ص۳۰۰ ج۱۔

مگر اس جواز کی دلیل ندارد، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس کی دلیل تو کجا شریعت میں ان عبث کاموں کی ممانعت موبود ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

ان الله لم یامرنا ان نکسو الحجارة والطین ، الحدیث.

یعنی اللہ تعالی نے ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا کہ ہم مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنائیں۔ صحیح مسلم ص۲۰۰ ج ۲۔

سنن ابو داؤد کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

ان اللہ لم یامرنا فیما رزقنا ان نکسوا الحجارۃ واللبن.

یعنی اللہ تعالی نے جو ہمیں رزق دیا ہے اس سے پتھر اور اینٹ کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا ۔ سنن ابو داؤد مع عون المعبود ص۱۲۲ ج ۴۔

اس حدیث کا یہی مقصود ہے کہ یہ چیزیں کپڑے وغیرہ کی محتاج نہیں، ظاہر ہے کہ اولیاء اور مزارات بھی اس میں شامل ہیں کیونکہ قبر پر چادر ڈالنا درحقیقت اینٹ گارے اور پتھر کو ہی کپڑا پہنانا ہے، جو اسراف کے زمرے میں آتا ہے۔

اللہ تعالی کے دیئے ہوئے رزق کو بے جا خرچ کرنا اس قدر برا فعل ہے کہ خالق ارض وسماء نے فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے

و آت ذا القربیٰ حقه و المسکین و ابن السبیل ولا تبذر تبذیراً☆ ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین و کان الشیطن لربه کفوراً☆ بنی اسرائیل ۲۶ و ۲۷.

اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو، اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا کفر کرنے والا ہے۔ ۱۷- ۲۶ و ۲۷۔

ایک روایت میں نبی رحمت رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قبروں پر چراغاں کرنے پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

لعن رسول اللہ ﷺ زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی خواتین اور ان کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ابو داود ص۱۰۵ ج ۲، و نسائی ص۲۲۳ ج ۱، و طیالسی ص۳۵۷، و

ترمذی مع تحفه ص ۲۶۵ ج ۱ ، و مسند امام احمد ص ۲۲۹ و ۲۸۷ ج ۱ ، و ابن حبان ص ۲۷ ج ۶ رقم الحدیث ۳۱۶۹، و مصنف ابن ابی شیبه ص ۳۴۵ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۷۴ ج ۱ ، و السنن الکبریٰ للبیهقی ص ۷۸ ج ۴، و طبرانی کبیر ص ۱۴۸ ج ۱۲ .و سنده ضعیف، الضعیفه، ۲۲۵ .

اس حدیث میں اس قدر سختی کی وجہ یہی ہے کہ مزارات پر چادر و پھول چڑھانا اور چراغاں کرنا دین میں بدعت کے علاوہ اسراف اور فضول خرچی بھی ہے اور بے مقصد دولت کو اجاڑنے والا بحکم قرآنی اخوان الشیطان اور کفران نعمت کا مرتکب ہے یہی معنی شارحین نے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ملا علی القاری حنفی مشکوۃ کی شرح میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

و النهی اتخاذ السرج لما فیه من تضییع المال لانه لانفع لاحدمن السراج ولانها من آثار جهنم واما للا حتراز عن تعظیم القبور کا لنهی عن اتخاذ القبور مساجد.

یعنی قبر پر چراغ جلانے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مال کا زیاں ہے اس لئے کہ چراغ جلانے سے کسی ایک (جلانے والا او رصاحب قبر) کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا، اور اس لئے بھی کہ یہ (آگ) جہنم کے آثار سے ہے اور اس لئے بھی کہ قبر کی تعظیم سے اجتناب (کرنے کا حکم ہے) جیسا کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ مرقاۃ ص ۲۱۹ ج ۲ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

شاہ عبد الحق محدث دھلویؒ (جن کی عبارات کو فریق ثانی چن چن کر بدعات کے جواز پر پیش کرتا ہے) شرح مشکوۃ میں تحریر فرماتے ہیں

چراغهارا بر قبور بقصد تعظیم و نذد بعض حرام است اگرچه نه بقصد تعظیم باشد اوجهت اسراف و تضیع مال و بعض گو یند که اگر آن جاء هگزر مردم باشد یادر سایه چراغ کاری میکرده باشد جائز است و درینصورت چراغ گرفتن بجهت قبر نیست بلکه بجهت کاری دیگر ست که قبر دران منظور نیست:

یعنی قبروں پر تعظیم کے قصد سے چراغ جلانا بعض کے نزدیک حرام ہے، اور اگر تعظیم کے قصد سے نہ ہو تب بھی اسراف اور مال کے زیاں کی وجہ سے حرام ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اگر قبر راستے پر ہے یا اس جگہ کوئی سایہ وغیرہ ہو تو تب چراغ جلانا جائز ہے مگر اس صورت میں چراغ جلانا قبر کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے کاموں کی وجہ سے ہے نہ کہ قبر پر چراغ جلانا منظور ہے۔ اشعۃ اللمعات ص ۳۶۳ ج ا، طبع نورانی کتب خانہ پشاور، وطبع نول کشور ۱۸۹۴ء۔

فائدہ جلیلہ

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی قبور پر مزار کی عظمت شان کے اظہار کیلئے بھی جائز ہے، ضرورتیں تین ہیں یا تو رات میں مردے کو دفن کرنا ہے روشنی کی ضرورت ہے، جائز ہے، قبر راستے کے کنارے پر ہے تو اس پر اس لئے چراغ جلا دینا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے وغیرہ .... مزارات اولیاء اللہ پر اگر ان میں سے کوئی ضرورت بھی نہ ہو تب بھی تعظیم ولی کیلئے جائز ہے، جاء الباطل ص ۲۹۶ ج ا۔

حضرت شاہ عبدالحق صاحب کی مذکورہ عبارت سے مفتی صاحب کی ان باتوں کی پر زور تردید ہوتی ہے، وہ صاف کہتے ہیں کہ قبر کی تعظیم کیلئے چراغ جلانا بحکم حدیث حرام ہے اور اگر تعظیم مقصود نہ بھی ہو تب بھی اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے حرام ہے اور مبتدعین کے اس بہانے کو وہ رد کر رہے ہیں کہ اگر راستے میں الخ، کیونکہ اس سے مقصود قبر پر چراغ جلانا ہی نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے ہے جس کا قبر سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

اسی طرح رات کے وقت دفن کرتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے چراغ جلایا جاتا ہے نہ کہ کسی قبر کی تعظیم کیلئے اور یہ چیزیں محل نزاع سے خارج ہیں۔

(۲) مفتی صاحب فرماتے ہیں ملا علی القاری اور شیخ عبدالحق محدث دھلوی و دیگر شارحین اسی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ خود قبر پر مسجد بنانا کہ قبر کی طرف سجدہ ہو یا قبر فرش مسجد میں آجائے یہ منع ہے لیکن اگر قبر کے پاس مسجد ہو برکت کیلئے تو جائز ہے یعنی اس جگہ انہوں نے "عَلٰی" کو حقیقی معنی پر رکھا ہے جس سے لازم آیا کہ اگر خود تعویز قبر پر چراغ جلانا منع ہے لیکن اگر قبر کے ارد گرد ہو تو وہ قبر پر نہیں، لہذا جائز ہے، جاء الباطل ص ۳۰۴ ج ا۔

ان اکابر کی عبارات کو ہم نے بحوالہ عرض کر دیا ہے، وہ تو صاف کہہ رہے ہیں کہ قبروں پر چراغ روشن کرنا مال کے زیاں، قبر کی تعظیم اور آثار جہنم کی وجہ سے حرام ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ قبر کے آس پاس اگر چراغ جلایا جائے تو تب جائز ہے، حالانکہ انکی عبارات میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں، بلکہ ان کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر اردگرد کسی بشری ضرورت کیلئے چراغ جلایا جائے، تو وہ چونکہ قبر کی تعظیم کیلئے نہیں لہذا جائز ہے، اگر آس پاس بھی قبر کی تعظیم کیلئے جلایا جائے تو تب بھی ناجائز ہے کیونکہ دونوں میں نیت ایک ہی ہے کہ دین میں اعتبار نیت کا ہوتا ہے علاوہ ازیں خود مفتی صاحب جاء الباطل میں عنوان تو مزارات پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا چراغاں کرنا، ص۲۹۶) کا قائم کرتے ہیں، حرف، پر، کا عربی میں ٹھیک معنی، علی، ہوتا ہے، گویا مفتی صاحب کا بھی دلی عقیدہ یہی ہے کہ قبروں کے اوپر چراغ جلایا جائے، اور مبتدعین کی قبروں کے اوپر ہی چراغ جلایا جاتا ہے۔

مگر یہاں پلہ چھڑانے کیلئے اس سے صاف انکار کر رہے ہیں حالانکہ حرف ''عَلَی'' میں دونوں مفہوم داخل ہیں قرآن میں ہے

(۱) او کالذی مر علی قریة . البقره. ۲۵۹)

یا اس کی طرح جو گزرا ایک بستی پر۔ (احمد رضا)

تو کیا مفتی صاحب اس کا یہ معنی کریں گے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اس بستی کے لوگوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے۔

(۲) ولا تصل علی احد منهم مات ابداً ولا تقم علی قبره. (توبه ۸۳)

اور ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ (احمد رضا)

تو کیا مفتی صاحب اس آیت کا یہ معنی کریں گے کہ کسی منافق کی میت کے اوپر چڑھ کر نماز جنازہ نہ پڑھنا آس پاس پڑھ لینا، اور قبر کے اوپر کھڑے ہو کر دعا نہ کرنا البتہ اس کے قرب و جوار میں اس کے حق میں مغفرت کی دعا کر لینا۔

اگر آپ حضرات ان آیات میں تین بار حرف علی کے معنی میں وسعت تسلیم کرتے ہیں تو حدیث میں ماننے سے کونسی چیز مانع ہے، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس صورت میں حقیقت ومجاز کا اجتماع لازم ہوگا، جاء الباطل ص۳۰۴ ج ا۔

تو ان کی نری جہالت ہے کیونکہ یہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز، نہیں بلکہ عموم مجاز ہے جو کہ جائز ہے۔

مفتی صاحب کا حقائق سے انکار

پہلا عذر

اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر غلاف ڈالا تھا، اسے پھاڑ کر یہ فرمایا، قبور اولیاء کی چادر کو اس سے کوئی تعلق نہیں، کعبہ معظّمہ پر قیمتی سیاہ غلاف ہے اور روضہ رسول علیہ السلام پر سبز (غلاف ہے) کعبہ زمانہ نبوی میں تھا، بتاؤ وہ جائز، تو قبور کی چادر بھی جائز، جاء الباطل ص۳۰۲ ج ا۔

کیا اعتبار خصوص سبب کا ہوتا ہے؟

الجواب ۔اولاً۔ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، خصوص سبب کا نہیں مثلاً قرآن کریم میں ہے

ان الذین یر مون المحصنٰت الغفلٰت المؤمنٰتِ لعنوا فی الدنیا و الآخرة و لهم عذاب عظیم. النور۲۳

جو لوگ پرہیزگار اور برے کاموں سے بے خبر اور ایماندار عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کو سخت عذاب ہوگا (۲۴۔۲۳)

اس آیت کا شان نزول تو حضرت صدیقہ کائنات رضی اللہ عنہا کا واقعہ افک ہے مگر اس کے عموم الفاظ میں دیگر امہات المومنین اور قیامت تک آنے والی پاک طینت خواتین شامل ہیں اسی طرح گو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا سبب تو دیوار پر پردہ کا ہے مگر آنحضرت ﷺ کے الفاظ میں عموم ہے۔

ان اللہ لم یامرنا ان نکسو الحجارۃ والطین، الحدیث.

اللہ تعالی نے ہمیں مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ صحیح مسلم ص ۲۰۰ ج ۲۔

اگر بقول مفتی صاحب ان الفاظ کا تعلق خاص پردہ لٹکانے سے ہی ہوتا تو الفاظ حدیث اس طرح ہوتے ۔

اللہ تعالی نے ہمیں دیوار پر پردہ لٹکانے کا حکم نہیں فرمایا۔ لیکن الفاظ نبوی عام ہیں خواہ کوئی پتھر اور مٹی ہو۔اور اس میں قبر کا پتھر اور مٹی شامل ہے، اور اس سے انکار محض ضد ہے اور اس مرض کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا کعبہ کے غلاف کا بہانہ تو یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ کعبہ کا غلاف تو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں چڑھایا جاتا تھا، جس میں آپ علیہ السلام نے تغیر نہیں کیا لہذا وہ عین سنت خیر الانام ہے، دیکھئے بخاری ص ۶۱۳ ج ۲۔

اگر کسی قبر کے متعلق یہ ثابت کر دیا جائے کہ زمانہ نبوی میں مسلمان اسکی تعظیم کیلئے چراغ جلاتے اور پھول ڈالتے تھے، تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ اسے سنت تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی پس و پیش نہ ہوگا اور ہم بغیر حیل و حجت اور تامل اسے قبول کر لیں گے، مگر پوری دنیا کے منکرین سنت اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، خواہ مرے ہوئے مبتدعین بھی دوبارہ زندہ ہو کر آجائیں۔ واضح رہے کہ غلاف چڑھانا کعبہ سے خاص ہے جیسے طواف صرف کعبہ کا ہی کیا جا سکتا ہے، اور اس پر قیاس کر کے کسی مسجد یا قبر کا طواف کرنا جائز نہیں،

ثالثاً۔ اسی طرح اگر کسی معتبر دلیل سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ خیر القرون کے سنہری دور میں کسی صحابی و تابعی نے رسول اللہ ﷺ کی قبر اطہر پر غلاف چڑھایا تھا اور اس پر بلا نکیر عمل بھی ہوتا رہا تو ہم تب بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں۔

محض مفتی صاحب کا بلا دلیل لکھ دینا کہ غلاف چڑھایا جاتا ہے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

دوسرا عذر

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

اسراف کے معنی ہیں بے فائدہ مال خرچ کرنا، چونکہ ان پھولوں اور چراغوں اور چادروں میں وہ فوائد ہیں جو کہ ہم پہلے باب میں عرض کر چکے ہیں، لہٰذا یہ اسراف نہیں، رہا کام چلنے کا عذر اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم کرتہ اس پر واسکٹ اس پر اچکن پہنتے ہیں پھر وہ بھی قیمتی کپڑے کی حالانکہ کام تو صرف ایک کرتے میں چل سکتا ہے، بتاؤ یہ اسراف ہوا یا کہ نہیں، اسی طرح عمارت اور لذیذ خوراک، سواریاں اور دیگر دنیاوی آرائشی سامان کہ ان سب میں خوب وسعت کرتے ہیں حالانکہ ان سے کم اور ان سے ادنی چیزوں سے بھی کام چل سکتا ہے لیکن اسراف نہیں جس کو شریعت نے حلال کیا ہے وہ مطلقاً ہی حلال ہے۔ جاء الباطل ص۳۰۲ ج۱۔

کیا خوش لباسی اور تمام اکل حلال، اسراف ہے؟

الجواب ۔اولاً۔ آپ کے بیان کردہ فوائد کی حقیقت تو آگے انشاء الرحمٰن آرہی ہے، کہ ان میں سے کوئی شرعی فائدہ ہی نہیں، کیونکہ شریعت نے ان فوائد کو بیان ہی نہیں کیا۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قبروں پر پھول و چادر چڑھانے اور چراغ جلانے میں کچھ فائدہ بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ کسی چیز میں چند فوائد ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ چیز اصل میں جائز و مباح ہے اور اس کو دستور العمل بنانا درست ہے،

شراب کو اللہ تعالی اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، مگر اس کے باوجود یہ بات کھل کر بیان فرمائی ہے، ومنافع للناس، البقرہ ۲۱۹،

اور لوگوں کیلئے (اس میں) کچھ فائدے بھی ہیں،(۲۔ ۲۱۹)

تو کیا ان فوائد کی وجہ سے شراب کو حلال و طیب کہا جاسکتا ہے، اور راس کے پینے کا فتوی دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے چراغ جلانے پر لعنت فرمائی ہے، تو گو امر

واقعہ میں بھی اس میں ہزاروں فوائد ہوں تب بھی یہ رسول اللہ ﷺ کی لعنت کے نیچے دب کر رہ جائیں گے۔

ثالثاً۔ مفتی جی انسان لباس تو اپنا تن ڈھانپنے اور زیب و زینت کیلئے پہنتا ہے، اسی طرح مکان وسواری وغیرہ کا اہتمام تو انسان اپنی سہولت کیلئے کرتا ہے، تاکہ اپنی زندگی کو بہتر طور وطریقہ سے گزار سکے، اوران چیزوں سے شریعت نے قطعاً منع نہیں کیا بلکہ اس کے متعلق تو صاف کہا ہے

قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده و الطيبٰت من الرزق قل هي للذين اٰمنوا في الحيوٰة الدنيا خالصة يوم القيٰمة. الاعراف ۳۲)

پوچھو کہ زینت (وآرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں خدانے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں انکو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کیلئے ہیں اور قیامت کے دن خالص انہی کا حصہ ہونگی (۷-۳۲)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے اگر رزق دیا ہوتو اس کا استعمال کرنا تاکہ زندگی سکھ چین اور آسودگی سے گزرے تو یہ حرام نہیں ہے۔

قبروں کو چادر چڑھانے پھول ڈالنے اور چراغ جلانے سے قطعاً یہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ بدعات تو قبر کی تعظیم کیلئے مبتدعین نے ایجاد کر رکھی ہیں جیسا کہ خود مفتی صاحب کو اس کا اقرار ہے۔ جاء الباطل ص۲۹۶۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب دعوی کچھ اور دلیل کچھ اور عنایت کر رہے ہیں، غالباً مفتی صاحب تعظیم اور زینت کے فرق اور ان کے معنی ومفہوم سے ہی ناواقف تھے یا اس طرح سطحی باتیں وہ جان بوجھ کر بیان کر کے اپنے قارئین کو ادھر ادھر کی ابحاث میں الجھا کر داد تحسین حاصل کرنا چاہتے تھے، تاکہ مبتدعین کے عوام جانے کہ حضرت نے آخر جواب تو لکھ ہی دیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس میں جان ہو یا نہ ہو

علاوہ ازیں یہ چیزیں تو شریعت میں حلال وطیب ہیں جن کی حلت کا خود مفتی صاحب نے اقرار کیا ہے جبکہ ان کے برعکس قبروں پر چراغ جلانے کی ممانعت موجود ہے لہذا ان پر قیاس کرنا

باطل ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بکری پر خنزیر کو قیاس کرے اور اس کے فوائد پر لاکھ دلائل قائم کرے اور کہے کہ دیکھنے میں دونوں ہی برابر ہیں اگر بکری چوپایا ہے تو خنزیر کی بھی چار ٹانگیں ہیں مگر ایسے اجتہاد کو کوئی مسلمان تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا، بلکہ تعوذ پڑھ کر ایسے خرافات سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگے گا۔

تیسرا عذر

مشکوٰۃ باب الدفن میں ہے۔

ان النبی ﷺ دخل لیلاً فاسرج له بسراج.

نبی کریم ایک شب دفن میت کیلئے قبرستان میں تشریف لے گئے تو آپ کیلئے چراغ جلایا گیا۔

جاء الباطل ص۳۰۴ ج۱۔

کیا رات کو دفن کے وقت لائٹ کا انتظام کیا جا سکتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کیا یہ چراغ میت کی تعظیم کیلئے جلایا گیا تھا، قطعاً نہیں بلکہ چراغ جلانے کا مقصود تو رات کے اندھیرے میں روشنی کر کے، آنحضرت ﷺ کیلئے سہولت مہیا کرنا تھی، جیسا کہ آج بھی اگر مردے کو رات کے وقت دفن کیا جائے تو روشنی کی غرض سے لائٹ کا انتظام کیا جاتا ہے،اور اس سے مقصود میت کی تعظیم نہیں ہوتی بلکہ اپنے لئے سہولت کا انتظام کیا جاتا ہے تاکہ میت کو دفن احسن طریقے سے کیا جائے،اور یہ چیزیں محل نزاع سے خارج ہیں، نہ ہی ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ یہ روایت سند کے لحاظ سے سخت ضعیف ہے اس میں دو راوی ضعیف ہیں، پہلا راوی ابو قدامہ منھال بن خلیفہ کوفی ہے، ترمذی مع تحفہ ص۱۵۷ ج۲، اسے امام یحیٰی بن معین او رنسائی نے ضعیف کہا ہے امام بخاری فرماتے ہیں اس کی احادیث منکر ہیں،

امام ابن حبان فرماتے ہیں مشاہیر سے منکر روایات بیان کرنے میں منفرد ہے اس سے احتجاج

کرنا جائز نہیں، تھذیب ص۳۱۹ ج ۱۰، و میزان ص۱۹۱ ج ۳، حافظ ابن حجر کا کہنا ہے ساتویں طبقہ کے ضعیف راویوں سے ہے، تقریب ص۲۵۵۔

دوسرا راوی اس میں حجاج بن ارطاۃ قاضی کوفہ ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ صدوق کثیر الخطاء والتدلیس، یعنی سچا تو ہے (لیکن) کثرت سے غلطیاں اور تدلیس کرتا ہے، تقریب ص۵۰، اسے امام ابن عدیؒ، امام ساجیؒ، امام بزارؒ، علامہ ذھبیؒ، امام محمد بن نصر، امام نسائی، امام یحییٰ بن قطان، امام احمد، اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، تھذیب ص۱۷۴ ج ۲، و طبقات المدلسین ص۴۹، و میزان ص۴۵۸ ج ۱۔

اور زیر بحث روایت میں سماع کی صراحت نہیں بلکہ معنعن ہے، ترمذی مع تحفہ ص۱۵۷ ج ۲، اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ مدلس راوی کی وہ روایت جس میں وہ تحدیث کی صراحت نہ کرے، ضعیف ہوتی ہے۔

چنانچہ علامہ زیلعی حنفی تخریج ھدایہ، میں فرماتے ہیں کہ

روی الترمذی.......... قال حدیث حسن وأ نکر علیه لان مداره علی الحجاج بن أرطاة، وهو مدلس ولم یذ کر سماعا، قال ابن قطا، ومنهال بن خلیفة ضعفه ابن معین وقال البخاری فیه نظر.

یعنی اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے (لیکن امام ترمذی کی) تحسین سے انکار کیا گیا ہے کیونکہ (اس روایت کا) دارومدار حجاج بن ارطاۃ پر ہے اور وہ مدلس ہے او راس نے سماع بھی ذکر نہیں کیا، امام ابن قطان فرماتے ہیں کہ (اس روایت کے دوسرے راوی) منھال بن خلیفہ کو امام ابن معین نے ضعیف کہا ہے اور امام بخاری نے، فیہ نظر، کہا ہے۔

نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ ص۳۰۰ ج ۲۔

الغرض یہ روایت سنداً ضعیف ہے جس کا حنفی اکابرین نے بھی اقرار کر رکھا ہے۔

چوتھا عذر

بہت سی باتیں زمانہ صحابہ کرام میں منع تھیں مگر اب مستحب ہیں، روح البیان پارہ

۱۰ سورۃ توبہ زیر آیت

انما یعمر مسٰجد الله من آمن بالله. ہے

و فی الاحیاء اکثر مصروفات هذه الاثار منکرات فی عصر الصحابة.

یعنی احیاء العلوم میں امام غزالی نے فرمایا کہ اس زمانہ کے بہت سے مستحبات صحابہ کرام کے زمانہ میں ناجائز تھے۔

مشکوٰہ کتاب الامارۃ باب ماعلی الولاۃ، میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ کوئی مسلمان حاکم خچر پر سوار نہ ہو اور چپاتی روٹی نہ کھائے اور باریک کپڑا نہ پہنے دروازہ کو اہل حاجت سے بند نہ کرے اور فرماتے تھے۔

فان فعلتم شیئا من ذلک فقد حلت بکم العقوبة

اگر تم نے ان میں سے کچھ بھی کیا تو تم کو سزا دی جائے گی۔

اسی مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے کہ ، **ماامرت بتشیید المسٰجد** مجھ کو مسجدیں اونچی بنانے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اس کے حاشیہ میں ہے، **ای باعلاء بناء هاو تزینها**، یعنی مسجدیں اونچی بنانے اور ان کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں۔

اسی مشکوٰۃ میں ہے

لاتمنعوا اماء الله مساجد الله، عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو۔

قرآن میں زکوٰۃ کے مصرف آٹھ ہیں یعنی مولفۃ القلوب بھی زکوٰۃ کا مصرف ہے لیکن عہد فاروقی سے صرف سات مصرف رہ گئے مولفۃ القلوب کو علیحدہ کر دیا گیا (دیکھو ھدایہ) کہیئے اب بھی ان پر عمل ہے، یہ احکام کیوں بدلے؟ اس لئے کہ ان کی علتیں بدل گئی اس وقت بغیر ظاہری زیب و زینت کے مسلمانوں کے دلوں میں اولیاء اللہ اور مقابر کی عزت و حرمت تھی لہذا زندگی موت ہر کام میں سادگی تھی اب دنیا کی آنکھیں ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھتیں ہیں لہذا اس کو جائز قرار دیا گیا ہے چنانچہ پہلے حکم تھا کہ مزارات پر روشنی نہ کرو اب جائز قرار پایا، انتہی ملخصاً، جاء الباطل ص ۳۰۵ ج ۱۔

کیا مرور زمانہ سے حکم شرعی بدل جاتا ہے؟

الجواب ۔ اولاً۔ ان عذرات میں مفتی صاحب کو یہ تو تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن وسنت اور اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں قبروں پر چادریں چڑھانا پھول ڈالنے اور چراغ روشن کرنے کی ممانعت ہے اور ان بدعات پر وعید شدید موجود ہے، مفتی صاحب کے اس عذر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مبتدعین قرآن وسنت سے ہیر پھیر کرکے ان بدعات کے جواز ومستحب پر بزعم خود جو دلائل نقل کرتے ہیں، وہ حقیقت میں دلائل نہیں بلکہ ان کے حقیقی واصل معنی اور مطلب ومفہوم کو بگاڑ کر تحریفات سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت صاف اور شفاف ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اختلاف قطعاً نہیں، جیسا کہ قرآن پاک کی سورۃ النساء آیت ۸۲، میں بیان ہوا ہے۔

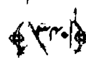
اس واضح ارشاد ربانی کے برعکس یہ ہم کیسے تسلیم کرلیں کہ شریعت میں ان کی ممانعت اور اجازت بھی ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ ان دونوں میں سے حکم شرع محمدی فقط ایک ہی ہے،اور وہ ہے، ان فضول وعبث کاموں کی ممانعت کا۔

ثانیاً۔ دین اسلام کی تکمیل کے بعد کسی دینی وشرعی حکم کا منسوخ ہونا قطعی طور پر غلط ہے، کیونکہ نسخ کا تعلق وحی سے ہے۔

دین کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قول وحکم کسی بڑے سے بڑے امتی کے قول واقوال سے بھی منسوخ نہیں ہوسکتا ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں کئی ناجائز چیزیں اب مستحبات میں داخل ہیں، تو یہ ان کی غلط بیانی ہے، ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت کو چیلنج ہے کہ وہ کسی امر شرعی کی مثال ثابت کریں کہ صحابہ کرام کے دور میں فلاں فلاں حکم شرعی کی ممانعت تھی مگر اب وہ مستحبات میں شامل ہے، کائنات کے خالق و مالک کی قسم ہے کہ جملہ مبتدعین اس کی ایک مثال بھی ثابت نہیں کرسکتے۔

اگر ہم اس قاعدہ واصول کو تسلیم کرلیں تو دین اسلام کے ایک حصے بلکہ بیشتر دین کو آج لوگ ہوائے نفس کی پیروی سے ترک کردیں گے، اور اس ہوائے نفس کے دور میں عیاش لوگ یہ کہنا



شروع کردیں گے کہ شریعت حقہ کے حسب ذیل احکام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے زہد وتقوی کی وجہ سے ناجائز تھے مگر اب مستحبات میں داخل ہیں۔

(۱) اکل حرام ناجائز تھا	مگر اب جائز ہے
(۲) بتوں کے نام جانور ذبح کرنے ناجائز تھے	مگر اب جائز ہے
(۳) سود ناجائز تھا	مگر اب جائز ہے
(۴) شراب کا استعمال ناجائز تھا	مگر اب جائز ہے
(۵) جوا ناجائز تھا	مگر اب جائز ہے
(۶) زنا ناجائز تھا	مگر اب جائز ہے
(۷) والدین پر لعنت ناجائز تھی	مگر اب جائز ہے
(۸) ترک نماز کفر تھا	مگر اب جائز ہے
(۹) تصویر اتروانی ناجائز تھی	مگر اب جائز ہے
(۱۰) زمین کی حدود کو مٹانا حرام تھا	مگر اب جائز ہے

اس طرح کے صدہا مسائل عوام نفسی خواہش کے تحت جائز و مباح قرار دے لیں گے، تو مبتدعین اسکے جواب میں یہی کہیں گے کہ نہیں بھائی جو چیز شریعت حقہ میں اس وقت حرام و ناجائز تھی وہ آج بھی حرام و ناجائز ہی ہے، کیوں کہ دین اسلام کا کوئی حکم کسی امتی کے کہنے سے منسوخ ہوسکتا ہے نہ ہی حرام چیز حلت میں بدل سکتی ہے، یہی بات ہم مزارات کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں۔

اب ترتیب وار مفتی صاحب کی غیر متعلقہ امثلہ کا جواب ملاحظہ کریں۔ اللہ تعالی ھدایت دے۔

عمال حکومت اور سیاست فاروقی

اسلام جب دیار عرب سے نکل کر عجم میں آیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس پر سخت اصرار تھا کہ امراء اور عمال عیش وعشرت میں مبتلا نہ ہونے پائیں، حاکم ومحکوم میں مساوات قائم رہے، غیر قوموں کی عادتیں ان میں سرایت نہ کرنے پائیں، حاکم تک ہر شخص کی رسائی ہو اور وہ خلیفہ وقت

کے پاس بلا روک ٹوک پہنچ سکے، چنانچہ حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

وایاکم والتنعم و زی اھل الشرک و لبوس الحریر.

یعنی عیش وعشرت اور مشرکین کی وضع وقطع اور ریشم سے اجتناب کرو، مسند احمد ص۱۶ ج۱، وصحیح مسلم ص۱۹۱ ج۲۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ سے ان تک فریادوں کی آواز نہیں پہنچ سکتی تو محمد بن مسلمہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوادی، مسند امام احمد ص۵۴ ج۱۔

ان کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز بھیجی تو انہوں نے پوچھا کیا کل مسلمان یہی کھاتے ہیں؟ بولے نہیں، اسی وقت ان کو لکھا کہ یہ تمھاری یا تمھارے باپ کی کمائی نہیں جو خود کھاؤ وہی تمام مسلمانوں کو کھلاؤ، اور عیش سے بچو، صحیح مسلم ۱۹۱ ج۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ

انی لم ابعث عمالی لیضربوا ابشارکم ولالیأ خذوا اموالکم فمن فعل به ذلک فلیر فعه الی اقصه منه، الحدیث.

یعنی میں نے اپنے عاملوں کو اس غرض سے نہیں بھیجا کہ وہ آپ کے جسموں کو ماریں یا تمھارے اموال کو لے لیں! اگر کوئی ایسا کرے تو میرے پاس استغاثہ کرے میں اس کو قصاص دلاؤں گا، ابو داود مع عون ص۳۰۶ ج۴۔

بلکہ ایک روایت میں مزید الفاظ یہ ہیں کہ

ولکن بعثتهم لیعلموکم دینکم و سنتکم فمن فعل به غیر ذلک فلیرفعه فاقصه منه.

یعنی عمال کو مقرر تو اس لیئے کرتا ہوں کہ وہ تمہیں دین اور سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام سکھائیں، جو افسر اس کے خلاف کرے اسکی میرے پاس شکایت کی جائے میں اس سے قصاص لیکر دوں گا،

السنن الکبریٰ للبیهقی ص ۲۹ ج ۹ و مستدرک حاکم ص ۴۳۹ ج ۴.

ظاہر ہے کہ یہ عین اسلام کی تعلیم مساوات ہے، اسی تعلیم اسلامی کی وجہ سے ہی آپ عمال کو مقرر کرتے ہوئے ان سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی ترکی گھوڑوں پر سوار نہ ہو، میدہ کی روٹی نہ کھائے، باریک کپڑا نہ پہنے، اور لوگوں کے حوائج پر دروازے بند نہ کریں۔ (شعب الایمان ۲۴/۶ رقم الحدیث ۷۳۹۴ و مصنف عبدالرزاق ۳۲۴/۱۱، رقم الحدیث ۲۰۶۶۲)۔

مشکوٰۃ باب ما علی الولاۃ من التیسر،

مسلم شریف کی مذکورہ حدیث نے فرمان فاروقی کا مقصد واضح کردیا کہ چونکہ عوام کو ایسی سہولتیں میسر نہیں لہذا عمال بھی ان عیش وعشرت کی چیزوں سے اجتناب کریں مگر کمال ہے کہ حضرت مفتی صاحب اسکا مفہوم الٹ بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں یہ چیزیں ناجائز تھیں، مگر اب مرور زمانہ کی وجہ سے جائز ہوگئی ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب یہ چیزیں اس وقت بھی مساوات کی وجہ سے ناجائز تھیں اور اب بھی مساوات کی وجہ سے ناجائز ہی ہیں، جو چیز عوام کو میسر نہیں وہ حکمران پارٹی پر آج بھی ناجائز ہے، اسلام کی یہ تعلیم کہیں بھی ثابت نہیں کہ رعایا تو بھوکوں رہے اور حکمران ملکی دولت پر سانپ بن کر عیش وعشرت کی زندگی بسر کریں، عوام ضروریات زندگی کی بنیادی چیزوں سے محروم ہو، اور ارباب حکومت مزے سے زندگی بسر کریں۔

مبتدعین کے حکیم الامت کا عوام اور حکمران پارٹی کے درمیان خط تنسیخ کھینچ دینا، انکی کم آگاہی کا نتیجہ تو کہا جاسکتا، مگر اسے اسلامی تعلیم باور نہیں کیا جاسکتا۔

کیا مساجد کو پختہ کرنیکی اجازت ہے؟

حضرت مفتی صاحب خلط مبحث کے ماسٹر ہیں، ادھر ادھر کی ابحاث میں الجھا کر دامن بچا جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا،

اس بحث میں دیگر غیر متعلقہ ابحاث لانا دراصل ان کے موقف کی کمزوری کی دلیل ہے، اور ان ابحاث میں بھی وہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں، فرماتے ہیں

مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے کہ مجھ کو مسجدیں اونچی بنانے کا حکم نہ دیا گیا،
جاء الباطل ص ۳۰۵۔

اس الجھی ہوئی تحریر سے ان کا مقصود یہ ہے کہ مساجد کو پختہ بنانے کی ممانعت کے باوجود اسلام میں مساجد کو پختہ بنایا جاتا ہے اور یہ مرور زمانہ کی وجہ سے جائز ہے، اسی طرح قبور اولیاء پر مزارات تعمیر کرنے کی ممانعت ہے مگر حالات کے تقاضا کی وجہ سے جائز ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حالانکہ حکم نہ ہونے سے ممانعت ثابت نہیں ہوتی، یہ مفتی صاحب کی زیادتی ہے، حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

والحديث قد استدل به بعضهم على معع تشييد المساجد، و فيه نظر لان نفي كون التشييد ماموراًبه، لا يقتضي الكراهة والمنع بل يدل على عدم الوجوب، ونفي الوجوب قد يتحقق بجواز الفعل ايضاً فلا يستوجب الكراهة و المنع.

یعنی اس حدیث سے بعض نے مساجد کو اونچا اور پختہ بنانے کی ممانعت پر استدلال کیا ہے لیکن اس استدلال میں خامی ہے، اس لئے کہ اس میں تشید مساجد کے مامور (حکم) کی نفی ہے جو کہ کراھت اور منع کو مقتضی نہیں، بلکہ اس حدیث میں مساجد کی تشید کے عدم وجوب کی نفی ہے، اور وجوب کی نفی اس کے جواز کو ثابت کرتی ہے لہذا اس سے کراھت اور ممانعت لازم نہیں آتی۔

مرعاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح ص ۴۲۸ ج ۲.

اس طرح کے فقرات ہم روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہیں، جس سے مقصود حکم کی نفی ہوتی ہے، نہ کہ ممانعت مثلاً زید کا کہنا

(۱) میرے باپ نے مجھے لاھور جانے کیلئے مامور نہیں فرمایا	تو کیا زید کو لاہور جانے سے منع کیا گیا ہے۔
(۲) رسول اللہ ﷺ نے چار عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم نہیں فرمایا	تو کیا اس سے چار سے نکاح کی حرمت ثابت ہوگئی۔
(۳) نبی ﷺ نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا	تو کیا اس سے ڈاکٹر بننے کی کراھت ثابت ہوگئی

(۴) آنحضرت ﷺ نے ایٹم بم بندوق وغیرہ کے استعمال اور بنانے کا حکم نہیں دیا	تو کیا اس سے ان کی ایجاد اور استعمال کی حرمت ثابت ہوگئی
(۵) رسول اللہ ﷺ نے ہوائی جہاز اور ریل پر سفر کرنے کا حکم نہیں دیا	تو اس فقرے سے ان پر سفر کرنا حرام ثابت ہوجائے گا

اس طرح کی بیسیوں امثلہ ہم دے سکتے ہیں مگر عقل وخرد والے کیلئے یہ کافی ہیں، تو کیا ان محاورات کو بول کر ہم حکم کی نفی کرتے ہیں یا کہ کسی فعل کو کرنے سے منع پر بولتے ہیں، قطعاً نہیں بلکہ اس سے مقصود ہمارا حکم کی نفی ہوتا ہے۔

خاص حدیث رسول اللہ ﷺ میں اسکی مثالیں دی جاسکتی ہیں،

مثلاً آپ علیہ السلام سے گوہ کھانے کے متعلق سوال کیا گیا تو ، فرمایا، **فما امربا کلھا ولا نھی**، یعنی مجھے اس کے کھانے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ ہی منع کیا گیا ہے، سنن نسائی ص۱۹۱ ج۲۔

تو اس ارشاد کا کیا مقصد ہے، یہی کہ کھانے کے حکم کی نفی ہے، نہ یہ کہ کھانے سے رُوکا گیا ہے، اگر مبتدعین یہی معنیٰ کریں تو اگلے الفاظ، ولانھی، کا معنی کیا کریں گے۔

اس طرح حدیث میں مساجد کو پختہ اور اونچا بنانے کے حکم کی نفی ہے، نہ کہ مساجد کو آراستہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ فرماتے ہیں

پختہ مسجد (نبوی) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بمشورہ اصحاب کرام بنی تھی، اس وقت بھی چہ میگوئیاں ہوئیں تھیں، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ میں نے پختہ مسجد اس لئے بنوائی کہ حدیث میں آیا ہے، **من بنیٰ مسجدا للہ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ**،

(یعنی جو کوئی اللہ کیلئے مسجد بنائے گا خدا اس کیلئے بہشت میں گھر بنائے گا) اس حدیث کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلئے پیش کیا کہ اس کے معنی میں عموم جانا، یعنی یہ سمجھا کہ کوئی مسجد بناوے ویسا ہی اس کا گھر بنے گا، خام بنائے تو خام پختہ بنائے تو پختہ، اس دلیل کو سب حاضرین

نے سنا اور خاموش رہے، ثابت ہوا کہ پختہ مسجد اسی حدیث سے ثابت ہے۔

فتاوی ثنائیہ ص ۳۸۷ ج ۱، وفتاوی علمائے حدیث ص ۱۵۱ ج ۳۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے جس قول کو فاتح مذاهب باطلہ نے نقل کیا ہے وہ، صحیح بخاری ومسلم کتاب المساجد، کے باب فضل بناء المسجد، میں موجود ہے۔

کیا مسجد میں عورت کا نماز پڑھنا ناجائز ہے

حضرت مفتی صاحب نے ایک ڈھکوسلہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ مرور زمانہ کی وجہ سے عورتوں کیلئے مساجد میں جانا صدہا خطرات کا باعث ہے۔

اس فضول اور الجھی ہوئی بحث سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث میں یہ موجود ہے کہ

لاتمنعوا نساء کم المساجد اذا استاذ نکم الیها.

یعنی تمھاری عورتیں جب تم سے مساجد کی طرف جانے کی اجازت طلب کریں تو انہیں منع نہ کرو، صحیح مسلم ص ۱۸۳ ج ۱، وابوعوانہ ص ۵۷ ج ۲۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ شریعت مفتی صاحب کے گھر کی نہیں کہ وہ جس حکم کو منسوخ کہہ دیں وہ منسوخ ہوجائے، یا اسلام میں مفتی صاحب کے قول و اقوال اور ردی قسم کے اجتہادات کی وجہ سے ہم فرمان نبوی کو چھوڑ دیں اوران کے پیچھے چل کر اپنی آخرت برباد کرلیں۔

جب مفتی صاحب کو اس فرمان کا اقرار ہے تو پھر بھی عورتوں کو روکنے کا فتوی صادر کرنا، یقیناً بغض رسول ﷺ کی پیداوار ہے، ہم بریلویت کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اس کی اجازت کے ساتھ ہی امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ نے یہ بھی کہہ رکھا ہے

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

قال رسول اللہ ﷺ لاتمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ و لیخرجن اذا خرجن تفلات.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں جب باپردہ ہوکر مساجد کی طرف نکلیں تو انہیں منع نہ کرو، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۸۳ ج ۲، و ابو داود (۱۵۶۵) واللفظہ اس شرط نبوی کے ساتھ آپ کا یہ

فرمان بھی شامل کر لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ لاتمنعوا نساء کم المساجد و بیوتھن خیر لھن .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنی عورتوں کو مساجد میں آنے سے مت روکو (ہاں البتہ) ان کے گھر ان کیلئے بہتر ہیں، سنن ابی داؤد مع عون ص۲۲۲ ج۱۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے صحیح ہے علامہ البانی رحمتہ اللہ علیہ نے اسے سلسلہ احادیث صحیحہ رقم الحدیث ۱۳۹۶ میں درج کیا ہے۔

ان ارشادات عالیہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی کہ مساجد میں جمعہ و جماعت کے ساتھ حاضری عورت پر لازم وضروری نہیں، اور ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ مساجد میں جمعہ و جماعت میں شامل ہونے کی بجائے گھر میں ہی ٹک کر رہیں، ہاں البتہ اگر کوئی نماز کے لیے مسجد کا رخ کرے تو اسے روکنے سے اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

اس صاف و شفاف تعلیم ربانی پر مبتدعین کو کیا اعتراض ہے

جب کہ خود شارع علیہ السلام اسکی حدود و قیود بیان کرتے ہوئے ،عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کو بہتری سے تعبیر کر رہے ہیں۔

کیا مولفۃ القلوب کا حکم منسوخ ہے؟

اس کے نسخ کی مفتی صاحب نے کوئی دلیل شرعی درج نہیں کی،اگر کرتے تو یقیناً ہم اس پر قرآن وسنت کی روشنی میں تبصرہ کرتے ،مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اس قلعہ کو بھی صاحب ھدایہ کے ایک فضول قول سے منہدم کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالانکہ مولفۃ القلوب کی مدد کرنا حکم قرآنی ہے، جیسا کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۵۹ میں مذکور ہے، اس ارشاد ربانی کو منسوخ کرنے کیلئے نص قطعی یا حدیث متواتر کی ضرورت ہے،

جسے پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام ثابت نہیں کر سکتے، اور جو صاحب ھدایہ نے دلیل درج کی ہے، اسے آپ بھی پڑھ لیں فرماتے ہیں

قرآن نے صدقات کے مصارف آٹھ بیان فرمائے ہیں، اور ان میں سے، مولفۃ القلوب، کا

استحقاق ساقط ہو چکا ہے، کیونکہ اب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو عزت دے دی ہے، لہذا اب اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمیں مستغنی کر دیا اور اس پر اجماع (صحابہ) منعقد ہو چکا ہے۔

ھدایہ مع فتح القدیر ص۲۰۱ ج۲،

حالانکہ قرآنی آیات کے خلاف نہ اجماع ہوسکتا ہے نہ قیاس، پھر اس اجماع کی دلیل بھی مت پوچھئے، خیر سے علامہ زیلعی حنفیؒ بڑی دور سے اس کیلئے ایک کوڑی تلاش کر کے لائے ہیں کہ عامر بن شعبی کہتے ہیں

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ حکم منقطع ہوگیا تھا، اللہ اکبر۔

یہ مت پوچھئے گا کہ عامر بن شرجیل الشعبیؒ کو اس اجماع کی خبر کہاں سے ملی، کیونکہ ان کی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات وسماع ثابت نہیں، محدثین کرام نے صراحت کی ہے، ان کی وفات ۱۰۴ھ میں بیاسی (۸۲) برس کی عمر میں ہوئی تھی، تاریخ صغیر للبخاری ص ۲۷۸ ج۱، گویا موصوف کی ولادت ۲۲ھ کو خلافت صدیقی کے تقریباً دس سال بعد ہوئی۔

آئمہ جرح وتعدیل کا تو بیان ہے، ان کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ، حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت مرسل ہے دیکھئے مراسیل ابن ابی حاتم ص۱۶۰۔

مرسل ہونے کے علاوہ اس کی سند میں ایک راوی جابر بن یزید الجعفی ہے، نصب الرایہ ص۳۹۴ ج۲، ومصنف ابن ابی شیبہ ص۲۲۳ ج۳، جو خیر سے خبیث العقیدہ ہونے کے علاوہ پرلے درجے کا کذاب ضعیف ومتروک راوی ہے، جس کی ضروری تفصیل، دین الحق صفحہ۶۳ ج ۱ میں راقم نے عرض دی ہے، قارئین کرام وہاں سے ایک بار پھر پڑھ لیں۔

ہاں البتہ اس مقام پر ہم حضرت امام ابو حنیفہ کا ایک قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں فرماتے ہیں،

مارایت فیمن رایت افضل من عطاء ولا اکذب من جابر الجعفی ماأتیته بشی الاجاء نی فیہ بحدیث، وزعم ان عندہ کذا و کذاالف الف حدیث لم یظھرھا .

یعنی جنہیں میں نے دیکھا ہے، ان میں سے حضرت عطاء بن ابی رباح سے بڑھکر کسی کو عظمت والانہیں دیکھا، اور جابر بن یزید الجعفی سے بڑھکر زیادہ کسی کو جھوٹا نہیں دیکھا، میں جب بھی کوئی چیز (فقہی طور پر) لاتا تو وہ اس کے متعلق حدیث (گھڑ) کر لے آتا، اور وہ یہ گمان کرتا تھا کہ اسی طرح کی من گھڑت روایات اس کے پاس ایک لاکھ ہیں جنہیں اس نے ابھی تک ظاہر نہیں کیا۔

میزان الاعتدال ص ۳۸۰ ج ۱، واللفظ له و تهذيب التهذيب ص ۴۲ ج ۲، و الضعفاء الكبير ص ۱۹۶ ج ۱، و كتاب القراء ة للبيهقي ص ۱۳۴، و فتاوى رضويه ص ۵۲۲ ج ۲.

الغرض مؤلفہ القلوب کا حکم اب بھی ہے اور اس کا کوئی ناسخ نہیں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی المتوفی ۱۲۲۵ فرماتے ہیں کہ

معلوم ہوا کہ مؤلفہ القلوب کو زکوٰۃ دینے کا جواز منسوخ نہیں اور کوئی نسخ کا قائل نہیں اور نسخ کا امکان بھی کیسے ہے جب کہ کوئی ناسخ موجود نہیں، تفسیر مظہری ص ۲۱۰ ج ۵ مترجم، طبع دارالاشاعت کراچی ۱۹۹۹ء۔

باب مزارات پر غلاف چڑھانا اور چراغاں کرنے کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے

ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب.

اس تعظیم میں کوئی قید نہیں ہر ملکے ہر رسمے جس ملک میں اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروج ہے وہ کرنا جائز ہے ان کی قبروں پر پھول ڈالنا چادریں چڑھانا چراغاں کرنا، سب میں ان کی تعظیم ہے لہذا جائز ہے جاء الباطل ص ۲۹۷ ج ۱۔

کیا قبریں شعائر اللہ میں داخل ہیں؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کی یہ دلیل دو چیزوں پر مبنی ہے

(۱) اولیاء اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں (۲) اور شعائر اللہ کی تعظیم ملکی رسوم کے مطابق کرنی جائز ہے۔

ثانیاً۔ ان باتوں کے جواب میں ہم فقط اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شعائراللہ کی تعظیم کرنا تو ہمیں من وعن قبول ہے نہ ہی اس میں اختلاف ہے، اور نہ ہی یہ باعث نزاع ہے،اختلاف تو حد تعظیم اور اولیاء اور ان کے مزارات کے شعائر اللہ ہونے میں ہے

لہذا مفتی صاحب کا یہ حق تھا کہ وہ اولیاء اور ان کی قبور کو پہلے دلائل سے شعائر اللہ ثابت کرتے پھر انکی تعظیم کی حدود شریعت حقہ سے ثابت کرتے اور قبروں پر اوچھاڑ چڑھانے اور چراغاں کرنے کا ثبوت دیتے، تو یہ ایک بات تھی، مگر یہ کام چونکہ دلائل شرعیہ سے ثابت ہونے تھے، جو خیر سے مفتی صاحب کے پاس نہ تھے، لہذا انہوں نے ان کا عدم ذکر ہی مناسب جانا، اور اصل بحث سے ھٹ کر ادھر ادھر کی ابحاث میں اپنے حواریوں کو الجھا کر اپنے خصوصی مکر وفریب کا نمونہ دکھا گئے ہیں، اور اولیاء اور ان کے مزارات کو شعائر اللہ ثابت کرنے پر ایک بھی دلیل شرعی نہ دی۔

ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین اور قبوری شریعت کے عاشقوں کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی کسی واضح نص سے اولیاء اور ان کی قبروں کو شعائر اللہ ثابت کریں۔

مجھے میری زندگی کے مالک کی قسم ہے کہ مبتدعین کے جملہ اکابرین مل کر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ رہا مبتدعین کا یہ عذر کے آخر اولیاء کی قبریں۔ شعائر، کیوں نہیں، ضیاء القرآن ج تو سنئے کہ شعائر، شعیرۃ کی جمع ہے جس کا معنی علامت اور نشانی کے ہیں، المفردات القرآن ص۲۶۲، ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کی شعار کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت کا کام دیتی ہے، سرکاری جھنڈی، پولیس و فوج کے یونیفارم وغیرہ حکومت کے شعار ہیں، صلیب عیسائیت کا شعار ہے، کسی وکڑا اور کرپان سکھ مذہب کا شعائر ہیں یہ سب مسلک اپنے اپنے شعار کا اپنے پیروں سے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس لغوی معنی کو ملحوظ رکھا جائے تو اس اعتبار سے شعائر اللہ وہ ہیں جو اعلام دین یعنی اسلام کے نمایاں

امتیازی احکام ہے۔ جن سے ایک مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے۔ اور وہ دوسرے مذاہب سے الگ پہچان لیا جاتا ہے۔ صفا و مروہ پہاڑیوں کو بھی اسی وجہ سے شعائر اللہ کہا گیا ہے کہ مسلمان حج و عمرے میں ان کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

منقول از کتب تفسیر، ظاہر ہے کہ مزارات شعائر اللہ میں داخل نہیں کیونکہ مزارات تو غیر مسلم بھی بناتے ہیں، لہذا ان کو اسلام کی علامت اور امتیازی حکم نہیں کہہ سکتے، پھر قرآن پر غور کیجئے کہ اللہ شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دے رہا ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اونچی قبریں گرانے کا حکم دیا اور آئندہ بنانے والے کو دین اسلام اور تعلیم محمدی علیہ التحیۃ والسلام سے بغاوت قرار دیا، اگر مزارات شعائر اللہ ہوتے تو آنحضرت ﷺ ان کو گرانے کا حکم نہ فرماتے، اور ان کے بنانے والے پر سخت نکیر بلکہ انہیں بدترین مخلوق قرار نہ دیتے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ملکی رسوم کے مطابق ہر طرح کی تعظیم جائز ہے تو یہ دعوی بلا دلیل ہے کسی ماں نے آج تک کوئی رضوی علامہ فہامہ جنم نہیں دیا جو اس کا ثبوت دے۔

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حیرہ شہر گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے امیر کو سجدہ کرتے ہیں تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ارایت لومررت بقبری اکنت تسجد له؟ قال فقلت لا، قال فلا لاتفعلوا لو کنت آمر احدا ان یسجد لاحد لامرت النساء ان یسجدن لازواجهن لما جعل الله لهم علیهن من الحق.

یعنی تیرا کیا خیال ہے اگر تو میری قبر کے پاس سے گزرے تو کیا اسے سجدہ کرے گا؟، میں نے کہا نہیں، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی ایک کو حکم دیتا کہ وہ دوسرے کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالی نے خاوندوں کا ان کی بیویوں پر (بڑا) حق بنایا ہے۔

ابوداؤد ص۲۹۱ ج۱، باب حق الزوج علی المراۃ۔ و مستدرک حاکم ص۱۸۷ ج۲ و بیہقی ص۲۹۱ ج۷،

اس صحیح حدیث کا واضح مفاد یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ کسی زندہ و مردہ کو سجدہ تعظیمی کرے، مسجود خواہ نبی کی ذات ہی کیوں نہ ہو۔

مگر مفتی صاحب ہمیں اس راہ کی طرف لیجانا چاہتے ہیں جس پر چل کر تعظیم کے پردہ میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے، یہ راستہ مبتدعین کو ہی مبارک ہو ہم تو اس سے اللہ تعالی کی پناہ مانگتے ہیں۔

اگر مبتدعین کہہ دیں کہ مفتی صاحب کی مراد ایسی تعظیم تھی، جس کو شریعت حقہ نے جائز و مباح کہا ہے، تو اس کے جواب میں راقم عرض کرتا ہے کہ اسی کی تو دلیل چاہیئے کہ قبروں پر چراغاں کرنا، اوچھاڑ چڑھانا، اور پھول وغیرہ ڈالنا اسلام میں جائز ہیں۔

رابعاً۔ شریعت حقہ میں کسی واضح نص سے اس کا ثبوت بھی دیجئے کہ شعائر اللہ کی تعظیم، چراغاں کرنے میں، پھول ڈالنے میں ہے، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اپنے لاؤ لشکر سمیت مل کر بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، جب اس کا ثبوت ہی نہیں تو پھر اللہ کا خوف کیجئے اور اپنی آخرت برباد نہ کریں اور ان بدعات قبیحہ سے اعراض کر کے سنت خیر الانام کی محفوظ شارع پر چل کر اپنی آخرت کو سنوار لیجئے کہ قیامت کے روز پچھتانا نہ پڑے گا۔

خامساً۔ علماء عقائد نے یہ بات بیان کی ہے کہ جس کے خاتمہ بالخیر کی خبر اللہ تعالی اور جناب رسول اللہ ﷺ نے نہ دی ہو، اس کے بارے قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، فقط ظاہری اعمال کی وجہ سے اسکے متعلق حسن ظن ہی رکھ سکتے ہیں۔

خالق ارض و سماء کہتا ہے کہ

فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی. النجم ۳۲.

تم اپنے نفسوں کو پاک صاف نہ جانو وہی زیادہ جانتا ہے کہ تم میں کون اللہ سے ڈرنے والا ہے (۵۳_۳۲)

جب ہم کسی کو قطعی طور پر ولی اللہ ہی نہیں کہہ سکتے تو اس کی قبر کو شعائر اللہ میں کیسے تسلیم کر لیا جائے۔

سادساً۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کیا شعائر اللہ کی تفسیر سے صحابہ کرام معاذ اللہ نابلد تھے کہ ان

میں سے کسی ایک نے بھی مزارات کو شعائر اللہ میں داخل نہیں سمجھا اور نہ ہی انہوں نے مزارات بنا کر ان پر چادریں اور پھول چڑھائے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب آداب الخلاء فصل اول میں ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام کا دو قبروں پر سے گزر ہوا فرمایا کہ دونوں میتوں کو عذاب ہو رہا ہے ان میں ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا۔ اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ فرمایا جب تک یہ خشک نہ ہوں تب تک ان کے عذاب میں کمی رہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۷ ج ۱، بلفظہٖ۔

عذاب قبر میں تخفیف کا سبب رسول اللہ ﷺ کی شفاعت تھی یا ٹہنی کی تسبیح

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب سے سہواً حدیث کے ان الفاظ

ثم اخذ جریدۃ رطبۃ فشقھا بنصفین، ثم غرز فی کل قبر واحدۃ.

کا ترجمہ رہ گیا ہے، اللہ اکبر، مفتی صاحب کا انہیں الفاظ سے ہی استدلال تھا اور انہیں کا معنی ترک کر دیا، یہ ان کے دل کی اندورونی کیفیت ظاہر کر رہا ہے کہ انہیں خود بھی اس دلیل پر اعتماد و بھروسہ نہیں تھا اور حق کے رعب نے انہیں ایسا مرعوب کیا ہے کہ وہ اپنی دلیل کا معنی بھی نہیں کر پائے، واللہ اعلم بالصواب۔

ثانیاً۔ ان قبروں سے تخفیف عذاب کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت تھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ

انی مررت بقبرین یعذبان فاحببت بشفاعتی ان یرفہ ذاک عنھما مادام الغصنان رطبین.

یعنی میرا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا، جب کہ انکو عذاب ہو رہا تھا، میں نے اپنی شفاعت کے ذریعہ یہ پسند کیا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں ان سے عذاب اٹھالیا جائے، صحیح مسلم

ص۲۱۸ ج ۲۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ ٹہنیاں تو فقط علامت کیلئے رکھی گئی تھیں، تخفیف عذاب کا سبب تو فخر الاولین والاخرین جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شفاعت تھی۔

مفتی صاحب نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے بلاوجہ اور بغیر کسی دلیل کے لکھا ہے کہ عذاب قبر کی کمی سبزے کی تسبیح کی برکت سے ہے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دعا سے اگر محض دعا سے کمی ہوتی، تو حدیث میں خشک نہ ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی، جاء الباطل ص ۲۹۸۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی دعا و شفاعت کے آپ حضرات منکر ہیں کہ شاخ کی تسبیح پر تو بے دلیل ہی اصرار کر رہے ہو اور آپ علیہ السلام کی بادلیل شفاعت سے انکار کر رہے ہو ہم اس الدالخصام پارٹی کے علماء سے پوچھتے ہیں کہ منبروں پر بیٹھ کر تو آپ لوگ عظمت مصطفیٰ ﷺ کی ٹھیکے داری کا دعوی کرتے ہیں، مگر افسوس کہ یہاں آپ علیہ السلام کی شفاعت کی برکت کی بجائے ٹہنیوں کی برکت پر اصرار کر رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کے تمام دعووں میں آپ حضرات جھوٹے ہیں، اللہ تعالی کی پاکی اور تسبیح تو ہر چیز بیان کرتی ہے، قرآن کی نص قطعی سے یہ بات ثابت ہے ارشاد ہوتا ہے

وان من شئی الا یسبح بحمدہ و لکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل ۴۴)

اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے (۱۷-۴۴)

اس قرآنی نص کے بالمقابل فریق ثانی پر لازم ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ سبز شاخ تو تسبیح بیان کرتی ہے مگر خشک نہیں کرتی۔

مگر یاد رہے کہ جملہ مبتدعین کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت قطعاً نہیں دے سکتے۔

معلوم ہوا کہ عذاب کی کمی ٹہنی کی تسبیح کی برکت کی وجہ سے نہ تھی (کیونکہ وہ تو خشک ٹہنی بھی کرتی ہے) بلکہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے تھی۔

علاوہ ازیں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تسبیح تو قبر کی مٹی بلکہ مردے کا کفن بھی کرتا ہے

کیونکہ، ان من شیء، میں یہ بھی شامل ہے،خود مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ خود کفن اور قبر کی مٹی بھی تسبیح پڑھ رہی ہے، نور العرفان ص ۵۶۔

سوال یہ ہے کہ قبر کی مٹی اور مردے کا کفن جو تسبیح پڑھ رہا ہے اس کی برکت سے عذاب قبر میں کمی کیوں واقع نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ تسبیح کی برکت کا بہانہ مبتدعین کی ایجاد ہے، او رٹہنی ومٹی کی تسبیح مردے کو کچھ فائدہ نہیں دیتی اور (ان کی قبروں پر) تخفیف عذاب کا سبب آنخضرت ﷺ کی شفاعت و دعا تھی، و بس۔

ثالثاً۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے واضح ہے کہ ان دونوں قبروں والوں کو عذاب ہو رہا تھا جو شاخیں گاڑنے کی وجہ سے وقتی طور پر ہلکا پڑ گیا تھا گویا کہ شاخیں لگانے کی علت عذاب تھی لہذا معلوم ہوا کہ جس کی قبر پر پھول وغیرہ چڑھائے جائیں اس کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اسے قبر میں عذاب ہو رہا ہے اس کی قبر پر پھول چڑھانے سے اس کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی، تو اس کا مطلب واضح ہے کہ تم جنہیں اولیاء سمجھ کر ان کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہو دراصل انہیں عذاب میں مبتلا اور گرفتار سمجھتے ہو۔ ورنہ پھول چڑھانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے یا پھر تمھارا اس حدیث سے استدلال ہی غلط ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت رسول اکرم ﷺ کا عظیم معجزہ ہے کہ اللہ تعالی نے آپ کی وجہ سے ان قبروں والوں سے عذاب ہلکا کر دیا۔

رابعاً۔ اگر اس حدیث کو عام سمجھ کر ہرایک کی قبر پر پھول چڑھائے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عام لوگوں کے فعل اور حضرت نبی اکرم ﷺ کے معجزہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہی بات ہے کہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو عام مستدل بنا کر فعل رسول اور فعل عوام میں جو امتیازی اور معجزاتی فرق تھا اسے ختم کر دیا ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے ایک خاص فعل سے عام استدلال کیسے درست ہوسکتا ہے۔ (گوندلوی)

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اولیاء اللہ کی قبروں پر چادریں ڈالنا جائز ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے عام زائرین کی نگاہ میں صاحب قبر کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۹ ۔

کیا اسلام میں قبر کی عظمت کا پرچار جائز ہے،

الجواب ۔ اولاً مفتی صاحب نے پہلی دلیل میں ان افعال کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اس سے ان کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، پھر دوسری میں اس کے برعکس یہ دعوی کر دیا کہ تسبیح کی برکت سے عذاب قبر میں تخفیف ہوتی ہے اور اولیاء کے لئے بلندی درجات کا سبب بنتی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۹۹ ۔

مگر اس دلیل میں پہلی دونوں دلیلوں کے الٹ یہ دلیل دی ہے کہ اس سے مقصود صاحب قبر کی عظمت محسوس کروانا ہے۔

اے جی آپ ایک بات پر ہی کیوں نہیں رہتے، شاید مبتدعین یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں، انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

ثانیاً ۔ حقیقت یہ ہے کہ مبتدعین کی اصل دلیل یہی ہے اور اسی سے ہی وہ اپنے عوام کو مطمئن کرتے ہیں کہ قبروں پر پھول ڈالنا اور چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا جائز ہے، مگر اس پر کوئی شرعی دلیل تو وہ **ندارد** ۔

افسوس مبتدعین جب دعوی کرتے ہیں تو آسمان پر جا ٹھہرتے ہیں، مگر جب دلیل دیتے ہیں تو تحت الثریٰ سے بھی نیچے جا گرتے ہیں۔

ہر مسلمان کی قبر کی توہین سے اعراض کرنا تو عین اسلام کی تعلیم ہے، اس میں ولی کی قبر کی بھلا تخصیص ہی کیا ہے، سنن ابوداؤد اور متعدد کتب میں یہ حدیث بسند صحیح مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے قبر پر بیٹھنے اور اس پر جوتی سمیت چلنے سے منع فرمایا، سنن ابو داؤد مع عون ص ۲۱۰ ج ۳ ۔

مگر مفتی صاحب کہتے ہیں کہ چراغاں کرنا اور چادریں وغیرہ سے لوگ صاحب قبر کی عظمت سے مرعوب ہو کر اس کی تعظیم کریں۔

تعظیم کروانے کا یہ نرالا ڈھنگ نہ رسول اللہ ﷺ کو سوجھا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور

خیر القرون کے سنہری دور میں اس پر عمل ہوا، دین اسلام کی تکمیل کے صدہا سال بعد مبتدعین نے اسے دریافت کر لیا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ سینہ گزٹ ہونے کے علاوہ تعظیم کے پردہ میں شرک و بدعت کی ترویج ہے۔

ثالثاً۔ مبتدعین اس تعظیم سے کیا مراد لیتے ہیں، اگر تو ان کا مقصود یہ ہے کہ عوام الناس ایک ولی کی قبر جان کر اس سے فیض حاصل کریں اور اس سے مرادیں مانگیں اسے حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اس کی قبر پر نذر و نیاز چڑھائیں۔

ایسی نیت سے مزارات کی تعمیر اور ان پر چراغاں، وغیرہ تمام بدعتیں صریحاً شرک کے زمرے میں آتی ہیں، ایسا عمل اسلام کے خلاف ایک خوف ناک سازش اور شرک کی طرف دعوت دینا ہے، کیونکہ کسی فرد بشر کی قبر سے فیض حاصل کرنے کی شریعت میں کوئی دلیل موجود نہیں، یہ تمام شیطان لعین کی راہیں ہیں جن پر چل کر انسان سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے۔

رابعاً۔ اگر مبتدعین یہ جھوٹا بہانہ تراش لیں کہ نہیں، ان افعال سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے، تو یہ قول ان کے عمل کے صریحاً مخالف ہے، کیونکہ یہ لوگ تو مزارات کی تعمیر کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کرتے ہیں، علماء و مشائخ کی قبور عام لوگوں سے ممتاز رہیں تاکہ لوگ پہچان کر ان سے فیض لیں۔ جاء الباطل ص ۲۸۷۔

بلکہ مولوی احمد رضا خاں نے تو خاص قبور پر چراغاں کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی ہے، تاکہ لوگ ولی کی قبر جان کر اس سے فیض حاصل کریں اس کے الفاظ ہیں

مزار کسی ولی اللہ یا محققین علماء میں سے کسی عالم کا ہے وہاں شمعیں روشن کریں ان کی روح کی تعظیم کیلئے جو اپنے بدن کی خاک پر ایسی تجلی ڈال رہی ہے، جیسے آفتاب زمین پر تاکہ اس روشنی کرنے سے لوگ جانیں کہ یہ ولی کا مزار پاک ہے تاکہ اس سے تبرک کریں اور وہاں اللہ عزوجل سے دعا مانگیں کہ ان کی دعا مقبول ہو۔ فتاوی رضویہ ص ۱۴۵ ج ۴۔

دیکھئے اس عبارت میں مولوی احمد رضا خاں نے بدعت کی ترویج و اشاعت کیلئے کیسا فارمولا ایجاد کیا ہے کہ عوام الناس کو معلوم ہو جائے کہ قبر ولی اور محققین علماء میں سے کسی ایک کی ہے۔ تاکہ وہ اس سے فیض اٹھا سکیں۔

گزارش یہ ہے کہ کیا خیر القرون میں اولیاء اور محققین علماء موجود نہ تھے اگر تھے؟ یقیناً تھے، تو کیا انہوں نے بھی ولایت کے پرچار کیلئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیئے تھے، نہیں قطعاً نہیں، پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

پھر بریلویت کے باوا آدم نے اسی پر ہی بس نہیں کیا کہ چراغاں کا عمل فقط پہچان کیلئے ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھکر اس نے یہ تاکید بھی کر دی تا کہ لوگ اس کی قبر سے فیض حاصل کریں اور وہاں جا کر دعائیں کریں۔

مزارات کی تعمیر اور ان پر چراغاں وغیرہ کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ ولایت کی آڑ میں اپنی دوکان کو چمکایا جائے تا کہ انکم کا لامحدود ذریعہ بن جائے۔

اسکیننگ : محمد شاکر
آراء، تجاویز، رائے کیلئے رابطہ کیجئے
truemaslak@inbox.com

باب میت دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

دفن کرنے کے بعد مسنون عمل

جنازہ کے بعد مسلمان کو دفن کرنا اور مٹی ڈال کر رب قدیر جو کہ غفور و رحیم ہے سے فوت شدہ کے حق میں اثبات قدمی کی دعا کرنا سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

كان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال استغفروا لاخيكم واسالوا له بالتثبيت فانه الآن يسئل.

یعنی نبی ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو قبر پر ٹھہرتے اور فرماتے اس کیلئے (اپنے مولیٰ کریم وحلیم سے) ثابت قدم رہنے کا سوال کرو کیونکہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔

سنن ابوداود مع عون المعبود باب الاستغفار عند القبر للميت فی وقت الانصراف، ص۲۰۹ ج۳، و مستدرک حاکم ص۳۷۰ ج۱، و شرح السنة ص۴۱۸ ج۵، و مشکوٰة رقم الحديث ۱۳۳، و بیهقی ص۵٦ ج۴، و التمهيد ص۲۷۰ ج۲۳.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ دفن کے بعد میت کیلئے دعا فرماتے، چنانچہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ دفن کے بعد اپنے مولیٰ حقیقی سے مرنے والے کیلئے تثبیت کا سوال اور دعا خیر کی جائے۔

الحمد اللہ۔ علم نبوی کی امین جماعت اس پر عمل پیرا ہے، لیکن اس کے برعکس اذان کا ثبوت قرآن وسنت سے کہیں بھی نہیں ملتا۔

امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی مقدس جماعت اور تابعین عظامؒ کا امین گروہ بھی اپنے مردوں کو دفنایا کرتے تھے، اذان بھی تھی، موذن بھی موجود ہوا کرتے تھے، مگر کسی

ایک نے بھی دفن کے بعد اذان نہیں دی، بلکہ تمام دفن کے بعد میت کیلئے دعا فرماتے تھے۔

علاوہ ازیں جو شخص دفن کے بعد قبر پر اذان دیتا ہے، وہ درحقیقت دعا کی سنت کو مٹاتا ہے کیونکہ دفن کے بعد مسنون طریقہ تو میت کیلئے ثابت قدمی کی دعا کرنا ہے، جو عمل سنت کو مٹائے اس کے بدعت ہونے میں کسی کلمہ گو کو انکار نہیں ہونا چاہیئے۔

فقہائے احناف کی صراحت

فقہائے احناف نے تو اس بات کی صراحت کی ہے کہ جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبر کے آس پاس کرنا مکروہ (حرام) ہے۔

علامہ ابن ھمام الحنفی المتوفی ۶۸۱ھ، ھدایہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

ویکرہ النوم عند القبر و قضاء الحاجة بل اولی و کل مالم یعهد من السنة المعهود منها لیس الازیارتها والدعاء عندها قائما کما کان یفعل ﷺ فی الخروج البقیع.

یعنی قبروں کے پاس سونا اور قضاء حاجت کرنا بالاولی، اور ہر وہ چیز جو سنت سے ثابت نہ ہو، وہ مکروہ (حرام) ہے اور سنت سے ثابت فقط۔قبروں کی زیارت اور انکے پاس کھڑے ہوکر دعاء کرنا ہے۔جیسا کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ جنت البقیع میں جا کر کرتے تھے۔

فتح القدیر ص۱۰۲ ج ۲، آخر فصل الدفن، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

علامہ زین الدین المعروف ابن نجیم حنفی، کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں۔

ویکرہ عند القبر کلما لم یعهد من السنة و المعهود منها لیس الازیارتها والدعاء عندها قائما کما کان یفعل ﷺ فی الخروج الی البقیع.

یعنی قبر کے پاس وہ تمام چیزیں (کرنا) مکروہ ہیں جن کا ثبوت سنت سے ثابت نہیں، اور سنت سے ثابت محض قبر کی زیارت اور اس کے پاس کھڑے ہوکر دعا کرنا ہے جیسا کہ آپ علیہ السلام بھی ایسا ہی کرتے تھے جب بقیع (مدینہ کے قبرستان) میں جاتے تھے۔البحر الرائق ص۱۹۶ ج ۲، طبع ایضاً۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاوی عالم گیری میں لکھا ہے

ویکرہ عند القبر مالم یعهد من السنة والمعهود منها لیس الازیارتهٔ والدعاء عنده قائما.

یعنی جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبر کے پاس کرنا مکروہ (حرام) ہے اور سنت سے فقط قبر کی زیارت اور اس کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ہے،

فتاوی عالم گیری ص۱۶۶ ج۱، طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ۔

علامہ محمد امین المعروف ابن عابدین درمختار کی شرح میں فرماتے ہیں

فی الا قتصار علی ماذکر من الوارد اشارة الی انه لایسن الاذان عند ادخال المیت فی قبره کما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر فی فتاویه بانه بدعة، و قال، و من ظن انه سنة قیاس علی ندبهما للمولود الحاقا لخاتمة الامر بابتدائه فلم یصب.

یعنی (زیارت اور دعا پر) اقتصار کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میت کو قبر میں دفن کرتے وقت اذان کہنا سنت (سے ثابت) نہیں، جیسا کہ آج کل عادت ہوگئی ہے، اور ابن حجر نے اپنے فتاوی میں اس کے بدعت ہونے کی صراحت کی ہے، انہوں نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ جس نے اسے سنت خیال کیا ہے اس نے بچہ کی پیدائش پر اسے قیاس کرتے ہوئے خاتمہ پر بھی اذان کو الحاق کیا ہے مگر ان لوگوں کا یہ قیاس درست نہیں، فتاوی شامی ص۲۳۵ ج۲، مطلب فی دفن المیت۔

فقہ حنفی کے معروف کتاب درالبحار میں ہے

من البدع التی شاعت فی بلاد الهند الاذان علی القبر بعد الدفن.

جو بدعتیں کہ ہندوستان میں شائع ہوگئیں ان میں سے دفن کے بعد قبر پر اذان دینا ہے۔

تو شیخ شرح تنقیح میں محمود بلخیؒ فرماتے ہیں

الاذان علی القبر لیس بشی، قبر پراذان دینا کچھ (بھی) نہیں، **بحواله جاء الباطل** ص۳۱۸ ج۱۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی، شرح صحیح مسلم، میں لکھتا ہے۔

دفن کے بعد اذان.......... کو تدفین کا ایک رکن قرار دینا باطل اور بدعت سیئہ ہے، شرح صحیح

مسلم ص ۱۹۰ ج ۲۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر اذان قبر دلیل شرعی سے ثابت ہے تو پھر اس کو دفن کا جزو کہنا بھی درست ہوگا، اور اگر اس کی کوئی دلیل ہی نہیں تو پھر یہ جزو کے اعتقاد کے بغیر بھی بدعت سیئہ ہی رہے گی۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دھلوی اپنے ایک تصدیقی فتوی میں فرماتے ہیں کہ

اذان قبر پر دینا مکروہ اور بدعت قبیحہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اور تابعین اور تبع تابعین اور مجتہدینؒ سے ثابت نہیں۔ فتاوی نذیریہ ص ۶۸۹ ج ۱۔

علمائے اہل حدیثؒ کا اتنا بڑا دعوی آج تک کسی رضوی علامہ فہامہ نے توڑا نہیں، وہ کسی صحیح و معتبر دلیل سے قبر پر اذان دینا قرآن وسنت اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے ثابت نہیں کر سکے، جو چیز صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے ثابت نہ ہو، اس کے بدعت ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

بدعت کے متعلق ایک اصول اور علمائے بریلویہ کا اعتراف حق

حضرت شیخ میاں نذیر حسین محدثؒ دھلوی کے مذکورہ فتوی کو جب آج تک چیلنج نہیں کیا گیا۔

تو پھر غور کیجئے کہ جس چیز کا رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارکہ میں سبب موجود تھا، اور کوئی چیز مانع بھی نہ تھی پھر بھی آنحضرت ﷺ نے ترک فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو کرنے کا حکم نہ فرمایا، بلکہ پورے خیر القرون میں اس پر عمل نہ تھا تو اس کے بدعت سیئہ ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

آیئے اس ضابطے اور کلیہ کا ہم آپ کو بریلوی علماء سے اعتراف دکھائیں جو تمام بدعات کے رد میں انشاء الرحمٰن کام دے گا۔

چنانچہ خاں صاحب نے ایک رسالہ، الہادی الحاجب عن جنازۃ الغائب، کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس میں ادھر ادھر کی فضول ابحاث لاکر بذعم خود خاں صاحب یہ دعوی کرتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، پھر کسی چیز کا آنحضرت ﷺ سے عدم منقول کے بارے میں بطور اصول کے تحریر کرتے ہیں کہ

اور جس امر سے مصطفیٰ ﷺ بے عذر مانع بالقصد احتراز فرمائیں وہ ضرور (یقیناً) امر شرعی و

مشروع نہیں ہوسکتا ہے۔ فتاوی رضویہ ص ۶۹ ج ۴۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ خاں صاحب کے نزدیک کسی کام کے محرک اور سبب کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کو ترک کیا ہو وہ یقیناً دین کا حصہ و جزو قطعاً نہیں ہوسکتا، بلکہ انہوں نے اس سے بھی بڑھکر ایک بات یہ کہی ہے کہ جس چیز پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے دور میں عمل نہ ہوا ہو وہ کم از کم مکروہ ہے۔

اس کے الفاظ ہیں

زمانہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں بحمداللہ ہزارہا بلاد عجم فتح ہوئے ہزاروں عجمی حاضر ہوئے مگر کبھی منقول نہیں کہ انہوں نے ان کی غرض سے خطبہ غیر عربی میں پڑھایا ہو، اس میں دوسری زبان کو خلط کیا ہو

وکل ماوجد مقتضیه عینا مع عدم المانع ثم ترکوه دل علی انهم کفوا عنه فکان ادناه الکراهة، فتاوی رضویه ص ۶۸۴ ج ۳. باب الجمعة.

افسوس کہ بریلویت کے اعلی حضرت نے اردو فتوی میں جو اصول درج کیا ہے وہ عربی زبان میں لکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے تاکہ لوگ اس بات سے واقف ہوکر بریلوی مذھب کو خیر باد کہہ کر متبع سنت نہ ہوجائیں، خیر ہماری بلا جانے، اب مذکورہ عبارت کا معنی معلوم ہو۔

ہر وہ کام بالخصوص جس کا سبب پایا جائے اور اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اس کو قصداً نہ کریں تو یہ اس بات کے عدم جواز پر دلالت کرتا ہے اور اس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ مکروہ ہو (انتھی)

خیر اب تو معنی ہوگیا اور خاں صاحب نے کھل کر اس چیز پر دستخط کر دیئے کہ جس چیز کا سبب ہونے کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے قصداً ترک کیا ہو وہ کم از کم مکروہ ہے۔

انہوں نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ جس چیز کا قرآن و سنت سے ثبوت نہیں وہ بدعت سیئہ ہے چنانچہ خاں صاحب سے ایک سوال کیمبل پور سے کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں اور بعض مواضع پشاور میں میت کو دفن کرنے کے بعد امام مسجد قبر کھودنے کے آلات و اوزار کو قبر کے اوپر پھلا کر رکھواتا ہے، اور (مبتدعین) کے پیش امام کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے میت کو راحت وسکون پہنچتا



ہے اور وہ عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے، بریلویت کے پیرو مرشد مولوی احمد رضا خاں نے اس کا تفصیلی رد تحریر کیا ہے، اس میں فرماتے ہیں

پھر اس عبث مبغوض کو دین میں نافع اور میت سے عذاب کا دافع سمجھ کر کرتے ہیں، یہ قطعاً شرع میں زیادت و اختراع و شنیع ابتداع (بری بدعت) ہے۔

فتاوی رضویہ ص۱۲۲ ج۴۔

اس عبارت میں خاں صاحب نے اس کے بدعت سیئہ ہونے کی یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہ شریعت میں زیادت ہے جو من گھڑت ہونے کی وجہ سے بدعت قبیحہ ہے، یہی بات ہم تمام بدعات کے بارے میں بالعموم اور اذان قبر کے متعلق بالخصوص کہتے ہیں کہ چونکہ یہ شریعت میں زیادت ہے کیونکہ باوجود سبب ہونے کے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کسی مانع کے نہ ہوتے ہوئے بھی نہیں کیا لہذا ان کا ارتکاب بدعت سیئہ ہے۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

ہم پہلے باب میں ثابت کر چکے ہیں کہ بعد دفن ذکر اللہ تسبیح و تکبیر حضور علیہ السلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنت ہے۔

اس پر زیادتی کرنا منع نہیں، فقہاء فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں ان میں کمی نہ کرے اگر کچھ بڑھائے تو جائز ہے۔ (ھدایہ وغیرہ) اذان میں تکبیر بھی ہے اور کچھ زیادہ بھی لہذا یہ سنت سے ثابت ہے اور اگر بدعت بھی ہو تو حسنہ ہے جیسے کہ ہم بحث بدعات میں عرض کر چکے ہیں۔

جاء الباطل ص۳۱۶ ج۱۔

جس کی اصل ثابت ہو اس پر لاحقہ اضافہ کرنا جائز ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ قبر پر تسبیح وغیرہ کی روایت کی بحث آگے ان شاء الرحمٰن تفصیل سے آ رہی ہے کہ

روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کی دلیل قطعاً نہیں۔

ثانیاً۔ مسنون تلبیہ کے الفاظ پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص ایسا کلمہ کہتا ہے جو رب قدیر کی بزرگی کبریائی اور عظمت پر مشتمل ہو تو جائز ہے اور اس کے جواز پر حدیث صحیح موجود ہے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

والناس یزیدون ذا المعارج و نحوہ من الکلام و النبی ﷺ یسمع فلایقول لھم شیئا.

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے، لبیک ذا المعارج، وغیرہ اور اس طرح کا اور کلام، تلبیہ میں زیادہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کلمات کو سنا اور کچھ نہ کہا،

ابو داؤد مع عون، باب کیف التلبیۃ ص۹۹ ج ۲۔

یہ تقریری حدیث ہے جس میں آپ علیہ السلام نے تلبیہ میں زائد کلمات سن کر خاموشی اختیار فرمائی ہے، اس سے بڑھکر اس کے جواز کی اور کیا دلیل چاہیئے، اگر اس طرح کا ثبوت اذان قبر کے متعلق بھی ملتا ہے تو دیجئے۔

راقم پوری ذمہ داری سے یہ بات عرض کرتا ہے کہ اگر یہ بات ثابت کر دی جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے قبر پر اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے سن کر خاموشی اختیار کر لی، تو چشم ماروشن دل ماشاد، ہم جماعتی طور پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کر دیں گے، مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ ثابت نہ کر سکیں گے، نیز تلبیہ کے زائد کلمات کو اذان قبر سے کیا نسبت ہے، واضح رہے کہ حج میں افضل تلبیہ، رسول اللہ ﷺ سے مروی الفاظ میں ہی کہنا ہے، محدث مبارک پوریؒ نے اس پر نہایت عمدہ بحث کی ہے باذوق حضرات مراجعت فرمائیں، مرعاۃ المفاتیح ص۴۴۶ ج ۸، حضرت مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں

والحاصل ان الا قتصار علی التلبیۃ المرفوعۃ افضل.

یعنی خلاصہ بحث یہ ہے کہ مرفوع تلبیہ (رسول اللہ ﷺ کے تلبیہ) پر اقتصار افضل ہے۔ عون المعبود ص۹۹ ج ۲۔

رہا مفتی صاحب کا یہ عذر کہ جس کی اصل سنت سے ثابت ہو اس پر زیادتی کرنا منع نہیں، تو یہ

ان کا جھوٹا بہانہ ہے جس سے وہ بدعات قبیحہ کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں، ورنہ اصل سے زائد کرنا درحقیقت بدعت ہے، جس کی ضروری امثلہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) رکوع میں، سبحان ربی العظیم، اور سجدہ میں، سبحان ربی الاعلی، سے زائد اگر کوئی شخص سورۃ یٰسن، یا قرآن کا کوئی اور حصہ تلاوت کرے تو کیا آپ حضرات ایسے شخص کے عمل کی تائید کریں گے، قطعاً نہیں۔

حالانکہ دونوں کلمے قرآن ہی کے ہیں مگر ان سے زائد رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے کو آپ بھی بدعت سیئہ ہی کہیں گے، گو کبھی کبھار ہی پڑھے۔اور یہ جھوٹا بہانہ بھی پیش کرے کہ میں نے قرأت کی نیت سے نہیں بلکہ دعا کی نیت سے پڑھا ہے، اور دعا آنحضرتﷺ سے رکوع وسجود میں ثابت ہے، لہذا اس اصل پر یہ زیادت جائز ہے مگر کوئی وہابی ونجدی کی رٹ لگانے والا اسے جائز نہیں کہے گا۔

(۲) اپنی عورت سے وطی کرنے کی اصل سنت سے ثابت ہے مگر اس پر زیادت لونڈے بازی، منع ہے، آخر کیوں؟ کیا دبر عورت کے جسم کا حصہ نہیں۔ہم تو کیا بدعت پسند بھی اس اجتہاد کو خرافات سے تعبیر کریں گے۔

(۳) رسول اللہﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو ایک دعا سکھائی جس میں یہ الفاظ تھے، و نبیک الذی ارسلت، حضرت براء رضی اللہ عنہ نے جب یہ دعا دھرا کر آپ کو سنائی تو یوں پڑھا

و رسولک الذی ارسلت، آپ علیہ السلام نے فرمایا

لا و نبیک الذی ارسلت، نہیں (وہی الفاظ دھراؤ جو میں نے سکھائے ہیں)

بخاری ص۳۸ ج۱، و ابوداود مع عون ص۴۷۱ ج۴، و ترمذی مع تحفۃ ص۲۳۰ ج۴.

(۴) سنن ترمذی میں ہے کہ امام نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں ایک شخص نے چھینک ماری تو اس نے کہا، **الحمدللہ والسلام علی رسول اللہ**ﷺ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ (عام حالات میں) میں بھی یہی کہتا ہوں،

الحمدلله و االسلام علی رسول الله، مگر چھینک کے وقت ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم، الحمدلله علی کل حال، کہیں۔ ترمذی مع تحفة ص۲ ج ۴، ومشکوة ص۴۰۶ وسندہ حسن۔

اس حدیث کو درج کر کے مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی بطور نتیجہ لکھتا ہے کہ اس شخص نے جو چھینک کے بعد، الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ، کہا تو اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ بات تھی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بغض کی بناء پر اس کو چھینک کے بعد درود شریف پڑھنے سے منع کر رہے تھے، ان کا مطلب صرف اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عبادات جس طرح مشروع اور مقرر فرمائی ہیں ان کو کسی ترمیم اور اضافہ کے بغیر ادا کرنا اتباع رسول اور جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ساتھ وابستگی ہے، اور اپنی رائے سے ان میں کسی سابقہ اور لاحقہ کا اضافہ کرنا بہرحال لائق ستائش نہیں ہے۔ شرح صحیح مسلم ص۱۰۹۵ ج۱، طبع فرید بک سٹال ۱۴۱۵ھ۔

(۵) نفلی روزے اور رات کو قیام کرنے کی اصل شریعت اسلامیہ میں موجود ہے مگر ساری رات قیام کرنا، ہمیشہ روزے رکھنے سے اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفی ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

تین آدمی امہات المومنین کے پاس آئے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھ رہے تھے جب انہیں آنحضرت ﷺ کی عبادت کے بارے میں خبر دی گئی تو کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں اللہ کے پیارے رسول ﷺ، رب کائنات نے تو انہیں معاف کر دیا ہوا ہے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری زندگی رات بھر قیام کیا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ساری زندگی روزے رکھوں گا اور کبھی روزہ ترک نہ کروں گا، تیسرے نے کہا کہ میں شادی نہ کروں گا، یہ باتیں رسول اللہ ﷺ سن رہے تھے، آپ علیہ السلام باہر تشریف لائے اور فرمایا

انتم الذین قلتم کذا و کذا اما والله انی لاخشا کم لله و واتقا کم له لکنی اصوم و افطر و اصلی و ارقدوا تزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی.

یعنی تم لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہیں ہیں (سن لو) مجھے رب کی قسم ہے کہ میں تم سب سے

زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ پر ہیز گار ہوں مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں رات کو قیام بھی کرتا ہوں سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریق (عمل) سے منہ پھیرتا ہے وہ میری (امت) سے نہیں۔ بخاری شریف ص ۷۵۷ ج ۲۔ و مسلم ص ۴۴۹ ج ۱ واللفظ لہ۔

دیکھئے رات کو نوافل پڑھنا سنت مصطفوی سے ثابت ہے، مگر ان پر زیادتی کہ ساری رات ہی پڑھا کروں گا، اسی طرح نفلی روزے کی بھی شریعت میں اصل ہے، مگر اس پر زیادتی یہ کہ کبھی بھی افطار نہ کروں گا، آنحضرت ﷺ نے ناپسند فرمایا۔

گو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی نیت یہی تھی کہ ان اعمال سے اپنے رب قدیر کی رضا حاصل کی جائے، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے اس طریق عمل کو پسند نہیں کیا، بلکہ ایسی عبادت کو اپنی سنت سے بغاوت قرار دیا۔

اب مسلمان فیصلہ کر لیں کہ انہوں نے مفتی صاحب کی بات کو ماننا ہے یا امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سنت پر چل کر آپکے اسوہ حسنہ کو اپنا کر دین میں من گھڑت بدعات اور زیادتیوں کو رد کر دینا ہے۔

علمائے بریلویہ کا اعتراف حق

آیئے اس ضابطہ و اصول کی بریلوی علماء سے تصدیق بھی ملاحظہ کیجئے۔

چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی صاحب حنفی بریلوی فرماتے ہیں

اس سلسلہ میں صحیح قاعدہ یہ ہے کہ جس خاص عبادت کے کرنیکا محرک ہو اور اس کے کرنے سے کوئی مانع نہ ہو اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے وہ کام قصداً ترک کیا ہو وہ کام کرنا یقیناً ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۴۵ ج ۲۔

سعیدی صاحب نے اس ضابطے کو فقط عبادات میں تسلیم کیا ہے، ہم تو اسے بھی غنیمت جانتے ہیں، اگر وہ اس کا بھی اقرار نہ کرتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، شاید سعیدی صاحب کے نزدیک سورۃ الحجرات کی حسب ذیل آیت کا تعلق فقط عبادات سے ہی ہے ارشاد ہوتا ہے

یاایھا الذین امنوا لاتقدموا بین یدی اللہ و رسولہ. (الحجرات ۱)

اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو (احمد رضا) ۴۹-۱۔

جب کہ سعیدی صاحب کے حکیم الامت اور مولف جاء الباطل نے بھی مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کسی چیز میں بھی حضور علیہ السلام سے آگے بڑھنا منع ہے کیونکہ، لاتقدموا، مطلق ہے۔ نورالعرفان ص۸۲۲۔

بریلویت کا معروف عالم مولوی نعیم الدین مراد آبادی لکھتا ہے

یعنی تمہیں لازم ہے کہ اصلاً تم سے تقدیم واقع نہ ہو نہ قول میں نہ فعل میں، حاشیہ بر ترجمہ مولوی احمد رضا خاں ص۷۴۵۔

علمائے بریلویہ کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھنے کی ممانعت عام ہے، خواہ عبادات ہوں یا معاملات یا دین کا کوئی اور مسئلہ، اس میں سنت سے زیادہ کام کرنا بدعت سیئہ ہے، خود سعیدی صاحب بھی اس بارے میں مطمئن نہیں انکی الجھی ہوئی بحث میں یہ عبارت بھی موجود ہے کہ

بے خطر اور سلامتی کا طریقہ یہی ہے کہ سنت رسول اور طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اس میں سرمو کمی بیشی نہ کی جائے، اعلی حضرت سے سوال کیا گیا کہ کفن مسنون سے کچھ زیادہ چیزیں کفن میں رکھنا جائز ہیں اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا

مرد کیلئے کفن کے تین کپڑے اور عورت کیلئے پانچ انکے سوا کفنی میں کوئی اور تہبند یا رومال دینا بدعت وممنوع ہے، سرمہ کنگھی اگر فقیر کو بطور صدقہ دیں تو حرج نہیں اور کفن میں رکھنا حرام ہے۔

اس عبارت سے آفتاب سے زیادہ روشن طریقہ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن امور کو منضبط کردیا ہے ان میں کسی قسم کی زیادتی اور سابقہ و لاحقہ کا اضافہ کرنا ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص۵۶۲ ج۲۔

اس عبارت میں سعیدی صاحب کو اقرار ہے کہ کسی مسنون فعل میں زیادتی کرنا بدعت وممنوع ہے، خواہ اس کا تعلق کسی چیز سے بھی ہو۔

کاش علمائے بریلویہ غور کرتے اور یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کرتے کہ کفن کا تعلق عبادات سے نہیں بلکہ حقوق العباد سے ہے۔

پھر سعیدی صاحب نے ایک اور ستم ڈھایا ہے، خاں صاحب کی عبارت نقل کرنے میں بریلوی ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے۔ حالانکہ مکمل عبارت اس طرح تھی

مرد کیلئے کفن کے تین کپڑے سنت ہیں اور عورت کیلئے پانچ، ان کے سوا کفنی میں کوئی اور تہبند یا رومال دینا بدعت وممنوع ہے۔ فتاوی رضویہ ص۲۱۳ ج۴۔

لیجئے جناب مولوی احمد رضا خاں کہہ رہا ہے کہ کفن میں زائد کپڑے دینے بدعت وممنوع ہیں، اس کی دلیل خاں صاحب نے یہ قائم کی ہے کہ یہ مسنون کفن سے زائد ہیں۔

اس اصول کو بریلوی علماء یہاں کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ دفن کے بعد میت کیلئے دعا کرنی مسنون ہے اور اذان دینا زائد ہے لہذا بدعت وممنوع ہے۔

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

اولا۔ ابن حجر شافعی ہیں تو بتاؤ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر، دوم، امام ابن حجر نے بھی اذان قبر کو منع نہیں کیا بلکہ اسکے سنت ہونے کا انکار کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر مان لیا جائے ابن حجر نے خود اذان کی تردید کی تو کسی عالم کے تردید کرنے سے کراہت یا حرمت ثابت ہو سکتی ہے، مفہوم جاء الباطل ص۳۱۶ تا ۳۱۷۔

الجواب

مفتی صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے، محض دفع الوقتی ہے، اب ترتیب وار ان خرافات کا جواب ملاحظہ کریں۔

اولاً۔ یہ مانا کہ ابن حجر شافعی المذہب تھا مگر حضرت جی یہ تو بتاؤ کہ آنجناب نے جو اسی بحث میں فتاوی شامی سے، جاء الباطل ص۳۱۲ ج۱، میں عبارت نقل کی ہے وہ کس حنفی کی ہے، وہ بھی تو عالی جاہ شافعی المذہب علماء کی ہے، چنانچہ ابن عابدین لکھتے ہیں کہ

وفی حاشیة البحر للخیر الرملی. رایت فی کتب الشافعیة انه یسن الاذان

لغير الصلوٰة.

یعنی رملی نے بحر کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں نے بعض کتب شافعیہ میں دیکھا ہے کہ نماز کے علاوہ چند جگہ پر اذان دینا سنت ہے۔ فتاوی شامی ص ۳۸۵ ج ۱۔

اس کے بعد علامہ شامی نے ابن حجر کا انکار درج کیا ہے۔

مفتی جی کی عیاری دیکھئے کہ خود تو شافعی علماء کی عبارت کو بطور حجت پیش کرتے ہیں مگر اس کی تردید جو علماء شافعی کرتے ہیں اس کا انکار کرتے ہیں، پھر اس کیلئے یہ جھوٹا بہانا پیش کرتے ہیں کہ ابن حجر شافعی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایک ایسی بری اور منحوس چیز ہے جو انسان سے عقل وخرد چھین کر بڑے بڑے مفتیان کرام کو خبطی بنادیتی ہے، اللہ تعالی محفوظ رکھے آمین۔

ثانیاً۔ ابن حجر نے محض اس کے سنت ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے بدعت بھی کہا ہے، قارئین کرام ورق الٹ کر بحوالہ شامی ص ۲۳۵ ج ۲، ابن حجر کی عبارت کو ایک بار پھر سے دیکھ لیں بلکہ خود مفتی صاحب نے شامی سے نقل کیا ہے کہ

وقد صرح ابن حجر بانه بدعة. اور ابن حجر نے تصریح فرمادی کہ یہ بدعت ہے۔ جاء الباطل ص ۳۱۸۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب کو جھوٹ بولنے (اور وہ بھی تحریر میں) ذرا بھر شرم نہیں آئی، پھر اس پر انہیں ندامت وشرمندگی کی بجائے فخر وگھمنڈ ہے چنانچہ شیخی بگھارتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

شامی سمجھنے کیلئے عقل وایمان کی ضرورت ہے، جاء الباطل ص ۳۱۷ ج ۲۔

جس کی خیر سے مفتی صاحب کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ثالثاً۔ شکر ہے کہ مفتی صاحب نے ایک حق بات تو زبان سے نکالی اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ بزرگ سے بزرگ امتی کی بھی دین میں کوئی حیثیت نہیں، یہی ہمارا اور اہل بدعت کا بنیادی اختلاف ہے کہ قرآن و حدیث اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی شرعی دلیل کے بالمقابل کسی کی ذات کو بطور حجت پیش نہیں کیا جاسکتا، کاش مبتدعین دیانت کے ساتھ اس اصول پر کار بند ہوں۔

رہا ہم نے فقہاء کی عبارتوں کو کیوں پیش کیا؟ تو جواباً عرض ہے کہ جناب پر اتمام حجت کیلئے جنھوں نے جاء الباطل کے شروع میں لکھا ہے کہ

ہدایات۔ اس کتاب میں حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۱) اپنے دعوے کی وضاحت (۲) اس کے دلائل قرآن و حدیث اور بزرگان دین محدثین و مفسرین کے اقوال سے، جاء الباطل ص۸ ج۱۔

آپ کے اس دعوے کو توڑنے کیلئے کہ قرآن و سنت اور فقہ حنفیہ سے ان کا ثبوت ہے، مگر حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، کہ مبتدعین کے بدعتی عقائد و اعمال کا قرآن و حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال سے قطعاً ثبوت نہیں ملتا، ثبوت تو کجا الٹا فقہاء عظام انکے مخصوص عقائد و اعمال کو بدعت کہتے ہیں، باقی مفتی اعظم کا یہ کہنا کہ کسی کے کہنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

یہ بات قابل غور ہے، واقعی کسی کے قول سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، لیکن جب اس پر دلیل شرعی موجود ہو، تو حرمت ثابت ہوجاتی ہے، اور یہاں دلیل شرعی، کل بدعة ضلالة، (ہر بدعت گمراہی) موجود ہے، اور سنت پر (زیادتی) ہونے کی وجہ سے بھی مردود ہے، مزید تفصیل مولوی احمد رضا خاں کے فتوی کے حوالے سے گزر چکی ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

بحرالرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بجز زیارت و دعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے، بالکل درست ہے، وہ زیارت قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب وہاں زیارت کی نیت سے جاوے تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ ناجائز کام نہ کرے اور یہاں گفتگو ہے دفن کے وقت، یہ زیارت کا وقت نہیں ہے اگر دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میت کو قبر میں اتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا جس کو فتاوی رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے سب منع ہے اس میں مردے کو جنگل میں رکھ کر فاتحہ پڑھ کر بھاگ آنا چاہیئے، جاء الباطل ص۳۱۸ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ البحرالرائق کی عبارت دراصل، فتح القدیر کی ہے جسے انہوں نے وہاں سے نقل کیا ہے،

اور فتح القدیر کی عبارت یوں ہے

ویکرہ النوم عند القبر و قضاء الحاجة و کل مالم یعهد من السنة المعهود منها لیس الازیارتها و الدعاء عندها قائما.

یعنی قبروں کے پاس سونا اور قضائے حاجت (پاخانہ کرنا) اور ہر وہ چیز جو سنت سے ثابت نہیں وہ مکروہ (حرام) ہے اور (قبر کے پاس) سنت سے ثابت فقط ان کی زیارت کرنا اور پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ہے۔ فتح القدیر ص۱۰۲ ج ۲

اب اگر مفتی صاحب کے مفہوم کو لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ صرف زیارت کے وقت قبر کے پاس سونا اور قضائے حاجت کرنا منع ہے، اگر دفن کے وقت سویا جائے یا قضائے حاجت کی جائے، تو جائز ہے، کیونکہ اس عبارت کا تعلق زیارت کے وقت سے ہے نہ کہ دفن کے وقت، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر علماء بریلویہ اس کو تسلیم کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں کرتے، یقیناً نہیں کرتے، تو پھر مبتدعین نے کس دلیل سے پہلی بات کو دونوں وقتوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور دوسری کو فقط زیارت کے وقت، جبکہ الفاظ، قضاء الحاجۃ، کے بعد واؤ عاطفہ بھی موجود ہے جو اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ ان کا آپس میں بھی تعلق ہے۔

ثانیاً۔ کتب فقہ کی عبارات کو ایک بار مکرر دیکھ لیجئے، ان کے الفاظ، عند القبر (قبر کے پاس) کے ہیں، فی القبر (قبر میں) کے نہیں، جب کہ مٹی ڈالنا وغیرہ، فی القبر، ہے، عند القبر، نہیں، اور فقہاء نے عند القبر (قبر کے پاس) دعا و زیارت کو مسنون قرار دیا ہے، باقی کو یکرہ (حرام) سے تعبیر کیا ہے، خیر سے مفتی صاحب کی اذان، عند القبر، (قبر کے پاس) ہے، فی القبر (قبر کے اندر) کی مد سے نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ قبر پر اذان دینا مکروہ ہے۔

ثالثاً۔ رہا فتاویٰ رشیدیہ کی عبارت کا جواب تو وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، جو بریلویت کے چند مخصوص عقائد و اعمال کے سوا مفتی صاحب کے ہم عقیدہ تھے، باقی دفن کے بعد تلقین ہمارے نزدیک بدعت ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے، فتاویٰ اہل حدیث ص۱۰۷ ج ۲۔ طبع ادارہ احیاء السنۃ النبویہ سرگودھا ۱۹۹۴ء۔

مفتی صاحب کا چوتھا اعتراض

تو شیخ کا فرمانا لیس بشئی اسکے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سنت محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنت یاواجب سمجھنا محض غلط ہے جو فقہاء اس کو بدعت فرماتے ہیں وہ بدعت جائز یا بدعت مستحبہ فرماتے ہیں نہ کہ بدعت مکروہہ کیونکہ بلا دلیل کراھت ثابت نہیں ہوتی۔ جاء الباطل ص۳۱۹ ج۱۔

الجواب۔ اولاً۔ کسی واضح دلیل سے ثابت کیجئے کہ فقہاء نے اسے بدعت مستحبہ قرار دیا ہے، محض لکھ دینا دلیل نہیں بلکہ اس کیلئے نقل ضروری ہے پھر یہ بھی یاد رہے کہ وہ نقل بھی بادلیل ہو۔

ثانیاً۔ لیس بشئی، کا یہ اچھوتا معنی کہ، مستحب ہے، لغت کی کس کتاب میں لکھا ہے اہل زبان جانتے ہیں کہ جب، لیس بشئی، بولا جاتا ہے تو اس سے کسی چیز کی نفی مراد ہوتی ہے، چنانچہ آئمہ لغت فرماتے ہیں

و لیس، کلمة نفی، یعنی،لیس،نفی کا کلمہ ہے۔

لسان العرب ص۲۱۲ ج۶، و تاج العروس ص۲۴۴ ج۴۔

علامہ فیومی فرماتے ہیں

لیس ، و معناه نفی الخبر فقولک لیس زید قائما.

یعنی اس سے مراد کسی خبر کی نفی ہوتی ہے جیسا کہ زید کھڑا نہیں،

المصباح المنیر ص۵۶۱ طبع موسسۃ دار الہجرۃ ۱۴۱۴ھ۔

مگر مفتی صاحب کلمہ، لیس بشئی، سے اثبات کر رہے ہیں پھر صریحاً جھوٹ بولا کہ شامی کے باب مطلب فی تکبیر التشریق، میں لیس بشئی، کا یہ معنی لکھا ہوا ہے کہ

وهو نکرة فی موضع النفی فتعم انواع العبادة من فرض و واجب و مستحب فبقیت الا باحة قیل یستحب. جاء الباطل ص ۳۱۹ ج ۱.

حالانکہ فتاوی شامی میں کوئی ایسی عبارت نہیں، دیکھئے فتاوی شامی ص۱۷۷ ج۲، ہاں البتہ درمختار میں یہ عبارت ہے، مگر فتاوی شامی والا تو اس کی تردید کرتا ہے چنانچہ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں

والحاصل ان الصحيح الكراهة كما في الدر رو بل في البحران ظاهر مافي غاية البيان انها تحريمية و في النهر ان عباراتهم ناطقة بترجيح الكراهة.

خلاصہ کلام یہ کہ صحیح وحق بات یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ، در رالبحار، میں ہے بلکہ بحر میں ہے کہ غایۃ البیان کے ظاہر (کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ مکروہ تحریمی ہے اور فتاوی النھر میں ہے کہ فقہاء کی عبارات اس کومکروہ قرار دینے میں ناطق ہیں۔ فتاوی شامی ص ۱۷۷ ج ۲۔

عرفہ کے روز باہر نکل کر عبادت وغیرہ کرنی

مفتی صاحب نے ،لیس بشئی، کی تعریف کہاں سے دریافت کی ہے اس کی پوری حقیقت پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض لوگ عرفہ کے روز باہر نکل کر اہل عرفہ کی مشابہت میں، ذکر وعبادت کرتے تھے ان کی اس بدعت سیۂ پر روشنی ڈالتے ہوئے امام محمدؒ نے لکھا تھا کہ

والتعريف الذى يصنع الناس ليس بشئى.

یعنی عرفہ کے روز باہر نکل کر جوعوام الناس کرتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جامع الصغیر ص ۱۱۵ طبع ادارۃ القران والعلوم الاسلامیہ کراچی ۱۴۱۱ھ۔

امام محمدؒ نے اپنے اس بیان میں عوام الناس کے عمل کی تردید کرتے ہوئے اسے بے اصل قرار دیا ہے، اور شریعت میں اسکی دلیل کی نفی کی ہے، حضرات فقہاء احناف نے امام محمد کے اس قول کی بنیاد پر پورے جزم ویقین کے ساتھ اس بدعت سیۂ کی تردید کی ہے چنانچہ ھدایہ میں ہے

والتعريف الذى يصنعه الناس ليس بشئى، و هو ان يجتمع الناس يوم عرفة في بعض المواضع تشبيها بالوافقين بعرفة لان الوقوف عرف عبادة مختصة بمكان مخصوص فلايكون عبادة دونه كسائرا المناسك.

یعنی تعریف جولوگ کرتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ (تعریف) یہ ہے کہ لوگ عرفہ

کے دن بعض مقامات پر جمع ہوکر (عبادت کریں) عرفہ میں ٹھہرنے والے لوگوں کی مشابہت میں، (اسکے مردود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) عرفہ میں ٹھہرنا ایک مخصوص عبادت ہے مخصوص مقام کے ساتھ اس کے علاوہ کسی جگہ کوئی عبادت مشروع نہیں جیسا کہ حج کے دیگر ارکان حج کے ساتھ ہی خاص ہیں۔

ھدایہ مع فتح القدیر ص۷۴ ج۲

علامہ ابن ھمام فرماتے ہیں

ظاهر مثل هذا اللفظ انه مطلوب الاجتناب.

یعنی ان جیسے الفاظ (لیس بشئ) کا ظاہر مقصود یہ ہے کہ (ان بدعات سے) اجتناب کیا جائے (انتھی) امام ابن ھمام نے آگے چل کر ان لوگوں کی پر زور مذمت کی ہے جو اسے جواز کا لبادہ اوڑھاتے ہیں۔

دیکھئے فتح القدیر ص۷۴ ج۲ باب صلاۃ العیدین۔

علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق کی شرح میں فرماتے ہیں

لان الوقوف لما كان عبادة مخصوصة بمكان لم يجز فعله الافي ذلك المكان كالطواف، وغيره، الاترى انه لا يجوز الطواف حول سائر البيوت تشبها بالطواف حول الكعبة ،ا،ه،و ظاهره ان الكراهة تحريمية و في الذخيرة من كتاب الحظر والا باحة التضحية بالديک اوبالدجاج فی ايام الاضحية ممن لااضحية عليه لعسرته بطريق التشبيه بالمضحين مكروه لانّ هذا من رسوم المجوس.

یعنی عرفہ میں ٹھہرنا ایک مخصوص جگہ کے ساتھ مخصوص عبادت ہے، اس کا کرنا جائز نہیں مگر وہاں ہی مخصوص مقام پر جیسا کہ طواف کعبہ ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ طواف کرنا جائز نہیں کسی بھی گھر کا کعبہ کے ساتھ مشابہت کرتے ہوئے، اور ظاہر اس کا یہ ہے کہ (تعریف) مکروہ تحریمی ہے، اور ذخیرہ میں ہے جسے قربانی دینے کی طاقت نہیں وہ اگر قربانی کرنے والوں کی مشابہت اختیار کر کے مرغی یا مرغا کی قربانی کرے تو مکروہ ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کی رسم ہے، البحر الرائق ص۱۶۴ ج۲۔

علامہ جلال الدین الخوارزمی حنفی نے ھدایہ کی شرح میں اس کے مکروہ ہونے پر قاضی ابو یوسف کا قول بھی نقل کیا ہے، الکفایۃ ص ۴۸ ج ۲۔

علامہ حلبی، منیہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

وعن مالک انه سئل عنه فقال لیس هذا من امرالناس و انما مفاتیح هذه الاشیاء البدع انتهی و مراده بالناس اصحاب رسول الله ﷺ و مالم یکن من امر هم فهوبدعة والبدعة اذا لم تستلزم سنة فهی ضلالة.

حضرت امام مالکؒ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا، اور اس جیسی چیزیں بدعات کی چابیاں ہیں (علامہ حلبی فرماتے ہیں کہ) امام مالک کے قول میں لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم ہیں، اور وہ جو حکم دیئے گئے تھے جو اس میں نہیں وہ بدعت ہے اور بدعت جب سنت سے ثابت نہ ہو وہ بدعت سیئہ ہے۔ غنیۃ المستملی ص ۵۷۳۔

فقہاء کرام کی ان عبارات سے ثابت ہوا کہ انہوں نے حضرت امام محمدؒ کے قول، لیس بشئی، سے تعریف کو مکروہ تحریمی اور بدعت سیئہ کہا ہے مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس لفظ سے استحباب ثابت کرر ہے ہیں۔

باب قبر پر اذان دینے کے دلائل کا تجزیہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ

مشکوٰۃ شریف کتاب الجنائز باب مایقال عند من حضر الموت، میں ہے۔

لقنوا موتکم لا اله الا الله

اپنے مردوں کوسکھاؤ ، لا الہ الا اللہ، اس حدیث کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ جو مر رہا ہو اس کو کلمہ سکھاؤ، دوسرا یہ کہ جو مر چکا ہو اس کو کلمہ سکھاؤ، پہلے معنی مجازی ہیں اور دوسرے حقیقی اور بلا ضرورت معنی مجازی لینا ٹھیک نہیں، لہذا حدیث کا یہ ہی ترجمہ ہوا کہ اپنے مردوں کوکلمہ سکھاؤ اور یہ وقت دفن کے بعد کا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۱۱ ج ۱۔

میت کو تلقین کب کی جائے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب جب کسی شرعی قرینہ سے مجازی معنی متعین ہوجائیں تو انہیں حقیقت کی طرف پھیرنا جائز نہیں، چنانچہ قرآن کریم میں عموماً ،اصحاب النار، سے مراد کافر ہیں لیکن یہی الفاظ سورۃ مدثر (آیت ۳۱) میں دوزخ کے داروغہ ملائکہ پر بولا گیا ہے، اب دیکھئے کہ اصحاب النار سے جہنم کا داروغہ مراد لینا مجاز ہے، لیکن چونکہ آگے لفظ، **الاملئکة** ، کے موجود ہیں جو اس مجازی معنی کو متعین کر رہے ہیں اس لئے اس کا معنی جہنم میں رہنے والے کافر کرنا غلط ہوگا، گو یہ اس کے حقیقی معنی ہیں مگر اس قرینہ کی وجہ سے جہنم میں رہنے والے کافر مراد لینا غلط ہے۔

بعینہ اس طرح حدیث، لقنوا موتکم ، میں جو مر رہا ہے اس کوکلمہ شہادت کی تلقین کرو، گو مجازی معنی ہے مگر اس پر دلائل شرعی موجود ہونے کی وجہ سے، مرنے کے بعد، پرمحمول نہیں کر سکتے، کہ شریعت سے اس کے خلاف دلائل موجود ہیں، اس سلسلہ کی مزید امثلہ ذیل مین ملاحظہ کریں

(۲) اذی، کے لفظ کا لغوی معنی تکلیف ہے لیکن سورۃ بقرہ (آیت ۲۲۲) میں اس کا استعمال نجاست غلاظت، گندگی، پر ہوا ہے، حالانکہ لغت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

(۳) جرم، قرآن میں اجرام کا لفظ گناہ، قصور، جُرم کے معنوں میں آیا ہے، اس کی تو ایک حد

تک لغت سے تائید ہوتی ہے لیکن قرآن نے جُرم (ثلاثی مجرد) کو گناہ پر ابھارنا، یا، گناہ میں مبتلا کر دینا، کے معنوں میں استعمال کیا ہے، المائدہ آیت ۲- وھود آیت ۸۹)

(۴) سوءۃ، سوء، بمعنی برائی، سیئہ، برا کام، ساء برا ہونا، اور، اساء، بمعنی برا بنانا، بگاڑنا، اور سوءۃ، بمعنی وہ چیز جو دیکھنے میں بری لگے، کنایۃً، اس کا معنی مرد یا عورت کا مقام ستر یا شرمگاہ بھی ہے کہ اس کا کھلنا برا معلوم ہوتا ہے، اور سوءۃ بمعنی لاش، اس کا کنائی معنی بھی نہیں، نہ ہی لغت سے اس کی تائید ہوتی ہے مگر سورۃ المائدۃ آیت ۳۱ میں دو بار یہ لفظ لاش کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور مشکل یہ کہ کوئی اور معنی فٹ بھی نہیں بیٹھتا۔

(۵) قِطف، چنے ہوئے پھل، اور خصوصاً، انگور کا گچھا، پر بولا جاتا ہے جب کہ وہ چنا جائے اور اس کی جمع قطاف اور قطوف آتی ہے مگر قرآن نے یہ لفظ ایسے گچھوں یا خوشوں کیلئے بولا ہے جو پک تو چکے ہوں مگر ابھی درخت پر ہی لگے ہوں۔ الحاقۃ - آیت ۲۳) و الدھر آیت ۱۴۔

(۶) نحلۃ کا معنی کسی کو کچھ دینا، مگر قرآن میں بمعنی، دل کی خوشی آیا ہے (النساء آیت ۴) حالانکہ لغت میں اس کا معنی دینا یا عطیہ دینا تو ہوسکتا ہے لیکن دل کی خوشی سے کرنا لغت میں موجود نہیں۔

منقول از مترادفات القران ص ۹۹۸۔

اس طرح کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اختصار کی وجہ سے انہی چند امثلہ پر اکتفا کر رہا ہوں۔

اب ان الفاظ کے معنوں کیلئے لغت لیکر بیٹھ جانا دیانت داری نہیں بلکہ پرلے درجے کی حماقت ہے، کیونکہ شرعی طور پر ان کے معنی متعین ہوچکے ہیں

اس مختصر تمہید کے بعد ہم عرض کرتے ہیں کہ حقیقت کی تین قسمیں ہیں، حقیقت وصفی، حقیقت عرفی، حقیقت شرعی، دیکھئے نو رالانوار ص ۹۵۔

اور زیر بحث روایت کا معنی جو مر رہا ہے اسے کلمہ شہادت کی تلقین کرو، حقیقت شرعی ہے، مجاز قطعاً نہیں، چنانچہ یہی روایت صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس کے راوی سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرماتے ہیں۔

قال رسول ﷺ لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ فانہ من کان آخر کلمتہ لا الہ الا

الله عند الموت دخل الجنة. الحديث.

یعنی رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ اپنے مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو کیونکہ جس کا آخری کلمہ وفات کے وقت لا الہ الا اللہ ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

صحیح ابن حبان ص۲۷۲ ج۶ رقم الحدیث ۲۹۹۳۔ (وموارد الظمآن رقم الحدیث ۷۱۹)

یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن درجہ سے کم نہیں

حافظ ابن حجرؒ نے، التلخیص ص۱۰۲ ج۲ میں اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے اور احناف کو مسلم ہے کہ جس روایت پر حافظ ابن حجر تلخیص، میں سکوت اختیار کریں وہ کم از کم حسن درجے کی ہوتی ہے، دیکھئے دین الحق ص [illegible]۔

اس حدیث نے [illegible] موتکم، کے معنی متعین کر دیئے کہ، من قرب منکم الموت، یعنی جو تم سے موت کے قریب ہو، اس پر مزید روایات بھی مروی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال رسول الله ﷺ من لقن لا اله الا الله عند الموت دخل الجنة.

یعنی جس نے موت کے قریب لا الہ الا اللہ کی تلقین قبول کی وہ جنت میں جائے گا، معجم طبرانی اوسط ص۴۹۶ ج۴۔

یہی روایت مسند امام احمد ص۴۷۴ ج۴ میں مرسل مروی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول [illegible] ﷺ [illegible] لا اله الا الله فمن قالها عند موته وجبت له الجنة. الحديث

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے مردوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو کیونکہ جس نے وفات کے وقت کلمہ شہادت کہا اس کیلئے جنت واجب ہوگئی۔

طبرانی کبیر ص۱۹۷ ج۱۲، ومجمع الزوائد ص۳۲۶ ج۲۔

گو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت عطاء کے اختلاط اور ابن عباس کی انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے مگر ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے شواہد کیلئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ابن حبان کی روایت

نے اس کے معنی کو متعین کر دیا ہے۔

ثانیاً۔ تلقین سے مقصود تو مرنے والے کو لقمہ دینا ہے کہ وہ اپنی زبان سے جو آخری بات کرے وہ کلمہ شہادت پڑھ رہا ہو، اور بموجب فیصلہ نبوی جس کا آخری کلمہ یہ ہوگا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول الله ﷺ من كان آخر كلامه لا اله الا الله دخل الجنة.

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا آخری کلام کلمہ شہادت ہوگا وہ جنت میں جائے گا، سنن ابو داود مع عون ص ۱۵۹ ج ۳، و مسند امام احمد ص ۲۳۳ ج ۵، و مستدرک حاکم ص ۳۵۱ ج ۱۔

اس فیصلہ الٰہی کی وجہ سے اللہ رب العزت کے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی امت کو از راہ شفقت یہ تعلیم دی کہ مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو تا کہ جب وہ اس دنیا سے جائے تو رب العالمین کی توحید اور اس کے نبی کی رسالت کی گواہی پر جائے مگر یار لوگوں نے اسے بعد از دفن کی تلقین بدعت پر محمول کر لیا ہے، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

اکابرین احناف سے حدیث کا معنی

ضرورت تو نہ تھی مگر ہم مبتدعین پر اتمام حجت اور عوام کی تفہیم کیلئے اکابرین احناف سے اس روایت کا معنی دکھاتے ہیں تا کہ حضرت مفتی صاحب اور ان کے چیلوں چانٹوں کا مکر و فریب پوری طرح آشکارا ہو کر دم توڑ جائے۔

(۱) ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں فرماتے ہیں

لقنوا موتا كم لا اله الا الله، اى ذكر وا من حضره الموت منكم بكلمة التوحيد.

یعنی، لقنوا موتاکم، کا معنی ہے، جب تم میں سے کسی کی موت حاضر ہو، تو اسے کلمہ توحید یاد کراؤ، مرقاۃ ص ۱۲ ج ۴۔

(۲) شیخ عبد الحق محدث دھلوی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں

لقنوا موتا کم لا اله الا الله، تلقین کنید مرده هاے خودرا یعنی آنها که نزدیک بمردن رسیده اند کلمه طیبه را.

یعنی حدیث، لقنوا موتاکم، کا معنی اپنے مردوں کو کلمہ طیبہ کی تلقین کرو جب وہ مرنے لگے۔ اشعۃ اللمعات ص۷۰۴ ج۱۔

(۳) مولوی قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں اس حدیث کا معنی کرتے ہیں کہ تلقین کرو ان شخصوں کو کہ قریب مرنے کے ہیں، کلمہ لا الہ الا اللہ، کی، مظاہر حق ص۲۹ ج۲ طبع نول کشور، ۱۹۳۴ء

(۴) صاحب ھدایہ فرماتے ہیں

و لقن الشهادتين لقوله ﷺ لقنوا مو تاكم شهادة أن لا اله الا الله والمراد الذى قرب من الموت.

یعنی مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو، کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنے مردوں کو کلمہ شہادت سکھاؤ، سو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت قریب آچکی ہو۔ ھدایہ مع فتح القدیر ص۶۸ ج۲۔

(۵) علامہ ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں

و لقن الشهادة بان يقال عنده لا اله الا الله محمد رسول الله ولا يومر بها للحديث الصحيح من كان آخر كلامه لا اله الا الله دخل الجنة وهو تحريض على التلقين بها عند الموت.

اور کلمہ شہادت کی تلقین (کا طریقہ یہ ہے کہ) اس (مرنے والے) کے پاس لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا جائے اور اسے پڑھنے کو نہ کہا جائے، کیونکہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس کا مرتے وقت آخری کلمہ لا الہ الا اللہ، ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور تلقین کی ترغیب موت کے وقت دلائی گئی ہے۔ البحر الرائق ۱۷۰ ج۲۔

(۶) علامہ حلبی، منیۃ المصلی کی شرح میں فرماتے ہیں

ويلقن الشهادة لماروى الجماعة الا البخارى انه عليه السلام قال لقنوا موتاكم شهادة ان لا اله الا الله والمراد من قرب من الموت.

یعنی مرنے والے کو کلمہ شہادت کی تلقین کی جائے کیونکہ ایک جماعت محدثین نے امام بخاری کے سوا یہ حدیث روایت کی ہے کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے، اپنے مردوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو، سو، موتاکم، کا معنی ہے جس کی اجل قریب ہو، اسے تلقین کرو۔ حلبی کبیر ص۵۷۶ طبع سہیل اکیڈمی لاھور ۱۴۰۸ھ۔

(۷) مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی جو ماضی قریب میں حنفیت کے نامور وکیل گزرے ہیں فرماتے ہیں

والمراد بالمیت من قرب من الموت.

یعنی حدیث کے الفاظ، موتاکم، سے مراد ہے جس کی اجل قریب ہو۔ عمدۃ الرعایۃ ص۲۰۵ ج۱ حاشیہ۱۲، طبع ایچ ایم سعید۔

(۸) علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ

ویلقن کلمة الشهادة لقول النبی ﷺ لقنوا موتاکم لا اله الا الله والمراد من المیت المحتضر لانه قرب موته فسمی میتا لقربه من الموت قال الله تعالی انک میت وانهم میتون.

یعنی نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق کلمہ شہادت کی تلقین کرنی چاہیئے، اور موتاکم، سے مراد محتضر (موت میں مبتلا شخص) ہے کیونکہ اس کی اجل قریب ہے اور اسے میت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی موت قریب ہے، جیسا کہ حق تعالی کا ارشاد، انک میت وانھم میتون، ہے، بدائع الصنائع ص ۲۹۹ ج۱،

محدثین کرام سے حدیث کا معنی

فن حدیث سے تھوڑا بہت مس رکھنے والا جانتا ہے کہ محدثین کرام نے حدیث رسول کی حفاظت اور اس کی تدوین و ترتیب میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، حقیقت میں یہی لوگ اس فن کے وارث تھے

اس مقدس گروہ نے جس طرح اقوال الرسول کے الفاظ کی صحت کا خیال رکھا اسی طرح معنی و

مفہوم کو بگاڑنے سے بچایا اور بدعت پسند حضرات کی تحریفات کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سپرد خاک کردیا، آیئے انہیں سے ہی معنی معلوم کرلیں کہ، موتاکم، کا کیا معنی ومفہوم ہے۔

(۱) امام ترمذی فرماتے ہیں

ان یلقن المریض عند الموت قول لا اله الا الله.

یعنی مریض کو موت کے وقت کلمہ کی تلقین کی جائے،

ترمذی مع تحفہ ص۱۲۸ ج۲۔

(۲) امام ابن حبان اپنی صحیح میں اسی حدیث کو روایت کر کے پھر اس کا معنی بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

عن معقل بن یسار قال قال رسول الله ﷺ اقراوا علی موتاکم یٰس، قال ابو حاتم رحمة الله، قوله اقرأوا علی موتاکم یٰس، اراد به من حضرته المنية لان الميت یقرا علیه، و کذالک قوله ﷺ لقنوا موتاکم لا اله الا الله.

یعنی حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مردوں پر یٰس پڑھو۔

امام ابو حاتم فرماتے ہیں اس سے مراد، جس کی موت حاضر ہو اس پر نزع کے وقت پڑھو، اسی طرح لقنوا موتاکم، میں بھی نزع کے وقت تلقین کرنا مراد۔

صحیح ابن حبان ص۳ ج۶ زیر رقم الحدیث۲۹۹۱۔

(۳) امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں

ویجب تلقین المیت الذی یموت فی ذهنه و لسانه منطلق او غیر منطلق، لما روینا لقنوا موتاکم. ملخصاً

یعنی مردے کو تلقین کرنا واجب ہے نزع کے وقت جب اس کی آنکھیں پھٹ چکی ہوں اور زبان صاف ہو یا نہ ہو جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لقنوا موتاکم،

المحلی بالآثار ص۳۸۴ ج۳۔

جن محدثین کرام نے اسے روایت کیا ہے انہوں نے بھی اس کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ قریب

المرگ انسان کوکلمہ کی تلقین کرو، کسی ایک نے بھی اس پر دفن کے بعد تلقین کا باب نہیں باندھا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس حدیث کا مفہوم قریب المرگ انسان ہے نہ کہ جو فوت ہو کر دفن کیا جا چکا ہو۔

برصغیر کے علماء اہل حدیث سے معنی

یہی معنی علماء حدیث نے اس کا بیان کیا ہے چنانچہ علامہ سندھی مرحوم (جو ماضی قریب میں ایک علمی شخصیت گنے گئے ہیں) فرماتے ہیں

(۱) لقنوا موتاکم المراد من حضره الموت لا من مات.

یعنی لقنوا موتاکم، سے مراد ہے جس کی موت حاضر ہو اسے تلقین کرو، نہ کہ جو مر چکا ہو۔ حاشیہ سندھی علی النسائی ص ۲۱۱ ج ۱ سلفیہ۔

(۲) مولانا شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں۔

ای ذکروا من حضره الموت منکم بکلمة التوحید او بکلمتی الشهادة.

یعنی جب تم میں سے کسی کی موت قریب ہو تو کلمہ شہادت یاد دلاؤ۔ عون المعبود شرح سنن ابی داود ص ۱۵۹ ج ۳۔

(۳) مولانا محمد عبد الرحمان محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

اعلم ان المراد من الموتی فی هذا الحدیث من حضره الموت لا المیت.

یعنی معلوم ہونا چاہیے کہ اس حدیث میں، موتی، سے مراد جس کی اجل قریب ہو نہ کہ جو فوت ہو چکا ہو۔ تحفة الاحوذی شرح ترمذی ص ۱۲۷ ج ۲۔

(۴) نواب صدیق حسن خاں محدث قنوجی فرماتے ہیں

ای من حضره الموت، یعنی جس کی اجل قریب ہو اسے تلقین کرو،

السراج الوهاج شرح صحیح مسلم ص ۲۸۸ ج ۱۔

(۵) مولانا عبید اللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

ای الذین هم فی سیاق الموت، یعنی انہیں کلمہ کی تلقین کرو جو موت کی کش مکش میں مبتلا

ہیں، مرعاۃ شرح مشکوۃ ص ۳۰۷ ج ۵۔

بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام سے معنی

مبتدعین کے امتیازی مسائل چونکہ بدعات ہیں، اس لئے ان کے علماء نے انہیں کے دلائل و براھین کو جمع کرنے میں علمی زور صرف کیا ہے، انہیں قرآن و سنت کی تشریح و توضیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اس وجہ سے ماضی قریب میں بریلوی مکتب فکر کی کوئی قابل ذکر حدیثی خدمت نظر سے نہیں گزری، جس کی وجہ سے گزرے ہوئے مبتدعین سے اس حدیث کے معنی کے متعلق کوئی قول لانا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

علمائے اہل حدیث کی دیکھا دیکھی موجودہ دور کے مبتدعین کے دل میں تراجم صحاح ستہ کا جذبہ ابھرا ہے اور انہوں نے بڑے ولولہ کے ساتھ ان تراجم کو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کا معنی حسب ذیل کیا ہے۔

(۱) مولانا غلام رسول سعیدی صاحب، ان کے حلقہ میں ایک علمی شخصیت سمجھے جاتے ہیں خیر سے دار العلوم نعیمہ کراچی کے شیخ الحدیث اور شارح صحیح مسلم ہیں، سعیدی صاحب اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

قال رسول اللہ ﷺ لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مرنے والوں کو، لا الہ الا اللہ، کی تلقین کرو۔ شرح صحیح مسلم ص ۷۱۴ ج ۲۔

سعیدی صاحب آگے چل کر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی کے حوالے سے فرماتے ہیں

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تلقین مستحب ہے البتہ اس کی کثرت اور اس پر اصرار مکروہ ہے کیونکہ جو شخص مرض الموت میں مبتلا ہو وہ تکلیف اور کرب میں ہوتا ہے، بار بار تلقین کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ اس کے دل میں کلمہ سے کوئی تنگی آجائے یا وہ زبان سے انکار کردے اور جب مرنے

والا ایک بار کلمہ پڑھ لے تو اس سے دوبارہ پڑھنے کیلئے اصرار نہ کیا جائے الا یہ کہ وہ کلمہ پڑھنے کے بعد کوئی اور بات کرے کیونکہ حدیث کے مطابق اس کا آخری کلام، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ہونا چاہیئے، شرح صحیح مسلم ص۸۴۳ ج۲، طبع فرید بک سٹال ۱۹۹۴ء۔

(۲) مولوی محمد صدیق ھزاروی بریلوی اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اپنے قریب المرگ لوگوں کو کلمہ توحید کی تلقین کرو، مترجم ترمذی ص۵۰۶ ج۱ طبع فرید بک سٹال لاہور ۱۹۸۴ء۔

(۳) مولوی عبد الحکیم خاں اختر شاہجہانپوری (بریلوی) اس حدیث کا معنی کرتے ہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مرنے والوں کو اس بات کی تلقین کرو کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ۔

مترجم ابو داؤد ص۵۲۲ ج۲ طبع فرید بک سٹال ۱۹۸۴ء، ومترجم ابن ماجہ ص۴۱۵ ج۱، طبع ایضاً۔

مفتی صاحب کی ایک نئی دریافت:

قارئین کرام جب آپ نے حدیث کے معنی ومفہوم کو بخوبی جان لیا، تو اب غور کیجئے کہ اس حدیث کو اذان قبر سے کیا نسبت ہے، کیا اذان اور تلقین ایک چیز ہیں؟

افسوس پہلے تو مفتی صاحب نے حدیث کے مفہوم کو بگاڑا، پھر اس الٹے مفہوم پر یہ عمارت تعمیر کر لی کہ چونکہ اذان میں کلمہ بھی ہے اس لئے یہ اذان بھی تلقین میت ہے، جاء الباطل ص۳۱۲ ج۱۔

اگر اذان بھی تلقین ہے تو کیا مبتدعین نے کبھی مرنے والے کو اذان بھی سکھائی ہے، نہیں قطعاً نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اذان تلقین ہی نہیں۔

مفتی صاحب کا استدلال بالکل، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا، کا مصداق ہے۔

اگر آج کوئی یہ استدلال کرے کہ لغت میں صلوۃ دعا اور نماز کو کہتے ہیں، اور دفن کے بعد قبر پر آپ علیہ السلام سے صلوٰۃ بمعنیٰ دعا ثابت ہے، لہذا قبروں پر کھڑے ہو کر فرض نماز ادا کرنی چاہیے کیونکہ صلوٰۃ بمعنیٰ نماز بھی آیا ہے، یا نماز کی بجائے دعا ہی کر لی جائے کہ اے اللہ مجھے معاف فرما، تو اس سے نماز ادا ہو جاتی ہے اور دعا مانگنے والے سے فرض ساقط ہو کر اللہ کے ہاں اس کی نماز قبول ہو جاتی ہے۔

ایسے مجتہد کو علماء بریلوی بھی دماغی آپریشن کا مشورہ دیں گے اس لئے کہ اس کا یہ اجتہاد امر واقعہ میں غلط ہے، اور شارع علیہ السلام کے تعامل کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

مشکوۃ باب فضل الاذان میں ہے کہ

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلال کی اذان سے رمضان کی سحری ختم نہ کرو، وہ لوگوں کو جگانے کیلئے اذان دیتے ہیں معلوم ہوا کہ زمانہ نبوی میں سحری کے وقت بجائے نوبت یا گولے کے اذان دی جاتی تھی لہذا سوئے کو جگانے کیلئے اذان دینا سنت سے ثابت ہے، جاء الباطل ص۳۱۴ ج۱۔

کیا سحری کی اذان سے قبر کی اذان ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان رمضان المبارک میں لوگوں کو سحری کھانے کی طرف متوجہ کرنے کیلئے ہوتی تھی، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں

عن النبی ﷺ قال لایمنعن احدکم او احد امنکم اذان بلال من سحورہ فانہ یوذن اوینا دی بلیل لیرجع قائمکم و لینبہ نائمکم. الحدیث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلال کی اذان کے سبب تم میں سے کوئی شخص سحری کھانے سے نہ رکے، اس لئے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں تا کہ نماز میں مشغول شخص سحری کھانے کیلئے گھر لوٹ جائے (اور گھر میں) سویا ہوا شخص بیدار ہوجائے۔ بخاری ص۸۷ ج۱، ومسلم ص۳۵۰ ج۱۔

اس حدیث سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ کہ رمضان المبارک میں سحری کیلئے اذان دی جائے تا کہ لوگ سہولت سے روزہ رکھ لیں، الحمد للہ جماعت اہل حدیث اس پر عامل ہے مگر مبتدعین کا گروہ اس سنت کا عملی طور پر منکر ہے، یہ حضرات سحری کی اذان سے چڑ کھاتے ہیں اور اذان کی بجائے شرکیہ شعروشاعری سے کام چلاتے ہیں، جو کہ قبیح ترین بدعت ہے۔

ثانیاً۔ عقل کے ناخن لو اس حدیث میں اذان قبر کا کیا ثبوت ہے یہ تو زندوں کے لئے اذان کہی جاتی تھی مگر مفتی صاحب اسے مردوں کیلئے باور کراتے ہیں کیا مبتدعین کے نزدیک زندہ اور مردہ برابر ہیں، اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر اس حدیث سے مردوں کیلئے اذان ثابت کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے، مشکوۃ باب الاذان میں ہے کہ

اذا نودی للصلوۃ ادبر الشیطان له ضراط حتی لایسمع التأذین.

جب نماز کی اذان ہوتی ہے تو شیطان گوز لگاتا ہوا بھاگتا ہے یہاں تک کہ اذان نہیں سنتا۔

اور جس طرح کہ بوقت موت شیطانِ مرنے والے کو ورغلاتا ہے تاکہ ایمان چھین لے اسی طرح قبر میں بھی پہنچتا ہے اور بہکاتا ہے کہ تو مجھے خدا کہہ دے تاکہ میت اس آخری امتحان میں فیل ہو جاوے۔

چنانچہ نوادر الاصول میں امام محمد علی ترمذی فرماتے ہیں

ان المیت اذا سئل من ربک یریٰ له الشیطان فیشیر الیٰ نفسه انی انا ربک فلهذا ورد سوال التثبت له حین سئل.

یعنی جبکہ میت سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے تو شیطان اپنی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ میں تیرا رب ہوں اسی لئے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے میت کے سوالات کے وقت اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا فرمائی ہے۔

اب اذان کی برکت سے شیطان دفع ہوگیا میت کو امن مل گئی اور بہکانے والا گیا، جاء الباطل ص ۳۱۴ ج ۱۔

کیا شیطان کو بہکانے کے لئے اذان دی جاسکتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حدیث کے الفاظ ہمارے پیش نظر ہیں، اذا نودی للصلوۃ الخ یعنی جب نماز

کیلئے اذان کہی جاتی ہے تو شیطان ...... یہ نہیں فرمایا، اذا نودی للمیت، الخ یعنی جب میت کیلئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ شیطان کا بھاگنا فقط نماز کی اذان سے ہے نہ کہ میت کیلئے اذان کہنے سے شیطان بھاگتا ہے۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض مبتدعین کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ جب بھی اذان کہی جائے تو شیطان بھاگتا ہے (حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ حدیث میں عموم نہیں بلکہ خصوص ہے) تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ قبر میں شیطان مومن کو بہکاتا ہے اور اذان کہنے سے بھاگ جاتا ہے اور قبر میں شیطان کے بہکانے کی جو دلیل مفتی صاحب نے رقم فرمائی ہے وہ تو خود دلیل کی محتاج ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں بلکہ ایک تابعی کا قول ہے جس سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا، اس کیلئے تو نص قطعی اور حدیث صحیح درکار ہے جو خیر سے مبتدعین کے پاس قطعاً نہیں۔

شرعی اصول کا یہ تقاضا ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور اسی میں اغوائے شیطان کا خطرہ رہتا ہے، قبر تو دار الجزا کی ایک کڑی ہے جس میں اغوائے شیطان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں

ان القبر اول من منازل الآخرة، الحدیث عن عثمان رضی الله عنه.

یعنی قبر قیامت کی منازل سے پہلی منزل ہے، الحدیث، ترمذی مع تحفہ ص۲۵۸ ج ۳، وابن ماجہ ص ۳۲۵، ومستدرک حاکم ص۳۷۱ ج۱، وبیھقی ص۵۶ ج ۴، ومسند امام احمد ص۶۳ ج۱۔

تو کیا فریق ثانی قیامت کے روز بھی اغوائے شیطان کا قائل ہے۔

ثالثاً۔ نماز، روزہ، حج، زکواۃ، اور امر بالمعروف صدقہ وخیرات اور لوگوں سے حسن سلوک وغیرہ اعمال صالحہ سے قبر میں میت منکر نکیر سے محفوظ رہتی ہے اور بندے کے یہ اعمال اس کی حفاظت کرتے ہیں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب میت کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو وہ پلٹنے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے پھر اگر وہ مومن ہے تو نماز اس کے سر کے پاس آجاتی ہے اور روزے اس کی دائیں جانب اور زکواۃ بائیں جانب اور بقیہ نیکی کے کام صدقہ وخیرات (نفلی) نماز امر بالمعروف اور لوگوں سے احسان ومروت کیا ہوا اس کے پاؤں کی

طرف آجاتا ہے، پھر جب فرشتے اس کے سر کی طرف سے آتے ہیں تو نماز کہتی ہے کہ میری طرف سے تمہیں آنے کا راستہ نہیں،

پھر وہ اس کی دائیں طرف سے آتے ہیں تو روزے (انہیں روکتے ہیں) اور کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے تمہارے لئے کوئی راستہ نہیں، پھر وہ اس کی بائیں طرف سے آتے ہیں تو زکواۃ (منع کرتی ہے) اور کہتی ہے میری جانب سے تمھارے لئے راستہ نہیں، پھر وہ اس کے پاؤں کی طرف سے آتے ہیں تو اُس وقت اس کے اعمال صالحہ صدقات وغیرہ انہیں روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی راستہ نہیں۔ الحدیث۔

صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۳۱۰۳، ص۴۵ ج۶ طبع مکتبة الاثریه سانگله هل، و المعجم الاوسط للطبرانی ص۱۰۳ ج۳، و مستدرک حاکم ص۳۸۰ ج۱، و ابن ابی شیبه، و بیهقی، و ابن مردویه کذا فی در المنثور ص۸۰ ج۴.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ میت کے اعمال صالحہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ منکر ونکیر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے مگر مبتدعین کا باوا آدم ہی نرالا ہے وہ اس کے برعکس اغوائے شیطان کے قائل نظر آرہے ہیں، پھر اس پر یہ عمارت قائم کرلی ہے کہ شیطان کو دور کرنے کیلئے اذان دی جاتی ہے۔

رابعاً۔ شیطان مردود تو انسان کی زندگی کے ہر لمحہ ساتھ رہتا ہے، حدیث صحیح میں موجود ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں

قال رسول الله ﷺ مامنکم من احد الا وقد و کل به قرینه من الجن. الحدیث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک (بھی ایسا) نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا ہے۔

مسند احمد ص۴۶۰ ج۱، و ص۳۸۵ ج۱، و ص۴۰۱ ج۱، و صحیح مسلم ص۳۷۶ ج۲، و نصب الرایة ص۴۳۴ ج۱.

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنھا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم. الحدیث.

یعنی شیطان انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے،

بخاری ص۲۷۳ ج۱، ومسلم ص۲۱۶ ج۲۔

یہ حدیث اس چیز کی برہان قاطع ہے کہ انسان کے ساتھ ہر وقت شیطان لعین رہتا ہے جو اسے برائی پر انگیختہ کرتا ہے۔

تو کیا فریق ثانی شیطان کو دور کرنے کیلئے ہر دم اذان کہنے کیلئے تیار ہے، علاوہ ازیں احادیث صحیحہ سے کئی مقامات پر بالخصوص شیطان لعین کا آنا ثابت ہوتا ہے جس کی امثلہ حسب ذیل ہیں

(۱) ان رسول الله ﷺ قال یعقد الشیطان علی قافیة راس احد کم اذا هو نام ثلث عقد. الحدیث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے سر کی گدی پر شیطان مردود تین گرہیں لگاتا ہے، جب وہ سوتا ہے۔

بخاری ص۱۵۳ ج۱، و مسلم ص۲۶۵ ج۱، و ابوداود، رقم الحدیث ۱۳۰۶، و ابن ماجه رقم ۱۳۲۹، و صحیح ابن خزیمه رقم ۱۱۳۱، و مسند حمیدی رقم ۹۶۰، و مسند احمد ص۲۴۳ ج۲، و بیهقی ص۵۰ ج۲، وغیره.

بلکہ اس سے بڑھکر ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ سے سوال ہوا کہ ایک ایسا شخص جو ساری رات سویا اور سورج طلوع ہونے کے بعد بیدار ہوا اور نماز نہ پڑھ سکا، فرمایا

بال الشیطان فی اذنه، اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا تھا۔ بخاری ص۱۵۳ ج۱، ومسلم ص۲۶۴ ج۱، ومسند احمد ص۲۶۰ ج۲۔

کیا فرماتے ہیں مبتدعین کے مفتیان کرام کہ کبھی انہوں نے یہاں بھی اذان کہنے کو مستحب یا پھر سنت کہا ہے؟ اور کبھی اس پر عمل کیا ہے کہ مولوی پیر مفتی اعظم حکیم الامت، تو بستر پر استراحت فرمانے لگے ہوں اور باوفا مرید اور شاگرد اذان دیکر شیطان کو بھگانے کی فکر میں ہوں، کہ کہیں ہمارے شیخ کی گدی پر شیطان گرہ و گانٹھ نہ لگا دے بلکہ عزت مآب کے کان میں پیشاب نہ کر دے۔

اگر مبتدعین ایسا کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں! تو وجہ فرق بیان کیجئے؟۔

(۲) اب مبتدعین کے مولوی صاحب پیر صاحب مفتی اعظم وغیرہ صاحب بیدار ہوکر مسجد کی طرف چلے جارہے ہیں صبح کے وقت عموماً قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی ہے، اب بالفرض وہ قضائے حاجت کیلئے جاتے ہیں، تو اب بھی اذان کی ضرورت پیش آئیگی، کیونکہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان هذه الحشوش محتضرة

یعنی قضائے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود رہتے ہیں۔الحدیث

ابوداود مع عون ص۶ ج۱، و ابن ماجه ص۲۶، و مسند احمد ص۳۶۹ ج۴، و بيهقی ص۹۶ ج۱، و مستدرک حاکم ص۱۸۷ ج۱، و ابن خزيمة رقم۶۹، و مصنف ابن ابی شيبة ص۱۱و، ۴۵۳ ج۱، و طبرانی کبير ص۲۳۲ ج۵.

یہی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، المعجم الاوسط للطبرانی ص۳۸۲ ج۳، و ص۳۶۰ ج۷۔

مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں اور اس کا پوتا شاگرد مولوی و مفتی احمد یار خاں نے کبھی اسے بھی مستحب و مباح قرار دیا تھا؟ اور اس پر کبھی انہوں نے عمل بھی کرایا تھا کہ خود تو قضائے حاجت میں مصروف ہوں اور چیلے ان سے شیطان بھگانے کی نیت سے اذان کہہ رہے ہوں، اگر نہیں قطعاً نہیں، تو وجہ فرق بیان کیجئے۔؟

(۳) مبتدعین کے اکابرین جب وضو سے فارغ ہوکر مسجد کی طرف آئیں گے راستہ میں اذان کہنی پڑے گی کیونکہ نماز ادا کرنے کیلئے جانا ایک عظیم الشان اسلامی فرض کو ادا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا شمار بہترین اعمال صالحہ میں ہوتا ہے اور نیک کام سے روکنا اور جاتی دفعہ وسواس ڈالنا شیطان کا مشغلہ ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے کہ حضرت سبرۃ بن ابی فاکہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

سمعت رسول الله ﷺ يقول ان الشيطان قعد لابن آدم باطرقه.

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابن آدم کیلئے (نیکی کے) راستوں پر شیطان (بھکانے کیلئے) بیٹھتا ہے۔الحدیث

سنن نسائی ص۵۰ ج۲، ومسند احمد ص۴۸۳ ج۳، وطبرانی کبیر ص۱۳۸ ج۷، ومصنف ابن ابی شیبہ ص۲۹۳ ج۵، وتاریخ کبیر للبخاری ص۱۷۸ ج۴، وکنز العمال رقم ۱۰۵۶۹۔

(۴) جب نماز کیلئے اقامت ہوجائے گی تو مبتدعین کے اکابرین حسب عادت صف بندی کرتے ہوئے درمیان میں بالشت بھر جگہ چھوڑ چھوڑ کر کھڑے ہونگے، اور ان مقامات پر مبتدعین کے اکابرین کے درمیان پہلو بہ پہلو شیطان بھی کھڑا ہوجائے گا کیونکہ ایسے مقامات پر آنے کی صراحت امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ نے دی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ رصوا صفو فکم وقار بوا بینھا وحاذوا بالا عناق فوالذی نفسی بیدہ انی لاری الشیطان یدخل من خلل الصف کانھا الحذف.

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی صفوں کو ملا کر رکھو اور نزدیکی کرو صفوں کے درمیان اور برابر رکھو گردنیں مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بیشک میں دیکھتا ہوں شیطان کو کہ داخل ہوتا ہے صفوں کے شگافوں میں، گویا کہ وہ سیاہ بچہ ہے، بکری کا۔

سنن ابی داود مع عون ص ۲۵۱ ج ۱ و نسائی (مجتبیٰ) ص۹۳ ج ۱، و صحیح ابن خزیمۃ ص ۲۲ ج۳، و بیھقی ص ۳۰۰ ج۳.

یہاں شیطان کو دور کرنے کیلئے مبتدعین کو اذان کہنی پڑھے گی اور اذان کہنے کیلئے ایک شخص کو مقرر کرنا پڑے گا۔

(۵) پھر عین ممکن ہے کہ صبح کی نماز ہو اور مقتدیوں میں سے کسی ایک کو انگڑائی آجائے اور وہ منہ کھول کر جمائی لے اور منہ پر ہاتھ رکھنا بھول جائے، تو اب بھی اذان کہنی پڑے گی کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ تب شیطان منہ میں داخل ہوجاتا ہے چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ اذا تثاؤب احدکم فی الصلوۃ فلیکظم ما استطاع فان

الشیطان یدخل.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کو نماز میں جمائی آئے تو وہ اسے حتی المقدور روکے کیونکہ شیطان (منہ میں) داخل ہوجاتا ہے۔ صحیح مسلم ص۴۱۳ ج۲، و بیہقی ص۲۹۸ ج۲۔

نماز میں جمائی کا آنا شیطان کے آنے کی علامت ہے لہذا مبتدعین کو نماز (منفرداً) میں عموماً اور جماعت کے وقت خصوصاً ایک موذن مقرر کرنا چاہئے کہ جونہی کسی نمازی کو جمائی آئے تو وہ شیطان کو بھگانے کیلئے اذان کہنی شروع کردے۔

اگر علماء بریلویہ اس پر عمل کرتے ہیں تو بہت خوب! اگر نہیں کرتے تو وجہ فرق بیان کریں۔

(۶) اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے صبح کی نماز جمعۃ المبارک کے روز کی ہو، اور پیش امام مسنون قرات کرتے ہوئے سورۃ السجدہ، کی تلاوت کرے اور سجدہ تلاوت پر آکر سجدہ تلاوت بھی کرے، تو اب بھی مبتدعین کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ سجدہ تلاوت سے قبل شیطان کا موجود ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اذا قرأ ابن آدم السجدة فسجد اعتزل الشيطان يبكي يقول ياويلتى امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة وا مرت بالسجود فابيت فلي النار.

یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب آدم کا بیٹا سجدہ کی آیت کو پڑھکر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس کہ ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا، اس نے سجدہ کیا تو اس کیلئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا، تو میں نے انکار کر دیا اور میرے لئے جہنم۔ مشکوٰۃ ص۸۴، و صحیح مسلم ص۶۱ ج۱، و ابن ماجہ (رقم الحدیث۱۰۵۲)، و مسند احمد ص۴۴۰ ج۲، و بیہقی ص۳۱۲ ج۲، و ابن خزیمہ رقم ۵۴۹۔

(۷) عین ممکن ہے کہ نماز پڑھتے پڑھتے کوئی مسائل سے ناواقف مقتدی حالت نماز میں التفات (ادھر ادھر دیکھنا) کرلے، تب بھی مبتدعین کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ التفات شیطان

کی طرف سے ہے۔

چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

سالت رسول اللہ ﷺ عن الا لتفات فی الصلوٰۃ فقال ھو اختلاس یختلسه الشیطان من صلاۃ العبد.

یعنی رسول اللہ ﷺ سے میں نے نماز میں التفات کے متعلق سوال کیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا التفات اچکنا ہے شیطان کی طرف سے بندے کی نماز سے۔ بخاری ص۱۰۴ج۱، ونسائی ص۱۴۰ج۱، وابوداؤد مع عون ص۳۴۲ج۱، ومسند احمد ص۷۰ج۶۔

(۸) کبھی کبھار ایسا بھی ممکن ہے کہ مبتدعین کا موذن ابھی مذکورہ اذان سے فارغ ہوا ہو، تو ادھر کیا دیکھتا ہے کہ اسی شخص نے لمبے لمبے سر پر بال رکھے ہوئے ہیں مگر سنت کے برعکس بالوں کو باندھ رکھا ہے، تو موذن کو اذان کہنی پڑے گی کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نماز کی حالت میں باندھے ہوئے بالوں پر شیطان بیٹھتا ہے چنانچہ حضرت ابو رافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ راوی ہیں کہ

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ذلک کفل الشیطان .الحدیث

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ یہ شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ابو داود مع عون ص۲۴۶ج۱، وترمذی مع تحفہ ص۲۹۸ج۱، وفتح الباری ص۱۳۸ج۲۔

(۹) اس اذان سے موذن فارغ ہی ہوا، تو فرض کیجئے کوئی دیوانہ نمازیوں کے آگے سے گزرے تو اب بھی اذان کی ضرورت پیش آئے گی کیونکہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ نمازیوں کے آگے سے گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

فانه معه القرین، یعنی آگے سے گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہے،

صحیح مسلم ص۱۹۷ج۱، وابن خزیمہ ص۱۷ج۲۔الحدیث

(۱۰) مذکورہ اذان کہہ کر موذن ایک لمحہ بھر کیلئے ٹھہرا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ پیش امام تشہد بیٹھ چکا ہے اور وہ بمع مقتدیوں کے انگلی سے اشارہ (یعنی رفع سبابہ) کررہا ہے تو اب بھی مبتدعین کو

اذان کی ضرورت پیش آئے گی، کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ

لھی اشد علی الشیطان من الحدید .

یعنی یہ شیطان پر لوہے کے (ہتھوڑے) سے زیادہ سخت ہے،

مسند امام احمد ص۱۱۹ ج۲، ومجمع الزوائد ص۱۴۳ ج۲، وبیھقی ۱۳۲ ج۲۔

گو اس روایت کی سند میں کلام ہے مگر حسن درجہ سے کم نہیں، بلکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس سے شیطان زخمی ہوتا ہے، مسند ابو یعلی بحوالہ نماز نبوی ص۱۶۶ مولفہ علامہ البانی رحمۃ اللہ۔

اس حدیث سے رفع سبابہ کے وقت شیطان کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اسے دور کرنے کیلئے مبتدعین کو اذان کہنے کی ضرورت ہے

تلک عشرۃ کاملۃ

یہ دس مقامات ایسے ہیں کہ اگر مبتدعین مفتی صاحب کے نسخہ پر عمل کریں تو جمعۃ المبارک کی صبح کی نماز سے فارغ ہونے تک دس بار انہیں اذان کہنی پڑھے گی، اگر وہ اس پر عمل کرتے ہیں تو مبارک ہو، اگر نہیں کرتے اور یقیناً نہیں کرتے! تو اس کی وجہ کیا ہے؟ بینوا وتوجروا۔

اذان قبر کے متعلق مفتی صاحب کے بیان کردہ جملہ فوائد سے کہیں بڑھ کر بندہ ناچیز ان دس اذانوں کے فوائد بیان کرسکتا ہے۔

اگر مبتدعین کہیں کہ یہ عمل بدعت ہونے کی وجہ سے سنت خیر الانام کے مخالف ہے، تو یہی ہم اذان قبر کے متعلق کہتے ہیں چونکہ یہ سنت سے ثابت نہیں لہذا بدعت ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

تیسرے یہ کہ اذان دل کی وحشت کو دور کرتی ہے ابونعیم اور ابن عساکر نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے

نزل آدم بالھند واستوحش فنزل جبریل فنادی بالاذان.

حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں اترے اور ان کو سخت وحشت ہوئی پھر جبریل آئے اور

اذان دی۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں مدارج النبوت کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اور میت بھی اس وقت عزیز و اقارب سے چھوٹ کر تیرہ و تاریک مکان (قبر) میں اکیلا پہنچتا ہے، سخت وحشت ہے اور وحشت میں حواس باختہ ہو کر امتحان میں ناکامی کا خطرہ ہے، اذان سے دل کو اطمینان ہوگا جوابات درست دے گا۔ جاء الباطل ص۳۱۴ ج۱۔

کیا قبر میں میت پر وحشت آتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سلسلہ سند میں ایک راوی محمد بن عبد اللہ بن سلیمان کوفی ہے، ابن عساکر بحوالہ سلسلہ آلاحادیث الضعیفہ ص۳۹۶ ج۱۔

اسے امام ابن مندہؒ نے مجہول کہا ہے میزان ص۶۰۲ ج ۳، اس کی عدالت و ثقاہت بیان کرنی فریق ثانی پر آج تک ادھار ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے روایت کا پورا متن درج نہیں کیا کیونکہ آخری الفاظ مفتی صاحب کے بدعی مسلک کے خلاف تھے، چنانچہ آخری الفاظ ہیں جب جبریل علیہ السلام اذان کہہ چکے تو

قال آدم من محمد؟ قال آخر ولدک من الانبیاء.

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا محمد (ﷺ) کون ہیں؟ تو جبریل علیہ السلام نے کہا تیری اولاد سے آخری نبی۔ الضعیفہ ص۳۹۶ ج۱۔ و کنز العمال ص۲۰۶ ج ۱۱ (۳۲۱۳۶)

ان الفاظ کا یہ تقاضا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر نازل ہوئے تب تک رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے ناواقف تھے، جب کہ مبتدعین کا یہ موقف ہے کہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم سے خطاء ہوگئی تو انہوں نے کہا اے میرے رب میں تجھ سے بہ حق محمد (ﷺ) سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے الخ۔

شرح صحیح مسلم ص۵۹ ج ۷، للمولوی غلام رسول سعیدی بریلوی۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مبتدعین کے نزدیک زمین پر نزول سے قبل حضرت آدم علیہ

السلام رسول اللہ ﷺ کو جانتے تھے، مگر روایت مذکورہ میں اس موقف کی تردید ہوتی ہے

افسوس کہ مفتی صاحب نے متن روایت میں تصرف کر کے مخالف ٹکرے کو ہضم کر دیا ہے، مزید افسوس یہ کہ کوئی ایسا لفظ ''الحدیث'' وغیرہ بھی تحریر نہیں کیا جس سے قاری یہ معلوم کر لے کہ مفتی صاحب نے روایت کا مکمل متن درج نہیں کیا۔

بلکہ انہوں نے اسے فل متن باور کرانے کی کوشش کی ہے، جو کہ علمی طور پر بدترین فعل ہے لیکن اس طرح کی عیاریوں کے باوجود احمد یار صاحب کو مبتدعین حکیم الامت وغیرہ القاب سے نوازتے ہیں۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب بدعات کی ترویج و اشاعت کیلئے ایسی ایسی تاویلیں گھڑتے تھے جنہیں عوام الناس دلائل سمجھ لیتے ہیں، ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ مومن پر قبر میں سخت وحشت طاری ہوتی ہے۔

ہمیں تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر دلاسا دیا ہے کہ .

عن ابی هريره رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال ان الميت يصير الى القبر فيجلس الرجل الصالح فی قبره غير فزع ولا مشغوف الحديث.

یعنی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا

جب مردہ قبر میں جاتا ہے تو جو شخص بھی نیک ہوتا ہے اسے قبر میں بٹھایا جاتا ہے اس پر نہ وحشت ہوتی ہے نہ دل پریشان، الحدیث، سنن ابن ماجہ ص ۳۲۵۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے، اس حدیث کا یہ مفاد ہے کہ نیک شخص پر وفات کے بعد قبر میں خوف و ہراس نہیں ہوتا، اس کی تائید حسب ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

عن ابی سعيد الخدری قال كان النبی ﷺ يقول اذا وضعت الجنازة واحتملها الرجال علی اعنا قهم فان كانت صالحة قالت قدمونی، وان كانت غير صالحة قالت لا هلها ياويلها اين تذهبون بها يسمع صوتها كل شئی الا الانسان ولو سمع الا نسان لصعق.

یعنی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے، جب جنازہ

تیار کیا جاتا ہے اور لوگ اپنی گردنوں پر اسے اٹھاتے ہیں، اگر نیک ہوتا ہے تو کہتا ہے مجھے جلدی لے چلو (قبر میں) اگر نیک نہیں ہوتا تو اپنے لوگوں کو کہتا ہے ہائے افسوس تم مجھے کہاں لے چلے ہو، اس کی آواز انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے، اگر انسان سن لے تو بے ہوش ہو جائے۔ صحیح بخاری ص۱۷۶ ج۱، ومسند احمد ص۵۸ ج۳، وبیہقی ص۲۱ ج۴، ونسائی ص۲۱۹ ج۱۔

یہ احادیث اس بات کی برہان قاطع ہیں کہ مرد صالح وفات کے بعد خوف و ہراس میں مبتلا نہیں ہوتا، مگر مفتی صاحب اس کے برعکس یہ دعوی کرتے ہیں کہ میت پر خوف چھا جاتا ہے۔

اب مسلمان دیکھ لیں کہ انہوں نے سید العرب والعجم امام الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی بات پر اعتبار کرنا ہے یا مفتی احمد یار صاحب پر۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

معلوم ہوا کہ مرد مومن پر مرنے کے بعد خوف آتا ہی نہیں، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ خوف کو دور کرنے کیلئے اذان کہنی چاہئے، مردود و باطل ہے۔

کیا حضرت آدم علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے وسیلہ سے دعا کی تھی؟

اوپر، ثانیاً کے تحت راقم نے جو مولوی غلام رسول سعیدی صاحب بریلوی کی کتاب، شرح صحیح مسلم، کے حوالے سے روایت فاروقی درج کی ہے، وہ محض الزامی طور پر نقل کر دی گئی ہے، ورنہ وہ روایت سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند کا دار و مدار، عبد الرحمان بن زید بن اسلم، راوی پر ہے۔

المعجم الاوسط للطبرانی ص۲۵۹ ج۷ رقم ۶۴۹۸، و مستدرک حاکم ص۶۱۵ ج۲، و دلائل النبوۃ ص۴۸۹ ج۵.

اس کے متعلق محدثین کا فیصلہ کچھ اس طرح ہے، امام احمد فرماتے ہیں اس کی حدیث منکر اور یہ خود ضعیف ہے، امام ابن معین فرماتے ہیں کہ اس کی مرویات ہیچ محض ہیں، امام علی بن مدینی نے اسے سخت ضعیف کہا ہے، امام ابوداود کا فیصلہ ہے کہ زید کی کل اولاد ضعیف ہے، امام نسائی اور ابو زرعہ اسے ضعیف کہتے ہیں، امام ابو حاتم کہتے ہیں حدیث میں پختہ نہیں اور اس کی مرویات واہی ہیں، امام ابن حبان کا کہنا ہے اخبار کو بے علمی کی وجہ سے الٹ پلٹ کردیتا تھا مرسل کو مرفوع اور موقوف کو مسند بنا دیتا تھا، امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ سخت ضعیف ہے، امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اہل علم اسکے خراب حافظے کی وجہ سے احتجاج نہیں کرتے، امام ساجی فرماتے ہیں منکر الحدیث ہے، امام طحاوی حنفی کا کہنا ہے حدیث کا علم رکھنے والوں کے ہاں یہ نہایت درجہ کا ضعیف ہے، امام جوز جانی کہتے ہیں زید کی پوری اولاد ہی ضعیف ہے، امام حاکم اور امام ابونعیم فرماتے ہیں کہ اپنے باپ سے موضوع (من گھڑت) روایات روایت کرتا ہے، امام ابن جوزی فرماتے ہیں کہ اس کے ضعف پر محدثین کرام متفق ہیں۔ تھذیب ص۱۶۲ ج۶۔

الغرض یہ متہم با لوضع ہے، علامہ ذھبی نے اس روایت کو باطل قرار دیا ہے، میزان ص۵۰۴ ج۲۔

یہی بات حافظ ابن حجر نے کہی ہے، لسان المیزان ص۳۶۰ ج۳۔

امام حاکم (صاحب المستدرک) فرماتے ہیں

روی عن ابیه احادیث موضوعة لا یخفی علی من تأملها من أهل الصنعة ان الحمل فیها علیه.

یعنی عبد الرحمٰن اپنے باپ سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے چنانچہ اہل صنعت میں سے جو غور کرے اس پر یہ بات مخفی نہ رہے گی کہ اس سند میں دارومدار اس پر ہے۔

المدخل الی الصحیح ص ۱۵۴ رقم الترجمة ۹۷) طبع مؤسسةالرسالة.

الغرض یہ روایت عبد الرحمٰن کے ضعیف اور متہم بالوضع ہونے کی وجہ سے باطل وموضوع ہے، مزید تفصیل کیلئے علامہ البانی رحمۃ اللہ کی تالیف التوسل ص۱۱۶، کا مطالعہ کریں۔

ہمارے معاصر مولانا غلام رسول سعیدی صاحب کا یہ لکھنا کہ یہ روایت گوضعیف ہے مگر فضائل

میں ضعیف معتبر ہوتی ہے، شرح مسلم ص۵۹ ج۷، غلط ہے جس کی ضروری تفصیل، دین الحق ص۵۳ ج۱، میں کردی گئی۔

علاوہ ازیں اس روایت کا تعلق عقائد سے ہے اور عقائد میں ضعیف حدیث بالاتفاق قابل حجت نہیں، واضح رہے کہ سعیدی صاحب کا اسے فضائل کے بارے باور کرانا غلط بیانی ہے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مسند فردوس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رانی النبی ﷺ حزیناً، فقال یا ابن ابی طالب انی اراک حزیناً فمر بعض اھلک یؤذن فی اذنک فانه دواء الھم.

مجھ کو حضور علیہ السلام نے رنجیدہ دیکھا تو فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ تم کو رنجیدہ پاتا ہوں تم کسی کو حکم دو کہ تمھارے کان میں اذان دے کیونکہ اذان غم کو دور کرنے والی ہے۔ جاء الباطل ص۳۱۴ ج۱۔

کیا مردے کے غم کو دور کرنے کے لئے اذان کہی جا سکتی ہے؟

اولاً۔ یہ روایت من گھڑت اور باطل ہے، کنز العمال، میں اسے، مسند فردوس سے نقل کرتے ہوئے جو سند درج کی گئی ہے۔ وہ منقطع ہے، اس کے بعد انہوں نے علامہ جذری کی کتاب، اسنی المطالب، سے ایک دوسری سند بھی نقل کی ہے، گو جذری کی سند میں وہ انقطاع نہیں جو مسند فردوس کی ایک سند میں ہے، لیکن جذری اور، مسند فردوس کی دوسری سند کے علاوہ بھی متعدد ایسے راوی ہیں جو دجال وکذاب اور خبیث العقیدہ ہونے کے علاوہ وضع احادیث میں معروف ہیں، چنانچہ اس کی سند میں پہلا راوی، ابوعبدالرحمٰن محمد حسین السلمی ہے، کنز العمال ص ۲۷۸ ج۲ طبع نشر السنہ ملتان، و اسنی المطالب فی مناقب سیدنا علی بن ابی طلب ص۹۳ طبع مکتبہ الامام امیر المؤمنین، اصفھان، ایران، سلمی کے ہم وطن امام محمد بن یوسف قطان نیساپوری فرماتے ہیں، یہ صوفیاء کے لئے احادیث وضع (گھڑا) کرتا تھا، میزان (ص۵۲۳ ج۳ وتاریخ بغداد ص۲۴۳ ج۲، علامہ ذھبی فرماتے ہیں کہ

اسکی کتب میں من گھڑت احادیث و حکایات ہیں اور ائمہ نے اسے زندیق اور باطنی قرار دیا ہے، تھذیب سیر اعلام النبلاء ص ۲۷۴ ج ۲ طبع موسسۃ الرسالۃ ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء۔

سلمی نے یہ روایت عبداللہ بن موسیٰ سلمی سے روایت کی ہے اور یہ بھی کذاب ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے، میزان الاعتدال ص ۵۰۹ ج ۲،

الغرض یہ روایت من گھڑت اور موضوع ہے، ہمارے شیخ نے اپنی ایک تحریر میں اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔

ثانیاً۔ روایت کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں کہ

فمر بعض اهلک یوذن فی اذنک فانه دواء للهم.

یعنی گھر والوں میں سے کسی ایک کو کہئے، جو آپ کے کان میں اذان دے کیونکہ یہ اس (غم) کیلئے دوا ہے، کنز العمال ص ۶۵۷ ج ۲ رقم ۵۰۰۰، طبع موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۹ھ۔ و اُسنی المطالب ص ۹۳۔

تو کیا فریق ثانی مردے کو دفن کرنے کے بعد اس کے کان میں اذان کہتا ہے، اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر یہ آپ کی دلیل کیسے بن گئی، جس کے ایک حصے پر جناب کا خود بھی عمل نہیں۔

ثالثاً۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ مردے تھے کہ ان کے حزن کو دور کرنے کیلئے، اذان کا حکم دیا تھا، نہیں قطعاً نہیں، تو پھر اس سے مردے کیلئے اذان کیسے ثابت ہوئی اور وہ بھی دفن میت کے بعد۔

رابعاً۔ پہلے صحیح احادیث سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ مومن وفات کے بعد خوف و ہراس میں مبتلا نہیں ہوتا، مومن کو مرنے کے بعد ہراساں تسلیم کرنا نص قرآنی کے خلاف ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملئکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون☆ ٠حم السجدة)

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر وہ اسی پر جم گئے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور جس بہشت کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا آج اس کی خوشی مناؤ۔ (ثنائی) ۴۱-۳۰۔

اس فرمان ربانی کے برعکس مفتی صاحب ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ مومن کو مرنے کے بعد خوف و ہراس اور وحشت گھیر لیتی ہے۔

افسوس مفتی صاحب بدعت کے جواز کیلئے پہلے تو اسلامی تعلیم کو مسخ کرتے ہیں پھر اس پر بدعت کی بنیاد رکھتے ہیں۔

خامساً۔ روایت مذکورہ سنت نبی ﷺ کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک حسن حدیث میں ہے کہ حضرت ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ دعوات المکروب اللهم رحمتک ارجو فلا تکلنی الی نفسی طرفة عین واصلح لی شانی کله لا اله الا انت.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غمگین یہ دعا پڑھے، الٰہی میں آپ کی رحمت کا امیدوار ہوں مجھے ایک لحظے کیلئے بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر (یعنی اپنی دست گیری کا ہاتھ میرے سر سے نہ اٹھا) اور میری حالت بالکل درست کردے کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔

سنن ابو داود مع عون ص۴۸۵ ج۴، و مسند احمد ص۴۲ ج۵، و ادب المفرد للبخاری ص۱۸۲ رقم ۷۰۱، و السنن الکبری للنسائی ص۱۶۷ ج۶، و ابن حبان ص۱۰۴ ج۳، رقم الحدیث ۹۶۶، و مصنف ابن ابی شیبه ص۱۹۶ ج۱۰، و فتح الباری ص۱۲۳ ج۱۱.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کان النبی ﷺ یدعو عند الکرب لا اله الا الله العظیم الحلیم لا اله الا الله رب السموات والارض و رب العرش العظیم.

یعنی نبی کریم ﷺ جب غمگین ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے

لا اله الا الله العظیم الحلیم لا اله الا الله رب السموات والارض و رب العرش العظیم.

کوئی الہ نہیں مگر وہی جو عظیم وحلیم ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی الہ نہیں جو زمین و آسمان اور عرش عظیم کا رب ہے،

بخاری ص ۹۳۹ ج۲،و مسلم ص ۳۵۱ ج۲، و مسند احمد ص۲۲۸ ج۱،

و ۲۵۹، ۲۸۰، ۲۸۴، ۳۳۹.

یہ احادیث صحیحہ اس بات کی واضح برہان ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رنجیدہ و اداس ہوتے تو اپنے غمگسار پروردگار کو پکار کر مذکورہ دعا کرتے تھے، مگر مبتدعین کا مفتی مغموم کو اذان کا درس دے رہا ہے، ظاہر ہے کہ اگر مغموم غم کو دور کرنے کیلئے اذان کہے گا تو وہ مذکورہ سنت مصطفوی کو مٹانے کی جسارت کرے گا، اور جو عمل سنت کو مٹائے وہ مبتدعین کے نزدیک بھی قبیح ترین بدعت میں شمار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

اذان کی برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے، ابو یعلی نے ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

یطفؤا الحریق بالتکبیر واذا رءیتم الحریق فکبروا فانه یطفی النار.

لگی ہوئی آگ کو تکبیر سے بجھاؤ اور جب کہ تم آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو کیونکہ یہ آگ کو بجھاتی ہے۔

وجہ استدلال میں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں

اذان میں تکبیر تو ہے، اللہ اکبر، لہذا اگر قبر میت میں آگ لگی ہو تو امید ہے کہ خدائے پاک اسکی برکت سے بجھادے، جاء الباطل ص ۳۱۴ ج ۱۔

کیا اذان دینے سے قبر کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کیا مبتدعین سچ مچ اپنے مردوں کو آگ لگی دیکھ کر اذان کہتے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر انہیں اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنی چاہئیے، ہم انہیں توحید کو اپنانے، سنت کی پیروی اور ترک بدعات کی دعوت دیتے ہیں کہ بدعی راستہ کو چھوڑ کر اس پر چل پڑیں کہ کل قبر میں بفضلہ تعالی آگ قطعاً نہیں لگے گی انشاء اللہ۔

واضح رہے کہ مذکورہ روایت مبتدعین کی دلیل (اور وہ بھی ادھوری) تب ہی بن سکتی ہے، جب یہ قبر میں میت کو جلتے دیکھ لیں، کیونکہ متن روایت کا تو خود مفتی صاحب نے یہ معنی کیا ہے کہ آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو الخ

ثانیاً۔ روایت مذکورہ ابو یعلی میں ہمیں تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی، ہاں، المعجم الاوسط للطبرانی، میں یہ روایت موجود ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، اطفؤا الحریق بالتکبیر۔

یعنی آگ تکبیر کے ساتھ بجھاؤ، طبرانی اوسط ص ۲۵۹ ج ۹، و مجمع الزوائد ص ۱۴۱ ج ۱۰۔

معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے کس رسالہ سے مذکورہ روایت کو نقل کیا ہے کہ نہ الفاظ درست ہیں اور نہ حوالا صحیح ہے،

ان الفاظ کا مقصود فقط اس قدر ہے کہ مومن کی زندگی میں اسلامی تعلیم کی جھلک نظر آئے اور وہ کام کی ابتدا اللہ رب العزت کے بابرکت نام سے کرے، جیسے نماز کی ابتدا میں بھی تکبیر کہی جاتی ہے، کسی بلند مقام پر چڑھتے وقت تکبیر کہنا مسنون ہے، اسی طرح مذکورہ روایت میں آگ بجھاتے وقت تکبیر کہنے کا ذکر ہے، نہ کہ جب آگ لگ جائے تو اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر تکبیر کہنے کا حکم ہے تا کہ اس تکبیر کی برکت سے آگ بجھ جائے۔

اگر مبتدعین اس روایت کا یہی مفہوم لیتے ہیں تو انہیں حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ فائر بریگیڈ ختم کردو! کیونکہ اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں سستا وارزاں ایک حکمی نسخہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے، جب کہیں آگ لگ جائے تو اسے تکبیر کہہ کر ختم کیا جاسکتا ہے، گویا کم خرچ بالانشین، والا معاملہ ہوگا، یوں جہاں ملکی دولت کروڑوں کی ضائع ہونے سے بچ جائے گی، وہاں بچارے عوام کا بھی خوب بھلا ہوگا کہ، فائر بریگیڈ، کو خطیر رقم دینے کی بجائے فقط، اللہ اکبر، کہنے سے کارخانہ وغیرہ میں لگی آگ بجھ جائے گی۔

اگر مبتدعین ایسا مطالبہ نہ کریں، تو ثابت ہوگا کہ انہیں خود بھی مفتی جی کے بیان کردہ معنی و مفہوم پر اعتماد نہیں، بلکہ انہوں نے عوام کی دل لگی اور بدعت کے جواز کیلئے حدیث کو بگاڑا تھا۔

ثالثاً۔ روایت میں تو تکبیر کا بیان ہے، مگر مفتی صاحب اس سے اذان کا ثبوت دے رہے ہیں، حالانکہ اذان اور تکبیر ایک چیز قطعاً نہیں، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ، اذان میں تکبیر تو ہے، اللہ اکبر، جاء الباطل ص ۳۱۴۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مبتدعین میں یہ شخص حکیم الامت وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے مگر بیچارے کی علمی لیاقت اس قدر ہے کہ جزو سے کل ثابت کر رہا ہے، ہم ارباب عقل وخرد کو

دعوت فکر دیتے ہیں کہ فیصلہ کریں کہ اس فلسفہ اور سائنس کے دور میں ایک نام نہاد مفسر قرآن، حکیم الامت، مفتی اعظم، کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ جزو ہونے سے کل ہونا لازم آتا ہے، اللہ اکبر، جس کا مطلب یہ ہوا کہ، تکبیر، کو پوری نماز، وضو کے ایک جزو مثلاً ہاتھ دھونے کو مکمل وضو کہا جائے، ایک اینٹ کو پورا مکان کہنا بھی درست ہوگا، کھانے کے اجزا میں سے ایک جزو نمک بھی ہے تو نمک کو کھانا کہنا بھی درست ہوگا، نمک کو پلاؤ اور پلاؤ کو نمک کہا جائے تو کوئی غلطی نہ ہوگی، ناخن انسان کا ایک جزو ہے لہذا انگلی کے ناخن کو انسان قرار دینا جائز ہے، ایک رسی کو چارپائی بھی کہا جاسکتا ہے، میخ کو کواڑ بھی، کیا خوب، مفتی ہوں تو ایسے جو سب کو ہی بدل ڈالیں۔

رابعاً۔ روایت مذکورہ جہاں مفتی صاحب کی عدم دلیل ہے، وہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ سند میں ابن عجلان ہے، طبرانی اوسط ص ۲۵۹ ج ۹۔

اس کے بارے میں محدثین کرام کا فیصلہ ہے کہ اس پر حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات مختلط ہوگئیں تھیں، تھذیب ص ۳۴۲ ج ۹، وتقریب ص ۲۲۸۔

اسکے نیچے، نوح مطوعی، اور اس کا بیٹا ایوب مجھول ہیں، علامہ ھیثمی کا کہنا ہے اس میں کئی ایسے راوی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا، مجمع الزوائد ص ۱۴۱ ج ۱۰۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

امام احمد وطبرانی وبیھقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کے دفن کا واقعہ نقل کر کے روایت کی ہے

سبح النبی ﷺ ثم کبر و کبر الناس قالوا یا رسول اللہ لم سبحت قال لقد تضائق علی ھذا الرجل الصالح قبرہ حتی فرج اللہ تعالی عنہ.

بعد دفن حضور علیہ السلام نے، سبحان اللہ، فرمایا پھر، اللہ اکبر، حضور علیہ السلام نے فرمایا اور دیگر حضرات نے بھی! لوگوں نے عرض کی کہ یا حبیب اللہ تسبیح و تکبیر کیوں پڑھی ارشاد فرمایا کہ اس صالح بندے پر قبر تنگ ہوگئی تھی، اللہ نے قبر کو کشادہ فرمایا۔

اس کی شرح میں علامہ طیبی فرماتے ہیں یعنی ہم اور تمام لوگ تسبیح و تکبیر کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے قبر کو کشادہ فرمایا۔ جاء الباطل ص ۳۱۴ ج ۱۔

کیا واقعہ سعدؓ سے اذان قبر ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ کہاں تسبیح و تکبیر اور کہاں اذان قبر، ان کا کوئی تعلق ہی سرے سے نہیں، کیونکہ تسبیح اور تکبیر سے مراد کبھی بھی اذان نہیں لی جاتی، اگر مفتی صاحب کی اصلاح میں تکبیر اور تسبیح کا معنی اذان ہے تو پھر اس حدیث کا کیا معنی ہوگا کہ جو شخص نماز کے بعد تیس بار اللہ اکبر، انتیس بار سبحان اللہ کہتا ہے اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں مسلم ص۲۱۹ ج۱ وابوعوانہ ص۲۴۷ ج۲ ومسند احمد ص۱۷۳ ج۲، عن ابی ہریرہؓ)۔ تو مفتی صاحب کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ نمازی نماز سے فارغ ہوکر تنتیس جمع تنتیس یعنی چھیاسٹھ بار اذان کہے کیا اس معنی پر مفتی صاحب کا یا اس کی پارٹی میں سے کسی ایک کا عمل ہے۔ یقیناً نہیں تو ثابت ہوا تکبیر اور تسبیح کا معنی اذان لینا بالکل غلط ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا مذکورہ روایت سے بایں معنی استدلال کہ، اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذاب قبر دور ہوتا ہے، جاء الباطل ص۳۱۴ ج۱۔

حالانکہ عرف میں یہ دونوں الگ چیزیں ہیں دعا میں طلب اور سوال ہوتا ہے جب کہ ذکر اس سے خالی ہوتا ہے، مفتی صاحب کا دادا استاذ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ۔

اذان تو خالص ذکر بھی نہیں جیسا کہ، البنایۃ شرح ھدایہ، علامہ عینی میں ہے۔ فتاوی رضویہ ص۴۱۵ ج۲، طبع دارالعلوم امجدیہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء۔

ثالثاً۔ روایت مذکورہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، کیونکہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا محمود بن عبدالرحمٰن الجموح ہے،

مسند احمد ص۳۷۷ ج۳ و۳۶۰۔

یہ مجہول ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے، التعجیل، میں صراحت کی ہے (مرعاۃ)

علامہ ھیثمی حنفی کا کہنا ہے کہ محمود کو، الحسینی، نے فیہ نظر کہا ہے، اور مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کے علاوہ بھی کسی نے ذکر کیا ہے،

مجمع الزوائد ص۴۹ ج۳۔

امام العصر علامہ ناصر الدین محدث البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے تحقیق مشکوۃ ص۴۹ ج۱، ومرعاۃ ص۲۳۱ ج۱۔

نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کرنا

حضرت مفتی صاحب جب اذان قبر پر مزید بحث سے عاجز آگئے تو معلوم نہیں انہیں کیا خیال آیا کہ اذان قبر کی بحث کے آخر میں نماز کے بعد مصافحہ کی بدعت کو گھسیٹ لائے، چنانچہ انہوں نے اسے لطیفہ کے زیر عنوان بیان کر کے آخر میں لکھا کہ اسی طرح یہ مسئلہ اذان ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۱ ج ا۔

راقم الحروف نے متعدد بار غور کیا کہ علمی طور پر اس کا اذان قبر سے کیا تعلق ہے جو مفتی صاحب نے پیدا کرنے کی فضول کوشش کی ہے، مگر خاکسار کی سمجھ میں نہ آیا، ہاں اگر ان میں کوئی رشتہ و واسطہ ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ دونوں دین میں زیادتی، من گھڑت اور بدعت سیۂ ہیں! ممکن ہے کہ مفتی صاحب کے نزدیک ان دونوں کا کوئی اور تعلق ہو، جسے انہوں نے بیان کرنا مناسب نہ جانا ہو، خیر جو بھی ہو ہماری بلا سے۔

نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کیا کیا کرتے تھے اس کے متعلق کتب حدیث میں مسنون ذکر و دعائیں تو منقول ہیں مگر نماز کے بعد مصافحہ کا ذکر کسی حدیث میں مروی نہیں، جو اس کا روشن پہلو ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا مسنون نہیں، بلکہ سنت ذکر و اذکار اور نوافل وغیرہ ادا کرنے ہیں، اب جو شخص نماز کے بعد مصافحہ کرتا ہے وہ مسنون عمل کو ترک کر کے اپنی طرف سے ایک نئی چیز پیدا کر رہا ہے، کیونکہ نماز سے فارغ ہوتے ہی، اللہ کے رسول ﷺ، اللہ اکبر، کہتے تھے۔ بخاری ص ۱۱۶ ج ا، و مسلم ص ۲۱۷ ج ا۔

حضرت مغیر بن شعبۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد یہ کلمات کہتے تھے۔

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر اللھم لامانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد.

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک ہے، اس کی بادشاہی ہے، اور اسی کیلئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ، جسے تو عطاء کرے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس

سے تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں، اور کسی کا بخت تیرے سامنے کوئی فائدہ نہیں دیتا، بخاری ص ۱۱۷ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۸ ج ۱۔

ان کے علاوہ بھی کئی مسنون اذکار کتب حدیث میں مروی ہیں، جن کو آنحضرت ﷺ ہمیشہ فرماتے، بعض کو کبھی کبھار پڑھتے تھے۔

معلوم ہوا کہ نماز کے بعد ذکر و اذکار مسنون طریقہ ہے، اب جو شخص نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کرتا ہے وہ عملی طور پر ان مسنون اعمال کو رد کر رہا ہے جو سنت نبوی علیہ السلام، کو محو کرنے کے مترادف ہے، جس عمل سے سنت نبوی ختم ہو، اس کے بدعت سیئہ ہونے کا فریق مخالف کو بھی اقرار ہے، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں

خلاف سنت کام جو رافع سنت ہو بدعت سیئہ ہی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۱۴ ج ۱۔

اور سلام کے بعد ذکر و اذکار مسنون ہیں نہ کہ مصافحہ کرنا، مگر مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ نماز کی حالت میں اگر چہ بظاہر تمام مقتدی اور امام ایک جگہ ہی رہے مگر حکمی لحاظ سے سب ایک دوسرے سے غائب تھے کہ نہ کسی سے کلام کرسکیں نہ ایک دوسرے کی مدد، بلکہ تمام لوگ دنیا ہی سے غائب ہیں کہ کھانا پینا، چلنا پھرنا تمام دنیاوی کام حرام ہیں اور ر، الصلوۃ معراج المومنین، کا نقشہ نظر آرہا ہے دنیا سے تعلق منقطع اور واصل الی اللہ ہیں، جب سلام پھیرا اب دنیا میں آگئے تمام دنیاوی کام حلال ہوگئے یہ وقت غائب ہونے کے بعد ملنے کا ہے لہذا مصافحہ سنت ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۱ ج ۱۔

(۱) مفتی صاحب نے سلام کے بعد مصافحہ کو سنت قرار دیا ہے، اگر وہ فرض بھی کہہ دیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

(۲) یہ عبارت اس بات کی گواہ ہے کہ مفتی صاحب سلام کے فوراً بعد مصافحہ کو لازمی اور ضروری خیال کرتے تھے، بلکہ انہوں نے اسے سنت کہہ کر نماز کا ایک جزو باور کرایا ہے۔

مگر اس پر کوئی دلیل شرعی تو وہ نادارند، بلکہ جو بھی زیب رقم فرمایا ہے وہ مفتی صاحب کا ذاتی من گھڑت ہے، جو قیاس فاسد پر مبنی ہے اور بوجہ سنت مصطفوی کے مخالف ہونے کے مردود ہے۔

(۳) مفتی صاحب کا حقیقی اور حکمی کو جمع کرنا حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا ہے، جو احناف کے نزدیک ناجائز ہے، دیکھئے دین الحق ص ۲۵۵ ج ۱۔

اختصار کے پیش نظر یہاں مفتی صاحب کا ایک حوالہ پیش خدمت ہے، فرماتے ہیں، حقیقت اور مجاز کا اجتماع منع ہے، جاء الباطل ص۳۰۴ ج۱۔

مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے

جمع بین الحقیقہ والمجاز باطل ہے۔ فتاوی رضویہ ص۱۵۸ ج۴۔

مبتدعین کے اس اصول سے ثابت ہوا کہ سلام و مصافحہ میں فقط ایک ہی ملاقات مراد لی جاسکتی ہے، حقیقی یا حکمی، ظاہر ہے کہ حکمی ملاقات نہیں، کیونکہ سنت متواترہ اس کا رد کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بھی قابل ذکر عالم نے سلام ومصافحہ کو حکمی ملاقات سے خاص نہیں کیا، باقی رہ گئی حقیقی، اور وہی مراد ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فا ذا دخلتم بیوتاً فسلموا علی انفسکم تحیۃً من عند اللہ مبٰرکۃ طیبۃ. (النور. ۶۱)

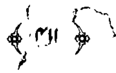
اور جب گھر میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو (یہ) اللہ تعالی کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔ (۲۴-۶۱)

یا یھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستانسوا و تسلموا علی اھلھا. (النور. ۲۷)

مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں کی اجازت لئے اور ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو۔ (۲۴-۲۷)

ان آیات میں حقیقی ملاقات مراد ہے، مفتی صاحب کی وضع کردہ حکمی ملاقات کا کوئی سرے سے وجود ہی نہیں، نماز میں پہلے نمازیوں کے وجود کو غائب کیا اور ان پر اپنی بدعت چسپاں کر دی کہ چونکہ نماز میں نمازی غائب تھے لہذا مصافحہ درست ہوا، کیسی عمدہ فقاہت ہے حضرت مفتی صاحب کی، لہذا ثابت ہوا کہ سلام و مصافحہ حقیقی ملاقات پر ہی ہے، معلوم نہیں کہ مولف جاء الباطل مفسر قرآن ہوکر بھی علوم قرآن سے اس قدر ناواقف کیوں تھا۔

(۴) حنفی علماء نے بعد از نماز مصافحہ کو بدعت سیئہ کہا ہے چنانچہ ابن عابدین، درمختار، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ



لکن قد يقال ان المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يودى الجهلة الى اعتقاد سنيتها فى خصوص هذه المواضع وان لها خصوصية زائدة على غيرها مع ان ظاهر كلامهم انه لم يفعلها احد من السلف فى هذه المواضع .... و نقل فى تبيين المحارم عن الملتقط انه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال لان الصحابة رضى الله عنهم ماصافحوا بعد اداء الصلاة و لا نها من سنن الروافض،

ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية انها بدعة مكروهة لااصل لها فى الشرع، و انه ينبه فاعلها اولاً و يعزر ثانيا.

ثم قال، وقال ابن الحاج من المالكية فى المدخل انها من البدع و موضع المصافحة فى الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاخيه لافى ادبار الصلوٰت فحيث وضعها الشرع يضعهافينهى عن ذلك و يزجر فاعله لما اتى به خلاف السنة.

یعنی البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز کے بعد ہمیشہ مصافحہ کرنے سے جاہل لوگ اسے سنت اعتقاد کریں گے کہ مصافحہ کرنے کی اس وقت کوئی خاص خصوصیت ہے جو دوسرے اوقات میں نہیں،

اس کے ساتھ ساتھ انکی عبارات (امام نووی اور ابو الحسن بکری) کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالحین سے اس وقت مصافحہ کرنے کی کوئی خصوصیت منقول نہیں، تبیین میں (فقہ حنفی کی کتاب) ملتقط، سے نقل کیا ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ کرنا ہر حال میں مکروہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نماز کے بعد مصافحہ نہ کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ یہ رافضیوں کا طریقہ ہے،

پھر ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ یہ بدعت مکروھہ ہے کیونکہ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں اور مصافحہ کرنے والے کو پہلے تنبیہ کی جائے (اگر اس پر اصرار کرے) تو دوسری بار تعزیر لگائی جائے۔

پھر ابن الحاج کی مدخل سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ بدعت ہے اور شریعت میں مصافحہ کرنے کا وقت ملاقات ہے جب ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان بھائی سے ملاقات ہو، اس وقت مصافحہ کرے نہ کہ نمازوں کے بعد، پس شارع علیہ السلام نے جس کام کیلئے جو وقت مقرر کیاہے وہ کام اسی وقت کیا جائے اور دوسرے اوقات میں منع کیا جائے اور کرنے والے کو ڈانٹا

جائے کیونکہ وہ خلاف سنت کر رہا ہے۔

فتاوی شامی ص۳۸۱ ج۶، کتاب الحظر والا باحۃ باب الاستبرا وغیرہ۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی حنفی فرماتے ہیں کہ

آنکه بعضے مردم مصافحه میکنند بعد از نمازمی کنند یابعد از جمعه کنند چیزی نیست و بدعت است از جهت تخصیص وقت .

یعنی بعض لوگ نماز کے بعد یا جمعہ کے بعد جو مصافحہ کرتے ہیں یہ کچھ بھی نہیں، اور وقت کی تخصیص کی وجہ سے بدعت ہے،

اشعۃ اللمعات ص۲۲ ج۴ طبع پشاور۔

رہا مفتی صاحب کا امام نووی سے، لاباس بہ، نقل کرنا۔

جاء الباطل ص۳۲۰ ج۱۔

تو یہ انہیں سود مند نہیں کیونکہ نووی شافعی ہیں اور مفتی صاحب نے اس سے قبل ایک شافعی عالم کے قول سے انکار کر دیا تھا کہ شافعیہ کا قول حنفیہ پر حجت نہیں (مفہوم) جاء الباطل ص۳۱۶ ج۱۔

مگر یہاں ایک شافعی عالم کے قول سے ہی استدلال کر رہے ہیں، جوان کی دورخی ثابت کرتا ہے، خاص کر جب حنفیہ کے نامور علماء نے نووی کی تردید بھی کی ہے، چنانچہ ملا علی القاری حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ، مشکوٰۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

ولا يخفى ان فى كلام الامام نوع تناقض لان اتيان السنة فى بعض الاوقات لايسمى بدعة مع ان عمل الناس فى الوقتين المذكورين ليس على وجه الا ستحباب المشروع فان محل المصافحة المشروعة اول الملاقاة و قد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة و يتصاحبون بالكلام و مذا كرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصا فحون فاين هذا من السنة المشروعة و لهذا صرح بعض علماء نا بانها مكروهة حينئذ و انها من البدع المذ مومة.

یعنی مخفی نہیں کہ امام نووی کے کلام میں تناقض کی نوع ہے، کیونکہ بعض اوقات میں سنت کا آنا (یعنی سنت پر عمل کرنا) بدعت سے موسوم نہیں کر سکتے جبکہ عوام الناس کا عمل ان دونوں وقتوں (صبح



اور عصر کی نماز کے بعد) میں شرعی استحباب کے درجہ میں نہیں، کیونکہ مشروع مصافحہ کا محل تو ملاقات کی ابتدا میں ہے اس کے برعکس جب لوگ مصافحہ کے بغیر ملکر گفت وشنید کرتے رہے اور علمی مسائل پر مذاکرہ کرتے رہے ایک اچھی خاصی مدت تک۔

پھر جب وہ نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں، پس یہ مشروع سنت کہاں سے ہوئی، اس لئے ہمارے بعض علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ مکروہ اور بدترین بدعت ہے، مرقاۃ المفاتیح ص۷۴ ج۹ کتاب الادب باب المصافحة و المعانقة طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

مولانا قطب الدین حنفی ترجمہ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ بعض آدمی جو مصافحہ کرتے ہیں بعد از نماز عصر کے یا جمعہ کے کچھ نہیں ہے اور بدعت ہے بسبب تخصیص وقت کے اور تصریح کی ہے، بعض علماء ہمارے نے کہ مصافحہ مذکورہ مکروہ ہے اور بدعت مذمومہ، مظاہر حق ص۵۹ ج۴۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے عید کے معانقہ پر مشکوٰۃ کتاب الادب باب المصافحہ، کے حوالے سے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی درج کی ہے،

جاء الباطل ص۳۲۰ ج۱۔

راقم نے اس روایت کی پوری تفصیل کے ساتھ صراحت کردی ہے کہ یہ سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے لحاظ سے عظمت مصطفیٰ ﷺ کے منافی ہے، دیکھئے دین الحق ص۱۳۳ ج۲، ذکر ولادت پر کھڑے ہونے پر، مفتی صاحب کی پانچویں دلیل کا جواب۔

علاوہ ازیں یہ روایت ملاقات کے وقت معانقہ کی دلیل ہے، نہ کہ نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ کی، یہ یاد رہے کہ ہم نہ تو مصافحہ کے منکر ہیں نہ معانقہ سے انکار ہے، انکار تو اس کی خاص کیفیت اور تخصیص سے ہے، اس پر مبتدعین کے پاس کوئی دلیل قرآن وسنت اور تعامل صحابہ سے موجود ہے تو عنایت کیجئے۔

باب اولیاء کرام کا عرس منانا

عرس کا پس منظر اور وجہ تسمیہ

بات آگے لے جانے سے پہلے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرس کرنے اور منانے کا جو اسلوب پاک و ہند کے مبتدعین کے حلقوں میں رائج ہے، خیر القرون اور اس کے بعد کئی صدیوں تک اسلامی معاشرہ میں اس کا وجود نہ تھا صدیوں بعد جب مسلمان دین اسلام سے ناآشنا ہوگئے اور مشرک اقوام سے ان کا میل ملاپ بڑھ گیا تو ان کے اندر کئی مشرکانہ رسوم وعقائد اور اعمال آگئے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں شرک و بدعت کی مختلف شکلیں اور تصورات رائج رہے ہیں ایک تصور مشرک اقوام میں یہ بھی رہا کہ خالق کائنات اور مخلوق کے مابین محبت کی نوعیت اس طرح ہے جس طرح ایک ماں اور اولاد کے مابین محبت ہوتی ہے اس تصور کے تحت خالق کائنات کی مظہر دیویاں قرار پائیں اور مختلف دیویوں کو پوجا جاتا رہا جیسے آج ہندوستان میں درگا دیوی، پاربتی دیوی، سرسوتی اور لکشمی دیوی وغیرہ کی پرستش ہوتی ہے۔

ایک تصور یہ رہا کہ اللہ تعالی اور انسان کے درمیان محبت کا تعلق ایسا ہے جیسے باپ اور بیٹوں کے درمیان ہوتا ہے، اس تصور کے تحت خدا رسیدہ بزرگوں کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور پھر انہیں خدائی اختیارات کا حامل باور کرا کے دیوتا کے درجے پر فائز کر دیا گیا اور ان کی پوجا پاٹ شروع کردی گئی ایک تیسرا تصور یہ رہا کہ اللہ اور انسانوں کے درمیان اس طرح کا رشتہ محبت ہے جس طرح دولہا دولہن یا میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔

اس تصور کے تحت کنواری عورتوں کو عبادت گاہوں میں وقف کیا جانے لگا وہ ساری زندگی شادی نہیں کراتیں جس طرح ہندوؤں کے مندروں میں دیوداسیاں اور گرجوں میں عیسائی راہبائیں ہوتی ہیں، اس کنوار پن نے انہیں بتدریج خدا کی محبوبائیں یا بیویاں بنادیا اور یوں انہیں بھی خدائی تقدس اور الوہی صفات کا حامل سمجھا جانے لگا۔

یہی تیسرا گروہ جاہل مسلمانوں میں آیا اور ملنگوں کا ایک طبقہ معرض وجود میں آگیا، جو عورتوں

کی طرح رنگ برنگ کے کپڑے پہنتا ہے، ہاتھوں اور پیروں میں کڑے اور چوڑیاں پہنے رہتا ہے عورتوں کی طرح ناچ گا کر اپنے میاں یعنی اللہ تعالی کو مناتا ہے، اسی تصور نے مزید پھیلتے پھیلتے بزرگوں کے یوم وفات کو عرس (شادی کا دن) یا یوم وصال بنادیا یعنی وفات پاکر یہ بزرگ اپنے خواجہ (اللہ میاں) کی حرم سرا میں پہنچ گئے اس اعتبار سے یہ ان کی شادی کا دن ہے یا وصال یار (محبوب کی ملاقات) کا دن ہے اسی وجہ سے بزرگوں کیلئے اس حلقے میں وفات کا لفظ نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے اور وفات کو، وصال، سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلیئے ان کی وفات کے دن عرس (شادی) کے نام سے سب کچھ اسی لئے کیا جاتا ہے جو شادی کے موقعے پر کیا جاتا ہے قبر کو غسل دیا جاتا ہے، ریشمی چادریں اس پر ڈالی جاتی ہیں، حتی کہ رسم مہندی بھی ادا کی جاتی ہے پھر تبرک کے نام پر شرینی تقسیم ہوتی ہے اور لنگر تقسیم اور بانٹا جاتا ہے سلامی کے طور پر نذرانے چڑھائے جاتے ہیں، مزاروں کے بوسے لئے جاتے ہیں اور پھولوں کے ہاروں کا اہتمام ہوتا ہے،

یہ ہے عرس کی وہ حقیقت جس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں، فاعاذنا اللہ منہ، منقول از قبر پرستی ایک حقیقت پسندانہ جائزہ ص۱۰۰ طبع مکتبہ ضیاء الحدیث رجب ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء۔

اولیاء کرام کا تہوار منانا

اولیاء کرام کا ادب و احترام کرنا ضروری ہے، انکی صحیح بات کو تسلیم کرنا باعث سعادت ہے اور ان کو بلاوجہ دکھ پہنچانا موجب خسران ہے، ارشاد ربانی ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ، (سورة البروج آیت ۱۰)

جو لوگ ایمان دار مردوں اور عورتوں کو محض ایمان کی وجہ سے تکلیف دیا کرتے ہیں پھر وہ توبہ بھی نہیں کرتے، ان کیلیئے جہنم کا عذاب اور جلانے والی تکلیف ہے۔ (ثنائی) (۸۵-۱۰)

حدیث قدسی میں ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں

من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب. الحديث.

یعنی جو شخص میرے دوست کو تکلیف پہنچائے میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں، صحیح بخاری

ص۹۶۳ ج ۲، وبیھقی ص ۳۴۶ ج ۳، وکتاب الاسماء والصفات ص ۲۵۱ ج ۲۔

ارشاد الٰہی اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اولیاء کرام سے عداوت کی بجائے محبت ہونی چاہیئے اور جب وفات پا جائیں تو ان کیلئے رفع درجات اور مغفرت کی دعا کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے لیکن اس سے زائد انکی قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، فیض حاصل کرنا، ان کے نام کی نذر ماننا، ان کی قبر پر قرآن پڑھنا، یہ خیال کرنا کہ ان کی قبر پر دعا جلدی قبول ہوتی ہے، وہ رب کریم کے ایلچی ہیں ان کے وسیلہ سے بیڑا پار ہوگا۔

اللہ تعالی نے ان کو کائنات کا نظام سونپ دیا ہے وہ جو چاہے کر سکتے ہیں وغیرہ یہ تمام بدعات قبیحہ ہیں، اسی طرح ان کی وفات کے روز، دن کا تعین کر کے اجتماع کرنا جس کو عرس کہتے ہیں اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تجعلوا بیوتکم قبوراً ولا تجعلوا قبری عیداً و صلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث کنتم.

یعنی اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور نہ میری قبر کو عید بنانا، اور مجھ پر درود (وسلام) بھیجو جہاں کہیں بھی تم ہو (کیونکہ) تمھارا درود مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

سنن ابوداود مع عون ص ۱۷۱ ج ۲، ومسند احمد ص ۳۶۷ ج ۳۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سفر کر کے آنحضرت ﷺ کی قبر پر جانا کہ وہاں اجتماع ہو جائز نہیں کیونکہ زیارت قبر نبوی کا مقصود تو وہاں جا کر آپ علیہ السلام پر درود وسلام بھیجنا ہے، جب کہ درود وسلام اور دعا تو آپ علیہ السلام کو دور ونزدیک سے پہنچائی جاتی ہے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا درود وسلام مجھے پہنچ جایا کرے گا، خواہ تم میری قبر سے قریب رہو یا دور، لہذا میری قبر کو زیارت گاہ بنانے کی ضرورت نہیں، بحوالہ ھدایۃ المستفید ص ۷۰۰ ج ۱ اس کے برعکس جب ایک شخص سفر طے کر کے جائے اور دیگر لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہوں تو یہ اجتماع عید کہلائے گا جسے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ عربی زبان میں عید کا لفظ کسی اجتماع پر بولا جاتا ہے خواہ وہ اجتماع خوشی کا ہو یا غمی کا، لغت عرب کی امہات الکتب میں یہی

معنی لکھا ہے چنانچہ علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

والعید کل یوم فیه جمع.

اور عید کہتے ہیں کسی بھی دن کے اجتماع کو۔ لسان العرب ص۳۱۹ ج ۳۔

یہی معنی علامہ محمد مرتضی زبیدی نے کیا ہے۔ تاج العروس من جواھر القاموس ص ۴۳۸ ج ۲۔

اسی کے قریب قریب ہی معنی صاحب، منجد، نے کیا ہے۔ ص ۲۳۷،

علامہ وحید الزمان فرماتے ہیں کہ، عید، مجمع کا دن، لغات الحدیث ص۲۱۹ ج ۳ کتاب ،ع، مادہ، عود، مولانا غلام رسول سعیدی حنفی شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ فرماتے ہیں کہ جس دن لوگوں کا اجتماع ہو اس کو عید کہتے ہیں۔ شرح صحیح مسلم ص۶۵۵ ج ۲۔

آئمہ لغت اور سعیدی صاحب کی صراحت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ عربی زبان میں، عید، کا لفظ کسی اجتماع پر بولا جاتا ہے، ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ حدیث نبوی کا یہ معنی ہے کہ میری قبر پر اجتماع نہ کرنا، اور اجتماع کو مقرر کر کے کرنا ہی دراصل عرس ہے اور راس کی شریعت نے ممانعت فرمائی ہے، جب آپ ﷺ کی قبر انور پر عرس کرنا جائز نہیں تو کسی اور کی قبر پر کیسے جائز ہو گیا۔

مفتی صاحب کا معنی حدیث سے انکار

فرماتے ہیں کہ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ عید سے مراد لوگوں کا جمع ہونا ہے اور حدیث کے معنی ہیں کہ میری قبر پر جمع نہ ہو، تنہا تنہا آیا کرو،

عید کے دن خوشیاں منائی جاتی ہیں مکانات کی زینت و آراستگی ہوتی ہے کھیل کود بھی ہوتے ہیں یہی اس جگہ مراد ہے یعنی ہماری قبر انور پر حاضر ہو تو باادب آؤ یہاں آکر شور نہ مچاؤ کھیل کود نہ کرو، اگر قبر پر جمع ہونا منع ہے تو آج مدینہ منورہ کی طرف قافلے بھی جاتے ہیں بعد نماز پنج گانہ لوگ جمع ہو کر سلام عرض کرتے ہیں۔ جاء الباطل ص۳۲۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ عید کا معنی، لوگوں کا جمع ہونا، ہمیں لغت عرب سے معلوم ہوا ہے، جیسا کہ پہلے باحوالہ

عرض کیا جاچکا ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ زیارت قبر نبوی کی طرف جانا بھی ناجائز ہوگا، تو اس میں تفصیل ہے کہ جانے والا اگر فقط قبر نبوی کی زیارت کیلئے سفر کرے تو ناجائز ہے، لیکن اگر مسجد نبوی کی زیارت اور وہاں نماز پڑھنے کیلئے سفر کرے تو تب قبر نبوی کی زیارت مستحب ہے۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

جس طرح عام قبروں کی زیارت مستحب ہے اسی طرح حضرت نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت بھی مستحب ہے ہاں صرف قبر مبارک کی زیارت کی نیت اور حصول ثواب کی امید کے لیے سفر کرنا اس کے لیے دلیل اور نص چاہیئے جو یقیناً ذخیرہ اسلام میں سے نہیں مل سکے گی۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

ہماری طرف سے دنیا بھر کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے کسی صحیح و معتبر دلیل سے یہ ثابت کردیں کہ محض قبر نبوی کی زیارت کیلئے سفر کرنا جائز ہے (یہ ملحوظ رہے کہ زیارت قبر انور ہمارے نزدیک مشروع اور مستحب امر ہے) انکار فقط زیارت کی نیت سے سفر کرنے سے ہے، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

نہ کسی معتبر دلیل سے اس کا ثبوت دیا جاسکتا ہے کہ خیر القرون میں لوگ نماز پنج گانہ ادا کرکے اکٹھے ہوکر قبر انور کے اردگرد کھڑے ہوکر صلواۃ وسلام پڑھا کرتے تھے، یہ تمام باتیں مفتی صاحب کی خانہ ساز ہیں جو کہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

مفتی صاحب کی سوچ کی غلط کروٹ

مفتی صاحب نے مذکورہ حدیث کا مفہوم بگاڑتے ہوئے لکھا ہے کہ عید کے دن خوشیاں منائی جاتی ہیں مکانات کی زینت وآراستگی ہوتی ہے کھیل کود بھی ہوتے ہیں یہ ہی اس جگہ مراد ہے۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا قبور اولیاء پر عرس کے موقع پر یہ تمام کام ہوتے ہیں کہ نہیں؟ اگر ہوتے ہیں یقیناً ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے تو آج تک یہی کچھ دیکھا ہے کہ میلہ کے موقع پر کھیل کود کے علاوہ رقص وسرود کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں، ڈھول کی دھل پر ملنگ

ناچتے ہیں، کنواری لڑکیوں کو حال پڑتے ہیں، نو جوان جوڑے جھولے پر بیٹھ کر اپنی فرینڈ کے ساتھ پینگ لیتے ہیں، بلکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ اکثریت بھونڈی کرنے والوں کی ہوتی ہے، تو غلط نہ ہوگا، علاوہ ازیں قبر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے اس پر چراغ و اوچھاڑ اور گلاب کے عرق سے غسل کا انتظام کیا جاتا ہے، معلوم نہیں کہ زینت و آراستگی اور کس بلا کا نام ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ لفظ ،عید، میں کھیل کود کا مفہوم داخل نہیں، اس کا معنی فقط لوگوں کا جمع ہونا ہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مفہوم سے مفتی صاحب کا دل بھی مطمئن نہ تھا تو ساتھ ہی یہ توجیہ بھی گھڑ دی کہ یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم ہماری قبر پر جلد جلد آیا کرو مثل عید کے سال بھر بعد ہی نہ آیا کرو۔

اس معارضہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا عرس سال بھر کے بعد ہی نہیں آتا، کیا وہ سال میں صرف ایک ہی دفعہ نہیں کیا جاتا۔ بالفرض اگر مفتی صاحب کے اس مفہوم کو مان بھی لیا جائے تب بھی عرس اس حدیث کے خلاف ہی رہے گا، مگر مفتی صاحب ایسے معارضات کو پیش کر کے عرس کا جواز ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

غالباً مفتی صاحب کتاب تحریر کرتے وقت محض چند حروف کے لکھنے کو ہی جواب تصور کرتے تھے۔ یہ سوچنے کی تکلیف نہیں کرتے تھے کہ یہ جواب ہمارے موافق ہے کہ نہیں، اے جی ہم نے آپ کا کلمہ نہیں پڑھا کہ آپ کی ہر بات (بے دلیل) کو آنکھیں بند کر کے قبول کرتے جائیں۔

آپ کی اس بات کو حدیث مذکورہ میں یہ الفاظ، تبلغنی حیث کنتم، رد کر رہے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو فرما رہے ہیں، لاتجعلوا قبری عیدا، مگر افسوس کہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ جلد جلد آیا کرو عید کی طرح سال کے بعد ہی نہ آیا کرو،

لفظ ،عید، کے یہ اچھوتے معنی لغت کی کس کتاب میں لکھے ہیں بحوالہ اس کی صراحت کیجئے، یہاں پر خلط مبحث نہ کرنا، کہ فلاں کتاب میں ایسا لکھا، فلانے علامہ صاحب نے یہ مفہوم بیان فرمایا ہے، بلکہ صریحا لغت کا حوالا پیش کیجئے کہ عید کا معنی ہے جلد جلد آیا کرو، ورنہ ،لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید سے ڈر جایئے،

مفتی صاحب کا اصل بحث سے فرار

شرعی اصول کا تقاضا ہے کہ جس کے ایمان کی گواہی خالق ارض وسماء نے نہیں دی، اس کے ظاہری اعمال حسنہ کی وجہ سے حسن ظن رکھا جائے کہ وہ مسلمان اور مومن ہوکر فوت ہوا، مگر ہم کسی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ولی اللہ تھا، چنانچہ ملا علی القاری حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ الفقہ الاکبر، کی شرح میں فرماتے ہیں

واما غيره من الاولياء والعلماء والاصفياء بالاعيان فلانجزم بموتهم على الايمان وان ظهر منهم خوارق العادات وكمال الحالات وجمال انواع الطاعات فان مبنى امره على العيان وهو مستور عن افراد الانسان،

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ اولیاء علماء اور صلحاء کے بارے متعین طور پر ہم بالجزم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی موت ایمان پر ہوئی ہے اگرچہ ان سے خوارق عادات کمال حالات اور جمال انواع طاعات ظہور پذیر ہوئے ہوں کیونکہ یقینی خبر کی بنیاد مشاہدہ (دیکھنے) پر ہے اور یہ مشاہدہ ہی افراد انسانی سے مستور ہے۔

شرح فقہ اکبر ص ۱۳۱ طبع مجتبائی دہلی، وص ۱۰۸ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ ہم کسی شخص کو یقینی طور پر ولی اللہ نہیں کہہ سکتے ہیں، جب کسی کی ولایت کا ہمارے پاس کوئی شرعی ثبوت ہی نہیں تو ہم کسی کا عرس کس طرح منائیں؟

اس حقیقت سے مفتی صاحب نے جس طرح جان چھڑائی ہے وہ قابل دید ہے فرماتے ہیں کہ زندگی کے ظاہری احکام بعد موت جاری ہوتے ہیں اور جو زندگی میں مسلمان تھا بعد موت بھی اس کو مسلمان سمجھ کر اس کی نماز جنازہ، کفن، دفن، میراث، کی تقسیم وغیرہ کی جاوے گی، اور جو زندگی میں کافر تھا بعد موت نہ اس کی نماز جنازہ ہوگی نہ کفن نہ گور نہ تقسیم میراث شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے فقط احتمال معتبر نہیں اسی طرح جو زندگی میں ولی ہو وہ بعد وفات بھی ولی ہے اگر محض احتمال پر احکام جاری ہوں تو کفار کی نماز جنازہ پڑھ لیا کرو شاید مسلمان ہو کر مرا ہو، اور مسلمان کو بے جنازہ پڑھے آگ میں جلا دیا کرو کہ شاید کافر ہو کر مرا ہو،

جاء الباطل ص ۳۲۴ ج ۱۔

یہ مانا کہ شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے لیکن اسکی صراحت تو کیجئے کہ اگر ظاہری حیثیت کے مطابق علم کافی ہے تو پھر ہر پابند شریعت مسلمان کا عرس کیوں نہیں منایا جاتا؟ اس لئے کہ قرآن کی رو سے ہر متقی مسلمان، ولی اللہ ہے، (سورۃ الانفال آیت ۳۴)

مگر آپ حضرات عرس فقط، پیر، کسی مسند یا درگاہ کا سجادہ نشین وغیرہ کا ہی مناتے ہیں، عوام الناس کا نہیں، رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ فقط احتمال معتبر نہیں، تو یہ مفتی صاحب کی غلط بیانی ہے کیونکہ احتمال دلیل کو کمزور کر دیتا ہے چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے۔

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، یعنی جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہوجاتا ہے۔ فتاوی رضویہ ص۲۹ ج۴۔ لکھتا ہے کہ عقل ونقل کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، الامن والعلی ص۱۶۸ طبع شبیر برادرز ۱۳۹۶ھ، دیکھئے مفتی صاحب احتمال کو معتبر نہیں مانتے مگر ان کا دادا استاذ اور مجدد بریلویت کہتا ہے کہ احتمال سے استدلال باطل ہوجاتا ہے۔ اور یہ عقل ونقل کا مسلمہ قاعدہ ہے۔

باقی رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ پھر مسلمانوں کو بے گوروکفن آگ میں جلا دیا کرو کہ ممکن ہے کہ وہ کافر ہوکر مرے ہوں، سرے سے قابل التفات ہی نہیں کیونکہ انکی ظاہری حیثیت کے مطابق ہم انہیں مسلمان جانتے ہیں، لہٰذا ان کی نمازہ جنازہ اور کفن اور دفن عین اسلامی تعلیم کے موافق ہے، جبکہ آپ حضرات بالجزم قبور میں مدفون حضرات کو ولی اللہ کہتے ہیں جو کہ رجما بالغیب ہے۔

پھر انتہائی جذباتی انداز میں یہ کہنا کہ انہیں آگ میں جلا دیا کرو۔

اے جی ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے، بخاری شریف باب حکم المرتد والمرتدۃ۔

جلانے والا مشورہ بریلویوں کو دیں جو خیر سے پہلے سے ہی ہندوؤں کی رسوم سے متاثر ہوکر عرس کا انعقاد کرتے ہیں ہم تو فرمان مصطفیٰ ﷺ کے سامنے آپ کی بات کو جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھتے۔

شریعت کی ظاہری پابندی مسلمان کو دنیا میں باز پرس سے نجات دلاتی ہے مگر اخروی کا تعلق رب تعالی کی ذات سے وابستہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و یقیموا الصلوٰة و یؤتوا الزکوة فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دمآء هم وا موالهم الا بحق الاسلام و حسابهم علی الله.

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد و قتال کروں یہاں تک وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کریں زکوۃ ادا کریں پس جب وہ یہ کام کریں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کرلیا، مگر یہ کہ حق اسلام (یعنی قصاص اور حدود) میں، اور ان کا حساب اللہ تعالی پر۔

بخاری ص ۸ ج ۱، و مسلم ص ۳۷ ج ۱، مشکوٰۃ ص ۱۲ و اللفظ لہ۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایک کلمہ گو موحد مسلمان جو شریعت کے ظاہر پر عمل کرتا ہے اس سے معاملات مسلمانوں جیسے کئے جائیں گے، مگر اس کے اخروی معاملہ کو اللہ تعالی کے سپرد کر دیا جائے گا، بندہ جانے اور اس کا رب،

مگر مبتدعین اخروی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور قبر میں مدفون شخص کا عرس اس نیت سے مناتے ہیں کہ یہ رب کا مقرب (ولی کا یہی معنیٰ) ہے اور یہ عذاب قبر سے محفوظ ہو کر اپنے پروردگار سے مل گیا ہے جسے یہ حضرات وصال سے تعبیر کرتے ہیں اگلے قدم میں یہ لوگ اسے رب قدیر کا ایلچی اور دنیا میں تصرف فی الامور کا عہدہ سونپتے ہیں، تب اس کی قبر پر نذر و نیاز اور میلے ٹھیلے کا انعقاد کیا جاتا ہے، جب کہ یہ تمام چیزیں رجماً بالغیب ہیں، اس کے ثبوت کیلئے انکے پاس کوئی قطعی نص موجود نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب خلط مبحث کے شہسوار تھے کہ اسکے جواب کیلئے دنیا کے معاملہ کو گھسیٹ لائے ہیں، پھر اس پر جو دلیل عنایت فرمائی ہے، اسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ۔

مشکوۃ کتاب الجنائز باب المشی بالجنازۃ میں بروایت مسلم و بخاری ہے کہ حضور علیہ السلام کے سامنے ایک جنازہ گزرا جس کی لوگوں نے تعریف کی، فرمایا، وجبت، واجب ہوگئی، دوسرا جنازہ گزرا، جس کی لوگوں نے برائی کی، فرمایا، وجبت، واجب ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا

واجب ہوئی؟

فرمایا، انتم شھداء اللہ فی الارض، تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ عامۃ المسلمین جس کو ولی سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی ولی ہے، مسلمانوں کے منہ سے وہی بات نکلتی ہے جو اللہ کے یہاں ہوتی ہے، اسی طرح جس کو مسلمان ثواب جانیں حلال جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی باعث ثواب اور حلال ہے کیونکہ مسلمان اللہ کے گواہ ہیں۔ جاء الباطل ص ۳۲۴ ج ۱۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے ایک کی تعریف کی تو دوسرے کی مذمت بیان کی۔

ظاہر ہے کہ مدح سے نہ تو جنت واجب ہوتی ہے نہ جہنم میں دخول ہوتا ہے، آیئے ہم آپ کو حدیث کا مفہوم سمجھا دیتے ہیں، وہ یہ کہ ان کلمات کو سن کر آنحضرت ﷺ ان کے اخروی ٹھکانے کے متعلق خبر دی، پہلے کے بارے میں جنت کی بشارت سنائی تو دوسرے کے حق میں جہنم کا اعلان فرمایا، یہ ملحوظ رہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے فقط تعریف و مذمت بیان فرمائی اخروی ٹھکانے کے متعلق لب کشائی نہیں کی، اخروی ٹھکانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بیان جاری فرمایا ہے، اور امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان اور بیان ان دونوں کے اخروی مقام کے بارے میں ایک یقینی علم ہے، جبکہ اس دور میں وفات پانے والوں کی تعریف و توصیف اور مذمت تو کی جاتی ہے مگر اس مدح و قدح کی کوئی تصدیق کرنے والا ہمارے پاس موجود ہی نہیں، تو پھر ہم کیسے باور کرلیں کہ فقط تعریف سے ہی جنت واجب ہوگئی۔

علاوہ ازیں ہم نے تو کئی بے دین جو زندگی میں علی الاعلان اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور شعائر اسلام کی تضحیک کا سامان بہم پہنچاتے تھے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، تو کجا حقوق العباد تک کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ ظالم و جابر اور نہایت درجے کے عیاش اور بدمعاش لوگ بھی جب وفات پاجاتے ہیں، تو عامۃ المسلمین جب اس کے پسماندگان کے پاس تعزیت کیلئے جاتے ہیں تو کہتے ہیں بہشتی میں بڑیاں خوبیاں تھیں، اللہ تعالی اسے معاف کرے اس پر رحمت کرے، اسکے دل میں ملک و قوم کی بڑی ہمدردی تھی، حالانکہ ہوتا سب جھوٹ ہے۔

تو کیا مفتی صاحب اور ان کے متبعین ایسے شخص کو ولی اللہ ماننے کے لئے تیار ہیں، اگر ہیں تو

مبارک ہو۔

الغرض لوگوں کی مدح و قدح سے نہ کسی کی ولایت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کو جہنم کا حق دار قرار دیا جاسکتا ہے، یہ پروردگار اور اس کے بندہ کا معاملہ ہے، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس شخص کی بھی تعریف کی تھی۔

جس نے غزوہ خیبر کے روز مال غنیمت سے ایک عدد چادر چوری کرلی تھی جب آنحضرت ﷺ واپس پلٹے تو راستے میں اسے ایک تیر لگا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے فرمایا

ھنیا لہ الجنۃ، اسے جنت مبارک ہو، مگر آنحضرت ﷺ نے اسکی تردید کرتے ہوئے فرمایا

والذی نفسی بیدہ ان الشملة التی اخذھا یوم خیبر من المغانم لم تصبھا المقاسم لتشتعل علیه ناراً.

یعنی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ چادر جو اس نے خیبر کے روز مال غنیمت سے تقسیم سے پہلے لے لی تھی اس پر آگ بن کر شعلہ مار رہی ہے۔ بخاری ص۹۹۲ ج۲ و مسلم ص۷۴ ج۱۔الحدیث

اس طرح کے واقعات کتب حدیث میں متعدد پائے جاتے ہیں۔

قارئین کرام دیکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس شخص کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا اور جنت کے مبارک ہونے کے الفاظ کہے، بلکہ مسلم کے الفاظ ہیں کہ اسے شہادت مبارک ہو، مگر صحابہ کرام کے ان کلمات سے اس شخص کی ولایت ثابت ہونا تو کجا اس کا مال غنیمت سے چادر چوری کرنے کا جرم بھی معاف نہ ہوا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں آگ کی وعید شدید سنائی۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب یہ کہتے ہیں کہ جسے لوگ ولی اللہ کہہ دیں وہ حقیقت میں ولی ہی ہوتا ہے، لیکن امت اسلام کے سب سے بزرگ اور صاحب عظمت لوگوں (صحابہ کرام) کے کہنے سے وہ شخص نہ شہید ثابت ہوتا ہے نہ جنتی۔

مفتی جی عامۃ الناس کا کیا کہنا ہے، عوام تو ان لوگوں کو بھی ولی اللہ کہہ دیتی ہے جو ساری زندگی کبھی مسجد میں نہ گیا ہو، بلکہ بالکل ننگا پھرتا رہا ہو، بازار میں کھڑے ہو کر گزرنے والوں پر



گالیوں کی بوچھاڑ کرتا رہا ہو، مگر یہی شخص جب فوت ہو جاتا ہے تو مبتدعین کے عوام اسے مجذوب کہہ کر دفن کرتے ہیں اور اس پر عالی شان عمارت تعمیر کر کے، دربار فلاں بزرگ چشتی قادری وغیرہ کے القاب لکھواتے ہے، راقم الحروف نے یہ خبر متواتر سنی ہے کہ علماء وصلحاء اور عامۃ الناس کا چشم دید واقعہ ہے کہ گوجرانوالہ میں، جی ٹی ایس کے اڈہ کے قریب جو مزار تعمیر ہوا ہے وہ اسی قماش کا شخص تھا۔ شہر گوجرانوالہ میں اس پر ہزاروں شہادتیں مل سکتی ہیں، اگر آپ کو یقین نہ آئے، تو مولوی ابوداؤد محمد صادق صاحب رضوی سے حلفاً پوچھ لیں، مجھے یقین کامل ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

میں نے اسے خود دیکھا تھا کہ وہ بالکل برہنہ تھا جسم میں صفائی نام کی کوئی شئی نہیں تھی غیر ضروری بال انتہا درجہ بڑھے ہوئے تھے اور وہاں سے بدبو کے فوارے پھوٹ رہے تھے مگر جب وہ گیا تو اب وہاں اس کا بڑا خوبصورت اور منقش مزار تعمیر ہو چکا ہے اور وہاں باقاعدہ سالانہ عرس ہوتا ہے اور بڑے بڑے بریلوی علماء وہاں شرکت کرتے ہیں اور برہنہ اور شرم و حیا سے عاری بے غیرت شخص کے مناقب بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے بڑے خوبصورت اشتہار اور اسٹکرز چھپتے ہیں۔ (گوندلوی)

الغرض اس طرح کی بیسیوں امثلہ پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا منشور ان کا شمار کروانا نہیں، لہذا اس پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

عرس اور فقہاء احناف

حضرت قاضی ثناء اللہ مرحوم پانی پتی حنفی فرماتے ہیں کہ

لایجوز ما یفعله الجهال بقبور الا ولیاء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ السرج والمساجد الیها ومن الا جتماع بعد الحول کا لاعیاد ویسمونه عرسا.

جاہل لوگ حضرات اولیاء وشہدا کے مزارات کے ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں مثلاً ان کو سجدہ کرنا، ان کے اردگرد طواف کرنا، ان کی قبر پر چراغاں کرنا، ان کی

طرف سجدہ کرنا، ہر سال بعد ان کی قبر پر میلوں کا منعقد کرنا جس کا نام عرس ہے، تفسیر مظہری ص ۶۵ ج ۲۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی فرماتے ہیں

لاتجعلوا زیارۃ قبری عیداً اقولُ ھذا اشارۃ الیٰ سد مدخل التحریف کما فعل الیھود والنصٰری بقبور انبیاء ھم و جعلوھا عیدا و موسما بمنزلۃ الحج۔

یعنی آپ علیہ السلام نے (جو یہ فرمایا کہ) میری قبر کو عید نہ بناؤ، میں (شاہ ولی اللہ) کہتا ہوں اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ بند کر دیا جائے، کیونکہ یہود ونصاری نے اپنے انبیاء کرام علیھم الصلوۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح عید اور موسم بنا دیا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۷ ج ۲، طبع المکتبۃ السّلفیہ۔

نیز فرماتے ہیں

ومن اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور فاتخذوھا عیداً۔

یعنی بڑی بدعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قبروں کے بارے میں بہت سی باتیں از خود گھڑ لی ہیں اور قبروں کو میلے کی حیثیت دے دی ہے، التفہیمات الٰہیہ ص ۶۴ ج ۲۔

مزید فرماتے ہیں کہ

عادت آتش پرستاں وھم عادت بت پرستاں ہند کہ روزے از روز ھائے معین در ہر سال عید می کنند و مجمع عام می نمایند، پیر پرستاں نیز عید غدیر خم و عرس ھائے قبور بزرگان مقرر کردہ اندکہ چو تعیش آنھادر آں ایام داد عیش و طرب و لھو و لعب می دھند وا رواح خبیثہ شیاطین راخودسند ساختہ۔

یعنی آتش پرستوں اور ہندوؤں کی یہ عادت ہے کہ ایک دن مقرر کر کے (کسی تھان وغیرہ پر) جمع ہو کر عید مناتے ہیں، پیر پرست فرقے نے بھی ان کے قدم بہ قدم کئی عیدیں بنا رکھی ہیں اور آئے دن کسی نہ کسی بزرگ کے ''مزار'' پر عرس رچاتے ہیں اور انہی کی طرح عیش وعشرت کر کے شیطان کو خوش کرتے ہیں۔ البلاغ المبین ص ۳۱۔

عرس کے دلائل اور ان کا تجزیہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ عرس کے لغوی معنی ہیں شادی، اسی لئے دولہا اور دلہن کو عروس کہتے ہیں، بزرگان دین کی تاریخ وفات کو اس لیے عرس کہتے ہیں کہ مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر میں ہے کہ جب نکیرین میت کا امتحان لیتے ہیں اور وہ کامیاب ہوتا ہے، تو کہتے ہیں

نم کنومة العروس التی لا یوقظه الا احب اهله الیه.

تم اس دلہن کی طرح سو جاؤ جس کو سوائے اس کے پیارے کے کوئی نہیں اٹھا سکتا۔

چونکہ اس دن نکیرین نے ان کو عروس کہا اس لئے وہ دن روز عرس کہلایا، یا اس لئے کہ وہ جمال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے کا دن ہے کہ نکیرین دکھا کر پوچھتے ہیں کہ تو ان کو کیا کہتا ہے؟ اور وہ خلقت کے دولہا ہیں تمام عالم ان ہی کے دم کی بہار ہے، اور وصال محبوب کا دن عرس کا دن ہے، لہذا یہ دن عرس کہلایا عرس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہر سال تاریخ وفات پر قبر کی زیارت کرنا اور قرآن خوانی و صدقات کا ثواب پہنچانا، اس اصل عرس کا ثبوت حدیث پاک اور اقوال فقہاء سے ہے، جاء الباطل ص۳۲۲ ج۱۔

مومن کے آرام قبر سے عرس کا اثبات

الجواب۔ اولاً۔ حضرت مفتی صاحب نے، عرس کے لغوی معنی، شادی تسلیم کرنے کے بعد یہ ثابت نہیں کیا کہ مرنیوالے کی کس سے شادی ہوتی ہے کہ اس کی وفات کے دن کو شادی (عرس) سے تعبیر کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا دفن کے بعد منکر ونکیر کے کہنے سے استدلال تو یہ صرف مبتدعین کا

وہم ہے، کیونکہ ملائکہ تو اسے، نم کنومۃ العروس، (دلہن کی طرح سوجا) کہتے ہیں عربی زبان کے جاننے والے طلباء اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حرف ،ک، سے فقط تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ عربی کی ضرب المثل ہے، زید کالاسد، یعنی زید شیر کی طرح ہے،اس کا یہ معنی نہیں کہ زید شیر ہے بلکہ زید کو شیر سے مشابہت دی گئی ہے۔

اسی طرح ملائکہ نے دفن ہونے والے کے آرام و راحت کو دلہن کی نیند سے تشبیہ دی ہے، چنانچہ ملاعلی القاری حنفی فرماتے ہیں کہ

وانما شبه نومه بنومة العروس، یعنی دفن ہونے والے کی نیند کو دلہن کی نیند سے مشابہت دی ہے۔ مرقاۃ ص ۲۰۴ ج ا۔

مگر اس حقیقت کے برعکس مفتی صاحب کہتے ہیں کہ مرنے والے کو عروس (دلہن) کہا ہے، کاش حضرت مفتی صاحب نے کسی فاضل سے،شرح مأئۃ عامل، ہی پڑھی ہوتی۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا دعوی تو یہ ہے کہ اولیاء کا عرس منانا ضروری ہے، مگر جس حدیث سے استدلال کررہے ہیں وہ ہر مومن کے بارے میں ہے، نہ کہ محض اولیاء کرام کیلئے اگر اس روایت سے استدلال صحیح ہے اور فی الواقع ،عرس، کا اثبات ہوتا ہے تو پھر ہر مسلمان کاعرس منانا ضروری ہے مفتی صاحب کے دعوے اور دلیل میں سرے سے کوئی موافقت ہی نہیں، کیونکہ دعوی خاص اور دلیل عام دے رہے ہیں جو کہ ہر کلمہ گو کو اس کی قبر میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔

رابعاً۔ مفتی صاحب کی یہ پکڑ کہ وہ جمال مصطفیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کا دن ہے...... اور وصال محبوب کا دن عرس کا دن ہے، الخ۔

تو یہ بھی مفتی صاحب کو سود مند نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم رسول اللہ ﷺ سے زبردست عقیدت و محبت رکھتے تھے، مگر کسی ایک نے بھی ملاقات کے دن کو عرس منانے سے تعبیر نہیں کیا کیونکہ وہ عربی زبان سے کماحقہ واقف تھے وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ وصال محبوب کو عرس نہیں کہتے، مگر مفتی صاحب وصال محبوب کو عرس کہتے ہیں، جو غلط بیانی ہی نہیں پرلے درجے کی جہالت ہے، لغت کی کسی کتاب میں ،عرس، کا معنی وصال محبوب ، یا، وصال محبوب کا معنی ،عرس، نہیں

لکھا یہ فقط مبتدعین کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

خامساً۔ مفتی صاحب کی تحریر کا انداز بتاتا ہے کہ انہوں نے مذکورہ روایت سے عرس کا جواز ثابت نہیں کیا بلکہ وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی ہے جس میں انہوں نے غلطی کھائی ہے عرس کی وجہ تسمیہ پر پہلے عرض کیا جاچکا ہے لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ملحوظہ

حضرت مفتی صاحب نے منکر ونکیر کے سوال، ھذا الرجل، سے رسول اللہ ﷺ کا مومن کی قبر میں حاضر ہونے کا استدلال کیا ہے جس کے بارے میں مفصل بحث تو دین الحق کی جلد سوم میں رب قدیر کی رحمت سے تفصیل سے آرہی ہے انشاء اللہ، مگر یہاں بھی اس کی قدرے وضاحت کر دینی خالی از فائدہ نہیں ہے۔

لفظ، ھذا، بعض دفعہ ذہن مین موجود چیز کے استعمال پر بھی آتا ہے کیونکہ ذہن میں موجود چیز کی حیثیت موجود جیسی ہوتی ہے، گو اس کا استعمال کم ہے، مگر ہے ضرور۔ حدیث میں آتا ہے کہ مقام حدیبیہ پر مشرکین مکہ کی طرف سے شرائط صلح طے کرنے کی غرض سے بدیل بن ورقا سفارت پر آیا، نبی رحمت رسول مکرم ﷺ سے گفت وشنید کر کے واپس آیا۔

فانطلق حتی اتیٰ قریشاً قال انا قد جئنا کم من عندھذا الرجلً

جب قریش مکہ کے پاس گیا تو کہنے لگا ہم تمہارے پاس اس شخص کے پاس سے آئے۔ بخاری ص ۳۷۸ ج ۱۔

دیکھئے رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے کئی کلومیٹر دور حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے اور بدیل کفار مکہ کو، ھذا الرجل، سے آنحضرت ﷺ کو تعبیر کرتا ہے۔ اسی طرح قبر کے سوال میں، ھذا الرجل، ہے یہ بات نہیں کہ آپ علیہ السلام ہر قبر میں بہ نفس نفیس حاضر ہوتے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو مومن کا جواب یہ ہوتا ہے، ھذا رسول اللہ ﷺ (یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں) مگر مومن جواب میں یہ الفاظ نہیں کہتا بلکہ مومن غائب کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

انہ عبد اللہ ورسولہ، وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، بخاری ص ۱۷۸ ج ۱ و ص ۱۸۴ ج ۱۔

اس کی مزید وضاحت حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنھم کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب

ملائکہ مومن سے پوچھتے ہیں کہ

ماتقول فی هذا الرجل.

اس شخص کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے، تو مومن ملائکہ سے سوال کرتا ہے کہ، من؟ کون شخص؟

قال محمد ﷺ، فرشتے کہتے ہیں کہ محمد ﷺ، تو تب مومن کہتا ہے، انہ رسول اللہ ﷺ، یعنی وہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں ۔مسند امام احمد ص۳۵۳ ج۶، و درمنثور ص۸۳ ج۴۔

علامہ ھیثمی فرماتے ہیں اس کے راوی صحیحین کے ہیں۔مجمع الزوائد ص۵۴ ج۳۔

حدیث کے ان الفاظ سے ثابت ہوا کہ قبر میں رسول اللہ ﷺ بہ نفس نفیس نہیں ہوتے، ورنہ مومن کا سوال، من، بے مقصد ثابت ہوگا، اور یہ باطل ہے۔

پھر عہد رسالت میں ایک عورت مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی، جب اس کا انتقال ہوگیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے آپ علیہ السلام کو اطلاع دیئے بغیر دفنا دیا، آنحضرت ﷺ کے سوال کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس کی وفات کی خبر دی، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا مجھے کیوں نہیں بتلایا گیا؟

عرض کی گئی کہ وہ کونسی خاص اہمیت کی حامل تھی، تب آپ علیہ السلام نے فرمایا، مجھے اس کی قبر بتلاؤ! صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی راہنمائی سے آپ علیہ السلام اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کی قبر پر کھڑے ہوکر، فصلی علیہ، اس پر نماز جنازہ پڑھی۔صحیح بخاری ص۱۷۸ ج۱۔

اگر رسول اللہ ﷺ قبروں میں خود تشریف فرما ہوتے تو ظاہر ہے کہ اس مرنے والی عورت کی قبر میں بھی حاضر ہوتے اور آپ علیہ السلام کو علم ہوتا کہ یہ تو وہی عورت ہے جو مسجد کی صفائی کرتی تھی لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، ثابت ہوا کہ منکر ونکیر کے سوال کے وقت آپ علیہ السلام قبر میں موجود نہیں ہوتے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

شامی جلد اول باب زیارت القبور میں ہے

وروی ابن ابی شیبة ان النبی ﷺ کان یاتی قبور الشهداء باحد علی راس کل حول.

ابن ابی شیبہ نے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام ہر سال شہداء احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے تھے۔ جاء الباطل ص۳۲۲ ج۱۔

یہی روایت مفتی صاحب نے تفسیر کبیر اور درمنثور کے حوالے سے مکرر نقل فرمائی ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ شہدا احد کی قبروں پر ہر سال جایا کرتے تھے؟

الجواب۔ اولاً۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں قطعاً نہیں

علامہ شامی کا وہم اور مفتی صاحب کی اندھی تقلید ہے، حافظ ابن حجرؒ نے، الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف ص۵۲۷ ج۲، میں اسے تفسیر ابن جریر اور مصنف عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے مگر مصنف ابن ابی شیبہ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی، راقم نے خود بھی گہری نظر سے، مصنف ابن ابی شیبہ، کو دیکھا ہے مگر اس میں یہ روایت خاکسار کو نہیں ملی،

علامہ سیوطی نے درمنثور ص۵۸ ج۴، میں اسے ابن جریر کے حوالے سے ہی نقل کیا ہے، باقی مفتی صاحب کا تفسیر کبیر سے نقل کرنا مصنف میں ہونیکی دلیل نہیں کیونکہ تفسیر کبیر ص۴۵ ج۱۹ طبع مصر ۱۹۳۸ء میں یہ روایت بغیر حوالے کے درج ہے۔

ثانیاً۔ مصنف عبدالرزاق میں مذکورہ روایت حسب ذیل سند سے مروی ہے

عبدالرزاق عن رجل من اهل المدینة عن سهیل بن ابی صالح عن محمد بن ابراهیم التیمی قال کان النبی الخ. ص۵۷۳ ج۳ رقم الحدیث ۶۷۱۶) طبع المجلس العلمی ۱۹۷۱ء.

امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، سورۃ الرعد، کی آیت ۲۳و۲۴، کے تحت اس کو حسب ذیل سند سے نقل کیا ہے۔

حدثنی المثنی قال حدثنا سوید قال اخبرنا ابن المبارک عن ابراهیم بن

محمد عن سهیل بن ابی صالح عن محمد بن ابراهیم قال کان النبی الخ.

تفسیر ابن جریر ص ۴۲۷ ج ۱۶، بہ تحقیق محمود محمد شاکر طبع مصر ۱۹۶۹ء

(۱) ابن جریر کے قدیم نسخہ میں، سہل بن ابی صالح، ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

(۲) گو مصنف عبدالرزاق کی سند میں، عن رجل من اهل المدینة، راوی مبہم ہے مگر ابن جریر کی سند میں اس کا متابع ابراھیم بن محمد موجود ہے۔

(۳) لیکن اس کے باوجود یہ روایت قابل حجت اور لائق استدلال نہیں ہے کیونکہ یہ ایک صغیر تابعی محمد بن ابراھیم) کی مرسل ہے اور مرسل روایت ضعیف ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل راقم نے، دین الحق ص ۶۵ ج ۱ میں عرض کر دی ہے۔

ثالثاً۔ روایت مذکورہ میں اجتماع، قرآن خوانی، مجلس وعظ کرنے اور قبر کو گلاب کے عرق سے غسل دینے کا کہیں ذکر ہی نہیں جو کہ عرس کے لوازمات سے ہیں۔

رابعاً۔ پھر مفتی صاحب نے متن روایت میں لفظ، راس، کا معنی چھوڑ دیا ہے، جو کہ ان کے استدلال کی خامی واضح کرتا تھا، عربی زبان میں لفظ، راس، کسی بلندی کی چوٹی کو کہتے ہیں، اور اسی بنا پر انسانی جسم میں سر کو راس کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسانی باڈی وتن میں جسم کا آخری حصہ ہوتا ہے اور جب یہ کسی وقت و زمانہ کی طرف مضاف ہو تو اس سے پہلا یا آخری وقت یا دن مراد لیا جاتا ہے۔

حدیث نبوی علیہ التحیۃ والسلام میں ہے کہ۔

ان الله یبعث لهذه الامة علیٰ رأس کل مائة سنة، من یجدد لها دینها.

یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں اس امت (کی اصلاح) کیلئے ایک شخص مبعوث کرے گا جو دین کی تجدید کریگا۔

سنن ابو داؤد مع عون ص ۱۷۸ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۵۲۲ ج ۴، و المعجم الاوسط للطبرانی ص ۲۷۲ ج ۷۔

جمہور محدثین و فقہاء اور آئمہ لغت کے نزدیک مذکورہ حدیث میں صدی کا آخر مراد ہے، جس کی ضروری تفصیل، عون المعبود ص ۱۷۸ تا ۱۸۲ ج ۴ میں دیکھی جاسکتی ہے، اس معنی کو ہی شیخ عبد الحق محدث دھلوی نے، اشعۃ اللمعات ص ۱۸۲ ج ۱، میں اختیار کیا ہے۔

الغرض لفظ، راس، کا معنی، اخرہ، عربی میں مستعمل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد، الطرف (کنارہ) ہوتا ہے خواہ ابتدا میں ہو یا آخر میں چنانچہ ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں

ای انتهائه او ابتدائه، یعنی کسی چیز کا اول یا آخر، مرقاۃ ص۱۰۱۳ ج۱۔

اگر اس کے معنی میں وسعت تسلیم کرتے ہوئے کسی چیز کا کنارہ تسلیم بھی کرلیا جائے، تو تب بھی یہ روایت مفتی صاحب کے مخالف ہی رہے گی، کیونکہ غزوہ احد ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں ہوا تھا، ضیاء النبی ص۴۶۱ ج۳ مؤلفہ پیر کرم شاہ بھیروی بریلوی، اگر آنحضرت ﷺ کا شہدا احد کی قبور کی طرف سفر عرس کیلئے ہوتا تو ماہ شوال میں ہوتا کیونکہ بقول مفتی صاحب عرس تو کہتے ہیں ہر سال تاریخ وفات پر قبر کی زیارت کرنا اور قرآن خوانی و صدقات کا ثواب پہنچانا۔ جاء الباطل ص۳۲۲۔

مگر آنحضرت ﷺ شوال کی بجائے سال کے ابتدا میں یا آخر میں مقام احد پر تشریف لے جاتے تھے جس میں نہ قرآن خوانی ہوتی تھی نہ ایصال ثواب نہ مجلس وعظ کا بیان ہے، نہ ڈھول کی دھل کا۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس سے عرس کا جواز ثابت کر رہے ہیں، لیکن جو لفظ ان کے استدلال باطل کو رد کرتا تھا اس کا معنی ہی چھوڑ دیا ہے، اس طرح کی بے ایمانیوں سے ان کی کتاب بھری پڑی ہے مگر مبتدعین انہیں حکیم الامت کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

عرس زیارت قبور اور صدقہ خیرات کا مجموعہ ہے، زیارت قبور بھی سنت، صدقہ بھی سنت تو دو سنتوں کا مجموعہ حرام کیونکر ہوسکتا ہے؟

مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور میں ہے کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ضرور زیارت کیا کرو اس سے ہر طرح کی زیارت قبور کا جواز معلوم ہوا خواہ روزانہ ہو یا سال کے بعد اور خواہ تنہا زیارت کی جائے یا کہ جمع ہوکر اب اپنی طرف سے اس میں قیود لگانا کہ مجمع کے ساتھ زیارت کرنا منع ہے سال کے بعد مقرر کرکے زیارت کرنا منع ہے محض لغو ہے معین کرکے ہو یا بغیر معین کئے ہر طرح جائز

ہے۔ جاء الباطل ص ۳۲۳ ج ا۔

کیا جب کیفیت بدل جائے تو حکم شرعی میں تبدیلی آجاتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب کا عرس کو زیارت اور صدقہ کا مجموعہ قرار دینا غلط بیانی ہی نہیں ہٹ دھرمی اور کھلا ہوا تعصب ہے ہم ارباب عقل وخرد کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے کسی بھی مزار پر جا کر عرس کا مشاہدہ کریں تو وہ اس حقیقت کو بخوبی معلوم کرلیں گے کہ عرس کے کئی دیگر بھی لوازمات ہیں جنہیں مفتی صاحب نے ذکر نہیں کیا، مثلا موسیقی ، ڈھول کی تھاپ پر ملنگوں کا رقص، رنڈیوں کے مجرا پر اوباش قسم کے لوگوں کا قہقہے لگا کر روپے نچھاور کرنا، لچوں کا عورتوں سے اختلاط پر اشارہ بازی، لوگوں کا قبروں پر سجدہ کرنا، کئی اور چیزیں بھی آپ کو دیکھنے میں ملیں گی، اہل بصیرت کئی اور باتوں کو اخذ کرکے مفتی صاحب کی بات کی پرزور مذمت کریں گے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ استدلال کہ دوسنتوں کا مجموعہ بھی سنت ہی رہے گا، اصول کی کس کتاب میں ایسا لکھا ہے، ذرا بحوالہ اس کی صراحت تو کیجئے، تھوڑی سی عقل وخرد کا مالک شخص بھی ایسا دعوی نہیں کرسکتا، ہم مبتدعین کو دعوت فکر دیتے ہوئے چند چیزوں کی نشان دہی کرتے ہیں

(۱) اللہ تعالی کو رکوع و سجود کرنا حکم شرعی ہے، قرآن پڑھنا بھی حکم شرعی ہے، کیا ان دونوں کا مجموعہ جائز ہوگا، یعنی رکوع و سجود میں قرآن پڑھنا جائز ہے؟

(۲) نوافل پڑھنا جائز و مستحب اور سنت خیر الانام سے ثابت ہیں ان کا جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی سنت ہے اس طرح جماعت کے لیے اذان کہنی بھی سنت ہے تو کیا نفلی نماز کے لئے اذان کہنی سنت ہوگی؟ مگر ان دونوں کے مجموعہ کو بریلوی بھی بدعت سئیہ ہی کہتے ہیں اور تداعی سے نوافل کی جماعت کو ناجائز کہتے ہیں۔

(۳) انگور اور پانی دونوں حلال وطیب ہیں مگر ان کے مجموعہ میں جب جوش آجائے تو بریلوی بھی اسے شراب سے تعبیر کرکے حرمت کا فتوی لگاتے ہیں۔

(۴) قضائے حاجت کے وقت بیت اللہ کی طرف منہ نہ کرنا سنت ہے، اور اذان کا جواب دینا بھی سنت ہے اب اگر کوئی شخص ان دونوں سنتوں کو بیک وقت جمع کرے تو بقول مفتی صاحب وہ جائز ہی ہیں، انا للہ انا الیہ راجعون۔

خلاصہ یہ کہ یہ اصول ہی سرے سے درست نہیں کہ دو مباح و مستحب اور سنت کے مل جانے سے ان کا مجموعہ بھی سنت ہی رہے گا، کیونکہ دو چیزوں کے ملاپ سے ان کی ہیت بدل جاتی ہے اور کیفیت بدلنے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔

مثال کے طور پر چند چیزوں کی ہم نشان دہی کرتے ہیں

(۱) بیوی کی بہن سے شادی کرنا حرام ہے (سورۃ النساء۲۳) مگر جب مرد کی بیوی فوت ہوجائے یا طلاق دے دی جائے تو اب سالی سے شادی کی جاسکتی ہے کیونکہ ہیت بدلنے سے حکم بدل گیا۔

(۲) رمضان المبارک کے مہینہ میں رات کو بیوی سے مباشرت کرنی جائز ہے مگر معتکف کیلئے ناجائز ہے کیونکہ کیفیت بدل جانے سے حکم شرعی بھی بدل گیا۔

(۳) کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن بھول کر کھاپی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ دونوں کے کھانے کی کیفیت جدا جدا ہے۔

(۴) صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینے کے متعلق دریافت کیا تو آپ علیہ السلام نے اجازت دے دی، پھر دوسرا آیا تو اس نے بھی یہی پوچھا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا، حدیث کے آخری الفاظ ہیں،

الذی رخص له شیخ والذی نهاه شاب.

یعنی جسے اجازت دی وہ بوڑھا تھا جسے منع فرمایا وہ نوجوان تھا،

سنن ابو داود مع عون ص ۲۸۵ ج ۲، و بیهقی ص ۲۳۱ ج ۴.

اب دیکھنے میں تو دونوں ہی مسلمان کلمہ گو تھے مگر ایک کو اجازت عنایت فرمائی، دوسرے کو روک دیا، کیوں؟ اس لئے کہ دونوں کی کیفیت ایک نہ تھی۔

(۵) ایک مسلمان خاتون نے رات کو رمضان المبارک کا روزہ رکھنے کی نیت کی مگر جب سحری کھانے کیلئے بیدار ہوئی تو ماہواری کا خون جاری ہو چکا تھا، لیکن اب روزہ نہیں رکھ سکتی (گو اس نے نیت کررکھی تھی) کیوں؟ اس لئے کہ اس کی کیفیت بدلنے سے حکم بدل گیا۔

(۶) ایک شخص جو صبح کے وقت دیوانہ تھا تو شرعی طور پر مرفوع القلم تھا مگر وہی شخص ظہر کے

وقت دیوانا نہ رہا تو اب وہ مرفوع القلم نہ رہا، نماز ظہر اور دیگر شرعی احکام اس پر جاری ہو جائیں گے، کیوں؟ اس واسطے کہ اس کی ہیت بدلنے سے شرعی حکم میں تبدیلی آگئی۔

اس طرح کی بیسیوں امثلہ دی جاسکتی ہیں مگر انہیں پر اکتفا کر رہا ہوں، الغرض یہ بنیادی اصول اور ضابطہ ہے کہ کسی چیز کی ہیت بدل جانے سے اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے مگر افسوس کہ مفتی صاحب ھٹ دھرمی کی وجہ سے اس پر بضد ہیں کہ دو چیزوں کے مجموعہ سے بھی وہی حکم رہتا ہے جو کہ ان کے جدا جدا میں تھا۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں بہت سی برکات جمع ہوجاتی ہیں، ایک پیر کے مریدین اس تاریخ میں اپنے پیر بھائیوں سے بلا تکلف مل لیتے ہیں جس سے ایک دوسرے کے حللات سے واقفیت ہوتی ہے اور آپس میں محبت بڑھتی ہے طالبان کو پیر تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے اگر عرس میں پہنچے تو وہاں مختلف بزرگان دین جمع ہوتے ہیں علماء صوفیاء کا مجمع ہوتا ہے سب کو دیکھ کر جس سے عقیدت ہو اس سے بیعت کر لے، حج اور زیارت مدینہ منورہ بھی تاریخ مقررہ میں ہی ہوتے ہیں اس میں بھی گزشتہ فوائد ملحوظ ہیں۔ جاء الباطل ص۳۲۴ ج۱۔

کیا عرس میں حج جیسے فوائد ہیں؟

الجواب ۔ اولاً۔ حج تو ایک مخصوص شرعی عبادت ہے جس کی شریعت حقہ نے حدود و قیود بیان فرمائیں ہیں جبکہ عرس کی کسی شق کو دین اسلام نے بیان ہی نہیں فرمایا، یہ یار لوگوں کی ایجاد ہے جو شعائر اسلامی (حج) کے بالمقابل وضع کیا گیا ہے جس کا اعتراف خود مفتی صاحب نے کرلیا ہے، جب مبتدعین کے حکیم الامت کو اقرار ہے کہ عرس میں وہی فوائد ہیں جو بیت اللہ میں ہیں تو گویا دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ مان لیا کہ عرس میں وہی برکات ہیں جو حج بیت اللہ میں ہیں اور حج

کی برکات کو عرس میں شامل ہونے سے حاصل کیا جاسکتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، جب بریلوی مکتب فکر کا جید عالم عرس کو حج بیت اللہ کے مساوی قرار دیتا ہے تو اس کے شرک و بدعت ہونے میں کیا کلام ہے۔

یہی مرزائی کہتے ہیں کہ، ہمارا جلسہ بھی حج کی طرح ہے، حج خدا تعالی نے مومنوں کی ترقی کیلئے مقرر کیا تھا آج احمدیوں کیلئے دینی لحاظ سے تو حج مفید ہے مگر اس سے جو اصل غرض یعنی قوم کی ترقی تھی وہ انہیں حاصل نہیں ہوسکتی ...... اس لئے خدا تعالی نے قادیان کو اس کام کیلئے مقرر کیا ہے۔

مرزے محمود کا خطبہ جمعہ مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۴ء مندرجہ (مرزائی) اخبار الفضل مورخہ ۳ جنوری ۱۹۱۵ء بحوالہ خطبات محمود ص ۲۳۶ ج ۴، طبع فضل عمر فاؤنڈیشن ربوہ بدون تاریخ۔

متنبّی قادیان مرزا غلام احمد قادیانی کا لخت جگر اور جانشین ثانی، اپنے سالانہ جلسہ کی برکات کو حج بیت اللہ کی برکات جیسی کہتا ہے اور مفتی صاحب عرس کی برکات کو حج بیت اللہ کی برکات جیسی باور کراتے ہیں۔

بت کرے آرزو خدائی کی — شان ہے تیری کبریائی کی،

خیر مفتی صاحب جو بھی کہیں انکا منہ تو بند نہیں کیا جاسکتا، لیکن اتنا تو ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ عرس کے باطل و مردود ہونے کیلئے بس یہی کافی ہے کہ یہ حج جیسے شعائر اللہ کی طرح منایا جاتا ہے اور حج کی طرح اس سے برکات حاصل کرنے کا زعم باطل اور عقیدہ رکھا جاتا ہے۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ دن مقرر کرنے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے، لیکن زیارت قبور کیلئے جمع ہونے کی کوئی دلیل شرعی تو وہ نادارد مفتی صاحب کی یہ بات تو تب قابل غور تھی جب وہ زیارت قبور کیلئے جمع ہونے کی دلیل عنایت فرماتے، اور تاریخ کو مقرر کرنے میں سہولت کا بہانا پیش کرتے، مگر افسوس کہ مفتی صاحب بنیاد تو ثابت نہیں کرتے لیکن چھت کے فوائد گنوانے بیٹھ گئے ہیں۔

ثالثاً۔ پیر بھائیوں سے ملاقات اور پیر کی تلاش میں آسانی کا ڈھکوسلہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں، ایک مسلمان کلمہ گو اور مومن کو بھلا پیر کی تلاش کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے، ان کا ہادی و رہنما تو فقط ایک ہی ہے اور وہ جناب حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذات مقدسہ و طاہرہ ہے، پھر

پیر کی تلاش کیلئے عرس کی کوئی عقلی ونقلی دلیل تو وہ سرے سے ہی مفقود ہے۔

پھر قابل غور بات تو یہ ہے کہ عرس تو منایا جارہا ہے قبر میں مدفون شخص کا اور فوائد بیان کیئے جارہے ہیں زائرین کے، کہ یہاں آنے والوں کی باہم ملاقات ہوگی، اور لوگ پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ دعوی اور دلیل میں کونسی مناسبت ہے، دعوی تو عرس منانے کا، مگر اس کی دلیل دینے کے بجائے اس کے فوائد کو بیان کرنا شروع کردیا ہے۔

اگر بالفرض مفتی صاحب کے بیان کردہ فوائد کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ جس چیز میں کوئی فائدہ ہوتو وہ چیز حلال وطیب اور مباح ہے قرآن حکیم نے شراب کو حرام کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے

و منافع للناس۔ اور (اس میں) لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں۔ (البقرہ ۲۱۹)

اب اگر کوئی شخص شراب کے فوائد بیان کر کے اس کی حلت ثابت کرے تو مبتدعین بھی ایسے مجتہد کو دماغی اپریشن کا مشورہ دیں گے۔

یہی ہم عرس کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عرس منانے کی کوئی دلیل شرعی عنایت کیجئے، اپنے قیاس فاسد سے اس کے فوائد بیان نہ کیجئے۔

کیا قبر پر قرآن پڑھنا جائز ہے

حضرت مفتی صاحب نے عرس کے جواز کیلئے ایک ڈھکوسلہ یہ بھی پیش فرمایا ہے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہوکر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، بہت سی برکات جمع ہوجاتی ہیں۔ جاء الباطل ص۳۲۳ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ قبر پر جمع ہوکر یا انفرادی طور پر تلاوت قرآن اور کلمہ و درود کے ورد کی کوئی دلیل مفتی صاحب نے درج نہیں کی، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ اس کی کوئی دلیل درج کرتے، سنت خیر الانام (ﷺ) سے اس کا ثبوت دیتے، چونکہ اس کی کوئی دلیل شریعت میں نہ تھی لہذا مفتی صاحب نے اس سے خاموشی سادھ لی۔ جب یہ اجتماع ہی بدعت قبیحہ ہے تو لوگوں کا تلاوت قرآن وغیرہ کے

لئے جمع ہونے کا کیا معنی ہے۔

ثانیاً۔ فقہاء احناف کی عبارات پہلے ذکر کردی گئی ہیں، جو چیز سنت سے ثابت نہیں اس کا قبر ستان میں کرنا مکروہ تحریمی ہے، جب کہ تلاوت قرآن اور کلمہ طیبہ، درود کا ورد، قبر پر کرنا سنت سے ثابت نہیں لہذا بدعت قبیحہ اور مکروہ تحریمی ہے، جو اس کے جواز کا قائل ہے وہ کسی واضح دلیل سے اس کا ثبوت دے۔

ثالثاً۔ بلکہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ قبر کی زیارت کے وقت مدفون کے لئے دعا کرے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں قبرستان والوں کیلئے کیا کہوں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تم کہا کرو۔

السلام علی اهل الديار من المومنين وا لمسلمين و يرحم الله المستقدمين منا و المستاخرين و انا ان شاء الله بكم للا حقون. صحيح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱.

اسی کے قریب قریب ہی الفاظ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ جب نبی ﷺ قبرستان کی طرف جاتے تو ہمیں یہ کلمات سکھاتے تھے ۔ دیکھئے مشکوٰۃ ص۱۵۴ج۱، ومسلم ص۳۱۴ج۱۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ قبرستان جا کر صرف سلام اور دعا مانگنے کی رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی ہے، قرآن کی قراۃ اور دیگر ذکر و اذکار کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے نہیں دی، اگر وہاں تلاوت قرآن اور کلمہ وغیرہ کا ورد کرنا جائز ہوتا تو آنحضرت ﷺ کبھی بھی نہ چھپاتے بلکہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کو ان کے پڑھنے کی تاکید کرتے اور ام المومنین رضی اللہ عنھا اس کی امت کو اطلاع فرماتیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں اس کا خوب چرچا ہوتا، لیکن سنت سے قطعاً ثابت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم روضہ اقدس پر اس کا خوب انعقاد کرتے اور اپنے والدین اور عزیز و اقارب کی قبروں پر جوق در جوق جا کر تلاوت قرآن اور درود و کلمہ کا ورد کرتے، مگر انہیں معلوم تھا کہ اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، لہذا انہوں نے سنت صحیحہ کو لازم پکڑا اور جب بھی قبرستان جاتے تو مسنون طریقہ سے دعا و سلام کرکے واپس آجاتے۔

بلکہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبرستان تلاوت قرآن کا محل نہیں، چنانچہ حضرت ابوھریرہ

رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تجعلوا بیوتکم مقابران الشیطان ینفر من البیت الذی تقرأ فیه سورة البقرة.

یعنی اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ بیشک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورة بقرہ پڑھی جائے۔ صحیح مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، ومسند احمد ص ۳۷۸ ج ۲۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قبرستان قرآن پڑھنے کی جگہ نہیں، یہ حدیث اسی طرح جس طرح حسب ذیل فرمان نبوی ہے

صلوا فی بیوتکم ولا تتخذوها قبوراً.

یعنی اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انہیں قبریں نہ بناؤ۔

صحیح مسلم ص ۲۶۵ ج ۱، و ابوداؤد ص ۲۰۴ ج ۱، و نسائی ص ۱۹۰ ج ۱، و ترمذی مع تحفه ص، و مسند احمد ص ۱۲۳ ج ۳، و طبرانی کبیر ص ۲۵۸ ج ۵، و ابن ابی شیبه ص ۲۵۵ ج ۲، و التمهید ص ۲۲۹ ج ۵.

اس سے ثابت ہوا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح قبرستان میں قرآن کی تلاوت بھی درست نہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی کے استاذ شیخ علی متقی فرماتے ہیں

الا ول الاجتماع للقراة با لقران علی المیت بالتخصیص فی المقبرة او المسجد او البیت بدعة مذمومة.

یعنی تخصیص کے ساتھ قبرستان یا مسجد میں یا گھر میں میت کے لئے قراۃ قرآن کیلئے جمع ہونا بدعت مذمومہ ہے۔

رسالہ رد بدعات بحوالہ فتاوی نذیریہ ص ۱۷۷ ج ۱۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی فرماتے ہیں

وعادت نبود کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند وختمات خوانند نہ بر سر گور نہ غیر آن این بدعت است۔ مدارج النبوۃ بحوالہ ایضاً ص ۱۷۷ ج ۱۔

اس کے بدعت مذمومہ اور حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تلاوت قرآن فی نفسہ عبادت ہے اور قبریں محل عبادت نہیں۔

شیخ الاسلام امام تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں،

وأما جعل المصاحف عند القبور لمن یقصد قراءة القرآن هناک، و تلاوته فبدعة منکرة، لم یفعلها أحد من السلف، بل هی تدخل فی معنیٰ، اتخاذ المساجد علی القبور، و قد استفاضت السنن عن النبی ﷺ فی النهی عن ذلک، حتی قال، لعن الله الیهود و النصار، اتخذوا قبورانبیائهم مساجداً، یحذر ما صنعوا. قالت عائشة، و لولا ذلک لأ برز قبره ، ولکن کره ان یتخذ مسجداً، و قال إن من کان قبلکم کانوا یتخذون القبور مساجد، ألا فلا تتخذوا القبور مساجد، فانی انها کم عن ذلک، ولا نزاع بین السلف والائمة فی النهی عن اتخاذ القبور مساجد، و معلوم انالمساجد بنیت للصلاة و الذکر و قرآءة القرآن، فاذا اتخذ القبر لبعض ذلک کان داخلا فی النهی. .... ولو کان المیت ینتفع بمثل ذلک لفعله السلف، فانهم کانوا اعلم بما یحبه الله و یرضاه، واسرع الی فعل ذلک و تحریه،

یعنی قبر کے پاس قرآن کو اس مقصد کے لئے رکھنا کہ اس کی وہاں تلاوت کی جائے ، بدترین بدعت ہے، سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کیا، بلکہ یہ قبروں کو مساجد بنانے کے معنیٰ میں داخل ہے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، حتی کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے انبیاء کرام علیھم السلام کی قبروں کو مساجد بنالیا، اس فرمان میں آپ علیہ السلام نے (اپنی امت کو) ڈرایا ہے جو یہود و نصاریٰ نے کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر اس کا خوف نہ ہوتا تو آپ علیہ السلام کی قبر اطہر کو باہر کھلی جگہ پر بنایا جاتا لیکن آپ علیہ السلام کو یہ ناپسند تھا کہ اسے مسجد بنالیا جائے، اور آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلی اقوام (اپنے انبیاء) کی قبروں پر مسجد بنالیتی تھیں۔ آگاہ رہو کہ قبروں کو مسجد نہ

بنانا، میں اس چیز سے اپنی امت کو منع کرتا ہوں،

آئمہ سلف صالحین میں اسکی ممانعت میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ معلوم ہے کہ مساجد کو نماز پڑھنے ذکر اور قرأۃ قرآن کے لئے بنایا جاتا ہے، اور قبر کو جب ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی لازم ومخصوص کرلیا تو یہ نھی میں داخل ہوا، اگر میت ان چیزوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکتی تو آئمہ سلف اس کو ضرور کرتے، کیونکہ وہ اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کی راہوں کو زیادہ جانتے تھے، اور نیک عمل کرنے اور اس پر رغبت دینے میں بھی جاری کرنے والے تھے۔ **مجموع فتاوٰی** ابن تیمیہ ص۳۰۲ ج۲۴۔

ملا علی القاری حنفی شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں کہ۔

ثم القرأة عندالقبور مکروهة عندابی حنیفة و مالک و احمد رحمهم الله فی روایة لانه محدث لم ترد به السنة،

یعنی امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ امام احمدؒ کے نزدیک قبروں کے پس قرآن کی تلاوت کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ (عمل) من گھڑت ہونے کے علاوہ سنت سے ثابت نہیں ہے، شرح فقہ اکبر ص۱۳۱ طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی بدون تاریخ۔

باب بحث سفر عرس

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ عرس بدعت سیئہ ہے تو اس کیلئے سفر بھی بدعت ہی ہوگا، کیونکہ جو کام برا ہے اس کیلئے سفر بھی جائز نہیں۔

عرس بری بدعت ہے تو اس کیلئے سفر بھی ناجائز ہی ہوگا، پھر خاص طور پر کہ جب اس سفر سے مقصود یہ ہوگا کہ وہاں تقرب حاصل ہوگا، وہاں دعا جلدی قبول ہوتی ہے الغرض کسی ولی کی قبر یا اس کے محل عبادت کو مخصوص کر کے سفر کرنا کہ وہاں اعتکاف کروں گا یا نوافل ادا کروں گا، وغیرہ تو یہ تمام امور بدعت قبیحہ اور ناجائز ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ قبروں کی زیارت مستحب عمل ہے لیکن اس کیلئے سفر کرنا ناجائز ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقط زیارت کی نیت سے سفر حرام ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۱) عن النبی ﷺ قال لاتشد الرحال الا الی ثلثة مساجدالمسجد الحرام و مسجد الرسول و مسجد اقصیٰ۔

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ نہ سفر کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام (کعبہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی طرف۔

بخاری ص۱۵۸ ج۱، واللفظ لہ و مسلم ص۴۴۷ ج۱۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۲) قال رسول اللہ ﷺ لا تشد الرحال الا ثلثة مساجد مسجد الحرام و مسجدی ھذا و مسجد الاقصیٰ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کجاوے اور زین باندھے نہ جائیں (یعنی سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف، ایک مسجد حرام اور میری یہ مسجد، اور مسجد اقصیٰ۔

ترمذی مع تحفہ ص۲۷۰ ج۱، و اللفظ لہ، و بخاری ص۱۵۹ ج۱، و مسلم ص۴۳۳ ج۱۔

یہ احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف تقرب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی فرماتے ہیں

كان اهل الجاهلية يقصدون مواضع معظمة بزعمهم يزور ونها و يتبر كون بها و فيه من التحريف والفساد ما لا يخفى فسد النبى ﷺ الفساد لئلا يلتحق غير الشعائر بالشعائر و لئلا يصير ذريعة لعبادة غير الله والحق عندى ان القبر و محل عبادة ولى من اولياء الله والطور كل ذالک سوا فى النهى.

زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے مذمومہ متبرک مقامات کی زیارت کیلئے جاتے تھے اس میں چونکہ غیر اللہ کی عبادت کا دروازہ کھلتا ہے جو کسی سے بھی مخفی نہیں، اس لئے تحریف اور فساد کے اس راستے کو نبی ﷺ نے اپنے فرمان ''لا تشد الرحال الا الى ثلثة'' کے ذریعے سے بند فرما دیا، تاکہ غیر شعائر، شعائر سے نہ مل جائیں اور یہ چیزیں غیر اللہ کی پرستش کا ذریعہ نہ بنیں اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ قبر کسی ولی کی یا اس کا محل عبادت اور کوہ طور یہ تمام کی تمام اس میں داخل ہیں اور (ان کا قصد کر کے سفر اختیار کرنیکی) ممانعت میں شامل ہیں،

حجة الله ص ۱۹۲ ج ۱ ، طبع مكتبه سلفيه.

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

كل من ذهب الىٰ بلدة اجمير او قبر سالار مسعود اوماضا ها لاجل حاجة يطلبها فانه اثم اثما اكبر من القتل و الزنا اليس مثله الا مثل من كان يعبد المصنوعات او مثل من كان يدعوا اللّات و العزىٰ.

ہر وہ شخص جو شہر اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ان جیسی دیگر قبروں اور جگہوں پر طلب حاجات کیلئے جاتا ہے وہ قتل اور زنا سے بھی زیادہ بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ایسا شخص بالکل اس شخص کی طرح ہے جو خود ساختہ چیزوں کی عبادت کرتا ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو لات وعزیٰ کو پکارتا ہے، التفہیمات الالٰہیہ ص ۴۵ ج ۲ طبع قدیم۔

مفتی صاحب کا پہلا عذر

اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ ان تین مسجدوں میں نماز کا ثواب زیادہ ملتا ہے .... لہٰذا ان مساجد میں یہ نیت کر کے دور سے آنا چونکہ فائدہ مند ہے جائز ہے لیکن کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا یہ سمجھ کر کہ وہاں ثواب زیادہ ملتا ہے محض لغو ہے اور ناجائز کیونکہ ہر جگہ کی مسجد میں ثواب یکساں ہے جیسے بعض لوگ دہلی کی جامع مسجد میں جمعۃ الوداع پڑھنے کیلئے سفر کر کے جاتے ہیں، یہ سمجھ کر کہ وہاں ثواب زیادہ ہوتا ہے یہ ناجائز ہے تو سفر کرنا کسی مسجد کی طرف اور پھر زیادتی ثواب کی نیت سے منع ہوا۔ جاء الباطل ص ۳۳۲ ج ۱۔

کیا، لاتشد الرحال، کی ممانعت صرف مساجد کے ساتھ خاص ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ اگر بالفرض اس توجیہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی یہ مبتدعین کے خلاف ہے، کیونکہ یہ لوگ قبر ولی کے جوار میں بنی ہوئی مسجد میں حصول برکت کیلئے نوافل ادا کرتے ہیں، نماز پڑھتے اور اعتکاف بیٹھتے ہیں، مثلاً علی ہجویری کے مزار پر بنی ہوئی مسجد میں اعتکاف کرنے کیلئے یہ حضرات ایک سال قبل درخواست دیتے ہیں، پھر ان میں قرعہ اندازی ہوتی ہے، پھر جس کا نام نکل آئے اسے جگہ ملتی ہے۔

تو کیا مبتدعین کا یہ عمل جو کہ حد تواتر تک پہنچ چکا ہے، زیادتی ثواب کیلئے ہی نہیں ہوتا؟ اگر زیادتی ثواب کی نیت نہیں ہوتی تو اس کے لئے تو کسی بھی مسجد میں اعتکاف کیا جا سکتا ہے، علی ہجویری کی قبر کے جوار میں بنی ہوئی مسجد کی تخصیص ہی کیوں ہے؟، مگر فرقہ بریلویہ اس کے ترک کے لئے قطعاً تیار نہیں، معلوم ہوا کہ مفتی صاحب نے مذکورہ حدیث سے جان چھڑانے کیلئے یہ عذر بنایا ہے ورنہ عملی طور پر یہ حضرات اسے بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔

ثانیاً۔ اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث سے طور کا سفر اختیار کرنیکی ممانعت ثابت کی ہے، چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ طور سے واپس آئے تو حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی تو

فقال من این جئت؟ قلت من الطور، قال لو لقیتک من قبل ان تاتیه لم تاته قلت له و لم؟ قال انی سمعت رسول اللهﷺ یقول لاتعمل المطی الا الی ثلثة مساجد المسجد الحرام و مسجدی و مسجد بیت المقدس. الحدیث.

انہوں نے پوچھا تم (ابوھریرہ رضی اللہ عنہ) کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا طور سے انہوں نے کہا کہ اگر تم مجھ سے طور پر جانے سے پہلے ملتے تو وہاں نہ جاتے، میں (ابوھریرہ رضی اللہ عنہ) نے کہا کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہﷺ سے سنا ہے کہ سفر نہ کیا جائے مگر تین مساجد کی طرف مسجد حرام، میری مسجد، اور مسجد اقصیٰ۔ الحدیث۔

سنن نسائی ص۱۶۸ ج۱، و موطا امام مالک ص۹۲.و السنن الکبریٰ للنسائی ص۵۴۰ج۱ (رقم الحدیث ۱۷۵۴) و مسند امام احمد ص۷ ج۶و مشکل الاثار ص۲۴۲ ج۱ و مسند طیالسی(۱۳۴۸و ۲۵۰۶) و طبرانی کبیر ص۲۷۶ ج۲ و طبرانی الاوسط ص۳۷۸ ج۳ و التمهید ص۳۶ ج۲۳.

اس روایت سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس حدیث کو عام جان کر اس سے کسی جگہ پر تقرب کی نیت سے سفر کرنے کو ممنوع جانا ہے، تب ہی حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ طور کے سفر کی ممانعت ثابت کرتے ہیں، اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ان کے استدلال پر سکوت کر کے تصدیق کرتے ہیں، اگر حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ کا استدلال غلط ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم بالعموم اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بالخصوص اس کی تردید کرتے مگر انہوں نے اس استدلال کی تردید کرنے کی بجائے خاموشی سے اس استدلال کے درست ہونے کی تصدیق کردی۔

حافظ ابن حجرؒ (جو زیر بحث مسئلہ میں ہمارے قدرے مخالف بھی ہیں) کو بھی اس حقیقت کا اقرار کرنا پڑا کہ

فقال الشیخ ابو محمد الجوینی یحرم شدالرحال الی غیرها عملا بظاهرهذا الحدیث و اشار القاضی حسین الی اختیاره و به قال عیاض وطائفة و یدل علیه ما

رواه اصحاب السنن من انکار بصرة الغفاری علی ابی هریره رضی الله عنه خروجه الی الطور و قال له لو ادرکتک قبل ان تخرج ماخرجت و استدل بهذا الحدیث فدل علی انه یری حمل الحدیث علی عمومه و وافقه ابو هریره.

یعنی شیخ ابو محمد جوینی نے کہا کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ (تقرب) کیلئے سفر کرنا حرام ہے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے اور قاضی حسینؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اختیار کرنے میں اور قاضی عیاض اور ایک گروہ اہل علم نے بھی یہی کہا ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے وہ حدیث جو اصحاب سنن نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ پر بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ نے انکار کیا ان کے سفر طور پر اور کہا کہ اگر تم مجھے جانے سے پہلے ملتے تو کبھی بھی نہ جاتے، اور اسی حدیث (لاتشدد الرجال) سے انہوں نے استدلال کیا تو یہ دلیل ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو عام جانا ہے اور سیدنا ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ نے انکی موافقت کی، فتح الباری ص ۵۰ ج ۳۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

اس طرح معروف تابعی قزعہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر سے پوچھا۔ کیا میں کوہ طور پر جا سکتا ہو؟ انہوں نے فرمایا **دع الطور ولا تاته وقال لاتشد الرحال اِلاّ الیٰ ثلاثه مساجد، مصنف ابن ابی شیبة ص ۶۵ ج ۴ ق ۲ کتاب الحج باب فیما تشد الیه الرجال.**

کوہ طور کو چھوڑو اور وہاں نہ جاؤ اور فرمایا تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف رخصت سفر نہ باندھا جائے جس سے واضح ہے کہ حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے تین مساجد کے لیے مطلقا بطور تقرب کے سفر کو عام سمجھا ہے اور حدیث کے ظاہری الفاظ سے بھی یہی واضح ہے کہ جو ان صحابہ کرام نے سمجھا ہے اور یہی درست ہے۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

الغرض یہ حدیث عام ہے اور اس سے ہر مقام پر جانے کی نفی ثابت ہوتی ہے جس میں تقرب

کی نیت سے سفر کیا جائے ایک مسلمان بیت اللہ، بیت المقدس، اور مسجد نبوی کی طرف تقرب کی نیت سے سفر کرتا ہے ہم اس جگہ مبتدعین کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سفر عرس تو کجا محض زیارت کی نیت سے قبروں کے سفر کا جواز کسی صحابی و تابعی بلکہ دوسری صدی تک ثابت کر دو تو انعام حاصل کرو!

جب کہ ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فتوی دکھا دیا ہے اور کسی صحابی سے ان کی مخالفت ثابت نہیں، لہذا آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ سفر عرس کے ثبوت کیلئے کوئی نص یا صحابی و تابعی کا قول دکھائیں یہاں متاخرین کے اقوال کو پیش کر کے اپنے فہم معکوس کا ثبوت نہ دیجئے گا، آپ سے ثبوت مانگا ہے تو خیر القرون سے جو ان شاء الرحمٰن آپ کبھی بھی نہیں دے سکتے۔

مفتی صاحب کا دوسرا عذر

اسی مشکوۃ کتاب الجھاد میں ہے

لا ترکب البحر الا حاجاً او متعمداً اوغازیاً فان تحت البحر نار اوتحت النار بحراً۔

دریا میں سوار نہ ہو مگر حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا۔

کہیئے کیا سوائے ان تینوں کے اوروں کو سفر دریا حرام ہے، غرضیکہ حدیث کا وہی مطلب ہے جو کہ ہم نے عرض کر دیا ہے ورنہ دنیا کی زندگی مشکل ہو جاوے گی۔ جاء الباطل ص ۳۳۵ ج ۱۔

کیا حاجی و غازی کے علاوہ کوئی اور دریائی سفر کر سکتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ مفتی صاحب نے آدھی روایت کا معنی تو کر دیا ہے مگر آدھی کا شرم کے مارے ترک کر دیا ہے کہ کہیں عوام مذاق نہ اڑائیں اب پورا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

دریا میں (کشتی پر) سوار نہ ہو مگر حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا کیونکہ دریا کے نیچے آگ ہے

یا آگ کے نیچے دریا ہے۔ مشکوٰۃ ص۳۳۳، روایت کے اس آخری حصہ کا معنی ترک کرنے کی دو ہی وجہیں ہوسکتیں ہیں

(۱) کشتی کے دوسرے حصہ میں سوار نہ ہونے کی وجہ بیان کی گئی تھی۔

(۲) اس میں بیان تھا کہ دریا کے اوپر آگ ہے یا نیچے۔

چونکہ اس کے معنی کرنے سے مفتی کے استدلال میں خامی کے علاوہ اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ اس روایت کی تکذیب نہ کریں کہ حضرت جی دریا کے اوپر نیچے آگ کہاں ہوتی ہے۔

اس لئے مفتی صاحب نے اس کے معنی چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی اور پلہ چھڑانے کیلئے مفتی صاحب نے جو بہانہ تلاش کیا وہ صریحاً بے ایمانی ہے۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس پر دووجہ سے کلام ہے (۱) اس کی سند میں بشر ابی عبداللہ اور بشیر بن مسلم دو راوی ہیں، ابو داؤد (۲۴۷۹) اور یہ دونوں ہی مجھول ہیں، جیسا کہ تقریب ص۳۵، اور، میزان ص۳۲۷ ج۱ میں ہے۔

(۲) روایت مضطرب ہے کیونکہ مطرب بن طریف کبھی تو بشر ابی عبداللہ کے واسطے سے بشیر سے بیان کرتا ہے، ابو داؤد مع عون ص۳۱۴ ج۲، اور کبھی بغیر واسطے سے بشیر سے بیان کرتا ہے، بیھقی ص۳۳۴ ج۴، جب کہ بشیر بن مسلم کبھی تو ابن عمر سے روایت بیان کرتا ہے، ابو داؤد، و بیھقی، اور کبھی عن رجل عن ابن عمر، کہتا ہے، میزان الاعتدال ص۳۲۹ ج۱، اسی وجہ سے محدثین کرام نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ علامہ خطابی، امام ابو داؤد، امام احمد، اور عبدالحق وغیرہ نے اس روایت کو مجروح قرار دیا ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے سلسلہ ضعیفہ ص۴۹۰ ج۱۔

الغرض یہ روایت سند کے اعتبار سے مردود ہے جب کہ حدیث، لاتشد الرحال، کی سند متواتر ہے لہذا مفتی صاحب کا صحیح کے بالمقابل ضعیف روایت پیش کر کے، لاتشد، کا مفہوم بگاڑنا زیادتی ہے، جو سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی لکھتا ہے کہ

بعض جہال بدمست یا نیم ملاّ شہوت پرست یا جھوٹے صوفی بادبدمست کہ احادیث صحاح

مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے یا متشابہ پیش کرتے ہیں، انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف ....واجب الترک ہے۔احکام شریعت ص ۶۲ حصہ اول، وفتاوی رضویہ ص ۱۹۹ ج ۱۰ جزو اول۔

اسوہ فاروقی اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنھم

ابن سعد میں بسند صحیح امام نافعؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اس درخت کے پاس برکت حاصل کرنے اور متبرک جگہ جان کر نماز پڑھنی شروع کردی ہے جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کٹوا دیا، بحوالہ فتح الباری ص ۳۶۱ ج ۷ باب غزوہ الحدیبیۃ

دیکھئے یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے قیام فرمایا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے بیعت لی، رب قدیر کی طرف سے اسی مقام پر سکینت نازل ہوئی اور ایک تاریخ ساز دستاویز تیار ہوئی جس نے آگے چل کر فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کردیا لوگوں نے اس مقام کو بابرکت جان کر یہاں نوافل وغیرہ ادا کرنے شروع کردیئے تھے، جس کی روک کیلئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو سرے سے ہی کٹوا دیا کہ کہیں یہ درخت فتنہ کا باعث نہ بن جائے اور آنے والی نسلیں اس کو بھی شعائر میں داخل نہ کرلیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی جگہ امر واقعہ میں بھی بابرکت ہو تو اس کو منتخب کر کے عبادت و تقرب کیلئے خاص نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ اور ایجاد بدعت کی وجہ سے اس کو تقرب کیلئے خاص کرنا غلط ہے اور اس غلطی کو دور کرنے کیلئے حکم فاروقی سے وہ درخت کاٹ دیا گیا اور اس درخت کو کاٹنے پر کسی نے مخالفت نہیں کی لہذا ثابت ہوا کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا اجماع سکوتی ہے جو کہ بلاشبہ حجت قاطع اور برہان واضح ہے۔

مفتی صاحب کا ڈھکوسلہ

فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو ہرگز نہیں کٹوایا بلکہ اصل

درخت قدرتی طور پر لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگیا تھا اور لوگوں نے اس کے دھوکے میں دوسرے درخت کی زیارت شروع کر دی تھی اس غلطی سے بچانے کیلئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس دوسرے درخت کو کٹوایا اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تبرکات کی زیارت کے مخالف ہوتے تو حضور علیہ السلام کے بال مبارک تہبند شریف اور قبر انور سب ہی زیارت گاہ بنی ہوئی تھیں ان کو کیوں باقی رہنے دیا۔

مسلم جلد دوم کتاب الامارت باب بیعت الرضوان، بخاری جلد دوم باب غزوہ الحدیبیہ میں ابن مسیّب سے روایت ہے کہ میرے والد بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے حضور علیہ السلام سے درخت کے پاس بیعت کی تھی انہوں نے فرمایا کہ ہم سال آئندہ حج کیلئے گئے تو اس کی جگہ ہم پر مخفی ہوگئی، پھر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصل درخت کٹوا دیا۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا تمام صحابہؓ ہی بیعت رضوان والے درخت کو بھول گئے تھے؟

الجواب ۔ اولاً۔ مفتی صاحب اور ان کے مکتب فکر کے علماءؒ پر لازم ہے کہ وہ سند معتبر سے ثابت کریں کہ لوگوں نے دھوکے سے دوسرے درخت کے پاس نوافل ادا کئے تھے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مصنوعی زیارت گاہ کو ختم کرنے کی غرض سے اس (دوسرے درخت) کو کٹوایا تھا۔ یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس بات کو کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے، فقط مفتی صاحب کی ایجاد ہے، جنھوں نے اللہ کا خوف کیئے بغیر اس کو گھڑ لیا ہے۔

ثانیاً۔ بخاری میں محمود بن رافع کی سند سے حضرت مسیّب رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں، **ثم انسیتھا بعد**، اس کے بعد میں اس درخت کو بھول گیا۔ بخاری شریف ص ۵۹۹ ج ۲۔

اور حضرت مسیّب رضی اللہ عنہ کے بھول جانے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم ہی بیعت رضوان کا مقام بھول گئے تھے۔

اے جی اسی بخاری کے اسی باب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

ولو كنت ابصر اليوم لاريتكم مكان الشجرة.

یعنی اگر میری آنکھیں ہوتیں (حضرت جابر رضی اللہ عنہ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے) تو میں آپ کو اس درخت کی جگہ دکھا دیتا۔ بخاری ص ۵۹۸ ج ۲۔

حافظ ابن حجر نے صراحت کی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بصارت زندگی کے آخری دور میں ختم ہوئی تھی، فتح الباری ص ۳۵۷ ج ۷۔ اور ان کی وفات راجح قول میں ۷۸ھ میں ہوئی تھی تھذیب ص ۳۸ ج ۲۔

شہادت فاروقی کا المناک سانحہ ۲۳ھ کے ابتدا میں پیش آیا تھا اگر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے نابینا ہونے کو وفات سے دو تین سال قبل تسلیم کرلیا جائے تو خلافت فاروقی اور ان کے نابینا ہونے کے درمیان (۵۳) سال بنتے ہیں گویا وہ درخت کاٹنے والے کی وفات سے نصف صدی بعد بھی کہتے ہیں کہ میں اس درخت کی جگہ جانتا ہوں اور اگر میں نابینا نہ ہوتا تو بیعت رضوان کی جگہ کی نشان دہی کروا دیتا، مگر مفتی صاحب صریحاً جھوٹ بولتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اس درخت کو بھول گئے تھے، پھر اس جھوٹ پر انہیں نہ شرم ہے نہ حیاء اور ہیں ماشاء اللہ مفتی اعظم اور حکیم الامت وغیرہ۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا بال مبارک، تہبند شریف اور قبر انور کی زیارت کا عذر پیش کرنا تو مبتدعین کسی معتبر دلیل سے ثابت کریں کہ دور فاروقی میں لوگ ان کے پاس تقرب کیلئے سفر کر کے آیا کرتے تھے اور ان کے پاس نماز بھی پڑھا کرتے تھے، ورنہ، لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید سے ڈریں واضح رہے کہ تبرکات (جسدیہ) نبویہ سے ہمیں انکار نہیں ہم ان تبرکات کو بسر وچشم قبول کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے آثار کے ساتھ تبرک جائز سمجھتے ہیں اور اس کا انکار نہیں کرتے، مگر آپ علیہ السلام کے کپڑوں، بالوں، ناخن وغیرہ یا اسی طرح کی دیگر اشیاء میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا، اور جن کے متعلق اب مشہور ہے کہ یہ تبرکات نبویہ ہیں ان کی صحت مشکوک ہے لہذا ان مصنوعی تبرکات کے بارے میں وہی عقیدہ رکھنا جو رسول اللہ ﷺ کے تبرکات کے بارے میں ہے غلط ہے کیونکہ یہ آنحضرت ﷺ کے تبرکات ہیں ہی نہیں۔

سفر عرس کے دلائل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

سفر کا حکم اس کے مقصد کی طرح ہے یعنی حرام کیلئے سفر کرنا حرام، جائز کیلئے سفر کرنا جائز اور سنت کیلئے سنت، فرض کیلئے فرض، حج فرض کیلئے سفر بھی فرض، کبھی جہاد و تجارت کیلئے سفر سنت ہے، کیونکہ یہ کام خود سنت ہیں، روضہ مصطفیٰ علیہ السلام کی زیارت کیلئے سفر واجب ہے، کیونکہ یہ زیارت واجب دوستوں کی ملاقات شادی ختنہ میں اہل قرابت کی شرکت، اطباء سے علاج کرانے کیلئے سفر جائز کیونکہ یہ چیزیں خود جائز ہیں، چوری ڈکیتی کیلئے سفر حرام، کیونکہ یہ کام خود حرام ہیں، غرضکہ سفر کا حکم معلوم کرنا ہو تو اس کے مقصد کا حکم دیکھ لو عرس خاص زیارت قبر کا نام ہے اور زیارت قبر تو سنت ہے لہذا اس کیلئے سفر بھی سنت ہی میں شمار ہوگا۔

قران کریم میں بہت سفر ثابت ہیں (مثلاً) سفر ہجرت، سفر تجارت، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کیلئے گئے، مشائخ کی ملاقات کیلئے سفر کرنا ثابت ہوا۔

یعقوب علیہ السلام نے فرزندوں کو تلاش یوسف کیلئے حکم دیا، تلاش محبوب کیلئے سفر ثابت ہوا، روزی کیلئے سفر ثابت ہوا، تبلیغ کیلئے سفر ثابت ہوا۔

من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله.

جو شخص تلاش علم میں نکلا وہ اللہ کی راہ میں ہے، حدیث میں ہے

اطلبوا العلم لو كان بالصين،

علم طلب کرو اگر چہ چین میں ہو۔

سیر کیلئے سفر ثابت ہے، جن ملکوں پر عذاب الٰہی آیا انکو عبرت پکڑنے کیلئے سفر ثابت۔

جب اس قدر سفر ثابت ہوئے تو مزارات اولیاء کی زیارت کیلئے سفر کرنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوا، یہ حضرات طبیب روحانی ہیں، اور ان کے فیوض مختلف، ان کے مزارات پر پہنچنے سے شان الٰہی نظر آتی ہے کہ اللہ والے بعد وفات بھی دنیا پر راج کرتے ہیں اس سے ذوق عبادت پیدا ہوتا ہے ان کے مزارات پر دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

شامی جلد اول بحث زیارت قبور میں ہے اور آیا زیارت قبور کیلئے سفر کرنا مستحب ہے، جیسے کہ آج کل خلیل الرحمٰن علیہ السلام اور سید بدوی علیہ رحمۃ کی زیارت کیلئے سفر کرنے کا رواج ہے، میں نے اپنے آئمہ میں سے کسی کی تصریح نہیں دیکھی، بعض شافعی علماء نے منع کیا ہے مسجدوں کے کیلئے سفر پر قیاس کر کے لیکن امام غزالی نے اس کی تردید کر دی ہے فرق واضح فرمادیا لیکن اولیاء اللہ تقرب الی اللہ وزائرین کو نفع پہنچانے میں مختلف ہیں بقدر اپنے معروف و اسرار کے۔

مقدمہ شامی میں امام ابو حنیفہؒ کے مناقب میں امام شافعی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔

میں امام ابو حنیفہؒ سے برکت حاصل کرتا ہوں اور ان کی قبر پر آتا ہوں اگر مجھے کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے تو دو رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان کی قبر کے پاس جا کر اللہ سے دعا کرتا ہوں تو بہت جلد حاجت پوری ہوتی ہے،

اس سے چند امور ثابت ہوئے، زیارت قبور کیلئے سفر کرنا کیونکہ امام شافعی اپنے وطن فلسطین سے بغداد آتے تھے، امام ابو حنیفہؒ کی قبر کی زیارت کیلئے صاحب قبر سے برکت لینا ان کی قبروں کے پاس جا کر دعا کرنا صاحب قبر کو ذریعہ حاجت روائی جاننا۔ انتھی ملخصاً کلامہ، جاء الباطل ص ۳۳۲ تا ۳۳۳۔

کیا عام سفروں سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ پہلے دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ عرس بدعت سیئہ ہے اور اس کی حدیث نبوی ﷺ میں ممانعت موجود ہے، جب یہ بدعت ہے تو اس کیلئے سفر کیسے جائز ہوا، جب کہ خود مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ حرام کیلئے سفر بھی حرام ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا دعوی تو عرس کیلئے سفر کرنے کا ہے، مگر دلیل عنایت فرماتے ہیں سفر ہجرت اور تجارت وغیرہ کی، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ دعوے اور دلیل میں کونسی مناسبت ہے، عالی جاہ عرس کیلئے سفر کرنا تو بقول آپ کے اس مقصد کے تحت ہوتا ہے کہ

صاحب قبر سے برکت حاصل کی جائے ان کی قبر کے پاس دعا جلدی قبول ہوتی ہے قبر والا حاجت روائی کرتا ہے اور اولیاء کرام زائرین کو نفع پہنچاتے ہیں ملخصاً جاء الباطل ص ۳۳۲ ج ا۔

مگر افسوس ان بدعات وخرافات کی دلیل، سفر تجارت، سفر ہجرت، سفر تبلیغ، بیٹے کی ملاقات کیلئے سفر، وغیرہ کی دیتے ہیں ایمان سے کہنا کہ کیا ان اسفار سے بھی یہی مقصود ہوتا ہے؟ جو سفر عرس میں مطلوب ہوتا ہے، اگر نہیں یقیناً نہیں تو ان اسفار سے آپ کا سفر عرس کیسے ثابت ہوگیا، اے جی اس کیلئے کوئی واضح نص پیش کریں، جو آپ کے پاس قطعاً نہیں، اور پوری دنیا کے منکرین سنت خیرالانام اور عاشقان بدعات، سر توڑ کوشش کے بعد بھی عرس کیلئے سفر کا ثبوت کسی واضح نص سے نہیں دے سکتے جب عرس ہی بدعت قبیحہ ہے تو اس کا سفر کیسے سنت ثابت ہوگیا، عقل کے ناخن لو کیا کہہ رہے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے تھے لہذا عرس کا سفر ثابت ہوگیا۔

کیا موسیٰ علیہ السلام فرعون کا عرس منانے کے لیے گئے تھے؟ نہیں! بلکہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی طرف سفر تو اسے دعوت توحید دینے کیلئے تھا کیونکہ فرعون ایک سرکش کافر تھا۔

کیا مبتدعین بھی مقابر اولیاء کی طرف اسی نیت سے جاتے ہیں کہ وہ سرکش کافر ہیں لہذا انہیں دین حق کی طرف بلایا جائے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو اس دلیل سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں ذرا اس کی وضاحت تو کیجئے، آخر عقل تو اللہ تعالی نے ہر شخص کو دی ہے اس دلیل کو نقل کرتے ہوئے آپکے دل میں کیا تھا۔

موسوی سفر اور سفر عرس میں کیا مناسبت تھی کہ جس کے اشتراک کی وجہ سے آپ نے اس کو درج کیا تھا، یا فقط لفظ سفر کو ہی دیکھ کر آپ نے اس کو نقل کر دیا، اور محض لفظ سفر کے مشترک ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ دونوں ہی جائز ہیں، کیا ہم نے سفر کرنے سے ہی انکار کیا تھا کہ اس دلیل سے آپ ہم پر حجت قائم کرر ہے ہیں۔

اس طرح تو ایک بت پرست بھی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ مسلمان بیت اللہ کی طرف سفر کر کے جاتے ہیں لہذا سومنات کی طرف جانا بھی ثابت ہوا، ایک مرزائی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ امت محمدیہ چونکہ مسجد نبوی کی طرف سفر کر کے جاتی ہے لہذا قادیان میں مرزے قادیانی کی عبادت گاہ کی طرف جانا بھی ثابت ہوا، ایک شیعہ کو بھی حق ہوگا کہ چونکہ اہل سنت صفاء و مروہ اور مزدلفہ وعرفات میں جاتے ہیں لہذا کربلا کی طرف جانا ثابت ہوا۔

تو جس دلیل سے ایک بت پرست اور مرزائی و شیعہ کو بریلوی علماء مطمئن کریں گے وہی دلیل

ہماری طرف سے مفتی صاحب کے مذکورہ اسفار کی تصور کر لیجئے گا۔

ثالثاً۔ عرس کے لئے سفر کرنا ایک خاص عمل ہے اور اس کیلئے دلیل بھی خاص چاہیئے کیونکہ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا، مثلاً بکر کا یہ کہنا کہ زید گھر میں موجود نہیں، اس سے زید کا مسجد میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوگا۔

یا عبد اللہ کا یہ کہنا کہ عبدالرحمٰن گھر سے لاہور چلا گیا ہے، اس سے عبدالرحمٰن کا ہیرا منڈی جانا ثابت نہ ہوگا، یا علی کا یہ کہنا کہ ایوب آج صبح سے غائب ہے اس سے ایوب کا سفر پر جانا ثابت نہ ہوگا۔

یا محبوب کا یہ کہنا کہ عدنان شہر گیا ہے (یا بازار) تو اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ عدنان کسی حکیم کے پاس گیا ہے،

علی ھذا القیاس اس طرح کے بیسیوں محاورات ہم روز مرہ کی زندگی میں بولتے ہیں مگر اس عام سے کوئی کم عقل اور اناڑی بھی خاص مراد نہیں لیتا کیونکہ ہر صاحب عقل اور صاحب دماغ جانتا ہے کہ عام سے خاص مراد لینے سے انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ مگر افسوس کہ مبتدعین نے دین کو ہی اس قدر لاوارث سمجھ رکھا ہے کہ جو چاہیں اس کی تعبیر کریں عام سے خاص مراد لیں یا بعض سے کل یا مجاز سے حقیقت تو انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ اسلام کی قوت جاتی رہی ارباب حکومت کو اپنی اپنی کرسی کی پڑی ہوئی ہے، اور گمراہ فرقے دین کی بنیادی تعلیم کو مسخ کر رہے ہیں۔

اے اللہ تو نے ہی دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے کوئی مرد مومن پیدا فرما جو تیرے دین کو غالب کردے، کفر وشرک اور بدعات کے گھپ اندھیرے کو ختم کر کے تیرے دین کا بول بالا کرے اور ان کی جگہ دین حق کو قائم کرے، کفر وشرک کو مٹا کر تیری توحید کو قائم کرے بدعات کا قلع قمع کر کے تیرے پیارے نبی ﷺ کی سنت کو جاری کرے، دین عربی کے خلاف تمام سازشوں کی بیخ کنی کردے اور کفار کے عقائد ونظریات کو مسمار کردے، آمین یا الہ العلمین۔

ہم تو تیرے عاجز و ناتواں بندے ہیں تیری توفیق سے یہی کر سکے ہیں تو ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں برکت ڈال دے آمین یارب العلمین۔

ہاں تو بات چل رہی تھی کہ عموم سے خصوص ثابت نہیں ہوتا
ارشاد ربانی ہے کہ

و جعلنا من الماء کل شیء حی . الانبیاء ۳۰)

اورتمام جان دار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں (۲۱-۳۰)
اس عام دلیل سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ جن اور ملائکہ کی پیدائش بھی پانی سے ہوئی ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج. (الدھر ۲)

ہم نے انسان کونطفہ مخلوط سے پیدا کیا (۷۶-۲)
اس دستورعام سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ آدم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی مخلوط نطفہ سے ہوئی تھی۔ خلاصہ کلام یہ کہ عام سے حکم خاص ثابت نہیں ہوتا اس کیلئے ایک مستقل اور علیحدہ دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن مفتی صاحب عام اسفار سے خاص سفر عرس کا ثبوت دینا چاہتے ہیں جو کہ ان کی اصول شکنی اورحقیقت پر پردہ ڈالنے کی فضول کوشش ہے، اللہ ھدایت اور سمجھ عطا کرے۔ آمین

مفتی صاحب کا حضرت امام شافعیؒ پر افترا

مفتی صاحب نے مقدمہ شامی سے نقل کیا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ امام ابو حنیفہؒ کی قبر پر برکت حاصل کرنے کیلئے آیا کرتے تھے اور جب کبھی انہیں کوئی حاجت ہوتی تو دو رکعتیں پڑھ کر دعا کرتے تو حاجت پوری ہوجاتی، پھراس پر چربہ چڑھاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

اس سے چند امور ثابت ہوئے، زیارت قبور کیلئے سفر کرنا،

کیونکہ امام شافعی اپنے وطن فلسطین سے بغداد آتے تھے امام ابو حنیفہ کی قبر کی زیارت کیلئے صاحب قبر سے برکت لینا ان کی قبروں کے پاس جا کر دعا کرنا صاحب قبر کو ذریعہ حاجت روائی جاننا ۔ جاء الباطل ص۳۳۲ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ واقعی اگر مذکورہ حکایت ثابت ہوتو مبتدعین کا موقف حضرت امام شافعیؒ سے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ صریحاً جھوٹ اور حضرت امام پر افترا ہے تفصیل آگے آرہی ہے ان شاء الرحمٰن لیکن ہم یہاں ایک چیز بیان کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق مفتی صاحب کی ہیرا پھیریوں سے ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خود مولف جاء الباطل نے اذان قبر کے سلسلہ میں کہا تھا کہ قول شافعی ہم پر حجت نہیں، مفہوم، جاء الباطل ص۳۱۶ ج۱۔

مگر یہاں بنیادی استدلال ہی حضرت امام شافعیؒ کے (بے بنیاد) عمل سے کر رہے ہیں جو کہ خود ان کے اپنے لکھے ہوئے کے خلاف ہے، شاید مبتدعین یہ کہہ کر پلہ چھڑالیں کہ انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

الغرض مفتی صاحب کو اپنے ضابطہ اور دستور العمل کی وجہ سے یہ ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ حضرت امام ابو حنیفہ فلاں صحابی و تابعی کی قبر پر جا کر ایسا کرتے تھے تو ایک بات تھی، لیکن مفتی صاحب کو اپنے گھر سے تو کوئی ایسی دلیل میسر نہ ہوئی، لہذا انہوں نے امام شافعی کو درمیان میں گھسیٹ لیا۔

ثانیاً۔ بلا شبہ یہ قول فتاوی شامی ص۵۵ ج۱، میں موجود ہے مگر علامہ ابن عابدین المتوفی ۱۲۵۲ھ نے اس قول کو بلا سند اور بلا حوالہ نقل کیا ہے حضرت امام شافعیؒ نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی، تقریب ص۲۱۴، امام شافعی اور ابن عابدین کے درمیان تقریباً دس صدیوں کا ایک طویل زمانہ حائل ہے لہذا ہم ان کی بے دلیل بات کو کیسے مان لیں۔

ثالثاً۔ ہمارے وسائل کی حد تک ہمیں یہ روایت تاریخ بغداد ص۱۲۳ ج۱، اور اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ للامام الصیمری ص۸۹ میں ملی ہے۔ جو بمع سند و متن حسب ذیل ہے۔

اخبر نا عمر بن ابراھیم قال ثنا مکرم قال ثنا عمر بن اسحاق بن ابراھیم قال ثنا علی بن میمون قال سمعت الشافعی یقول انی لا تبرک بابی حنیفة و أجئی الی قبرہ فی کل یوم، یعنی زائرا، فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین و جئت الی قبرہ و سالت اللہ الحاجه فما تبعد عنی حتی تقضی. انتھی بلفظه.

مگر یہ سند باطل و مردود ہے کیونکہ عمر بن اسحاق غیر معروف ہے، کتب رجال میں اس کا کہیں

بھی ذکر نہیں پایا جاتا علامہ البانی رحمۃ اللہ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ عمرو بن اسحاق ہو، جس کا ذکر خطیب نے تاریخ ۱۲/۲۲۶ میں کیا ہے لیکن کوئی جرح و تعدیل بیان نہیں فرمائی لہذا یہ مجہول الحال ہے، پھر فرماتے ہیں (عمرو بن اسحاق ہونا) بعید ہے کیونکہ خطیب بغدادی نے بیان کیا ہے کہ عمرو بغداد میں ۳۴۱ھ میں آیا تھا جبکہ جس سے یہ بیان کر رہا ہے (یعنی علی بن میمون) اس کی وفات ۲۴۷ھ میں ہو چکی تھی، اس لئے یہ ناممکن ہے اسے عمرو نے پایا ہو،

سلسلہ احادیث ضعیفہ ص ۳۱ ج ۱۔

علامہ کوثری کا یہ کہنا کہ اس کی سند کے تمام راوی خطیب بغدادی کے نزدیک ثقہ ہیں (تانیب الخطیب ص ۲۵)۔

غلط بیانی ہے علامہ عبدالرحمٰن المعلمی نے کوثری کی زندگی میں ہی اس کی پر زور تردید کر دی تھی، جس کا پوری زندگی کوثری سے جواب نہ بن پڑا تھا حالانکہ علامہ عبدالرحمٰن کی کتاب کوثری کو مل گئی تھی، بلکہ انہوں نے چند صفحات کا رسالہ، الترحیب بنقد التانیب، کے نام سے ان کے جواب میں بھی لکھا تھا، مگر ان کے معارضات پر کوثری نے دم نہیں مارا، جب کہ علامہ عبدالرحمٰن المعلمی نے مذکورہ حقائق سے مزید ایک معارضہ یہ بھی پیش کیا تھا کہ علی بن میمون کی حضرت امام شافعی سے روایت ہی ثابت نہیں، آخر میں فرماتے ہیں۔

ولا يخفى على ذى معرفة انه لا يثبت بمثله شئى، و يؤكد ذلك حال القصة فان زيارته قبر أبى حنيفة كل يوم بعيد فى العادة، و تحريه قصده للدعاء عنده بعيد ايضاً، انما يعرف تحرى القبور لسئوال الحوائج عندها بعد عصر الشافعى بمدة فاما تحرى الصلوة عنده فابعد وا بعد.

یعنی اہل علم پر مخفی نہیں کہ ان جیسی اسناد سے کوئی چیز بھی ثابت نہیں ہوتی، اور یہی حال اس قصہ کا ہے، کیونکہ ہر روز امام ابو حنیفہ کی قبر کی زیارت کرنا عادتاً ناممکن ہے، (کیونکہ امام شافعی کا وطن کوفہ نہ تھا) اور امام ابو حنیفہ کی قبر کو منتخب کر کے اس پر دعا کیلئے قصداً جانا امام شافعی سے بعید ہے کیونکہ قبروں کا انتخاب کر کے ان پر سوال حوائج کیلئے جانا حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ کے بعد رائج ہوا ہے اور ان کی قبر کو نماز کیلئے منتخب کرنا تو حضرت امام شافعیؒ سے اور بھی بہت زیادہ بعید ہے، طلیعۃ

التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الاباطیل ص۶۵، طبع المکتبۃ السلفیۃ لاھور ۱۹۸۱ء۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ نے مذکورہ حکایت پر خاصی پرمغز گفتگو کرتے ہوئے آخر میں تحریر کیا ہے

ثم تقدم عندالشافعی ماھو ثابت فی کتابہ من کراھۃ تعظیم قبور المخلوقین خشیۃ الفتنۃ بھا، وانما یضع مثل ھذہ الحکایاتَ من یقل علمہ و دینہ، واما ان یکون المنقول من ھذہ الحکایات عن مجھول لایعرف.

پھر نقل کیا جاچکا ہے حضرت امام شافعی سے کہ مخلوق کی قبروں کی تعظیم کی کراھت ثابت ہے، فتنہ (شرک) کے خوف سے اور اس طرح کی حکایات اس شخص نے گھڑی ہیں جس کا علم و دین ناقص ہے، اور یہ حکایات منقول بھی مجہول (اسناد) سے ہیں جو معلوم نہیں، اقتضاء الصراط المستقیم ص۶۸۶ ج۲، طبع ۱۴۰۴ھ۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ نے امام شافعیؒ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ ان کی تالیف، کتاب الام ص۲۷۸ ج۱ باب مایکون بعد الدفن، میں موجود ہے۔

ان دلائل و براہین سے مذکورہ حکایت کا مکذوبہ اور من گھڑت ہونا ثابت ہوگیا، مگر مفتی صاحب اس کو دلیل بناتے ہوئے ذرا بھر شرم و حیا نہیں کرتے، اور کوثری اس کی تصیح کرتے ہوئے صریحاً جھوٹ تحریر کرتا ہے کہ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔

کیا زیارت قبور سے عرس کا سفر ثابت ہوتا ہے

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں

سفر کا مقصد تو ہے زیارت قبر اور یہ منع نہیں کیونکہ زیارت قبر کی اجازت مطلقاً ہے، الافزوروھا، تو سفر کیوں حرام ہوگا۔ جاء الباطل ص۳۳۲ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ جو شخص زیارت قبور کیلئے سفر کرتا ہے، کیا اس کے وطن میں قبرستان نہیں ہوتا، یا وہاں مسلمان فوت نہیں ہوتے، یا ان کو مسنون طریقہ سے دفن نہیں کیا جاتا، مثلاً ایک شخص کراچی سے

لاهور آتا ہے حضرت علی ہجویری کی قبر پر، یا ایک شخص لاهور سے بغداد جاتا ہے زیارت قبور کیلئے تو کیا اس کے اپنے وطن میں قبریں نہیں ہوتیں جو لاهور اور بغداد میں زیارت قبور کیلئے جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اس کا مقصد محض زیارت قبور ہے ہی نہیں، کیونکہ یہ تو اس کے اپنے وطن میں موجود تھیں، لہذا اس تخصیص پر کوئی دلیل عنایت کیجئے کہ کسی ولی کی قبر کو منتخب کر کے اس کی طرف سفر کرنا اور وہ بھی اس نیت سے کہ صاحب قبر سے برکت اور حوائج کے طلب کرنے کی غرض وغیرہ سے مگر مفتی صاحب اس تخصیص اور نیت کی دلیل دینے کی بجائے زیارت قبور کو درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں۔

ثانیاً۔ زیارت قبور کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ وہاں جا کر ان کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے اور ان کی قبروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو کہ جس طرح ان لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر ایک دن مٹی میں ڈیرا ڈال لیا ہے اسی طرح ہم نے بھی فوت ہو کر اس مٹی میں دفن ہونا ہے، چنانچہ یہ چیزیں سنت خیر الانام ﷺ سے ثابت ہیں۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۱) کان رسول الله ﷺ یعلمهم اذا خرجوا الی المقابر السلام علیکم اهل الدیار من المومنین و المسلمین و انا ان شاء الله بکم للاحقون اسال الله لنا ولکم العافیة.

یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو کہیں السلام الخ یعنی اے مسلمانوں کے گھر والوں! تم پر سلامتی ہو ان شاء اللہ ہم تمھارے ساتھ ملنے والے ہیں اور ہم اللہ تعالی سے اپنے اور تمھارے لئے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۳۱۴ ج ۱۔

حضرت ابو هریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

(۲) ان رسول الله ﷺ اتی المقبرة فقال السلام علیکم دار قوم مومنین وانا انشاء الله بکم لاحقون. الحدیث.

یعنی رسول اللہ قبرستان آئے اور کہا اے مومنین کے گھر والو! تم پر سلامتی ہو اور انشاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۱۲۶ ج ۱۔

(۳) اسی طرح کتب حدیث سے ثابت ہے کہ آنخضرت ﷺ نے آٹھ سال بعد شہداء احد کی

قبروں پر جا کر ان کی قبروں پر نماز جنازہ پڑھا۔

(۴) اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کیلئے دعا کرو کیونکہ اب اس سے سوال ہوگا، یہ تمام احادیث پہلے با حوالہ گزر چکی ہیں۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرتے اور دفن کرتے ہوئے سلام و دعا کرنے کا حکم فرماتے جیسا کہ میت کو دفن کرنے سے پہلے نماز جنازہ میں اپنے لئے مرنے والے کے واسطے اور تمام زندہ و مردہ مومنین کے حق میں دعا کی جاتی ہے، اور اسی طرح کی جو چیز سنت مصطفیٰ اور خیر القرون کے، السابقون الاولون، سے ثابت ہے وہ مشروع اور جائز ہے الغرض زیارت قبور تو سنن صحیحہ سے ثابت ہے حتیٰ کہ کفار کی قبروں پر جانا بھی ثابت ہے، جس کی دلیل، یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

فزوروا القبور فانها تذكر كم الموت. الحديث.

یعنی قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

صحیح مسلم ص۳۱۴ ج۱۔

اس حدیث میں زیارات قبور کی بقول مفتی صاحب مطلقاً اجازت ہے لہذا یہ کفار کی قبروں کو بھی شامل رہے گی علاوہ ازیں ان کی قبریں بھی موت اور آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

الغرض اگر زیارت قبور ہی مقصود ہے تو اس کیلئے اپنے شہر کا قبرستان ہی کافی ہے، دور دراز کا سفر کر کے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

مگر مبتدعین کا زیارت سے مقصود مسنون طریقہ نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے یہ حضرات نذر مانتے ہیں کہ میرا کام ہوگا تو میں فلاں بزرگ کی قبر پر اس قدر روپیہ خرچ کروں گا، یا اس نیت سے سفر کیا جاتا ہے کہ اس کی قبر سے برکت حاصل کی جائے یا حوائج کیلئے، تب ہی یہ لوگ عوام الناس کی قبروں پر جانے کی بجائے اولیاء کرام کی قبروں کا رخ کرتے ہیں۔

پھر اس کیلئے بھی انہوں نے بعض کو مخصوص کر رکھا ہے کہ بعض مقابر پر جانے سے لڑکا ملتا ہے

بعض سے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے اور بعض سے مصیبت وغم دور ہو کر رزق میں برکت ڈالی جاتی ہے وغیرہ مگر اس کی کوئی دلیل شرعی تو وہ نادارد، بلکہ نہایت عیاری سے مفتی صاحب نے زیارت قبور کا مخلص تلاش کیا ہے۔

مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اگر زیارت قبور ہی مقصود ہے تو سال بعد عرس کیلئے سفر کرنے کا عنوان کیوں قائم کیا ہے؟ کیا زیارت قبور فقط سال بعد مرنے والے کے روز وفات ہی کرنی مشروع ہے؟، اگر نہیں یقیناً نہیں تو یہ مفتی صاحب کی دلیل کیسے بن گئی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عرس کے سفر، بار ثبوت ابھی تک مبتدعین پر ادھار ہے، جسے کبھی بھی چکا نہیں سکتے۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے علم حاصل کرنے کے لئے ایک روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے کہ

اطلبوا العلم ولو کان بالصین .

علم طلب کرو اگرچہ چین میں ہی ہو۔ جاء الباطل ص۳۳۱ ج۱۔

واضح رہے کہ اس حدیث سے اگر مفتی صاحب کا مقصود سفر عرس ثابت کرنا ہے تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ علم کسی قبر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا کہ مفتی صاحب کی دلیل ہو بلکہ علم تو کسی معلم سے حاصل کیا جاسکتا ہے جو زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال اذا مات الانسان انقطع عملہ الا من ثلاث صدقة جاریة، اوعلم ینتفع بہ، او ولد صالح یدعولہ.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہوجاتے ہیں مگر تین، صدقہ جاریہ، یا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، یا اس کی نیک اولاد جو اس کیلئے دعا کرے۔

صحیح مسلم ص ۴۱ ج۲، و ابوداؤد ص ۴۲ ج۲، و نسائی ص ۱۲۲ ج۲،



و ترمذی مع تحفہ ص۲۹۸ ج۲، و بیہقی ص۲۷۸ ج۶، و مسند احمد ص۳۷۲ ج۲.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے والے کے علم سے فائدہ تو حاصل کیا جاسکتا ہے (جیسے ہم محدثین اور فقہاء کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں) مگر ان سے علم سیکھا اور پڑھا نہیں جاسکتا ہے۔

ثانیاً۔ **اطلبوا العلم ولو کان بالصین،** کی یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس کا راوی طریف بن سلمان، متروک الحدیث ہے اسے امام ابو حاتم نے، ذاھب الحدیث، امام بخاری نے، منکر الحدیث، امام دارقطنی نے، ضعیف، اور امام نسائی نے، غیر ثقہ، کہا ہے، میزان ص۳۳۵ ج۲، و عقیلی ص۲۳۰ ج۲، و ابن عدی ص۱۴۳۸ ج۴۔

مزید تفصیل کیلئے علامہ البانی رحمۃ اللہ کی تالیف سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ص۴۱۳ ج۱ اور حضرت استاذی المکرم کی تالیف، ضعیف اور موضوع روایات ص۹۴ کی مراجعت فرمایئے۔

باب قوالی کی بحث

اسلام میں عبادت کا طریقہ

اکثر مزارات پر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ وہاں سماع کی محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے، جس میں ملک کے نامور قوالوں کو دعوت دی جاتی ہے اور وہ بمع اپنے سازو سامان قدم رنجہ ہوتے ہیں۔

پہلے ہا، ہو، پھر تالی و بانسری بجائی جاتی ہے ہارمونیم کا باجا بجنے لگتا ہے تو دوسری طرف بیٹھا ہوا ایک شخص ڈھولکی پر ہاتھ مارنا شروع کردیتا ہے پھر طبلہ و گھڑا بھی آواز نکالنے لگتا ہے اور سارنگیا جو بن میں سارنگی کی تار پر ساز بجاتا ہے۔

ان خرافات کے ساتھ ساتھ ہی قوال تالی بجاتا ہوا کوئی مشرکانہ گیت گانے لگتا ہے جس میں صاحب قبر کی منقبت بیان ہوتی ہے، یوں اس تقریب سے عرس کی ابتدا کی جاتی ہے جسے سننے اور سنانے والے بلکہ محفل رچانے والے اس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، عوام الناس اس کی ریکارڈنگ کو علی الصبح کارثواب اور بطور برکت گھروں دوکانوں بسوں میں لگاتے ہیں اگر کوئی سلفی منع کرے تو اسے کہتے ہیں کہ بھائی یہ تو قوالی ہے گانے تھوڑے ہیں جو کہ آپ منع کر رہے ہیں۔

عبادت کا یہ طریقہ بالکل کفار مکہ کا تھا، رب قدیر فرماتے ہیں

وماکان صلاتهم عند البيت الا مكآءً و تصدية. (الانفال ۳۵)

یعنی نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں اور تالیاں بجانا (۸-۳۵)

یہی کچھ قوالی میں ہوتا ہے جسے یہ لوگ کفار کی طرح عبادت جانتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی عبادت ایسی نہ تھی ان کی عبادت وہی تھی جس کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے یعنی نماز، قراۃ قرآن، ذکر اور شرعی مجالس، نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی گانے کی محفل میں شرکت نہیں کی نہ ہی ہاتھوں سے تالیاں بجائیں نہ ہی سیٹیاں ماریں، نہ آپ علیہ السلام کو کبھی وجد آیا، نہ آنحضرت ﷺ کی چادر گری، محدثین کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اکٹھے ہوتے تو ایک کو قرآن پڑھنے پر

مامور فرماتے تو باقی سنا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ، میں نے عرض کیا کہ آپ کو پڑھ کر سناؤں، حالانکہ قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے، ارشاد فرمایا میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو سورۃ نساء سنائی جب اس آیت پر پہنچا۔

فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد و جئنا بك علي هؤلاء شهيداً.

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) طلب کریں گے (۴-۴۱)

تو آپ نے فرمایا

امسک فاذا عيناه تذرفان.

بس کرو اور اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

بخاری ص ۶۵۹ ج ۲، واللفظ له، و مسلم ص ۲۷۰ ج ۱.

اس طرح کا سماع انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروؤں کا سماع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے

اولئک الذين انعم الله عليهم من النبين من ذرية ادم و ممن حملنا مع نوح و من ذرية ابراهيم و اسرائيل و ممن هدينا و اجتبينا اذا تتلى عليهم ايت الرحمن خروا سجداً و بكياً (مريم ۵۸)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے پیغمبروں میں سے فضل کیا (یعنی) اولاد آدم میں سے نبی ہیں، اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کو نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، اور یہ لوگ ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے ہیں اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ھدایت دی اور برگزیدہ کیا جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ میں گر پڑتے تھے اور روتے رہتے تھے (۱۹-۵۸)

اہل معرفت کے بارے میں فرمایا

و اذا سمعوا مآ انزل الى الرسول ترىٰ اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من

الحق یقولون ربنآ اٰمنا فا کتبنا مع الشٰھدین. (المائدۃ ۸۳)

اور جب اس(کتاب) کو سنتے ہیں جو (سب سے پیچھے) پیغمبر (محمد ﷺ) پر نازل ہوئی تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی ہے اور وہ(اللہ کی جناب میں) عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم ایمان لے آئے تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ لے۔ (۵-۸۳)

لیکن اس کے برعکس اہل بدعت کا سماع تالیاں و سارنگی اور طبلہ وطنبور کا ہوتا ہے، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم و تابعین اور آئمہ کرام میں سے کسی نے اس طرح کے سماع کو اللہ تبارک وتعالی تک پہنچنے کا طریق قرارنہیں دیا، وہ اسے قرب الی اللہ اور عبادت میں نہیں بلکہ بدعت مذمومہ میں شمار کرتے ہیں۔

(الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطین ص ۱۷۹ مترجم)

موسیقی رسول اللہ ﷺ کی نظر میں

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

سمع النبی ﷺ یقول لیکونن من امتی اقوام یستحلون الحر و الحریر و الخمر و المعازف و لینزلن اقوام الی جنب علم تروح علیھم بسارحۃ لھم یاتیھم یعنی الفقیر لحاجۃ فیقولون ارجع الینا غداً فیبیتھم اللہ و یضع العلم و یمسخ آخرین قردۃ و خنازیرالی یوم القیٰمۃ.(بخاری رقم الحدیث ۵۵۹۰ کتاب الاشربۃ باب ما جاء فیمن یستحل الحمد......)

یعنی نبی ﷺ سے میں نے سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ میری امت میں ایسے لوگ (پیدا) ہونگے جو زنا اور حریر اور شراب اور باجوں (آلات موسیقی) کو حلال قرار دیں گے اور ایسا ہوگا کہ چند لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں اتریں گے شام کو ان کا چرواہا ان کے جانور لے کر ان کے پاس آئے گا تو اس سے کہیں گے کہ ارے فقیر کل آنا لیکن رات کو اللہ تعالی ان پر پہاڑ گرا کر ان کا کام تمام کردے

گا(اور جو پہاڑ گرنے سے بچ جائیں گے) بندر اور سور بنادے گا قیامت تک اسی صورت میں رہیں گے۔

بخاری ص۸۳۷ج۲، و ابو داود مع عون ص۸۱ج۴، و طبرانی کبیر ص۳۱۹ج۳، و بیھقی ص۲۲۱ج۱۰.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

ان النبی ﷺ نھی عن الخمر و المیسر و الکوبة و الغبیراء و قال کل مسکر حرام.

نبی ﷺ نے شراب، جوا، اور آلات موسیقی سے منع فرمایا ہے اور کہا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

سنن ابی داؤد ص۱۶۳ج۲، یہی روایت مسند احمد ص۲۸۹ج۱، اور بیہقی ص۲۲۱ج۱۰ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور اور یہی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے بیہقی ص۲۲۲ج۱۰ میں آتی ہے، جن کے ابتدائی الفاظ، ان اللہ حرم (یعنی اللہ نے حرام قرار دیا ہے) کے ہیں۔

محدثین رحم اللہ عنھم میں، الکوبة، کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے اس کا معنی ،طبلہ، بعض نے ڈگڈگی، اور بعض نے بربط ،بعض نے بانسری کیا ہے۔

آئمہ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کا استعمال آلات موسیقی پر ہوتا ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ موسیقی شراب کی طرح حرام ہے۔

حضرت قیس بن سعد راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال ان ربی تبارک و تعالی حرم علی الخمر و الکوبة و القنین وایاکم و الغبیراء فانھا ثلث خمر العالم.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب تبارک وتعالی نے مجھ پر شراب، آلات موسیقی کو حرام کیا ہے اور جوار کی شراب سے بچو کیونکہ وہ تمام جہانوں کی شراب کا ثلث ہے۔ مسند احمد ص۴۲۲ج۳ رقم ۱۵۰۵۵، وبیھقی ص۲۲۲ج۱۰ واللفظ لہ۔

فقہاء احناف کی تصریحات

علامہ ابن ھمام الحنفی ، ھدایہ، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

نعم اذا قیل ذلک علی الملاھی امتنع و ان کان مواعظ و حکما للالات نفسھا لالذلک التغنی.

ہاں جب نظم، آلات موسیقی کے ساتھ گائی جائے تو منع ہے خواہ نظم میں نصیحت اور حکمت کی باتیں ہوں، یہ ممانعت آلات موسیقی کی وجہ سے ہے نظم کی وجہ سے نہیں۔ فتح القدیر ص۴۸۲ ج٦، باب من تقبل شھادتہ ومن لاتقبل۔

علامہ فخر الدین حسن بن منصور الاوز جندی حنفی المتوفی ۲۹۵ھ فرماتے

اما استماع صوت الملاھی کا لضرب بالقضیب و غیر ذلک حرام و معصیة لقوله علیه الصلاة و السلام استماع الملاھی معصیة و الجلوس علیھا فسوق و التلذذ بھا من الکفر انما قال ذلک علی وجه التشدید و ان سمع بغتة فلا اثم علیه و یجب علیه ان یجتھد کل الجھد حتی لایسمع لماروی ان رسول الله ﷺ ادخل اصبعیه فی اذنیه.

آلات موسیقی مثلاً لکڑی سے کوئی چیز بجانا اور اس کے علاوہ ایسی دوسری چیزیں سننا حرام اور (اللہ و رسول ﷺ کی) نافرمانی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آلات موسیقی کو سننا گناہ ہے وہاں بیٹھنا فسق اور لذت لینا کفر سے ہے، آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان بطور سختی کے ہے، (ہاں) اگر (کسی شخص نے) اچانک آواز سن لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اس پر واجب ہے کہ پوری کوشش کرے کہ اس کے کان میں آواز نہ آئے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے (بانسری کی آواز سن کر) اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔

فتاوی قاضی خاں علی حامش الھندیہ ص۴۰٦ ج۳، کتاب الحظر والا باحۃ طبع حافظ کتب خانہ کوئٹہ۔

شمس الائمہ عبد العزیز بن احمد حلوائی الحنفی المتوفی ۴۴۸ھ فرماتے ہیں

السماع والقول والرقص الذی یفعله المتصوفة فی زماننا حرام لایجوز القصد الیه و الجلوس علیه و هو وا لغنا والمزامیر سواء.

یعنی گانا سننا اور ناچنا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں صوفیاء کرتے ہیں حرام ہے، اور جائز نہیں اس کا قصد کرنا اور وہاں بیٹھنا۔گانا اور آلات موسیقی کاایک ہی حکم ہے، بحوالہ فتاوی عالم گیری ص۳۵۲ ج ۵، طبع کوئٹہ۔

علامہ ابن عابدین درمختار کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

واستماعه، کالرقص و السخرية و التصفيف و ضرب الاوتار من الطنبور و البربط و الرباب و القانون و المزمار و الصنج و البوق فانها کلها مکروهة لأنهازی الکفار و استماع ضرب الدف و المزمار وغير ذلک حرام و ان سمع بغتة يکون معذورا و يجب ان يجتهد ان لايسمع، قهستانی.

اور (ہرقسم کا لہو) سننا (حرام ہے جیسا کہ) ناچنا، مذاق اڑانا، تالی بجانا، ستار کے تار بجانا، بربط، سارنگی، رباب، قانون، بانسری، جھانجھر، بگل بجانا مکروہ (تحریمی) ہے کیونکہ یہ کفار کا شعار ہیں اور دف بانسری اور دیگر آلات موسیقی کا سننا حرام ہے۔

اگر چہ اچانک سن لیا تو معذور ہے اور اس پر لازم ہے کہ پوری کوشش کرے کہ نہ سنے، قہستانی، فتاوی شامی ص۳۹۵ ج۶ (باب) فصل فی البیع طبع ایچ ایم سعید کراچی۔

فتاوی رضویہ

مولوی احمد رضا خاں صاحب کی شخصیت، مبتدعین میں امتیازی ہے ان کی تحقیقات پر انہیں پورا وثوق اور کامل یقین ہے ان سے سوال کیا جاتا ہے

بعالی خدمت امام اہل سنت مجدد دین وملت معروض کہ آج میں جس وقت آپ سے رخصت ہوا اور واسطے نماز مغرب کے مسجد میں گیا، بعد از نماز مغرب کے ایک میرے دوست نے کہا چلو ایک جگہ عرس ہے، میں چلا گیا وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں بہت سے لوگ جمع ہیں اور قوالی اس طریقہ سے ہورہی ہے کہ ایک ڈھول دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دستگیر کی شان میں اشعار کہہ

رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان میں اشعار گا رہے ہیں اور ڈھول سارنگیاں بج رہی ہیں، یہ باجے شریعت میں قطعی حرام ہیں کیا اس فعل سے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ خوش ہوتے ہونگے؟ اور یہ حاضرین جلسہ گنہگار ہوئے یا نہیں؟ اور ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس طرح کی؟

الجواب

ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گنہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر، بغیر اس کے کہ عرس کرنے والے کے ماتھے، قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ کی کچھ کمی آئے، یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف ہو، نہیں بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور ایسا عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ، وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا ان کیلئے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا اگر وہ سامان نہ کرتا یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے اس لئے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا، پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا وہ نہ کرتا نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔

کما قالوا فی سائل قوی ذی مرة سوی ان الأ خذ و المعطیٰ اثمان لانهم لولم یعطوا لما فعلوا فکان العطاء هو الباعث لهم علی الا ستر سال فی التکدی والسئوال و هذا کله ظاهر علی من عرف القوا عد الکریمة الشرعیة و بالله التوفیق.

جیسے کہ فقہاء نے اس سائل کے بارہ میں جو طاقتور تندرست ہو کہ ایسا خیرات لینے والا اور ایسے کو دینے والا دونوں گنہگار ہیں کیونکہ دینے والے اگر نہ دیں تو بھی گداگری کا مذموم کاروبار نہ کریں پس ان کی عطا ان کی گداگری کا باعث بنی اور یہ سب قواعد شرعیہ جاننے والے پر ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ کیساتھ ہی توفیق ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرماتے ہیں

من دعا الی ھدی کان له من الا جر مثل اجور من تبعه لا ینقص ذلک من اجورھم شیئا و من دعا الی ضلالة کان علیه من الاثم مثل اٰثام من تبعه لا ینقص ذلک من اٰثامھم شیئا.

جو کسی امر ھدایت کی طرف بلائے جتنے اس کا اتباع کریں ان سب کے برابر ثواب پائے اور اس سے ان کے ثوابوں میں کچھ کمی نہ آئے اور جو کسی امر ضلالت کی طرف بلائے جتنے اس کے بلانے پر چلیں ان سب کے برابر اسیر گناہ ہو اور اس سے انکے گناہوں میں کچھ تخفیف راہ نہ پائے۔

رواہ الائمة احمد و مسلم والا ربعة عن ابی ھریرہ رضی الله عنه .

باجوں کی حرمت میں احادیث کثیرہ وارد ہیں ازاں جملہ اجل واعلیٰ حدیث صحیح بخاری شریف ہے، کہ حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ

لیکونن فی امتی اقوام یستحلون الحر و الحریر و الخمر والمعازف .

ضرور میری امت میں وہ لوگ ہونے والے ہیں جو حلال ٹھہرائیں گے عورتوں کی شرمگاہ یعنی زنا اور ریشمی کپڑوں اور شراب اور باجوں کو۔

حدیث صحیح جلیل متصل و قد اخرجه ایضا احمد و ابو داؤد و ابن ماجه والا سمعیلی و ابو نعیم باسانید صحیحة لا مطعن فیھا و صححه جماعة اٰخرون من الائمة کما قاله بعض الحفاظ قاله الامام ابن حجر فی کف الرعاع.

بعض جہال بدمست یا نیم ملا شہوت پرست یا جھوٹے صوفی باد بدست کہ احادیث صحاح مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے یا متشابہ پیش کرتے ہیں، انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف متعین کے آگے محتمل محکم کے حضور متشابہ واجب الترک ہے، پھر کہاں قول کہاں حکایت فعل، پھر کجا مبیح ہر طرح یہی واجب العمل، اسی کو ترجیح مگر ہوس پرستی کا علاج کس کے پاس ہے، کاش گناہ کرتے اور گناہ جانتے اقرار لاتے، یہ ڈھٹائی اور بھی سخت ہے کہ ہوس بھی پالیں اور الزام بھی ٹالیں اپنے لئے حرام کو حلال بنالیں، پھر اس پر بس نہیں بلکہ

معاذ اللہ اس کی تہمت محبوبان خدا اکابر سلسلہ عالیہ چشت قدست اسرارھم کے سر دھرتے ہیں، نہ خدا سے خوف نہ بندوں سے شرم کرتے ہیں حالانکہ خود حضور محبوب الٰہی سیدی و مولائی نظام الحق والدین سلطان الاولیاء رضی اللہ عنہ و عنھم و عنا بھم، فوائد الفواد شریف میں فرماتے ہیں

مزامیر حرام است

مولانا فخر الدین زرادی خلیفہ حضور سیدنا محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے حضور کے زمانہ مبارکہ میں خود حضور کے حکم احکم سے مسئلہ سماع میں رسالہ، کشف قناع عن اصول السماع، تحریر فرمایا، اس میں صاف ارشاد فرما دیا کہ

اما سماع مشائخنا رضی الله عنه فبرئ عن هذه التهمة وهو مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرة من كمال صنعة الله تعالى.

ہمارے مشائخ کرام رضی اللہ عنہ کا سماع اس مزامیر کے بہتان سے بری ہے وہ صرف قوال کی آواز ہے ان شعار کے ساتھ جو کمال صنعت الٰہی سے خبر دیتے ہیں۔

للہ انصاف! اس امام جلیل خاندان عالی چشت کا یہ ارشاد مقبول ہوگا یا آج کل کے مدعیان خامکار کی تہمت بے بنیاد، ظاہرۃ الفساد۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

سیدی مولانا محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی مرید حضور پر نور شیخ العالم فریدالحق الدین گنج شکر و خلیفہ حضور سیدنا محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ کتاب مستطاب، سیر الاولیاء میں فرماتے ہیں۔

حضرت سلطان المشائخ قدس الله سره العزيز می فرمود که چند این چیز می باید تا سماع مباح می شود، مسمع و مستمع و مسموع و آله سماع مسمع یعنی گوئنده مرد تمام باشد، کودک نبا شد و عورت نباشد مستمع آنکه می شنود ازیاد حق خالی نباشد و مسموع آنچه بگویند فحش و مسخرگی نباشد و آله سماع مزامیر ست چون چنگ و رباب ومثل آن می باید که درمیان نباشد این چنیں سماع حلاست.

حضرت سلطان المشائخ قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز فرماتے تھے کہ چند شرائط ہوں تو سماع مباح ہوگا کچھ شرطیں سنانے والے میں کچھ سننے والے میں کچھ اس کلام میں جو سنائی جائے کچھ آلہ سماع

یعنی سنانے والا کامل مرد ہو چھوٹا لڑکا ہو نہ عورت سننے والا یاد خدا سے غافل نہ ہو اور جو کلام پڑھی جائے فحش اور تمسخرانہ انداز کی نہ ہو، اور آلات سماع یعنی مزامیر جیسے سارنگی اور رباب وغیرہ، چاہیے کہ ان چیزوں میں سے کوئی موجود نہ ہو، اس طرح کا سماع حلال ہے۔

مسلمانو! یہ فتوی ہے سرور و سردار سلسلہ عالیہ چشت حضرت سلطان اولیاء رضی اللہ عنہ کا کیا اس کے بعد بھی مفتریوں کو منہ دکھانے کی گنجائش ہے؟

نیز۔ سیر الاولیاء شریف میں ہے

یکے بخدمت حضرت سلطان المشائخ عرض داشت کہ دریں روز ھا بعضے از درویشان آستانہ دار در مجمعے کہ چنگ و رباب و مزامیر بود رقص کردند فرمود نیکو نکردہ اند آنچہ نا مشروع ست ناپسندیدہ است، بعد ازاں یکے گفت چوں ایں طائفہ ازاں مقام بیروں آمدند بایشان گفتند کہ شماچہ کردید، درآں مجمع مزامیر بود سماع چگو نہ شنیدید و رقص کر دید ایشاں جواب دادند کہ ماچناں مستغرق سماع بودیم کہ ندا نستیم کہ اینجا مزامیر است یانہ، حضرت سلطان المشائخ فرمود ایں جواب ھم چیزے نیست ایں سخن درھمہ معصیتھا بیاید.

ایک آدمی نے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کی کہ ان ایام میں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رباب اور دیگر مزامیر تھے رقص کیا، فرمایا انہوں نے اچھا کام نہیں کیا جو چیز شرح میں ناجائز ہے ناپسندیدہ ہے، اس کے بعد ایک نے کہا جب یہ جماعت اس مقام سے باہر آئی، لوگوں نے ان سے کہا تم نے یہ کیا کیا وہاں تو مزامیر تھے تم نے سماع کس طرح سنا اور رقص کیا، انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس طرح سماع میں مستغرق تھے کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں، سلطان المشائخ نے فرمایا یہ جواب کچھ نہیں اس طرح تو تمام گناہوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔

مسلمانو! کیسا صاف ارشاد ہے کہ مزامیر ناجائز ہیں، اور اس عذر کا کہ ہمیں استغراق کے باعث مزامیر کی خبر نہ ہوئی کیا مسکت جواب عطا فرمایا کہ ایسا حیلہ ہر گناہ میں چل سکتا ہے، شراب

پئیے اور کہہ دے شدت استغراق کے باعث ہمیں خبر نہ ہوئی کہ شراب ہے یا پانی، زنا کرے اور کہہ دے غلبہ حال کے سبب ہمیں تمیز نہ ہوئی کہ جروا (بیوی) ہے یا بیگانی۔ اسی میں ہے

حضرت سلطان المشائخ فرمود من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نباشد و درین باب بسیار غلو کردتا بحد یکہ گفت اگر امام راسھو افتد مرد تسبیح اعلام کند وزن سبحان اللہ نگو ید زیر اکہ نشاید آوازاں شنو دن پس پشت دست برکف دست زند و کف دست برکف دست نزند کہ آں بلھومی ماندنا ایں غایت از ملاھی و امثال آں پرھیز آمدہ است، پس درسماع بطریق اولیٰ کہ ازیں بابت نباشد یعنی درمنع دستک چند یں احتیاط آمدہ است پس درسماع مزامیر بطریق اولیٰ منع است (اھ باختصار)

حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا میں نے منع کر رکھا ہے کہ مزامیر اور دیگر محرمات درمیان نہ ہوں اور اس بات میں آپ نے بہت مبالغہ کیا، یہاں تک کہ فرمایا اگر امام نماز میں بھول جائے مرد تو سبحان اللہ کہہ کر امام کو مطلع کرے اور عورت سبحان اللہ نہ کہے کیونکہ اس کو اپنی آواز سنانا نہ چاہیے پس ایک ہاتھ ہتھیلی دوسرے ہاتھ (کی) ہتھیلی پر نہ مارے کہ اس طرح یہ کھیل ہوگا۔ بلکہ ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کی (پشت) پر مارے جب یہاں تک لہو ولعب کی چیزوں اور ان کی طرح چیزوں سے پرہیز آئی ہے تو سماع میں مزامیر بطریق اولیٰ منع ہیں۔

مسلمانو! جو آئمہ طریقت اس درجہ احتیاط فرمائیں کہ تالی کی صورت کو ممنوع بتائیں وہ اور معاذ اللہ مزامیر کی تہمت، للہ انصاف کیسا خبط بے ربط ہے اللہ اتباع شیطان سے بچائے اور ان سچے محبوبان خدا کا سچا اتباع عطا فرمائے آمین الہ الحق آمین۔

بجا ھھم عندک آمین، و الحمدللہ رب العالمین ۔کلام یہاں طویل ہے اورانصاف دوست کو اسی قدر کافی ہے۔ واللہ الھادی واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، عبدہ المذنب احمد رضا عفی عنہ۔

بجمدن المصطفی ﷺ۔

احکام شریعت ص ۶۵، وفتاوی رضویہ ص ۲۰۰ ج ۱۰ حصہ اول۔

خاں صاحب نے اسی طرح کا ایک اور فتوی رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ میں تحریر کیا تھا جو خاصا لمبا ہے، بڑے سائز کے تقریباً پانچ صفحات پر مشتمل ہے، فتاوی رضویہ ص۲۱۲ ج۱۰ جزو اول، اور ص۵۴ ج۱۰ جزو اول، میں دو صفحات پر مشتمل خاں صاحب کا مزامیر کے رد میں فتوی درج ہے اسی جلد کے ص۲۵۷ (حصہ دوم) میں قوالی کو جائز کہنے والے کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کی خاں صاحب نصیحت کرتے ہیں۔

مزید فرماتے ہیں قوالی مع مزامیر کے کسی کو سننا جائز نہیں ص۲۷۴ ج۱۰ حصہ دوم۔

خاں صاحب سے قوالی و مزامیر کے رد پر تقریباً بیس کے لگ بھگ فتاوی ہیں جو ان کے فتاوی کی جلد دس کتاب الحظر ولاباحۃ میں موجود ہیں باذوق حضرات مراجعت فرمائیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قوالی کی حرمت میں بریلویوں کا پیر بھی ہمارے ساتھ ہے۔

قوالی کے دلائل اور ان کی حقیقت

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

قوالی جو آج کل عام طور پر مروج ہے، جس میں گندے مضامین کے اشعار گائے جاتے ہیں اور فاسق اور امردوں کا اجتماع ہوتا ہے اور محض آواز پر رقص ہوتا ہے یہ واقعی حرام ہے لیکن اگر کسی جگہ تمام شرائط سے قوالی ہو گانے والے اور سننے والے اہل ہوں تو اس کو حرام نہیں کہہ سکتے بڑے بڑے صوفیاء کرام نے خاص قوالی کو اہل کیلئے جائز فرمایا اور نااہل کو حرام، اس کی اصل وہ حدیث ہے جو مشکوٰۃ کتاب المناقب باب مناقب عمر میں ہے کہ

کہ حضور علیہ السلام کے سامنے ایک لونڈی دف بجا رہی تھی، حضرت صدیق اکبر آئے تو وہ بجاتی رہی حضرت عثمان غنی آئے تو بجاتی رہی مگر جب فاروق اعظم آئے تو دف کو اپنے نیچے ڈال کر بیٹھ گئی، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اے عمر تم سے شیطان خوف کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ دف بجانا شیطانی کام تھا یا کہ نہیں؟ اگر تھا تو کیا حضور علیہ السلام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ و عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شیطان نے خوف نہ کیا اور اس میں خود حضور علیہ السلام اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے شرکت کیوں کی؟ اور اگر شیطانی کام نہ تھا تو حضور کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں؟

جواب وہی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آنے سے قبل یہ ہی کام شیطانی نہ تھا ہوتا رہا اور فاروق اعظم کے آتے ہی شیطانی بن گیا، بند ہوگیا اسی لئے صوفیاء کرام نے اس پر چھ شرطیں لگائیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جاء الباطل ص ۳۲۷ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ اس تحریر سے ثابت ہوا کہ آج کل کی قوالیاں مفتی صاحب کے نزدیک بھی حرام ہیں، لیکن ان کے ناجائز و حرام ہونے کی وجہ طبلہ و سارنگی اور دیگر آلات موسیقی نہیں بلکہ گندے اشعار، فاسق لوگوں کا اجتماع اور آواز پر رقص کی وجہ ہے، لیکن اگر محض آواز کی بجائے کسی اور وجہ سے رقص کریں اور گندے مضامین اور فاسق لوگ نہ ہوں تو تب موسیقی کے ساتھ قوالی جائز ہے جس کی خیر سے نام نہاد مفتی اور مفسر قرآن نے حدیث نبوی سے بزعم خود دلیل بھی درج کی ہے۔

ثانیاً۔ حدیث کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں کہ

ان الشیطان لیخاف منک یا عمر.

بے شک شیطان اے عمر تجھ سے ڈرتا ہے۔

مشکوٰۃ ص ۵۵۸، وترمذی مع تحفہ ص ۳۱۷ ج ۴۔

لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آنے کے بعد یہ کام شیطانی ہوا، پہلے نہ تھا حالانکہ متن روایت سے اس کی تردید ہوتی ہے کہ جب حضرت عمر آئے تو شیطانی بن گیا، کیونکہ شیطان کا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے خائف ہونے کی آنحضرت ﷺ اسی حدیث میں خبر دے رہے ہیں لیکن آپ رضی اللہ عنہ کے آنے کے ساتھ ہی شیطان کی آمد کو بھی تسلیم کرلیا جائے تو کلام نبوی کی تکذیب ہوتی ہے مگر مفتی صاحب کی بلا جانے انہیں تو فقط قوالی کی دلیل درکار ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ حضور علیہ السلام اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شیطان نے خوف کیوں نہ کیا۔

تو جواباً عرض ہے کہ حنفیہ کے مسلم بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ فرماتے ہیں کہ چور و بدمعاش ہمیشہ وزیراعظم اور صدر کی بجائے پولیس سے ڈرتے ہیں کیونکہ انہوں نے جوتے مارنے اور پٹائی کرنی ہوتی ہے صدر اور وزیر اعظم سے بڑے لوگوں کا نہ ڈرنا اس سے ان کی توہین

لازم نہیں آتی اور نہ ہی پولیس کی ان پر عظمت و بزرگی ثابت ہوتی ہے اسی طرح روایت میں نہ عظمت مصطفیٰ ﷺ پر کوئی حرف ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ اور دیگر صحابہ پر شان فاروقی ثابت ہوتی ہے۔مفہوماً، از تحفۃ اثنا عشریۃ ،صفحہ ۱۶۸ طبع میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی۔

رابعاً۔ رہا مفتی صاحب کا دف سے دور حاضر کی موسیقی کا جواز ثابت کرنا تو یہ ان کی زیادتی ہے کیونکہ دف کی آواز ہی ایسی ڈھپ ڈھپ کی سی ہوتی ہے کہ اسے کوئی موسیقی کہہ ہی نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ ہندی میں دف کو ڈھپ کہتے ہیں جو غالبًا آواز کی مناسبت سے نام رکھا گیا ہے اس لئے اگر دف نکاح، عید، وغیرہ کے موقعہ پر بجایا جائے تو جائز ہے مگر اس میں بھی لہو ولعب کی نیت کو دخل نہ ہو۔

علامہ سرخسی حنفی فرماتے ہیں۔

انما المکروہ طبول اللھو بمنزلۃ الدفوف لاباس بضر بھا فی اعلان النکاح و انکرہ ذلک للھو.

دف اور طبل کا بجانا مکروہ ہے، نکاح کے اعلان کیلئے دف بجانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور لہو کیلئے دف بجانا مکروہ ہے۔

شرح سیر کبیر ص ۱۴۵۸ ج ۴، طبع المکتب للثورۃ الاسلامیہ.

لیکن دف سے آج کل کی موسیقی پر استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ ایک تو دف کی آواز ہی ایسی ہے جسے ہم موسیقی میں داخل نہیں کر سکتے، دوسرا یہ کہ دف کی اس مخصوص اجازت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بھی عام نہیں بلکہ خاص ہی جانا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ وہ جب دف کی آواز سنتے تو معلوم کرواتے کہ یہ دف کس لئے بجائی گئی ہے اگر نکاح وغیرہ کا موقع ہوتا تو خاموش ہو جاتے،

مصنف عبدالرزاق ص ۵ ج ۱۱۔

لیکن اس مخصوص آلہ (دف) کو مفتی صاحب کا آج کل کے آلات موسیقی پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ رخصت اسی کے ساتھ خاص ہے۔

خامساً۔ روایت میں محض دف بجانے کا ذکر ہے گانا گانے، رقص اور وجد کا بیان نہیں ہے جب

کہ قوالی میں گانا اور رقص بھی ہوتا ہے تو اس سے قوالی کس طرح ثابت ہوئی، مفتی صاحب کا استدلال بالکل اس شخص کی طرح ہے جو علم کلام کے محمود و مذموم ہونے کی بحث میں نفس کلام پر گفتگو کرتا ہے اسے، اسم، فعل، حرف پر تقسیم کرتا ہے، یا خاموشی کی فضیلت ثابت کر کے علم کلام کی مذمت کرتا ہے یا گفتگو کے جائز و مباح ہونے سے علم کلام کی تائید کرتا ہے، حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ بحثیں اصل موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتیں بلکہ سراسر جدل و مناظرہ کی پیداوار ہیں۔

سادساً۔ روایت میں فقط بچی نابالغہ کا بیان ہے، جاء ت جاریۃ، یعنی ایک بچی آئی۔ ترمذی مع تحفہ ص ۳۱۶ ج ۴۔

تو اس سے بالغ عورت اور مرد کا دف بجانا کیسے ثابت ہوا اور وہ بھی دیگر آلات موسیقی اور تالی و رقص او روجد اور دیگر خرافات کے ساتھ جب کہ قوالی کیلئے مفتی صاحب بالغ ہونا شرط لگاتے ہیں ان کے الفاظ ہیں مجلس میں کوئی بے داڑھی کے لڑکا نہ ہو۔ جاء الباطل ص ۳۲۸ ج ۱۔

الغرض مفتی صاحب نے پہلے تو نابالغ کی بات کو بالغ پر قیاس کیا ہی تھا غضب یہ ڈھایا کہ بچی سے مرد بنالیا، حالانکہ مرد کو دف بجانے کی ممانعت کا فتوی ان کی فقہ میں موجود تھا۔

علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

مباح وهو الدف فی النکاح و فی معناه ماکان من حادث سرور ويکره فی غيره لماروی عن عمر رضی الله عنه انهٗ لما سمع صوت الدف بعث فنظر فان کان فی وليمة سکت و ان کان فی غيره عمده بالدرة و هو مکروه للرجال علی کل حال للتشبه بالنساء.

یعنی دوسری قسم کا آلہ جو نکاح اور دیگر (شرعی) خوشی کے موقع پر مباح ہے وہ دف ہے اور ان کے علاوہ دیگر مواقع پر دف بجانا مکروہ ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب دف کی آواز سنتے تو کسی کو دیکھنے کیلئے بھیجتے اگر ولیمہ کا موقع ہوتا تو خاموش رہتے اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو درہ سے سزا دینے کا قصد کرتے اور مردوں کیلئے ہر حال میں دف بجانا مکروہ ہے کیونکہ اس میں عورتوں سے مشابہت ہے، البحر الرائق ص ۸۸ ج ۷۔

خلاصہ کلام

قارئین کرام مفتی صاحب نے قوالی کے اثبات کیلئے حدیث کے مفہوم میں حسب ذیل بے ایمانیاں کی ہیں۔

(۱) بیان فقط دف کا تھا، مفتی صاحب نے تمام آلات موسیقی کو شامل کرلیا۔

(۲) روایت میں گانے کا ذکر نہ تھا مفتی صاحب نے خود متن میں داخل کرلیا۔

(۳) ذکر نابالغ کا تھا جس سے مفتی صاحب نے بالغ کا فعل ثابت کرلیا۔

(۴) مونث سے مذکر بنالیا۔

(۵) خوشی کے موقع کو عام باور کرا کر قوالی کا اثبات کرلیا۔

علامہ شامی کی ادھوری عبارت

مفتی صاحب نے فتاوی شامی سے قوالی کے جواز پر ایک عبارت نقل کی ہے جس کا ماحاصل یہ ہے کہ

آلات لہو ولعب حرام نہیں ہیں بلکہ آلات لہو ولعب (آلات موسیقی) کو بجانے والا یا سننے والا لہو کا قصد کرے تب حرام ہیں بزرگان دین جو سماع کرتے رہے ہیں اس پر معترض کو انکار نہیں کرنا چاہیے تاکہ ان کی برکات سے محروم نہ ہو،

جاء الباطل ص ۳۲۸ ج ۱۔

اولاً۔ واضح رہے کہ مفتی صاحب نے فقط عربی عبارت نقل کی ہے معنی نہیں کیا، ترجمہ نہ کرنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ مفتی صاحب کا دل بھی اس پر مطمئن نہ تھا ورنہ اپنی دلیل کا معنی ضرور کرتے اور اپنے استدلال کو بھی واضح کرتے۔

ثانیاً۔ علامہ شامی کے کلام میں تناقض ہے کیونکہ پہلے فتاوی شامی ص ۳۹۵ ج ۶ کے حوالے سے ان کی عبارت گزر چکی ہے کہ آلات موسیقی فی نفسہ حرام ہیں اور ان کا سننا مکروہ تحریمی ہے اور اگر اچانک سن لیا تو پوری کوشش کرے کہ نہ سنے۔

ثالثاً۔ جب علامہ شامی کو ان کے حرام ہونے کا اعتراف بھی ہے تو حرمت ان کے مکروہ ہونے

کی وجہ سے ہی ہے نہ کہ بطور لہو ولعب کے، علاوہ ازیں یہ عذر تو ہر حرام اور گناہ میں کیا جاسکتا ہے کہ

شراب کو بطور لہو ولعب کے پینا حرام ہے۔

زنا کو بطور لہو ولعب کے کرنا حرام ہے۔

چوری کو بطور لہو ولعب کرنا حرام ہے۔

الغرض یہ بہانے سرے سے قابل التفات ہی نہیں کہ کسی فعل حرام کو بطور لہو ولعب کرنا حرام ہے، کسی دوسری وجہ سے کرنا جائز ہے۔

رابعاً۔ خود علامہ شامی نے مفتی صاحب کی درج کردہ عبارت سے قبل تحریر کیا ہے کہ

وفی الملتقی و عن النبی ﷺ انه کره رفع الصوت عند قرآة القرآن و الجنازة و الزحف و التذکیر، فما ظنک به عند الغناء الذی یسمونه و جدا و محبة فانه مکروه لااصل له فی الدین قال الشارح زاد فی الجوهرة و ما یفعله متصوفة زمائنا حرام لایجوز القصد و الجلوس الیه و من قبلهم یفعل کذالک الیٰ أن قال و ان کان سماع غناء فهو حرام باجماع العلماء و من اباحه من الصوفیة فلمن تحلی عن اللهو، و تحلی بالتقوی، الی قوله والحاصل انه لا رخصة فی السماع فی زماننا لان الجنید رحمه الله تعالی تاب عن السماع فی زمانه.

یعنی ملتقی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن، جنازہ، جہاد اور وعظ ونصیحت کے وقت آواز کو بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا، تو تمہارا کیا خیال ہے اس گانے کے متعلق جس کو یہ حضرات وجد اور محبت کہتے ہیں کیونکہ یہ مکروہ ہے اور دین اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، شارح کہتے ہیں کہ جوہرہ نیرہ، میں ہے کہ آج کل کے زمانہ میں صوفیوں کی مجلس میں بیٹھنا اور انکاارادہ کرنا ناجائز ہے کیونکہ پہلے لوگ ایسا نہ کرتے تھے، الغرض اگر سماع گانے کے ساتھ ہوتو اس کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے اور صوفیاً سے جو اس کی اباحت کے قائل ہیں وہ اسے بطور لہو کے حلال نہیں جانتے بلکہ بطور تقوی جانتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں سماع سننا جائز نہیں کیونکہ جنیدؒ نے اپنی زندگی میں ہی اس

سے توبہ کرلی تھی۔ ملخصاً فتاوی شامی ص۳۴۹ ج ۶۔

الغرض علامہ شامی بھی اس دور میں سماع وقوالی کے حرام کہنے میں ہمارے ساتھ متفق ہیں۔

واضح رہے کہ اس عبارت کو ہم نے مفتی صاحب کی تردید کی غرض سے نقل کیا ہے، ورنہ ہماری تحقیق اور دین و ایمان یہی ہے کہ قوالی نہ پہلے حلال تھی اور نہ اب ہے، الغرض موسیقی زمانہ رسالت سے ہی حرام تھی، اوراب بھی اس کی حرمت باقی ہے۔

باب کفنی والفی تحریر کرنیکی بحث

دنیا آخرت کی کھیتی ہے اس میں رہ کر جو بویا جائے گا وہ مرنے کے بعد انسان کیلئے پک کر تیار ہوجائے گا، گویا دنیا دار العمل ہے اور اگلی زندگی دارالجزا ہے، جس میں انسان کو اس کے کئے کا پھل مل جائیگا۔

جس نے دنیا کی چار دن کی زندگی کوقرآن وسنت کے مطابق گزارہ وہ آخرت کی پہلی گھڑی قبر میں بھی کامیاب و کامران رہے گا، اسے کسی کفنی والفی کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی وہ منکر ونکیر کے جوابات دینے کیلئے ہماری کفنی والفی کامحتاج ہوگا جیسا کہ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ

اللہ کا نام لکھا ہوا دیکھ کر بھی مردے کو جواب نکیرین یاد آنے کی امید ہے یہ بھی ایک قسم کی تلقین ہے، جاء الباطل ص۳۴۰ ج۱۔

رب تعالی جو احکم الحاکمین ہے فرماتا ہے

يثبت الله الذين امنوا بالقول الثابت فى الحيوة الدنيا و فى الا خرة و يضل الله الظلمين . و يفعل الله مايشاء .(ابراهيم ۲۷)

اللہ تعالی مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور) پکی بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے اور آخرت میں بھی (رکھے گا) اور اللہ تعالی ظالموں کو گمراہ کردیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۱۴-۲۷)

اس آیت میں، فی الاخرۃ، کے الفاظ کاتعلق قبر میں مدفون مومن کے ساتھ ہے جیسا کہ صحیح

حدیث میں اس کی صراحت ہے

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال اذا أقعد المؤمن فی قبرہ اتی ثم شهد ان لا اله الا الله و ان محمدارسول الله فذلک قوله یثبت الله الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیٰوة الدنیا و فی الاخرة.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا جب مومن کو قبر میں بیٹھایا جاتا ہے تو اس کے پاس (فرشتے) آتے ہیں پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاہ کوئی الہٰ نہیں اور بے شک محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔

بالقول الثابت فی الحیٰوة الدنیا و فی الأخرة.

کی آیت سے یہی مراد ہے۔ بخاری ص۱۸۳ ج۱، ومسلم ص۳۸۶ ج۲، واللفظ لہ۔

ہمارے مہربان مفتی صاحب کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

یعنی مومن دنیا میں بہ ہر حال ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور مرتے وقت کلمہ طیبہ پڑھ کر گناہوں سے توبہ کر کے مرتا ہے حساب قبر پر اس کا دل مطمئن رہتا ہے جس سے بہ آسانی جواب دے لیتا ہے، نور العرفان ص۴۱۲۔

مولوی نعیم الدین مراد آبادی (استاذ محترم ،مفتی صاحب) مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ، فی الاخرة ، کے الفاظ کی تفسیر میں فرماتے ہیں

یعنی قبر میں کہ اول منازل آخرت ہے جب منکر ونکیر آکر ان سے پوچھتے ہیں کہ تمھارا دین کیا ہے اور سید عالم ﷺ کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں ان کی نسبت کیا کہتا ہے تو مومن اس منزل میں بفضلِ الٰہی ثابت رہتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور دین اسلام اور یہ میرے نبی محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول (ہیں) خزائن العرفان ص۳۷۴ حاشیہ نمبر۰۷۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مومن کو جس طرح دنیا کی زندگی میں اسلام، بانی اسلام اور رب قدیر کی ذات کا علم اور معرفت ہوتی ہے اسی طرح اسے اخروی اور برزخی زندگی میں بھی علم و معرفت ہوتی ہے اور جس طرح وہ دنیا کی زندگی میں اسلام پر استقامت اختیار کرتا ہے اسی طرح وہ برزخی زندگی میں استقامت رکھتا ہے، وہ قبر کی دہشت اور منکر و نکیر سے خوف زدہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جزم و یقین اور اطمینان سے انہیں جوابات دیتا ہے اور اس کے دل میں ذرا بھر بھی بے قراری نہیں آتی، لہذا اسے کفی والفی سے تلقین کرنا بے سود اور بے کار ہے اور اگر کافر و منافق ہے تب بھی اس کیلئے کفنی والفی عبث ہے کیونکہ کافر و منافق ہماری کفنی والفی کی تلقین کے باوجود اس سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتا۔

الغرض کفنی والفی کی تلقین اصول اسلام اور شریعت حقہ کی تعلیم کے ہی منافی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی معتبر اور سند صحیح سے اس کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کے مقدس گروہ میں اس کا وجود پایا جاتا تھا بلکہ خیر القرون کے سنہری دور میں ان خرافات کا نام و نشان ہی نہ تھا کیونکہ وہ حضرات بخوبی جانتے تھے کہ تلقین کا یہ محل ہی سرے سے نہیں کیونکہ سکھایا پڑھایا تو اسے جاتا ہے جو جانتا نہ ہو، جب کہ قبر میں مدفون مومن تو ان تینوں سوالوں کا جواب بخوبی جانتا ہے وہ تو ساری زندگی ان کیلئے تیاری کرتا ہے اور دن رات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں بسر کرتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دفن کرنے کے بعد تلقین کی بجائے اس کیلئے استقامت کی دعا فرماتے تھے۔

جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

كان النبي ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه فقال استغفروا لا خيكم وا سالوا له بالتثبيت فانه الان يسئل.

یعنی نبی ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس (قبر) پر ٹھہرتے اور فرماتے اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو اور اس کیلئے استقامت کی دعا کرو کیونکہ وہ اب سوال کیا جائے گا۔

سنن ابی داود مع عون ص ۲۰۹ ج ۳، و مستدرک حاکم ص ۳۷۰ ج ۱ .

دیکھئے آنحضرت ﷺ نے استقامت کی دعا فرمائی اور دعا مانگنے کا حکم بھی فرمایا، مگر جو سوالات کیئے جانے تھے، ان کے جواب کی تلقین نہیں فرمائی اگر کفنی وغیرہ سے میت کو فائدہ ہوتا ہے تو آپ علیہ السلام ضرور بھر ضرور دعا کی طرح کفنی و الفی کی تحریر لکھنے کا حکم بھی فرماتے، مگر ایسا کسی حدیث سے ثابت نہیں اور آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے جس فعل کو کرنے کا میں نے حکم و ارشاد نہیں فرمایا، وہ مردود و بدعت ہے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھورد.

یعنی بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس (شخص) نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے کوئی حکم (ثبوت) نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے۔

بخاری ص ۱۰۷۲ ج ۲، و مسلم ص ۷۷ ج ۲، و مسند احمد ص ۱۴۶ و ۱۸۰ و ۲۵۶ ج ۶، و سنن دار قطنی ص ۲۲۷ ج ۴.

یہ حدیث بدعات کے رد میں اصول کا درجہ رکھتی ہے کہ جن بدعات کو مبتدعین کرتے ہیں ان میں اگر کوئی خیر و برکت ہوتی ہے تو ہادی برحق ﷺ ان کے کرنے کا ارشاد فرماتے اور خیر و برکت کی خبر بھی دیتے مگر زبان نبوی علیہ التحیۃ والسلام اس سلسلہ میں خاموش ہے کہ مرنے والے کے کفن میں الفی وغیرہ تحریر کی جائے۔

ثابت ہوا کہ کفنی و الفی کی شرع میں وضاحت نہیں لہذا بدعت سیئہ اور فرمان مصطفی ﷺ کے مخالف ہے، چنانچہ علماء اہل حدیث نے اسکے بدعت قبیحہ ہونے کی دھڑلے سے صراحت کی ہے۔

چنانچہ الحاج میاں محمد نذیر حسین محدث دھلوی ؒ فرماتے ہیں

اسی طرح جو کفن پر لکھنے کی روایت نقل کی ہے محض بے اصل اور اس کا کچھ پتا اور نشان کتب آئمہ اربعہ بروایت صیحہ اور محدثین محققین کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا اور ظاہر ہے کہ کفن پر آیات و دعا لکھنا سرا سر بے ادبی ہے کہ پیپ اور خون میں ملوث ہوں گے، اس لئے ابن عابدین شامی نے

حاشیہ درمختار میں کفن پر آیت و حدیث کے لکھنے سے منع کیا ہے

وقد افتی ابن الصلاح بانه لایجوز ان یکتب علی الکفن سورة یٰس او الکهف و نحوهما خوفا من صدید المیت، فلا یجوز تعر یضهما للنجاسة، والقول بانه یطلب فعله مردود لان مثل ذلک لایحتج به الا اذا صحح عن النبی ﷺ طلب ذلک و لیس کذلک اه و قدمنا قبیل باب المیاه عن الفتح انه تکره کتابة القران واسماء الله تعالی علی الدراهم والمحاریب والجدران و مایفرش، وما ذاک إلا لا حترامه و خشیمة وطئه و نحوه مما فیه إهانة فالمنع هنا بالأولی مالم یثبت عن المجتهد اوینقل فیه حدیث ثابت فتأمل، ملحضاً، فتاوی شامی ص۲۴۶ ج۲، کتاب الجنائز (باب الشهید) مطلب فیما یکتب علی کفن المیت.

یعنی ابن صلاح نے کفن پر سورۃ کھف اور یٰسین لکھنے کی ممانعت کا فتوی دیا ہے، کیونکہ میت کی پیپ سے کفن ناپاک ہوجائیگا اور قرآن مجید کی توہین ہوگی اور یہ کہتے ہیں (مبتدعین) کر لینا چاہیے، یہ بات مردود ہے کیونکہ نبیﷺ سے منقول نہیں ہے اور ہم پہلے باب المیاہ میں فتح القدیر سے بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے (ابن ھمام حنفی) دراھم، محرابوں، دیواروں پر قرآن پاک کی کتابت اور اللہ تعالی کے اسماء لکھنے سے منع کیا ہے اور یہ ان کا فتوی نہیں مگر اس خوف وخطرہ کی وجہ سے کہ اس سے ان کی اہانت (توہین) ہوگی اور یہاں (کفن پر کفنی) پرتو بالاولیٰ منع ہونا چاہئے، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں کسی مجتھد کا فتوی یا حدیث ثابت نہ کی جائے............

الراقم العاجز سید محمد نذیر حسین عفی عنہ، فتاوی، نذیریہ ص۶۹۱ ج۱۔

مفتی اہل حدیث، شارح سنن ابو داؤد حضرت علامہ محمد شمس الحق محدث عظیم آبادی فرماتے ہیں۔

میت کی پیشانی پر انگلی سے بسم اللہ لکھنا کتاب الہی وسنت رسول واجماع صحابہ وقیاس مجتھدین سے ہرگز ثابت نہیں ہے اور جو ان چار دلیلوں میں سے کسی سے بھی ثابت نہ ہو وہ کام کرنا منع ہے

اور اسی طرح کفن پر کوئی چیز لکھنا یا کسی متبرک چیز کا رکھنا بھی جائز نہیں ہے، اگر سوال کیا جائے کہ فقہ کی بعض کتابوں سے لکھنا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ محمد بن محمد بزازی نے فتاوی بزازیہ میں لکھا ہے کہ، صفار نے کہا ہے کہ اگر میت کی پیشانی یا پگڑی یا کفن پر عہد نامہ لکھا جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالی اس کو بخش دے اور، تاتارخانیہ، میں ہے کہ کسی نے اپنے بیٹے کو وصیت کی جب میں مر جاؤں اور غسل دے دیا جائے تو میری پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم، لکھ دینا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا خواب میں باپ کو دیکھا تو اس کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ جب مجھے قبر میں رکھا گیا تو عذاب کے فرشتے آئے جب انہوں نے میری پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ لکھی دیکھی تو کہنے لگے تو عذاب سے بچ گیا اور ابراھیم نے صغیری شرح منیہ، میں اور علاؤالدین حصفکی نے درمختار میں اور ابن عابدین نے رد المختار، میں فتاوی بزازیہ کے حوالے سے اس عبارت کو لکھا ہے اور جواز کا فتوی دیا ہے اور ابن عجیل پہلے اسی کا فتوی دیتے تھے بعد ازاں صدقہ کے اونٹوں پر جو لفظ، اللہ، لکھا جاتا تھا اس پر قیاس کر کے لکھنے کا فتوی بھی دینے لگے اور اسی طرح شرجی کے حوالے سے بعض محشین نے سینہ پر انگلی سے بسم اللہ اور کلمہ لکھنا نقل کیا ہے، یہی فتوی محمد اسحاق دھلوی نے مائۃ المسائل، میں اور، مفتاح الجنان، و، کفایہ، شعبی میں درج ہے، تو اس سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں، میں کہتا ہوں ادلہ اربعہ میں سے کوئی دلیل بھی مذکورہ کتابوں میں نقل نہیں کی گئی اور اس کی بنا قیاس فاسد پر ہے یا پھر خواب پر، قیاس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اذکار اور ادعیہ اور ان کی ہیئت کزائی سب توقیفی (جن پر قیاس کو دخل نہ ہو) ہیں ان کو از خود تجویز کرنے اور ان پر اجر و ثواب مرتب کرنیکا کسی کو بھی حق نہیں ہے، یہ حق صرف اللہ تعالی اور اس کے رسول کا ہے بعض چیزیں بظاہر دیکھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن چونکہ وہ منقول نہیں ہیں لہذا منع ہیں، دیکھئے صبح طلوع ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ سے صرف دو رکعت سنت ثابت ہیں اب اگر کوئی زیادہ پڑھے تو ناجائز ہوگا، حالانکہ نماز فی نفسہ بہت اچھی چیز ہے، عید گاہ میں نفل چونکہ آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہیں اگر وہاں نفل پڑھے ناجائز ہوگا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے کہ سورۃ قل یا ایھا الکفرون سے لیکر آخر تک ایک ہی رکعت میں نہ پڑھے کیونکہ یہ بدعت ہے ،ثابت نہیں، اور صدقہ کے اونٹوں پر قیاس کر کے لکھنا قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ اونٹوں پر جو لکھا جاتا تھا وہ علامت کیلئے لکھا جاتا تھا اور یہاں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ تبرک اور نجات کیلئے لکھا جاتا ہے اور پھر وہاں بے ادبی کا امکان نہیں اور یہاں پیپ وغیرہ میں ملوث ہونے کا یقین ہے..........

باقی رہا خواب کا معاملہ تو نبی کی خواب کے سوا کسی کی خواب حجت شرعی نہیں ہے۔

العبد الفقیر ابو الطیب محمد المدعو بشمس الحق عفاعنه ذنوبه رب الفلق.

نوٹ۔ اصل فتوی فارسی زبان میں ہے، جس میں عربی عبارات بھی بکثرت ہیں، راقم نے عوام کی تفہیم کیلئے، فقط مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کا ترجمہ اختصار سے نقل کیا ہے، فتاوی نذیریہ ص۷۰۰تا۷۰۵ج۱۔

شارح سنن ترمذی علامہ محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

ڈھیلوں پر سورۃ اخلاص وغیرہ پڑھ کر قبر میں رکھنا یا قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی دعا لکھ کر قبر میں رکھنا یا کعبہ شریف کا غلاف یا کسی بزرگ کا کوئی کپڑا یا اس کی کوئی اور چیز تبرکاً قبر میں رکھنا جائز نہیں ہے یہ کام ناواقف لوگوں کا ہے، ایسے کاموں سے احتراز واجتناب لازم ہے۔کتاب الجنائز ص۷۳۔

شیخ الاسلام امام المناظرین حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں کہ ایسے افعال حدیثوں سے ثابت نہیں ہیں، اگر کچھ ہے تو بدعت ہے۔

فتاوی ثنائیہ ص۲۹ج۲۔

الغرض یہ بدعت سیئہ ہے، اس کو کرنے اور لازم قرار دینے والے حضرات پر اس کی دلیل شرعی دینی ادھار ہے جو کہ یہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے، ان شاء اللہ تعالی۔

کفنی یا الفی لکھنے کے دلائل اور ان کا تجزیہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

قبر میں بزرگان دین کے تبرکات اور غلاف کعبہ وشجرہ یا عہد نامہ رکھنا مردہ کی بخشش کا وسیلہ ہے قرآن فرماتا ہے کہ

وابتغوا الیه الوسیلة. یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے فرمایا تھا،

اذھبوا بقمیصی ھذافا لقوہ علی وجه ابی یات بصیرا.

میری قمیض لے جا کر والد ماجد کے منہ پر ڈال دو وہ انکھیارے ہوجائیں گے، معلوم ہوا کہ بزرگوں کا لباس شفا بخشتا ہے، کیونکہ یہ ابرہیم علیہ السلام کی قمیض تھی تو امید ہے کہ بزرگوں کا نام مردے کی عقل کھول دے اور جوابات یاد آجائیں،

جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا توسل سے تبرک اور تبرک سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کا تعلق کفنی والفی لکھنے سے ہے، قطعاً نہیں، تو پھر مبتدعین کا موقف کیسے ثابت ہوا۔

ثانیا۔ مفتی صاحب کا تبرک اور وسیلہ کو ایک ہی زمرہ میں گنوانا، غلط بیانی ہے، کیونکہ وسیلہ تو کہتے ہیں اللہ تعالی کا کسی چیز سے تقرب حاصل کرنے کو، اسکی تین صورتیں مشروع ہیں۔

(۱) اللہ تعالی کے اسماء حسنٰی میں سے کسی اسم پاک یا کسی صفت حمیدہ کے ساتھ وسیلہ۔

(۲) دعا کرنے والا اپنے عمل کو وسیلہ کے طور پر پیش کرے۔

(۳) کسی زندہ مرد صالح کی دعا کے ساتھ وسیلہ۔

ان کے علاوہ باقی صورتیں وسیلہ کی اختلافی ہیں، جب کہ اس میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ناجائز اور غیر مشروع ہیں کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس کے ساتھ حجت پکڑی

جائے۔

جب کہ مبتدعین کا موقف ہے کہ اللہ تعالی کا تقرب اعمال و عبادات اور انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کی ذات کے توسل سے بھی جائز ہے۔

مولانا غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی فرماتے ہیں کہ

ائمہ لغت کی ان تصریحات سے واضح ہوا کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے، اللہ تعالی کا تقرب اعمال صالحہ اور عبادات سے حاصل ہوتا ہے، تاہم انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اللہ تعالی کی بارگاہ میں جو عزت اور وجاہت حاصل ہے اللہ تعالی کی بارگاہ میں قبولیت دعا کیلئے اس عزت اور وجاہت کو پیش کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے، زندگی میں اور وفات کے بعد بھی۔ شرح صحیح مسلم ص۵۶ ج۷۔

لیکن اس کے برعکس تبرک یہ ہے کہ کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے آثار سے جب کسی اثر کو پالے تو وہ اس کے ساتھ حصول خیر و برکت کا متمنی ہو، تو گویا تبرک و توسل میں دو طرح سے فرق ہے۔

(۱) تبرک کے ساتھ کسی دینوی خیر و برکت ہی کی امید ہوتی ہے، لیکن توسل میں دنیا و آخرت میں کسی بھی خیر و برکت کی امید کی جاسکتی ہے۔

(۲) تبرک سے جلد حاصل ہوجانے والی خیر و برکت کا حصول مقصود ہوتا ہے جب کہ وسیلہ صرف دعا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مگر افسوس کہ تبرک و توسل کو مفتی صاحب ایک باور کرا رہے ہیں پھر بات کو خلط ملط کر کے توسل سے تبرک اور تبرک سے کفنی و الفی بنالی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، جس کی دلیل پر ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ثالثاً۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد محترم علیہ السلام کو اپنی قمیض بھیجنا اور ان کی اس سے بینائی لوٹ آنے کو کفنی و الفی سے کیا واسطہ ہے، حضرت شاہ عبدالقادر محدث دھلوی حنفی فرماتے ہیں آنکھیں گئی تھیں ایک شخص کے فراق میں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی ہوئیں، یہ کرامت تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی، موضح القرآن بحوالہ تفسیر عثمانی ص۳۲۶۔

الغرض یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا، اور معجزہ سے قبر میں کفنی والفی کا ثبوت کس طرح ثابت ہوگیا۔

اس طرح تو ایک شخص یہ بھی دعویٰ کر سکتا ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور بابرکت بھی ہے لہذا قبر میں قرآن کریم بھی رکھنا چاہیے، دوسرا آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور معجزہ ملا تھا لہذا قبر میں عصا رکھنا چاہئے، تیسرا شخص یہ اجتہاد بھی کر سکتا ہے کہ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو تلوار عنایت کی تھی جو بابرکت تھی لہذا قبر میں تلوار کو رکھا جائے، چوتھا آدمی یہ دعویٰ کر دے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے فضلات (پیشاب و پاخانہ وغیرہ) طاہر ہیں اور ان سے پیٹ کی بیماری دور ہوگئی تھی۔

شرح صحیح مسلم ص ۷۸۱ و ۷۸۹ ج ۶، مولفہ غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی۔

لہذا قبر میں کسی ولی و بزرگ سے پیشاب و پاخانہ کروا کر میت کو دفن کرنا چاہیے۔

تو ایسے مدعی کو علماء بریلویہ بھی دماغی اپریشن کا مشورہ دیں گے جب کہ اہل علم اور ارباب عقل و خرد کے نزدیک ان جیسے دلائل کی حیثیت پرکاہ کی بھی نہیں۔

رابعاً۔ قرآن کریم کی یہ آیات رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئیں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے ان کو پڑھا تابعین عظام ان سے بخوبی واقف تھے خیر القرون میں ان کی خوب شہرت تھی، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی پتہ نہ چلا کہ ان آیات سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے، اسکی دریافت کا سہرا مبتدعین کے حکیم الامت اور مفسر قرآن کے سر پر ہے کہ جو اپنے استدلال باطل میں کوئی دلیل سنت خیر الانام اور تعامل صحابہ کرام اور اقوال تابعین سے پیش نہیں فرمارہے، معلوم ہوا کہ ان آیات سے کفنی والفی کا مفہوم مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے، جو تفسیر بالرائے ہونے کی وجہ سے اس لائق ہے کہ، اٹھا کر پھینک دو اسے باہر گلی میں۔

جب کہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے، اس کے بعد تفسیر قرآن بالآحادیث، کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر قرآن نہایت ہی اعلیٰ، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ اور خلفاء الراشدین، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع

تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر، ماخوذ از اعلاء کلمۃ اللہ للعلامہ گولڑوی قدس سرہ۔ جاء الباطل ص ۱۱ ج ۱۔

مگر آنحضرت ﷺ اور امت مرحومہ کا تعامل ہمارے پیش نظر ہے کسی ایک نے بھی مذکورہ آیات کو کفنی والفی پر محمول نہیں کیا، جس سے ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کی تفسیر ایجاد بندہ ہے جو من گھڑت ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہے۔

اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو سنت صحیحہ آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور اقوال تابعین سے اس کا ثبوت دیں، جو ان شاء الرحمٰن کبھی بھی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، یہ صبح ازل تک ان پر ادھار رہے گا۔ ان شاء الرحمٰن۔

خامساً قرآن تو بیان کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ

اذهبوا بقميصى، سورہ یوسف آیت ۹۳ میرا یہ کرتا لے جاؤ (ترجمہ مولوی احمد رضا)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کرتا بھائیوں کو دیا تھا، وہ ان کا اپنا تھا، مگر مفتی صاحب قرآن کے اس بیان پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی قمیص تھی، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

علاوہ ازیں مفسرین نے یہ بات بیان کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اللہ تعالی نے اس بات کی وحی کی تھی کہ کہ قمیض ڈالنے سے ان کی بصارت لوٹ آئے گی،

خازن ص ۳۱۴ ج ۳، و جواہر القرآن ص ۵۳۸ ج ۲۔

سوال یہ ہے کہ کیا مبتدین پر بھی الفی لکھنے کی وحی نازل ہوئی ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں، تو پھر ہم حکم الہی اور آپ کی ایجاد و اختراع کو ایک کیسے سمجھ لیں۔

مفتی صاحب کی دسری دلیل

مشکوۃ باب غسل المیت میں ام عطیہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے کہ جب ہم زینب بنت رسول اللہ ﷺ کو غسل دیکر فارغ ہوئے تو نبی کریم علیہ السلام کو خبر دی، ہم کو حضور علیہ السلام نے اپنا تہبند شریف دیا اور فرمایا کہ تم کفن کے اندر جسم میت سے متصل رکھ دو۔

اس کے تحت فلاں نے یہ لکھا فلاں نے یہ تحریر کیا ہے وغیرہ۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱۔

کیا حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے کفن میں کوئی علیحدہ کفنی والفی رکھی گئی تھی؟

الجواب۔ اولاً۔ حدیث کے الفاظ (اشعرنھا ایاہ) بخاری ص ۱۶۷ ج ۱، ومسلم ص ۳۰۴ ج ۱، ہمارے پیش نظر ہیں، اور لفظ شعار کا معنی ہوتا ہے، وہ کپڑا جو بدن سے لگا ہوا ہو، اس لغوی معنی کو ملحوظ رکھ کر ہم بنیان کو شعار تو کہہ سکتے ہیں جب کہ اوپر پہنی ہوئی قمیض کو ہم، شعار، نہیں بلکہ دثار کہیں گے، شارحین حدیث نے اس کا حسب ذیل معنی کیا ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں۔

وھو الثوب الذی یلی الجسد سمی شعارا لانہ یلی شعر الجسد.

یعنی شعار، اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم سے ملا ہوا ہو، اور اس کا نام شعار اس لئے بولا جاتا ہے کہ یہ جسم انسانی کے بالوں سے ملا ہوتا ہے۔

شرح صحیح مسلم ص ۳۰۴ ج ۱۔

ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں کہ۔

والشعار الثوب الذی یلی الجسد لانہ یلی شعرہ قال الطیبی ای اجعلن ھذا الحقو تحت الاکفان بحیث یلاصق بشرتھا.

یعنی شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو انسانی جسم سے ملا ہوا ہو کیونکہ یہ میت کے شعر (بالوں) سے ملا ہوتا ہے، علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ (نبی علیہ السلام کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ) اس تہبند کو کفن کے دوسرے کپڑوں کے نیچے پہنانا کہ یہ اس کی ظاہری جلد کے ساتھ ملا ہوا ہو، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۳۳ ج ۴۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ

اجعلنہ یلی جسد ھاقبل سائر ا کفانھا.

یعنی کفن کے دیگر کپڑوں سے قبل اسے جسم کے ساتھ ملا کر پہنانا۔

التمھید لمافی الموطا من المعانی والاسانید ص ۳۷۹ ج ۱.

علامہ ابن منظور افریقی پہلے اس کا معنی بتاتے ہیں کہ شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اوپر والے (دثار) کے نیچے انسان نے پہن رکھا ہو، پھر بعدہ اسی حدیث کا معنی بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، الذی یلی جسدھا، لسان العرب ص ۴۱۳ ج ۴۔

یہی معنی علامہ محمد مرتضی الحسینی حنفی نے، تاج العروس ص ۳۰۲ ج ۳، میں اور، علامہ فیومی نے، المصباح المنیر ص ۳۱۵۔ میں کیا ہے،

شارحین حدیث اور ائمہ لغت کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا تہبند کفن پہنانے کیلئے عطا فرمایا تھا اور برکت کیلئے یہ حکم فرمایا کہ اسے سب سے پہلے پہنانا۔

چنانچہ مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ، اس روایت کا حسب ذیل ترجمہ کرتے ہیں۔

آپ نے ہماری طرف چادر پھینکی اور فرمایا اسکو سب کپڑوں کے نیچے پہنانا۔ شرح صحیح مسلم ص ۵۶۷ ج ۱، رقم ۲۰۶۳)۔

مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں بھی اس سے یہی سمجھا ہے کہ تہبند شریف کفن پہنانے کیلئے عنایت فرمایا تھا، ان کے الفاظ ہیں

حضور پرنور صلوات اللہ تعالی وسلامہ علیہ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب یا حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنھا کے کفن میں اپنا تہبند اقدس عطا کیا، فتاوی رضویہ ص ۱۳۰ ج ۴۔ خاں صاحب کی اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ تہبند کفن کیلئے عنایت فرمایا تھا۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آگئی کہ تہبند کو کفن کے اندر ہی محض نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اس چادر مبارک کو کفن کا ایک جزو بنایا گیا تھا، مگر مفتی احمد یار خاں نہایت دیدہ دلیری سے متن حدیث میں معنوی تحریف کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ

تم کفن کے اندر جسم میت سے متصل رکھ دو۔ جاء الباطل ص ۳۳۶ ج ۱،

اس تحریف کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ کفنی والفی کفن کا جزو وحصہ نہیں ہوتی بلکہ کفن سے زائد کسی کپڑے وغیرہ پر لکھ کر کفن میں رکھی جاتی ہے جیسا کہ مفتی صاحب تحریر کرتے ہیں

جو شخص اس دعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو

عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر ونکیر کو دیکھے گا،

جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

جب کہ روایت مذکورہ میں کفن کیلئے تہبند عنایت کرنے کر کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ کفن سے الفی کا ثبوت نہ بنتا تھا، مفتی صاحب نے دلیل کے سقم کو دور کرنے کیلئے معنی حدیث ہی بدل دیا ہے۔

ثانیاً۔ اس ہیرا پھیری کے باوجود مفتی صاحب کی کفنی و الفی ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ تہبند میں کوئی تحریر نہ لکھی گئی تھی۔

ثالثاً۔ تہبند تو آنحضرت ﷺ کے آثار میں سے ہے، تو کیا کفنی و الفی بھی حضور علیہ السلام کے آثار سے ہے؟ قطعاً نہیں تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

رابعاً۔ مفتی صاحب کا نبی کریم ﷺ کے آثار پر اولیاء کرام اور بزرگان دین کے آثار کو قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ نبی اور امتی قطعاً برابر نہیں، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم جو خیرالقرون میں علوم نبویہ کی امین جماعت تھی اپنے مرنے والوں کو اپنے آثار کے ساتھ دفن کرتی، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا، اور مبتدعین ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود کسی صحابی و تابعی سے اس کا ثبوت نہیں دے سکتے کہ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کی موت پر اپنے آثار کو ان کے ساتھ برکت کیلئے دفن کیا ہو، دیدہ باید۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

مشکوٰۃ باب غسل لمیت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام عبداللہ بن ابی کی قبر پر تشریف لائے جب کہ وہ قبر میں رکھا جا چکا تھا، اس کو نکلوایا، اس پر اپنا لعب دہن ڈالا اور اپنی قمیض مبارک اس کو پہنائی۔

جاء الباطل ص ۳۳۷ ج ۱۔

کیا منافقین کے لیڈر کے کفن میں حضور ﷺ نے کفنی والفی رکھی تھی؟

الجواب۔ اولاً۔ اس روایت میں بھی قمیض میں کفن دینے کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی مر گیا تو

جاء ابنه عبدالله بن عبداللّٰه الی رسول الله ﷺ فاعطاه، قمیصه وامره ان یکفنه فیه، الحدیث.

یعنی اس کا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ (جو کہ ایک پکے مسلمان تھے) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ علیہ السلام نے اسے اپنی قمیض عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ اس قمیض میں اسے کفن دیا جائے۔ صحیح بخاری ص۶۷۴ ج ۲۔

بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ اس کے بیٹے نے کفن کیلئے قمیض مانگی تھی جس پر آپ علیہ السلام نے یہ قمیض عنایت فرمائی تھی،

و بخاری ص۱۶۹ ج۱، مسلم ص ۳۶۸ ج ۲۔

الغرض اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی قمیض میں کفن دینے کا بیان ہے نہ کہ کفنی والفی لکھنے کا ذکر، مگر مفتی صاحب کفن سے الفی وغیرہ ثابت کرنے کے درپہ ہیں، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

ثانیاً۔ کیا قمیض پر آنحضرت ﷺ نے کوئی تحریر لکھوا کر دی تھی؟ نہیں، تو پھر آپ حضرات کی کفنی والفی کیسے ثابت ہوگئی۔

ثالثاً۔ حدیث میں تو یہ الفاظ بھی ہیں کہ

فنفث فیہ من ریقہ، اسپر اپنا لعاب مبارک (بھی) ڈالا۔

بخاری ص۱۶۹ ج۱، و، مسلم ص ۳۶۸ ج ۲۔

ظاہر ہے کہ جس مقصد کیلئے آپ نے قمیض عنایت فرمائی تھی اسی نیت سے دہن اقدس کا لعاب بھی ڈالا تھا، تو کیا مبتدعین اپنے مرنے والوں پر تھوک اور رال بھی برکت کیلئے ڈالتے ہیں؟ اگر نہیں ڈالتے یقیناً نہیں ڈالتے تو وجہ فرق بیان کریں۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

بخاری کتاب الجنائز باب من اعد الکفن، میں ہے کہ ایک دن حضور علیہ السلام تہبند شریف پہنے ہوئے باہر تشریف لائے کسی نے وہ تہبند شریف حضور علیہ السلام سے مانگ لیا، صحابہ کرام نے اس سے کہا کہ حضور علیہ السلام کو اس تہبند کی ضرورت تھی اور سائل کو رد کرنا عادت کریمہ نہیں، تم نے

کیوں مانگ لیا انہوں نے کہا کہ

واللہ ما سئلته لالبسها انما سئلته لتکون کفنی قال سھل فکانت کفنه.

اللہ کی قسم میں نے پہننے کیلئے نہیں لیا میں نے تو اس لئے لیا ہے کہ یہ میرا کفن ہو، سہل فرماتے ہیں کہ وہی اس کا کفن ہوا۔ جاء الباطل ص ۳۳۷ ج ۱۔

کیا زندگی میں کفن تیار کرنے سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے؟

جواب اولاً۔ اس عنوان کا باب بخاری میں قطعاً نہیں یہ مفتی صاحب کا وہم اور، رسائل سے کتاب تحریر کرنے کا نتیجہ ہے، ہاں یہ روایت بخاری ص ۱۷۰ ج ۱ میں باب **من استعد الکفن فی زمن النبی** ﷺ، **فلم ینکر علیه** کے تحت موجود ہے۔

ثانیاً۔ مگر اس روایت کو کفنی والفی سے کیا تعلق، بالخصوص جب خود مفتی صاحب اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ میں نے اس لئے لیا ہے کہ یہ میرا کفن ہو۔الخ ظاہر ہے کہ کفن پہنانا ایک مسنون عمل ہے اس سے کفنی والفی کی بدعت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ کفن میں شمار نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق بدعت سے ہے جو مسنون کفن و دفن میں ایک زائد چیز ہے، افسوس کہ مفتی صاحب کا دعوی کچھ اور دلیل کچھ اور دیتے ہیں اور دعوے و دلیل کی موافقت کے بغیر احادیث نقل کرتے جانا اور عوام الناس کو مغالطہ دینا مبتدعین کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، پھر مزید یہ کہ اس گھناؤنے جرم پر شرم وحیاء کی بجائے یہ لوگ مرتکب کو حکیم الامت وغیرہ القاب سے نوازتے ہیں۔

ثالثاً۔ کیا نبی ﷺ نے تہبند پر عہد نامہ اور شجرہ لکھوا کر دیا تھا، نہیں ہرگز نہیں، تو پھر اس سے کفنی والفی کس طرح ثابت ہوئی۔

الغرض بحث نزاع مسئلہ تو کفنی وغیرہ کا ہے جس کی دلیل سے مفتی صاحب ابھی تک ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اور ادھر ادھر کی غیر متعلقہ احادیث کو نقل کرکے مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے الجھائے بیٹھے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ مفتی صاحب یہ تو کہتے ہیں کہ

میت کے لئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جائے، جاء الباطل ص ۳۴۱ ج ۱۔

مگر اس کی دلیل دینے کی بجائے، کفن کے دلائل نقل کرتے ہیں، اے جی کفن سے کس نے

انکار کیا ہے اور کون آثار نبوی علیہ التحیۃ والسلام کی برکت کا منکر ہے کہ آپ ان کے دلائل نقل کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

ابونعیم نے معرفۃ الصحابۃ میں اور دیلمی نے مسند الفردوس میں بسند حسن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سیدنا علی کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت اسد کو حضور علیہ السلام نے اپنی قمیض میں کفن دیا اور کچھ دیر ان کی قبر میں خود لیٹے، پھر ان کو دفن کیا، لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا

انی البستها لتلبس من ثياب الجنة و اضطجعت معها فی قبرها لا خفف عنها ضغطه القبر.

قمیض تو اس لئے پہنائی کہ ان کو جنت کا لباس ملے اور ان کی قبر میں آرام اسلئے فرمایا کہ ان سے تنگی قبر دور ہو، جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

کیا رسول اللہ ﷺ والدہ علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قبر میں لیٹے تھے؟

الجواب۔ اولاً۔ **مسند فردوس الاخبار، للحافظ شیرویہ بن شہر دار بن شہیر ویہ الدیلمی، طبع دارالکتاب العربی بیروت** ۱۹۸۷ء کو راقم نے گہری نظر سے دیکھا ہے، اس کی پانچوں جلدوں کے ایک ایک صفحہ کو بغور پڑھا ہے مگر اس میں یہ روایت راقم کو نہیں ملی، ہاں البتہ ہمیں یہ روایت امام طبرانی کی، المعجم الاوسط ص۲۴۷ ج ۷ (۶۹۳۱) سے ملی ہے اور علامہ علی متقی نے کنز العمال ۳۴۴۱۹ و ۳۷۶۰۷، میں دیلمی کے حوالے سے بیان کیا ہے، لیکن سند ذکر نہیں کی البتہ حسن قرار دیا ہے، لیکن یہ بات غلط ہے کیونکہ سند میں ایک راوی سعدان بن ولید صاحب السابری، ہے امام طبرانی نے اسے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسے بیان کرنے میں سعدان بن ولید منفرد ہے، (ص۲۴۷ ج ۷) علامہ ذھبی نے بھی سعدان کی سند کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے، ھذا غریب، یعنی سنداً یہ روایت غریب ہے، سیر اعلام النبلاء ص۱۰۸ ج ۲، اس سے ثابت ہوا

کہ اس روایت کا دارومدار سعدان بن ولید السابری پر ہے، اور یہ مجھول الحال ہے، راقم نے رجال کی تقریباً تمام متداول کتب کو دیکھا ہے کسی محدث نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

لہذا مولوی احمد رضا خاں کا اس کی سند کو حسن کہنا (فتاوی رضویہ ص۱۳۰ ج۴) اور مفتی صاحب کا ان کی تقلید میں بسند حسن لکھنا غلط بیانی ہے۔

کیونکہ مجھول راوی کی وجہ سے یہ روایت درجہ صحت سے گر گئی ہے، مگر مبتدعین کا اصول ہی نرالا ہے کہ مجھول شخص کی روایت کو حسن کہہ رہے ہیں، حالانکہ علامہ ہیثمی نے اسے، معجم الاوسط، سے نقل کر کے لکھا ہے

و فیه سعدان بن الویلد ولم اعرفه.

یعنی اس کی سند میں سعدان ہے جسے میں نہیں جانتا۔

(مجمع الزوائد ص۲۶۰ ج۹)۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے الفاظ روایت بھی درست درج نہیں کئے، اصل الفاظ یوں ہیں

البستها قمیصی لتلبس من ثیاب الجنة،الخ طبرانی الاوسط ص ۳۷۴ ج۷، و مجمع الزوائد ص ۲۶۰ ج ۹، و فتاوی رضویه ص ۱۳۰ ج ۴.

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے متن روایت کا معنی بھی غلط کیا ہے، اور ان کی قبر میں آرام، اسلئے فرمایا کہ ان سے تنگی قبر دور ہو۔ جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

حالانکہ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں

و اضطجعت معها فی قبرها لیخفف عنها من ضغطة القبر.

یعنی میں اس کے ساتھ اس کی قبر میں اس لئے لیٹا کہ اس کی قبر کی تنگی اس پر ہلکی ہو۔ المعجم الاوسط ص ۳۷۴ ج ۷۔

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ یہ عظمت مصطفی ﷺ کے خلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ کسی غیر محرمہ کی قبر میں اس کے ساتھ لیٹے۔ رب محمد ﷺ کی قسم ہے یہ آپ پر افترا ہے، مسلمانو! آپ کے پیرومرشد رحمت للعالمین امام الانبیاء سید دو عالم حضرت محمد مصطفی ﷺ نے تو عورتوں سے بیعت لیتے وقت بھی ان سے مصافحہ نہیں کیا۔ موطا امام مالک باب

ماجاء فی البیعۃ، عن امیمۃ رضی اللہ عنھا بنت رقیقہ۔

اگر مبتدعین کو ہماری اس بات سے اختلاف ہے تو کیا وہ اس پر عمل کرنے کیلئے تیار ہیں کہ جب کوئی غیر محرمہ خاتون فوت ہو تو یہ کسی پیر بزرگ اور اپنے مولوی صاحب کو قبر میں اس خاتون کے ساتھ تبرک حاصل کرنے کی نیت سے لٹائیں؟ اگر نہیں یقیناً نہیں! تو یہ بات ہم اپنے پیر و مرشد امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں کیسے مان لیں جو تمام دنیا سے زیادہ پاکیزہ اور عظمت والے ہیں، الغرض یہ روایت عظمت مصطفیٰ کے منافی ہونے کی وجہ سے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

رابعاً۔ لفظی و معنوی تحریف کے باوجود یہ روایت مبتدعین کی قطعاً دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس میں کفنی والفی لکھنے کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔

ملحوظہ

مجمع الزوائد، میں کتابت کی غلطی سے متن روایت کے الفاظ ہیں کہ، لماماتت فاطمۃ بنت علی بن ابی طالب، ص۲۶۰ ج۹۔

غلطی کی دلیل یہ ہے کہ علامہ ھیثمی نے اسے طبرانی اوسط سے نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ، لما ماتت فاطمہ ام علی بن ابی طالب، ص۲۷۴ ج۷، الغرض کتابت کی غلطی سے لفظ، ام، بنت، میں بدل گیا ہے، اس پر دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بیٹی فاطمہؓ کی وفات ۱۱۷ھ میں ہوئی تھی، تھذیب ص۴۴۳ ج۱۲۔

ظاہر ہے کہ ان کی تو پیدائش اور وفات ہی آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی تھی، لہٰذا ان کے جنازہ میں شرکت اور تہبند عنایت کرنے کے کیا معنی۔

دیگر روایات

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنھا کو آنحضرت ﷺ کا تہبند عنایت کرنے اور ان کی قبر میں ساتھ لیٹنے کی روایت متعدد طرق سے مروی ہے، جو کہ تمام مجروح اور ناقابل اعتبار ہیں، جن کی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ روایت حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مستدرک حاکم، ص۱۰۸ ج۳، میں آتی ہے مگر یہ سنداً نہایت درجہ کی کمزور ہے کیونکہ سند میں عبدالرحمٰن بن عمرو بن جبلہ راوی ہے، علامہ ذھبی فرماتے ہیں

قال ابو حاتم کان یکذب، فضربت علیٰ حدیثه، وقال الدارقطنی، متروک یضع الحدیث.

یعنی امام ابو حاتم کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتا تھا، میں نے اس کی روایات پر نشان لگادیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ متروک اوراحادیث وضع کرتا تھا۔

میزان الاعتدال ص۵۸۰ ج۲۔

اس کے علاوہ بھی اس سند میں خامیاں ہیں جنہیں ہم سرے دست نظر انداز کرتے ہیں الغرض یہ روایت عبدالرحمٰن کی وجہ سے قریب الموضوع ہے۔

(۲) دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آتی ہے، جس کی سند میں ایک راوی، روح بن صلاح، ہے۔ طبرانی الاوسط ص۱۵۲ ج۱، ومجمع الزوائد ص۲۶۰ ج۹، وحلیۃ الاولیاء ص۱۲۱ ج۳۔

امام طبرانی اور ابونعیم نے صراحت کی ہے کہ، روح بن صلاح، اسے بیان کرنے میں منفرد ہے، علامہ البانی فرماتے ہیں کہ روح کوابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس کہتے ہیں کہ اس سے مناکیر مروی ہیں امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف فی الحدیث ہے ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، ابن عدی نے اس کی دوحدیثیں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی بہت سی احادیث ہیں جن میں سے بعض میں نکارت ہے، گویا محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ ضعیف ہے اس کی یہ حدیث اسکے تفرد کے باعث منکر ہے۔ التوسل انواعه واحکامه، مترجم ص۱۳۳، وسلسلہ احادیث الضعیفہ ص۳۲ ج۱۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی روایت کی ایک سند شیرازی نے، الالقاب، میں بیان کی ہے جس میں ایک راوی احمد بن محمد بن عمرو بن مصعب ہے، کنز العمال (۳۷۶۰۵) ص۳۷۳ ج۱۳۔

اس کے متعلق علامہ ذھبی لکھتے ہیں کہ

امام ابن حبان کا کہنا ہے کہ متن روایت کو گھڑ لیا کرتا تھا اور سند کو الٹ پلٹ دیتا تھا جس کی وجہ سے ترک مستحق قرار پایا، امام دارقطنی کا فیصلہ ہے کہ احادیث کو وضع کرتا تھا، میزان الاعتدال ص ۱۴۹ ج ۱۔

علاوہ ازیں اس کی سند و متن میں کئی اور بھی علتیں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، روایت کے ضعف کے لئے یہی کافی ہے کہ سند میں ایک کذاب راوی ہے، لہذا طول کلام سے اعراض کرتے ہوئے، اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ہاں اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کردیئے گئے تو ان کی تفصیل ہم بحوالہ عرض کر دیں گے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

حاکم نے مستدرک میں حمید ابن عبدالرحمٰن رواسی سے نقل کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ مشک تھا، وصیت فرمائی مجھ کو اس سے خوشبو دینا اور فرمایا کہ یہ حضور علیہ السلام کی خوشبو کا بچا ہوا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۳۸ ج ۱۔

کیا کفن کی خوشبو سے کفنی والفی ثابت ہوتی ہے؟

الجواب۔ اولاً۔ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے حمید بن عبدالرحمٰن رواسی نہیں بلکہ ابی وائل (شقیقؒ بن بجیر کوفی) ہیں،

السنن الکبریٰ للبھیقی ص ۴۰۵ ج ۳، ومستدرک حاکم ص ۳۶۱ ج ۱۔

مفتی صاحب نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کی تالیف، الحرف الحسن فی الکتابۃ علی الکفن، سے اپنی کم علمی کی وجہ سے مغالطہ کھایا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خاں صاحب بریلی نے لکھا تھا کہ حاکم نے مستدرک میں بطریق حمید بن عبدالرحمٰن رواسی روایت کی قال حدثنا الحسن بن صالح عن ھارون بن سعید عن ابی وائل، فتاوی رضویہ ص ۱۳۱ ج ۴۔

ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ خاں صاحب کا مقصود یہ ہے کہ حمید بن عبدالرحمٰن کے طریق سے یہ روایت مروی ہے، پھر بعدہ انہوں نے حمید سے آگے سند بھی لکھ دی، مگر ہمارے مفتی صاحب کو فن حدیث کی ہوا بھی نہ لگی تھی، اس لئے انہوں نے اس تحریر کا یہ مفہوم بیان کر دیا کہ حاکم نے

مستدرک میں حمید بن عبدالرحمٰن رواسی سے نقل کیا، جاء الباطل ص ۳۴۸ ج ۱، ان للہ وانا الیہ راجعون۔

اسے کہتے ہیں، لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

اگر مبتدعین کہہ دیں کہ مفتی صاحب کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ حاکم نے حمید سے روایت لی ہے تو یہ اس سے بھی بڑھکر جہالت ہے کیونکہ امام حاکم نے یہ روایت اپنے استاذ ابو بکر بن اسحاق سے لی ہے، مستدرک حاکم ص ۳۶۱ ج ۱۔

ثانیاً۔ بلاشبہ سنداً یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں، اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی قبر میں آنحضرت ﷺ کے ناخن و بال رکھنے بھی اگر صحیح سند سے ثابت ہوں تو انکو ماننے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کیونکہ یہ چیزیں آثار نبوی کی وجہ سے بابرکت تھیں اور ان سے تبرک حاصل کرنے کے ہم قطعاً منکر نہیں، مگر ان سے کفنی و الفی کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے آثار (بالخصوص جسم اطہر کے ناخن وغیرہ) کوئی تحریر یا کلمہ کی املا نہ تھے جس سے کفنی والفی کی تحریر ثابت کی جائے۔

ثالثاً۔ میت کو غسل دینے کے بعد کفن و میت کو خوشبو لگانا سنت سے ثابت ہے، اور آنحضرت ﷺ کی بچی ہوئی خوشبو کو لگانے کی وصیت سے کوئی زائد چیز ثابت نہیں ہوتی بلکہ مسنون کفن و دفن ہی ثابت ہوتا ہے، جو بدعت کو مستلزم نہیں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

امام ترمذی حکیم ابن علی نوادر الاصول میں روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا

من کتب هذا لدعاء و جعله بین صدر المیت و کفنه فی رقعة لم ینله عذاب القبر ولا یری منکرا و نکیرا.

جو شخص اس دعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر ونکیر کو دیکھے گا۔ وہ دعا یہ ہے

لا اله الا الله والله اکبر لا اله الا الله وحده لاشریک له، لا اله الا الله له الملک وله الحمد، لا اله الا الله ولا حول وقوة الا بالله العلی العظیم. جاء الباطل

ص ۳۳۸ و ۳۳۹.

الجواب

اولاً۔ یہ رسول اللہ ﷺ پر صریحاً افترا ہے، کیونکہ یہ روایت فقط حکیم ترمذی کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے، دیگر کتب حدیث میں اس کا نام و نشان تک موجود نہیں، اور حکیم ترمذی کی تالیف نوادرالاصول، میں فقط متون ہیں، اسناد قطعاً نہیں، راقم الحروف نے متعدد کتب خانوں، سے حکیم ترمذی کی کتاب کو تلاش کیا ہے مگر کہیں بھی اس کا وجود راقم کو نہیں ملا، آخر پریشان ہو کر حضرت مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کو لیٹر لکھا جس کے جواب میں انہوں نے حسب ذیل خط تحریر کیا۔

محترم مولانا داؤد ارشد صاحب

وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

یاد فرمائی کاشکریہ، آئینہ میں ہونے والی فردگزاشت کے سلسلے میں وضاحت پر مزید شکر گزار ہوں۔

نوادرالاصول، ادارہ میں بھی نہیں، اشاعت العلوم، ایک دیوبندی مدرسہ میں اس کا نسخہ ہے مگر اس میں کسی حدیث یا قول کی سند نہیں، غالباً بعد کے کسی ناشر نے اسانید حذف کر دیں ہیں افسوس آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا............

والسلام

دعا جو

ارشاد الحق اثری عفی اللہ عنہ

(۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

اس کے بعد راقم اپنے فاضل بھائی جناب محمد منشاء صاحب کو جب، راولپنڈی، میں کتاب کا مسودہ کمپوزنگ کیلئے دینے گیا، تو ان سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک اھلحدیث عالم جناب محترم دکتور صدیق الحسن حفظ اللہ کی علم حدیث پر بہترین لائبریری ہے ان سے پتہ کر لیتے ہیں، بہرحال ان کی لائبریری میں کتاب، نوادر الاصول مل گئی، مگر ہم نے گہری نظر سے دیکھا، لیکن مذکورہ راویت نہ مل سکی، الغرض یہ کذب و افتراء ہے۔

ثانیاً۔ نوادر الاصول کے مؤلف کی کسی محدث نے توثیق نہیں کی، بلکہ یہ شخص گستاخ مقام نبوت تھا، کیونکہ اس کے نزدیک ولایت نبوت سے بڑھکر تھی، علامہ ذھبی عبدالرحمٰن سلمی سے نقل کرتے ہیں کہ

اخرجوا الحکیم من ترمز، و شھدوا علیہ بالکفر و ذلک بسبب تصنیفہ کتاب ختم الولایۃ، و کتاب علل الشریعۃ، و قالوا انہ یقول، ان للاولیاء خاتم کالانبیاء لھم خاتم و انہ یفضل الولایۃ علی النبوۃ.

یعنی حکیم ترمزی کو ترمز سے نکال دیا گیا تھا اور علماء نے اس کے کفر کی گواہی دی تھی، ختم الولایۃ، اور، علل الشریعۃ، کی تصنیف کی وجہ سے اور علماء نے کہا تھا کہ یہ کہتا ہے کہ جیسے انبیاً کرام کو ختم کرنے والے (محمد مصطفیٰ ﷺ) ہیں اسی طرح اولیاء کو بھی ختم کرنے والا (ایک ولی) ہے اور وہ ولایت کو نبوت پر تفضیل دیتا تھا۔ سیر اعلام النبلاء ۱۳/۴۴۱ (رقم الترجمہ ۲۱۶)

حافظ ابن حجر نے بھی، لسان المیزان ص ۳۰۸ ج ۵، میں اسے نقل کیا ہے بلکہ قاضی کمال الدین نے تاریخ حلب (الملحۃ فی الرد علی ابی طلحۃ) میں لکھا ہے کہ یہ محدثین سے نہ تھا اور بُرے عقائد کی وجہ سے فقہاء کے دائرہ سے نکل کر مستحق طعن ہوگیا، بحوالہ لسان المیزان ۵/۳۰۹۔ شیخ الصوفیاء فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ فرمایا (حکیم ترمذی نے) مجذوب کے بھی کئی مدارج ہیں پہلے درجہ میں تہائی نبوت حاصل ہوتی ہے، دوسرے میں نصف اور تیسرے میں نصف سے کچھ زیادہ اور جب وہ مدارج نبوت طے کرکے تمام مجذوبین پر سبقت لے جاتا ہے تو خاتم الاولیاء ہو جاتا ہے، تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۱ مترجم،

اس سے ثابت ہوا کہ حکیم ترمذی بدترین بدعتی تھا، جس کی جیب میں سو ۱۰۰ مرزا غلام احمد قادیانی تھا، جیسے اس نے اپنے منکرین پر کفر کا فتویٰ لگایا، تذکرہ (یعنی مجموعہ الھامات مرزا) ص ۳۳۶ و ۶۰۷، اسی طرح حکیم ترمذی کہتا ہے کہ زاہدین اور علماء کا منکر قطعاً کافر ہے،

تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۱۔

دیکھئے حکیم ترمذی فتویٰ تکفیر کی آڑ میں عابدین اور مولویوں پر بھی ایمان لانے کو جزو ایمان کہہ رہا ہے، انا اللہ و انا الیہ راجعون۔

الغرض اس کتاب کا مؤلف ہی ایسا بدعتی ہے جس کے عقائد کفریہ ہیں لہذا اس کی بیان کردہ روایت کسی طرح بھی حجت نہیں، جتنی دیر تک اصول حدیث کے مطابق اس کی صحت ثابت نہ کی

جائے، دور حاضر کے محدث عظیم جناب علامہ محمد ناصرالدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے باطل و موضوع قرار دیا ہے۔ سلسلہ ضعیفہ ۱/ ۴۱۷۔

کفنی کے ثبوت پر عقلی دلائل اور ان کا رد

پہلی عقلی دلیل

عقل بھی چاہتی ہے کہ یہ عہد نامہ وغیرہ لکھنا یا قبر میں رکھنا جائز ہو چند وجوہ سے، اولاً۔ تو یہ کہ جب قبر کے اوپر سبز گھاس و پھول کی تسبیح سے میت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو قبر کے اندر جو تسبیح وغیرہ لکھی ہوئی ہو اس سے فائدہ کیوں نہ پہنچے گا۔ جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس کی شرعی دلیل کہ قبر پر گھاس و پھول کی تسبیح سے عذاب قبر میں تخفیف ہوکر میت کو فائدہ پہنچتا ہے؟ تو وہ نادار ر، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، الغرض یہ مفتی صاحب کا شریعت حقہ پر افترا ہے،

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا تسبیح وتحمید پر کفنی والفی کو قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ تسبیح و تقدیس لسانی ذکر ہے جبکہ کفنی والفی تحریر ہے جوکہ انسان کے ہاتھ کا فعل ہے، ظاہر ہے کہ عبادت اور املا ایک نہیں ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص نماز کی ترتیب کو ہاتھ سے لکھتا ہے، تو اس سے اس کی نماز ادا نہ ہوگی اور فریضہ اس کے ذمہ رہے گا، جب آپ نے اس فرق کو سمجھ لیا، تو اب غور کیجئے کہ مفتی صاحب کس کماش کے مفتی تھے کہ پہلے تو بلا دلیل یہ لکھا کہ گھاس و پھول کی تسبیح سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے، پھر اس پر کفنی والفی کو قیاس کرلیا، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

دوسری عقلی دلیل

اس لئے کہ قبر کے باہر سے میت کو تلقین کرنیکا حکم ہے کہ اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچ جائے تاکہ اس امتحان میں کامیاب ہو تو وہ ہی اللہ کا نام لکھا ہوا دیکھ کر بھی مردے کو جواب نکیر یاد آنے کی امید ہے یہ بھی ایک قسم کی تلقین ہے۔

جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قبر کے باہر سے میت کو تلقین کرنے کا حکم کہاں لکھا ہے، اس کا ثبوت درکار ہے جو مبتدعین صبح ازل تک نہیں دے سکتے۔

باقی رہی حدیث،لقنوا موتکم،تو اسکا تفصیل کے ساتھ جواب پہلے عرض کر دیا گیا کہ فرمان نبوی کا منشا مرگ الموت میں مبتلا کو تلقین کرنے کا ہے۔

ثانیاً۔ یہ بھی غلط ہے کہ فقط اللہ تعالیٰ کا نام کان میں پڑنے سے مدفون امتحان میں کامیاب ہوجاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام تو منکر و نکیر بھی لیتے ہیں، جب وہ سوال کرتے ہیں، تیرا رب اور رسول کون ہیں، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا نام فقط کان میں پڑنے سے کامیابی قطعاً نہیں۔

تیسری عقلی دلیل

تیسرے اس لئے کہ اللہ والوں کے نام کی برکت سے مصیبت ٹلتی ہے، جلی ہوئی آگ بجھتی ہے، گھبرایا ہوا دل قرار پاتاہے، رب فرماتا ہے، **الابذکرالله تطمئن القلوب**، اللہ کے ذکر سے دل چین میں آتے ہیں، تفسیر نیشاپوری و روح البیان، سورۃ کہف زیر آیت **مایعلم الاقلیل**، اورتفسیر صاوی شریف میں اسی آیت کے ماتحت ہے کہ اصحاب کہف کے نام اتنے جگہ کام آتے ہیں، (آگے مفتی صاحب نے ان ۱۳ مقامات کی نشان دہی مولوی احمد رضاخاں کی تالیف، الحرف الحسن، کے حوالے سے کی ہے) محدثین کبھی اسناد صحیح نقل کر کے فرمادیتے ہیں، لوقرءت **هذا الاسناد علی مجنون لبرء من جنته**، اگر یہ اسناد کسی دیوانے پر پڑھی جائے تو اس کو آرام ہوجائے، اسناد کیا ہے بزرگان دین راویان حدیث کے نام ہی تو ہیں، اصحاب بدر کے نام کے وظیفے پڑھے جاتے ہیں، تو زندگی میں تو ان بزرگوں کے نام فائدہ مند ہوں، اور بعد موت بیکار ہوں، یہ نہیں ہوسکتا ضرور ان سے فائدہ ہوگا لہذا میت کیلئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جائے۔ جاء الباطل ص ۳۴۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اللہ والوں کے نام کی برکت، اصحاب کہف، سلسلہ اسناد، اور اصحاب بدر کے اسماء کے وظائف کرنے سے حصول برکت کا فقط دعوی ہی دعوی ہے، مفتی صاحب کی یہ تحریر نہ قرآن ہے اور نہ

ہی حدیث ہے جو فی نفسہ دلیل شرعی ہو، کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول کرلیا جائے۔

ثانیاً۔ پوری دنیا کے اگلے پچھلے لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات ہے، اور انکا نام نامی اسم گرامی قبر میں منکر نکیر ہر مدفون شخص پر لیتے ہیں جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر گواہ ہیں،

دیکھئے بخاری ص۱۸۴ ج۱ ومشکوٰۃ ص۲۴۔

مگر اس کے باوجود کافر ومنافق کہتا ہے، **لادری کنت اقول مایقول الناس**، یعنی میں نہیں جانتا میں تو وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے، **بخاری باب ماجاء فی عذاب القبر ص ۱۸۴ ج ۱**،

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بابرکت اور اللہ والے کا نام، مستحق عذاب قبر کو منکر ونکیر سے نہیں بچا سکتا۔

ثالثاً۔ رہی آیت قرآنی، بذکر اللہ، تو اس کا تعلق قبر سے نہیں بلکہ دنیا کی زندگی سے ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہی آگے ارشاد فرمایا

الذین اٰمنوا و عملوا الصلحٰت طوبیٰ لھم و حسن ماٰب. (الرعد ۲۹)

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کیلئے خوشحالی اور عمدہ ٹھکانا ہے (۱۳-۲۹)۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص ایمان لا کر عمل صالحہ کرتا رہا اور دنیا کی زندگی میں اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تسکین حاصل کرتا رہا ہو، اور اسے ذکر الٰہی سے چین ملتا ہو، اس کا اخروی ٹھکانا بہتر ہوگا۔

مگر مفتی صاحب آیت کا تعلق قبر کے پاس ذکر سے جوڑ رہے ہیں، پھر قابل غور بات تو یہ ہے کہ ذکر اور کفنی کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

رابعاً۔ اصول حدیث کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ محدثین کرام کبھی سند صحیح نقل کر کے کہہ دیتے ہیں کہ اگر مجنون پر بھی پڑھا جائے، تو اسے آرام آجائے گا، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، ہاں البتہ خاں صاحب بریلی نے، ابن حجر مکی، سے ایک سند نقل کی ہے کہ

عن علی الرضاء حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیه جعفر الصادق عن ابیه محمد الباقر عن ابیه زین العابدین عن ابیه الحسین عن ابیه علی الخ.

پھر فرماتے ہیں کہ اس سند کے متعلق امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ یہ مبارک سند اگر مجنون

پر پڑھو تو ضرور اسے جنون سے شفا ہو،

فتاوی رضویہ ص ۱۳۷ ج ۴۔

دیکھئے مولوی احمد رضا خاں تو خاص امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب کرتا ہے مگر مفتی صاحب علی الاطلاق محدثین کی طرف نسبت کرتے ہیں۔

ثم اقول

اس کی امام احمد بن حنبل کی طرف نسبت بھی درست نہیں، کیونکہ یہ کسی معتبر سند سے ان سے ثابت ہی نہیں، علاوہ ازیں یہ سند بھی کوئی اس درجہ کی نہیں جس کے متعلق اتنا بڑا دعوی تسلیم کر لیا جائے، یہ محض اشتہاری حکیموں کی طرح خانہ ساز فوائد ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ ذرا بھی تعلق نہیں، اگر علماء بریلویہ ان فوائد پر بضد ہیں تو اس کا آج بھی تجربہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی دیوانے پر اسے پڑھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ انشاء اللہ قطعاً بیماری سے شفا یاب نہ ہوگا، آخر کیا وجہ ہے کہ علماء بریلویہ کے ہاتھ اتنا اکسیر بہدف نسخہ شفا موجود ہے، لیکن ملک میں پھر بھی دیوانے موجود ہیں بلکہ حکومت لاکھوں روپے خرچ کر کے قوم کی فلاح و بہبود کیلئے اس بیماری پر خرچ کر رہی ہے علماء بریلویہ کو دعوت فکر ہے کہ وہ اس رضاخانی نسخہ کو استعمال کر کے میڈل حاصل کریں اور ہزاروں والدین سے ڈھیروں دعائیں وصول کریں، اسکے ساتھ ساتھ آپ کو تردید وہابیت کا بھی ایک عمدہ اور موثر ذریعہ تبلیغ مل جائے گا۔

آخر آپ حضرات خاموش کیوں ہیں، کچھ تو ہے جس کی پردہ دری ہے۔

رابعاً۔ اصحاب بدر رضی اللہ عنھم کے مقدس اسماء کے وظیفہ کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، مبتدعین پر لازم ہے کہ وہ ثابت کریں کہ اصحاب بدر کے ناموں کا وظیفہ کرنا، قرآن وسنت میں پایا جاتا ہے، مگر یاد رہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوکر مشرق میں غروب تو ہوسکتا ہے، لیکن اس کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا، یہ سب باتیں خانہ ساز اور مبتدعین کی عیاریاں ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ سے جس قدر وظائف مروی ہیں وہ تمام کے تمام اللہ کی حمد و تعریف، تقدیس و کبریائی وغیرہ پر مبنی ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ وظیفہ شرعی دراصل اللہ تعالی کی لسانی عبادت ہے، اور بندوں میں سے کسی کا وظیفہ کرنا حقیقت میں ان کی عبادت کرنا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ اصحاب بدر کے ناموں کا وظیفہ کرنا بدترین بدعت ہے۔

باب نماز کے بعد بلند آواز سے دورد شریف پڑھنے کی بحث

کیا بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے؟

اصل بحث کی طرف جانے سے پہلے چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں تاکہ فریقین کے موقف کو سمجھنے میں آسانی رہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک جہاں رسول اللہ ﷺ سے ذکر بلند آواز سے ثابت ہے وہاں اونچی آواز سے ذکر کرنا مسنون ہے اور جہاں آہستہ یا خفی ثابت ہے وہاں اس مسنون طریقہ کو ہی ملحوظ رکھنا عین تعلیم اسلامی کا تقاضا اور راہ ھدایت ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

قلت ماذهب إليه بعض السلف و ابن حزم من المتأخرين من استحباب رفع الصوت بالتكبير و الذكر أثر كل صلاة مكتوبة هو القول الراجع عندى وإن لم يقل به الائمة الأربعة و مقلدوهم لأن حديث ابن عباس باللفظين نص فى ذلك، ويدل على ذلك ايضاً حديث عبدالله بن الزبير الأتى، والحق يدورمع الدليل لامع الادعاء أوالرجال، نعم لايبالغ فى رفع الصوت، ولا يجهر جهرا مفرطا لقوله ﷺ اربعوا على أنفسكم فانكم لاتدعون أصم ولا غائبا، الحديث، ولا دليل لمن حمل حديث ابن عباس على أن الجهر كان أحيانا أووقتا يسيراً لأجل تعليم المأمومين صفة الذكر والتكبير .... ولا يثبت شئى بالادعا والتحكم، والراوى وهوابن عباس لم يقيد رفع الصوت بوقت دون وقت، بل اطلقه و عممه، وفيه ايضاً لفظة، كان، وهى تشعر بالمواظبة، فدل ذلك على أن اكثر عمل النبى ﷺ و اصحابه قدكان على رفع الصوت بالتكبير، فالحق ان رفع الصوت بذلك اثر كل صلاة مكتوبة حسن كما صرح به ابن حزم فى المحلى.

یعنی میرے نزدیک راجح بات وہ ہے جس کی طرف بعض سلف اور متاخرین میں سے امام ابن

حزم گئے ہیں کہ ہر فرض نماز کے بعد تکبیر کے ذکر کو بلند آواز سے کرنا مستحب ہے، اگرچہ ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین یہ بات نہیں کہتے، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت دونوں لفظوں سے (بلند پڑھنے) پر نص ہے۔

اور اس پر دلالت کرتی ہے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آتی ہے اورحق دلائل کے ساتھ گھومتا ہے نا کہ دعوؤں اور شخصیتوں کے ساتھ، ہاں (یہ ملحوظ رہے کہ) بلند آواز مبالغہ سے نہ ہو اور جہر مفرط نہ ہو، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے، اپنی جانوں پر نرمی کرو کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں بلا رہے، الحدیث، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو احیاناً اور مقتدیوں کی تعلیم پر محمول کرنے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ کوئی چیز محض دعوی اور تحکم سے ثابت نہیں ہوتی، اور اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ انہوں نے اسے عموم پر رکھا، اور اس میں لفظ، کان، بھی آیا ہے اور یہ مواظبت (ہیشگی) پر دلالت کرتا ہے، کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا اکثر و پیشتر عمل (نماز کے بعد) تکبیر کو بلند آواز سے کہنے کا تھا، اس لئے خالص حق بات یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنا اچھا عمل ہے جیسا کہ ابن حزم نے محلی میں صراحت کی ہے۔

مرعاۃ المفاتح شرح المشکوٰۃ ص۳۱۵ تا ۳۱۶ ج ۳۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیفؒ فرماتے ہیں کہ

والحق مع ابن حزم قال الفنجابی ثبت الجهر فی مواضع کثیرة فیجهر فیما یجهر ﷺ و یسر فیما اسرو یخیر فیما لم ینقل عنه ﷺ الجهروالسر والا فضل فیه السرنعم لایجوز الجهر المفرط لماورد انکم لاتدعون اصم، الحدیث والله اعلم.

اورحق امام ابن حزم کے ساتھ ہے، امام ابوعبدالرحمٰنؒ پنجابی التوفی ۱۳۱۵ھ شارح سنن نسائی نے کہا ہے کہ کثیر مقامات پر نبی ﷺ سے بلند آواز سے ذکر ثابت ہے، لہذا جن مقامات پر آپ سے ذکر جہری ثابت ہے وہاں جہری کیا جائے اور جہاں سری (آہستہ) ثابت ہے وہاں سری کیا

جائے اور جہاں جہری و سری ثابت نہیں وہاں انسان کو اختیار ہے خواہ جہری کرے یا سری کرے، اور افضل سری ہے، ہاں افراط سے جہر جائز نہیں، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث مروی ہے کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے۔ التعلیقات السّلفیہ علی النسائی ص ۱۵۶ ج ۱۔

حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب محدث قنوجی، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

وفيه دليل لما قاله بعض السلف انه يستحب رفع الصوت بالتكبير والذكر عقب المكتوبة و ممن استحبه من المتاخرين ابن حزم الظاهري رضي الله عنه و نقل ابن بطال وآخرون ان اصحاب المذاهب المتبوعة و غيرهم متفقون على عدم استحباب رفع الصوت بالتكبير والذكر وحمله الشافعي على انه جهر وقتاً يسيرا حتى يعلمهم صفة الذكر لاانهم جهروا دائما قال فاختار للامام والماموم ان يخفيان ذلک و هذا الحديث الصحيح يرد عليهم اجمعين ردا واضحاً ولاملجى الى التاويل و صرف الظاهر الحقيقي الى المعنى المجازي، والله اعلم.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے جسے بعض سلف نے کہا ہے کہ فرض نماز کے عقب میں بلند آواز سے تکبیر اور ذکر کرنا مستحب ہے اور متاخرین میں سے جنہوں نے اسے مستحب کہا ہے امام ابن حزم رضی اللہ عنہ ہیں اور ابن بطال اور دوسروں نے اصحاب مذاہب متبوع وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بلند آواز سے ذکر و تکبیر کے عدم استحباب پر متفق ہیں، امام شافعیؒ نے جہر کو تھوڑے وقت پر محمول کیا ہے یہاں تک انہیں ذکر کی صفت کا علم ہوجائے، نہ کہ جہری ہمیشہ تھا، مزید فرماتے ہیں کہ امام اور مقتدیوں کیلئے مختار یہ ہے کہ (نماز کے بعد ذکر) مخفی کریں، (نواب صاحب فرماتے ہیں) اور یہ حدیث صحیح ان تمام کا واضح رد کرتی ہے، لہذا تاویل کی ضرورت نہیں اور حقیقی معنیٰ کو معنی مجازی کی طرف پلٹنا درست نہیں،

السراج الوھاج ص ۲۱۲ ج ۱۔

خلاصہ ان عبارات علمائے اہل حدیث کا یہ ہے کہ جن مقامات پر جہر سے ذکر ثابت ہے وہاں ذکر جہری ہی کرنا عین سنت کا تقاضا ہے اور جہاں آنحضرت ﷺ نے اخفا سے ذکر و اذکار فرمایا ہے،

وہاں اخفا ہی مناسب اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ومقصود اور راہ ھدایت اور تقاضا اتباع رسول ہے، مثلاً۔ نماز میں التحیات کا سری پڑھنا سنت متواترہ ہے تو اخفا ہی درست ہے، اور جن نمازوں میں قرات کو جہری پڑھنا ثابت ہے اور امام ومقتدی کا آمین جہر سے کہنا سنت سے ثابت ہے وہاں جہر ہی کرنا چاہئے۔

نماز کے بعد آنحضرت ﷺ سے تکبیر و ذکر بلند آواز سے (غیر مفرط جہر) ہی کرنا سنت نبوی کی پیروی ہے، یہاں تک مبتدعین اصولی طور پر ہمارے ساتھ متفق ہیں، اس لئے اس بات کی ضرورت تو نہیں کہ سری و جہری ذکر و اذکار کے دلائل نقل کیئے جائیں۔

لیکن ہم اپنے موحد قارئین کرام کی تسلی وتشفی اور بات کو مدلل کرنے کی غرض سے ان کے دلائل نقل کر دیتے ہیں، واللہ یھدی من یشاء۔

سری اور جہری ذکر کی دلیل

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں

قال رسول الله ﷺ یقول الله انا عند ظن عبدی بی وانا معه اذا ذکر نی فان ذکر نی فی نفسه ذکرته فی نفسی و ان ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منهم وان تقرب الی بشبر تقربت الیه ذراعا وان تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا و من اتانی یمشی اتیته هرولة.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کہتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں (جو اس کو میرے ساتھ گمان ہے) جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوں اپنے علم وفضل سے، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں، اور اگر ایک ہاتھ نزدیک ہو تو میں ایک بام (دو ہاتھ کے برابر) نزدیک ہوتا ہوں اور اگر میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں دوڑتا ہوا اس کی طرف جاتا ہوں۔

بخاری ص ۱۱۰۱ ج ۲، ومسلم ص ۳۴۳ ج ۲، وترمذی مع تحفہ ص ۲۹۰ ج ۴۔

یہ حدیث ذکر سری و جہری دونوں کی دلیل ہے۔

چنانچہ مولانا عبیداللہ رحمانی محدث مبارک پوری مشکوٰۃ کی شرح میں اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

(في نفسه) أی سرا و خفية وهو يحتمل أن يكون ذكراً قلبياً اولسانيا اخفائيا ای ذكرا شفاهيا، علی جهة السردون الجهر، قال الشوكانی، ويدل علی هذا الاحتمال الثانی قوله وان ذكر نی فی ملأ ذكر ته فی ملأ خيرمنه فانه يدل علی أن العبد قدجهر بذكره سبحانه و تعالی بين ذلك الملأ الذی هو فيهم فيقابله الاسرار بالذكر باللسان لامجرد الذكر القلبی فانه لايقابل الذكر الجهری بل يقابل مطلق الذكر اللسانی أعم من يكون سراً اوجهراً.

(اپنے دل میں) یعنی سری دمخفی یعنی احتمال رکھتی ہے، یہ حدیث قلبی یا زبان سے مخفی کا، یعنی ذکر قولی پوشیدہ کی جہت سے، آواز کے بغیر۔

امام شوکانی فرماتے ہیں احتمال ثانی (جہر) پر دلالت کرتے ہیں آپ علیہ السلام کے یہ الفاظ کہ اگر (مومن) مجلس میں ذکر کرے تو میں اسے اس سے بہتر مجلس میں ذکر کرتا ہوں، تو یہ دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بندے نے جہری کیا ہے اپنی محفل کے درمیان جن میں وہ (بیٹھا ہوا) تھا تو یہ سری کے مقابل واقع ہوا زبان کے ساتھ ذکر کرنا نہ کہ فقط ذکر قلبی کیونکہ ذکر قلبی جہری کے مقابل نہیں آتا، بلکہ مطلق زبان کے ذکر کے بالمقابل آتا ہے خواہ وہ سری ہو یا جہری۔

مرعاۃ المفاتیح ص۳۸۴ ج۷، باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ۔

الغرض اس حدیث سے ذکر سری و جہری دونوں ثابت ہوتے ہیں اب شریعت میں جہاں ذکر سری مروی ہے وہاں سری کیا جائیگا۔ اور جہاں جہری مروی ہے وہاں جہری کیا جائے گا۔ اور جہاں شریعت میں کوئی صراحت نہیں تو وہاں مومن اجتہاد سے کام لیکر جونسا طریقہ وقت کے مناسب ہو، اسے لائحہ عمل بنا کر ذکر کرے اس طریقہ عمل سے کافی حد تک اختلافات کی خلیج کم ہوگی اور امت میں اتحاد و اتفاق کا پہلو غالب رہے گا اور عوام میں نفرت وتعصب کی بجائے پیار و محبت پیدا ہوگا۔

العود الی المقصود۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ حضرت مفتی صاحب نے ذکر بالجہر کا مسئلہ چھیڑ کر اپنا اصل مدعا ہی چھوڑ دیا ہے، کیونکہ مفتی صاحب ثابت تو یہ کرنا چاہتے تھے کہ نماز فجر اور عشاء کے بعد بلند آواز سے دورد شریف پڑھنا چاہیئے، مگر انہوں نے بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کی بجائے مطلق ذکر بالجہر کی بحث کو لکھنا شروع کردیا چنانچہ فرماتے ہیں

پنجاب وغیرہ میں قاعدہ ہے کہ بعد نماز فجر و عشا بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں، مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلوں سے اس کو روکنا چاہتے ہیں، ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے اصول حنفیہ کیخلاف ہے، اس سے نمازی لوگ نماز میں بھول جاتے ہیں، لہذا یہ حرام ہے۔

جاء الباطل ص ۳۴۴ ج ا۔

اس کے بعد انہوں نے ذکر بالجہر کے دلائل دینے شروع کردیئے ہیں، جو ص ۳۵۰ تک پھیلے ہوئے ہیں (جن میں سے دو آیات قرآنیہ اور متعدد احادیث ہیں جن میں سے بعض صحیح اور بعض ضعیف اور بعض میں الفاظ کی زیادتی ہے، تفصیل آگے آرہی ہے)

حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے نماز کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کے دلائل نقل کرتے، بعد میں ان پر اعتراضات نقل کرکے تسلی بخش جوابات دیتے، لیکن چونکہ نماز کے بعد درود شریف پڑھنے کا ذکر شریعت سے ثابت نہ تھا، لہذا مفتی صاحب اصل بحث کی بجائے ذکر بالجہر کی بحث درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں اس کھینچا تانی سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اصل بحث پردہ حجاب میں رہے اور عوام یہ باور کرلیں کہ نماز کے بعد بلند آواز سے درود شریف کا وظیفہ ثابت ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حالانکہ اصولی طور پر ذکر بالجہر کی بحث اعتراضات کے ضمن میں لاتے کہ اس کے ناجائز ہونے پر مخالفین ایک دلیل عدم بالجہر کی بھی دیتے ہیں، چونکہ اس طرح اصولی بحث ہونی تھی اور مفتی صاحب کا بھانڈا پھوٹ جاتا تھا، کہ نماز کے بعد درود شریف کے بلند آواز سے پڑھنے کا وظیفہ قرآن و سنت سے ثابت ہی نہیں۔

جب کہ مفتی صاحب اپنی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے، اس لئے انہوں نے اصل موضوع پر لکھنے کی بجائے ایک فرضی اعتراض پر عمارت قائم کر لی تاکہ مریدین میں واہ واہ ہوجائے کہ مفتی صاحب تیس مار خاں ہیں۔

نماز کے بعد مسنون وظائف

(۱) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

کنت اعرف انقضاء صلوۃ النبی ﷺ بالتکبیر.

یعنی میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا تمام ہونا تکبیر کہنے کے ساتھ پہچان لیتا تھا ۔ بخاری ص۱۱۶ ج۱، ومسلم ص۲۱۷ ج۱ واللفظ لہ۔

یعنی میں آنحضرت ﷺ کی نماز کے اختتام کو، اللہ اکبر، کہنے کی آواز سے معلوم کر لیتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ کلمہ بلند آواز سے کہا جائے تب ہی علم ہوسکتا ہے، اور دوسری روایت میں اس کی صراحت بھی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علی عھدالنبی ﷺ.

یعنی بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا جب فرض نماز سے فارغ ہوں، نبی ﷺ کے زمانہ میں معمول تھا، بخاری ص۱۱۶ ج۱، ومسلم ص۲۱۷ ج۱۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی امام اور مقتدیوں کو بلند آواز سے، اللہ اکبر، کہنا چاہئے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے فارغ ہوکر درود شریف کی بجائے، اللہ اکبر، کہنا مسنون طریقہ ہے، اور جو چیز سنت کو مٹاتی ہو اسکے بدعت سیئہ ہونے کا علمائے بریلویہ کو بھی اعتراف ہے۔

چنانچہ مجدد ملت بریلویہ مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ

بدعت سیئہ وہ ہے کہ رد سنت کرے، احکام شریعت ص۱۹۰۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی لکھتا ہے

رسول اللہ ﷺ نے جن امور کو منضبط کر دیا ہے ان میں سے کسی قسم کی زیادتی اور سابقہ ولاحقہ کا اضافہ کرنا ناجائز اور بدعت ہے۔ شرح صحیح مسلم ص۵۶۲ ج ۲۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے محبوب طریقہ وعمل سے نماز سے فارغ ہوکر بلند آواز سے، اللہ اکبر، تو کہا ہے، مگر بلند آواز سے درود کا ورد نہیں کیا، اور درود کا بلند آواز سے نماز کے بعد پڑھنا چونکہ آپ علیہ السلام کے منضبط کئے ہوئے طریقہ پر زیادتی ہے لہذا اصول بریلویہ کے مطابق یہ بدعت سئیہ ہے۔

علاوہ ازیں نماز کے بعد دیگر کئی وظائف آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں مگر کسی ایک میں درود کا وظیفہ ثابت نہیں، اگر کوئی اس کا ثبوت دے دے تو ہم اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہیں، ان شاء الرحمٰن۔

مگر یاد رہے کہ یہ کسی معتبر دلیل سے ہو، چونکہ چنانچہ کی ہیرا پھیریاں اور مکاریاں نہ ہوں، صریحاً دلیل درکار ہے کہ آنحضرت ﷺ فجر اور عشا کی نماز سے فارغ ہوکر بلند آواز سے درود شریف پڑھا کرتے تھے، یقین جانیئے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، تجربہ کردیکھئے قیامت تک مہلت ہے۔

کیا اہل حدیث درود کے منکر ہیں؟

اہلحدیث کے نزدیک درود کا منکر کافر و بے ایمان اور پکا خبیث بلکہ پرلے درجہ کا لعنتی ہے، ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ کا نام نامی اسم گرامی سن کر درود پڑھنا واجب ہے، اور اس کا وظیفہ کرنا بھی درست ہے، لیکن جہاں اور جس مقام پر آنحضرت ﷺ نے دردو کی بجائے کوئی اور کلمات پڑھے ہیں، ان مقامات پر انہیں کلمات کو پڑھنا ہی راہ ھدایت اور مسنون طریقہ اور سنت خیرالانام کی پیروی کا تقاضا ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص نماز میں رکوع وسجود میں تسبیحات کی بجائے درود پڑھے، یا نماز میں قراۃ قرآن کی بجائے درود پڑھے، تو بالاتفاق ایسے شخص کی نماز نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مسنون طریقہ کو ترک کرکے ازخود عبادت میں کیفیت اور ہیئت متعین کی ہے جو تعامل مصطفوی کے خلاف ہونیکی وجہ سے مردود وباطل ہے، اسی طرح ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نماز کے بعد اللہ تعالی کے

محبوب و پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے درود کی بجائے، اللہ اکبر، کو بلند آواز سے پڑھا ہے، لہذا اسے ہی پڑھنا درست اور حق ہے اور درود کو پڑھنا چونکہ سنت کو مٹاتا ہے لہذا بریلویت کے اصول سے یہ بدعت سیئہ ہے۔

حضرت امام نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو چھینک آئی تو اس نے کہا، الحمدالله و السلام علی رسول الله، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی (عام حالات میں) کہتا ہوں،

الحمد لله والسلام علیٰ رسول الله، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں چھینک کا جواب اس طرح نہیں سکھایا بلکہ انہوں نے، الحمدلله علیٰ کل حال، کہنے کی تعلیم دی ہے ترمذی مع تحفۃ ص۲ج۴۔

اس حدیث کا یہ قطعاً معنی نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ درود کے منکر یا بغض نبوی کی وجہ سے درود سے منع کر رہے تھے (جیسا کہ اہل بدعت اہل حق پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ درود کے منکر ہیں) بلکہ ان کا مقصود یہ تھا کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کی دی ہوئی تعلیم پر اضافہ ہے جس کی وجہ سے ناجائز ہے، چنانچہ بریلویت کے شیخ الحدیث مولوی غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں

اس شخص نے جو چھینک کے بعد، الحمدللہ والسلام علیٰ رسول اللہ، کہا تھا تو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ بات تھی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بغض کی بنا پر اس کو چھینک کے بعد درود شریف پڑھنے سے منع کر رہے تھے، ان کا مطلب صرف اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عبادات جس طرح مشروع اور مقرر فرمائی ہیں ان کو اسی طرح ترمیم اور اضافہ کے بغیر ادا کرنا اتباع رسول اور جماعت صحابہ کے ساتھ وابستگی ہے اور اپنی رائے سے ان میں کسی سابقہ اور لاحقہ کا اضافہ کرنا بہر حال لائق ستائش نہیں ہے۔ شرح صحیح مسلم ص۱۰۹۵ ج۱۔

اور یہی کچھ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ نماز کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے جس طریقہ سے ذکر فرمایا ہے اس میں کسی ترمیم و اضافہ کے بغیر بلند آواز سے اللہ اکبر اور دیگر مشروع وظائف

کیئے جائیں، اور درود کی رسم کو ختم کیا جائے، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اہل بدعت ان جیسے مسائل میں افہام وتفہیم کی بجائے نہایت بودے اور جزباتی انداز میں عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل حدیث درود کے منکر ہیں حالانکہ یہ اہل بدعت کا صریحاً جھوٹ اور ایک مسلمان بھائی پر افترا ہے جس کا حقیقت سے ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

اللہ ھدایت اور سمجھ کی توفیق عنایت فرمائے۔

اس کے برعکس حنفیہ کے آقا ومقتدا امام ابو حنیفہ کی مجلس میں رسول کریم ﷺ پر درود نہیں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب السنۃ ص۲۱۴ ج۱ لابن امام احمد بن حنبلؒ۔

اسی طرح درمیانی تشہد میں اگر اللھم صل علی محمد ﷺ پڑھ لیا جائے تو ان کے نزدیک سجدہ سہو واجب ہے، بہار شریعت ص۵۰ حصہ چہارم و فتاویٰ رضویہ ص۶۳۶ ج۳، وحلبی کبیر ص۴۶۰ و البحر الرائق ص۹۷ ج۲ و فتح القدیر ص۴۳۸ ج۱، و فتاویٰ عالم گیری ص۱۲۷ ج۱، و فتاویٰ قاضی خاں ص۱۲۱ ج۱، و حاشیہ امداد الفتاویٰ ص۳۵۳ ج۱، و احسن الفتاویٰ ص۳۰ ج۴، وغیرہ کتب فقہ و فتاویٰ میں بریلوی و دیوبندی علماء نے اس کے مفتی بہ ہونے کا فتویٰ دے رکھا ہے، حالانکہ درمیانی تشھد میں درود پڑھنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، نسائی ص۲۰۲ ج۱، و ابوعوانہ ص۳۲۴ ج۲، معلوم ہوا کہ درود کے منکر حنفی ہیں،

مفتی صاحب کے دلائل میں سقم کی صراحت

مقام کی مناسبت سے ہم یہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ، ذکر بالجہر، پر مفتی صاحب نے جن دلائل کو ذکر کیا ہے، ان میں مفتی صاحب کی فاش غلطیوں کو واضح کر دیا جائے تاکہ کہیں علماء بریلویہ یہ نہ کہہ دیں کہ حضرت کی لاجواب علمی تحریر سے متاثر ہوکر، مؤلف، دین الحق، نے ذکر بالجہر جواز کا موقف اپنایا ہے بلکہ ہمارا یہ موقف قرآن وسنت کی روشنی میں بفضلہٖ تعالیٰ پہلے سے ہی تھا، مفتی صاحب کے بودے اور بے مغز استدلال کی ہمیں چنداں ضرورت بھی نہیں۔

بہرحال ہم یہاں مفتی صاحب کے تسامحات کو، الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے تحت درج کر رہے ہیں تاکہ مبتدئین کو بھی صحیح و درست بات تسلیم کرنے کی رب تعالیٰ

عادت صالحہ ڈال دے۔

الفاظ حدیث میں اضافہ

حضرت مفتی صاحب نے، مشکوٰۃ کے باب الذکر بعد الصلوٰۃ، سے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ

اذا سلم من صلوة یقول بصوته الا علیٰ لا اله الا الله وحده لاشریک له.

جب اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے فرماتے تھے، لا اله الا الله وحده لا شریک له. جاء الباطل ص۳۴۵ ج۱۔

الجواب۔ اولاً۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ سے یہ روایت قطعاً مروی نہیں صاحب مشکوٰۃ یا کسی ناسخ و کاتب کا ذھول ہے، کیونکہ یہ روایت انہوں نے صحیح مسلم سے نقل کی ہے اور مسلم شریف میں، بصوته الاعلی، (بلند آواز سے) کے الفاظ نہیں ہیں، مسلم ص۱۱۸ ج۱۔

محدث عبید اللہ مبارک پوری فرماتے ہیں

حدیث عبدالله بن الزبیر هذا اخرجه مسلم من طرق ولکن لیس فی طریق منها قوله، بصوته الاعلیٰ.

یعنی اس حدیث عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو امام مسلم نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے مگر کسی طریق میں، بصوته الاعلی، کے الفاظ مروی نہیں جو (صاحب مشکوٰۃ نے) نقل کیئے ہیں، مرعاۃ المفاتیح ص۳۱۸ ج۳۔

انہوں نے مزید صراحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ روایت مسند احمد ص۴، ۵، ج۴، وسنن ابو داوٗد ص(۱۵۰۲)، اور نسائی (۱۳۴۰)، وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے مگر اس میں بصوته الاعلی، کے الفاظ نہیں ہیں، ایضاً۔

معنی حدیث کی غلط تاویل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جامع الصغیر میں ہے

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اکثروا فی الجنازۃ قول لا الہ الا اللہ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جنازہ میں لاالہ الا اللہ زیادہ کہا کرو۔

مفتی صاحب اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

اس سے معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا یا کوئی اور ذکر کرنا ہر طرح جائز ہے، بلند آواز سے ہو یا خفیہ۔ جاء الباطل ص۳۴۶ ج۱۔

الجواب۔اولاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت مجروح ہے، حاشیہ دیلمی ص۱۰۳ ج۱، (مزید تفصیل آگے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ پڑھنے کی بحث میں آرہی ہے)۔

ثانیاً۔ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے، فی الجنازہ، کے معنی، جنازہ کیساتھ، کس اصول و ضابطہ اور لغت کی رو سے کیا ہے، ورنہ اس کا صحیح معنی تو یہ ہے کہ، جنازہ میں، مگر علماء بریلویہ جب بدعات کو ثابت کرنے پہ آتے ہیں تو تمام اصول وقواعد کو بھول جاتے ہیں اور تقویٰ وخشیت الہی کا ذرا بھی پاس ولحاظ نہیں کرتے مزید افسوس یہ کہ دین کے واحد ٹھیکے دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی انہیں اس طرح کی ہیرا پھیریاں کرتے ہوئے ذرا بھر حیا نہیں آتا۔

مفتی صاحب کی علل الحدیث سے کم آگاہی

فرماتے ہیں کہ تفسیر خازن و روح البیان پارہ ۶ میں زیر آیت و اٰتینا داوٗد زبوراً، ایک روایت نقل کی کہ حضور علیہ السلام نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آج رات ہم نے تمہاری قرات قرآن سنی تم کو داوٗدی آواز دی گئی ہے،

ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں

فقلت اما واللہ لو علمت انک تسمع لحبرتہ حبیرا التحبیر حسن الصوت.

میں نے عرض کیا کہ رب کی قسم اگر مجھے خبر ہوتی کہ میرا قرآن صاحب قرآن سن رہے

ہیں ﷺ تو میں اور بھی آواز بنا کر پڑھتا۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ اولاً، یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ باہر آواز آتی تھی، دوسرے یہ کہ ذکر اللہ تلاوت قرآن عبادت الٰہی ہے اور عین عبادت میں حضور علیہ السلام کو خوش کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی تمنا تھی۔ جاء الباطل ص ۳۴۶ ج ۱۔

تبصرہ

اولاً۔ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب نے یہاں خازن و روح البیان کا حوالہ کس مقصد کیلئے نقل کیا ہے، حالانکہ یہ روایت مختصر طور پر، بخاری ص ۷۵۵ ج ۲، اور مسلم ص ۲۶۸ ج ۱، میں موجود تھی، اور حدیث کے آخری الفاظ،

بیھقی ص ۱۲ ج ۳، ص ۲۳۶ ج ۱۰، و مسند ابویعلی ص ۱۴۰ ج ۶، و طبرانی (مجمع الزوائد ص ۳۶۳ ج ۹) میں مروی ہیں، لیکن مفتی صاحب کی جہالت کہئے یا مطالعہ کی کمی سے تعبیر کریں کہ (کتب حدیث کی بجائے،) معروف حدیث کیلئے تفاسیر کا حوالہ نقل کررہے ہیں، یہ ہیں علم نبوی کے ٹھیکیدار اور فقاہت کے علمبردار،

ثانیاً۔ الفاظ نقل کرنے میں بھی نہایت غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں

فقال لو علمت لحبرته لک تحبیرا.

البتہ طبرانی کی روایت میں، لوعلمت، کے بعد، بمکانک، کے الفاظ زائد ہیں اور ابن سعد کی روایت میں، لک، کی بجائے، لھن، کے الفاظ آتے ہیں،

بحوالہ فتح الباری ص ۷۶ ج ۹۔

لیکن جو الفاظ مفتی صاحب نے درج کیئے ہیں، ان الفاظ کا مجموعہ کسی حدیث کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

معنی حدیث میں تحریف

فرماتے ہیں، مشکوۃ کتاب الصلوۃ باب صلوۃ اللیل، میں روایت ہے کہ ایک شب حضور علیہ

السلام اپنے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا امتحان لینے کیلئے تشریف لے گئے کہ ان کے رات کے مشاغل کو ملاحظہ فرماویں۔ (اس کے بعد مفتی صاحب نے پوری حدیث نقل کی ہے) جاء الباطل ص۳۴۶ج۱۔

تبصرہ

اولاً۔ ان الفاظ سے ایسی کوئی روایت مشکوٰۃ کے مذکورہ باب میں نہیں، بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ ہیں

ان رسول الله ﷺ خرج ليلة فاذا هو بابی بکر يصلی، الحديث.

یعنی رسول اللہ ﷺ ایک رات کو باہر نکلے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے، مشکوٰۃ ص۱۰۷، و ابو داوٗد ص۵۰۹ج۱۔

لیکن مفتی صاحب کو تحریر میں جھوٹ لکھنے کا ایسا چسکا پڑا ہوا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر غلط بیانیاں کرتے تھے ہم عربی کے طلبہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ میں کن الفاظ کا یہ معنی ہے کہ آپ علیہ السلام امتحان کی غرض سے باہر نکلے تھے، بلکہ حدیث کے الفاظ اس بات کو رد کرتے ہیں، کیونکہ، فاذا ھو بابی بکر، کے الفاظ کا یہ مفاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس قصداً نہیں بلکہ اچانک و اتفاقی طور پر گزرے، چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دھلوی حنفی ان الفاظ کا معنی بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

پس ناگاه که وے و ملا بس و ملاقے ست بابوبکر که نماز میگزارد. اشعة اللمعات ص ۵۵۰ ج ۱ .

مگر حضرت حکیم الامت اور مفسر قرآن علم حدیث سے اس قدر بے خبر اور جاہل تھا کہ متن روایت کے بالکل خلاف معنی کر دیا۔

اس سلسلہ میں مزید چیزیں بھی قابل گرفت ہیں مگر ہم نے، اختصار کی وجہ سے عمداً ترک کر دی ہیں، کہ کتاب پہلے ہی ہمارے اندازے سے زیادہ ضخیم ہوتی جارہی ہے۔

باب انسان کے ہاتھ پاؤں چومنے کی شرعی حیثیت

جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو نبیٰ بنا کر مبعوث فرمایا، تو انہیں ھدایت کامل دیکر بھیجا جس میں بنی آدم کو آداب وتعظیم کا طریقہ بھی بتایا گیا، آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں متبرک مقامات کے علاوہ صاحب فضل وکمال لوگ بھی موجود تھے، ان کی تعظیم کی بھی آپ نے اپنے اسوہ حسنہ سے تلقین فرمائی، مگر کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بیت اللہ کا بوسہ لیا ہو یا مقام ابراھیم کو چوما ہو یا قرآن مجید کے مقدس اوراق کو آنکھوں پر لگایا ہو، یا کسی صاحب عظمت اور باوقار شخصیت کی قدم بوسی کی ہو۔

ہم ارباب عقل وخرد اور اہل علم کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پورے ذخیرہ احادیث میں کسی چیز کا تعظیم کی غرض سے بوسہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، ہاں البتہ حجر اسود کا بوسہ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، مگر یہ بھی کوئی واجب وفرض نہیں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر عمداً حجر اسود کا بوسہ نہیں لیتا تو اس کے حج میں ذرا برابر بھی فرق نہیں پڑھتا۔

لیکن حجر اسود کے بوسہ سے کسی دوسری باعظمت چیز کا بوسہ ثابت کرنا درست نہیں، کیونکہ جیسے کعبہ کا طواف کعبہ سے ہی خاص ہے، اسی طرح حجر اسود کا بوسہ بھی اسی سے ہی خاص ہے، بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو ایک بار حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے صاف الفاظ میں یہ بات کہی تھی

انی لا اعلم انک حجر لاتضر ولا تنفع ولولاانی رایت النبی ﷺ یقبلک ماقبلتک.

یعنی مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، جو کسی کو نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا، اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے کبھی بھی نہ چومتا، صحیح بخاری ص ۲۱۷ ج ۱، و صحیح مسلم ص ۴۱۳ ج ۱۔

حافظ ابن حجر اس اثر کی شرح کرتے ہوئے امام طبرانی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس لئے کہا تھا کہ بتوں کی عبادت کا زمانہ قریب تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں جاہل لوگ حجر اسود کو چومنے سے یہ خیال نہ کرلیں کہ اسلام میں بھی بعض پتھروں کی تعظیم ہے، جیسا کہ عربی لوگ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے، اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بات کا ارادہ فرمایا کہ لوگ جان لیں کہ حجر اسود کو چومنا اتباع رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ حجر اسود ذاتی طور پر کوئی نفع و نقصان پہنچاتا ہے۔

جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ بتوں کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے محدث مہلب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول سے اس شخص کا رد ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ حجر اسود زمین میں اللہ تعالی کا یمین (دایاں ہاتھ) ہے جو اپنے بندوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کرتا ہے، معاذ اللہ، (پھر فرماتے ہیں) کہ اس کے چومنے کا مقصد یہ ہے کہ اطاعت کا مشاہدہ کیا جائے کہ کون اطاعت کرتا ہے اور یہ ابلیس کے قصہ کے مشابہ ہے کہ جہاں فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو (نہ یہ کہ آدم معبود تھے) فتح الباری ص۴۶۳ ج ۳۔

الغرض کچھ بھی ہو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہر حال حجر اسود کو مخاطب کر کے یہ بات کہی کہ تیری تعظیم کی غرض سے نہیں اتباع رسول ﷺ کی پیروی میں تجھے چوم رہا ہوں، ہمارا بھی دعوی ہے کہ کسی متبرک و باعظمت چیز کا بوسہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت کر دیا جائے تو ہم بھی اتباع رسول میں اس کو ضرور بھر ضرور بوسہ دیا کریں گے اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں گے، کتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ ثبوت لاؤ، تو ہم عمل کرنے کیلئے تیار ہیں، باقی رہا مفتی صاحب کا روایات نقل کرنا کہ فلاں شخص نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ یا پاؤں چومے تو یہ مفتی صاحب کے مذھب وعقیدہ اور عمل کی رو سے ان کی دلیل نہیں (تفصیل آگے آرہی ہے)

پھر اگر ہاتھ پاؤں چومنے آداب میں شامل ہوتے اور کسی باوقار اور صاحب عظمت شخصیت کی تعظیم ہی مقصود ہوتی تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کسی نا کسی کی تعظیم میں ضرور بھر ضرور اس کے ہاتھ پاؤں چومتے، آخر آنحضرت ﷺ کی زندگی مبارکہ میں آپ کی رضاعی ماں اور بہن بھائی موجود تھے، آپ کا محسن چچا اور جلیل القدر صحابی بلکہ سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہی کبھی تعظیم میں ہاتھ چوم لیا کرتے یا کسی صحابی کو ہی حکم فرماتے کہ اپنے فلاں کے ہاتھ پاؤں چوما کرو کہ یہ آداب میں شامل ہے، مگر پورے ذخیرہ حدیث کو آپ پوری کوشش اور جستجو سے پڑھ لیجئے آپ کو کوئی ایسی صحیح صریح ایک حدیث بھی نہ ملے گی، جو زمانہ حال کے مبتدعین کی کھلی دلیل بن سکتی ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے بھی اس کی پر زور تردید کی ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے کہ

تقبيل يدنفسه اذا لقي غيره فهومكروه فلا رخصة فيه واما تقبيل يد صاحبه عند اللقاء فمكروه بالاجماع وكذاما يفعلونه من تقبيل الارض بين يدى العماء و العظماء فحرام والفاعل والراضي به آثمان لانه يشبه عبادة الوثن و هل يكفر ان علي وجه العبادة والتعظيم كفر وان على وجه التحية لا و صار آثما مرتكبا للكبيرة..

یعنی دوسرے سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ کو چومنا، مکروہ ہے اس (عمل میں) رخصت نہیں اور اپنے دوست سے ملاقات کے وقت اس کا ہاتھ چومنا بالا جماع مکروہ ہے اور اسی طرح (یہ بھی مکروہ ہے) جو علماء اور معظم لوگوں کے سامنے سے زمین کو بوسہ دیتے ہیں ایسا کرنے والا اور اس کے فعل پر راضی ہونے والا دونوں ہی گناہگار ہیں، کیونکہ یہ بتوں کی عبادت کے مشابہ ہے، اور اگر عبادت وتعظیم کی نیت سے کرے تو کفر ہے اور اگر تحیۃ کے ارادہ سے کرے تو کفر نہ ہوگا ہاں البتہ گنہگار ہوگیا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔ درمختار مع فتاوی شامی ص۳۸۳ ج۶۔ کتاب الحظر و والاباحۃ باب الاستبراء وغیرہ۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں، مولوی عبدالحی صاحب نے مقدمہ ھدایہ میں حجر اسود کے ماتحت اس حدیث کو نقل فرمایا کہ حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ اے امیر المومنین حجر اسود نافع بھی ہے اور مضر بھی، کاش آپ نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر پر توجہ فرمائی ہوتی،

و اذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهور هم ذریتهم.

جب میثاق کے دن رب تعالیٰ نے عہد و پیمان لیا تو وہ عہد نامہ ایک ورق میں لکھ کر اس حجر اسود میں رکھا اور یہ سنگ اسود قیامت کے دن آویگا کہ اس کی آنکھیں اور زبان اور لب ہوں گے اور مومنین کی گواہی دے گا، لہذا یہ اللہ کا امین اور مسلمانوں کا گواہ ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے علی جہاں تم ہو خدا مجھے وہاں نہ رکھے اصل حدیث ترمذی ص ۱۱۵ میں بھی ہے۔ جاء الباطل ص ۳۷۵ ج ۱۔

الجواب.

اولاً۔ مفتی صاحب نے صریحاً جھوٹ بولا ہے کہ یہ روایت ترمذی میں ہے، حالانکہ یہ روایت ترمذی میں نہیں پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور عاشقین بدعات اس کا وجود ترمذی سے ثابت نہیں کر سکتے۔

ثانیاً۔ یہ داستان مکذوبہ ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ابی ھارون العبدی (عمارۃ بن جوین) ہے، مستدرک حاکم ص ۴۵۷ ج ۱۔ وشعب الایمان للبیھقی ص ۴۵۱ ج ۳ (رقم الحدیث ۴۰۴۰)۔

جو کہ پرلے درجہ کا ضعیف و متروک ہے، اسے حماد بن زید، امام جوزجانی، امام ابن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ نے کذاب قرار دیا ہے، امام شعبہ اسے ضعیف کہتے ہیں، امام احمد نے، لیس بشئی (ہیچ محض) کہا ہے، امام ابو زرعہ نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے، امام ابو حاتم فرماتے ہیں بشر بن حرب سے بھی زیادہ ضعیف ہے، امام نسائی، امام حاکم نے متروک قرار دیا ہے

امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ ابی سعید سے وہ روایات بیان کرتا ہے جو ان کی احادیث میں

نہیں (یعنی ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتا ہے خیر سے یہ روایت بھی انہی سے بیان کی ہے، ابوصہیب) اس کی روایات کو لکھنا جائز نہیں مگر تعجب کی نظر سے، امام ابن سعد نے احادیث میں ضعیف قرار دیا ہے، امام شعبہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے روایت کرنے سے گردن کٹوانا زیادہ پسند ہے،

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کرام کا اجماع ہے۔

تھذیب التھذیب ص۴۱۳ ج۷، و میزان الاعتدال ص۱۷۳ ج۳۔

کوئی ادنیٰ کلمہ توثیق بھی راقم کو کتب رجال سے اس کے متعلق نہیں ملا، حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص۳۶۳ ج۳، میں اور امام بیہقی نے، شعب الایمان، میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور امام احمدؒ سے اس روایت کا ضعف نقل کیا ہے، علامہ سیوطی نے امام بیہقی کا حکم ذکر کر کے سکوت کیا ہے، درمنثور ص۱۴۴ ج۳۔

بزرگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے کے دلائل کا تجزیہ

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

تبرکات کا چومنا جائز ہے، قرآن کریم فرماتا ہے کہ

واد خلوا الباب سجداو قولو احطة۔

یعنی بنی اسرائیل تم بیت اللہ کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو، اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں۔

اس آیت سے پتہ لگا کہ بیت المقدس جوانبیاء کرام کی آرام گاہ ہے اس کی تعظیم اس طرح کرائی گئی کہ وہاں بنی اسرائیل کو سجدہ کرتے ہوئے جانے کا حکم دیا، یہ بھی معلوم ہوا کہ متبرک مقامات پر توبہ جلد قبول ہوتی ہے۔ جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ مبتدعین پرلازم ہے کہ وہ کسی معتبر دلیل شرعی سے ثابت کریں کہ بنی اسرائیل کوسجدہ کرنیکاحکم اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ انبیاء کرام کی آرام گاہ ہے، لہذا سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا، یقین جانیئے پوری دنیا کے مبتدعین اکٹھے ہوکر سرتوڑ کوشش کرنے کے باوجود اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتے، بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے پہلے کوئی نبی بستی بیت المقدس میں گیا ہو اور اس نے وہاں آرام کیا ہو یا وہاں اس کی فرودگاہ یا قبر ہو، یہ فقط مفتی جی کی سینہ گزٹ بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

اس کے برعکس اللہ تعالی کے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہود (بنی اسرائیل) اس وجہ سے ملعون ہوگئی کہ انہوں نے انبیاء کرام علیھم السلام کی آرام گاہوں کوسجدہ گاہ بنالیا تھا۔

ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا راویہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لعنة الله علی الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد، الحدیث.

یعنی یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالی کی لعنت ہو کہ انہوں نے انبیاء کرام علیھم السلام کی قبروں کوسجدہ

گاہ بنالیا تھا۔ بخاری ص۶۲ ج۱، و مسلم ص۲۰۱ ج۱۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ یہود کے اس فعل کی وجہ سے ان پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، مگر افسوس کہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ انہیں انبیاء کرام کی آرام گاہوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اے جی اگر حکم دیا گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے لعنت کیوں فرمائی، کیا رسول اللہ ﷺ ایسے شخص پر لعنت فرمایا کرتے تھے جو حکم الٰہی پر عمل کرتا ہو۔

ثانیاً۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے حکم الٰہی کو بدل دیا اور سجدہ نہیں کیا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ انہیں جس سجدے کا حکم دیا گیا تھا، وہ انہوں نے نہیں کیا جیسا کہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال قیل لبنی اسرائیل ادخلو الباب سجداً و قولوا حطة فدخلوا یزحفون علی استا ھھم فبدلوا وقالوا حطة حبة فی شعرة.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور زبان سے یہ کہتے ہوئے الٰہی ہمیں معاف کردے، داخل ہونا، مگر انہوں نے اس حکم کو بدل دیا اور چوتڑوں کے بل داخل ہوئے اور حطة (معاف کردے) کی جگہ حبة فی شعرہ (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔ بخاری ص۶۴۳ ج۲۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس سجدہ کا انہیں حکم دیا گیا تھا، وہ اسے بجانہ لائے جس کی وجہ سے وہ مستحق عذاب قرار پائے، ارشاد ہوتا ہے

فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون. (البقرہ ۵۹)

تو جو ظالم تھے انہوں نے اس لفظ کو جس کا انکو حکم دیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا پس ہم نے (ان) ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ نافرمانیاں کئے جاتے تھے (۲-۵۹)

اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ حکم کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا تھا، اب اگر مفتی صاحب کی بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ انہیں انبیاء کرام کی آرام گاہوں کی تعظیم کیلئے یہ حکم ہوا تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان پر عذاب الٰہی کیوں نازل ہوا، کیونکہ انبیاء کرام علیھم السلام کی

قبروں کو تو انہوں نے سجدہ گاہ بنا رکھا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی روایت اس پر گواہ ہے، معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا مطلب کشید کردہ ہے، جو غلط ہونے کی وجہ سے مردود و باطل ہے۔

ثالثاً۔ صحیح و درست اور خالص حق بات یہ ہے کہ انہیں اللہ تبارک و تعالی کے حضور سجدہ شکر بجا لانے کا حکم دیا گیا تھا، (جس کی انہوں نے نافرمانی کی تھی)

جیسا کہ ،حطۃ، کے الفاظ اس بات کا قرینہ ھیں کیونکہ مغفرت کی دعا فقط خالق سے ہی کی جاتی ہے، پھر آگے فرمایا کہ

نغفر لکم خطٰیکم (البقرہ، ۵۸)

ہم تمہاری خطائیں بخش دینگے (احمد رضا خاں)

ثابت ہوا کہ انہیں اس بات کی تعلیم دی گئی تھی کہ مجھ (رب) سے مغفرت طلب کرنا تو میں معاف کردوں گا، اس ساری تقریر سے ،حطۃ، کا تعلق خالق ارض وسماء رب تعالی سے ثابت ہوگیا ،تو، سجدہ، کا تعلق بھی اسی ذات سے رہا جس سے ،حطۃ، کا ہے خود مفتی صاحب کو اس حقیقت کا اقرر ہے فرماتے ہیں

اے اسرائیلیوں صرف بدنی عبادت (سجدہ) کرنے پر ہی کفایت نہ کرنا بلکہ وہاں داخل ہوتے وقت اپنی زبان سے کہنا خدایا ہمارے گناہ معاف کردے،

تفسیر نعیمی ص ۳۸۳ ج ۱۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب جاء الباطل میں اس کا تعلق انبیاء کرام کی آرام گاہوں سے جوڑ رہے ہیں، پھر اس یہودانہ تحریف پر انہیں نہ شرم ہے نہ حیا بلکہ اس بے ایمانی اور ہیرا پھیری کو بنیاد بنا کر اس سے اولیاء کرام کے ہاتھ پاؤں چومنے کا اثبات کر رہے ہیں۔

رابعاً۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ سجدہ کا تعلق رب تعالی سے ہے، لیکن اگر بالفرض مفتی صاحب کی بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ سجدہ انبیاء کرام کی آرام گاہوں کی وجہ سے تھا، (نعوذ باللہ تعالی) تو تب بھی مفتی صاحب کی بات ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ سجدہ سے ہاتھ پاؤں چومنے کا ثبوت کس دلیل سے ثابت ہوا۔

الغرض مفتی صاحب کی بات سے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا ہی ثابت ہوا، جو خیر سے خود

مفتی صاحب کے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸ ج ۲۔

فما کان جوابکم فھو جوابنا

دوسری دلیل

مشکوٰۃ باب المصافحہ والمعانقہ فصل ثانی میں ہے کہ

وعن ذراع وکان فی وفد عبدالقیس قال لما قدمنا المدینة فجعلنا نتبادر من رواحلنا فنقبل ید رسول الله ﷺ ورجله.

حضرت ذراع سے مروی ہے اور یہ وفد عبدالقیس میں تھے فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ آئے تو اپنی سواریوں سے اترنے میں جلدی کرنے لگے پس ہم حضور علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا اور ان کے بعد ان کے تبرکات بال ولباس وغیرہ کو بوسہ دینا، ان کی تعظیم کرنا مستحب ہے، جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

مگر اس کی دلیل یہ عنایت فرماتے ہیں وفد عبدالقیس نے ملاقات کے وقت آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومے تھے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اس روایت سے امتی کے تبرکات (لباس و بال) کو چومنا اور ان کی غلو کی حد تک تعظیم کرنا کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے، رہا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند مولویوں کا اس سے بزرگوں کے ہاتھ چومنے کا استدلال تو محل نظر ہے کیونکہ نبی اور امتی کا جسم ایک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے جسم اطہر پر کسی پیر وفقیر اور مبتدعین کے اکابرین کو قیاس کر لیا جائے۔

ثانیاً۔ سند کے اعتبار سے یہ روایت اس قابل نہیں کہ اس پر بنیاد بنائی جاسکے کیونکہ سند میں ایک راویہ ام ابان بنت الوازع بن زارع ہیں، ابوداؤد ص ۳۵۳ ج ۲۔

ان کی کسی محدث سے توثیق منقول نہیں، دیکھئے تھذیب ص ۴۵۸ ج ۱۲، ہاں البتہ حافظ ابن حجر نے تقریب ص ۴۴۳ میں، مقبولۃ، کہا ہے، اور یہ کلمہ اس بات کی صراحت ہے کہ ان کی کوئی متابعت کرے تب مقبول ورنہ لین الحدیث ہوتی ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے، مقدمہ تقریب، میں

صراحت کی ہے الغرض جب تک ام ابان کی توثیق یا کم از کم اس کا کوئی متابع ثابت نہ کیا جائے تب تک اس کی صحت کا دعوی قابل التفات نہیں۔

تیسری دلیل

مشکوۃ باب الکبائر و علامات المنفاق میں حضرت صفوان ابن عسال سے روایت ہے، فقبل یدیہ ورجلہ، پس انہوں نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں چومے تھے۔ جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس میں کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیاء کرام کے ہاتھوں اور پاؤں کو تبرکات کی نیت سے چومنا جائز ہے، الغرض مبتدعین کو کوئی ایسی دلیل پیش کرنی چاہیے جس میں اولیاء کرام کے ہاتھ اور پاؤں چومنے کی اجازت ہو۔

ثانیاً۔ اصول کی کتابوں میں سنت تقریری کی یہ تعریف لکھی ہوئی ہے کہ جو کام آنحضرت ﷺ کے سامنے مسلمان کریں، وہ تقریری سنت ہے،

جب کہ روایت مذکورہ میں ہاتھ پاؤں چومنے والے یہودی تھے، مسلمان نہ تھے، اگر مبتدعین غور کرتے تو اسی حدیث میں ہی اس اصول کا ذکر موجود ہے،

چنانچہ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہودیوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، جس پر آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ، فما یمنعکم ان تتبعونی، پھر تمہیں میری پیروی سے کونسی سی چیز روکتی ہے، اس پر یہودیوں نے کہا کہ

ان داود دعا بان لایزال من ذریته نبی وانا نخاف ان اتبعناک ان تقتلنا یهود، نسائی ص ۱۶۵ ج ۲.

داؤد علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ نبوت ہمیشہ ان کی اولاد میں رہے، اور تحقیق ہم ڈرتے ہیں اگر ہم نے آپ کی پیروی کی، تو یہودی ہم کو مار ڈالیں گے۔

مسند احمد ص ۲۳۹ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۹ ج ۱، و بیھقی ص ۱۶۶ ج ۸، و ابن ماجہ ۳۷۰۵ و

ترمذی مع تحفہ ص ۱۳۹ ج ۳، وص ۳۹۹ ج ۴۔

حالانکہ یہ یہود کا کذب اور داؤد علیہ السلام پر افتراء تھا، کیونکہ انہوں نے ایسی کوئی دعا نہ کی تھی، بلکہ یہود تورات میں آپ علیہ السلام کے خاتم النبیین ہونے کا تذکرہ پڑھ چکے تھے، یہود کے اس جھوٹ کو تمام شارحین حدیث بیان کرتے ہیں، دیکھئے مرقاۃ ص ۱۳۰ ج ۱، و اشعۃ اللمعات ص ۸۳ ج ۱۔

الغرض کسی کافر کے قول وفعل پر نبی کی خاموشی سنت کے زمرہ میں نہیں آتی ورنہ آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہودیوں کی بات کی آنحضرت ﷺ نے تصدیق کر دی تھی کہ داؤد علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی، جو رب نے منظور کر لی، کہ نبوت آل داؤد میں رہے، کیونکہ آپ علیہ السلام نے ہاتھوں کے چومنے کی طرح اس پر بھی خاموشی اختیار کی ہے،

ثالثاً۔ شارحین حدیث نے ایک مزید بات بھی کہی ہے کہ یہود کے وفد نے جو گفتگو آنحضرت ﷺ سے کی تھی، ان میں تناقض ہے، انہوں نے آپ ﷺ کے نبی ہونے کی تصدیق کی، آپ علیہ السلام نے جب پوچھا کہ پھر ایمان کیوں نہیں لاتے، اس کے جواب میں یہود نے دعا داؤدی کو عذر بنایا، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا تناقض ہے، اور یہود اپنی دونوں باتوں میں سے، ایک میں کاذب ہیں، اوروں کو جانے دیجئے خود مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

یہ ان کا خالص افترا تھا، سارے نبیوں نے ہمارے حضور (ﷺ) کی پیش گوئی کی، داؤد علیہ السلام یہ دعا کیسے مانگ سکتے تھے، تعجب ہے کہ یہ دونوں ابھی حضورؐ کی تصدیق کر چکے اور اب یہ بہتان باندھ رہے ہیں،.......... تورات و زبور میں خبر تھی کہ محمد مصطفیٰ (ﷺ) سارے عالم کے نبی ہوں گے، تمام شریعتوں کے ناسخ۔

مرآۃ المناجیح ص ۷۷ ج ۱، طبع نعیمی کتب خانہ گجرات بدون تاریخ۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کذب و افترا سے کام لیا ہے اور ان کے کلام میں کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کے جھوٹ پر کوئی گرفت نہیں کی بلکہ سکوت اختیار کیا ہے۔

اب اگر کوئی مجتہد یہ دعویٰ کر دے کہ چونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اس افترا سے منع

نہیں کیا اور نہ ہی کوئی نکیر کی ہے لہذا ثابت ہوا کہ جھوٹ بولنا اور انبیاء علیھم السلام کے مقدس و مطہرہ گروہ پر افترا کرنا جائز ہے، تو ایسے مدعی کو مبتدعین کیا جواب دیں گے، فما کان جوابکم فھو جوابنا۔

اس کے جواب میں ہم تو اسے بڑے پیار سے کہیں گے کہ نہیں بھائی کسی کافر کے قول وفعل پر نبی کی خاموشی سنت کے زمرہ میں نہیں آتی کیونکہ کفار کے قول وفعل لغو ہوا کرتے ہیں، جہلا کے سامنے خاموشی تعلیم قرآن ہے، ارشاد ہے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰماً، (الفرقان آیت ۶۳)

اور جب جاہل لوگ ان سے گفتگو کرتے ہیں، تو سلام کہتے ہیں۔ (۲۵-۶۳)

الغرض کافر کے قول وفعل پر نبی کی خاموشی دین میں حجت نہیں ہوتی مگر افسوس کہ مبتدعین کے حکیم الامت کو یہ باتیں کون سمجھائے کہ وہ ہاتھ پاؤں چومنے کو سنت قرار دے رہے ہیں۔

بھائیو! اگر یہ سنت ہے تو پھر مبتدعین کے نزدیک جھوٹ بولنا اور انبیاء کرام علیھم السلام پر افترا کرنا بھی شاید سنت ہی ہو، غالباً اسی سنت یہود پر عمل کرتے ہوئے مفتی صاحب نے، جاء الباطل، میں تقریباً ایک صد کے قریب اپنی طرف سے احادیث وضع کی ہیں، اللہ ھدایت اور سمجھ عطا کرے، آمین۔

چوتھی دلیل

مشکوٰۃ شریف باب یقال عند من حضر الموت بروایت ترمذی و ابوداؤد مروی ہے کہ

عن عائشة قالت قبل رسول الله ﷺ عثمان ابن مظعون و هو ميت .

حضور علیہ السلام نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

جاء الباطل ص ۳۶۸ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بوسہ تو فاضل نے مفضول کا لیا ہے تو یہ حدیث آپکی دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ آپ کا عمل اور دعوی تو ہے مفضول کا فاضل کو بوسہ دینا اور ہاتھ پاؤں چومنا۔

ثانیاً۔ یہ بوسہ زندہ نے مردہ کا لیا ہے تو کیا آپ کے اولیاء جن کی قدم اور دست بوسی کرتے ہو حالانکہ وہ زندہ ہوتے ہیں کیا وہ اپنی زندگی ہی میں مردہ ہوتے ہیں کہ اس روایت سے استدلال کر رہے ہو۔

ثالثاً۔ یہ بوسہ تو منہ سے لیا گیا تھا، جیسا کہ الفاظ قبل اس کا قرینہ ہیں کیونکہ عربی زبان میں مطلق قبل (من التقبیل) بولا جائے تو اس سے منہ کا بوسہ لینا مراد ہوتا ہے اور اس معنی کو حدیث کے الفاظ بھی متعین کرتے ہیں کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

وهو يبكي حتى سال دموع النبي ﷺ على وجه عثمان، الحديث مشكوة ص ۱۴۱ .

اس کا معنی شیخ عبدالحق محدث دھلوی فرماتے ہیں۔

وآنحضرت گریه میکرد تاآنکه روان شد اشکهای پیغمبر ﷺ را برروی عثمان.

یعنی (جب نبی ﷺ نے ان کا بوسہ لیا تو) آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپؐ کے آنسو ٹپک کر عثمان بن مظعون کے چہرے پر گرے، اشعۃ اللمعات ص ۷۰۶ ج ۱،

منہ پر آنسو تب ہی گر سکتے ہیں جب بوسہ بھی منہ سے لیا ہو۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا کہ آنحضرت ﷺ نے عثمان بن مظعون کا بوسہ منہ سے لیا تھا! سوال یہ ہے کہ آیا مبتدعین بھی اپنے اولیاء اور گدی نشین حضرات کا منہ چومتے ہیں اگر چومتے ہیں (جن میں اکثریت عورتوں کی ہوتی ہے) تو یہ انہیں مبارک ہو۔

اگر منہ کو بوسہ نہیں دیتے تو یہ حدیث انکی دلیل کس طرح بن گئی۔

رابعاً۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد مومن کی میت پاک ہوتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کسی پلید و نجس چیز کا بوسہ قطعاً نہ لیتے تھے، بلکہ پاکیزہ چیز کو ہی استعمال کرتے تھے اور پاک و طاہر کو ہی مس کرتے تھے، مگر افسوس کہ مبتدعین میت کے نجس و پلید ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

خامساً۔ اس کی سند میں عاصم بن عبید اللہ، راوی ہے، ابوداود مع عون ص۱۷۳ ج ۳، وترمذی مع تحفہ ص۱۳۰ ج ۲، وابن ماجہ ص۱۰۶، ومستدرک حاکم ص۳۶۱ ج ۱، وبیھقی ص۴۰۷ ج ۳، وابن عدی ص۱۸۶۷ ج ۵۔

اور یہ شدید قسم کا ضعیف راوی ہے امام مالک پہلے اس سے روایت کرتے تھے پھر اسے ضعیف قرار دے دیا، امام یحییٰ فرماتے ہیں ضعیف ہے اس سے احتجاج نہ کیا جائے، امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ کثیر الوھم اور فاش خطائیں کرتا ہے، امام ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ شیوخ اس کی روایت سے بچتے تھے امام نسائی اور امام ابن عدی نے ضعیف کہا ہے، امام ابو زرعہ اور ابوحاتم نے منکر الحدیث اور دارقطنی نے متروک کہا ہے، میزان الاعتدال ص۳۵۴ ج ۲۔

کوئی کلمہ توثیق راقم کی نظر سے نہیں گزرا بلکہ امام ھشام فرماتے ہیں

لا یخرج الدجال و واحد من ھولاء حی.

یعنی دجال کا خروج ممکن نہیں جب کہ اس ٹیم سے ایک (عاصم) زندہ موجود ہے، تھذیب ص۴۹ ج ۵۔

الغرض یہ روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کی دلیل بھی نہیں، تفصیل پہلے عرض کر دی گئی ہے۔

پانچویں دلیل

شفا شریف میں ہے جس منبر پر حضور علیہ السلام خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ لگا کر منہ پر رکھتے تھے(چومتے تھے) جاء الباطل ص۳۶۹ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی آنحضرت ﷺ سے والہانہ محبت وعقیدت تھی، اللہ تعالی ہر مسلمان میں محبت رسول اور اتباع کا جذبہ ڈال دے، مگر اس سے مفتی صاحب کا استدلال چند وجوہ سے باطل ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ثانیاً۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ منبر پر ہاتھ پھیر کر منہ پر رکھتے تھے، آگے جو مفتی صاحب نے بریکٹ میں اس کی تفصیل، چومتے تھے، بیان فرمائی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اثر کے الفاظ ہیں،

ثم یضعها علی وجهه، جاء الباطل ص ۳۶۹ ج ا .

اور، وضع، کا معنی رکھنا ہوتا ہے چومنے کیلئے عربی زبان میں، قبل، لثم، استلم، وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر منبر سے آثار نبوی کی وجہ سے تبرک حاصل کرتے تھے، مبتدعین کی طرح چومتے چاٹتے نہ تھے۔

ثالثاً۔ منبر تو آثار نبوی میں سے تھا، اور آثار نبوی سے تبرک کے ہم بھی قائل ہیں، اس سے ہمیں انکار نہیں، لیکن اس سے کسی بڑے یا پیر یا ولی یا استاذ وغیرہ کے ہاتھ چومنے کا استدلال غلط ہے کیونکہ منبر بہر حال لکڑی کا تھا، جو ایک بے جان چیز ہے مگر آپ کا دعوی جاندار لوگوں کے ہاتھ چومنے کا ہے، لہذا دلیل بھی جاندار چیز کی بالخصوص انسان کی دیجئے کہ اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفی ﷺ نے اولیاء کرام کے ہاتھ پاؤں چومنے کی اجازت یا حکم فرمایا ہو۔

افسوس کہ مفتی صاحب اصل موضوع کی طرف تو آتے ہی نہیں ادھر ادھر کی غیر متعلقہ بھرتی کر کے داد تحسین حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عوام یہ خیال کریں کہ لوجی ہمارے حکیم الامت اور مفتی صاحب نے اس قدر دلائل عنایت فرمائے ہیں، لہذا اپنے اکابرین کے ہاتھ پاؤں چومنے چاہئیں ان کے آگے عاجزی و انکساری سے پیش آنا چاہیے کون پوچھنے والا ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

بس مفتی صاحب نے کوئی عربی عبارت نقل کر کے کہہ دیا کہ اس سے ہمارا فلاں مسئلہ ثابت ہوتا ہے، بدعت پسند پارٹی نے اسے پلے باندھ لیا اور اسے اہل سنت کی علامت قرار دیکر منکرین کو وہابی کا لقب دیا اور ساتھ یہ مشہور کر دیا کہ یہ لوگ تو گستاخ ہیں ان کا کہنا نہ ماننا، انا للہ۔

اس طرح کے مفتی صاحب نے جس قدر دلائل نقل کیئے ہیں ان کا تعلق زیر بحث مسئلہ کی بجائے آثار نبوی کے تبرکات سے ہے، ان کا اصولی جواب تو ہم نے دے دیا ہے کہ ہم آثار نبوی سے تبرکات کے قائل ہیں لیکن پھر بھی ہم آگے، مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار، کے زیر عنوان انہیں نقل کر کے ان پر تبصرہ کیئے دیتے ہیں، **واللہ علی کل شئی قدیر، وھو یھدی الی السبیل.**

رابعاً۔ مذکورہ تمام جوابات بصورت تسلیم ہم نے عرض کیئے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ قاضی عیاض کی تالیف، شفا شریف، میں اسناد نہیں ہیں، لہذا ان کے مجرد لکھنے سے بات ثابت نہیں ہوسکتی، الغرض اس کی صحیح سند پیش کرنا مبتدعین پر ادھار ہے، امام محمد بن عاصم الاصبھانی **المتوفی ۲۶۲ھ** نے صحیح سند سے ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ امام نافع فرماتے ہیں کہ،

ان ابن عمر کان یکرہ مس قبر النبی ﷺ .

یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ قبر نبوی (ﷺ) کو مس کرنے کو مکروہ جانتے تھے، جزء محمد بن عاصم صفحہ ۱۰۶، رقم الحدیث ۲۷، طبع دارلعاصمہ الریاض۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام دار الہجرت فقیہ امت حضرت امام مالکؒ نے منبر کو چومنا بھی بدعت قرار دیا ہے، مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۷۹ ج ۲۷۔

مفتی صاحب کا اصل موضوع سے فرار

راقم کو جہاں تک معلوم ہے اہل سنت میں کسی نے بھی تبرکات نبوی سے حصول برکت کا انکار نہیں کیا، جس کی پوری تفصیل، کفنی والفی، کی بحث میں پہلے عرض کر دی گئی ہے، پھر نامعلوم کہ مفتی صاحب تبرکات نبوی کی روایات کو درمیان میں کیوں گھسیٹ لائے ہیں، اگر ان روایات سے مفتی صاحب کا مقصود اہل حدیث کا رد کرنا ہے کہ یہ لوگ تبرکات نبوی سے حصول برکت کے منکر ہیں تو یہ

ان کا افترا ہے یا کم از کم اسے ہم وہم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کیونکہ ہمارا دامن اس افترا سے پاک ہے، ہم الحمد للہ تبرکات نبوی سے حصول برکت کے قائل ہیں، دور حاضر کے محدث اور سلفی جماعت میں چوٹی کے محقق علامہ ناصر الدین محدث البانی رحمۃ اللہ تعالی فرماتے ہیں

نبی کریم ﷺ کے آثار کے ساتھ تبرک مشروع ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس تبرک کو آپ کی حیات مبارکہ میں حاصل کیا اور آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہ فرمایا، التوسل انواعہ و احکامہ ص ۱۷۸ مترجم۔

اگر مفتی صاحب کا ان روایات کو نقل کرنے سے اولیاء کرام کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کا جواز پیدا کرنا ہے، تو یہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ بے دلیل دعوی ہے، جو قابل قبول نہیں اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو وہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے اپنے دعوی کو ثابت کریں یا کم از کم جن کے یہ مقلد ہیں ان (ابو حنیفہ) سے ہی اس کا ثبوت دیں کہ آثار نبوی پر اولیاء کرام کے آثار کو قیاس کر کے ان سے تبرکات حاصل کیئے جا سکتے ہیں، یقین جانئے کہ پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور مبتدین کے اکابر سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل نہیں لا سکتے، **فان لم تفعلوا و لن تفعلوا**.

امام احمد بن حنبلؒ پر افترا

باقی رہا مفتی صاحب کا امام احمد بن حنبلؒ سے یہ نقل کرنا کہ انہوں نے قبر نبوی کو چومنے کا فتوی دیا ہے، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

شرح بخاری لابن حجر پارہ ششم ص ۱۵ میں لکھا ہے کہ ارکان کعبہ کے چومنے سے بعض علماء نے بزرگان دین وغیر ہم کے تبرکات کا چومنا ثابت کیا ہے، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضور علیہ السلام کا منبر یا قبر انور چومنا کیسا ہے؟ فرمایا کوئی حرج نہیں، جاء الباطل ص ۳۶۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس حکایت کو نقل کر کے حافظ ابن حجر نے لکھا تھا کہ

و استبعد بعض اتباعه صحة ذلک.

یعنی امام احمد بن حنبلؒ کے بعض پیروکاروں نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ فتح الباری ص۳۷۳ ج۳، **باب من لم یستلم الالرکنین الیمانین.**

اس سے ثابت ہوا کہ ان کے مقلدین نے اس نقل کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے، مگر مفتی صاحب نے مطلب کی عبارت تو نقل کر دی مگر آگے اس کی تردید کو بغیر ڈکار کے ہضم کر گئے۔

ثانیاً۔ حافظ ابن حجرؒ چھٹی صدی ہجری کے ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی تھی، تھذیب ص۶۵ ج۱، درمیان میں تقریباً اڑھائی صدیوں کا ایک طویل زمانہ محیط ہے، تو ہم حافظ صاحب کی نقل پر کیسے یقین کرلیں جب کہ وہ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے مقلدین نے اس قول کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے۔

ثالثاً۔ خود حافظ ابن حجر نے اسے صیغہ تمریض سے نقل کیا ہے کہ، فنقل عن الامام احمد، یعنی امام احمدؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے، (فتح الباری) یہ نقل کرنے والا کون ہے، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، تفصیل نادارند۔

رابعاً۔ اس روایت کے معتبر ہونیکی اگر حافظ ابن حجر کے پاس بھی کوئی دلیل ہوتی تو وہ اسے ضرور نقل کر کے امام احمد بن حنبل کے مقلدین کی تردید کرتے اور بالجزم اس قول کو امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب کرتے، مگر ایسا انہوں نے بھی نہیں کیا، معلوم ہوا کہ خود حافظ ابن حجر کے نزدیک بھی اس قول کی صحت مشکوک ہے۔

خامساً۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ قبر نبوی کو چھونا مکروہ سمجھتے تھے۔ اور امام احمد بن حنبلؒ جو مجتھد اور آثار صحابہ کرام سے واقف ہیں یہ ویسے ہی بعید ہے کہ وہ عمل صحابہ کے برعکس کوئی فتویٰ دیں

سادساً۔ مگر ان تمام حقائق کے برعکس مفتی صاحب پھر بھی اس قول کو نقل کر کے خصم کو حجت باور کراتے ہیں، لیکن اس کے ضعف والی عبارت کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ روضہ اقدس چومنا بریلوی مذھب میں بھی جائز نہیں مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ زیارت روضہ انور سید اطہر

ﷺ کے وقت نہ دیوار کریم کو ہاتھ لگائے نہ چومے.......... یہ سب بدعت قبیحہ (بری) ہیں۔ فتاویٰ رضویہ ص۲۲۸ ج ۱۰ جزو دوم۔ اسی طرح ہم عرض کرتے ہیں کہ بدعت قبیحہ ہے۔

آیت قرآن سے غلط استدلال

فرماتے ہیں، بزرگان دین کے بال ولباس وجمیع تبرکات کی تعظیم کرنا ان سے لڑائی وغیرہ مصائب میں امداد طلب کرنا، قرآن کریم سے ثابت ہے، قرآن فرماتا ہے

قال لهم نبيهم ان اٰية ملكه ان ياتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم و بقية مما ترك اٰل موسى و اٰل هٰرون تحمله الملئكة.

بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے فرمایا کہ طالوت کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آویگا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کو چین ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں، معزز موسیٰ و ہارون کے ترکہ کی کہ اٹھائے ہوں گے اس کو فرشتے۔

اس آیت کی تفسیر میں خازن و روح البیان وتفسیر مدارک اور جلالین وغیرھم نے لکھا ہے کہ تابوت ایک شمشاد کی لکڑی کا صندوق تھا جس میں انبیاء کی تصاویر ان کے مکانات شریف کے نقشے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ان کا عمامہ وغیرہ تھا، بنی اسرائیل جب دشمن سے جنگ کرتے تو برکت کیلئے اس کو سامنے رکھتے تھے، جب خدا سے دعا کرتے تو اس کو سامنے رکھ کر دعا کرتے تھے، بخوبی ثابت ہوا کہ بزرگان دین کے بترکات سے فیض لینا، ان کی عظمت کرنا طریقہ انبیاء ہے۔ جاء الباطل ص۳۶۹ تا ۳۷۰ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ قرآن کے کن الفاظ کا یہ معنی ہے کہ بزرگان دین کے بال ولباس وجمیع تبرکات کی تعظیم کرنا اور لڑائی وغیرہ مصائب میں ان سے امداد طلب کرنا، جاء الباطل ص۳۶۹ ج ا۔ یقین جانئے کہ یہ مفتی صاحب کا قرآن پر افترا اور من گھڑت افسانہ ہے، ہماری طرف سے پوری دنیا کے مبتدعین کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ قرآن سے اس کا ثبوت دیں اگر نہ دے سکیں یقیناً نہ دے سکیں گے، تو پھر اللہ کا خوف کیجئے اور لوگوں کو گمراہ نہ کریں کہ کل قیامت کے روز اس کا حساب دینا پڑے گا۔

ثانیاً۔ رہا مفتی صاحب کا تفاسیر کے حوالے سے یہ لکھنا کہ بنی اسرائیل کیلئے اس میں یہ یہ تھا اور وہ اس کے ساتھ ایسا ویسا کرتے تھے، تو یہ سرے سے قابل التفات ہی نہیں کیونکہ یہ تمام چیزیں اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، اگر مبتدعین میں ہمت ہے تو اس کا ثبوت کسی مرفوع حدیث سے دیں، مجھے میری زندگی کے مالک کی قسم ہے، پوری دنیا کے منکرین سنت اس پر گھٹنے ٹیک جائیں گے، مگر ثبوت فراہم نہیں کرسکیں گے ان شاء اللہ۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ حکایت ہے قرآن کے کسی لفظ کا معنی نہیں ہے کہ مفسرین کے اقوال حجت ہوں، الغرض یہاں نقل معتبر کی ضرورت ہے، چنانچہ خود مفتی صاحب فرماتے ہیں

اب تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد تفسیر قرآن بالاحادیث، کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر نہایت ہی اعلیٰ، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ اور خلفائے راشدین کی تفسیر، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر۔ جاء الباطل ص ۱۱ ج ۱۔

ثالثاً۔ قرآن سے فقط یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالی نے ان کیلئے طالوت کی بادشاہی کیلئے ایک صندوق بطور نشانی مقرر کیا جس میں آل موسیٰ و ہارون علیہ السلام کا ترکہ تھا، چنانچہ مجدد ملت بریلویہ مولوی احمد رضا خاں ان آیات کا معنی کرتے ہیں۔

اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کو چین ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں معزز موسیٰ اور معزز ھارون علیہ السلام کے ترکہ کی اٹھائے لائیں گے اسے فرشتے، بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے ہو، کنز الایمان ص ۶۰، طبع محمود اینڈ کمپنی بمبئی۔

اب دیکھئے اس میں صندوق کے آنے اور اس کو طالوت کی بادشاہی کی نشانی تو قرآن نے قرار دیا ہے لیکن اس سے اگلے مضمون سے قرآن خاموش ہے، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ اس سے مصائب ولڑائی کے وقت امداد طلب کرتے تھے، صریحاً قرآن پر افترا ہے۔

پھر اس طلب امداد سے اولیاء کرام کے تبرکات کی تعظیم ثابت کرنا اور بال ولباس کو اس میں

شامل کرنا، پہلے سے بھی بڑھکر جھوٹ اور قرآن پر بہتان ہے۔

کاش مبتدعین قرآن میں ھیرا پھیری کے رویہ کو ترک کر کے حسب ذیل آیت کی وعید شدید کو نگاہ میں رکھیں

فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا لیضل الناس بغیر علم ان اللہ لا یھدی القو الظلمین. الانعام آیت ۱۴۴ .

تو اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے تا کہ از راہ بے دانشی لوگوں کو گمراہ کرے کچھ شک نہیں کہ خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔(۶-۱۴۴)

فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا او کذب بایٰتہ. (الاعراف آیت ۳۷)

تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ (۷-۳۷)

فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا او کذب بایٰتہ انہ لا یفلح المجرمون. (یونس ۱۷)

تو اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے اور اس کی آیتوں کو جھٹلائے بے شک (ایسے) مجرم فلاح نہ پائیں گے۔ (۱۰-۱۷)

اس مضمون کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے، الکھف آیت ۱۵، الانعام آیت ۳۹و ۲۱، ھود آیت ۱۸، العنکبوت آیت ۶۸، اور سورۃ الصف آیت ۷، وغیرہ میں بھی بیان فرمایا ہے، لیکن ان آیات بینات کے باوجود مفتی صاحب ایسے دلیر و جری واقع ہوئے کہ وہ رطب و یابس تفاسیر کے اقوال کو بھی حکم قرآنی اوز فرمان الٰہی کہنے میں کوئی عار اور ننگ محسوس نہیں کرتے تھے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھنے سے ہی عاری تھے، ورنہ مسلمان کی شان سے ہی ان کا صدور بعید ہے۔

رابعاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ واقعی بنی اسرائیل ایسا ہی کرتے تھے جیسا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں، تو تب بھی قوم یہود کا کوئی فعل ہم پر حجت نہیں کیونکہ یہ پہلی شرائع کا مسئلہ ہے، اور شریعت محمدیہ میں ایسا ثابت نہیں۔

اس اصول کا مبتدعین کو بھی اعتراف ہے، مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی فرماتے ہیں کہ

یہ شریعت سابقہ ہے ہم پر حجت نہیں، تبیان القرآن ص ۱۴۷ ج ۲ بعض لوگ عورت کی سربراہی کے جواز پر ملکہ بلقیس کے واقع سے استدلال کرتے ہیں، ان کو جواب دیتے ہوئے سعیدی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شریعت سابقہ ہے، ہم پر حجت نہیں ہے، تبیان القرآن ص ۶۵۸ ج ۲۔

خلط مبحث کی ایک اور مثال

فرماتے ہیں کہ تفسیر خازن مدارک وروح البیان وکبیر سورۃ یوسف پارہ ۱۲

زیر آیت، فلما ذهبوا به.

کہ جب یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کے ساتھ بھیجا تو ان کے گلے میں ابراھیم علیہ السلام کی قمیض تعویذ بنا کر ڈال دی تا کہ محفوظ رہیں۔ جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً تفاسیر میں یہ واقعہ، ویروی، کے الفاظ سے منقول ہے دیکھئے مدارک ص ۳۵۷ ج ۲، و کشاف ص ۴۵۰ ج ۲۔

اس حکایت کو بیان کرنے والا کون ہے، کتب تفاسیر میں اس کا کوئی اتا پتا نہیں، اور اللہ تعالی نے ہمیں مجھول لوگوں سے دین لینے کا مکلّف نہیں ٹھہرایا، بات اگر قرآن اور حدیث صحیحہ سے ثابت ہوتی تو ہم ضرور قبول کر لیتے، مگر مذکورہ دلیل جو مفتی صاحب نے خصم کو حجت باور کرائی ہے وہ قرآن وحدیث تو کجا کسی صحابی و تابعی کا قول بھی نہیں بلکہ اسے بیان کرنے والا اور خبر دینے والا ہی غیر معلوم ہے تو ہم اسے عقیدہ کے معاملہ میں کیسے تسلیم وقبول کر لیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کی قمیض کو حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں تعویذ بنا کر ڈالی تھی جب کہ ہمارے پیارے اور محبوب رسول حضرت محمد مصطفی ﷺ نے تو فرمایا ہے کہ جس نے تعویذ لٹکایا اس نے (اللہ تعالی کے ساتھ) شرک کیا۔

حضرت عقبۃ بن عامر الجھنی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ اقبل إليه رهط فبايع تسعة و امسك عن واحد فقالوا، يا رسول الله ﷺ بايعت تسعة و تركت هذا؟ قال ان عليه تميمة فادخل يده فقطعها

فبايعه، وقال من علق تميمة فقد اشرک.

یعنی ایک وفد دس افراد پر مشتمل رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ علیہ السلام نے نو سے تو بیعت لے لی اور ایک کی بیعت سے ہاتھ روک لیا، تو ان (نو) نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے نو سے تو بیعت لے لی ہے اور اس شخص کو چھوڑ دیا ہے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا اس کی (گردن) پر تعویذ ہے، چنانچہ اس شخص نے اپنا ہاتھ (گریبان) میں داخل کیا اور تعویذ کو کاٹ کر (پھینک دیا) تو آپ نے بیعت لی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے تعویذ ڈالا اس نے شرک کیا۔

مسند امام احمد ص۱۵۶ ج۴، و مستدرک حاکم ص۲۱۹ ج۴، و اللفظ لہ۔

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اور مسند احمد کی روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد ص۱۰۶ ج۵۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ

عن عقبة بن عامر الجهني عن النبي ﷺ قال من تعلق تميمة فلا اتم الله عليه و من تعلق و دعة فلا ودع الله له.

جو شخص تعویذ لٹکاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کو پورا نہ کرے اور جو شخص سیپی (کاگڈ) لٹکائے اللہ اسے آرام نہ دے۔

مسند ابویعلی ص ۳۱۱ ج ۲، ومسنداحمدص ۱۵۴ ج ۴، و مستدرک حاکم ص ۴۱۷ ج ۴ و ص ۲۱۶ ج ۴، و بیهقی ص ۳۵۰ ج ۹، و ابن حبان (رقم الحديث ۶۰۵۴) و طبرانی کبیر ص ۲۹۷ ج ۱۷ (۸۲۰) و ابن عدی ص ۲۴۶۰ ج ۶.

اس صحیح حدیث کے بالمقابل مفتی صاحب کا ایک من گھڑت قصہ (جو افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا،) سے تعویذ کا اثبات کرنا، پھر تعویذ سے تبرکات کا استدلال کرنا شاید مبتدعین میں کوئی اہمیت رکھتا ہو، جو خیر سے انہیں جیسے خرافات کے مجموعہ کا نام بریلویت ہے، لیکن اہل علم میں ایسے بیانات پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

ثانیاً۔ اس مجہول اور بے سند قصہ کے کس لفظ کا معنی ہے کہ اولیاء کرام اور بزرگان دین کے

ہاتھ پاؤں چومنے چاہیئے اور ان کے لباس وغیرہ کو سنبھال کر رکھنا چاہیئے اور مصیبت و دکھ کے وقت ان سے امداد طلب کرنا چاہیئے، اگر یہ چیزیں ثابت ہی نہیں تو مبتدعین بریلویہ کی یہ دلیل کیسے بن گئی۔

ثالثاً۔ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ پہلی شرائع کا کوئی حکم وعمل بدون تائید شریعت محمدیہ علیہ التحیۃ والسلام قابل قبول نہیں۔ علاوہ ازیں بے سند واقعہ ناقابل حجت ہوتا ہے، جیسا کہ آگے اذان میں انگوٹھے چومنے کی بحث، میں علمائے بریلویہ کا اعتراف، کے زیر عنوان مبتدعین کے اکابرین کی ہم نے عبارات نقل کی ہیں۔

آب زم زم سے استدلال

فرماتے ہیں سارے پانی رب نے پیدا کیئے ہیں مگر آب زم زم کی تعظیم اس لئے ہے کہ یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قدم شریف سے پیدا ہوا۔ جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ تعظیم سے مفتی صاحب کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کا مقصود یہ ہے کہ اس سے حاجات کو طلب کیا جائے، اور مصیبت و دکھ کے وقت اس کو مشکل کشا جان کر میدان جنگ میں لایا جائے، تو اس تعظیم سے اسلام کا دامن صاف ہے، شاید فرقہ رضاخانی اس کا قائل ہو، اور اگر تعظیم سے مطلب یہ ہے کہ ایک نبی کا معجزہ جان کر اور بابرکت و پاکیزہ یقین کر کے استعمال کرنا چاہیئے تو اس پر الحمدللہ ہمارا عمل ہے۔

ثانیاً۔ معلوم نہیں کہ اس سے تبرکات اولیاء کو کیا نسبت ہے، اور انکی قدم بوسی کو کیا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ آب زم زم تو ایک پینے کی چیز ہے، جب کہ اولیاء کرام کھانے پینے کی چیزیں نہیں کہ پانی پر انہیں قیاس کرلیا جائے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ آب زم زم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قدم شریف سے پیدا ہوا الخ، یہ عبارت فرقہ بریلویہ کے حکیم الامت مفتی اعظم اور مفسر قرآن وغیرہ کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آب زم زم جبرائیل علیہ

السلام نے اپنا پر یا پاؤں زمین پر مار کر نکالا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں

فاذا ھی بالملک عند موضع زم زم فبحث بعقبہ اوقال بجناحۃ الحدیث عن ابن عباس رضی اللہ عنہ،، بخاری شریف کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی. ص ۴۷۵ ج ۱.

رابعاً۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مفتی صاحب نے جبرائیل علیہ السلام کی بجائے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام جان بوجھ کر لکھ دیا ہو کیونکہ بقول مفتی صاحب انہوں نے بخاری کی شرح بھی تحریر کی ہے۔ جاء الباطل ص ۲۵۸ ج ۲۔

واضح رہے کہ شرح تحریر کرتے وقت اس حدیث کو بھی پڑھا ہوگا، جس کی شرح بھی کی ہوگی لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاؤں سے پانی کو جاری ہونے کا فرمارہے ہیں، بلکہ تفسیر میں تو فرماتے ہیں وہ (اسمٰعیل) روتے میں اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے ہیں جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہے، بہت خوش ہوئیں اور اس کے گرد مٹی جمع کر کے فرمانے لگی اے پانی ٹھہر ٹھہر، تفسیر نعیمی ص ۶۹۴ ج ۱۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب صحیح حدیث سے انکار کسی ذاتی عقیدہ کے اثبات کیلئے کر رہے ہیں اور وہ عقیدہ ہے انبیاء کرام کا، تصرف فی الامور، کا، اور یہ بھی کہ اسے آثار انبیاء کہہ کر اس کی تعظیم سے اولیاء کے تبرکات سے حصول برکت کا عقیدہ ثابت کیا جائے، مگر تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں ان کی ہیرا پھیریاں کون پلے باندھتا ہے۔

مقام ابراھیم علیہ السلام کو مصلیٰ بنانے سے استدلال

فرماتے ہیں، مقام ابراھیم پتھر کو حضرت براھیم علیہ السلام سے نسبت ہوئی تو اس کی عزت یہاں تک بڑھ گئی کہ رب تعالی نے فرمایا

واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ.

سب کے سر ادھر جھکا دیئے۔ جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ کسی جگہ کو عبادت کیلئے مخصوص کرنے سے تبرکات کو کیا نسبت ہے، کیونکہ عبادت تو رب تعالیٰ کی ہوتی ہے اور جگہ کی تعظیم بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہوتی ہے جیسے مسلمان قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کعبہ کی عبادت کرتے ہیں اسی طرح مقام ابراھیم پر نماز کو ادا کرنا اس کی عبادت و تعظیم نہیں بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہی عبادت و تعظیم ہے کیونکہ مقام ابراھیم تو ایک پتھر ہے اور مسلمان کسی پتھر کی عبادت نہیں کرتے۔

ثانیاً۔ اولیاء کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تبرکات کو تعظیم کیلئے چوما جاتا ہے اس لئے مقام ابراھیم پر اس کا قیاس درست نہیں۔

ثالثاً۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، بعض نے مواقف حج، بعض نے عرفات و مزدلفہ، بعض نے سارا حرم، بعض نے خانہ کعبہ مراد لیا ہے۔

دیکھئے تفسیر ابن کثیر ص ۱۶۸ ج ۱۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ مقام ابراھیم کو نماز کی جگہ بنائیں، تب یہ آیت اتری، بخاری ص ۶۴۴ ج ۲،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مقام ابراھیم کو جائے نماز بنانے کا حکم ربانی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی حجۃ الوداع میں طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراھیم کے پیچھے دو رکعت نماز نفل ادا فرمائے تھے۔ بخاری ص ۵۷ ج ۱، معلوم ہوا کہ یہاں دو رکعت نماز نوافل ادا کرنا سنت خیر الانام ﷺ ہیں، تفصیل کیلئے مرعاۃ ۹۰ ج ۹ دیکھئے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک تو یہ دو رکعت واجب ہیں، بہار شریعت ص ۱۷ حصہ ششم جلد اول، و مبسوط للسرخسی ص ۱۲ ج ۴ و البحرائق ص ۳۳۱ ج ۲ و فتاویٰ عالمگیری ص ۳۳۶ ج ۱، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مقام ابراھیم کے پاس دو رکعت نماز ادا کرنی حج کے افعال سے ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ مقام ابراھیم کے ساتھ ہی خاص ہے جیسا کہ حج میں طواف کیا جاتا ہے اور یہ بیت اللہ کے ساتھ ہی خاص ہے، کعبہ کے طواف پر کسی چیز کو قیاس کر کے اس کا طواف کرنا درست نہیں، ایسے ہی مقام ابراھیم پر کسی کو قیاس نہیں کر سکتے،

مکرر جلوت و خلوت میں غور کیجئے اور مفتی صاحب کی دلیل کو قرآن سے نکال کر دیکھئے کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۵ میں جہاں مقام ابراھیم کو جائے نماز بنانے کا حکم ہے اسی مقام پر ہی بیت اللہ کا طواف کرنے کا بھی حکم موجود ہے، اگر مقام ابراھیم پر مفتی صاحب کا قیاس درست تسلیم کرلیا جائے، تو لازم آئے گا کہ تمام مساجد بلکہ قبور اولیاء کا بھی طواف کرلیا جائے، حالانکہ مبتدعین بھی یہ بات تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ طواف کعبہ، بیت اللہ سے خاص ہے، اسی طرح مقام ابراھیم کا معاملہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قسم سے استدلال

فرماتے ہیں۔ مکہ معظّمہ کو حضور علیہ السلام سے نسبت ہوئی تو رب تعالیٰ نے اس کی قسم فرمائی

لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد.

نیز فرمایا، **وھذا البلد الامین**، جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قسم کو اولیاء کرام کے تبرکات سے کیا نسبت ہے؟ ذرا اس کی وضاحت تو کیجئے۔

ثانیاً۔ اگر یہ قسم مکہ کی تعظیم کیلئے ہے تو آگے ہی تمام بنی آدم کی قسم کھائی ہے

و والد وما ولد (البلد آیت ۳)

یعنی قسم ہے تیرے والد (آدم) اور اس کی اولاد کی (۹۰-۳)

ثالثاً۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے فعل سے بنی آدم کا فعل ثابت کرنے کی فضول کوشش کی ہے، کیونکہ وہ تو مختار کل ہے، جو چاہے کرلے، اسے کون پوچھنے والا ہے، لا یسئل وھم یسئلون۔ جب کہ انسان شریعت کا مکلّف و پابند ہے، لہذا بندوں کے فعل کیلئے اللہ تعالیٰ کے فعل سے اثبات کرنا غلط ہے، دیکھئے اسی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی قسم کھائی ہے، حالانکہ انسان کی قسم اٹھانے کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال اَلا ان اللہ ینھا کم ان تحلفوا بأبائکم من کان حالفا

فليحلف بالله او ليصمت.

بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آگاہ رہو اللہ تعالی نے اس چیز سے منع فرمایا ہے کہ تم اپنے آباء کی قسمیں اٹھاؤ اور جو شخص تم میں سے قسم اٹھانے والا ہو تو وہ اللہ تعالی کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔ بخاری ص ۹۸۳ ج ۲ و مسلم ص ۴۶ ج ۲ و مشکوٰۃ ص ۲۹۶۔

اب اگر کوئی مجنون یہ کہہ دے کہ چونکہ خود اللہ تعالی نے ہمارے آباء کی قسمیں اٹھائی ہیں تو ہمیں اٹھانے میں کیا مذائقہ ہے، تو ایسے مدعی کو ہر صاحب علم پاگل کہے گا، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم سے اولیاء کرام کے تبرکات کو چومنے کا استدلال غلط ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال

فرماتے ہیں۔ ایوب علیہ السلام سے فرمایا

ارکض برجلک هذا مغتسل بارد و شراب.

ایوب علیہ السلام کے پاؤں سے جو پانی پیدا ہوا وہ شفا بنا معلوم ہوا کہ نبی کے پاؤں کا دھون عظمت والا اور شفا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۷۰ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ بات کو آگے لے جانے سے قبل آیئے پہلے قرآن سے اس آیت کو ملاحظہ کریں، رب قدیر فرماتا ہے

واذ کر عبدنا ایوب اذنادیٰ ربه انی مسنی الشیطن بنصب و عذاب. ارکض برجلک هذا مغتسل باردو شراب. (صٓ آیت ۴۱ و ۴۲)

اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ (بار الہٰا) شیطان نے مجھ کو ایذا اور تکلیف دے رکھی ہے (ہم نے کہا کہ زمین پر) لات مارو (دیکھو) یہ (چشمہ نکل آیا) نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو (شیریں) (۳۸-۴۱-۴۲)

معلوم ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو بیماری نے گھیر رکھا تھا جس پر انہوں نے اپنے مولیٰ حقیقی سے دعا و التجا کی کہ میرا یہ دکھ اور تکلیف دور کر دے تب مولیٰ کریم جو رحیم و حلیم ہے کی طرف

سے یہ حکم ملا اپنی لات کوزمین پر مار، تب زمین سے چشمہ پھوٹ پڑا جس میں غسل کرنے سے آپ کی ساری بیماری جاتی رہی، اب ایمان سے کہنا کہ اس بات کو مبتدعین کے عمل ہاتھ و پاؤں چومنے کا جواز کیسے ثابت ہوگیا۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ نبی کے پاؤں کا دھوون عظمت والا شفا ہے الخ، اس آیت سے ان کا استدلال غلط ہے کیونکہ وہ پانی پاؤں کا دھون بنا ہی نہیں تھا، بلکہ فقط پیر مارنے سے، چشمہ ابل پڑا تھا۔

ثالثاً۔ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کا معجزہ تھا اور معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تبارک وتعالی کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے جسکی پوری تفصیل شرح و بست کے ساتھ دین الحق میں عقائد کے حصہ میں راقم نے کردی ہے، لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کا تو نام لیکر رب قدیر نے شفا کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَیوب اذنادیٰ ربه انی مسنی الضر وانت اَرْحَمُ الرّٰحمین فاستجبنا له فکشفنا ما به من ضر و اٰتینٰه اهله و مثلهم معهم رحمة من عند نا و ذکریٰ للعٰبدین. الانبیاء ۸۳و۸۴.

اور ایوب کا ذکر بھی سناؤ جب اس نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں سخت مصیبت میں ہوں اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے پس اس کی دعا کو ہم نے قبول کیا اور جو اس کو تکلیف تھی سب دور کردی اور اس کو اس کا عیال دیا اور محض اپنی مہربانی سے اور عابد لوگوں کو نصیحت کیلئے ان کے ساتھ اور بھی دیا۔ (ثنائی) ۲۱-۸۳و۸۴)

دیکھئے اس آیت کریم میں صحت اور مال و اولاد و کی فراوانی کو اللہ تعالی نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، مگر مفتی صاحب اس بیان پر عدم اعتماد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کے پاؤں کا دھوون (وہ پانی جس میں کوئی چیز دھوئی گئی ہو) عظمت والا اور شفا ہے۔

اس بیان سے وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسے پانی سے شفا ملی تھی جس میں انہوں نے اپنے پاؤں کو دھویا تھا، اس بیان کو وہ بنیاد بنا کر عوام کو پیر پرستی کا درس دے رہے ہیں کہ ان لوگوں کے تبرکات سے شفا حاصل کرو، انا اللہ و انا الیہ راجعون۔ مگر کوئی پوچھنے والا



نہیں کہ حضرت جی اگر ایوب علیہ السلام کے اختیار میں شفا اور پاؤں کے دھوون میں بیماری کا علاج تھا تو بار بار اپنے رب سے دعا و التجا کی ضرورت پیش کیوں آئی؟

افسوس تو اس بات کا ہے کہ مبتدعین کے اکابرین اپنے دینی حلقہ میں سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں، یہ جو بیان بھی جاری کریں اسے عوام آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

رابعاً۔ بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ پاؤں کے دھوون سے ہی شفا ہوئی تھی، تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ شفا اللہ نے نہیں دی بلکہ پاؤں کے دھوون سے ہوئی تھی، ہر روز لوگ حکیموں سے دوا لیتے ہیں، تو کیا شفا دوا دیتی ہے، یا من جانب باللہ ہوتی ہے، یقیناً من جانب باللہ ہوتی ہے کیونکہ دوا میں شفا ڈالنے والا مالک حقیقی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب دوا مریض کے مرض کو پہنچ جاتی ہے، تو اللہ کے حکم سے مریض اچھا ہوتا ہے، صحیح مسلم ص۲۲۵ ج۲ و مشکوٰۃ ص۳۸۷۔

باب عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنے کی بحث

اسلام ایک مکمل و اکمل دین ہے جس نے انسان کو ہر بات کی تمیز اور سلیقہ سکھایا ہے، اولاد کے نام رکھنے اور ان کے معنی ومفہوم کوملحوظ رکھنا بھی اسلام نے سکھلایا ہے، کہ اللہ تعالی کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن وغیرہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ ان احب اسمائكم الى الله عبدالله و عبدالرحمن .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالی کے ہاں تمہارے ناموں سے سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔

صحیح مسلم ص۲۰۶ ج۲، وابو داؤد مع عون ص۴۴۳ ج۴، و ترمذی مع تحفه ص۲۸ ج۴، و ابن ماجه ص۲۷۳، و دارمی ص ۳۸۰ ج ۲، و مسند احمد ص۱۲۸ ج۲، و بیهقی ص۳۰۶ ج۹، و مستدرک حاکم ص۲۷۴ ج۴.

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن اسماء میں عبد کا لفظ اللہ تعالی کی طرف مضاف ہو وہ اللہ تبارک وتعالی کومحبوب اور تمام ناموں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں

يلحق بهذين الا سمين ماكان مثلهما كعبد الرحيم و عبدالملک و عبدالصمد.

یعنی ان دونوں ناموں میں ان کی مثل، عبدالرحیم، عبدالملک اور عبدالصمد وغیرہ بھی شامل ہیں۔

بحواله تحفة الاحوذی ص۲۹ ج۴۔

عبد کے لفظ کی خالق کائنات کی طرف اضافت میں چونکہ یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ انتہائی عاجزی، تذلل، خضوع، توحید پرستی اور دنیا سے اپنے آپ کو روک کر اللہ کا ہی ہوجانا، کہ اس سے مفارقت اختیار نہ کی جائے، چنانچہ لغت عرب کی امہات الکتب میں اس کا یہی معنی لکھا ہے، علامہ راغب فرماتے ہیں

عبد، العبودية اظهار التذلل، والعبادة ابلغ منها لانها غاية التذلل ولا يستحقها الامن له غاية الا فضال وهو الله تعالى.

یعنی عبد اور عبودیت تذلل و عاجزی کے اظہار کو کہتے ہیں، اور عبادت کا لفظ عبد سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنی انتہائی عاجزی کرنے کے ہیں، اور اسکا کوئی مستحق نہیں مگر وہی جس کے انعام و اکرام بہت زیادہ ہوں، اور ایسی ذات فقط اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ المفردات فی غریب القرآن ص۳۱۹۔

علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی فرماتے ہیں

وقال بعض ائمة الاشتقاق اصل العبوية الذل و الخضوع و قال آخرون العبودة الرضا بما يفعل الرّب و العباد فعل ما يرضى به الرب والا ول اقوى واشق.

یعنی علم اشتقاق کے بعض آئمہ نے کہا ہے عبودیت کے اصل معنی عاجزی اور خضوع کے ہیں، اور بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قضا کے ساتھ راضی رہنے کو عبودیت کہتے ہیں اور عبادت وہ فعل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ راضی رہتا ہے لیکن پہلے معنی زیادہ قوی ہیں۔ تاج العروس ص۴۱۰ ج۲۔

گو اس کے دوسرے معانی بھی موجود ہیں مثلاً کسی چیز کا بھی غلام بن جانا، جیسے عبدالدرھم، اور عبدالدینار، بمعنی مال و دولت کا غلام یا پرستار یا عبدالطاغوت وغیرہ اور عبد بمعنی کسی شخص کا غلام بھی ہے، (ضدحر) خواہ یہ زرخرید ہو یا ورثہ میں ملا ہو یا غنیمت میں ہاتھ لگا ہو۔

الغرض لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے جس کے متعدد معانی ہیں لیکن نام اور تسمیہ کے موقع و محل پر یہ لفظ عبادت کے معنی میں ہی مستعمل ہوتا ہے، لغت عرب کے مسلم امام علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں

و يقال فلان عبد بين العبودة والعبوديه و العبدية، و اصل العبودية الخضوع والتذلل و فى حديث ابى هريرة رضى الله عنه لايقل احد كم لمملوكه عبدى و امتى و ليقل فتاى و فتاتى، هذا على نفى الا ستكبار عليهم و ان ينسب عبديتهم اليه فان المستحق لذلك الله تعالى هو رب العباد كلهم و العبيد.

اور کہا جاتا ہے فلاں عبد، ہے (تو اس کہنے سے اس شخص کی) عبودۃ واضح ہوگی، اور عبودیت

کا معنی ہے عاجزی وخضوع، اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے غلام کو میرا عبد میری لونڈی نہ کہے بلکہ میرا چھوکرا میری چھوکری کہے، یہ نفی ان (غلاموں) پر تکبر کی وجہ سے کی گئی ہے کیونکہ وہ ان کی عبدیت کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اس چیز کا مستحق فقط اللہ تبارک وتعالی ہے کیونکہ وہ عباد (بندوں) کا رب ہے اور تمام لوگ اس کے عبید (بندے) ہیں۔

لسان العرب ص۲۷۱ ج۳۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ قال لا يقولن احد كم عبدي و امتي كلكم عبيدالله و كل نسائكم اماء الله و لكن ليقل غلامي و جاريتي و فتاي و فتاتي.

یعنی بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ عبدی (میرا بندہ) یا امتی (میری لونڈی) کیونکہ تم سب اللہ کے بندے اور تمھاری عورتیں اللہ تعالی کی لونڈیاں ہیں، بلکہ کہے میرا غلام میری چھوکری۔

صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں

قال رسول الله ﷺ لايقولن احد كم عبدي فكلكم عبيدالله و لكن ليقل فتاي ولا يقل العبد ربي و لكن ليقل سيدي.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی (میرا بندہ) کیونکہ تم سب اللہ تعالی کے بندئے ہو، بلکہ کہے میرا غلام اور نہ غلام کہے میرا رب بلکہ سردار کہے۔ صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ایک حدیث میں اس سے بھی قدرے وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں

لايقل احدكم اسق ربك اطعم ربك وضئ ربك و قال لايقل احد كم ربي و ليقل سيدي و مولاي ولا يقل احد كم عبدي و امتي و ليقل فتاي و فتاتي غلامي.

کوئی تم میں سے (غلام کو) یوں نہ کہے اپنے رب کو پانی پلا، اپنے رب کو کھانا کھلا، اپنے رب

کو وضو کرا، اور کوئی تم میں سے کسی کو اپنا رب نہ کہے بلکہ سید یا مولیٰ کہے اور کوئی تم میں سے میرا بندہ (عبدی) میری بندی نہ کہے بلکہ میرا جوان اور میری جوان عورت، میرا غلام (یہ الفاظ) کہے، صحیح مسلم ص ۲۳۸ ج ۲۔

ان احادیث مبارکہ کو مکرر پڑھئے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں بلکہ اپنی تفسیر آپ ہیں کہ کوئی اپنے غلام کو عبدی نہ کہے کیونکہ وہ (غلام) اس کا عبد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عبد ہے لہذا عبد کی اضافت اس کی طرف ہی کرنی چاہئے جس کا وہ عبد ہے اسی طرح غلام کو بھی رسول اللہ ﷺ یہ تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے آقا کو رب نہ کہے کیونکہ اس کا آقا اس کا رب نہیں بلکہ اس کا رب خالق ارض و سماء ہے، اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے علماء کرام نے صراحت کی ہے کہ لفظ عبد کو بندہ کی طرف مضاف کر کے نام رکھنا ایہام شرک سے ہے، چنانچہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی فرماتے ہیں۔

و منها انهم كانوا يسمون ابناء هم عبدالعزیٰ و عبد شمس و نحو ذلک .... فهذہٖ اشباح و قوالب للشرک نهی الشارع عنها لکونها قوالب له والله اعلم.

یعنی اقسام شرک میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے اسماء عبدالعزی اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے، تو یہ اسماء شرک کے قالب اور اس کے سانچے ہیں اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان ناموں سے منع فرمایا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۳ ج ۱۔

علامہ ابن حجر مکی (جن کی عبارات کو چن چن کر مفتی جی نے، جاء الباطل، جیسی بے کار تالیف تصنیف کی ہے) لکھتے ہیں۔

و يحرم ملک الاملاک لان ذلک ليس لغير الله و كذا عبدالنبی و عبدالكعبة اوالدار اوعلی اولحسن لايهام الشريک.

یعنی کسی کا نام شہنشاہ رکھنا حرام ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کیلئے (جائز نہیں) اور اس طرح، عبدالنبی، عبدالکعبہ، عبدالدار، (اور حضرت علی مرتضیٰ کی طرف نسبت کر کے) عبدالعلی، اور

عبدالحسن نام بھی درست نہیں کیونکہ ان میں ایہام شرک ہے، شرح منہاج بحوالہ مجموعۃ الفتاوٰی ص۲۵۳ ج۳۔

ملاعلی القاری حنفی فرماتے ہیں

واما ما اشتهر من التسمية بعبد النبی فظاهره كفر الا ان اراد بالعبد المملوک.

یعنی عبدالنبی نام جو مشہور ہے تو اس کا ظاہر کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مراد غلام ہو تو پھر کفر نہ ہوگا، شرح فقہ اکبر ص۲۳۸۔ طبع مجتبائی و ص۱۹۳ طبع کراچی۔

اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ مملوک مراد ہو تو تب جائز ہے بلکہ یہ ہے کہ بہر حال ناجائز پھر بھی ہے، چنانچہ خود ملاعلی القاری فرماتے ہیں

ولا یجوز نحو عبدالحارث ولا عبدالنبی ولا عبرة بما شاع فیما بین الناس.

یعنی عبدالحارث اور عبدالنبی نام رکھنا جائز نہیں، اور عوام میں ان ناموں کے رواج کا کوئی اعتبار نہیں، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۱۰۶ ج۹ طبع ملتان۔

اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی نے اپنے فتاوی اور تفسیر میں اور مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے اپنے مجموعہ فتاوی ص۲۵۲ ج۳ میں اسے ایہام شرک سے قرار دیا ہے۔

حضرت سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دھلویؒ فرماتے ہیں

فی الواقع این چنین تسمیة غیر مشروع است بنا بر آن مولانا شاہ عبدالعزیزؒ این را از جملہ شرک در غیر عبادت تحت این آیت کریم، فلا تجعلوا للہ انداد، نوشتہ اندعبارتہ ھکزا، اما ھمسر کنند گان در غیر عبادت پس بسیار انداز انجملہ کسانے کہ درذکر دیگراں راباخدا ھمسرمی کنند و نام دیگران رابانام خدا بطریق تقرب ذکر می نمائید و ازان جملہ اند کسانے کہ در نام نھادن خود رابندہ فلاں و عبد فلان می گویند و این شرک در تسمیہ است، انتھی کلامہ مختصر، بس از تقریر شاہ صاحب مغفور و مبرور تسمیہ ابن حنیں اسماء غیر

شروع شد و ارتکاب غیر مشروع منھی عنه است پس ازین احترازھر ضرور است که توھم شرکت نباید. واللہ اعلم بالصواب.

فتاوی نذیریه ص ۴۳۲ ج ۳.

حضرت مولانا محمد بشیر الدین محدث سہسوانی فرماتے ہیں۔

اگر از تسمیه بعبد النبی و عبدالرسول عبدیت حقیقة مراد دارد لاریب شرک و کفر است کما ھو الظاھر والا کفر نیست لیکن خالی از جرم ھم نیست بجھت ایھام شرک پس تبدیل ھم چون اسماء مذکورہ الزم و واجب است ملا علی قاری در مرقاۃ شرح مشکوٰۃ نوشته، ولا یجوذ نحو عبدالحارث ولا عبدالنبی ولا غیرہ مما شاع فیما بین الناس، انتھی، و ابن حجر مکی در تحفه نوشته، و یحرم ملک الملوک لان ذلک لیس لغیراللہ تعالی و کزا عبدالنبی و الکعبة او الدار، اوعلی او الحسنین، لایھام التشریک، انتھی، وھم چنین در شرعة الاسلام و شرح آن و کتب دیگر مرقوم است کمالا یخفی علی الناظر فقط کتبه عبده المسکین محمد بشیرالدین العثمانی نسباً والقنوجی وطناً. بحوالہ فتاوٰی نذیریه ص ۴۳۵ ج ۳.

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں، ان تمام حدیث میں ان ناموں سے جوممانعت ہے کراہت تنزیہی کی بنا پر ہے ورنہ قرآن و حدیث بلکہ خود احادیث میں سخت تعارض ہوگا، دیکھو رب خدا کا بھی نام ہے اورقرآن کریم میں بندوں کوبھی رب فرماتا ہے

کما ربیانی صغیرا، فارجع الیٰ ربک.

اگرکوئی شخص کسی کو اپنا مربی یا رب کہے تو مشرک نہ ہوگا، ہاں اس سے بچے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ نام رکھنا واجب نہیں لیکن اگر اس زمانہ میں دیو بندیوں وہابیوں کو چڑانے کیلئے یہ نام رکھے تو بہت باعث ثواب ہے جیسے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی۔ جاء الباطل ص ۳۸۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول کرنے کیلئے دلیل شرعی کی ضرورت تھی جو خیر سے مفتی صاحب نے درج نہیں کی، اگر درج کرتے تو ہم بفضلہٖ تعالیٰ اس کا بخوبی تجزیہ کرتے۔

ثانیاً۔ اسے مکروہ تنزیہی تسلیم کرنے کی کئی شرعی خرابیاں ہیں، مثلاً اس حدیث میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو رب وغیرہ نہ کہے تو کیا یہ بھی مکروہ تنزیہی ہی ہے، اور کیا علماء بریلویہ نے اپنی تربیت کرنے والے کو بھی کبھی لغوی طور پر رب کہا ہے؟ یا کسی تقریر وتحریر میں اپنے استاذ کی طرف اشارہ کر کے اسے اپنا رب قرار دیا ہے، مبتدعین میں سے جاہل سے جاہل نے بھی آج تک ایسا نہیں کیا کہ وہ تحریر میں اپنے علماء کے اقوال کو یوں نقل کرتا ہو کہ میرا رب مولانا احمد رضا خاں یہ کہتا ہے، یا ہمارے رب مفتی احمد یار خاں نے یہ لکھا ہے، یا مفتی احمد یار کے رب مولوی نعیم الدین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے۔

اگر مبتدعین نے عبدالنبی کی طرح بندوں کو رب کہنے کا جماعتی سطح پر اہتمام نہیں کیا! تو ثابت ہوا کہ حدیث کے ان الفاظ کو بریلویہ بھی مکروہ تنزیہی تسلیم نہیں کرتے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے عبدالنبی کے جواز کی بھی نرالی دلیل عنایت فرمائی ہے کہ چونکہ وہابیوں کو چڑانا مقصود ہے، لہٰذا ان اسماء کا رکھنا بھی باعث ثواب ہے، اے جی آپ کے عمل سے ہمیں کیا چڑ ہے آپ خواہ جو چاہیں کریں، ہمیں آپ کے متعلق پوچھ گچھ ہی نہ ہوگی، ارشاد ہوتا ہے

فذکر انما انت مذکر☆ لست علیھم بمصیطر ☆ الا من تولیٰ و کفر ☆ فیعذبه الله العذاب الاکبر ☆ ان الینا ایابھم ☆ ثم ان علینا حسابھم☆ الغاشیة ۲۱ تا ۲۶.

تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑا عذاب دے گا، بے شک انکو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے پھر ہم ہی کو ان سے حساب لینا ہے۔ (۸۸-۲۱ تا ۲۶)

اس لئے بھائی ہمیں آپ کے کسی قول وفعل سے چڑ نہیں، آپ شرک کریں یا اکبر الاکبائر کا ارتکاب کریں، ہاں ہم درد دل سے آپ کو نصیت ضرور کریں گے۔

رابعاً۔ کیا مکروہ تنزیہی بھی کسی گروہ و جماعت کو چڑانے کیلئے باعث ثواب بن جایا کرتی ہے، اصول فقہ کی کس کتاب میں ایسا لکھا ہے، کاش مفتی صاحب نے قرآن کو ہی بخوبی سمجھا ہوتا تو ایسی بات قطعاً نہ کہتے، رب قدیر فرماتے ہیں

ولا یجر منکم شنأن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا. (المائدة آیت ۲)

اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تم کو عزت والی مسجد سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔(۵-۲)

دیکھئے کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی کی عداوت تمہیں زیادتی پر آمادہ نہ کردے، **مگر** مفتی صاحب عداوت کی آڑ میں ایک فعل شنیع (اور بقول مفتی صاحب مکروہ تنزیہی) کو کارثواب قرار دیتے ہیں۔

خامساً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر کوئی کسی کو اپنا رب کہے تو مشرک نہ ہوگا، تو ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ رب کے معنی ہیں کسی کو پرورش کرکے بتدریج حد کمال تک پہنچانا اور اس کی پوری ضرورتوں کا خیال رکھنا، المفردات القرآن ص۱۸۴، یہ لفظ عموماً بطور اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے۔

الحمد لله رب العلمین ۔ سب تعریفیں اللہ کے لیئے ہیں جو سب جہان والوں کا پرورش کرنے والا ہے، (ثنائی ۱-۲)

ربوبیت کی صفت اللہ ہی کو سزا وار ہے اور، الرب، صرف اللہ تعالی ہی ہے، تاہم لفظ رب کی نسبت آقا اور مالک کی طرف بھی ہوسکتی ہے (اور اس صورت میں اس کا مصدر ربوبیة نہیں بلکہ ربابیت آئے گا، مفردات ص۱۸۴) لیکن ان معنوں میں لفظ رب کے استعمال کو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ اپنے آقا و مالک کو رب کہا جائے جیسا کہ پہلے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے فرمان نبوی گزر چکا ہے۔ امت مرحومہ نے اس کا حقیقی و اصلی معنی ہی ملحوظ رکھا ہے اور کوئی بھی اپنے والدین کو رب کے نام سے موسوم نہیں کرتا اور نہ ہی تربیب کرنے کو رب کہتا ہے، افسوس کہ مفتی صاحب نے عبدالنبی کو ثابت کرنے کیلئے غیر اللہ کو رب کہنے کا فتوی بھی صادر کردیا ہے پھر اس عیاری سے بیان کیا ہے کہ کمال ہی کر دیا کہ مشرک نہ ہوگا، انا للہ وانا الیہ راجعون، حالانکہ اس کے ایہام شرک ہونے سے کوئی بھی منکر نہیں یہ فقط مفتی صاحب کی ہی ایجاد ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء بریلویہ

اگر کوئی شخص اپنے مالک و آقا کو رب کہے یا والدین کو رب کہے اور اس سے مراد لغوی طور پر وہی معنی لے جو مفتی صاحب نے بیان کیا ہے، اور اس کو عام طور پر استعمال کرے اور اپنے کو اس طرح مخاطب کرے کہ میں نے اپنے رب کو پانی پلایا کھانا کھلایا ان کا بستر بچھایا وغیرہ اور ان افعال سے اس کا مقصود اہل حدیث کو چڑانا ہو، تو ایسا شخص خطا کار اور گناہ گار ہے یا مصیب و ثواب کار ہے، بینو وتو جروا۔

اگر آپ حضرات کا جواب نفی میں ہے تو اس کی بھی صراحت کیجئے گا کہ ایک ہی حدیث میں آقا کو رب کہنے اور غلام کو عبد کہنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ آپ نے آدھی کو تو قبول کر لیا اور آدھی سے انکار کر دیا ہے، وجہ فرق بیان کریں جو واضح اور بین ہو۔

اگر آپ حضرات عبدالنبی کی طرح آقا و مالک کو بھی رب کہنے کا فتوی صادر کرتے ہیں تو اس کی بھی صراحت کیجئے کہ کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات میں عبدالنبی اور عبدالمصطفی وغیرہ نام پائے جاتے ہیں مگر آپ اپنے والدین کو رب نہیں کہتے اور نہ ہی تربیت کرنے والے کو رب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

لہذا مناسب ہے کہ آپ حضرات آئندہ کیلئے اپنے علماء کو بمعنی مربی رب کہا کریں اور جلسہ و جلوس اور جشن میلاد میں اسٹیج وغیرہ پر اعلان کیا کریں کہ اب ہمارے فلاں رب صاحب خطاب کریں گے، یا مولوی احمد رضا خاں کی برسی پر ہی کوئی اشتہار وغیرہ شائع کر دیا کریں کہ ہمارے رب کی فلاں مقام پر برسی ہونے والی ہے، آخر اس میں مضایقہ ہی کیا ہے، اگر لغوی معنی مراد لیکر ایسا کیا جائے، انما الاعمال بالنیات، بھی تو آخر فرمان مصطفوی ہے، لیکن یقین جانئے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس سے انکار ہی کریں گے اور قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہ ہونگے، کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے بہانے اور طفل تسلیاں ہیں۔

بس جناب یہی کچھ ہم عبدالنبی وغیرہ کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام عذر لنگ ہیں اور عذر گناہ بدتر از گناہ ہیں۔

مفتی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ، قرآن کریم فرماتا ہے

وانکحوا الایامیٰ منکم و الصلحین من عبادکم و امائکم.

اور نکاح کرو اپنوں میں ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق بندوں اور کنیزوں کا۔

وجہ استدلال میں فرماتے ہیں

اس عبارت میں، عباد، کو، کم، کی طرف مضاف کیا گیا ہے یعنی تمہارے بندے، جاء الباطل ص۳۷۹ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ آیت میں، عبادکم، سے مراد اپنے بندوں، نہیں بلکہ، اپنے غلام، معنی ہے چنانچہ، مفسرین نے اس کا یہی معنی بیان کیا ہے۔

اردو میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کا ترجمہ مستند شمار کیا جاتا ہے اور انہوں نے اس کا یہی معنی کیا ہے، مولوی احمد رضا خاں کے علاوہ جملہ اردو تراجم میں اس کا معنی، غلام، کیا گیا ہے، موجودہ دور کے بریلویت کے مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب بھیروی نے بھی اس کا معنی، غلاموں، ہی کیا ہے۔ ضیاء القرآن ص۳۲۰ ج۳۔

لغت عرب کے بے نظیر ادیب اور لغت میں مسلمہ امام علامہ زمخشری نے، الکشاف ص۲۳۴ ج۳، میں علامہ نسفی نے، مدارک التنزیل ص۳۴۰ ج۳، میں، عبادکم، کا معنی، غلمانکم، کیا ہے، کسی تفسیر میں اس کا معنی عبیدکم، نہیں جو مفتی صاحب کر رہے ہیں، معلوم نہیں کہ مبتدعین نے حقائق کے برعکس چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

ثانیاً۔ بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی کتاب قرآن حمید میں سورۃ النور کی آیت ۳۲، میں کہہ رہا ہے کہ

اور اپنے میں سے بیوگان کی اور اپنے نیک چلن غلاموں اور لونڈیوں کی شادیاں کر دیا کرو، اگر وہ محتاج بھی ہوں تو خدا ان کو اپنے فضل سے غنی کردے گا اور اللہ بڑی فراخی والا اور جاننے والا ہے۔ (ثنائی) ۲۴-۳۲)

اب ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ اس حکم میں یہ کہاں حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی اولاد کا، عبدالمصطفیٰ، عبدالرسول، عبدالنبی، وغیرہ نام رکھنا اوراپنے کو نبی ﷺ کا بندہ کہنا، اگر یہ بات نہیں قطعاً نہیں تو پھر مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

ثالثاً۔ اختلاف اس میں نہیں کہ لفظ ،عبد، جب انسان کی طرف مضاف ہوتو اس کا معنی کیا ہے کیونکہ یہ تو مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے کہ جب غیراللہ کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔ جاء الباطل ص ۳۸۰ ج ۱۔ بلکہ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ، عبد، کا لفظ مخلوق کی طرف مضاف کر کے نام رکھنے جائز ہیں کہ نہیں؟ لیکن اس کی دلیل دینے کی بجائے آپ ثابت یہ کر رہے ہیں کہ فلاں جگہ پر عبد کا لفظ انسان کی طرف مضاف ہوا ہے اے جی کیا اس آیت میں بطور اسم مضاف ہوا ہے کہ آپ حجت باور کرا رہے ہیں۔

دوسری دلیل

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمة الله.

اے محبوب فرمادے کہ میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

وجہ استدلال میں فرماتے ہیں اس یاعبادی میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ رب فرماتا ہے کہ اے میرے بندو دوسرے یہ کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فرمادو اے میرے بندو، اس دوسری صورت میں عباد رسول اللہ مراد ہوئے، یعنی حضور علیہ السلام کے غلام اورامتی، دوسرے معنی کو بھی بہت سے بزرگان دین نے اختیار فرمایا ہے۔ جاء الباطل ص ۳۷۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس آیت میں کس لفظ کا معنی ہے کہ ،عبد، کومخلوق کی طرف مضاف کر کے نام رکھنا جائز ہے، یقین جانیئے یہ مفتی صاحب کی ذاتی اختراع ہے جسے قرآن نے قطعاً بیان نہیں کیا۔

ثانیاً۔قرآنی الفاظ کا مفہوم تو یہ ہے کہ

اے نبی! میرے بندوں کو میری طرف سے کہہ اے میرے (خدا کے) بندو! جنہوں نے مختلف قسم کے گناہوں کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کئے ہیں تم اللہ کی رحمت سے بے امید نہ ہونا اللہ تعالی تمام گناہ بخش دے گا۔(تفسیر ثنائی) لیکن مفتی صاحب اس حقیقت کو احتمال کا نام دے رہے ہیں اور دوسرے معنی کو اختیار کر کے فرماتے ہیں دوسری صورت میں عباد رسول اللہ مراد ہوئے یعنی حضور علیہ السلام کے غلام اور امتی، جاء الباطل ص۳۷۹، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حالانکہ یہ احتمال کسی معتبر تفسیر میں سرے سے موجود ہی نہیں، یہ فقط مبتدعین کی اختراع و ایجاد ہے ہم پوری دنیا کی رضا خانی ذریت کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ وہ کسی صحیح مرفوع حدیث یا صحابی و تابعی اور مستند مفسر سے اس کا ثبوت دیں ورنہ اس احتمال کی ایجاد پر اپنے بستر پر ہی شرمندگی وخفت سے سر جھکا لینا، اور لعنت اللہ علی الکاذبین، کی وعید شدید سے ڈر کر اپنی خرافات سے تائب ہو کر ،کونوا مع الصادقین، کی جماعت میں شامل ہو جانا کہ قیامت کے روز بارگاہ الٰہی میں سجدہ کا شرف حاصل ہوگا، ان شاء اللہ۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

عبادی کا معنی امتی کرنا سراسر تحریف اور ہے جس کا عربی کی کسی لغت کی کتاب میں وجود نہیں، یہ قرآن کریم کی معنوی تحریف کی بدترین مثال ہے۔ (محمد یحیٰی گوندلوی)

اب آیئے ذرا شان نزول کی روشنی میں دیکھئے کہ، عبادی، سے مراد اللہ تعالی کے بندے ہیں یا نبی ﷺ کے امتی وغلام، تو اس سوال کا جواب مبتدعین کو آنکھوں سے ضد کی پٹی اتار کر سننا چاہئے کہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

ان ناسا من اهل الشرک کانوا قد قتلوا واکثروا و زنوا و اکثروا فاتوا محمداً ﷺ فقالوا ان الذی تقول و تدعوا الیه لحسن لو تخبرنا ان لما عملنا کفارة فنزل ......قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، الحدیث. بخاری رقم الحدیث ۴۸۱۰)

مشرکین کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے جنہوں نے قتل کئے اور کثرت سے کئے، اور بدکاری کی تو کثرت سے کی، وہ کہنے لگے کہ جس دین کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اچھا ہے اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو گناہ ہم کر چکے ہیں وہ معاف ہو جائیں گے، (اسلام قبول کرنے کی وجہ

سے) اس پر، قل یاعبادی الذین، کی آیت نازل ہوئی۔ صحیح بخاری ص ۷۱۱ ج ۲، ومسلم ص ۷۶ ج ا۔

اس صحیح اور متفق علیہ حدیث سے ثابت ہوا کہ،عبادی، سے مشرکین مراد ہیں، اب ظاہر ہے کہ مشرکین تو آنحضرت ﷺ کے غلام و امتی نہیں تھے، پس ثابت ہوا کہ، عبادی، کا تعلق اللہ تعالی کی ذات بابرکات سے ہے۔

لیکن افسوس کہ اس صحیح وصریح حدیث کی موجودگی میں مفتی صاحب عبادی کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے جوڑ رہے ہیں، کاش بریلویت کے مفسر قرآن نے قرآن کو بھی پڑھا ہوتا،تو اس بات کو کہنے کی جرات نہ کرتا، چنانچہ آیات قرآنیہ کا سیاق وسباق کچھ اس طرح ہے

قل یعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمة الله ان الله یغفرالذنوب جمیعاً انه ھو الغفورالرحیم☆وانیبوا الی ربکم و اسلموا له من قبل ان یاتیکم العذاب ثم لاتنصرون☆واتبعوا احسن ماانزل الیکم من ربکم من قبل ان یاتیکم العذاب بغتةً و انتم لا تشعرون☆ ان تقول نفس یحسرتیٰ علی مافرطت فی جنب الله وان کنت لمن السٰخرین☆ اوتقول لو ان الله ھدٰنی لکنت من المتقین☆ اوتقول حین تری العذاب لوان لی کرة فاکون من المحسنین☆ بلیٰ قد جاء تک اٰیتی فکذبت بھاو استکبرت و کنت من الکفرین.(الزمر آیت ۵۳ تا ۵۹)

ترجمہ۔ (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پرزیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے(اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے، اوراس سے پہلے کہ تم پر عذاب آواقع ہو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار ہوجاؤ، پھرتم کو مدد نہیں ملے گی، اور اس سے پہلے کہ تم پر ناگہاں عذاب آجائے، اورتم کو خبر بھی نہ ہو اس نہایت اچھی کتاب کی جوتمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے پیروی کرو کہ (مبادا اس وقت) کوئی متنفس کہنے لگے کہ(ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی اور میں تو ہنسی ہی کرتا رہا یا یہ کہنے لگے کہ اگر خدا مجھ کو ھدایت دیتا تو میں بھی پرہیز گاروں میں ہوتا، یا جب عذاب دیکھ لے کہنے لگے کہ اگر مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہوتو میں نیکوکاروں میں ہوجاؤں گا، (خدا فرمائیگا) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں مگر تو نے ان کو جھٹلایا اور شیخی میں آگیا اور تو کافر بن گیا۔ (از ترجمہ مولوی فتح محمد حنفی) ۳۹-۵۳تا۵۹)۔

ان آیات بینات کو مکرر پڑھیئے، یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں، ان کا ماحاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی کوئی کل ہی سیدھی نہ تھی، کفر و شرک کے علاوہ فسق و فجور، ظلم و ستم، راہزنی و قزاقی، بدکاری و شراب خوری، سود خوری اور قتل اولاد وغیرہ سنگین خرابیوں میں بری طرح مبتلا تھے، وہ اپنی زندگی کے لائحہ عمل کو دیکھ کر اپنی اصلاح و نجات سے کلی طور پر ناامید ہو چکے تھے، اس مایوسی نے انہیں مزید گناہوں کے ارتکاب سے زندگی بسر کرنے کا عادی بنادیا تھا، انہیں دعوت فکر دی جارہی ہے کہ اب تم نے اپنے نفس پر ظلم و زیادتی کی حد کردی ہے اب بھی اگر تائب ہوکر رب قدیر کی ذات کے در رحمت پر آکر دستک دو گے تو اس کی رحمت تمہیں مایوس نہیں کرے گی اور تمہارے گزشتہ تمام جرائم کو معاف کردیا جائے گا اور اگر تم نے یہ موقع بھی ہاتھ سے گنوا دیا تو آنے والی زندگی میں اور آخرت کے روز تمہیں کوئی مددگار و حامی نہ ملے گا، اور تمہارے تمام عذرات کو یہ کہہ کر رد کردیا جائے کہ، و کنت من الکٰفرین، یعنی تو کافروں میں سے تھا، چنانچہ بریلویت کے معروف مفسر قرآن اور مفتی احمد یار خاں کے استاذ مکرم جناب مولوی نعیم الدین فاضل مراد آبادی نے مولوی احمد رضا خاں کے ترجمہ قرآن پر تفسیر بیان کرتے ہوئے ان آیات کا شان نزول مشرکین کو بتایا ہے۔ ص۶۷۲۔

پیر کرم شاہ صاحب جو دور حاضر میں بریلویت کے سرگرم وکیل اور ناصر ہیں نے اپنی تفسیر قرآن میں ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

اس آیت (قل یعبادی) طیبہ مبارکہ میں بھی ان لوگوں کو مزید نوید رحمت دی جارہی ہے جو عمر بھر اپنے اوپر زیادتیاں کرتے رہے جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے رہے جنہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو بالکل برباد کردیا ایسے لوگوں کو کہا جا رہا ہے کہ آؤ میری رحمت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے اگر تم سچے دل سے تائب ہو کر نئی اور پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دیئے جائیں گے، تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا۔ ضیاء القرآن ص۲۷۸ ج۴۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کا سیاق و سباق اور شان نزول یٰعبادی کا تعلق رب قدیر سے جوڑتا ہے نہ کہ نبی کریم ﷺ سے، الغرض اس آیت میں عبادی حضور علیہ السلام کی طرف سرے سے مضاف ہی نہیں کہ اس سے عبدالمصطفیٰ وغیرہ نام رکھنے کا ثبوت ہو۔

تیسری دلیل

الریاض النضرۃ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر خطبہ میں فرمایا

قد کنت مع رسول اللہ ﷺ فکنت عبدہ و خادمہ.

میں حضور علیہ السلام کے ساتھ تھا پس میں آپ کا بندہ اور خادم تھا۔

جاء الباطل ص ۳۷۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ معلوم نہیں کہ اس کی سند کیسی ہے صحیح ہے یا من گھڑت؟ لہذا مبتدعین پر واجب ہے کہ وہ اس کی صحیح و معتبر سند پیش کریں۔

ثانیاً۔ کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر یہ کہا ہے کہ میں نے اپنا نام عمر بدل کر عبدالرسول اور عبدالمصطفیٰ وغیرہ رکھ لیا ہے، یا ان اسماء کے رکھنے کی اجازت ہے؟ اگر نہیں یقیناً نہیں تو پھر یہ مبتدعین بریلویہ کی دلیل کیسے بن گئی؟ کیونکہ اختلاف تو لفظ عبد کو اسماء میں مخلوق کی طرف مضاف کرنے کا ہے نہ کہ اس لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کر کے حضور علیہ السلام کا خادم کہنے میں ہے، افسوس کہ مفتی صاحب دلیل دینے کی بجائے خلط مبحث کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ الریاض النضرۃ، کس محدث کی تالیف ہے، اور اسے کس نے شائع کیا تھا بحوالہ اسکی صراحت کیجئے، کیونکہ مجرد کسی کتاب میں لکھا ہونا کہ فلاں نے یہ بات کہی تھی، دلیل نہیں، جتنی دیر تک مؤلف کتاب کو ثقہ و معروف اور موحد ثابت نہ کیا جائے اور اس میں مروی روایات کو اصول حدیث کی رو سے صحیح ثابت نہ کیا جائے، امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اگر سند نہ ہوتی تو جو کوئی چاہتا کہہ دیتا۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ

عبد کی اضافت بطور نام کے غیر اللہ کی طرف قطعاً حرام اور انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب و الحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً

الی من دون الله ولکن کونوا ربانین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون
(آل عمران ۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ خدا اس کو کتاب علم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ خدا کے علاوہ میرے بھی بندے بنو، ہاں تم کتاب اللہ کو پڑھ پڑھا کر اللہ والے بنو۔ (ثنائی)، ۳-۷۹۔

اس آیت سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت صرف یہ تھی کہ بندے رب والے ہو جائیں اور یہ دعوت قطعی نہ تھی کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔ اگر مفتی صاحب کے مؤقف کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام ایک صحیح عقیدہ کی نفی کرتے رہے۔ معاذ اللہ۔ نہیں بلکہ اس آیت کی روشنی میں مفتی صاحب کا ہی عقیدہ غلط ہے جس کی مزید وضاحت اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص کا نام عبدالحجر تھا تو رسول اللہ نے فرمایا لاانت عبداللہ، الادب المفرد (ص ۲۲) آج کے بعد تیرا نام عبدالحجر نہیں بلکہ عبداللہ ہے۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اتفقا علی تحریم کل اسم معبد لغیر اللہ (فتح المجید ص ۲۹۳)۔ رہی مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت:

قد کنت مع رسول الله فکنت عبده و رسوله.

یہ ایک لمبی روایت کا ٹکرا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو منبر رسول پر لوگوں کو خطبہ دیا اللہ تعالی کی حمد وثنا کے بعد فرمایا۔ لوگو! مجھے علم ہے کہ تم مجھ میں شدت اور سختی محسوس کرتے ہو۔ یہ اس لیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا اور آپ کا غلام اور خادم تھا۔ آپ ﷺ ایسے تھے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا بالمؤمنین روف الرحیم۔ میں آپؐ کے سامنے مسلول (سونتی ہوئی) تلوار کی طرح تھا مگر یہ کہ آپ مجھے نیام میں رکھتے یا آپ مجھے کسی امر کا حکم فرماتے تو میں اس سے رک جاتا یا میں آپ کی نرمی کی وجہ سے لوگوں کی طرف پیش قدمی کرتا۔ میں اسی کیفیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہا حتی کہ اللہ تعالی نے آپ کو فوت کر دیا۔ پھر میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی طرح تھا اور میں ان کا بھی خادم تھا حتی کہ اللہ تعالی نے ان کو بھی فوت کرلیا۔
(کنز العمال ص ۶۸۲ ج ۵)

صاحب کنز العمال نے اس روایت کا ماخذ فوائد ابو حسین بن بشران، اور ابو احمد الدھقان اور اللالکائی بتایا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتابیں نہ معروف ہیں اور نہ ہی متداول، اور نہ ہی مذکورہ روایت کی سند سامنے ہے۔ تاہم یہ روایت ضعیف بھی ہے اور مفتی صاحب نے اس روایت سے جو استدلال کیا ہے وہ باطل ہے، روایت تو اس لیے ضعیف ہے کہ حضرت عمر نے یہ خطبہ خلافت پر متمکن ہوتے ہی ارشاد فرمایا تھا اس وقت اس واقعہ کے راوی حضرت سعید بن مسیب پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں میں حضرت عمر کی خلافت کے دو سال گزرنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ (تہذیب التھذیب ص۸۶ ج۴) جس سے ظاہر ہے کہ اس روایت کی فنی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے کیا انہوں نے حضرت عمر کا مذکورہ خطبہ اپنی ولادت سے دو سال قبل سن لیا تھا۔

۲-مفتی صاحب کا استدلال باطل ہے اس لیے کہ وہ اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کی طرف نام کی اضافت کرنے کے جواز کا استدلال کر رہے ہیں حالانکہ اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کے نام کی طرف اضافت کا اشارہ تک موجود نہیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ کے خادم اور غلام کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اور وہی ذمہ داری جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ان کے سامنے ادا کرتا تھا آپ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیقؓ کے لیے ادا کرنے لگا۔ کیا کسی کی زندگی میں کوئی منصبی ذمہ داری نبھانا اس کی طرف عبدیت کی اضافت ہوتی ہے اگر ایسے ہی ہے تو پھر یہ واضح ہے حضرت عمر اس کے قائل نہ تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے وہی منصب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے نبھایا۔

(۳) روایت میں لفظ خادم بھی ہے جس کا معنیٰ خدمت کرنے کا ہے اور کنت خادمہ کا معنیٰ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی خدمت کرتا تھا جب کہ مفتی صاحب کے نزدیک خدمت مقصد نہیں تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے نام کی طرف اضافت کر کے عبدیت کا مقصد ہے جو سراسر شرک ہے کبھی کسی صحابی نے حضرت رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کو جو خادم کے لفظ سے موسوم نہیں کیا۔ صحابہ کرام ایسا کر بھی کیسے کر سکتے تھے۔ وہ توحید کا صحیح مفہوم جانتے تھے جب کہ اس طرح کے شرکیہ عقائد تکمیل اسلام کے سینکڑوں سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔ (گوندلوی)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ خود صاحب کنز العمال، کے نزدیک بھی یہ روایت ضعیف ہے۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ علی متقی نے صحاح ستہ اور چند دیگر کتب حدیث کا نام لیکر کہا ہے کہ ان میں جمع حسن اور ضعیف روایات ہیں۔ اور میں نے ہر مقام پر اس کی نشاندہی کی ہے، ان کے علاوہ جتنی روایات ہیں:

فهو ضعيف فيستغني بالعذو اليها او الى بعضها عن بيان ضعفه.

وہ ضعیف ہیں اور ان کتب کی طرف نسبت کر دینا ہی ضعیف کے لیے کافی ہے۔ لہذا حکم لگانے کی ضرورت نہیں۔ (کنز العمال ص ۱۹ ج ۱، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان۔

ان کی اس صراحت سے معلوم ہوا کہ غیر معروف اور غیر متداول کتب کی طرف نسبت کرنا ہی ان کے نزدیک ضعف کے لیے کافی ہے، اور زیر بحث روایت بھی ان کتب کی ہے جن کی طرف نسبت کرنا ہی صاحب کنز العمال کے نزدیک ضعف کے لیے کافی ہے الغرض صاحب کنز العمال کے نزدیک یہ روایب ضعیف ہے۔



باب جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ وغیرہ کا ذکر کرنا

اسلام سے قبل دنیا میں جہالت کا دور دورا تھا، لوگوں نے خود تراشیدہ خدا اور انکی عبادت کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے، انہیں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کسی کی وفات ہوتی تو اس کی میت پر کلام مقدس کی تلاوت کی جاتی اور اس کے ساتھ مختلف ذکر و اذکار بھی کیئے جاتے تھے، جیسا کہ علامہ جلال الدین الخوارزمی حنفی التوفی نے شرح ھدایہ میں پورے جزم و یقین کے ساتھ کہا ہے کہ

ویکرہ رفع الصوت بالذکر و القراۃ لانہ فعل الکتابی.

یعنی جنازے کے ساتھ بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ اہل کتاب (یہود نصاریٰ) کا فعل ہے، الکفایۃ ص ۹۷ ج ۲۔

مبتدعین کی مُسلم شخصیت علامہ خوارزمی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ جنازہ کے ساتھ ذکر وغیرہ اہل کتاب کی رسم ہے، اب اگر اس رسم میں کوئی خوبی اور حسن ہوتا تو شریعت اسے واضح کر کے بیان کرتی، مگر آپ حضرات پورے ذخیرہ حدیث کو کھنگال لیجئے کسی روایت میں آپ کو یہ الفاظ نہیں ملیں گے کہ میت کو اٹھاتے یا لے جاتے وقت اس کے پیچھے کلمہ طیبہ کا ورد کیا کرو، کسی صحابی و تابعی کا فتویٰ و عمل بھی اس کے جواز پر منقول نہیں، خیر القرون کے پورے زمانہ سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم تو جنازے کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ جانتے تھے۔

حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یکرھون رفع الصوت عندالجنائز و عندالقتال و عندالذکر.

یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم آواز کو بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے جنازہ کے ساتھ قتال اور ذکر میں۔ السنن الکبریٰ للبیھقی ص ۷۴ ج ۴، اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

غور کیجئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے جنازہ کیساتھ خاموشی کی تعلیم کس سے حاصل کی تھی اور کس کی اتباع میں وہ لوگ جنازہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا مکروہ جانتے تھے، ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اسوہ اپنے پیارے اور محبوب قائد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات اقدس سے حاصل کیا تھا۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال ان اللہ عزو جل یحب الصمت عندثلاث عند تلاوۃ القرآن و عند الزحف و عند الجنازۃ.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین مقامات پر خاموشی کو پسند کرتا ہے، تلاوت قرآن، میدان جنگ اور جنازہ کے ساتھ،

طبرانی کبیر ص۲۱۳ ج۵، و مجمع الزوائد ص۳۳ ج۳، و کنز العمال (۶۸۸۴)

اس کی ہم معنی روایت، سنن ابی داؤد میں بھی آتی ہے کہ

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال لا تتبع الجنازۃ بصوت ولانار.

یعنی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ میں آگ اور آواز بلند کر کے شریک نہ ہوا جائے۔

ابوداؤد مع عون ص۱۷۶ ج۳، و مسند احمد ص۵۳۲ ج۲۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ انه نهی ان یتبع المیت صوت اونار.

یعنی نبی کریم ﷺ نے میت کے ساتھ آواز (کو بلند کرنے) اور آگ کو ساتھ لے جانے سے منع فرمایا۔ ابو یعلی بحوالہ مجمع الزوائد ص۳۲ ج۳۔

گو یہ روایات (زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، ابوھریرہ رضی اللہ عنہ، جابر رضی اللہ عنہ) صحیح نہیں مگر اپنے شواہد کی وجہ اور قیس بن عباد رضی اللہ عنہ کے اثر صحیح کی بنا پر ہم نے انہیں بطور تائید نقل کر دیا ہے، ان احادیث و آثار سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ جنازہ کے ساتھ کسی ذکر و اذکار

کا بلند کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم (بموجب فرمان نبوی) مکروہ جانتے تھے، اور اس مکروہ کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ خوارزمی نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ کفار کا شعار اور اہل کتاب (یہود نصاریٰ) کا فعل ہے، اسی طرح دیگر معتبر کتب فقہ حنفیہ میں لکھا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن ھمام حنفی ھدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں۔

ویکرہ لمشیعها رفع الصوت بالذکر والقراۃ.

ذکر اور تلاوت کو جنازہ کے ساتھ بآواز بلند کرنا مکروہ ہے۔

فتح القدیر ص ۹۷ ج ۲۔

امام سراج الدین اودی حنفی لکھتے ہیں کہ

رفع الصوت بالذکر و قرآۃ القرآن و قولهم کل حی یموت و نحو ذلک خلف الجنازہ بدعة.

یعنی جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کرنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرے گا یا اسی طرح کا کوئی جملہ کہنا بدعت ہے۔ الفتاوی السراجیہ ص ۲۳۔ ایسے ہی علامہ شرنبلالی نے ،مراقی الفلاح، میں اسے بدعت قرار دیا ہے، اور اسکی شرح میں علامہ طحطاوی فرماتے ہیں کہ بدعت سیئہ ہے۔ (حاشیہ **مراقی** ۲۰۶)۔

فتاوی عالمگیری میں بحوالہ طحاوی لکھا ہے کہ

وعلی متبعی الجنازۃ الصمت ویکرہ لهم رفع الصوت بالذکر و قراۃ قرآن.

یعنی جولوگ جنازہ کے ساتھ جانے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں اور ان کیلئے بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن مکروہ ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ص ۱۶۲ ج ۱ الفصل الرابع فی حمل الجنازۃ)۔

علامہ کاسانی حنفی **متوفی** ۵۸۷ھ فرماتے ہیں

و یطیل الصمت اذا اتبع الجنازۃ ویکرہ رفع الصوت بالذکر لماروی عن قیس بن عبادۃ انه قال کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یکرهون رفع الصوت عند ثلاثة عند القتال و عند الجنازہ والذکر ولانه تشبه باهل الکتاب فکان مکررہ،

یعنی جو جنازہ کے ساتھ جائے اس پر لازم ہے کہ وہ لمبی خاموشی اختیار کرے کیونکہ ذکر کے وقت آواز کو بلند کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ حضرت قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم تین مقام، جہاد، جنازہ اور ذکر کے وقت آواز بلند کرنے کو مکروہ جانتے تھے، (علامہ کاسانی فرماتے ہیں) یہ مکروہ اس لئے ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ متشابہت ہے، بدائع الصنائع ص ۳۱۰ ج ۱۔

مفتی صاحب کا اعتراض

جن فقہاء نے میت کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ فرمایا ہے ان کی مراد مکروہ تنزیہی ہے۔ جاء الباطل ص ۴۰۹۔

جواب

اولاً۔ ہم اس سے پہلے متعدد بار اس بات کی صراحت کر چکے ہیں کہ جب فقہاء کرام مطلق مکروہ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد مکروہ تحریمی ہوتی ہے، اس پر ہم نے بفضلہ تعالیٰ فقہ حنفیہ کی معتبر کتب کی عبارات ذکر کردی ہیں، بلکہ مبتدعین کے گرو مولوی احمد رضا خاں بریلوی کی عبارات بھی نقل کی ہیں، تفصیل کیلئے آذان قبر کی بحث دیکھئے۔

ثانیاً۔ مذکورہ اصول و ضابطہ تو اپنے مقام پر حنفیہ کا اصول تھا ہی، مگر کمال یہ کہ فقہ حنفی میں اس کے مکروہ تحریمی ہونے کی بھی صراحت ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفی کنز الدقائق کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

و ینبغی لمن تبع جنازة أن یطیل الصمت ویکره رفع الصوت بالذکر و قراءة القرآن و غیر هما فی الجنازة والکراهة فیها کراهة تحریم.

اور مناسب ہے اس شخص کیلئے جو جنازہ کے ساتھ جائے وہ لمبی خاموشی اختیار کرے اور بلند آواز سے ذکر اور تلاوت قرآن کو جنازہ کے ساتھ کرنا مکروہ ہے اور اس میں کراہت بھی تحریمی ہے۔ البحر الرائق ص ۱۹۲ ج ۲۔

علامہ حلبی، منیۃ المصلی، کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

و ینبغی ان یطیل الصمت ویکرہ رفع الصوت فیھا بالذکر و قراءۃ القرآن ذکر فی فتاوی العصر انھا کراھۃ تحریم.

اور مناسب ہے کہ طویل خاموشی اختیار کرے (جنازہ کے ساتھ جانے والا) اور آواز کو ذکر اور تلاوت قرآن کیساتھ بلند کرنا مکروہ ہے اس کو، فتاوی العصر، میں ذکر کر کے کہا ہے یہ تحریمی ہے، حلبی کبیر ص ۵۹۴۔

مگر ہمارے مفتی صاحب اس کو مکروہ تنزیہی باور کرا رہے ہیں، پھر اس پر صریحاً جھوٹ بولا کہ فقہاء بلا دلیل شرعی مکروہ کہیں تو تب مکروہ تنزیہی مراد ہوتا ہے۔

حالانکہ علامہ ابن عابدین نے فتاوی شامی، میں اس پر قرآنی آیت پیش کی تھی جسکی نقل کا تو مفتی صاحب کو بھی اقرار ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱۔

یہ الگ بات ہے کہ علامہ شامی کے استدلال کو مفتی صاحب نے ادھورا قرار دیکر جان چھڑانے کی فضول حرکت کی ہے، بہر حال یہ ثابت ہوگیا کہ فقہاء نے اس کی کراہت پر استدلال قرآن سے کیا ہے، اور راقم الحروف نے بھی اس کے مکروہ ہونے پر عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو بسند صحیح ثابت کر دیا ہے، معلوم نہیں مبتدعین کی نظر میں دلیل کس بات کا نام ہے، حالانکہ فقہاء احناف تو اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی پیروی واجب ہے ہاں البتہ جب سنت سے اس کی نفی ہو تب نہیں، فتح القدیر شرح ھدایہ ص ۳۷ ج ۲۔

ایک نئی دریافت

ادھر ادھر کی فضول بھرتی کے بعد مفتی صاحب نے آخر اپنے راگ کی تان اس پر توڑی ہے کہ خاموش رہنا بہتر اور خاموش نہ رہنا بلکہ ذکر بالجہر کرنا بہتر نہیں جائز ہے، جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱ سطر ۳۔

اس عبارت میں مفتی صاحب نے حق کا اعتراف الٹے کان پکڑ کر تو لیا ہے مگر اس کے نیچے روایتی مبتدعین کی عیاری کی جھلک ہے کہ گو ذکر کرنا بہتر نہیں مگر بہر حال جائز تو ہے، مفتی صاحب غالباً قرآن و سنت کے علم کی طرح عقل و خرد سے بھی کورے تھے، انہیں اتنا بھی علم نہ تھا کہ جب دونوں طرف سے دلائل شرعی موجود ہوں تو تب ایک چیز کو مکروہ کہتے ہیں اور دوسری کو جواز مع الکراھت سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ کھڑے ہو کر کھانے کی روایات میں شدید وعید ہے لیکن کھڑے

ہو کر کھانے کی روایات بھی ملتی ہیں، تو علماء نے کھڑے ہو کر کھانے کو جواز مع الکراہت کہا ہے۔

مگر یہاں معاملہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ ہم نے جنازہ کے ساتھ آواز بلند نہ کرنے کی احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا تعامل پیش کر دیا ہے کہ وہ جنازہ کے ساتھ آواز کو بلند کرنا مکروہ جانتے تھے، خود مفتی صاحب نے دوسرے باب میں بحوالہ ابن منذر اس اثر کو نقل کیا ہے۔ جاء الباطل ص ۴۰۹۔

اسی طرح علامہ حلبی اور کاسانی نے اس سے دلیل پکڑی ہے۔

حلبی کبیر ص ۵۹۴۔ بدائع الصنائع ص ۳۱۰ ج ۱۔

جبکہ اس کے برعکس مفتی صاحب نے جنازہ کیساتھ ذکر بالجہر کو کرنا تو کجا آواز کے بلند کرنے کی بھی کوئی شرعی دلیل درج نہیں کی! جو زیب رقم فرمایا ہے وہ غیر متعلقہ ہے جس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، خود مفتی صاحب کو بھی حقیقت کا بحر حال ادراک ہے اور وہ اس بات سے کما حقہ واقف ہیں کہ خیر القرون میں اس سے لوگ منع کرتے تھے چنانچہ اس بات کا اقرار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

یہ ممانعت اس زمانہ کیلئے تھی اب اس زمانہ میں چونکہ لوگوں کے حالات بدل گئے ہیں، یہ حکم کراہت بھی بدل گیا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں جو بھی جنازے کے ساتھ جاتا تھا وہ خاموش رہتا تھا اس سے عبرت پکڑتا تھا اہل میت کے ساتھ رنج وغم میں شرکت کرتا تھا، اب وہ زمانہ ہے کہ جنازے کے ساتھ جانے والے دنیاوی باتیں ہنسی مذاق مسلمانوں کی غیبتیں کرتے جاتے ہیں، اگر قبرستان میں کچھ دیر بیٹھنا پڑے تو خوش گپیاں اڑاتے ہیں، میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ کھیل کا مشغلہ کر کے دل بہلاتے ہیں، تو ان کو ذکر الٰہی میں مشغول کر دینا ان بیہودہ باتوں سے بہتر ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۱ ج ۱۔

شکر ہے کہ مفتی صاحب نے ایک صحیح بات کا اقرار تو کیا ہے، خیر القرون میں اسکی ممانعت ہی تھی، مفتی صاحب کی اگلی بات سے ہمیں چند وجوہ سے کلام ہے جسکی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اب لوگوں کی حالت بدل گئی ہے الخ! بھائی بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی شرعی امر میں غلطی کا ارتکاب کریں تو انہیں سمجھانا، اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو

بیان کر دینا ہی ضروری ہوتا ہے، انہیں اس بات پہ قائل کرنا کہ یہ چیزیں خلاف شریعت ہیں، علماء اہل علم اور ہر سمجھ دار طبقہ پر فرض ہیں، اگر وہ حضرات سمجھ جائیں تو فبہا ورنہ ہمیں اور کسی بھی کلمہ گو مسلمان امتی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دین کے حکم میں ہی رد و بدل کر دے اور عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر دین سازی کا عہدہ سنبھال لے، مثلاً اگر کوئی شخص نماز کو مسنون طریقہ کے برعکس پڑھتا ہے وہ کسی بھی نماز کے رکن میں کوتاہی کرتا ہے، تو اہل علم پر فرض ہے کہ اسے سمجھا دیں، مگر یہ کسی فرد بشر کو حق حاصل نہیں کہ وہ نماز کے طریقہ میں ہی تبدیلی کر دے۔

ثانیاً۔ ہر دور میں عوام و خواص ہوتے ہیں بعض دین پر کما حقہ عمل کرتے ہیں بعض ۹۰٪، بعض ۵۰٪ بعض ۱۰٪، اور بعض کی حالت ایک فی صد کی بھی ہوتی ہے، خیر القرون میں بھی بعض جاہل جنازہ کے ساتھ ہنسی مذاق کرلیا کرتے تھے، چنانچہ علامہ حلبی، سنن سعید بن منصور سے نقل کرتے ہیں کہ

وسمع ابن مسعود رجلاً یضحک فی الجنازة فقاله اتضحک و انت فی جنازة لا کلمک ابدا. حلبی کبیر ص ۵۹۴.

اس کا معنی مولوی امجد علی بریلوی کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جنازہ کے ساتھ ہنستے دیکھا، فرمایا، تو جنازہ میں ہنستا ہے، تجھ سے کبھی کلام نہ کروں گا، بہار شریعت ص ۱۳۱ حصہ چہارم۔ یہی روایت، شعب الایمان للبیھقی ۷/۱۱ رقم الحدیث (۹۲۷۱) میں موجود ہے۔

مبتدعین کی اس مسلمہ روایت سے ثابت ہوا کہ خیر القرون اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے دور میں بھی بعض لوگ نماز جنازہ میں نازیبا حرکات کرتے تھے، مگر انہوں نے جنازہ میں اس وجہ سے بدعات تو پیدا نہ کیں ہاں البتہ ایسے لوگوں سے ترک کلام ضرور کیا، لہذا آج تغیر زمانہ سے بدعات کا دروازہ کھولنا کسی طرح بھی درست نہیں جیسا خیر القرون کے زمانہ میں بعض لوگ ہنسی مذاق میں مشغول رہا کرتے تھے۔

اگر آج بھی ہوں تو انہیں احکام اسلام کی تعلیم دینا چاہیے نہ کہ سرے سے ان احکام اسلام میں ہی حک و اضافہ کر دیا جائے، الغرض ہر دور میں خواہش نفس کے پجاری تو رہا ہی کرتے ہیں، اور ہر

دور میں دین پر عمل کرنے والے بھی رہا کرتے ہیں، اگر آج دین سے لوگ لاپرواہ ہیں تو دین پر عمل کرنے والے اور جنازہ میں مودب ہوکر باقاعدہ مسنون طریقہ سے ساتھ جانے والے بھی موجود ہیں۔

ویسے راقم الحروف کو ۱۲/ اگست ۱۹۸۴ء سے لیکر تادم تحریر امامت و خطابت کرتے ہوئے تقریباً تیرا سال گزر چکے ہیں لیکن مجھے ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ لوگ نماز جنازہ پڑھنے کیلئے جاتے ہوئے یا میت کو دفن کرنے تک آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوں، ادھر دفن وکفن کا انتظام ہو رہا ہو تو دوسری طرف لوگ کھیل و تماشا میں مشغول ہوں، بلکہ خاکسار کا تو مشاہدہ ہے کہ لوگ مرگ کے سوگ میں خاموش کھڑے رہتے ہیں، اور مرنے والے کی موت کے اثرات سے انہیں موت یاد آجایا کرتی ہے اور بعض دفعہ دین سے دور لوگ بھی چند ایام کیلئے پکے نمازی بن جاتے ہیں کئی حضرات اپنے والدین کی وفات پر پختہ نمازی بن جاتے ہیں، ہم اس کی متعدد امثلہ پیش کر سکتے ہیں، مگر مفتی صاحب اپنا مشاہدہ اس کے برعکس بیان کرتے ہیں، ممکن ہے کہ اکا دکا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو مگر اکثریت ایسی قطعاً نہیں، یہ مفتی صاحب کا بدعت کی ایجاد کیلئے ایک فقط بہانہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مفتی صاحب کے دلائل کا محاسبہ

پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ جنازے کے آگے کلمہ طیبہ یا تسبیح وتہلیل یا درود شریف یا نعت شریف آہستہ آہستہ یا بلند آواز سے پڑھنا جائز اور میت و حاضرین کو مفید ہے، اس پر قرآنی آیات وا حادیث صحیحہ و اقوال فقہا شاہد ہیں، رب تعالی فرماتا ہے

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعوداً و علی جنوبھم.

وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر۔

اس کی شرح میں تفسیر روح البیان، ابو السعود، کبیر میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ہمیشہ کھڑے بیٹھے ذکر الہی کرتے ہیں کیونکہ انسان اکثر ان حالات سے خالی نہیں ہوتا۔ جاء الباطل ص۴۰۴ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ اس آیت میں کس لفظ کا معنی ہے کہ نماز جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے، ایک شخص بآواز بلند کہے، کلمہ شہادت، تو دوسرے لوگ کہیں، اشھدان لا الہ الا اللہ، وغیرہ، جب سرے سے اس بات کا یہاں ذکر ہی نہیں تو پھر یہ آپ کی دلیل کیسے بن گئی، الغرض یہاں نماز جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ پڑھنے کا ذکر نہیں۔

ثانیاً۔ اگر مبتدعین کہیں کہ اس عام حکم میں نماز جنازہ بھی شامل ہے کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ذکر کیا جائے، تو جواباً عرض ہے کہ خود مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ اب تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں، تفسیر بالقرآن، یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد تفسیر قرآن بالا حادیث کیونکہ حضور علیہ السلام صاحب قرآن ہیں، ان کی تفسیر نہایت ہی اعلی، پھر قرآن کی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے قول سے خصوصاً فقہاء صحابہ ادر خلفا راشدین کی تفسیر، رہی تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے، یہ اگر روایت سے ہے تو معتبر ورنہ غیر معتبر۔ جاء الباطل ص۱۱ ج۱۔

بتایئے مفتی صاحب کے اس بتائے ہوئے اصول کی رو سے، مذکورہ آیت سے جنازہ کے ساتھ

کلمہ وغیرہ کا ذکر قرآن، صاحب قرآن، صحابہ کرام وغیرہ نے بیان فرمایا ہے، نہیں ہرگز نہیں، تو پھر مفتی صاحب کے من گھڑت استدلال کی کوئی شرعی حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

ثالثاً۔ عام سے خاص ثابت نہیں ہوتا، اس اصول کی ہم متعدد بار صراحت کر چکے ہیں۔

رابعاً۔ اختلاف ذکر کے محل وطریقہ اور کیفیت سے ہے کہ اجتماعی طور پر بآواز بلند جنازہ کے ساتھ ذکر سنت سے ثابت نہیں، جیسا کہ مبتدعین میں رواج ہے کہ ایک شخص کہتا ہے، کلمہ شھادت، دوسرے شریک جنازہ، کلمہ طیبہ، کا ذکر کرتے ہیں، خیر سے اس کا ثبوت دیجئے۔

خامساً۔ اگر اس آیت کو زیر بحث مسئلہ سے ہی تعلق ہے اور اس سے جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ کا ذکر ثابت ہوتا ہے تو خود مولف جاء الباطل نے یہ کیوں لکھا ہے کہ

معلوم ہوا کہ (جنازہ کے ساتھ) خاموش رہنا بہتر ہے اور خاموش نہ رہنا بلکہ ذکر بالجہر کرنا بہتر نہیں جائز ہے۔ جاء الباطل ص ۴۱۰ ج ۱۔

اس عبارت میں مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ جنازہ کے ساتھ ذکر بالجہر کرنا غیر بہتر اور جائز مع الکراھت ہے، فرقہ بریلویہ ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ مفتی صاحب کی اس تحریر کے بعد ان کے استدلال کی کوئی وقعت رہ جاتی ہے، کیونکہ اگر یہ مسئلہ قرآن سے ثابت ہے تو اس کے جواز کو غیر بہتر سے مفتی صاحب کیوں تعبیر کر رہے ہیں، کیا قرآن کے احکام بھی غیر بہتر ہوتے ہیں، کچھ تو خدا کا خوف کیجئے۔

سادساً۔ قرآن کی اس آیت کا مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ جنازہ کے ساتھ کلمہ کو پڑھا جائے، آیئے پہلے قرآن کے الفاظ پر غور کریں، ارشاد ہوتا ہے

ان فی خلق السمٰوات والارض و اختلاف الیل و النھار لاٰیت لاولی الالباب☆ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعودا و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربناما خلقت ھذا باطلاًسبحٰنک فقنا عذاب النار. اٰل عمران آیت ۱۹۰ و ۱۹۱.

یعنی بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے

اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے ہیں کہ) اے پروردگار تو نے **اسے** (مخلوق کو) بے فائدہ پیدا نہیں کیا تو پاک ہے تو (قیامت کے روز) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو (۳-۱۹۰تا۱۹۱)

ان آیات کو آپ مکرر پڑھیئے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں کہ یہاں ذکر سے مراد مخلوق کی پیدائش میں تدبر ہے جسے مومن دیکھ دیکھ کر اللہ کی حمد وصفت بیان کرتا ہوا اپنے لئے مغفرت کی دعا کرتا ہے، مگر یار لوگوں نے اس سے مخصوص جنازہ کا بدعی ذکر کشید کرلیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گو بعض نے اس (یذکرون اللہ) سے بدنی و لسانی ذکر بھی بیان کیا ہے مگر انکے نزدیک بھی اس سے مراد نماز ہے جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے صحیح بخاری ص ۶۵۷ ج ۲ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث لاکر اس کو بیان کیا ہے اور اس کی تائید قران سے بھی ہوتی ہے کہ

و اقم الصلوٰۃ لذکری، طٰہ آیت ۱۴ ۔

یعنی میرے ذکر کیلئے نماز پڑھا کرو (۲۰-۱۴)

گویا قرآن کی آیت کا مقصود یہ ہوا کہ نماز کو ہر حالت میں پڑھا کرو خواہ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر یا پہلو پر لیٹ کر، الغرض اس کی تفسیر میں دو ہی قول ہیں تدبر اور اقامت صلوٰۃ، مگر مفتی صاحب کے کشید کردہ معنی کو کسی مُسلّم مفسر نے بیان نہیں کیا، پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

قرآن فرماتا ہے، **الا بذکر الله تطمئن القلوب،** خبردار ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں۔

اس کی تفسیر میں صاحب روح البیان فرماتے ہیں۔ پس قرآن سے اور اللہ کے ذکر سے جو اسم اعظم ہے، مسلمان انس لیتے ہیں اور اس کو سننا چاہتے ہیں اور کفار دنیا سے خوش ہوتے ہیں اور ذکر غیر اللہ سے سرور پاتے ہیں۔

اس آیت اور تفسیری عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر مسلمان کی خوشی و فرحت کا باعث ہے۔ مگر کفار اس سے رنجیدہ ہوتے ہیں، بحمداللہ میت بھی مسلمان ہے اور سب حاضرین بھی، سب

کو ہی اِس سے خوشی ہوگی، نیز میت کو اس وقت اپنے اہل و عیال سے چھوٹنے کا غم ہے یہ ذکر اس غم کو دور کرے گا، خیال رہے کہ اس آیت میں بھی ذکر مطلق ہے خواہ آہستہ ہو یا بلند آواز سے لہذا ہر طرح جائز ہوا محض اپنی رائے سے اس میں قید نہیں لگا سکتے۔ جاء الباطل ص ۴۰۵ ج ۱

الجواب

اولاً۔ اذان قبر کی بحث میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ایک مومن و مسلمان وفات کے بعد اہل و عیال کی جدائی سے قطعاً غم نہیں کرتا، اس پر ہم نے بفضلہ تعالی صحیح احادیث پیش کر دیں ہیں، لہذا مفتی صاحب کا بدعت کی ایجاد کے لئے یہ ایک چور دروازہ ہے، جس کی علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔

ثانیاً۔ آیت کے کس لفظ کا معنیٰ ہے کہ جب جنازہ لیکر چلو تو اس کے ساتھ بآواز بلند کلمہ طیبہ وغیرہ کا ذکر کیا کرو، آیئے ہم آپ کو مرادِ قرآنی سمجھا دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے

الذین امنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب.(سورۃ الرعد آیت ۲۸)

یعنی جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں سن رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے (۱۳-۲۸)

دیکھئے اس آیت میں تو اللہ تعالی بیان فرما رہا ہے کیونکہ جو ایمان لاتا ہے تو اس کو اللہ کے ذکر سے اطمینان قلبی میسر ہوتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مسلمان و موحد کی زندگی مصائب و مشکلات کے اندر ناکامیوں اور قید و بند کی صعوبتوں، مخالفتوں کی آفتیں، وسائل کی کمی کی دشواریاں وغیرہ میں بھی ان کے دلوں میں راحت ہوتی ہے، جبکہ بے دین لوگ فتوحات مال و دولت کی فراوانی کے باوجود انہیں اطمینان قلب میسر نہیں ہوتا بلکہ ہوس و تمنا کی آگ انکے سینہ میں بھڑکتی رہتی ہے، مگر ایک مسلمان و مومن کا دل اطمینان سے لبریز ہوتا ہے۔

الغرض اس آیت میں ذکر کرنے والے کے دل کو اطمینان میسر ہونیکی خوش خبری سنائی گئی ہے نہ کہ میت پر ذکر کرنے سے مردے کو چین ملنے کا وعدہ دیا گیا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب ذاکر کی بجائے میت کو اطمینان کا استدلال کر رہے ہیں اسے ان کی سادگی سے تعبیر کیا جائے یا جہالت سے،

کچھ بھی ہو بہر حال ان کا استدلال منشا قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن تو ذاکر کے اطمینان قلب کا ذکر کرتا ہے لیکن مفتی صاحب کھینچ تان کر میت کے اطمینان قلب پر فٹ کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ اختلاف ذکر سے نہیں بلکہ اس کے محل وطریقہ وکیفیت سے ہے، لیکن افسوس کہ مفتی صاحب اپنے طریقہ کے ثبوت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں مطلق ذکر کو بیان کر رہے ہیں اور عوام بچارے انکی عیاری کو بھانپنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے وہ تو فقط انکی دستار وقبا کو دیکھ کر اعتماد کر بیٹھتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ اس کے نیچے کس قدر فریب کاری وعیاری ومکاری ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

ابن عدی نے کامل میں اور امام زیلعی نے **نصب الرایه لتخریج احادیث الهدایه جلد دوم** ص۲۹۲، مطبوعہ مجلس ڈابھیل میں لکھا ہے

عن ابن عمر رضی الله عنه قال لم یکن یسمع من رسول الله ﷺ وهو یمشی خلف الجنازة الاقول لا اله الا الله مبدیاو راجعا.

اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے جاء الباطل ص۴۰۴ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے روایت کے الفاظ کا معنی جان بوجھ کر نہیں کیا کہ کہیں عوام کو یہ معلوم ہی نہ ہوجائے کہ روایت کے متن میں کسی فعل وعمل کی فضیلت قطعاً بیان نہیں کی گئی، بلکہ ایک عمل کی حکایت ہی بیان ہوئی ہے، اس ھیرا پھیری کے بعد صریحاً جھوٹ بولا کہ اگر ضعیف بھی ہو تب بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے، اے جی کس عمل کی فضیلت بیان ہوئی ہے جس کیلئے آپ نے یہ مخلص تلاش کیا ہے، علاوہ ازیں فضائل اعمال میں بھی ضعیف روایات معتبر نہیں، جس کی ضروری تفصیل دین الحق ص۵۳ ج۱ میں عرض کر دی گئی ہے۔

ثانیاً۔ علامہ زیلعی حنفی نے اسے ابن عدی کے حوالے سے بیان کر کے اس کی تضعیف کی تھی، نصب الرایہ ص۲۹۲ ج۲، جسے مفتی صاحب بے ڈھکار ہضم کر گئے ہیں، اسی طرح امام ابن عدی نے الکامل ص۲۶۹ ج۱، وص۱۶۰۸ ج۴، میں اس کی پرزور الفاظ میں تضعیف کی ہے۔

مفتی صاحب کا فرض تھا کہ اس کی صحت ثابت کرتے اور علامہ زیلعی و ابن عدی کی جرح کا جواب دیتے، مگر مفتی صاحب نے اس سے تو آنکھیں بند کر لیں، کہ ان کی جرح کا جواب ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے، ہاں البتہ غیر متعلقہ بحث کو حسب دستور درمیان میں گھسیٹ لائے کہ فضائل میں ضعیف روایات معتبر ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے جی یہ روایت فقط ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع (من گھڑت) ہے کہ اس کا راوی ابراھیم بن احمد المدانی کو امام ابوعروبہ نے، یضع الحدیث (یعنی احادیث گھڑتا تھا) کہا ہے، ابن عدی ص ۲۶۹ ج ۱، و میزان الاعتدال ص ۱۷ ج ۱۔

مگر ہمارے مہربان مفتی صاحب اسے فضائل میں ضعیف الخ کہہ کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

منتخب کنز العمال جلد ہشتم ص ۹۹ میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ ہے

اکثروا فی الجنازۃ قول لا الہ الا اللہ، جاء الباطل ص ۴۰۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس روایت کا بھی مفتی صاحب نے ترجمہ عمداً ترک کر دیا ہے کہ کہیں میری بے ایمانی کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے، آیئے ہم آپ کو بتاتے جائیں کہ ترجمہ نہ کرنے میں کونسی مصلحت و مجبوری تھی، قارئین کرام بات یہ ہے کہ متن روایت کا یہ معنی ہے کہ

جنازہ کے اندر اکثر، لا الہ الا اللہ، کہا کرو، دیکھئے مقیاس حنفیت ص ۵۸۴ از مولوی محمد عمر اچھروی بریلوی۔

ان الفاظ کا یہ مفہوم تھا کہ جنازہ پڑھتے ہوئے اس کے بیچ میں کلمہ کو کثرت سے پڑھا کرو، ظاہر ہے کہ ان الفاظ سے مفتی صاحب کا، مدعا جنازہ کے ساتھ کلمہ وغیرہ کا ذکر، ثابت نہ ہوتا تھا، تو مفتی صاحب نے روایت کے متن کو نقل کر کے ترجمہ ترک کر دیا تاکہ عوام یہی سمجھیں کہ اس روایت کا تعلق بھی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے کلمہ پڑھنے سے ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ مبتدعین میں ایسے لوگ بھی مفتی اعظم، حکیم الامت اور مفسر قرآن کے القاب سے یاد

کیئے جاتے ہیں، جو عوام کو صریحاً مغالطہ دیکر اپنا اعمال نامہ سیاہ کرتے رہے ہیں۔

ثانیاً۔ منتخب کنز العمال، مسند احمد، کے حاشیہ پر حیدر آباد دکن سے طبع ہوئی تھی، جو کہ مسند کی چھ جلدوں کے ساتھ مطبوع ہے، لیکن مفتی صاحب اس کی جلد ہشتم کا حوالا دے رہے ہیں، معلوم یوں ہوتا کہ مفتی صاحب نے اصل کتاب کی طرف مراجعت نہیں کی کسی رسالے سے حوالہ نقل کرتے ہوئے ان سے سہو ہوا ہے۔

ثالثاً۔ ہمیں یہ روایت اصل، کنز العمال ص ۴۵۰ ج ۱۵ میں رقم الحدیث (۴۲۵۷۸) کے تحت بحوالہ مسند فردوس الاخبار للدیلمی ملی ہے، دیلمی کو دیکھ لیا گیا ہے اس میں یہ روایت سرے سے موجود ہی نہیں، ہاں البتہ علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے، جامع الصغیر کی شرح، فیض القدیر ص ۸۸ ج ۲، طبع مصر ۱۹۳۸ء میں اس کی نسبت دیلمی کی طرف کر کے لکھا ہے، بسند فیہ مقال، یعنی اس کی سند میں جرح ہے، اسی طرح علامہ البانی رحمۃ اللہ، نے ضعیف الجامع الصغیر و زیادتہ ص ۱۵۷ (رقم الحدیث ۱۱۱۴) میں اس کی تضعیف کی ہے۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

مشکوٰۃ کتاب الدعوات باب ذکر اللہ میں ہے۔

ان للہ ملئکۃ یطوفون فی الطرق یلتمسون اھل الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون اللہ تنادوا ھلموا الی حاجتکم قال فیحفونھم با جنحتھم.

اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں چکر لگاتے ہیں ذکر اللہ کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں پس جبکہ کسی قوم کو ذکر الہی کرتے ہوئے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ آؤ اپنے مقصد کی طرف پھر ان ذاکرین کو پروں میں ڈھانپ لیتے ہیں، الخ۔

لہٰذا اگر میت کے ساتھ لوگ ذکر اللہ کرتے ہوئے جائیں گے تو ملائکہ راستے ہی میں ملیں گے اور ان سب کو اپنے پروں میں ڈھانپ لیں گے، میت بھی ملائکہ کے پروں کے سایہ میں قبرستان تک جائے گی، خیال رہے کہ اس حدیث میں ذکر مطلق ہے خواہ آہستہ ہو یا بلند آواز سے۔ جا الباطل ص ۴۰۶ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ جب مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ اس حدیث میں مطلق ذکر کا بیان ہے تو پھر ان کی یہ دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ ان کا دعوی وعمل مطلق نہیں بلکہ مقید ہے کہ جنازہ کے ساتھ ذکر بالجہر کیا جائے۔

ثانیاً۔ مبتدعین کا دعوی اور عمل یہ ہے کہ وہ میت کو اٹھا کر چلتے ہوئے راستے میں کلمہ طیبہ وغیرہ کا ذکر بالجھر کرتے ہیں، مگر زیر بحث حدیث میں مجلس ذکر کا بیان ہے،

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

عن النبی ﷺ قال ان لله تبارک و تعالی ملائکة سیارة فضلا یبتغون مجالس الذکر فاذا وجدوا مجلسا فیه ذکر قعدوا معهم و حف بعضهم بعضا با جنحتهم حتی یملوا ما بینهم و ما بین السماء الدنیا فاذا تفرقوا عرجوا و صعدوا الی السماء، الحدیث،

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ کے کچھ فرشتے گشت کرنے والے ہیں جو ذکر کی مجالس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں جب وہ ذکر کی کوئی مجلس پاتے ہیں تو ان (ذاکرین) کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے پروں سے بعض فرشتے بعض دوسرے فرشتوں کو (اوپر تلے) ڈھانپ لیتے ہیں جب ذکر کرنے والے اٹھ جاتے ہیں تو یہ فرشتے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں،

الحدیث، صحیح مسلم ص۳۴۴ ج۲۔

یہ حدیث اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ میں مجلس کی بات ہے نہ کہ چلتے ہوئے کے بارے میں ہے، پھر آگے صاف بیان ہے کہ فرشتے ان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور مجلس برخاست ہونے پر وہ آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب اسے راستے کے ذکر پر محمول کر رہے ہیں جو کہ غلط بیانی ہی نہیں بلکہ حدیث نبوی میں یہودانہ حد تک تحریف بھی ہے۔

ثالثاً۔ مذکورہ حدیث کا جو ہم نے ترجمہ کیا ہے وہ مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی کا ہے جو اس کی، شرح صحیح مسلم ص۶۴۴ ج۷، سے ہم نے، کا، کی، کی تبدیلی سے نقل کیا ہے، اسے مکرر پڑھ

لیجئے، حدیث میں پروں سے ڈھانپ لینے کا بیان ذاکرین کے بارے میں قطعاً نہیں، مگر بریلوی امت کا حکیم الامت، اسے ذاکرین کے بارے میں باور کرا کرمیت کو بھی ساتھ شامل کر رہے ہیں، جو کہ صریحاً بے ایمانی ہے۔

رابعاً۔ اس حدیث میں، ذکر کی مجالس کی فضیلت بتائی گئی ہے جس سے کسی کلمہ گو کو قطعاً انکار نہیں، انکار تو آپ کے بدعی عمل سے ہے کہ میت کے ساتھ ذکر بالجہر کے طریقہ سے کلمہ وغیرہ کا ورد کیا جائے، لیکن اس حدیث میں تو سرے سے اس کا بیان ہی نہیں، مفتی صاحب کا استدلال بالکل اس بچہ نادان کی طرح ہے جو طلوع آفتاب اور غروب سورج کے وقت نفل پڑھنے لگ جائے، اور منع کرنے پہ نوافل کے فضائل کی احادیث بیان کرنے لگے، دیانت سے کہنا کہ اسکی اس بات کو آپ حضرات دلیل سے تعبیر کریں گے یا اسے دماغی اپریشن کا مشورہ دیں گے۔

بالکل اسی طرح ہم آپ کے استدلال کو غلط و باطل کہہ کر اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ! انہیں دین کی سمجھ اور قرآن و حدیث کا اے اللہ علم عطا کر، اور انہیں بدعات ترک کرنے کی توفیق دے کہ ان میں پڑ کر یہ لوگ خبطی ہو چکے ہیں۔

خامساً۔ مفتی صاحب نے استدلال تو غلط کیا ہی تھا کہ یہ ان کی مجبوری تھی کہ غلط سلط قیاس سے ہی ان کی گاڑی چلنی تھی، مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے حدیث کے الفاظ بھی غلط نقل کیئے ہیں، درست الفاظ، **فیحفونھم**، کے ہیں جنہیں مفتی صاحب نے حسب عادت، **فیحفولھم**، سے بدل دیا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

مشکوٰۃ اسی باب میں ہے کہ

ادا مررتم برياض الجنة فارتعوا قالوا و ماریاض الجنة قال حلق الذکر.

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں میں سے گزرو تو کچھ کھا لیا کرو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں؟ فرمایا کہ ذکر کے حلقے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر میت کے ساتھ ذکر الٰہی ہوتا ہوا جاوے تو میت جنت کے باغ میں

قبرستان تک جاوے گا، خیال رہے کہ یہاں ذکر مطلق ہے، آہستہ یا بلند آواز سے، جاء الباطل ص۴۰۶ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن ثابت البنانی ہے، ترمذی مع تحفہ ص۲۶۳ ج۴، ومسند احمد ص۱۵۰ ج۳، وابویعلی ص۳۸۳ ج۳، وابن عدی ص۲۱۴۷ ج۶، وغیرہ، اور یہ متکلم فیہ راوی ہے، امام ابن معین اسے، لیس بشیئی (ہیچ محض) کہتے ہیں، امام ابوحاتم کہتے ہیں منکر حدیث ہے اس کی روایات سے احتجاج نہ کیا جائے، امام بخاری، فیہ نظر، فرماتے ہیں، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام دارقطنی نے اسے ضعیف کہا ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی روایات کا کوئی متابع نہیں، امام ابن معین فرماتے ہیں کہ فی نفسہ تو صدوق ہے مگر ضعیف الحدیث ہے، امام ابو زرعہ اسے لین، کہتے ہیں، امام ازدی اسے، ساقط (اعتبار سے گرا ہوا) فرماتے ہیں، امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ اپنے والد سے ایسی روایات نقل کرتا ہے جو اس کی مرویات سے نہیں، اس سے احتجاج کرنا جائز نہیں، تھذیب التھذیب ص۸۳ ج۹، ومیزان الاعتدال ص۴۹۵ ج۳، وخلاصہ ص۳۸۶ ج۲، حافظ ابن حجر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، تقریب التھذیب ص۲۱۶۔

ثانیاً۔ جب مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ یہ حدیث مطلق (عام) ہے تو پھر یہ مفتی صاحب کی دلیل کس طرح بن گئی کیونکہ مبتدعین کا دعوی وعمل مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔

ثالثاً۔ اس حدیث کے کس لفظ کا معنی ہے کہ میت کے پیچھے بلند آواز کلمہ طیبہ وغیرہ کا ورد کیا جائے، جب سرے سے اس کا زیر بحث موضوع سے واسطہ ہی نہیں تو اس سے مبتدعین کی رسم کیسے ثابت ہوگئی، پھر اسی طرح کی دوسری ضعیف روایت میں آتا ہے کہ

قال رسول الله ﷺ اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا قلت یا رسول الله ﷺ وما ریاض الجنة قال المساجد، قلت وما الرتع یا رسول الله ﷺ قال سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو اس سے کچھ کھا لیا کرو،

میں (ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ جنت کے باغ کیا ہیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کی) مساجد، میں نے عرض کیا کہ کیسے کھالیا کریں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ، سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر۔ کا کہنا (اس کا کھانا ہے)

سنن ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ص۲۶۳ ج۴۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت کا تعلق مساجد میں ذکر، سبحان اللہ والحمدللہ، الخ کے کرنے سے ہے، مگر مبتدعین کے نزدیک تو مساجد میں میت کو لیکر جانا ہی ناجائز ہے (کیونکہ ان کے نزدیک مساجد میں نماز جنازہ مکروہ تحریمی ہے، فتاوی رضویہ ص۵۷ ج۴) تو پھر اس روایت سے مبتدعین کا مروجہ عمل کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔

رابعاً۔ اس کا تعلق ذکر مجلس سے ہے جیسا کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ روایت میں بھی، حلق الذکر، کے الفاظ موجود ہیں، مگر مفتی صاحب نے کمال دیانت داری سے، جوڑ توڑ کر کے اسے جنازہ کے پیچھے کے بارے میں باور کرایا ہے جو کہ صریحاً بددیانتی ہے۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

اسی مشکوٰۃ اسی باب میں ہے

الشیطن جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر الله خنس.

شیطان انسان کے دل میں چمٹا رہتا ہے جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر میت کو لے جاتے وقت ذکر اللہ کیا جاوے گا تو شیطان سے میت کو امن رہے گی، یہاں بھی ذکر میں آہستہ یا بلند کی کوئی قید نہیں۔

جاء الباطل ص۴۰۶ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ صاحب مشکوٰۃ نے اسے بخاری کی طرف مرفوعاً منسوب کیا ہے، مشکوٰۃ ص۱۹۹، حالانکہ یہ بخاری میں مرفوعاً نہیں بلکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، دیکھئے بخاری ص۷۴۴ ج۲۔

مولانا عبیداللہ محدث مبارک پوری فرماتے ہیں

فی عزو هذا السیاق المرفوع للبخاری نظر فانه ذکر فی تفسیر سورة الناس معناه عن ابن عباس موقوفا علیه من قوله لا مرفوعاً

یعنی اس سیاق و سباق کے لحاظ سے بخاری کی طرف نسبت میں نظر ہے کیونکہ امام بخاری نے سورۃ الناس کی تفسیر میں معناً اس کو ابن عباس کے قول سے بیان کیا ہے نہ کہ مرفوعاً۔ مرعاۃ المفاتیح ص۴۱۶ ج ۷۔

امام ابن کثیر نے تفسیر القرآن العظیم ص۵۷۵ ج ۴ میں علامہ سیوطی نے الدر المنثور ص۴۲۰ ج ۶ میں اسے ابن عباس کا قول ہی بیان فرمایا ہے۔

ثانیاً امام بخاری نے اسے تعلیقاً (بلا سند) روایت کیا ہے امام حاکم نے مستدرک ص۵۴۱ ج ۲ میں اس کی سند کو بیان کیا ہے جس کو حافظ ابن حجر نے حکیم بن جبیر راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے،

فتح الباری ص۶۰۲ ج ۸، وتغلیق التعلیق ص۳۸۱ ج ۴۔

آئمہ جرح و تعدیل نے حکیم بن جبیر کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ضعیف و متروک ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ضعیف الحدیث اور مضطرب ہے امام ابن معین فرماتے ہے کہ ہیچ محض ہے امام معاذ اور یحییٰ قطان نے امام شعبہ سے کہا کہ ہم حکیم کی روایت کا مزاکرہ نہ کریں؟ تو انہوں نے کہا کہ میں (جہنم کی) آگ سے ڈرتا ہوں امام یعقوب، امام ابو زرعہ، امام ساجی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، بلکہ ابو زرعہ نے اسے منکر الحدیث بھی کہا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں قوی نہیں، دارقطنی کا کہنا ہے کہ متروک ہے۔

تھذیب التھذیب ص۳۸۳ ج ۲، ومیزان الاعتدال ص۵۹۳ ج ۱۔

الغرض یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہونے کے ساتھ ساتھ ضعیف بھی ہے۔

ثالثاً۔ اس قول ابن عباس میں ذکر کرنے والے کے دل سے شیطان کے ھٹ جانے کا ذکر ہے نہ کہ میت کے پاس ذکر بالجہر کرنے سے شیطان میت کو دکھ نہ دے گا جیسا کہ مفتی صاحب باور کرا رہے ہیں۔

رابعاً۔ اس میں سرے سے زیر بحث مسئلہ کا بیان ہی نہیں کہ میت کے ساتھ کلمہ طیبہ کا ذکر بالجہر

کیا جائے تو میت سے شیطان دور ہو جاتا ہے، تو پھر یہ مفتی صاحب کی دلیل اور مبتدعین کے عمل کا ثبوت کیسے بن گئی۔

خلاصہ کلام

یہ کہ مفتی صاحب اپنے دعوی کے ثبوت میں کوئی واضح اور صریحاً دلیل پیش نہیں کر سکے، ہاں البتہ غیر متعلقہ روایات کی بھر مار کر دی ہے جن کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ مبتدعین کا دعوی خاص ہے اس کیلئے دلیل بھی خاص کی ضرورت ہے مگر مفتی صاحب نے مطلق ذکر کی روایات بیان کر کے اس قلعہ کو فتح کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے، جو امر واقعہ میں کار آمد نہیں۔ بلکہ مفتی صاحب نے عوام کو مغالطہ دینے کی غرض سے ایسی روایات بھی بیان کر دی ہیں جن کا شرم کے مارے انہوں نے خود بھی معنی ترک کر دیا ہے کہ کہیں عوام یہ نہ کہہ دیں کہ حضرت جی اس سے ہمارا عمل کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے، حدیقۃ الندیہ اور امام شعرانی کی عبارات ذکر کی ہیں، مگر کسی دینی مسئلہ کا ثبوت فقط کتب فقہ کی عبارات سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ٹھوس قرآن و حدیث کے دلائل درکار ہیں، جو خیر سے مبتدعین کے پاس قطعاً نہیں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام شعرانی حنفی نہیں بلکہ شافعی المسلک تھے، اور شافعیہ کی عبارات جب مفتی صاحب کے رد میں ہوں تو یہ کہہ کر جان چھڑا جاتے ہیں کہ یہ شافعی ہیں لہذا ان کی بات ہم حنفیہ پر حجت نہیں، دیکھئے جاء الباطل ص۳۱۶ ج۱۔

مگر یہاں شافعیہ کی عبارات کو حجت باور کرار ہے ہیں، جو کہ صریحاً اصول شکنی ہے، اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

SCANNING: MUHAMMAD SHAKIR
truemaslak@inbox.com

باب حیلہ اسقاط کی بحث

حیلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

تعریف کے لائق وہ مالک حقیقی ہے جس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہماری ھدایت کیلئے دین حق دیکر بھیجا اور اس میں تمام فوائد کو بیان کر دیا جو بنی آدم کی بہتری اور فلاح وبہبود کیلئے کافی وشافی ہیں آنحضرت ﷺ نے حکم الہیہ پر عمل کر کے دین اسلام کی تعلیم کو روشن سے روشن تر کر دیا بالآخر آپ علیہ السلام نے پورے جزم ویقین کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ

لقد ترکتکم علی مثل البیضاء لیلها کنها رها. الحدیث

یعنی اللہ کی قسم ہے کہ میں نے آپ کو ایسی روشن شریعت پر چھوڑا، کہ جس کی رات بھی دن کی طرح ہے، کنز العمال (۱۰۶۲) وابن ماجہ (۵) وکتاب السنۃ لابن ابی عاصم ص۲۷ ج۱۔ وسندہ حسن، الترغیب ص۸۸ ج۱

دین میں جس قدر مصلحتیں اور آسانیاں تھیں انہیں رسول اللہ ﷺ نے کھول کر بیان کر دیا، اور ان کی توضیح وتشریح اس طرح بیان فرمائی کہ رب القدیر نے اپنی طرف سے دین اسلام کی تکمیل کا اعلان فرما دیا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً. (المائدہ آیت ۳).

(اور) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا، (۵-۳)

دین کی تکمیل یہی ہے کہ اس میں رشد وھدایت کے تمام طریقوں اور اعمال صالحہ کو بیان کر دیا گیا ہے اور ان پر عمل کرنا، ان کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا اور بلا چوں وچرا نہایت سادگی سے قبول کر لینا ہی راہ ھدایت اور طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور دین میں استقامت ہے۔

اگر اسقاط کے طریقے سے میت کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا یا رب قدیر کی رحمت کا حصول ممکن تھا تو

رسول اللہ ﷺ اس کو ضرور بیان فرماتے، اور امت کو ایسا کرنے کا حکم فرماتے، کیونکہ آپ علیہ السلام رحمۃ للعالمین ہیں، آپ ﷺ کے دل میں امت کی ہمدردیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئیں تھیں، بنی آدم کے ایسے غم خوار تھے کہ رب قدیر نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ،

فلعلک باخع نفسک علی آثار هم ان لم یومنوا بهذا الحدیث اسفا. (الکهف ٦)

(اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم انکے پیچھے رنج کر کے اپنے تیئں ہلاک کر دو گے (۱۸-

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین (الشعراء ۳)

(اے نبی ﷺ) شاید تم اس (رنج) سے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تیئں ہلاک کر دو گے (۲۶-۳)

امام راغب، بخع، کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

البخع قتل النفس غما.

یعنی غم واندوہ سے جان کو تلف کر دینا، المفردات ص ۳۹۔

یہ دونوں آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھیں، جب کفار مکہ کی عداوت کا یہ حال تھا کہ کسی معقول بات کو سننا تو کجا بلکہ مذاق اڑاتے تھے، لیکن ادھر پیکر رحمت کی یہ حالت ہے کہ اہل مکہ کو ہر وقت ہلاکت سے بچانے کا فکر دامن گیر ہے، بیت اللہ کے صحن میں، مکہ کی گلیوں و بازاروں میں ان کے دیوان خانوں میں جا کر آپ علیہ السلام انہیں سمجھاتے ہیں، لیکن وہ ہر بار آپ علیہ السلام کو جھڑک دیتے ہیں؟ غصے ہوتے ہیں، قتل کرنے کا منصوبہ تیار کرتے ہیں، منہ پر گالیاں دیتے ہیں، راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں، مگر آپ علیہ السلام کا یہ بے لوث عمل جاری رہتا ہے، رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، لوگ محو خواب ہوتے ہیں، تو یہ اخلاص و محبت کا پیکر اٹھتا ہے، اپنا سر پروردگار عالم کے سامنے جھکاتا ہے، اور خالق ارض وسماء سے رو رو کر ان کیلئے ہدایت کی دعائیں و التجائیں کرتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک بھی ایمان سے محروم رہا تو آپ علیہ السلام کی جان پر بن جائے گی، اس کیفیت کو اللہ تعالی دیکھتا ہے، تو ارشاد ہوتا ہے کہ ان جان کے دشمنوں اور خون کے

پیاسوں کیلئے اس قدر بے چینی و اضطراب، نہ کیجئے کہ اپنی جان ہی تلف کردیں بلکہ تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

و كذب به قومك و هو الحق قل لست عليكم بو كيل. (الانعام ٦٦)

اور اس (قرآن) کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سرا سر حق ہے کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں (٦-٦٦)

آپ علیہ السلام کے دل میں تو غیروں کیلئے بھی اس قدر نرم گوشہ تھا۔ کہ جنہوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا تھا ان کے حق میں بھی جب جبرائیل امین پروردگار عالم کا یہ پیغام لیکر آئے کہ اگر آپ حکم کریں تو میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں، تو ایسا ہی ہوگا۔

مگر پیکر رحمت ﷺ فرماتے ہیں

بل ارجوان يخرج الله عزوجل من اصلابهم من يعبد الله عزوجل وحده لايشرك به شيئا، الحديث، عن عائشة رضى الله عنها.

نہیں بلکہ مجھے اللہ عزوجل سے امید ہے کہ ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کریگا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی، صحیح بخاری ص ۴۵۸ ج ۱، و صحیح مسلم ص ۱۰۹ ج ۲۔

جو شخصیت اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ اتنی رؤف و رحیم ہے، اس کا اپنی امت سے کس قدر پیار و محبت ہوگا، اس کے دل میں کلمہ گو کو بخشوانے کی کس قدر تڑپ ہوگی، اس کا اندازا لگانا مشکل ہے، مگر اتنی عظیم شخصیت نے ہمیں اس کی تعلیم نہیں دی کہ جب مسلمان مرجائے تو اس کو بخشوانے کیلئے حیلہ اسقاط کرنا، فرائض سے غافل کی غفلت کے جرم کو اسقاط کے ذریعہ معاف کروانا، پوری دنیا کے مبتدعین سر توڑ کوشش کرلیں انہیں کوئی صحیح تو کجا ضعیف حدیث بھی نہیں ملے گی کہ بے نمازی وغیرہ کیلئے حیلہ اسقاط کیا جائے، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ یار لوگوں نے قوم سے پیسے بٹورنے کا ایک بہانا بنا رکھا ہے، سادہ عوام کو ان کے والدین کی بخشش کا جھانسا دیکر پیٹ پوجا کا ایک دروازہ کھول رکھا ہے، بلکہ الٹا اس بدعت کا انکار کرنے والوں کو ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔

وہابی جس طرح زندہ مسلمان کے دشمن ہیں اسی طرح مردوں کے بھی دشمن کہ ان کو نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ (لعنۃ اللہ علی الکاذبین ابوصھیب) اور مرے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جاء الباطل ص ۳۸۳ ج ا۔

حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ ہے، ہمارا دامن ان الزامات سے بری ہے، نہ تو ہم کسی زندہ وفوت شدہ مسلمان کے دشمن ہیں اور نہ ہی ہم ان کو فوائد پہنچانے کے منکر ہیں، مرنے والوں کے حق میں مغفرت کی دعا کو مسنون جانتے ہیں، والدین کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنے کے بھی قائل ہیں۔

اگر دشمنی سے مراد مفتی صاحب کی حیلہ اسقاط کا انکار ہے تو پھر اس دشمنی میں ہمارے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنھم آئمہ عظام فقہاء کرام بھی شامل ہیں، لہذا اسکے بہانے فقط بچارے وہابیوں کو ہی کیوں مطعون کیا جارہا ہے، ان کے پورے گروہ کو مطعون کیجئے جو تمام کے تمام ان خرافات کے منکر ہیں اور بالخصوص نبی ﷺ کی ذات مقدسہ کو جنہوں نے حیلہ اسقاط کی تعلیم نہ دیکر مسلمانوں سے دشمنی کی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رب کعبہ کی قسم ہے کہ اسقاط نہ کرنا مومنوں سے دشمنی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اسقاط ضرور کرتے، معلوم ہوا کہ یہ مومنوں سے سرے سے دشمنی ہی نہیں بلکہ بدعت پسند پارٹی نے عوام کا مال ہضم کرنے کا ایک ذریعہ تلاش کرر کھا ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ

یا یھاالذین اٰمنوا ان کثیراً من الاحبار و الرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ (التوبۃ ۳۴)

یعنی اے ایمان والو! بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں (۹-۳۴)

الغرض بریلوی مولوی و مشائخ اور گدی نشین پیر وفقیر اور درویش بلکہ حکیم الامت وغیرہ بالکل اس آیت کے مصداق ہیں کہ ان لوگوں نے عوام کو عبادات کی بجائے کھانے پینے کی رسوم کی طرف متوجہ کر رکھا ہے، اگر ان رسومات قبیحہ کو نکال دیا جائے تو بریلوی مکتب فکر کے انفرادی نظریات پچاس فیصد ختم ہوجاتے ہیں باقی جو بچتے ہیں وہ یا تو ان کے تابع ہیں یا جہالت کی وجہ سے تعصب وضد کی

پیداوار ہیں، ورنہ یقین جانیے کہ اسلام کا دامن ان خرافات سے پاک ہے۔

جن لوگوں نے حیلہ کیا تھا ان کا انجام

قرآن اس بات پر گواہ ہے جن لوگوں نے رب تعالی کے حکم کو حیلہ سے ٹال دیا تھا ان کو اللہ تبارک وتعالی نے اس دنیا میں ہی کڑی سزا دی کہ انہیں بندر بنا دیا، ارشاد ہوتا ہے

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لھم کو نوا قردۃ خسئین☆ فجعلنھا نکالا لما بین یدیھا و ما خلفھا و موعظۃ للمتقین☆ (البقرہ آیت ۶۵و۶۶)

اورتم ان لوگوں کو بخوبی جانتے ہو جوتم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے، تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ، اور قصے کو اس وقت کے لوگوں کیلئے اور جوان کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیز گاروں کیلئے نصیحت بنا دیا (۲-۶۵و۶۶)

قرآن کے یہ الفاظ حیلہ کے رد میں نص صریح ہیں کہ اللہ تعالی کے احکام کو حیلوں و بہانوں سے رد کرنا، عذاب الہی کو دعوت دینا ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے حیلہ سے ہی حکم الہی کی نافرمانی کی تھی کہ انہیں اس بات کا حکم دیا گیا کہ سبت کا دن عبادت کیلئے مخصوص ہے، اس روز ان کیلئے دنیاوی کاروبار ممنوع تھے لیکن مرور زمانہ کی وجہ سے انہوں نے رفتہ رفتہ اس حکم کو حیلہ وفریب سے بے اثر کر دیا تو خالق کائنات نے ان کے اس فعل کو برداشت نہ کیا اور ان پر اپنا عذاب مسلط کر دیا، جس نے انہیں ذلت و خواری کے ساتھ صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا، پھر ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ اس سزا کو ہم نے اگلے پچھلے لوگوں کیلئے عبرت بنا دیا اور پرہیز گاروں کیلئے نصیحت، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن کا مقصود فقط داستان سرائی نہیں بلکہ ہماری عبرت پزیری کیلئے اسے بیان کر رہا ہے۔

مفتی صاحب کا اعتراض

فرماتے ہیں کہ حیلہ کا حرام ہونا بھی بنی اسرائیل پر عذاب تھا جیسے کہ بہت سے گوشت ان پر حرام تھے، ایسے ہی یہ بھی اس امت پر جائز حیلوں کا حلال ہونا رب کی رحمت ہے نیز انہوں نے حرام

کو حلال کرنے کا حیلہ کیا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار ان پر حرام تھا ایسے حیلے اب بھی منع ہیں۔ جاء الباطل ص۳۹۱ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کی مذکورہ عبارت میں تناقض ہے، پہلے تو فرمایا کہ حیلے بنی اسرائیل پر حرام تھے، جو اللہ کی طرف سے ان پر عذاب تھا، مگر امت مسلمہ پر حیلوں کا جائز ہونا رحمت ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ حرام کو حلال کرنا ان میں بھی ناجائز تھا اور ہمارے ہاں بھی منع ہیں۔

گویا مفتی صاحب پہلے ایک چیز کو ان کیلئے عذاب اور اپنے لئے رحمت کہہ رہے ہیں لیکن معاً بعد ہی اسی چیز کو ان کیلئے بھی حرام اور اپنے لئے بھی منع فرمارہے ہیں، یعنی جس طرح ان کیلئے حیلوں کی ممانعت عذاب تھی ایسے ہی اب بھی ہے، معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کتاب لکھتے وقت محو خواب ہوتے تھے، کہ کچھ نہ کچھ جواب تحریر کردوں، یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔

ثانیاً۔ بعض ایسے گوشت جو امت اسلام پر حلال اور بنی اسرائیل پر حرام تھے، اس چیز کا بیان تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضرت محمد ﷺ نے کیا ہے، اور ان کی حلت کو کھول کر بیان فرمایا ہے، تو کیا بنی اسرائیل کے حیلوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے امت محمدیہ کیلئے جائز بنایا ہے، دلیل دیجئے۔

یقین جانیئے کہ یہ مفتی صاحب کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر کھلا کھلا بہتان ہے، پوری دنیا کے منکرین سنت خیر الانام اور عاشقین بدعات سرتوڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کرسکتے۔

اہل اسلام مفتی صاحب کے اس کلام سے مغالطہ نہ کھانا بلکہ آپ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صاف کہا ہے کہ حیلہ جس طرح قوم موسیٰ پر حرام تھا اسی طرح امت محمدیہ ﷺ پر بھی حرام ہے، چنانچہ امام ابن بطہ نے اپنی معروف کتاب، ابطال الحیل (رقم الحدیث ۴۲) میں نبی ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال لاترتکبوا مارتکبت

الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل.

یعنی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جن چیزوں کے یہود مرتکب ہو چکے ہیں، تم نہ ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو ادنیٰ حیلوں سے حلال کر لینا۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند جید ہے، تفسیر ابن کثیر ص ۱۰۷ ج ۱ و ص ۲۵۷ ج ۲۔

مگر حضرت مفتی صاحب اس صحیح حدیث کے بالمقابل یہ دعوی کرتے ہیں کہ حیلوں کا حرام ہونا یہود پر عذاب تھا جب کہ یہ ہمارے لئے حلال ہو کر رحمت الٰہی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے جی اگر ہمارے لئے یہ رحمت ہوتے تو نبی ﷺ اسے منع نہ فرماتے، کیونکہ آپ علیہ السلام حصول رحمت کے کاموں کی تلقین کرنے کیلئے آئے تھے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کرنے سے منع کرنے کی غرض سے تشریف نہ لائے تھے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا یہ دعوی کہ ایسے حیلے اب بھی حرام ہیں جس سے حرام کو حلال کر لیا جائے، یقین جانیئے کہ اس عبارت کو لکھ کر مفتی صاحب نے عوام کو مغالطہ دیا ہے کیونکہ اس عبارت پر خود مفتی صاحب کا ایمان بھی حلق کے اوپر اوپر سے ہی ہے، ورنہ یہ لوگ حیلے سے حرام کو حلال میں بدلنے کے قائل ہیں، کیونکہ خود انہوں نے اسی کتاب میں حلالہ کا فتوی دیا ہے، دیکھئے جاء الباطل ص ۴۵۴ ج ۱،

ہم قارئین کرام کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مبتدعین سے پوچھئے کہ کیا حلالہ کے ذریعے آپ حرام کو حلال میں نہیں بدلتے؟ اگر بدلتے ہیں اور یقیناً بدلتے ہیں، تو بتایئے ایسا شخص کس قبیل کا ہے جو محض اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے صریحاً جھوٹ بولتا ہو۔

اس کی ایک اور مثال خود مولف جاء الباطل کی تصانیف سے سنتے جایئے، فرماتے ہیں، سید کو زکواۃ دینے یا مسجد میں لگانے کیلئے یہ حیلہ کیا جاوے کہ کسی فقیر کو دے دی جائے اور وہ مالک بن کر اپنی طرف سے وہاں صرف کر دے تو عین ثواب ہے، تفسیر نعیمی ص ۴۲۲ ج ۱، اور اس چیز کو اختصار کے ساتھ مفتی صاحب نے جاء الباطل ص ۳۸۹ ج ۱، میں بھی بیان کیا ہے اب دیکھئے کہ مسجد میں زکوٰۃ

کو صرف کرنا حنفیہ کے نزدیک حرام ہے، اس حرام کو اس حیلے سے حلال کر لیا ہے کہ فقیر کو دیکر پھر مسجد کے مصرف میں لائی گئی ہے، اس طرح سید آل رسول پر زکوٰۃ حرام ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبدالمطلب بن ربیعة رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

قال رسول الله ﷺ ان هذه الصدقات انما هي اوساخ الناس و انها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلا شبہ یہ صدقات لوگوں کی میل کچیل ہے اور بے شک یہ حلال نہیں محمد ﷺ اور ان کی آل کیلئے،

مشکوٰۃ ص ۱۶۱، وصحیح مسلم ص ۳۴۴ ج ۱، ومسند احمد ص ۱۶۶ ج ۴،

یہ حدیث اس بات پر برہان واضح ہے کہ آل رسول اللہ ﷺ پر زکوٰۃ حرام ہے، مگر مفتی صاحب اس حرام کو حیلے سے بدل رہے ہیں، مگر پھر بھی یہ کہتے ہوئے ذرا برابر شرم و حیا نہیں کہ ہمارے نزدیک جس حیلے سے حرام حلال بن جائے وہ حیلہ حرام ہے، اس پر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہیں عادت ہے بھول جانے کی۔

حیلہ اللہ تعالیٰ کی شریعت سے مذاق ہے

حیلہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے مذاق ہے، کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حرام کی ہے اس میں دینی و دنیاوی فوائد اور عظیم الشان مصلحتیں ہیں۔ اب جو شخص کسی حرام چیز کو حیلے سے حلال کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے ان کا مذاق اڑاتا ہے، فقیر کو زکوٰۃ دیکر سید کو دلوانی محض ایک فریب ہے کیونکہ جب فقیر کو ہی اس شرط پر دی کہ تو نے فلاں شخص کو دینی ہے، تو یہ فقیر کو سرے سے دینا ہی نہیں (زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقیر کا درمیان میں واسطہ پڑ گیا ہے) کیونکہ انسان کے فعل کا دارومدار نیت پر ہے، ان چیزوں کو ہی ملحوظ رکھ کر حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں، کتاب الحیل، کی ابتدا ہی اس فرمان نبوی سے کی ہے کہ

انما الا عمال بالنية،

یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ صحیح بخاری ص ۱۰۲۸ ج ۲۔

اب دیکھئے کہ زکوٰۃ دینے کی اصل نیت تو سید کو تھی، مگر درمیان میں فقیر کا واسطہ ڈال لیا، تو اس واسطے سے دینے والے کی نیت نہیں بدلی بلکہ دینے کا طریقہ بدلا ہے جو معتبر نہیں۔

الغرض حیلہ کے مردود و باطل ہونے کی یہ زبردست دلیل ہے کہ یہ دین کے احکام سے مذاق ہے اور یہ اس قدر فعل قبیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

یخٰدعون الله و الذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم و ما یشعرون. (البقرہ ۹)

یہ اللہ تعالیٰ اور مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں مگر (حقیقت میں) اپنے سوا کسی کو چکما نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں (۲-۹)

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

فرماتے ہیں کہ حیلہ کو دھوکا کہنا جہالت ہے حیلہ سے مراد ہے ضرورت شرعیہ کو پورا کرنیکی شرعی تدبیر، اردو میں بولتے ہیں، حیلے رزق بہانے موت، اور شرعی حیلہ تو رب نے سکھایا اور حضور علیہ السلام نے تعلیم فرمایا۔ جاء الباطل ص ۳۸۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ صریحاً جھوٹ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حیلے کی تعلیم فرمائی ہے، یقین جانئیے کہ پوری دنیا کے مبتدعین اس کا ثبوت نہیں دے سکتے، رہے وہ دلائل جو مفتی صاحب نے دیئے ہیں تو ان کی حقیقت آگے اپنے مقام پر آرہی ہے کہ ان سے حیلہ اسقاط کا مطلب مفتی صاحب کا کشید کردہ ہے۔

ثانیاً۔ لفظ حیلہ تحول سے مشتق ہے اور اس کا باب حال یحول ہے، واوٗ اپنے ماقبل کے کسرہ سے یا میں بدل گئی ہے، اور اس کا معنی ایک مخصوص قسم سے اس کا فاعل ایک حال سے دوسرے حال کی طرف گھوم جائے، پھر عرف میں اس کا غالب استعمال ان پوشیدہ راہوں میں چلنے سے ہوگیا جن سے انسان اپنی مرضی ایسے ڈھب سے کرے کہ جسے بجز فطین انسان کے دوسرا نہ پرکھ سکے جب

اپنے لغوی معنی سے اس عرفی معنی میں اس کی خصوصیت ہوگئی تو اس کا عام استعمال ناجائز و ممنوع چیزوں میں حصول غرض کیلئے ہوگیا، مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں تو حیلہ بازوں سے ہے، فلاں شخص سے معاملہ نہ کرنا وہ بڑا حیلہ ساز ہے، فلاں حیلہ سکھاتا ہے۔

دیکھئے تاج العروس ص۲۹۴ ج ۷، ولسان العرب ص۱۸۵ ج ۱۱۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب اس حقیقت کا محض انکار ہی نہیں بلکہ الٹا ہمیں جہالت کا طعنہ دے رہے ہیں، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

پھر اس پر دلیل عنایت کی ہے کہ اردو میں بولتے ہیں، حیلے رزق بہانے موت، حالانکہ اس مثال سے بھی مفتی صاحب کا مدعا واضح نہیں ہوتا کیونکہ اس کا معنی ہے کہ رزق کوئی نہ کوئی کام کرنے سے ملتا ہے، موت کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ فیروز اللغات ص۵۷۸۔

غور کیجئے اس معنی سے مفتی صاحب کے زیر بحث حیلہ کو کیا تعلق ہے، علاوہ ازیں اگر مفتی صاحب نے اردو محاورات سے ہی دیکھنا ہے تو اردو لغات میں حیلہ کا معنی، فریب، دھوکا، لکھا ہوا ہے، دیکھئے فیروز اللغات ص۵۷۸، وعلمی اردو لغت (متوسط) ص۴۵۲۔

ثم اقول

اے جی ہمارا آپ کا اختلاف حیلہ کے معنی میں نہیں کیونکہ یہ اچھے معنی میں بھی مستعمل ہے، قرآن میں ہے

الا المستضعفين من الرجال و النساء و الولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا. ○ النساء ۹۸)

ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں (۴۔۹۸)

دیکھئے یہاں حیلہ سے مراد وہ طریقہ ہے جس سے کفار کے ہاتھوں سے چھٹکارا مل جائے، تو گو اس پر بھی حیلہ کا لفظ بولا گیا ہے۔

الغرض لفظ حیلہ اچھی تدبیر پر بھی بولا جاتا ہے اس سے ہمیں اختلاف نہیں بلکہ اختلاف تو اس حیلہ سے ہے جو آپ کر کے حکم شرعی کا حکم بدلتے ہیں جس سے حرام حلال میں بدل جاتا ہے، زکوٰۃ

سید کیلئے حرام تھی۔ آپ نے حیلہ سے سید کیلئے حلال کر دی تو اس اصطلاحی مفہوم کو ہم نے دھوکا قرار دیا ہے۔

دوسرا اعتراض

فرماتے ہیں کہ لینے کا حیلہ کرنا برا اور دینے کا حیلہ کرنا اچھا ہوتا ہے، اس میں فقرا کو دینے کا حیلہ ہے.......... یہ آیت منافقین کے متعلق نازل ہوئی جو کہ کلمہ ایمانی کو اپنے لئے آڑ بناتے تھے، اور دل میں کافر تھے، مسلمانوں کے عمدہ اور شرعی اعمال پر اس کو چسپاں کرنا سخت جرم ہے، جاء الباطل ص۳۹۰ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ بات کہہ دی ہے، ورنہ کسی سے حیلہ سے چیز لینے کے تو خود مفتی صاحب بھی قائل ہیں، اسی بحث میں حیلہ کے جواز پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ بنیامین کو اپنے پاس رکھیں اور راز ظاہر نہ ہو اس کیلئے بھی ایک حیلہ فرمایا، جاء الباطل ص۳۸۴ ج ا۔

دیکھئے اس دلیل میں مفتی صاحب نے حیلہ کی یہ دلیل عنایت فرمائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے بنیامین کو حیلہ سے چھین لیا تھا، تو چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے استدلال نہ کرتے بلکہ اس کا جواب تحریر کرتے مگر مفتی صاحب کا چونکہ موقف ہی یہ ہے اس لئے اس سے استدلال کر لیا، مگر اس کے پانچ صفحات بعد فرماتے ہیں کہ لینے کیلئے حیلہ کرنا غلط ہے۔

ایمان سے کہنا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک میں مفتی صاحب کاذب ہیں کہ نہیں؟

ثانیاً۔ گویا مفتی صاحب کے نزدیک حیلہ سے حرام کو حلال کر کے اپنا مقصود حاصل کرنا تو ناجائز ہوا مگر کسی کا مقصد پورا کرنا جائز ہوا، خشیت الٰہیہ کو پیش نظر رکھ کر کوئی عاقل یہ بات کہہ سکتا ہے کہ شراب پینی تو ناجائز ہے مگر پلانی جائز ہے، چوری، بدکاری، حرام خوری، وغیرہ کرنی تو حرام ہیں، مگر کروانی جائز کیونکہ اس میں کسی کا بھلا ہے، انا للہ انا الیہ راجعون۔

معلوم نہیں کہ اتنی چھوٹی سی بات ان بڑے بڑے متفکرین بریلویہ کے دماغ میں کیونکر نہیں اتر رہی کہ اس پر اڑے بیٹھے ہیں کہ لینے کیلئے حیلہ ناجائز اور دینے کیلئے حلال، گویا مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند مولوی حضرات سے حیلہ سے رقم بٹورنا تو حرام، مگر حیلہ سے ان کی جیب بھر دینا جائز، کیا کہنے ہیں آپ کی قانون سازی، اصول دانی، فتوی نویسی، اور کتب میں دلائل کی دریافت کے، اس طرح کی ہیرا پھیریوں پر امت بریلویہ انہیں حکیم الامت کہتی ہے جو دراصل امت کا سب سے بڑا مریض ہے۔

ثالثاً۔ یہ بھی خوب کہا کہ ان آیات کا تعلق منافقین سے ہے کلمہ گو سے نہیں، اور مسلمان کے بارے میں کہنا سخت جرم ہے، اے جی جس صفت کو اللہ تعالی منافقین کی صفت قرار دے اور مومن کلمہ گو بھی اس فعل کا مرتکب ہو تو کیا کلمہ گو کو اس سے الگ کر لیا جائے کہ یہ صفت منافقین کی ہے نہ کہ ایک مسلمان کی، جبکہ کلمہ پڑھکر اس فعل قبیح کا مرتکب ہو رہا ہو، جناب عالی اس صورت میں کلمہ گو کا گناہ تو کافر سے سنگین ہو جائے گا کہ اس نے ایمان کے بعد برے فعل کا ارتکاب کیا ہے نہ یہ کہ اس فعل کا گناہ یہ کہہ کر کم قرار دیا جائے گا کہ یہ مسلمان ہے۔

ثم اقول، سورۃ الانعام کے رکوع ۱۹، میں کفار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ تعالی نے تم پر، شرک، والدین سے بدسلوکی، ناداری کے اندیشے سے اولاد کو قتل کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا، یتیم کے مال کو کھانا، ماپ تول میں بے ایمانی، اور اللہ تعالی سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہ کرنا حرام قرار دیا۔ (الانعام ۱۵۱ تا ۱۵۲)

اب اگر کوئی کلمہ پڑھنے والا ان افعال کا مرتکب ہو، بت کی عبادت کرے، والدین کو مارے پیٹے، اولاد کو قتل کرے، لوگوں کو بلا شرعی عذر کے قتل کرے، یتیم کے مال کو ہضم کر جائے، پیمائش اور وزن میں ہیرا پھیری کرے، اور نذر شرعی کو پورا نہ کرے، اور اپنے اس عمل کی دلیل یہ عنایت کرے کہ ان احکام کا تعلق تو کفار سے ہے اور ان آیات کا سبب عرب کے کافر تھے، نہ کہ امت محمدیہ ان آیات کی مخاطب ہے، تو کیا وہ ایسا کرنے اور کہنے میں حق بجانب ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی طرح گو ان آیات کا تعلق منافقین سے ہے مگر اس حکم کے تمام مسلمان مخاطب ہیں کہ ان جیسے فعل نہ کرنا، قرآن نے ان کا ذکر محض داستان سرائی کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ہماری عبرت کیلئے کیا ہے کہ

ان افعال قبیحہ کا تم بھی مرتکب نہ ہونا کیونکہ جو شخص بھی کلمہ پڑھ چکنے کے بعد ایسا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک منافقین کی جماعت وگروہ میں سے ہے نہ کہ سچے اور پکے مسلمانوں کی جماعت میں اس کا شمار ہوگا۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

فرماتے ہیں کہ۔ اسقاط کے مال کی وجہ سے نماز معاف نہیں ہوتی بلکہ زمانہ زندگی میں نماز پڑھنے کا جو قصور میت سے ہو چکا ہے اور اب اس کا بدلہ میت سے ناممکن ہے اور میت اس میں گرفتار ہے اس کے قصور معاف کرانے کا یہ حیلہ ہے کیونکہ صدقہ غضب الٰہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، الصدقۃ یطفی غضب الرب، مشکوٰۃ باب الجمعۃ میں ہے کہ جس سے نماز جمعہ چھوٹ جائے وہ ایک دینار خیرات کرے، اسی مشکوٰۃ باب الحیض میں ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے بحالت حیض صحبت کرے تو ایک دینار یا نصف دینار خیرات کرے، یہ خیرات کیا ہے، اس گناہ کا کفارہ ہے جس کا بدلہ ناممکن ہوگیا۔ جاء الباطل ص ۳۹۰۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب یہ تحریر کرتے وقت ایسے مبہوت تھے کہ انہیں یہ ہی خبر نہ رہی کہ کیا لکھ رہے ہیں، لکھنا تو یہ چاہتے تھے کہ نماز نہ پڑھنے کا، مگر لکھ دیا کہ نماز پڑھنے کا جو قصور الخ۔

ثانیاً۔ حیلہ اسقاط کی یہ دلیل بھی نرالی ہے کہ صدقہ غضب الٰہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، اے جی اس کی دلیل عنایت کیجئے کہ حیلہ اسقاط غضب الٰہی کو ٹھنڈا کرتا ہے، کیونکہ بحث صدقہ میں نہیں بلکہ حیلہ اسقاط پر ہو رہی ہے، جس کی دلیل دینے کی بجائے آپ خلط مبحث کر رہے ہیں، واضح رہے کہ مفتی صاحب نے روایت کے الفاظ غلط نقل کیئے ہیں، درست الفاظ اس طرح ہیں

الصدقة تطفی غضب الرب، طبرانی اوسط ص ۳۷۲ ج۸، و مجمع الزوائد ص ۱۱۳ ج۳، و ص ۱۷۳ ج ۹.

علاوہ ازیں یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اس کی سند میں اصرم بن حوشب، راوی ہے، اسے امام یحیٰی نے کذاب (بہت بڑا جھوٹا) اور خبیث کہا ہے، امام بخاری امام مسلم، نسائی نے متروک قرار

دیا ہے امام دارقطنی نے منکر الحدیث کہا ہے امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ ثقات راویوں پر احادیث گھڑتا تھا، میزان ص۲۷۲ ج۱، علامہ ھیثمی نے اس روایت کونقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند میں اصرم راوی متروک ہے، مجمع الزوائد (۱۷۳/۹) مگر افسوس کہ مفتی صاحب نے اسے دلیل بنا کر عوام کو الو بنانے کی فضول کوشش کی ہے، کیونکہ اول تو یہ روایت ہی من گھڑت ہے دوم اس کا تعلق حیلہ سے نہیں صدقہ و خیرات سے ہے اور صدقہ و خیرات اور حیلہ اسقاط کو ایک سمجھنا مفتی صاحب کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ثالثاً۔ رہا مفتی صاحب کا ترک جمعہ اور حائضہ سے وطی کے کفارہ کو پیش کرنا، تو یہ بھی ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ کفارہ اور حیلہ اسقاط ایک نہیں کہ کفارہ پر حیلہ کو قیاس کر لیا جائے، بلکہ کفارہ تو شرعی حکم ہے جسے بہر حال ادا کرنا پڑھے گا جبکہ حیلہ اسقاط تو کفارہ کو ٹالنے کا ایک بہانہ ہے، الغرض ادائگی اور ٹالنے کو ایک سمجھنا مفتی صاحب کے علم کا کرشمہ ہے۔

رابعاً۔ ان احادیث کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر جمعہ رہ جائے تو نماز ظہر کی بجائے ایک دینار صدقہ کردے تو فریضہ اس سے ساقط ہوجائے گا، نہیں ہرگز نہیں بلکہ نماز ظہر اس پر فرض ہے کیونکہ جمعہ ظہر کے قائم مقام ہے، اگر عذر شرعی کی وجہ سے جمعہ رہ جائے تو نماز ظہر پڑھنا فرض ہے۔

خامساً۔ من ترک الجمعة من بغیر عذر فلیتصدق بدینار فان لم یجد فبنصف دینار.

کی روایت سنداً ضعیف ہے کیونکہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا راوی قدامہ بن وبرۃ ہے، ابوداؤد ص۱۵۱ ج۱، ونسائی (۱۳۷۳) و حاکم ص۲۸۰ ج۱، و ابن حبان (۲۷۷۷ و ۲۷۷۸) و ابن ابی شیبہ ص۱۵۴ ج۲، وعقیلی ص۴۸۴ ج۳۔

اور امام بخاریؒ نے صراحت کی ہے کہ قدامہ کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں، تھذیب التھذیب ص۳۶۶ ج۸، و میزان ص۳۸۶ ج۳۔علاوہ ازیں قدامہ مجھول ہے (تقریب ص۲۸۱)

الغرض یہ روایت انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے، اگر کوئی حنفی کہے کہ یہ روایت سنن ابن ماجہ ص۸۰ میں قتادہ عن الحسن عن سمرہ کے طریق سے بھی مروی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سند بھی منقطع ہے کیونکہ حسن بصری کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سوائے عقیقہ کی حدیث کے سماع ہی

ثابت نہیں، چنانچہ فن رجال کے عظیم الشان امام یحیٰ بن معین کا کہنا ہے کہ حسن کی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی، کتاب المراسیل لابن ابی حاتم ص۴۳، قصہ مختصر یہ کہ اس میں بھی انقطاع ہے اور قتادہ کی تدلیس بھی موجود ہے، جس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

سادساً۔ رہی حائضہ عورت سے وطی کے کفارہ والی حدیث، گو اس کی سند میں بھی بعض نے کلام کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مختلف الفاظ اور اسناد سے مروی ہے جن میں بعض احادیث صحیح ہیں تفصیل کیلئے دیکھئے مرعاۃ ص۲۵۰ ج۲، لیکن اس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ حائضہ سے مباشرت کرنا سنگین جرم ہے، جس کی ممانعت قرآن مجید میں وارد ہے (البقرہ آیت۲۲۲) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی سختی سے روکا ہے، دیکھئے مشکوٰۃ باب الحیض الفصل الثانی عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ۔

اگر کوئی شخص بھول کر اس کا مرتکب ہو جائے اور اسے اپنے کیئے پر افسوس بھی ہو تو اسے حکم ہے کہ آئندہ کیلئے توبہ کرے اور حسب توفیق دینار یا نصف دینار صدقہ کر دے، اس حدیث کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ حائضہ سے مباشرت کی عادت ڈال لے اور ہر روز اٹھ کر صدقہ کر دیا کرے۔

سابعاً۔ گو حائضہ سے مباشرت کرنا گناہ ہے مگر اس گناہ میں وہ کسی عبادت شرعی کا تارک نہیں ہوا کہ حائضہ سے وطی کے کفارہ سے نماز روزہ کا کفارہ کشید کر لیا جائے۔ الغرض یہ قیاس ہی سرے سے باطل ہے۔

ثامناً۔ حائضہ سے وطی کے کفارہ کو تو شریعت نے واضح کر دیا ہے مگر نماز روزہ کا مالی کفارہ شریعت نے بیان ہی نہیں کیا، روزے کا کفارہ تو میت کی طرف سے روزے رکھنے کا ہے جیسا کہ اس پر صحیح احادیث گواہ ہیں۔

بخاری ص۲۶۲ ج۱، و مسلم ص۳۶۲ ج۱۔

(تفصیل آگے مفتی صاحب کے دلائل میں نماز اور روزے کا حیلہ، کے زیر عنوان آرہی ہے)

اور اسی طرح نماز کا مالی کفارہ متعین کرنا بھی غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کی نماز قضاء ہو جائے تو جب اسے یاد آئے تو نماز کو پڑھ لے کیونکہ اس کا یہی کفارہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

بخاری ص۸۴ ج۱، و مسلم ص۲۴۱ ج۱،

(حدیث کے اصلی الفاظ آگے مفتی صاحب کے دلائل میں، اسقاط کا ثبوت کے زیر عنوان آرہے ہیں) اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز کا کفارہ فقط اس کو ادا کرنا ہی ہے، مالی کفارہ بدنی عبادت کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

تاسعاً۔ کفارہ اور حیلہ کو ایک باور کرانا مفتی جی کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ کفارہ تو بہر حال ادا کرنے سے ہی انسان حکم شرعی سے عہدہ برآں ہوگا جبکہ حیلہ اسقاط حکم شرعی کو ٹالنے کا ایک طریقہ و بہانہ ہے۔

صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے

روایت ،صدقہ غضب الٰہی کو ٹھنڈا کرتا ہے،ضعیف ہے، لیکن صحیح حدیث میں الفاظ، والصدقۃ تطفیٔ الخطیئۃ، یعنی صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے، الحدیث ،عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنھم ، مسند ابو یعلی ص۳۸۳ ج۲، (۱۹۹۵) و مسند احمد ص ۳۲۱ ج۳، (۱۴۰۳۲) و مصنف عبدالرزاق ص۳۴۶ ج۱۱، (۲۰۷۱۹) و مستدرک حاکم ص۴۲۲ ج۴، و صحیح ابن حبان (۴۴۹۷) وشعب الایمان (۵۷۶۱)

اس حدیث کو حاکم و ذھبی نے صحیح کہا ہے، اور ھیثمی نے ، مجمع الزوائد ص۲۴۷ ج۵ میں مسند احمد کے راویوں کو صحیح کے راوی کہا ہے، یہ روایت مختصر حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، مسند احمد ص۲۴۳ ج۴، و نسائی ص۱۷۹ ج۲، و ترمذی باب ما ذکر فضل الصلاۃ (۶۱۴) و بیھقی ص۱۶۵ ج۸، وطبرانی صغیر ص۲۶۳ ج۱ (۴۳۰) مگر اس میں مذکورہ الفاظ، الصدقۃ تطفیٔ الخطیئۃ، کے نہیں، ہاں البتہ امام طبرانی نے ، المعجم لاوسط ص۲۴۳ ج۵، (۴۴۷۷) وطبرانی کبیر ص۱۰۶ ج۱۹ (۲۱۲) و طبرانی صغیر ص۲۷۴ ج۱ (۶۲۵) میں اور بیھقی نے ،شعب الایمان ص۵۷ ج۴ (۵۷۶۲) میں ان الفاظ کو بیان کیا ہے اور ھیثمی نے ، مجمع الزوائد ص۲۳۳ ج۱۰ میں طبرانی اوسط کے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صحیح حدیث کے مطابق صدقہ گناہوں کو مٹاتا ہے، واضح رہے کہ یہاں صدقے کے متعلق فرمان نبوی ﷺ ہے، حیلہ اسقاط کے بارے میں قطعاً نہیں، کیونکہ صدقہ کا لفظ ،صدق، سے مشتق ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ صدقہ کرنے والے نے عمل سے اپنے اسلام کی سچائی ثابت کی، جب کہ حیلہ تو حکم شرعی کو بدلنے کا نام ہے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک نہیں بلکہ دونوں آپس میں متعارض اور ضد ہیں، مگر یہ عقل وفہم کی باتیں مفتی جی کی بلا جانے۔

حیلہ نبی ﷺ کی نظر میں

اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ علیہ السلام پر چربی کو حرام قرار دیا تھا، مگر یہود نے اس کو پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کو ہضم کر گئے، رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے اس حیلہ کا تذکرہ کیا تو فرمایا

عن ابی هریره رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال قاتل الله الیهود احرمت علیهم الشحوم فباعوها و اکلوا اثمانها.

یعنی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر چربی کو حرام کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو کھا لیا، صحیح بخاری ص۲۹۶ ج۱، ومسلم ص۲۳ ج۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انکو خبر ملی کہ فلاں شخص شراب کی تجارت کرتا ہے تو فرمایا کہ اللہ اسے ہلاک کرے کیا اسے خبر نہیں کہ

ان رسول الله ﷺ قال قاتل الله الیهود حرمت علیهم الشحوم فجملوها فباعوها.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی تو انہوں نے چربی کو پگھلا کر فروخت کیا (اوراس کی قیمت کو کھا گئے) بخاری ص۲۹۶ ج۱، ومسلم ص۲۳ ج۲۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے، شراب، مردار، سور، اور بتوں کی تجارت سے منع فرمایا ہے لوگوں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ مردے کی چربی تو کشتیوں پر ملتے ہیں، (انہیں ملائم کرنے کی غرض سے) کھالوں پر لگاتے ہیں اور لوگ اس سے روشنی کرتے ہیں، آپ نے فرمایا نہیں وہ حرام ہے، پھر اسی وقت ارشاد فرمایا

قاتل الله الیهود ان الله لما حرم شحومها اجملوه ثم باعوه فاکلوا ثمنه.

اللہ تعالیٰ یہود کو تباہ کرے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی حرام کی تو انہوں نے پگھلایا اور پھر

اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو کھا لیا۔

صحیح بخاری ص ۲۹۸ ج ۱، و مسلم ص ۲۳ ج ۲۔

یہ احادیث اس بات پر گواہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود پر حیلہ کی وجہ سے بدعا کی ہے بلکہ صحیح مسلم میں ایک حدیث کے الفاظ، لعن اللہ الیھود، یعنی یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، ص ۲۳ ج ۲،

ظاہر ہے کہ جس فعل پر رسول اللہ ﷺ کسی قوم پر لعنت و بددعا کریں اس فعل کی اجازت اپنی امت کو کیسے دے سکتے ہیں۔

الغرض دین میں حیلہ کی اجازت دینے والے اور اس کو اسلام کا حصہ و جزو باور کرانے والے حضرات غلطی پر ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ھدایت اور سمجھ عطاء فرمائے، امین یا الہ العالمین۔

اصول شریعت کا تقاضا

شرعی اصول کا تقاضا ہے کہ جس حکم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح بیان فرمایا ہے اور اس کے رسول ﷺ نے جس ڈھنگ سے اس کی توضیح و تشریح بیان فرمائی ہے اسے بلا چون و چراں قبول کر لیا جائے، اس میں کمی و بیشی اور لاحقہ کے بغیر اس پر عمل کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے روزے کا فدیہ ایسے شخص کیلئے مقرر فرمایا ہے جو اس قدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس کی صحت کے لوٹنے کی امید نہ ہو، مگر جو شخص فوت ہو جائے اور اسکے ذمہ کچھ روزوں کی قضاء لازم ہو تو اس کے وارث کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے روزوں کی قضا کرے، بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

اگر مرنے والے کی طرف سے فدیہ بھی ادا ہو سکتا تو اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ فرما دیتے، مگر آپ علیہ السلام نے جب بیان ہی نہیں فرمایا تو ہم کسی غیر معصوم کی من گھڑت فقہ کو کیسے قبول کر لیں کہ اس کی طرف سے فدیہ بھی ادا ہو سکتا ہے، پھر فدیہ بھی اتنی بے ایمانی سے کہ ساری زندگی کے روزوں کی چند سیر گندم دیکر میت کا وارث فارغ ہو جائے اور اپنی آرام طلبی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بیان کی ہوئی روزوں کی قضا ساقط ہو جائے۔

مبتدعین کے اکابرین کی دراصل میت سے ہمدردی نہیں بلکہ اس کے وارث کو آرام مہیا کرنا ہے کہ جون و جولائی کی شدید گرمی میں میت کی طرف سے روزے رکھنے کی بجائے چند سیر گندم ہیر

پھیر کر کے صدقہ کر دے، تاکہ جہاں عوام شرعی حکم سے بچ جائیں وہاں مبتدعین کے پیش امام کو چند سیر گندم بھی مل جائے، پیٹ پوجا کیلئے یہ سب کچھ ایجاد ہوا ہے، مرنے والے سے ہمدردی سرے سے ہے ہی مفقود، مگر مفتی صاحب الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے پر عمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہابی مردوں کے دشمن ہیں، جاء الباطل ص۳۸۳ ج۱، اے جی ہم مردوں کے تو واللہ دشمن نہیں، ہاں البتہ آپ کے پیٹ پوجا کے طریقہ کے ضرور مخالف ہیں کیونکہ یہ غیر شرعی طریقہ ہے جس کو آپ حضرات نے چند دمڑیوں کی خاطر دین میں ایجاد کر رکھا ہے اور عوام کو میت سے ہمدردی باور کراتے ہیں جو حقیقت میں مرنے والے سے دشمنی ہے۔

اسی طرح نماز جو کہ بدنی عبادت ہے اس کا فدیہ بھی غلط ہے کیونکہ بدنی عبادت کا مالی کفارہ نہیں ہوا کرتا، پھر خاص کر نماز کہ جس کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا کفارہ فقط قضا پڑھنا ہے اور کوئی اس کا کفارہ نہیں،

بخاری ص۸۴ ج۱، ومسلم ص۲۴۱ ج۱۔

مگر یار لوگوں نے اس کا بھی کفارہ ایجاد کر لیا کہ چند سیر گندم کو ہیر پھیر کر کے پوری زندگی کی نمازوں کا فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔

مفتی صاحب کا اعتراض

یہ قیاس قرآنی آیت کے مقابل ہے کہ قرآن فرما رہا ہے، جو اس روزے کی طاقت نہیں رکھتے، ان پر فدیہ ہے، مسکین کا کھانا اور حکم الٰہی کے مقابل اپنا قیاس کرنا شیطان کا کام ہے کہ اس کو حکم الٰہی ہوا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کر، اس نے اس حکم کے مقابل اپنا قیاس دوڑایا مردود ہوا، پھر بدنی محنت کے مقابل مال کا ہونا عقل کے مطابق ہے کہ ہم کسی سے کام کراتے ہیں، اس کو معاوضہ مال دیتے ہیں، بعض صورتوں میں جان کا بدلہ بھی مال سے ہوتا ہے، کوئی نمازی پہلی التحیات بھول گیا تو سجدہ سہو کرے کسی نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا تو اس کے کفارہ میں ۶۰ روزے رکھے، حاجی نے بحالت احرام شکار کر لیا، اگر پیسہ ہے تو اس شکار کی قیمت خیرات کرے ورنہ روزے رکھے، یہ تمام کفارے خلاف قیاس ہیں مگر شریعت نے مقرر فرما دیا، بسر و چشم منظور ہے، جاء الباطل

ص ۳۹۰ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ اسے قیاس کہہ کر مفتی صاحب کا تردید کرنا خالص شیطانی وسواس ہے کیونکہ ہم نے صحیح احادیث پیش کر دی ہیں کہ مرے ہوئے شخص کی طرف سے روزوں کا کفارہ صدقہ و خیرات نہیں ہے، اسی طرح قضاء نماز کی احادیث پیش کر کے نماز کے مالی صدقہ کی تردید کی ہے مگر مفتی صاحب کو یہ قیاس نظر آتا ہے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔

ثانیاً۔ میت کی طرف سے روزوں کا مالی کفارہ ادا کرنا قرآن نے قطعاً بیان نہیں کیا، یہ مفتی صاحب کا کھلا مغالطہ اور صریحاً جھوٹ اور سولہ آنے شریعت پر افترا ہے، اگر کسی بدعتی میں علم شریعت ہے تو اس کا ثبوت قرآن سے دے، ورنہ یہ لوگ گھر میں ہی بیٹھے ہوئے اپنے علم و عقل کا ماتم کریں، رہی مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت تو اسکا تعلق زندہ انسان سے ہے جس کی پوری تفصیل آگے مفتی صاحب کے دلائل میں، نماز و روزہ کا حیلہ، کے زیر عنوان آرہی ہے۔

ثالثاً۔ بدنی محنت پر عبادت کو قیاس کرنا، یہ مفتی صاحب کا ہی اجتہاد ہے ورنہ جس کے دل میں قرآن و سنت کا علم ہے وہ تو ایسے قیاس کو خرافات کا نام دے گا، اگر مالی اجرت پر نماز روزہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ مبتدعین اس بات کا فتوی نہیں دیتے کہ اگر امیر انسان اجرت پر کسی شخص کو رکھ کر اس سے اپنی نماز روزہ اور دیگر احکام شرعی کروالے، تو کیا فرائض اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائیں گے؟ دیدہ باید، مگر اس کا کوئی قائل ہے نہ ہوگا، مگر مفتی صاحب کی دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے کہ اجرت پر عبادت کو قیاس کر رہے ہیں، یہ ہیں فقہ کے ٹھیکے دار۔

رابعاً۔ بیوی سے ظہار اور حالت احرام میں شکار شرعی طور پر گناہ ہیں اور ان گناہوں کا یہ کفارہ مقرر کیا گیا ہے کہ نیکی سے گناہ معاف ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب گناہ کے کفارہ پر عبادت کا کفارہ قیاس کر رہے ہیں، اس پر انہیں شرم ہے نہ حیا اور ہیں ماشاء اللہ مفتی اعظم، حکیم الامت وغیرہ لیکن ان کے ان قیاسات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ دراصل جاہل اعظم اور مرض الامت ہے۔

پھر ان کفارات کو خلاف قیاس کہنا بھی مفتی صاحب کی بیباکی، گستاخی و شوخی ہے اگر عقل کے

خلاف ہونے کی دلیل درج کرتے تو راقم الحروف اس کا پورا پورا محاسبہ کرتا اور ان شاء اللہ بفضلہٖ تعالیٰ قارئین کرام پر واضح ہو جاتا کہ شریعت کے یہ احکام عقل کے موافق ہیں یہ الگ بات ہے کہ مفتی جی کی الٹی عقل وسوچ کو یہ خلاف قیاس نظر آرہے ہیں۔

پھر درمیانی تشہد کے ترک پر سجدہ سہو کو مفتی صاحب کا خلاف قیاس کہنا بھی غلط بیانی ہے کیونکہ درمیانی تشہد کے ترک پر سجدہ سہو کرنا تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، بخاری ص۱۱۵ ج۱ ومسلم ص۲۱۱ ج۱، مشکوٰۃ ص۹۳، اور جو شخص آنحضرت ﷺ کے عمل کو خلاف قیاس کہتا ہے وہ واہیات بکتا ہے یقین جانیئے کہ اگر مفتی صاحب اس کی بھی وجہ بیان کرتے تو ہم ان کے قیاس کا ایسا بفضلہٖ تعالیٰ رد کرتے کہ مفتی جی کی عقل وخرد کا حدود اربعہ معلوم ہو جاتا۔

اسی طرح مفتی صاحب کا دیت کے مسئلہ کو درمیان میں کھینچ لانا بھی دراصل ان کے فہم کا قصور ہے کجا قتل وغیرہ کے جرم میں وارثوں کو مال دیکر راضی کرنا اور کجا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مالی فدیہ دینا، غور کیجئے کہ ان کے درمیان بھی کوئی تعلق و ربطہ ہے، مگر مفتی صاحب یہ کہہ کر کہ بعض صورتوں میں جان کا بدلہ بھی مال ہوتا ہے، اے جی ادھر ادھر سے فضول بھرتی کرنے کی بجائے اگر بدنی عبادت کے مالی کفارہ پر بھی آپ کے پاس کوئی دلیل ہے، تو اسے سامنے کیوں نہیں لاتے، اسے پردہ میں کس غرض سے چھپا رکھا ہے۔

معلوم ہوا کہ بدنی عبادت کے مالی کفارہ پر آپ کے پاس سرے سے کوئی قرآن وسنت سے دلیل ہی نہیں، جس کی وجہ سے آپ کچھ نا کچھ لکھ کر عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں، یقین جانیئے کہ قرآن کی ایک آیت یا کتب احادیث میں سے صرف ایک صحیح حدیث یا کم ازکم حسن ہی پیش کردیں کہ میت کی نماز اور روزہ کے فدیہ میں اس قدر گندم یا چاول یا جو، صدقہ وخیرات، حیلہ اسقاط کے طریقہ سے کرنا چاہیے۔

راقم الحروف مبتدعین کے اکابرین سے وعدہ کرتا ہے کہ جس وقت آپ ایسی دلیل پیش کر دیں گے اسی محفل اسی گھڑی پوری دنیا کے سلفی جماعتی طور پر اس کے مسنون ہونے کا اعلان کر دیں گے، مگر یاد رہے کہ اس کا ثبوت مبتدعین قیامت تک نہیں دے سکتے، لہٰذا عرض ہے کہ دنیاوی مفاد کی غرض سے آخرت برباد نہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے، آمین یا الہ

العالمین۔

حیلہ اسقاط کے دلائل کا تجزیہ

اسقاط کے طریقہ پر تبصرہ

بات کو آگے لے جانے سے قبل ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ قارئین کرام کی دلچسپی کیلئے مفتی صاحب سے اسقاط کا طریقہ نقل کر کے اس پر قرآن وسنت کی روشنی میں تبصرہ کر دیں۔

چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح زندہ مسلمان کے دشمن ہیں اسی طرح مردوں کے بھی دشمن ہیں کہ ان کو نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور مرے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے (لعنت اللہ علی الکاذبین) اسقاط کا طریقہ یہ ہے کہ میت کی عمر معلوم کی جاوے اس میں نو سال عورت کیلئے اور بارہ سال مرد کیلئے نابالغی کیلئے نکال دو اب جتنے سال بچے اس میں حساب لگاؤ کتنی مدت تک وہ بے نمازی یا بے روزہ رہا، یا نمازی ہونے کے زمانہ میں کس قدر نمازیں اس کی باقی رہ گئی ہیں کہ نہ وہ پڑھی اور نہ قضا کیں، اس لئے زیادہ سے زیادہ اندازہ لگالو، جتنی نمازیں حاصل ہوں فی نماز ۱۷۵ روپے اٹھنی بھر گیہوں خیرات یعنی جو فطرانہ کی مقدار ہے، وہ ہی ایک نماز کے فدیہ کی، وہ ہی ایک روزہ کی، تو ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من گندم تقریباً اور سال کی نمازوں کا ۱۰۸ من گندم ہوتا ہے، اب کسی کے ذمہ دس بیس سال کی نمازیں ہیں تو صدہا من غلہ خیرات کرنا ہوگا، شاید کوئی بڑا دیندار مالدار تو یہ کر سکے مگر غربا سے ناممکن، ان کیلئے یہ طریقہ ہے کہ ولی میت بقدر طاقت گندم یا اس کی قیمت لے مثلاً ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من تھا، تو ۹ من گندم یا اس کی قیمت لے اور کسی مسکین کو اس کا مالک کر دے وہ مسکین یا تو دوسرے مسکین کو یا خود مالک کو بطور ہبہ دے دے، وہ پھر اس فقیر کو صدقہ دے، ہر بار کے صدقہ میں ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ادا ہوگا، بارہ بار صدقہ کیا ایک سال کا فدیہ ادا ہوا، اسی طرح بار بار گھمانے میں فدیہ ادا ہو جائے گا، نمازوں کے فدیہ سے فارغ ہو کر اسی طرح روزہ اور زکوٰۃ کا فدیہ ادا کریں، رحمت الٰہی سے امید ہے کہ میت کی مغفرت فرما دے گا، اسقاط کا یہ طریقہ صحیح ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸۳ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ وہابی زندہ و مردہ مسلمان کے دشمن ہیں، یہ انکی غلط بیانی ہے، ہمیں کسی مسلمان سے کوئی ذاتی عداوت و دشمنی نہیں ہے، ہم بفضلہٖ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں، ہاں البتہ، الحب للہ والبغض للہ، کے تحت ہماری محبت و دشمنی کے معیار میں فرق ضرور ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے جو نماز روزہ کی مقدار فدیہ مقرر کی ہے اس کی کوئی شرعی دلیل درج نہیں کی، کوئی ہوتی تو اسے ضرور نقل کرتے۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے صراحت نہیں کی کہ گندم کو چند بار گھمانے کے بعد گندم کو میت کا وارث ہی گھر لے جائے گا یا محتاج وفقیر کے حوالے کر دی جائے گی یا مسجد غوثیہ کے پیش امام کو بطور نذرانہ عنایت کر دی جائے گی۔

رابعاً۔ مبتدعین کا وارث میت جب مذکورہ مقدار میں گندم فقیر ومحتاج کو ہبہ کر دے گا، تو اب دوبارہ اسے فقیر سے واپس نہیں لے سکتا، کیونکہ ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لینا شرعاً اتنا بڑا گناہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کتے کی قے خوری قرار دیا ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال النبی ﷺ لیس لنا مثل السوء الذی یعود فی ھبتہٖ کا لکلب یرجع فی قیئہ.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ بری مثال اپنے اوپر لانا کوئی مومن پسند نہیں کرے گا جو شخص ہبہ کر کے پھر اسے واپس لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کتا قے کر کے خود چاٹ لیتا ہے۔

بخاری ص ۳۵۷ ج ۱، ومسلم ص ۳۶ ج ۲۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مجاہد کو فی سبیل اللہ ایک گھوڑا عنایت کر دیا مگر اس نے خراب کر دیا، میں نے چاہا کہ اس سے گھوڑے کو خرید لوں پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجاہد گھوڑا ارزاں وسستا نہ دے دے، تو اس کا تذکرہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

لاتشتره وان اعطاکه بدرهم واحد فان العائد فی صدقتہ کالکلب یعود فی قیئه.

یعنی اے عمر (رضی اللہ عنہ) اگر وہ ایک روپیہ کا بھی فروخت کر ڈالے تو تم نہ لینا کیونکہ صدقہ دیکر پھر واپس لینے والا کتے کی طرح ہے جو قے کرکے پھر چاٹنے لگ جاتا ہے۔ بخاری ص ۳۵۷ ج ۱، ومسلم ص ۳۶ ج ۲۔

مگر افسوس کہ مفتی صاحب یہ درس دے رہے ہیں کہ ۹ من گندم وارث فقیر کو دے پھر فقیر وارث کو لوٹائے اور وارث پھر فقیر کو ہبہ کرے یوں سلسلہ چلتا رہے، اور مبتدعین کے اکابرین بقول رسول اللہ ﷺ کے ہبہ کو واپس لیکر کتے کی طرح قے خوری کرتے رہیں، پھر آخر میں مبتدعین بریلویہ کے پیش امام کی مٹھی گرم کر کے میت کے تمام گناہ بخشوالیں کہ یہ دین الٰہی کے واحد ٹھیکے دار ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حیلہ اسقاط کی پہلی دلیل

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی کہ میں اپنی بیوی کو سو لکڑیاں ماروں گا رب تعالی نے ان کو تعلیم فرمایا کہ تم ایک جھاڑو لیکر ان کو مارو اور اپنی قسم نہ توڑو، قرآن مجید نے اسی قصہ کو نقل فرمایا

وخذ بیدک ضغثا فاضرب به ولا تحنث.

تم اپنے ہاتھ میں جھاڑو لیکر ماردو اور قسم نہ توڑو۔ جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قرآن کے الفاظ "فَاضْرِبْ بِّه" کے ہیں، امید ہے کہ جاء الباطل کے ناشرین شکریہ کے ساتھ اسکی تصحیح کرلیں گے۔

ثانیاً قرآن کریم نے یہ کہاں کہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ ضرب علیحدہ علیحدہ لگاؤں گا، اگر اس احتمال کو تسلیم کرلیا جائے تو حیلہ رہتا ہی نہیں کیونکہ حیلہ تو اسے کہا جاتا ہے جو لفظ کو اس کے مصداق سے علی الاطلاق ہٹا دے، خود فقہاء میں ایسی قسموں کے بارے میں

اختلاف ہے مثلاً کسی نے کہا کہ میں اپنی لونڈی کو سو ضرب لگاؤں گا ایک تو یہ ہے کہ اسکو الگ الگ مارے دوسرا یہ کہ کسی چیز سے ایک ہی بار ضرب لگائے، اور بعض نے یہ شرط لگائی ہے کہ مجموعی طور پر اسے مارنا بھی ضروری ہے۔ دیکھئے فتح القدیر ص۴۶۰ ج۴۔ واعلام الموقعین ص۹۶۳ ج۵۔ مترجم

ثالثاً۔ اگر آیات قرآنیہ سے مراد ضرب معروف ہے تو تب بھی آپ کا اس سے استدلال درست نہیں، کیونکہ پہلی شریعت کا کوئی فقہی مسئلہ ہم پر حجت نہیں، اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ پہلے ادیان ہمارے لئے شرع ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر نہیں تو مفتی صاحب کا استدلال خود بخود باطل ہوگیا، اور اگر ہیں تو اس شرط سے ہے کہ شرع محمدی کے خلاف نہ ہوں، جب خلاف ہوگا تو تب بھی مفتی صاحب کا استدلال باطل ہوگا۔

جب کہ مفتی صاحب کے اکابرین کو مسلم ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ انہیں کے ساتھ خاص ہے۔

علامہ ابن ہمام حنفی ھدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں

والحق ان البر بضرب بضغث بلا الم اصلاً خصوصية رحمة لزوجة ايوب عليه السلام. فتح القدير ص ۴۶۰ ج ۴.

یعنی یہ بات حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی محترمہ کے ساتھ خاص ہے۔

یہی بات درمختار میں ہے اور اسی کو ہی محقق ابن عابدین نے اختیار کیا ہے، فتاوی شامی ص۸۳۷ ج۳، فقہاء احناف کی ان عبارات کے علاوہ ان کی خصوصیت پر خود قرآن مجید میں دلیل موجود ہے کہ، انا وجدنٰہ صابرا، سورۃ ص آیت ۴۴) بے شک ہم نے اسے صابرہ پایا (۳۸-۴۴) یہ جملہ قرینہ ہے کہ یہ خاص صورت اللہ تعالی نے انکے صبر کی جزا میں بیان فرمائی۔

رابعاً۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انکی شریعت میں قسم کا کفارہ نہ تھا، بلکہ ان کیلئے دو ہی صورتیں تھی (۱) قسم کو پورا کیا جائے (۲) یا قسم کو توڑا جائے، خود مفتی صاحب کو اس بات کا اقرار ہے۔

دیکھئے نور العرفان ص ۷۲۷۔

لیکن شریعت محمدیہ علیہ السلام میں کفارہ بھی مقرر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

لا یو اخذ کم اللہ باللغو فی ایمانکم و لکن یو اخذ کم بما عقد تم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مسٰکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم اوتحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلٰثۃ ایام ذٰلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیتہ لعلکم تشکرون۔ (المائدہ ص ۸۹)

اللہ تعالیٰ تمہاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن پختہ قسموں پر (جن کے خلاف کرو گے) مواخذہ کریگا، تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا، اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھالو (اور اسے توڑدو) اور (تم کو) چاہیے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے (سمجھانے کے) لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم شکر کرو۔ (۵-۸۹)

اس آیت کا شان نزول بھی ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے چنانچہ ام المومنین صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا راویہ ہیں کہ

ان اباھا کان لایحنث فی یمین حتی انزل اللہ کفارۃ الیمین قال ابو بکر رضی اللہ عنہ لا اریٰ یمیناً اریٰ غیرھا خیر منھا الا قبلت رخصۃ اللہ و فعلت الذی ھو خیرا۔

یعنی انکے والد (سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ) کبھی اپنی قسم نہ توڑا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارہ (کا حکم) نازل فرمایا، تب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں (کسی کام کے متعلق) قسم کھا لیتا ہوں پھر اسکے خلاف اگر بہتری جانتا ہوں تو اللہ کی رخصت کو منظور کر کے وہ کام کر لیتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے (اور قسم کا کفارہ ادا کر دیتا ہوں) صحیح بخاری ص۶۶۴ ج۲۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ پہلی شریعتوں میں کفارہ کا مسئلہ نہ تھا، اور عرب میں قسم کو پورے کرنے کا ہی رواج تھا یہاں تک کہ کفارہ کی آیات نازل ہوئیں، اس لئے کسی کام کیلئے قسم کھالینا لیکن بعد میں قسم کے خلاف بہتری معلوم ہو تو حیلہ و اسقاط کی سرے سے ضرورت ہی نہیں بلکہ کفارہ

ادا کر کے اس کام کو کر لینا جس میں دین و دنیا کی بہتری ہے، اور اس بات کی اجازت حدیث نبوی میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللهﷺ من حلف علی یمین فریٰ غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر و لیکفر عن یمینه.

یعنی رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس (قسم) کے خلاف کو بہتر خیال کیا وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے اس کام کو کرلے۔

صحیح مسلم ص ۴۸ ج ۲۔

خامساً۔ کیا اس آیت کے الفاظ کا یہ معنی ہے کہ میت کے وارث مردے کیلئے اسقاط کریں تاکہ اس کے گناہ معاف ہوکر فرائض اس سے ساقط ہوجائیں نہیں ہرگز نہیں، تو پھر یہ مبتدعین کی دلیل کیسے بن گئی۔

ایک بریلوی عالم کا اعتراف حق

دور حاضر میں پیر کرم شاہ صاحب بھیروی بریلوی مکتب فکر کے ایک علمی شخصیت ہیں جو کہ متعدد کتب کے مصنف اور ناصر بریلویت ہیں، وہ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ شرعی احکام سے بچنے کیلئے حیلوں سے کام لینا جائز ہے، حالانکہ یہ ہرگز درست نہیں، اس طرح احکام شرعیہ بچوں کا کھیل بن جائیں گے اور اغیار کو مذاق کرنے کا موقع مل جائے گا، نیز جن مقاصد کیلئے یہ احکام جاری کئے گئے انکا حصول ناممکن ہوجائے گا، علامہ آلوسی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بڑی محققانہ اور جامع بات فرمائی ہے۔

عندی ان کل حیلة اوجبت ابطال حکمة شرعیة لا تقبل کحیلة سقوط الزکوٰة و حیلة سقوط الا ستبراء. (روح المعانی)

یعنی ہر وہ حیلہ جس سے حکم شرعیہ کی اس حکمت کا بطلان ہوتا ہو جس کیلئے یہ حکم شرعی نافذ

کیا گیا، ایسا حیلہ قطعاً باطل ہے جیسے زکوٰۃ ساقط کرنے کیلئے لوگ حیلہ سازیاں کرتے ہیں اور استبراء سے بچنے کیلئے، وہ یہ نہیں جانتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے رب سے دھوکا کر رہے ہیں۔ ضیاء القرآن ص ۲۴۶ ج ۵، طبع ۱۳۹۹ھ ناشر ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ بنیامین کو اپنے پاس رکھیں اور راز ظاہر نہ ہو، اس کیلئے بھی ایک حیلہ ہی فرمایا جس کا مفصل ذکر سورۃ یوسف میں ہے۔ جاء الباطل ص ۳۸۴ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ قارئین کرام دیکھتے جانا کہ مفتی صاحب ایک دلیل دے رہے ہیں مگر دلیل کے الفاظ نقل کر کے ان کا معنی و مفہوم بیان نہیں کر رہے کہ کہیں حقیقت حال سے عوام واقف نہ ہو جائیں، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ قرآنی الفاظ کو نقل کر کے ان سے وجہ استدلال بیان کرتے کہ کس لفظ کا معنی ہے کہ مرنے والے کے وارث مذکورہ طریقہ سے اسقاط کریں تو مردہ بخش دیا جاتا ہے۔

لیکن قرآن میں چونکہ ایسا کوئی لفظ تھا ہی نہیں لہذا مفتی صاحب نے عدم نقل کو ہی مناسب جانا کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثانیاً۔ بات کو آگے لے جانے سے پہلے آیات قرآن اور ان کا معنی و مفہوم جان لینا ضروری ہے تاکہ بات کو سمجھنے میں آسانی رہے، ارشاد ہوتا ہے کہ

ولما دخلوا علیٰ یوسف اٰوٰی الیہ اخاہ قال انی انا اخوک فلاتبتئس بما کانوا یعملون ☆ فلما جھزھم بجھازھم جعل السقایۃ فی رحل اخیہ ثم اذّن مؤذن ایتھا العیر انکم لسٰرقون ☆ قالوا واقبلوا علیھم ماذاتفقدون ☆ قالوا نفقد صواع الملک ولمن جاء بہٖ حمل بعیرٍ وانا بہٖ زعیم ☆ قالوا تاللہ لقد علمتم ماجئنا لنفسد فی الارض وما کنا سٰرقین ☆ قالوا فما جزآؤہٗ ان کنتم کٰذبین ☆ قالوا جزآؤہ من وجد فی رحلہٖ فھو جزآؤہٗ کذٰلک نجزی الظٰلمین ☆ فبدا باوعیتھم قبل وعاءِ اخیہ ثم استخرجھا من وعاءِ اخیہ کذٰلک کدنا لیوسف ماکان لیاخذ

اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ نرفع درجٰت من نشاء وفوق کل ذی علمٍ علیمٌ ☆ قالوا ان یسرق فقد سرق اخٌ لہ من قبل فاسرھا یوسف فی نفسہٖ ولم یبدھا لھم قال انتم شرٌ مکاناً واللہ اعلم بما تصفون ☆ قالوا یایھا العزیز ان لہ اباً شیخاً کبیراً فخذ احدنا مکانہ انا نرٰک من المحسنین ☆ قال معاذ اللہ ان ناخذ الا من وجدنا متاعنا عندہٗ انا اذاًلظٰلمون. سورۃ یوسف(آیت ۶۹ تا ۷۹، رکوع ۹)

ترجمہ۔ اور یوسف کے بھائی جب یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ جگہ دی اور کہہ دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں پس تو ان کے کاموں سے رنجیدہ مت ہو، پھر جب انکی بوریا بندھوانے کا حکم دیا تو اپنے بھائی کی بوری میں کٹورا رکھوا دیا پھر ایک پکارنے والے نے پکار دیا کہ اے قافلہ والو! تم چور ہو، یوسف کے بھائیوں نے پھر کر پوچھا تمہارا کیا کھو گیا ہے؟ سپاہیوں نے کہا سرکاری کٹورا ہمیں نہیں ملتا اور جو کوئی اسے لائے اس کو اونٹ کے بوجھ جتنا غلہ ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں۔

یوسف کے بھائی بولے کہ واللہ تم جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں سپاہیوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا ہے،

بولے جس کے اسباب سے وہ نکلے وہی اس کی سزا ہے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں، تو یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں اور بوریوں کو کھلوایا پھر اپنے بھائی کے تھیلے سے نکال لیا، اسی طرح ہم نے یوسف کو ڈھب سکھایا تھا، ورنہ بادشاہ کے قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو نہ رکھ سکتا تھا، مگر جو خدا چاہتا ہے ہم جس کو چاہیں بلند رتبہ کر دیتے ہیں اور ہر ایک دانا سے بڑھکر دوسرا دانا ہے، بولے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی یوسف نے اس کلمہ کو چھپا رکھا اور ان کے سامنے اس کو نہ دہرایا کہا کہ تم بڑے نالائق ہو تمہارا بیان اللہ کو خوب معلوم ہے،

کہنے لگے اے عزیز! اس کا باپ نہایت بوڑھا ہے پس تو ہم میں سے کسی کو اس کے عوض رکھ لے ہم تجھے محسن جانتے ہیں، یوسف نے کہا خدا پناہ دے کہ ہم اس شخص کو چھوڑ کر جس کے پاس ہمیں اپنی چیز ملی ہے کسی دوسرے کو لیں تو فوراً ہم ظالم ٹھہریں گے(ثنائی) ۱۲-۶۹ تا ۷۹)۔

لیجئے جناب یہ ہے مفتی صاحب کی دلیل کا اصل متن قارئین کرام ان آیات کو مکرر پڑھئے اور غور و تدبر کیجئے کہ ان آیات کو مرنے والوں کے وارثوں کو اسقاط کا حکم کن الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ایک ماہ کی نمازوں کا فدیہ ۹ من گندم ہے جسے تم فقیر ومحتاج کو ہبہ کردو پھر اس سے واپس لیکر مکرر اسے ھبہ کرو علی ھذا القیاس اسی طرح کرتے رہو حتی کہ پوری زندگی کی نمازوں کا کفارہ ادا کردو پھر زکوٰۃ و روزہ کو بھی لگے ہاتھوں پورا کردو اور یوں ایک ہی دن میں پوری شریعت اسلامیہ کے احکام کی ادائیگی سے مرنے والا سرخرو ہو کر جنت کا وارث بن جائے گا۔

اللہ اکبر۔

مفتی صاحب کے استدلال کی خامیاں

قارئین کرام اب ترتیب وار مذکورہ آیات قرآن سے مفتی صاحب کے استدلال باطل کا رد سنتے جائیے۔

(۱) خود حنفیہ اس طرح کے حیلوں کو ناجائز وحرام مانتے ہیں،

چنانچہ فتاوی عالم گیری میں ہے کہ

فنقول مذهب علمائنا رحمهم الله تعالى ان كل حيلة يحتال بها الرجل لا بطال حق الغير اولاد خال شبهة فيه اولتمويه باطل فهي مكروهة.

یعنی ہمارے علماء کا مذھب یہ ہے کہ تمام وہ حیلے جو کسی کا حق مارنے یا اس میں شبہ پیدا کرنے یا باطل (جھوٹ) سے فریب دینے کیلئے کیئے جائیں وہ مکروہ ہیں،

فتاوی عالمگیری ص۳۹۰ ج۶۔

اس عبارت کو خود مفتی صاحب نے جاء الباطل ص۳۸۵ میں نقل کیا ہے۔

اس صراحت سے معلوم ہوا کہ ایسا حیلہ جس میں جھوٹ سے کسی کو فریب دیا جائے خود مفتی صاحب کے مذھب میں ناجائز وحرام ہے۔

(۲) یہ اللہ تعالی کی ایک تدبیر تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بوری میں سقایا کو رکھنا وحی الہی سے تھا، اور اس تدبیر سے اللہ تعالی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کو پاس رکھنے کے

اسباب اکٹھے کروادیئے، ورنہ اتنی سی بات (بھائی کی بوری میں سقایا رکھنے) سے حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کوروک نہ سکتے تھے۔

کیونکہ یہ بات تو قرآن نے کھول کر بیان فرمائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مملکت کا یہ قانون نہ تھا کہ چور کوروک کرغلام وغیرہ بنالیا جائے، بلکہ بقول مفسرین انکی سلطنت کا یہ دستور تھا کہ چور سے دوگنا مال لیکر اور مار پیٹ کر اسے چھوڑ دیا جائے، لیکن جب منادی نے پکارا کہ اے قافلے والو تم چور ہو، انہوں نے کہا کہ تمہاری کیا چیز چوری ہوئی ہے کہ ہمیں چور ہونے سے مطعون کر رہے ہو، اس پر منادی نے کہا کہ شاہی سقایا گم ہے، مگر اولاد یعقوب نے اس کی چوری سے انکار کیا، منادی نے کہا کہ اگر تمہارے پاس سے برآمد ہو تو تمہاری کیا سزا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ

جزآؤہ من وجد فی رحلہ (۷۵)

ان کے دل میں یہ جواب ڈال دینا بھی اللہ تعالی کی تدبیر تھی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اختیار میں ایسا اعتراف کرا لینا نہ تھا، ممکن ہے کہ وہ کہہ دیتے کہ جو آپ کی سلطنت کا قانون ہے وہی اس کی سزا ہے یا محض کسی سے سقایا برآمد ہونا اس کے چور ہونے کی دلیل نہیں (حنفیہ کا یہی موقف ہے کہ کسی سے مال کے برآمد ہونے سے وہ چور ثابت نہ ہوگا)

اس کا ثبوت دیجئے کہ اسی نے ہی چرایا ہے، تو اس سوال کا جواب نفی میں تھا کیونکہ وہ نہ تو چور تھے اور نہ ہی اس پر شرعی شہادت تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنی عدالت سے مجبور ہو جاتے، مگر اللہ تعالی نے ان تمام تدابیر کو جمع کردیا، یہی مطلب ہے قرآن کے ان الفاظ کا کہ

کذلک کدنا لیوسف (۷۶) اس طرح ہم نے یوسف کیلئے تدبیر کی۔

دیکھئے کہ ان الفاظ قرآن میں تدبیر کو اللہ تعالی نے اپنی طرف مضاف کیا ہے، نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کہ یہ انکی تدبیر تھی۔ اور اللہ تعالی تو فعال لما یرید ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے، خضر علیہ السلام سے کشتی تڑوادے یا لڑکے کوقتل کرادے، اسے کون پوچھنے والا ہے؟ لیکن اگر ہم کسی کے بچہ کوقتل کردیں یا کشتی توڑ دیں، تو ہم سے قصاص و معاوضہ وصول کیا جائے گا، کیوں؟ وجہ فرق یہ ہے کہ ہم شریعت کے پابند اور مکلّف ہیں جب کہ اللہ تعالی نہیں، آیئے ہم آپ کو بریلوی

عالم سے تصدیق کروا دیتے ہیں کہ یہ تدابیر اللہ تعالیٰ تھیں۔ یوسف علیہ السلام کی نہ تھیں۔

چنانچہ بریلویت کے معروف مفسر قرآن پیر کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں

ان واقعات میں سے کس کو اللہ تعالی نے اپنی خصوصی تدبیر فرمایا ہے، اس کے متعلق گزارش ہے کہ اگر ذرا غور کیا جائے تو حقیقت عیاں ہوجاتی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس قافلہ کی روانگی کے بعد فوراً ان کو پیالہ کی گمشدگی کا پتہ نہ چلتا کچھ دن گزرنے کے بعد انہیں معلوم ہوتا کہ پیالہ گم ہوچکا ہے اتنے میں وہ مصر کی سرحد عبور کر کے چلے جاتے یا پہلے اپنے میں سے کسی کو چوری سے متہم کرتے اور ان کی طرف انکا خیال ہی نہ جاتا، یا یہ نوبت ہی پیش نہ آتی کہ چور کی سزا کے متعلق ان سے ہی دریافت کیا جاتا اور اگر ان سے پوچھا بھی گیا تھا تو وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ جو بادشاہ کی مرضی ہو اس چور کو سزا دے، یہ سب احتمالات تھے، جو اغلب الوقوع تھے، اس لئے ان کو پیالہ کی گمشدگی کا فوراً علم ہوجانا، پھر ذہن کا فوراً ان کی طرف منتقل ہونا پھر مجرم کی سزا کے متعلق ان سے پوچھا جانا اور پھر ان کا یہ سزا تجویز کرنا یہ سب تدبیر الٰہی اور ارادہ ربانی کی کرشمہ سازی تھی، اور اگر ان واقعات میں سے ایک آدھ کڑی بھی گم ہوجاتی تو پھر بنیامین کو رکھنے کی کوئی وجہ جواز نہ مل سکتی،

تفسیر ضیاء القرآن ص ۴۴۷ ج ۲، طبع ۲ ۱۴۰۲ھ۔

اس ساری تفصیل سے ثابت ہوا کہ یہ تدبیر خالق کائنات کی تھی، جس میں اس نے اپنے مومن ومتوکل اور مظلوم بندے کی مدد فرمائی کہ وہ ظالموں سے انتقام لیکر اپنے دل کو ٹھنڈا کرلے، ایمان سے کہنا کہ اس کو مفتی صاحب کے حرام حیلوں سے کیا مناسبت ہے کہ وہ اسے دلیل بنا رہے ہیں۔

مبتدعین جس قدر حیلے کرتے ہیں کیا ان کے کرنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا کہ نماز کا یہ حیلہ ہے اور زکوٰۃ ٹالنے کا یہ حیلہ ہے، حضرت جی یہ تو شریعت سے ویسے ہی مذاق ہے کہ اللہ تعالی کی فرض کی ہوئی چیزوں کو بہانوں سے ٹال دیا جائے اور یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ اللہ تعالی ایک فعل کو فرض قرار دے اور پھر اسے ٹالنے کا حیلہ بھی بتائے کہ اس طرح یہ فرض ٹل جاتا ہے۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

ایک بار حضرت سارا نے قسم اٹھائی تھی کہ میں قابو پاؤں گی تو حضرت ہاجرہ کا کوئی عضو قطع



کر دوں گی، حضرت ابراھیم علیہ السلام پر وحی آئی کہ ان کی آپس میں صلح کرادو، حضرت سارا نے فرمایا میری قسم کیسے پوری ہو، تو ان کو تعلیم دی گئی کہ حضرت ہاجرہ کے کان چھید دیں۔ جاء الباطل ص۳۸۴ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بات کسی معتبر دلیل سے ثابت نہیں، مبتدعین پر لازم ہے کہ وہ اسے نقل صحیح سے ثابت کریں ورنہ اللہ رب العزت سے ڈر کر ان جیسے قصے کہانیوں سے اپنی بدعی رسومات کے جواز پر استدلال سے توبہ کریں۔

ثانیاً۔ اس بات کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص۳۰۷ ج۶، میں اور علامہ سہار نپوری نے حاشیہ بخاری ص۴۷۴ ج۱، میں نقل تو کیا ہے مگر یہ صراحت نہیں کی کہ اس بات کو کس نے بیان کیا اور یہ قول مرفوع ہے یا موقوف، الغرض انہوں نے اس قضیہ کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دی، معلوم ہوتا کہ انہوں نے بھی زبان زدعام کی بنا پر لکھ دیا ہے ورنہ اس کی سند یا کم ازکم حوالے کی نشان دہی ضرور کرتے۔

ثالثاً۔ اگر بالفرض اس کو نقل صحیح سے ثابت کر دیا جائے، حالانکہ ایسا ممکن نہیں، تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سرے سے حیلہ ہے ہی نہیں کیونکہ حضرت سارہ رضی اللہ عنھا نے عضو کاٹنے کی قسم کھائی تھی جسے انہوں نے کان چھید کر اپنی قسم کو پورا کیا ہے نہ کہ کسی حیلہ سے اسے ٹال دیا ہے۔

رابعاً۔ اگر مبتدعین اسی پر ہی بضد رہیں کہ نہیں یہ حیلہ ہی ہے، تو اسکو معتبر دلیل سے ثابت کرنا ان پر ادھار ہے، اور یہ ثابت کرنا کہ شریعت اسلامیہ میں یہ حکم اسی طرح ہی وارد ہوا ہے، ان پر لازم ہے کوئی صحیح حدیث پیش کریں۔

خامساً۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ پہلی شرائع میں قسم کا کفارہ نہ تھا، جبکہ دین اسلام میں قسم کا کفارہ بھی مقرر کر کیا گیا ہے، لہذا ہمیں کسی چیز پر قسم کھا کر حیلہ سے ٹالنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں بلکہ کفارہ ادا کر کے اپنی قسم کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

مشکوٰۃ کتاب البیوع باب الربوا میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عمدہ خرمے لائے، حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے، عرض کیا کہ میرے پاس کچھ ردی خرمے تھے، میں نے دو صاع ردی خرمے دیئے اور ایک صاع عمدہ خرمے لے لیئے فرمایا یہ سود ہوگیا آئندہ ایسا کرو کہ ردی خرمے پیسوں کی عوض فروخت کرو اور ان پیسوں کے اچھے خرمے لے لو، دیکھو یہ سود سے بچنے کا ایک حیلہ ہے۔ جاء الباطل ص۳۸۴ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ اسے حیلہ کہنا ہی غلط ہے، کیونکہ حیلہ تو کہتے ہیں کسی حکم شرعی کو بہانے سے ٹالنے کو، جبکہ اس حدیث میں حکم شرعی کو قبول کیا گیا ہے، اور اس کا ایک عمدہ طریقہ شارع علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہم علی سے کہیں فلاں راستے سے نہ گزرنا کہ وہاں رنڈیوں کا بازار ہے، بلکہ فلاں راستے سے گزرنا، تو علی کا اس راستے سے نہ جانا حیلہ نہیں بلکہ برے راستے سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔

ثانیاً۔ کھجوروں کو اپنی ہم جنس سے کمی وبیشی سے لینا تو واقعی سود ہوا کہ دونوں کی جنس ایک ہی ہے، اب اس سے بچنے کیلئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنی کھجوروں کو قیمتاً فروخت کرو، پھر ان پیسوں سے اعلی کوالٹی کی کھجوریں خرید ، حضرت جی یہ ایک بیع نہیں بلکہ دو ہیں کیونکہ جس طرح پہلی بیع تھی، اسی طرح دوسری بیع مستقل ہے اگر پہلے سے یہ طے کرلیا گیا کہ اتنے میں تو خرید لے اور فلاں قیمت پر میں تجھ سے خریدوں گا، دوسری بیع الگ نہ گنی جائے گی بلکہ اس کا شمار پہلی میں ہی ہوگا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، ثم اشتر بہ، یعنی ان پیسوں سے پھر اچھی کھجوریں خرید۔

بخاری ص۳۱۱ ومسلم ص۲۶ ج۲ ومشکوٰۃ ص۲۴۵۔

ان الفاظ کا واضح مفاد یہ ہے کہ پہلی فروخت کے بعد یہ خرید بتلائی ہے جو اس بات کا قرینہ قویہ ہے کہ آخری بیع مستقل اور الگ ہے، پہلی بیع کا تتمہ نہیں۔

الغرض حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی کھجوروں کو پہلے مارکیٹ میں منڈی کے ریٹ کے مطابق

فروخت کیجئے اور پیسے حاصل کر کے ان سے اچھی کھجوریں خرید لیجئے، ہم قارئین کرام کو دعوت فکر دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث کو فقہا کے سودی حیلوں سے کیا مناسبت ہے کہ ایک غریب و مفلس جو دین دار ہے، وہ قرض لینا چاہتا ہے مگر قرض سود کے بغیر مل نہیں رہا، وہ حنفی سیٹھ صاحب کے پاس جاتا ہے کہ مجھے قرض سود کے بغیر چاہیے تو وہ فقیہ سیٹھ اسے اس طرح قرض عنایت کرتا ہے کہ تو مجھ سے ٹریکٹر پانچ لاکھ روپے کا خرید لے اور پھر وہیں بیٹھے ہوئے ہی میں تجھ سے وہی ٹریکٹر تین لاکھ کا خرید لوں گا، پھر رقم کی واپسی کی تاریخ متعین کی جاتی ہے اور حنفی مفتی و سیٹھ وہاں بیٹھے بیٹھے ہی اسے ٹریکٹر کی بجائے ایک مدت تک کیلئے تین لاکھ روپیہ عنایت کر دیتا ہے جسے واپسی کے وقت لینے والے نے پانچ لاکھ روپے دینے ہیں، ایمان سے کہنا کہ یہ سود نہیں تو اور کیا ہے، مگر حنفی فقہا جو ساری زندگی تفقہ کا راگ آلاپتے رہتے ہیں اور اہل حدیث کو ظاہر پرست کہتے تھکتے نہیں، وہ اسے سود نہیں (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کی مذکورہ حدیث سے استدلال کر کے سود سے بچنے کا ایک حیلہ کہہ رہے ہیں۔

آہ عربی میں ایک ضرب المثل ہے کہ، فرمن المطر وقام تحت المیز اب، یعنی بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا، افسوس کہ مبتدعین لفاظی سے اسے حیلہ ثابت کرنے کے درپہ ہیں۔

رابعاً۔ ایک بیع میں دو بیع کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

نھی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فی بیعة.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ترمذی مع تحفۃ ص ۲۳۵ ج ۲، و نسائی ص ۲۲۰ ج ۲، و ابو داؤد مع عون ص ۲۹۰ ج ۳، و ابن حبان (۴۹۵۲) واللفظ لہ

یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مروی ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے

تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۵ ج ۲، والتمھید ص ۳۸۸ ج ۲۴، وعون ص ۲۹۰ ج ۳، وغیرہ۔

اس بیع کی یہی صورت ہے کہ ایک شخص کسی سے پانچ لاکھ روپے میں ٹریکٹر ادھار لیتا ہے پھر وہی شخص اسی ٹریکٹر کو اڑھائی لاکھ میں خرید لیتا ہے، ٹریکٹر اسی کے پاس رہا مگر اس کے اڑھائی لاکھ

کھرے ہوگئے، جبکہ ان دونوں میں یہ بات پہلے سے طے پاچکی تھی، تو یہ ایک بیع میں دو بیع ہوئیں۔

جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

جس حدیث سے مبتدعین حیلہ ثابت کرتے ہیں اس کا وہی مفہوم لیا جائے جو مفتی صاحب نے بیان کیا ہے، تو ایک حرام کو حلال ماننا پڑھے گا، اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک صورت کو حرام بھی قرار دیں، لیکن پھر اسے حلال میں بھی داخل کردیں، الغرض حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ایک بیع میں دو بیع جمع کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اپنی کھجوروں کو فروخت کرنا مستقل بیع ہے اور ان پیسوں سے دوسری کھجوریں خریدنا الگ اور دوسری بیع ہے، مگر یہ سیدھی اور صحیح بات مبتدعین کے فقہی دماغ میں نہیں اتر رہی، تو اسے حیلہ سے تعبیر کر کے سود کھانے کا بہانا بنا لیا ہے۔

نماز اور روزے کا حیلہ

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

روزے کا فدیہ قرآن سے ثابت ہے، رب تعالی فرماتا ہے

وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين.

اور جن کو اس روزے کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجبور بوڑھا یا مرض الموت کا مریض جب روزے کے قابل نہ رہے تو ہر روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا دے اور نماز بمقابلہ روزے کے زیادہ مہتم بالشان ہے، اس لئے نماز کو روزے کے حکم میں رکھا گیا، اسی آیت کے ماتحت تفسیرات احمدیہ شریف میں ملا احمد جیون قدس سرہ فرماتے ہیں،

نماز روزے کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی اہم لہذا ہم نے اس میں بھی فدیہ کا احتیاطاً حکم دیا اور رب تعالی کے فضل سے قبول کی امید ہے، نماز میں فدیہ کا واجب ہونا احتیاطاً ہے۔

شرح وقایہ میں ہے کہ ہر نماز کا ایک فدیہ ایک دن کے روزے کی طرح ہے اور وہ ہی صحیح ہے، شرح الیاس میں ہے، ہر فوت شدہ نماز کے فدیہ کا اعتبار ایک دن روزے پر ہے، یعنی ایک دن کے

روزے کی طرح ہے، جوشخص مرجائے اور اس پر رمضان کی قضا ہے پس اس نے وصیت کی تو اس کی طرف سے اس کا ولی ہر دن کے عوض ایک مسکین کو نصف صاع گیہوں (گندم) یا ایک صاع خرمے یا جو دیدے کیونکہ میت اب ادا سے مجبور ہوگیا اور اسی طرح اس نے نماز کے بدلے میں کھانا دینے کی وصیت کی ہو، ....

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ نماز روزے کا فدیہ دینا جائز ہے اور قبول کی امید ہے بلکہ احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں چنانچہ نسائی نے اپنی سنن کبریٰ اور عبدالرزاق نے کتاب الوصایا میں سیدنا عبداللہ ابن عباس سے نقل فرمایا

لا یصلی احدعن احد ولا یصوم احد عن احد ولکن یطعم عنه مکان کل یوم مدین من حنطة.

کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے نہ روزے رکھے لیکن اس کی طرف سے ہر دن کے عوض دومد گندم (آدھا صاع) خیرات کردے۔

مشکوٰۃ کتاب الصوم باب القضاء میں ہے،

قال مات علیه صیام شهر رمضان فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکینا،

جو مرجائے اور اس کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں تو چاہیے کہ اس کی طرف سے ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا دیا جائے۔

غرضکہ نماز روزے کا فدیہ مال سے دینا شریعت میں وارد ہے اس کا انکار کرنا جہالت ہے۔

جاء الباطل ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ ج ا۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا روزے کے فدیہ سے حیلہ کو ثابت کرنا ان کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ فدیہ تو زندہ شخص اپنی طرف سے ادا کرتا ہے جب کہ حیلہ اسقاط مرنے والے کے وارث اس کی طرف سے ہیر پھیر کر کے چند سیر گندم ادا کرتے ہیں، تو ان دونوں کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں، مگر مفتی صاحب کے ہاتھ ایسا محکمہ افتا لگ گیا ہے کہ جس کی آڑ میں وہ غلط سلط استدلال کر کے عوام کو گمراہ کررہے ہیں، اے جی روزے کا فدیہ ہر شخص کیلئے نہیں کہ جس کا روزے

رکھنے کو جی نہ چاہا وہ ایک مسکین کا کھانا کھلادے تو فرض اس کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا، بلکہ الفاظ قرآن کا معنی یہ ہے کہ،

ایسا شخص جو شیخ فانی ہو چکا ہے یا ایسا مریض جو مرض الموت میں مبتلا ہے تو اس کی طرف سے روزے کا فدیہ دے دیا جائے۔

چنانچہ احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ

بعض جاہلوں نے یہ خیال کرلیا ہے کہ روزہ کا فدیہ ہر شخص کیلئے جائز ہے جب کہ روزے میں اسے تکلیف ہو، ایسا ہرگز نہیں، فدیہ صرف شیخ فانی کیلئے رکھا گیا ہے جو بہ سبب پیرانہ سالی حقیقۃً روزہ کی قدرت نہ رکھتا ہو نہ آئندہ طاقت کی امید کہ عمر جتنی بڑھے گی ضعف بڑھے گا اس کیلئے فدیہ کا حکم ہے۔

فتاوی رضویہ ص۶۰۲ ج۴۔

مولوی احمد رضا خاں کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فدیہ کا حکم عام نہیں بلکہ خاص ہے، یہی ان کے قابل فخر شاگرد اور مفتی جی کے استاذ المکرّم مولوی نعیم الدین فاضل مراد آبادی نے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ قرآن کے حواشی سورۃ بقرہ (۳۲۸) میں لکھا ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے نور العرفان ص۴۳ میں لکھا ہے۔

قارئین کرام جب آپ نے اس بات کو بخوبی جان لیا کہ فدیہ کا حکم عام نہیں بلکہ خاص ہے اور اس کا تعلق اضطراری حالت سے ہے، تو مفتی صاحب کا ایک تندرست اور جوان کا فدیہ کشید کرنا اور پھر فدیہ سے حیلہ کی طرف گھسیٹ لانا غلط بیانی نہیں تو کیا ہے۔

ثانیاً۔ فدیہ سے حیلہ تو بنایا ہی تھا ستم بالائے ستم یہ کہ روزے کے فدیہ سے نماز کے فدیہ کو کشید کرلیا، پھر اس پر حنفی فقہ کی عبارات نقل کردیں گویا کہ جیسی روح ویسے فرشتے، اے جی فقہ حنفی میں کیا کچھ نہیں لکھا کہ آپ اس کی عبارات ہم پر بطور حجت نقل کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ پھر مفتی صاحب نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول سنن کبریٰ اور عبدالرزاق سے نقل کیا ہے، اس میں بھی تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھائی، اثر کے آخری الفاظ تھے، کل یوم مد من حنطۃ، دیکھئے السنن الکبریٰ للنسائی ص۱۷۵ ج۲، وبیھقی ص۲۵۷ ج۴، یہی الفاظ علامہ زیلعی حنفی نے، نصب الرایہ

ص ۴۶۳ ج ۲، میں علامہ ماردینی حنفی نے، الجوھرالنقی ص ۲۵۷ ج ۴، میں نقل کیئے ہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب نقل میں اس قدر غیر معتبر ہیں کہ بلا وجہ واحد سے تثنیہ بنا ڈالا ہے، پھر مفتی صاحب کا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کو مصنف عبدالرزاق کی طرف منسوب کرنا بھی نہایت درجہ کی غفلت ہے، کیونکہ مصنف میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے نہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا۔

دیکھئے مصنف عبدالرزاق ص ۶۱ ج ۹ (رقم الحدیث ۱۶۳۴۶) ونصب الرایہ ص ۴۶۳ ج ۲۔

رابعاً۔ جب انسان زندہ موجود ہو تو تب بلا شبہ معذور شخص کے متعلق یہی حکم ہے کہ اس کی طرف سے روزے کا فدیہ دینا ہی شرعی طور پر روزہ کے قائم مقام ہے، لیکن اس میں بھی حیلہ کی تجویز شریعت نے بیان نہیں کی کہ ایک دن کا کھانا ھبہ کرکے واپس لیا جائے اور اس کو پھر دیگر واپس لے لیا جائے یہاں تک تیس بار ایسا کرکے ایک ہی فدیہ میں پورے روزوں کا کفارہ ادا کرلیا جائے، الغرض اس کو بھی ہر روزہ کے بدلہ میں فدیہ دینا ضروری ہے۔

خامساً۔ شریعت کا یہ حکم فقط زندہ شخص کے بارے میں ہے لیکن جب کوئی شخص فوت ہوجائے اور اس کے ذمہ روزوں کی قضا ہو تو ایسے شخص کے بارے میں فیصلہ مصطفوی فدیہ دینے کا نہیں بلکہ اس کی طرف سے وارث کو روزے رکھنے کا حکم ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راویہ ہیں کہ

ان رسول اللہ ﷺ قال من مات و علیہ صیام صام عنہ ولیہ.

یعنی بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص فوت ہوجائے اور اس پر روزے رکھنے (باقی ہوں) تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔

صحیح بخاری ص ۲۶۲ ج ۱، ومسلم ص ۳۶۲ ج ۱۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ ﷺ ان امی ماتت و علیہا صوم شھرا فاقضیہ عنہا؟ قال نعم فدین اللہ احق ان یقضی، الحدیث.

یعنی ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا فوت ہوگئی ہیں اور ان کے ذمہ رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے تھے، تو کیا میں ان کی طرف سے

قضا کروں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔

صحیح بخاری ص۲۶۲ ج۱، وصحیح مسلم ص۳۶۲ ج۱۔

صحیح مسلم کی روایت میں قدرے تفصیل زیادہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا،

لو كان على امك دين اكنت قاضيه عنها.

یعنی اگر تیری والدہ پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتا، تو اس شخص نے کہا ہاں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے، صحیح مسلم شریف ص۳۶۲ ج۱۔

ان احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا کہ مرنے والے کی طرف سے وارث روزے رکھے گا نہ کہ فدیہ ادا کرے گا، اقوال ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ چونکہ احادیث مرفوعہ کے مخالف ہیں، اس لئے حجت نہیں، کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب قول صحابی حدیث مرفوع کے مخالف ہوگا، تو تب حجت نہ ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن ھمام ھدایہ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں،

ان قول الصحابی حجة مالم ينفه شئی من السنة.

یعنی صحابی کا قول یقیناً حجت ہے جب تک سنت اس کی نفی نہ کرے،

فتح القدیر ص۳۷ ج۲۔

مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا شاگرد خاص مولوی ابو یوسف محمد شریف حنفی بریلوی لکھتا ہے کہ،

اور صحابی کا قول جب کہ سنت کے برخلاف ہو حجت نہیں ہوتا،

کشف الغطاء مندرجہ دلائل المسائل ص۲۱۰۔

الغرض قول ابن عمر رضی اللہ عنہ اور قول ابن عباس رضی اللہ عنہ چونکہ احادیث مرفوعہ کے خلاف ہیں۔ لہذا حجت نہیں، باقی رہا مفتی صاحب کا مشکوۃ سے حدیث نقل کرنا کہ مرنے والے کی طرف سے ایک مسکین کا فدیہ ادا کردو، تو یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی

لیلیٰ راوی ہے، ترمذی مع تحفہ ص۴۳ ج۲، اور محمد بن عبدالرحمٰن سيء الحفظ ہے، دیکھئے دین الحق ص۳۸۳ ج۱۔

تنبیہ

علامہ ماردینی حنفی، الجوھر النقی ص۲۵۴ ج۴، میں فرماتے ہیں کہ محمد بن عبدالرحمٰن کا محمد بن سرین ابن ماجہ میں متابع موجود ہے، واضح رہے کہ ابن سرین کہنا امام ابن ماجہ یا ان کے شیخ کا وہم ہے جیسا کہ امام مزی نے، الاطراف، میں اور حافظ ابن حجر نے، التلخیص ص۲۰۹ ج۲، میں اس کی صراحت کی ہے، مولانا عبیداللہؒ رحمانی محدث مبارک پوری نے، مرعاۃ المفاتیح ص۳۳ ج۷، میں اس پر نہایت عمدہ بحث کی ہے باذوق حضرات مراجعت فرمائیں،

خلاصہ کلام یہ کہ سند میں محمد بن عبدالرحمٰن ہی ہے اور محمد بن سرین کہنا امام ابن ماجہ یا ان کے شیخ کا وہم ہے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ صحیح اور خالص حق بات یہی ہے کہ فوت شدہ کے ذمہ اگر روزوں کی قضا ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے قضاء ادا کرے، اس ساری تفصیل سے یہ بات ہمارے سامنے کھل کر آگئی کہ مرنے والے کی طرف سے فدیہ دینا غیر مشروع اور دین میں زیادتی ہے لہذا مفتی صاحب کا مرنے والے کی طرف سے روزہ کی قضا میں فدیہ ادا کرنے کی تلقین کرنا اور منکر پر جہل ہونے کا فتوی صادر کرنا، خود مولف جاء الباطل کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے، پھر روزے کے فدیہ سے نماز کا فدیہ کھینچ لینا تو ان کے اجہل ہونے کی برہان واضح ہے۔

الغرض شریعت میں مرنے والے کی طرف سے روزوں کی قضا کے عوض میں فدیہ ادا کرنا ثابت نہیں بلکہ روزوں کی قضاء ادا کرنے کا حکم ہے جب روزوں کا ہی فدیہ ثابت نہ ہوا تو نماز کا بالا ولیٰ ثابت نہ ہوا کہ کیونکہ مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند لوگوں نے نماز کے فدیہ کو روزے کے فدیہ پر قیاس کیا تھا، جب اصل کا ہی فدیہ ثابت نہ ہوا تو اس پر قیاس کے چہ معنی۔

العود الی المقصود

خیر مفتی صاحب نے روزوں کا فدیہ ثابت کرنے کے لئے جو پاپڑ بیلنے تھے وہ تو ایک الگ اور مستقل بحث تھی، ستم یہ ڈھایا کہ فدیہ سے حیلہ بنانے کی فضول کوشش کی ہے، حالانکہ فدیہ تو ہر روزہ کا الگ دینا ضروری ہے جبکہ حیلہ تو فدیہ کو ٹالنے کا ناکام بہانہ ہے کہ گندم وغیرہ کو ہیر پھیر کر کے فقیر کو دیدیجئے کہ چند سیروں میں پوری زندگی کے روزے اور نمازیں معاف ہو جائیں، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ دعوی اور دلیل میں کونسی مناسبت ہے کہ حیلے کے جواز کیلئے مفتی صاحب فدیہ کی بحث کو درمیان میں گھسیٹ لائے ہیں۔

اسقاط کا ثبوت

مفتی صاحب نے اسقاط کے ثبوت کے لئے دور کا چکر لگا کر آخر میں حیلہ اسقاط کا ثبوت دینے کی غرض سے تیسری فصل کے تحت، مسئلہ اسقاط کے ثبوت، کے زیرعنوان جو بھی زیب رقم فرمایا ہے، وہ چند کتب فقہ حنفیہ کی عبارات ہیں، حالانکہ مفتی صاحب کا حق تھا کہ قرآن وسنت اور اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے اس کا ثبوت دیتے یا کم از کم امام ابوحنیفہؒ اوران کے ارشد تلامذہ سے اس کا ثبوت عنایت فرماتے، مگر مفتی صاحب نے ان تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھ کے، نور الایضاح، درمختار، فتاوی شامی، الاشباہ والنظائر، عالم گیری، کی عبارات ذکر کی ہیں، اور مزید پانچ چھ کتب فقہ کے نام لکھ کر فرمایا کہ ان میں بھی ایسا ہی لکھا ہے، دیکھئے جاء الباطل ص ۳۸۷ تا ۳۸۸ ج ا۔

جب کہ ان میں کسی مسئلہ کا بیان کیا جانا، حنفیہ پر تو یقیناً حجت ہے لیکن ایک متبع سنت اور قرآن اور صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنا راہنما اور قائد جاننے والے کے نزدیک ان کتب فقہ کی حیثیت پرکاہ اور دمڑی کی بھی نہیں، بالخصوص جبکہ ان کے مسائل خلاف شریعت اور قرآن وسنت سے متصادم ومتعارض ہوں، اگر اللہ تعالی کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ، دین الحق کی چوتھی جلد میں ہم فقہ حنفیہ کے عجیب وغریب مسائل ذکر کریں گے۔

واضح رہے کہ جس شخص کی نماز عذر شرعی کی وجہ سے قضا ہوجائے اس کا فقط یہی کفارہ ہے کہ اسے جب یاد آئے، تو نماز کو پڑھ لے، نماز کے عوض میں کوئی صدقہ وخیرات کفارہ نہیں بن سکتا،

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ،

عن النبی ﷺ قال من نسی صلوۃ فلیصلی اذاذکر ھالا کفارۃ لھا الا ذلک، الحدیث.

یعنی نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نماز کو بھول جائے، تو اسے جب یاد آئے تو پڑھ لے، اس کا کوئی اور کفارہ نہیں فقط یہی ہے (کہ نماز کو قضا کرے)

بخاری ص ۸۴ ج ۱، و مسلم ص ۲۴۱ ج ۱، و ابو داود ص ۶۴ ج ۱، و ابو عوانہ ص ۳۸۵ ج ۱، و ص ۲۵۲ ج ۲، و مسند احمد ص ۲۶۹ ج ۳، و ابن خزیمہ (۹۹۳) و بیہقی ص ۲۱۸، ۳۳۰، ۴۵۶، ج ۲.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر کسی نماز کی ادائیگی باقی ہو تو اس کی طرف سے اس نماز کی قضا نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کے عوض میں اسکی طرف سے کھانا کھلایا جائے گا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے، لاکفارۃ لھا الا ذلک، کہہ کر حصر کر دیا ہے کہ اس کے کفارہ کی ایک ہی صورت ہے کہ جس کی رہ گئی ہے وہ خود اس نماز کی قضاء کرے، جب زندگی میں قضاء نماز کا صدقہ کفارہ نہیں بن سکتا تو مرنے کے بعد اس کی طرف سے وارثوں کا کیا ہوا صدقہ عوض کیسے بن جائے گا، مگر افسوس کہ یہ چھوٹی سی بات مولف جاء الباطل کے مفتیانہ دماغ میں نہیں اتری کہ نماز کے عوض میں فدیہ کا فتوی صادر کر دیا ہے پھر فدیہ کو بھی ہیر پھیر اور حیلہ سازی سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، کاش حضرت مفتی صاحب کتب فقہ کی بجائے احادیث رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ فرماتے، تو انہیں ایسے خرافات کے جواز پر کتاب تحریر کرنے کی بجائے کسی بہتر دینی خدمت کی اللہ رب العزت کی طرف سے توفیق دی جاتی، واللہ یھدی من یشاء۔

باب اذان میں انگوٹھے چومنے کی بحث

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مبتدعین کے عوام جب مؤذن سے، اشھدان محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، کی آواز سنتے ہیں، تو وہ پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو چومتے ہیں، پھر اسے آنکھوں پر لگاتے ہیں، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں،

جب مؤذن کہے، اشھد ان محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، تو اس کو سن کر اپنے دونوں انگوٹھے یا کلمے کی انگلی چوم کر آنکھوں سے لگانا مستحب ہے۔

جاء الباطل ص۳۹۴ ج۱۔

الغرض ہمارا مشاہدہ اور مفتی صاحب کا اقرار اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ مبتدعین اذان سن کر جواب اذان دینے کی بجائے کلمہ شہادت پر انگوٹھوں کو چوما کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسی بدعت سیئہ ہے جو کہ سنت خیرالانام کے مخالف ہے کیونکہ، مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اذان کا جواب دیا جائے یعنی جس طرح مؤذن کلمات اذان کہتا ہے سننے والا بھی انہیں کلمات کو دھرائے۔

جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر گواہ ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول ثم صلوا علی فانہ من صلی علی صلوٰۃ صلی اللہ علیہ بھا عشراً، الحدیث.

یعنی میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرمارہے تھے کہ جب مؤذن سے اذان سنو تو اسی کی مثل تم بھی کلمات اذان کہو پھر مجھ پر درود بھیجو کیونکہ جس نے مجھ پر ایک بار درود بھیجا اللہ تعالی اس پر دس رحمتیں بھیجے گا،

الحدیث، صحیح مسلم ص۱۶۶ ج۱، و ابوداؤد ص۷۷ ج۱۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤذن، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے تو تم میں سے ہر ایک بھی، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے، جب مؤذن، اشھدان لا الہ الا اللہ، کہے تو وہ بھی یہی کہے، پھر جب مؤذن، اشھدان محمد رسول اللہ، کہے تو وہ بھی یہی کہے، جب

مؤذن، حی علی الصلوٰۃ، کہے تو سننے والا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، کہے، جب مؤذن حی علی الفلاح، کہے تو سننے والا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، کہے، جب مؤذن، اللہ اکبر اللہ اکبر، کہے تو وہ بھی ان کلمات کو دھرائے اور جب مؤذن، لا الہ الا اللہ، کہے تو وہ بھی اسی طرح کہے، آخر میں فرمایا کہ

من قلبہ دخل الجنۃ، یعنی جس نے دل سے ان کلمات کو کہا اسکے لئے جنت میں داخلہ ہے، صحیح مسلم ص۱۶۷ ج۱، وابو داؤد ص۷۸ ج۱۔

اذان کا جواب دینے کی احادیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مروی ہیں مثلاً، ابی رافع رضی اللہ عنہ، ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ، ام حبیبہ رضی اللہ عنھا، عبداللہ بن ربیعۃ رضی اللہ عنہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھا، معاذ بن انس رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ۔ دیکھئے ترمذی مع تحفہ ص۱۸۳ ج۱، والتلخیص الحبیر ص۲۱۱ ج۱، والتمھید ص۱۳۴ ج۱۰، وارواء الغلیل ص۲۵۸ ج۱، وبیھقی ص۴۰۹ ج۱ وغیرہ۔

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ اذان سننے والے پر اس کا جواب دینا واجب ہے، لیکن مبتدعین اس مسنون طریقہ کو ترک کر کے اور، اشھد ان محمد رسول اللہ، کہنے کی بجائے بقول مفتی صاحب مرحبا بحبیبی قرۃ عینی محمد بن عبداللہ، کو کہتے ہوئے اپنے انگوٹھے چومتے ہیں۔ جاء الباطل ص۳۹۶ ج۱۔

حالانکہ اس کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی وزنی ثبوت تو کجا کوئی حسن درجہ کی روایت بھی نہیں ہے،اس سلسلہ میں جو بھی بیان کیا جاتا ہے اس کی حیثیت زیب داستان سے بڑھکر نہیں ہے، مولوی احمد رضا خاں نے لکھا ہے کہ

بعض جہال بدمست یا نیم ملا شہوت پرست یا جھوٹے صوفی باد بدست کہ احادیث صحاح مرفوع محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے متشابہ پیش کرتے ہیں انہیں اتنی عقل بھی نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضیف، متعین کے آگے محتمل، محکم کے حضور متشابہ واجب الترک ہے،

احکام شریعت ص۶۲۔ وفتاویٰ رضویہ ص۱۹۹ ج۱۰ حصہ اول واللفظ لہ

یہی کچھ ہم یہاں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اذان کا جواب دینے کی احادیث صحیحہ ہیں اور متعدد

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مروی ہیں، جبکہ اس کے برعکس کلمہ شہادت کے وقت، اشھد ان محمد رسول اللہ، کہنے کی بجائے، مرحبا بحبیبی قرۃ عینی محمد بن عبداللہ، کہہ کر انگوٹھوں کو چومنے کی روایات من گھڑت اور وضعی ہیں جن کی حیثیت قصے و کہاوتوں سے زیادہ نہیں ہے، لیکن افسوس کہ مبتدعین کے بانی نے اپنے قائم کیئے ہوئے اصول و ضابطے سے انحراف کرتے ہوئے، انگوٹھے چومنے کے جواز پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں جن میں سے معروف، منیر العینین، ہے جو فتاوی رضویہ کی دوسری جلد میں شامل اشاعت ہے، جس میں انہوں نے دو تین صفحات اصل موضوع پر لکھنے (مفتی صاحب کی پیش کردہ من گھڑت روایات) کے بعد ادھر ادھر کی بے کار بھرتی کر کے فتح حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، حالانکہ ان کا یہ حق تھا کہ اذان کے جواب کی روایات کے بالمقابل صحیح مرفوع احادیث پیش کر کے محدثین کرام سے ان کی تصحیح نقل کرتے، چونکہ یہ کام علمی تھا اور سند مولوی احمد رضا خاں کو ملی نہ تھی، اس لئے انہوں نے خلط مبحث کرتے ہوئے مسئلہ کو الجھاؤ میں ضرور ڈالا، لیکن اپنے عمل کی کوئی صحیح السند حدیث تو کجا کوئی حسن درجہ کی بھی پیش نہ کر سکے، تو خاں صاحب خود اپنے اصول کی رو سے جاہل ثابت ہوگئے۔

انگوٹھے چومنے کا ثبوت

اس عنوان کے تحت حضرت مفتی صاحب نے متعدد کتب فقہ اور تفاسیر کی عبارات نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسند فردوس الاخبار، میں حدیث آتی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مؤذن سے کلمہ، اشھد ان محمد رسول اللہ، سن کر اپنی شہادت والی انگلی کو چوم کر اپنی آنکھوں کو لگایا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میرے اس پیارے کی طرح کرے اس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

دوسری روایت حضرت خضر علیہ السلام کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے مؤذن کو یہ کہتے ہوئے سنا، اشھد ان محمد رسول اللہ، تو کہے مرحبا بحبیبی وقرۃ عینی محمد بن عبداللہ، پھر اپنے انگوٹھوں کو چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے تو اس کی آنکھیں کبھی نہ دکھیں گی، اس پر مفتی صاحب نے مقاصد حسنہ، وغیرہ کتب کے حوالے بھی نقل کیئے ہیں، جاء الباطل

ص۳۹۴تا۳۹۷ج۱۔

الجواب

مفتی صاحب اور ان کے گرو مولوی احمد رضا خاں اور دیگر بدعت پسند حضرات نے اس کی دلیل پر جس قدر حوالے نقل فرمائے ہیں، ان تمام کا خلاصہ مطلب یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث فردوس الاخبار میں آتی ہے، مسند فردوس، آج سے تقریباً دس سال قبل کی شائع ہو چکی ہے اور بفضلہ تعالیٰ ہماری لائبریری میں موجود ہے، جس کی ایک ایک سطر کو راقم نے گہری نظر سے پڑھا ہے مگر اس میں مبتدعین کی پیش کردہ روایت سرے سے موجود ہی نہیں، یہی وجہ تھی کہ راقم الحروف نے، دین الحق ص۳۰۷ج۱، میں چیلنج دیا تھا کہ اس کی سند ثابت کرنے والے کو راقم پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دے گا، مگر مبتدعین نے اس پر دم نہیں مارا، اب بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ ہم پوری دنیا کے منکرین سنت اور عاشقین بدعات کو کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ اس کی صحیح سند ثابت کردو تو ہم اس کو سنت تسلیم کرنے کو تیار ہیں، اورانشاء اللہ جماعتی سطح پر اس پر عمل کریں گے مگر یاد رہے کہ پوری دنیا کے رضاخانی اس کا ثبوت نہیں دے سکتے،

غالباً انہیں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر ہی علامہ سیوطی نے کہا ہے کہ

والاحادیث التی رویت فی تقبیل الانامل وجعلها علی العینین عند سماع اسمه ﷺ عن المؤذن فی کلمة الشهادة کلها موضوعات.

یعنی وہ احادیث جن میں مؤذن سے کلمہ شہادت میں رسول اللہ ﷺ کا نام سننے کے وقت انگلیاں چومنے اور آنکھوں پر رکھنے کا ذکر ہے سب کی سب من گھڑت اور جعلی ہیں۔ تیسیر المقال بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ص۲۴۸ج۱۔

علامہ ابو اسحاق بن عبدالجبار کابلی نے شرح رسالہ عبدالسلام لاہوری میں لکھا ہے کہ،

قد تکلموا فی احادیث وضع الابهامین علی العینین فلم یصح شئی منها بروایة ضعیفة ایضاً صرح بعضهم بوضع کلها.

یعنی محدثین کرام نے انگوٹھوں کا آنکھوں پر رکھنے کی روایات پر کلام کیا ہے اور ان میں سے کوئی روایت سند ضعیف سے بھی ثابت نہیں ہوئی اور بعض محدثین نے اسی وجہ سے ان کے من

گھڑت ہونے کی صراحت کی ہے،

بحوالہ ایضاً ص ۲۴۷ ج ا۔

امام ابوالحسن عبدالغافر فارسی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں،

والروایات فی هذا الباب کثیرة لا اصل لها بسند ضعیف ایضاً وقال ابو نعیم الا صفهانی ماروی فی ذلک کله موضوع.

یعنی انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر انگوٹھے رکھنے کی روایات گو کثرت سے بیان کی جاتی ہیں مگر ان سے کوئی بھی ضعیف سند سے بھی ثابت نہیں امام ابونعیم اصفہانی نے کہا کہ یہ تمام کی تمام من گھڑت اور جعلی ہیں۔

اقوال الاکاذیب بحوالہ فتاوی نذیریہ ص ۲۴۷ ج ا۔

علامہ سخاوی، ملا علی قاری، علامہ طاہر حنفی، عجلونی وغیرہ نے اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ، لم یصح، یعنی اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں، اس کا جواب تحریر کرتے ہوئے مولوی احمد رضا خاں کی تقلید میں مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ، لم یصح، سے ضعف ثابت نہیں ہوتا اور ضعیف فضائل میں معتبر ہیں جاء الباطل ص ۴۰۰ و ۴۰۱ ج ا۔

حالانکہ یہ روایت ضعیف ہی نہیں بلکہ جعلی و من گھڑت ہے اور کوئی دنیا میں بریلوی مائی کا لال۔ اس کی سند صحیح تو کجا مسند فردوس سے اس کا وجود ہی ثابت نہیں کر سکتا جب یہ سرے سے ہے ہی من گھڑت تو فضائل میں ضعیف کے معتبر ہونے کا، اصول کون سنتا ہے بالخصوص جب یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے، رہی حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سے منسوب روایت کا معاملہ تو گزارش ہے کہ اس کے بارے میں ملا علی القاری حنفی فرماتے ہیں،

بسند فیه مجاهیل مع انقطاعه.

یعنی اس کی سند منقطع ہے اور کئی راوی درمیان میں مجہول ہیں،

موضوعات کبیر ص ۱۰۸ طبع میر محمد کتب خانہ کراچی۔

عیسائیوں کے گھر سے

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت صدر الا فاضل مولائی مرشدی استاذی مولانا الحاج سید نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلھم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ بر آمد ہوا جس کا نام ہے، انجیل برنباس، آجکل وہ عام طور شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں اس کے اکثر احکام اسلامی احکام سے ملتے جلتے ہیں اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روح القدس (نور مصطفوی) کے دیکھنے کی تمنا کی تو وہ نور ان کے انگوٹھے کے ناخنوں میں چمکایا گیا، انہوں نے فرط محبت سے ان ناخنوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا، جاء الباطل ص ۳۹۸ ج ۱۔

الجواب

بات کو آگے لے جانے سے قبل بہتر معلوم ہوتا کہ، انجیل برنباس، کی اصل عبارت قارئین کرام کے ھدیہ کی جائے۔

پس آدم نے بمنت یہ کہا کہ اے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن پر عطا فرما۔

تب اللہ تعالی نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطاء کی، داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت، لا الہ الا اللہ، اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت، محمد رسول اللہ ﷺ، تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پدری محبت کے ساتھ بوسہ دیا، اور اپنی دونوں آنکھوں سے ملا اور کہا، مبارک ہے وہ دن جس میں کہ تو دنیا کی طرف آئے گا، انجیل برنباس فصل ۳۹ آیت ۲۳ تا ۲۷، ص ۱۰۶۔

یہ ہے جناب وہ عبارت جس کی طرف حضرت مفتی صاحب نے روایتی طور پر اشارہ کیا ہے، لیکن اس میں چند وجوہات سے کلام ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اولاً۔ مفتی صاحب کے بیان اور اصل عبارت میں اختلاف ہے۔

ثانیاً۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انگوٹھوں کو پدری محبت کی وجہ سے بوسہ دیا، جبکہ مبتدعین پدری محبت سے نہیں بلکہ حضور علیہ السلام کی محبت کی وجہ سے چومتے ہیں۔ ہمارے شیخ فرماتے ہیں نیز

آدم علیہ السلام نے اس تحریر کو چوما تھا جس میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تھا جب کہ مبتدین حضرات کے ہاتھوں پر تحریر نہیں ہوتی وہ صرف اسم مبارک سنتے ہی انگوٹھے چومتے ہیں۔ پھر حضرت آدم نے اذان میں رسول اکرم ﷺ کا نام سن کر انگوٹھا نہیں چوما تھا جب کہ مبتدعین اذان میں اسم مبارک سن کر انگوٹھے چومتے ہیں۔ (محمد یحییٰ گوندلوی)

ثالثاً۔ انجیل برنباس بھی دیگر اناجیل کی طرح لفظوی و معنوی تحریفات کا شکار ہے، جس کی ضروری تفصیل انجیل برنباس کے مقدمہ میں خلیل سعادت نے بڑی تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔

رابعاً۔ انجیل کے اس اقتباس سے استدلال دراصل اس کی صحت کی تصدیق کرنا ہے جبکہ آنحضرت ﷺ نے اہل کتاب کی خبر کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ لاتصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم. الحديث.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی بات کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو۔

بخاری شریف ص۱۱۲۵ ج ۲، وبیھقی ص۱۶۳ ج ۱۰۔

لہذا مبتدعین کا انجیل برنباس کے قول کی تصدیق کر کے مخالف کو حجت باور کرانا، فرمان نبوی کی مخالفت ہے، الغرض انجیل برنباس کا اقتباس تب معتبر ہے جب اللہ تعالی اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے تصدیق شدہ ہو یعنی قرآن و حدیث میں اس واقعہ کی صحت ثابت ہو، لیکن ہم پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالی اور نبی ﷺ نے اس کی قطعاً تصدیق نہیں کی، اور پوری دنیا کے مبتدعین سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کر سکتے، قیامت تک مہلت ہے تجربہ کر دیکھئے۔

خامساً۔ انجیل برنباس میں کئی ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو اس کی صحت کو ساقط الاعتبار قرار دیتی ہیں، اور انبیاء کرام کی تعلیم کے منافی ہیں، اگر مبتدعین اس

حقیقت سے انکار کریں گے، تو انشاء الرحمٰن اس کی بحوالہ نشان دہی کر دی جائے گی، لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اس میں اکثر احکام اسلام سے ملتے ہیں، اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔

ایک من گھڑت

حضرت مفتی صاحب نے تفسیر روح البیان کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انسان کے ناخن دراصل جنتی لباس ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے پورے جسم پر نہایت خوبصورت اور نرم تھا جب ان پر عتاب الٰہی ہوا وہ کپڑا اتار لیا گیا مگر انگلیوں کے پوروں پر بطور یادگار باقی رکھا گیا، جاء الباطل ص۴۰۳ ج ا۔

حالانکہ یہ روایت محض جھوٹ کا پلندہ اور سینہ گزٹ ہے، کسی معتبر دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا، الغرض انگوٹھے چومنے کی جس قدر روایات اور محل استدلال کی عبارات ہیں وہ تمام کی تمام من گھڑت ہیں جن کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

علماء بریلویہ کا اعتراف

دین میں کسی چیز کے اثبات کیلئے حنفیہ نے ادلہ اربعہ کا اصول بنایا تھا کہ دین کے مسائل، قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس شرعی سے ثابت ہونگے، گو ہمارے نزدیک اصل قرآن و حدیث ہی ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے خلاف اجماع ہوسکتا ہے نہ ہی قیاس۔

الغرض قرآن و حدیث سے دلائل شرعیہ کا اثبات کرنے میں فریقین متفق ہیں اس ضابطہ پر بھی محقق علماء کا اتفاق ہے کہ ضعیف و موضوع اور من گھڑت واقعہ کو بنیاد بنا کر کسی شرعی مسئلہ کا اثبات کرنا درست نہیں ہے، اور یہ کہ کسی ضعیف روایت سے کوئی دینی مسئلہ ثابت نہ ہوگا، بریلوی مکتب فکر کا بانی مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے کہ

مذکورہ حدیث کو زید نے بالجزم رسول خدا کا ارشاد بتایا ﷺ، یہ سخت بیباکی و جرأت ہے وہ حدیث صحیح نہیں، اس کی سند کا مدار ابو صالح باذام پر ہے، باذام کو آئمہ فن نے ضعیف بتایا ہے، تقریب امام ابن حجر عسقلانی میں ہے،

باذام بالذال المعجمة ویقال اٰخره نون ابو صالح مولیٰ ام ھانی ضعیف مدلس.

یہیں سے ظاہر ہوا کہ یہ حدیث قابل احتجاج نہیں،

فتاوی رضویہ ص ۱۵۷ ج ۴۔

مزید کہتا ہے کہ اگر سند کا سلسلہ نہ ہوتا تو جو شخص چاہتا دین میں اپنی مرضی کی بات کرتا پھرتا، احکام شریعت ص ۱۳۳ حصہ اول مسئلہ ۵۸۔

رضا خانی فرقہ کا مناظر اعظم مولوی محمد عمر اچھروی لکھتا ہے،

اس کی سند میں بہت ضعف ہے چنانچہ اس سند کے رواۃ سے عبداللہ بن صالح راوی ہیں، ان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ، بہت غلط رواتیں بیان کرتا تھا، اہل حدیث بننے کا دعوی کرنے والو، ایسی کچی بات احناف کے سامنے پھر زبان پر نہ لانا،

مقیاس حنفیت ص ۲۴۷۔

مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ کراچی، شرح صحیح مسلم میں لکھتا ہے کہ یہ غیر مستند روایت ہے اور اسکی سند مذکور نہیں ہے، شیخ دھلوی نے اس کو، معارج النبوۃ، میں نقل کیا ہے اور اس میں رطب و یابس موجود ہے یہ حوالہ ہم پر حجت نہیں ہے، شرح صحیح مسلم ص ۵۱۸ ج ۱۔

مزید فرماتے ہیں، یہ واقعہ بنو سلمہ کے بعض بوڑھوں سے مروی ہے جن کا نام نہیں بیان کیا گیا، سو یہ مجہول روایت ہے، اور مجہول روایت حجت نہیں ہوتی۔

شرح صحیح مسلم ص ۵۱۱ ج ۱۔

ان عبارات سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ضعیف روایت سے استدلال کرنا درست نہیں اور بلا سند حدیث حجت نہیں ہے کیونکہ اگر سند نہ ہوتی تو ہر شخص جو جی میں آتا کہتا پھرتا، اور اپنی بات اور نظریہ کو حدیث کر کے پیش کرتا۔

قارئین کرام جب آپ نے یہ اصولی بات بخوبی سمجھ لی ہے کہ بلا سند حدیث معتبر اور قابل استدلال نہیں ہوتی، تو اب سنئے کہ انگوٹھے چومنے کی جس قدر روایات

بیان کی جاتی ہیں وہ تمام کی تمام من گھڑت بلا سند اور مجہول لوگوں سے مروی ہیں اور ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں جو قابل استدلال ہو۔

مبتدعین کا بنیادی استدلال ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی روایت پر ہے مگر

ہمارا دعوی ہے کہ یہ ان کی طرف جھوٹی منسوب کی گئی ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ یہ کسی مستند حدیث کی کتاب میں نہیں ہے ہاں بعض متاخرین نے بغیر سند کے ذکر کیا ہے، لیکن یہ ان کا وہم ہے، اور اوہام کو دین میں داخل کرنا، کم عقلی ہی نہیں بدترین جہالت ہے، دوسری روایت جو حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے بیان کی جاتی ہے اس کے بارے میں خود متاخرین نے اس کی سند میں مجہول راویوں کے علاوہ انقطاع کو تسلیم کیا ہے۔

الغرض یہ من گھڑت ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہیں جو کہ ہم پر حجت نہیں ہے۔



باب الطلاق الثلث فی مجلس واحد

فصل اول

پہلی آیت

للذین یولون من نساء ھم تربص اربعة اشھر فان فاءو فان الله غفور الرحیم ☆ وان عزموا الطلاق فان الله سمیع علیم ☆ والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلاثة قروءٍ ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق الله فی ارحامھن ان کن یومن بالله والیوم الاخر وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف و للرجال علیھن درجة والله عزیز حکیم ☆ الطلاق مرتن فامساک بمعروفٍ او تسریح باحسان.

پ۲ سورۃ البقرہ آیت ۲۲۶ تا ۲۲۹

اور وہ جو قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس (نہ) جانے کی' انہیں چار مہینے کی مہلت ہے پس اگر مدت میں پھر آئے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے' اور اگر چھوڑ دینے کا ارادہ پکا کرلیا' تو اللہ سنتا جانتا ہے اور طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رہیں' تین حیض تک اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا' اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہیں' اور ان کے شوہروں کو اس مدت کے اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے اگر ملاپ چاہیں اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے' پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نکوئی (نیکی) کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

(ترجمہ مولوی احمد رضا خان فاضل بریلوی)

ان آیات بینات سے دو باتیں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں کہ قسم کھانے والا مرد چار مہینے کی مدت گزرنے پر دو راستوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے میں مکلف ہے' اول اپنی' قسم سے رجوع کرے' دوم یا پھر عورت کو طلاق دیکر رخصت کر دے اگر خاوند نے متوخر الذکر راستہ اختیار کیا ہے'

طلاق دے دی' تو عورت کو حکم ہے کہ وہ تین قروٗ (جس کا مولوی احمد رضا خاں نے معنی تین حیض کیا ہے) انتظار کرے اور خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اس دوران طلاق سے رجوع کر لے' اور یہ رجوع دو طلاقوں تک ہے تیسری کے بعد نہیں ہے اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق دینے کے بعد مرد کو عدت کے دوران رجوع کا حق قرآن نے دیا ہے اور یہ حکم عام ہے جس میں ہر طلاق دینے والا اور ہر مطلقہ عورت داخل ہے (مگر وہی جسے اللہ اور اس کے رسول نے علیحدہ کر دیا ہو)

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک دم تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی' بلکہ مقصد یہ ہے کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں' الطلاق میں الف لام عہدی ہے پھر فرمایا کہ جو کوئی دو سے زیادہ یعنی تین دے تو بغیر حلالہ سے عورت حلال نہیں۔ جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ا۔

الجواب

اولا : قرآن کے الفاظ ہمارے سامنے ہیں جس میں اللہ تعالی نے ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ طلاق دینا مشروع فرمایا ہے مجموعی طور پر تین طلاقیں (بیک وقت) دینا اصل میں مشروع ہی نہیں فرمایا' چنانچہ اطلاق مرتان میں دو یکے بعد دی گئی طلاقوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اب وقت ہے کہ یا تو پہلے دی گئی طلاقوں سے " فامساک بمعروف " معروف طریقہ سے عورت کو روک لیا جائے یعنی ان طلاقوں سے رجوع کر لیا جائے یا پھر تیسری دیکر اسے " اوتسریح باحسان " فارغ کر دیا جائے پھر اسی تسریح باحسان کا تھوڑا سا آگے چل کر ذکر کرتے فرمایا کہ فان طلقھا فلاتحل لہ" یعنی اگر تیسری بار طلاق دے دی تو وہ (عورت) اس مرد کے لیے خلال نہیں رہتی۔

یہ تیسری آخری طلاق بائن ہو گی' جس سے میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ کیلیے جدائی واقع ہو جائے گی' اللہ تعالی نے یکے بعد دیگرے طلاق دینے کی ہدایت دیکر جو حکمت و مصلحت ملحوظ رکھی ہے وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قرآنی حکم کے مطابق طلاق دی جائے اور یہ تب ممکن ہے جب طلاق باری باری متفرق طہروں میں دی جائے' اب اگر کوئی شخص ایک دم تین طلاقیں دیتا ہے اور پھر اسے تین تسلیم بھی کر لیا جاتا ہے تو جہاں اس کا یہ فعل معصیت ہے وہاں ہی کتاب اللہ کے ساتھ

مذاق بھی ہے اور اللہ نے رجعت کا جو حق دیکر فریقین کو سوچ و بچار کا موقع فراہم کیا تھا اس کو ضائع کرنے کے علاوہ دو خاندانوں کی بربادی اس پر مستزاد ہے ان تمام حقائق کے برعکس مفتی صاحب کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ فرما رہے ہیں کہ اس میں ایک دم دی گئی تین طلاقوں کے ایک کا ذکر نہیں ہے حالانکہ مرتان' کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دو طلاقیں دوبار دو طہروں میں واقع ہوں جیسا کہ علامہ ابو بکر حصاص نے ۔احکام القران''میں صراحت کی ہے (تفصیل آگے مفتی صاحب کی پہلی دلیل میں آرہی ہے' انشاء الرحمٰن۔

عربی زبان ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں اگر آپ کہیں کہ میں نے زید کو ایک بار دو درہم دیئے' تو اس کا کوئی جاہل بھی یہ معنی نہ سمجھے گا کہ بکر نے زید کو دومرتبہ درہم دیئے۔

رہا مفتی صاحب کا مذکورہ ڈھکوسلہ کہ تین کو ایک نہیں کہا'' تو جواباً عرض ہے کہ ایک دم دی گئی تین کو تین تسلیم کرنے کا جب رد ہو گیا اور قرآن نے صاف کہہ دیا کہ مرد کو ایک وقت میں صرف ایک رجعی طلاق دینے کا حق ہے اور کسی شخص کو اس کا شرعاً کوئی اختیار نہیں کہ وہ یکدم تین طلاقیں دے سکتا ہے جس کے بعد دروازہ رجوع بند ہو جائے اور جس پر انسان کو شرعا کوئی اختیار ہی نہ ہوا س کو اگر کوئی نادان و جاہل کر بھی لے تو تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی جہالت کی وجہ سے عنداللہ کوئی مواخذہ نہیں نہ کہ کسی جاہل کا کر لینا ہی اس کے حق میں قانون بھی بن جاتا ہے' مثال کے طور پر اگر کسی جاہل نے ایسی عورت سے نکاح کر لیا جس سے نکاح کرنے سے اللہ تعالی اور اس کے رسول برحق حضرت محمد ﷺ نے منع فرمایا ہے' تو جہالت سے ایسی حماقت کرنے والے کو یہی کہا جائے گا کہ نکاح نہیں ہوا' اسی مسئلہ طلاق کے ہی ایک پہلو کو لے لیجئے کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ اگر میں فلانی عورت سے شادی کروں تو میری طرف سے اس پر طلاق ہے اور بعد میں اس سے شادی بھی ہو جاتی ہے' تو رسول اللہ ﷺ نے صاف کہا ہے کہ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی ' لاطلاق قبل النکاح ' یعنی نکاح سے قبل طلاق واقع نہیں ہوتی 'ابن ماجہ ص ۱۴۸ وبیھقی ص ۳۲۰ ج ۷' و مصنف عبد الرزاق (۱۳۸۹۹) و حاکم ص ۲۰۵ و دارقطنی ص ۴ ج ۴' واقع نہ ہونے کی صاف اور صریحا وجہ یہی ہے کہ نکاح سے پہلے مرد کو طلاق دینے کا اختیار نہیں' اسی طرح اگر کوئی صبح کے وقت ہی ظہر وعصر ومغرب وعشاء کی نماز پڑھ لے اگرچہ پڑھنے والا جاہل ہی کیوں نہ ہو' مگر کوئی اناڑی

بھی یہ نہ کہے گا کہ ایسے کرنے والے کی پانچوں نمازیں ہوگئیں جناب من اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ جب قرآن نے مرد کو ایک وقت میں صرف ایک ہی طلاق دینے کا حق دیا ہے تو واقع بھی صرف وہی ہوگی جس کا مرد کو حق دیا گیا ہے' ایک اور طرح سے اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے جس پر اس کی ملکیت نہیں تو کیا اس شخص کا وقف کرنا درست ہے اور فی الواقع وہ چیز وقف بھی ہو جائے گی' جان من جس چیز پر انسان کو اختیار ہی نہیں وہ کسی کے زبانی جمع خرچ سے اختیار مل نہیں جائے گا'

ثانیاً: مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ الطلاق میں الف لام عہدی ہے' غلط محض ہے کیونکہ یہاں لام عہد کیلئے نہیں بلکہ عموم کیلئے ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق مشروع متفرق ہے چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں' الطلاق مرتان'' کے تحت لکھتے ہیں

وفی ماقال مرتان دون ثنتان دلالة علی کراهة الطلقین دفعة واحدةفان کلمةمرتان تدل بالعبادة علی التفریق وبالاشارة علی العدد وللام للجنس ولیس وراء الجنس شئی وکان القیاس ان لا یکون الطلقیتان المجتمعان معتبرة شرعا واذالم یکن الطلقتان معتبرة لم یکن الثلاث مجتمعة معتبرة باطریق الاولی لو جودهما فیها مع زیاده ......

اللہ تعالی کا' مرتان'' فرمانا' ثنتان' نہ کہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ (طلاقیں مجموعی طور پر دینی حرام ہیں اس لئے کہ کلمہ مرتان عبارت النص کے طور پر تفریق پر دلالت کرتا ہے اور بطور اشارۃ النص عدد طلاق پر اور الطلاق کے اندر الف لام جنس کا ہے اور جنس کے آگے کچھ نہیں ہوتا اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ مجموعی دو طلاقیں معتبر نہ ہونگی تو تین طلاقیں بدرجہ اولی معتبر نہ ہونگی کیونکہ تین کے اندر دو کا عدد زیادتی کے ساتھ موجود ہوتا ہے' اور دو اور ایک ملا کر تین ہوتے ہیں)

ثالثاً: مفتی صاحب کا یہاں یہ فرمانا کہ پھر فرمایا کہ جو کوئی دو سے زیادہ تین دے تو بغیر حلالہ عورت حلال نہیں الخ اگر مفتی صاحب کی یہاں مراد ایک دم تین طلاقیں دینا ہے تو یہ قرآن پر افترا ہے اور اس کا افترا ہونا فریقین کو مسلم ہے کیونکہ یکدم تین طلاقوں کے ممنوع ہونے کا اعتراف مؤلف جاء الباطل کے تقلیدی مذہب کو بھی ہے اور اس تقلیدی مذہب نے اپنے مؤقف پر آیت قرآنی ' الطلاق مرتان' کو دلیل قرار دیا ہے۔

ملاحظہ احکام القرآن للجصاص والمبسوط للسرخسی، ص ۴۰۳ ج ۶۔

ظاہر ہے کہ اگر یکدم تین طلاقوں کا یہاں ذکر ہوتا تو فقہاء احناف تین کی حرمت کا اس سے استدلال نہ کرتے'

دوسرا اعتراض

اگر مان لیا جائے کہ مرتان سے تین طلاقوں کی علیحدگی مراد ہے تو یہ کہنا کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے اس میں بھی طلاقوں کی لفظاً علیحدگی ہے اور یہ کہنا کہ تجھے تین طلاقیں ہیں' اس میں عددی علیحدگی' کیونکہ علیحدگی کے بعد کیسے عدد بنے گا آیت کا یہ مطلب کہاں سے نکال لیا کہ طلاقوں کے درمیان ایک حیض کا فاصلہ ہونا شرط ہے' جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ۱۔

الجواب

اولا۔قرآن نے عورت کو تین حیض تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے' اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس دوران مرد کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے'صاف ظاہر ہے کہ اگر مرد طلاق کو وقفہ حیض سے دے گا تو تب ہی تین حیض کے درمیان رجوع کر سکتا ہے کیونکہ جب دوسری طلاق دے گا تو دوسرا حیض آنے کے بعد ختم ہو چکا ہوگا اور یہی آخری رجعی طلاق ہوگی' اگر تیسرا حیض بھی آ گیا تو عورت بائن ہوکر مرد پر حرام ہو جائے گی اگر مفتی صاحب زندہ ہوتے تو ہم انہیں مشورہ دیتے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلی کے ترجمہ قرآن کو پڑھیں جنہوں نے ثلثۃ قروء کا معنی تین حیض کیا ہے ثانیاً۔مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے میں بھی لفظاً علیحدگی ہے' جواباً عرض ہے کہ حضرت اس طرح یکدم تین طلاقیں دینا قرآن کے موافق ہیں یا مخالف؟

اگر مخالف ہیں یقیناً مخالف ہیں کیونکہ اسی طرح طلاق دینا تو صاحب ھدایہ (جو کہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہے) نے لکھا ہے بدعی ہے اگر اس طرح طلاق قرآن کے موافق ہوتی تو بدعی طلاق کیوں ہوتی ؟ اس سے واضح ہوا کہ مفتی صاحب کا اعتراض غلط ہے اور انہوں نے قرآنی حکم سے فرار کا ایک جھوٹا بہانہ تلاش کیا ہے جب قرآن نے ایک وقت میں صرف ایک ہی طلاق دینے کا حکم فرمایا ہے' تو صاف واضح ہے تو ایک ہی واقع ہوگی نہ کہ تینوں' اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ ایک

دن میں نماز ظہر صرف ایک ہی بار پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اب اگر کوئی شخص تین دنوں کی نماز ظہر ایک ہی دن پڑھنے کا ارادہ کر لے اور یہ سوچ کر سنیچر کو ظہر کے وقت میں تین بار نماز ظہر اسطرح پڑھے کہ پہلی بار کی نماز ظہر ہفتہ کی نماز ظہر ہے دوسری بار کی نماز ظہر اتوار کی اور تیسری بار کی نماز سوموار کی نماز ظہر ہے تو ظاہر ہے شریعت اسلام کا مقصود یہ ہے کہ ظہر کی نماز تینوں مختلف اوقات میں ایک ایک دن کے وقفہ سے ظہر کے وقت میں پڑھیں جائیں' اس لیے ایک دم پڑھی ہوئی دوسری اور تیسری ظہر کی نمازیں کالعدم ہونگی اسی طرح اگر کوئی مختلف اوقات کے بجائے ایک وقت میں الفاظ طلاق کو دھرائے گا تو اس کا ایک سے زیادہ والا مانا جائے گا کیونکہ شریعت نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ دومرتبہ طلاق رجعی دی جائے مطابق عدت دی جائے طلقوھن لعدتھن'' اور مطابق عدت طلاق کا مطلب شریعت نے یہ بتلایا ہے کہ طلاق دینے کے لائق وقت میں صرف ایک ہی طلاق دی جا سکتی ہے اس کی ایک

نظیر مسئلہ حج بھی ہے کہ شریعت میں حج مقررہ وقت میں صرف ایک ہی بار کیا جاسکتا ہے اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ میں حج کے مقررہ وقت میں ایک دم دو تین بار یا اس سے بھی زیادہ حج کر ڈالوں اور وہ یکدم۔ ایک حج کی بجائے وہ تین حجوں کیلئے دو تین احرام یا ان سے بھی زیادہ حجوں کیلئے باندھ لے اور احرام کی تعداد کے مطابق افعال حج بھی متعدد بار انجام دے تو ظاہر ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ انجام دیئے ہوئے یہ افعال حج جہاں کتاب وسنت کے ساتھ ایک مذاق ہے وہاں ہی اس کے یہ افعال حج کالعدم ہونگے۔

خلاصہ یہ کہ جس کام کا اللہ تعالی اور اس کے رسول برحق حضرت محمد مصطفی ﷺ نے کسی کو اختیار ہی نہیں دیا وہ کسی امتی کی محض جہالت سے کر لینے سے ہی اس فعل کا صادر ہو جانا ممکن نہیں اور اس کے صدور کا قائل روح شریعت سے مذاق کر رہا ہے' یہ اتنی واضح بات ہے کہ ہر شخص کی سمجھ میں بآسانی آ سکتی ہے اور اس پر تمام دوسرے شرعی امور کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

تمہاری تفسیر سے بھی آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ طلاقیں الگ الگ ہونی چاہئیں ہم بھی یہ ہی

کہتے ہیں کہ بیشک ایک دم تین طلاقیں دینا سخت منع ہے الگ الگ ہی دینا ضروری ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ جو کوئی حماقت سے ایک دم تین طلاقیں دیدے تو واقع بھی ہونگی یا نہیں اس سے آیت ساکت ہے' جاء الباطل ص ۴۶۱ ج ۱۔

الجواب

اولاً طلاق کو الگ الگ دینا یہ صرف ہماری ہی تفسیر نہیں بلکہ تمام مفسرین کرام اس کی یہی تفسیر کرتے ہیں کیونکہ قرآن کی آیات کا یہی مقصود ہے اور خود مفتی صاحب نے یہ بات لکھ کر کہ ہم بھی یہی کہتے ہے کہ ایکدم تین طلاقیں دینا سخت منع ہیں۔ الگ الگ دینا ضروری ہیں' تمام مفسرین کی بالعموم اور ہمارے موقف کی بالخصوص تائید کر دی ہے۔

ثانیاً۔ رہی مفتی صاحب کی یہ الٹی منطق کہ اگر کوئی حماقت سے طلاق دیدے تو واقع بھی ہونگی یا نہیں' اور پھر خود ہی یہ کہنا کہ آیت قرآنی اس سے خاموش ہے۔اس لا یعنی کلام کا مقصد بالکل وہی ہے جس طرح کسی جاہل ونادان نے قرآن کی ان آیات کا مذاق اڑایا تھا کہ قرآن میں یہ تو ضرور ہے کہ تمہاری مائیں بیٹیاں بہنیں پھوپھیاں خالائیں بھتیجیاں' بھانجیاں' دودھ کی مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا' تمہاری دودھ کی بہنیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو' پچھلی لڑکیاں جو اکثر اوقات تمہاری پرورش میں ہوں یہ سب تم پر حرام ہیں۔

سورۃ النساء آیت ۲۳۔

مگر قرآن اس سے ساکت ہے کہ اگر کسی نے حماقت سے ان عورتوں میں سے کسی سے نکاح کر لیا تو اب اس پر وطی کرنا بھی حرام ہے۔

فریق ثانی جس دلیل سے ایسے خبیث انسان کو مطمئن کرے گا وہی دلیل ہماری طرف سے مفتی صاحب کے مذکورہ ڈھکو سلے کی تصور کر لیجئے گا' حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب نے مذکورہ اعتراض کر کے آیات قرآنی کا مذاق اڑایا ہے' مفتی جی جب ایک سے زیادہ طلاق دینا نص سے حرام ہیں (جیسا کہ حنفیہ کو بھی اس کا اقرار ہے) تو پھر کسی کے فعل حرام سے حلال حرام نہیں ہو گا جیسا کہ حدیث نبوی میں صراحت ہے کہ" لا یحرم الحرام الحلال" ابن ماجہ (۲۰۱۵) وبیہقی ص ۱۶۸' ۱۶۹ ج ۷ ودار قطنی ص ۶۸ ج ۳"

اس طرح تین یکدم دینے سے یعنی حرام حلال کوحرام نہیں کرتا گنہگار تو ہوا مگر طلاق کے بعد رجعت کو قرآن نے تین مہینے کے اندر حلال کیا ہے اسے اس کا یہ فعل حرام ' نہیں کرے گا' باطل اسی طرح جس طرح مذکورہ عورتیں جو کہ محرمات سے ہیں اگر کوئی نکاح کرے تو نکاح کرنے والا گنہگار تو ہوگا مگر نکاح فاسد ہوگا' یہی علماء بریلی کے سرخیل اور مجدد بریلویت مولوی احمد رضا خاں نے فتویٰ دے رکھا ہے' چنانچہ خاں صاحب سے سوال کیا جاتا ہے کہ زید نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا اوراس کی حیات میں اس کی چھوٹی بہن سے نکاح کیا' نکاح دوم جائز ہے یا ناجائز اس کا خاں صاحب نے صاف جواب دیا ہے کہ نکاح دوم فاسد ہے احکام شریعت ص ۱۳۵ حصہ اول

دوسری آیت

اللہ تعالیٰ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

یایها النبی اذا طللقتم النساء فطلقوهن لعدتهن واحصواالعدة واتقوا الله ربکم لاتخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة و تلک حدود الله ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لا تدری لعل الله یحدث بعد ذلک امرا ☆ فاذا بلغن اجلهن فامسکوهن بمعروف اوفار قوهن بمعروف واشهدوا ذوی عدل منکم واقیمواالشهادة لله '

سورۃ الطلاق آیت ۱تا۲ ۔

اے نبی ﷺ جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں طلاق دیا کرو اورعدت شمار کیا کرو اوراپنے پروردگار سے ڈرتے رہا کرو تم ان کو ان کے مکانوں سے نہ نکالا کرو اور نہ وہ خود نکلا کریں ہاں جس وقت وہ کھلی بدکاری کریں تو نکال دو اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا، شاید اللہ اس کے بعد کوئی امر پیدا کر دے' پھر جب وہ اپنی عدت کو پہنچنے لگیں تو عزت کے ساتھ ان کو روک لیا کرو یا دستور کی موافق ان کو جدا کر دیا کرو اور دو عادل گواہ بنا لیا کرو اور شہادت اللہ کے لیے دیا کرو۔

آگے فرمایا۔ جو لوگ اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان رکھتے ہیں انکو یہ نصیحت کی جاتی ہے جو شخص

اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کیلئے راہ نکال دے گا اور خدا اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو گا جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کافی ہو گا بیشک اللہ تعالیٰ اپنی منشاء کے مطابق اپنا کام کر دیا کرتا ہے۔

قدجعل الله لكل شئى قدرا (۳)

اللہ نے ہر چیز کیلئے اندازہ اور وقت مقرر کر رکھا ہے' (ثنائی)

ناظرین کرام

اولا: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک بات کی صراحت فرمائی ہے کہ

قدجعل الله لكل شئى قدرا (۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے' ظاہر ہے کہ اس فرمان الٰہی میں طلاق بھی داخل ہے بلکہ طلاق کے سلسلہ میں اس کا ذکر فرما کر اس طرف توجہ دلا دی کہ طلاق کیلئے خصوصی ایک حد مقرر کر رکھی ہے' **ذالكم يوعظ به** کہہ کہ معاملہ اور بھی صاف کر دیا کہ جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں نصیحت ہے کہ طلاق کے سلسلہ میں جاری کردہ میرے فرمان کی مخالفت ایک مومن کے شایان شان نہیں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں ظالم اور اسلامی حدود سے تجاوز کے مرتکب قرار پائیں گے۔

"**ذلک امر الله**" کہہ کر اس بات پر مزید زور دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل کیا ہے اس کی پابندی کی جائے۔

ثانیاً۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت صراحت سے طلاق دینے والوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی عورتوں کو عدت میں طلاق دو اور اس (عدت) کی پوری پوری نگہداشت رکھو اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صاف اعلان فرمایا کہ عدت میں طلاقیں دینے کا مطلب یہ ہے کہ مدخولہ عورت کو (جس طہر میں جماع نہ کیا ہو) ایک بار طلاق دو حضرت امام نافع فرماتے ہیں کہ۔

ان عبدالله بن عمر طلق امراته وهى حائض على عهد رسول الله ﷺ فسال عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلک فقال رسول الله ﷺ مره اجعهاثم يمسكهاحتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر ثم انشاء املاء بعد وان شاء طلق قبل ان

یمس فتلک العدة التی امر الله ان یطلق لها النساء . موطا امام مالک ص ۵۲۴ واللفظ وبخاری ص ۷۹۰ ج ۲ ، و مسلم ص ۴۷۶ ج .

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عورت کو حیض کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں طلاق دی، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔ نہیں حکم دو رجعت کر لیں ۔ پھر رہنے دیں جہاں تک کہ حیض سے پاک ہو پھر حائضہ ہو پھر حیض سے پاک ہو، اب اختیار ہے خواہ رکھے یا طلاق دے اگر طلاق دے تو اس طہر میں صحبت نہ کرے یہی عدت ہے جس میں حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا۔ (انتھی)

اس حدیث کی روشنی میں قرآن مجید کی مذکورہ آیات کا یہ معنی متعین ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ اصول بتایا ہے ,, ہر چیز کیلئے ایک حد متعین کر دی گئی ہے'' اس کے مطابق اس نے طلاق کے لیے حد متعین کر دی ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک طلاق دی جائے اور یہ بھی حکم قرآنی ہے کہ اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور یہ چیز بھی کسی شک وشبہ سے بالا تر ہے کہ جس کام کا انسان کو شرعاً اختیار نہیں اسے کسی نے کر ڈالا تو اس کا اعتبار نہیں بلکہ وہ کام کالعدم ہوگا، اس کی مسئلہ طلاق میں ہی مثال موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے نہ کہ عورت کو، اگر عورت حماقت سے یہ کہہ دے کہ میں نے اپنے خاوند کو طلاق دی طلاق دی طلاق دی اور ان تینوں طلاقوں سے مراد بھی عورت کی تینوں طلاقیں دینا ہی ہو، تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی، یقیناً نہیں، علماء بریلویہ طلاقوں کے واقع نہ ہونے کی یہی دلیل دیں گے کہ عورت کو طلاق دینے کا اختیار ہی نہیں دیا گیا، اسی طرح جس طلاق کا مرد کا اختیار نہیں دیا گیا وہ واقع ہی نہیں ہوگی ۔

تنبیہ

حضرت مفتی صاحب نے مذکورہ آیات کے ماتحت ,, ابوداود وغیرہ سے حدیث رکانہ درج کر کے اھل حدیث کی طرف سے ,, تیسرا اعتراض'' ذکر کیا ہے کہ ابو رکانہ نے اپنی بیوی ام رکانہ کو طلاق دی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ رجوع کر لو ۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور میں نے تین

طلاقیں دی ہیں' فرمایا ہاں ہم جانتے ہیں مگر رجوع کرو اور یہ آیت تلاوت فرمائی ۔

یایھا النبی اذاطلقتم النساء فطلقوا ھن لعدتھن .

اگر اکٹھی طلاقیں تین واقع ہوتیں تو رجوع ناممکن تھا وہاں تو حلالہ کی ضرورت در پیش آتی ۔
معلوم ہوا کہ ایک طلاق باقی رکھی گئی اور دو کو رد کر دیا گیا حالانکہ ابو رکانہ عرض کر رہے ہیں کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں یہاں تاکید کا احتمال نہیں اور پھر بھی ایک ہی مانی گئی الخ ۔

حضرت مفتی صاحب نے اس کا جواب تقریباً ڈیڑھ صفحہ تحریر کیا ہے خلاصہ ان کی تحریر کا یہ ہے کہ تین طلاقیں والی روایت ضعیف ہے جب کہ صحیح روایت سے یہ ثابت ہے کہ ابو رکانہ نے طلاق بتہ دی تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دیگر احادیث سے صحیح ہے کیونکہ اس کا بیٹا اور اس کے گھر والے اس کے حالات سے بمقابلہ غیروں کے زیادہ واقف ہوتے ہیں رکانہ کے پوتے تو فرماتے ہیں کہ میرے دادا نے میری دادی کو طلاق بتہ دی اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ طلاقیں تین دیں ۔

جاء الباطل ص ۴۶۴ ج ا ۔

الجواب

اولاً ۔ طلاق بتہ کی روایت ضعیف ہونے کے علاوہ مفتی صاحب کے مذہب کے مخالف ہے جیسا کہ آگے مفتی صاحب کی چھٹی دلیل کے جواب میں تفصیل سے انشاء الرحمٰن آ رہا ہے ۔

ثانیاً ۔ لفظ بتہ سے مروی یہ حدیث ہمارے مخالف نہیں بلکہ موافق ہے جو اسے اھل حدیث کے رد میں پیش کرتا ہے' اس نے یا تو مغالطہ کھایا ہے یا جان بوجھ کر حقیقت پر پردہ ڈال رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اھل مدینہ طلاق ثلاثہ' کو طلاق بتہ کہتے تھے ۔

فریق ثانی پر حجت تامہ کیلئے ہم اس جگہ پر ایک بریلوی مکتب فکر کے مفسر قرآن جناب پیر کرم شاہ **ازھری** آف بھیرہ کا حوالہ پیش کرتے ہیں' چنانچہ فرماتے ہیں کہ

اہل مدینہ کا عرف یہ تھا کہ طلاق ثلاث کو طلاق بتہ کہا کرتے نہ یہ کہ طلاق البتہ کو طلاق ثلاث' دعوت فکر ونظر مندرجہ مجموعہ مقالات علیمہ ص ۲۳۴ ۔

اس لحاظ سے مدنی عرف کے مطابق حدیث رکانہ کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے بیوی کو مجلس واحد میں تین طلاقیں دی تھیں لیکن طلاق کے بعد انہوں نے اپنی بیوی کو رکھنا چاہا تو رسول اللہ ﷺ

نے ان کو اس کی اجازت مرحمت فرمادی ۔ ثالثاً حضرت مفتی صاحب نے ابو داود اور بیہقی سے حسب ذیل الفاظ نقل کر کے۔

انماطلق امراته البتة وجعلها النبی ﷺ واحدة' جاء الباطل ص ۴۶۴ ج ۱ .

طلاق ثلاث کے الفاظ سے مروی روایت کو ضعیف ٹھہرایا ہے' حالانکہ ایسا کرنا حضرت مفتی صاحب کی شایان شان نہ تھا کیونکہ مذکورہ الفاظ تو ہمارے مؤقف (جو کہ ثانیاً کے تحت گزر چکا ہے) کی تائید کرتے ہیں' کیونکہ یہاں بتہ کے الفاظ واحدۃ کے بالقابل بولے گئے ہیں جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ بتہ سے مراد ایک دم دی گئی تین طلاقیں ہیں جنہیں نبی ﷺ نے ایک شمار کیا ,, جعلھا'' کا یہی مفاد ہے۔

پہلی حدیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ۔

کان الطلاق علی عهد رسول الله ﷺ وابی بکر وسنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدةفقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فيه اناةفلوا مضيناه عليهم فامضاه عليهم .

مسلم ص ۴۷۷ ج ۱

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارکہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی دو سال تک تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں ۔ (پھر) عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ایک ایسے کام میں جلد بازی شروع کر دی ہے جس میں ان کو مہلت تھی' پس اگر ہم ان تینوں کو ہی ان پر نافذ کر دیں' (تو مناسب ہے) پس آپ نے تین طلاقوں کو نافذ کر دیا'

اس حدیث کی صحت کیلئے اس قدر ہی کافی ہے کہ اسے امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں داخل کیا ہے اور اس کے اول تا آخر تمام راوی ثقہ وثبت ہیں' خود حضرت مفتی صاحب نے بھی اسکی صحت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنا پورا زور حدیث مذکورہ کی تاویل میں صرف کیا ہے اگر

صحت حدیث میں انہیں رتی بھر بھی گنجائش نظر آتی تو حضرت حکیم صاحب اپنی مخصوص حکمت کو جوش میں لاکر کوئی نہ کوئی حواس باختہ جرح ضرور کرتے خلاصہ یہ کہ حدیث مذکورہ صحیح ہے اس مسئلہ میں واضح بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی طیبہ میں اور اس طرح خلافت صدیقی وابتدائی دور فاروقی میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا' نبی رحمت حضرت مصطفیٰ ﷺ کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کی شایان شان نہیں کہ وہ اس کی جان بوجھ کر مخالفت کرے کیونکہ یہ راستہ سیدھا جھنم کی طرف لے جانے والا ھے۔

مفتی صاحب کا پہلا اعتراض

یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی تو یہ روایت ہے اور خود ان ہی کا فتویٰ ہے کہ ایک دم تین طلاقیں ہی تین طلاقیں ہی ہوں گی جس کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے اور جہاں راوی حدیث کا عمل اپنی روایت کے خلاف ہو وہاں معلوم ہوگا کہ راوی کے علم میں یہ حدیث منسوخ ہے نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی موجودگی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قانون بنا دینا کہ ایک دم تین طلاقیں تین ہی ہونگی اور اس پر عمل درآمد ہو جانا اور کسی صحابی بلکہ خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اس پر اعتراض نہ کرنا بآواز بلند خبر دیتا ہے کہ وہ حدیث یا منسوخ ہے یا ماول (نقل مطابق اصل' ابوصہیب) کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنھم حدیث کے خلاف اجماع کر سکتے ہیں' جاء الباطل ص ۴۲ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ طلاق ثلاثہ کے وقوعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا اجماع ہو چکا ہے تفصیل آگے آ رہی ہے' انشاء الرحمٰن۔

ثانیاً۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد اسناد صحیحہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے یکدم دی گئی طلاق ثلاثہ کو ایک طلاق رجعی قرار دیا ہے کماسیاتی انشاء الرحمٰن بفضلہ تعالی۔

ثالثاً۔ قال اعتبار راوی کی حدیث کا ہوتا ہے نہ کہ راوی کی رائے کا خاص کر جب راوی سے نبی ﷺ کی وفات کے بعد حدیث کے موافق فتویٰ منقول ہو' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے

حدیث کے موافق فتویٰ دیا ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پوری مدت خلافت صدیقی اور ابتدائی دور خلافت فاروقی کے دوتین سال تک اس حدیث پر امت کا تعامل رہا ہے تو اس کے بعد کس چیز نے اس کو منسوخ کردیا ہے' امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ۔

المازری وقد زعم من لاخبر له بالحقائق ان ذلک کان ثم نسخ قال وھذا غلط فاحش لان عمر رضی اللہ عنہ لا ینسخ ولو نسخ و حاشاہ لبادرت الصحابة الی انکارہ وان ارادہ ھذا القائل انہ نسخ فی زمن النبی ﷺ فذالک غیر ممتنع ولکن یخرج عن طاھر الحدیث لانہ لو کان کذالک لم یخبر للراوی ان یخبر بیقاء الحکم فی خلافة ابی بکر و بعض خلافة عمر فان قیل قد یجمع الصحابة علی النسخ فیقبل ذلک منھم قلنا انمایقبل ذلک لانہ یستدل اجماعھم علی ناسخ واما انھم ینسخون من تلقاء انفسھم فمعاذ اللہ لا نہ اجماع علیٰ الخطا وھم معصومون من ذلک فان قیل فلعل النسخ انما ظھر لھم فی زمن عمر قلنا ھذا غلط ایضا لانہ یکون قد حص الاجماع علی الخطاء فی زمن ابی بکر و المحققون من الاصولیین لایشترطون انقراض العصر فی صحة الا جماع ' واللہ اعلم . شرح صحیح مسلم ص ۴۷۸ ج ۱ .

مازری نے کہا ہے کہ جن لوگوں کو حقائق کی خبر نہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ حکم تھا پھر منسوخ ہوگیا' مازری نے کہا یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی چیز کو منسوخ نہیں کر سکتے اور اگر حاشا و کلا منسوخ کرتے بھی تو صحابہ کرام فوراً انکار کرتے اور اگر قائل کا منشا یہ ہے کہ حکم نبی ﷺ کے دور میں منسوخ ہوگیا تو یہ بات ناممکن نہیں لیکن یہ بات حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو راوی کیلئے جائز نہ ہوتا کہ وہ خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض سالوں تک اس حکم کے باقی رہنے کی خبر دیتا' اگر یہ کہا جائے کہ کبھی صحابہ نسخ پر اجماع کر لیتے ہے اور ان کا اجماع قبول کرلیا جاتا ہے' ہم کہتے ہیں کہ انکا اجماع اس لئے قبول کرلیا جاتا ہے کہ اس سے ناسخ کے وجود کیلئے دلیل فراہم ہو جاتی ہے' رہی یہ بات کہ وہ خود منسوخ کرتے

ہیں تو اس سے اللہ تعالی کی پناہ کیونکہ یہ غلطی پر اجماع ہوگا اور وہ اس سے معصوم ہیں۔
اگر کہا جائے کہ نسخ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ظاہر ہوا، ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غلطی پر اجماع ہو گیا تھا ارو محقق علماء اصول نے اجماع کی صحت کیلئے زمانہ کے ختم ہونے کی شرط نہیں لگائی، واللہ اعلم۔

مفتی صاحب کا دوسرا اعتراض

دوسرے یہ کہ اس حدیث میں اس عورت کو طلاق دینا مراد ہے جس سے خلوت نہ ہوئی ہو اور واقعی اگر کوئی شخص اپنی ایسی عورت کو تین طلاقیں ایک دم اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے تو اول واقع ہوگی اور اخیر کی دو طلاقین لغو، چنانچہ ابو داؤد کتاب ,, الطلاق باب النسخ المراجعۃ التطلیقات الثلث'' میں ہے کہ ابو صحبا نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کو خبر نہیں کہ زمانہ نبوی زمانہ صدیقی اور شروع خلافت فاروقی میں جو کوئی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تو ایک ہی مانی جاتی تھی۔ فرمایا ہاں جو غیر مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا اسکی طلاق ایک پڑتی تھی۔
جاء الباطل ص۴۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولا۔ مفتی صاحب نے صحیح حدیث کو رد کرنے کیلئے جو یہ مخلص تلاش کیا ہے اس میں رتی بھر جان نہیں اور اسے بے جان سمجھ کر ہی اکابر احناف نے اس کی تردید کی ہے تفصیل آگے انشاء الرحمٰن آرہی ہے۔

ثانیًا۔ یہ خود مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب کے خلاف ہے کیونکہ ان کا مؤقف ہے کہ اگر خاوند نے بیوی سے کہا تجھے تین طلاقیں ہیں تو تینوں ہی واقع ہو جائیں گی چنانچہ علماء بریلویہ کے سر اور مجدد بدعات مولوی احمد رضا خاں نے لکھا ہے کہ۔

قربت نہ کی تھی تو ایک لفظ میں تین طلاقیں دیں مثلاً یہ کہ تو تین طلاق سے مطلقہ ہے تو طلاق مغلظہ ہوگئی اور بغیر حلالہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور اگر ہنوز قربت نہ کی تھی اور متفرق لفظوں میں تین طلاقیں دیں مثلاً تجھ پر طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے، تو طلاق بائن ہوئی مغلظہ نہ ہوئی بے

حلالہ اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے فتاوی رضویہ ص ۱۱۳ جلد ۵ حصہ اول مسئلہ نمبر ۱۱۴۔

اس عبارت کا واضح مفاد ہے کہ اگر غیر مدخولہ کو یک دم تین طلاقیں دی جائیں تو احناف کے نزدیک تینوں ہی واقع ہو جائیں گی، خود حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو جس سے صرف نکاح ہوا ہو اور خلوت نہ ہوئی ایکدم تین طلاقین اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے اس صورت میں صرف ایک طلاق واقع ہو گی اور آخیری دو واقع نہ ہوں گی کیونکہ پہلی طلاق بولتے ہی وہ عورت نکاح سے خارج ہو گئی اور اس پر عدت بھی واجب نہ ہوئی ۔۔۔۔۔ہاں اگر اس طرح عورت سے کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو تینوں پڑ جائیں گی کیونکہ اس صورت میں تینوں طلاقیں نکاح کی موجودگی میں پڑیں ۔ص ۴۵۴ ج ۱۔

اس عبارت میں مفتی صاحب نے صاف اقرار کیا ہے کہ یکدم ایک ہی لفظ سے تینوں طلاقیں دے گا تو تینوں ہی واقع ہو جائیں گی یہی وجہ ہے کہ اکابر احناف نے صاف اقرار کیا ہے مذکورہ توجیح ہمارے خلاف ہے چنانچہ علامہ ماردینی فرماتے ہیں ۔

ولیس ذلک مذهب الشافعی بل مذهب انها تبین بالا ولی ولاحکم لما بعدها وهو مذهب ابی حنیفة واصحابه والثوری واحمد واسحق ذکره الخطابی و روایة ایوب ضعیفة فکیف یستدل بها البیهقی علی صحةهذا التاویل الذی خالفه هو وامامه واکثر الفقهاء

(اور جو امام رحمتہ اللہ علیہ نے کی ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ غیر مدخولہ کے متعلق ہے) اور یہ مذہب امام شافعی کا نہیں بلکہ ان کا مؤقف ہے کہ پہلی طلاق سے عورت بائن ہو جائے گی اور بعد کی طلاق کا کوئی فائدہ نہیں اور یہی مذہب امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں اور امام ثوریؒ احمد بن حنبل اور اسحاق کا ہے جیسا کہ علامہ خطابی نے بیان کیا ہے اور ایوب کی (ابوداؤد والی) روایت ضعیف ہے تو پھر امام بیہقی کی تاویل کی صحت کو کیسے تسلیم کر لیا جائے خاص کر جب اس تاویل کی ان کے امام اور اکثر فقہاء نے مخالفت کی ہے ۔ الجوھر النقی ۳۳۹ ج ۷

اس عبارت سے واضح ہے کہ فقہ حنفی میں غیر مدخولہ کے متعلق دو مؤقف پائے جاتے ہیں پہلا مؤقف جس میں مرد تین بار علیحدہ علیحدہ طلاق کا لفظ بولتا ہے، دوسرا مؤقف جس میں مرد تینوں

طلاقیں یکدم بولتا ہے' پہلی صورت میں طلاق صرف ایک ہی واقع ہو گی جب کہ دوسری صورت میں تینوں ہی واقع ہو جائیں گی' سوال یہ ہے کہ مفتی صاحب نے کس دلیل سے پہلا مئوقف مراد لیا ہے اور دوسرے کو ترک کر دیا ہے جب کہ حدیث میں اس تقسیم کے متعلق کوئی لفظ تو کجا اشارہ تک موجود نہیں' امر واقعہ یہ ہے کہ ابو داود کی روایت مفتی صاحب کے تقلیدی مذہب کے خلاف حجت تامہ ہے جیسا کہ علامہ ماردینی نے صراحت کی ہے۔

ثالثاً۔ جب آپ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث منسوخ نہیں' (جب کہ اس سے پہلے آپ نے نسخ کا دعویٰ بھی کر رکھا ہے) بلکہ یہ صرف غیر مدخولہ کے متعلق ہے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو کہ عام ہے آپ نے کس دلیل سے خاص کیا ہے کہ یہ صرف غیر مدخولہ کے متعلق ہے؟ اگر آپ کہہ دیں کہ ابوداود کی حدیث ایوب سے ہم نے یہ تخصیص کی ہے جواباً عرض ہے کہ اول تو محض طلاق کی حد تک مدخولہ اور غیر مدخولہ کا کوئی فرق نہیں، جب آپ نے اس حدیث کو ایک کے متعلق تسلیم کر لیا ہے تو مدخولہ کا حکم خود بخود ثابت ہو گیا دوم ابو داود کی حدیث ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ماردینی نے صراحت کی ہے اور ضعیف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں مجہول راوی ہیں چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں۔

واما هذا الرواية التی لا بی داود فضعيفة رواها ايوب السختيانی عن قوم مجهولين عن طاؤس عن ابن عباس فلا يحتج بها ' ۴۷۸ ج ۱ .

اور یہ روایت جو کہ ابوداود نے روایت کی ہے ضعیف ہے کیونکہ اسے ایوب نے ایک مجہول قوم کے طریق سے بیان کیا ہے لہذا اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔

مفتی صاحب کا تیسرا اعتراض

زمانہ نبوی اور زمانہ صدیقی میں لوگ تین طلاقیں اسطرح دیتے تھے کہ تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے' گویا پچھلی دو طلاقوں سے پہلی طلاق کی تائید کرتے تھے اور زمانہ فاروقی میں لوگوں کا یہ حال بدل گیا کہ وہ تین طلاقیں ہی دینے لگے لہذا صورت مسئلہ بدلنے سے حکم بدل گیا' جاء الباطل ص ۶۶۲ ج ۱۔

الجواب

اولا۔ حضرت مفتی اعظم اور حکیم الامت کی یہ تحقیق ہے کہ اگر حدیث میں تعارض ہو تو احادیث نا قابل عمل ہو جاتی ہیں (دیکھئے جاء الباطل ص ۲۰۳ ج ۱۔ اور یہاں حضرت صاحب کے بدایونی اعتراضات میں تعارض ہے پہلے میں کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا' دوسرے اعتراض میں نسخ سے انکار کر دیا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ یہ حکم غیر مدخولہ عورت کی طلاق کی ایک خاص شق کے متعلق ہے اب اس سے بھی مکر گئے ہیں اور پہلی اور جھانوی تحقیق کے برعکس یہ کہہ دیا کہ نہ تو یہ حکم منسوخ ہوا ہے نہ ہی غیر مدخولہ کے متعلق ہے بلکہ یہاں مقصود ہی ایک طلاق دینا ہے' انا اللہ وانا الیہ راجعون ۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ کے اعتراض میں تعارض ہے تو وہ خود بخود مردود و باطل کیوں نہیں ہو جاتے ۔

ثانیاً ۔ مفتی صاحب کے اعتراض سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے طلاق میں شرعاً نیت کو بھی دخل ہے جب ہی تو انہوں نے تین دفعہ بولے ہوئے لفظ طلاق کو محض طلاق دینے والے کی نیت پر اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی مراد پہلی طلاق کی تائید کرنا تھا' حالانکہ ایسا لکھنا مفتی صاحب کے رضوی مذہب کے خلاف تھا' چنانچہ مولوی رضا خاں سے سوال کیا جاتا ہے کہ زید نے اپنی بیوی کے دروازے پر جا کر بآواز بلند اپنی زوجہ کو طلاق دی اب شوہر کا کہنا ہے کہ میں نے یہ لفظ محض خوف دلانے کیلئے غصہ کی حالت میں کہا تھا۔

اور گھر میں زوجہ کے بھائی اور والدہ اور نانی اور دروازے پر ایک ملازم کا بیان ہے کہ ہم نے طلاق دی' دی'دی' کا لفظ تین دفعہ سنا اور دروازہ کے باہر دو شخصوں نے بھی اس آواز کو سنا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دی کا لفظ ایک دفعہ سنا اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکورہ بالا میں تین طلاق ہوئیں یا ایک طلاق رجعی؟

الجواب

عورت کے دونوں بھائی اور ملازم ان تینوں شخصوں میں اگر دو ثقہ عادل قابل قبول ہیں تو تین طلاقیں ہو گئیں ۔

فتاویٰ رضویہ ص ۶۱ ج ۵ حصہ پنجم مسئلہ نمبر ۷۷

مجدد بریلویت کے اس فتویٰ سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلاق میں نیت کو کچھ دخل نہیں ہے' ورنہ فتویٰ تو اس طرح لکھنا چاہیے تھا کہ چونکہ مرد کا کہنا ہے کہ میں نے طلاق کی نیت ہی نہیں کی محض خوف دلایا ہے لہذا طلاق واقع ہی نہیں ہوئی' اس بات کو بھی جانے دیجیے مرد کا کہنا کہ میں نے ایک بار طلاق دی ہے اور اس کے دو آدمی باہر کے گواہ بھی موجود ہیں تب بھی مجدد صاحب نے طلاق دی دی دی سے تین طلاقوں کا فتوی دیا ہے حالانکہ بقول مفتی صاحب مرد کی بات پہ اعتماد کیا جاتا ہے اور فتویٰ یہ دیا جاتا کہ بالفرض اگر مرد نے تین بار ہی یہ جملہ کہا ہو تب بھی ایک ہی واقع ہوگی کیونکہ اس کی نیت تو ایک ہی کی تھی مگر دیکھا آپ نے کہ مولوی احمد رضا خاں فاضل بریلی نے تین طلاقوں کا ہی فتویٰ دیا ہے' اس طرح غصہ کی حالت میں دی گئی طلاق کو بھی کالعدم اور نامقبول کیا جانا چاہیئے کیونکہ غصہ کی حالت میں مرد نیت وارادہ سے طلاق نہیں دیتا مگر سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالت غصہ میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خاں لکھتا ہے' یہ خیال کہ غصہ میں مطلقا طلاق نہیں ہوتی محض جاہلانہ خیال ہے طلاق اکثر غصہ میں ہوتی ہے رضا مندی میں کون چھوڑتا ہے' ایضاً ص ۲۷ مسئلہ ۱۰۰' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر علمائے احناف کے نزدیک تو جبراً لی گئی طلاق بھی واقعہ ہو جاتی ہے جس کی تائید تو مولوی احمد رضا خاں نے بھی کر رکھی ہے' ایضا ص ۶۱ مسئلہ نمبر ۶۸ الغرض اگر طلاق میں نیت کو دخل ہوتا تو غصہ میں دی گئی اور جبراً لی گئی طلاق واقع نہ ہوتی بلکہ محض خوف دلانے کی نیت میں بولے گئے الفاظ طلاق کا وقوعہ نہ ہوتا مگر آپ نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے مجدد صاحب نے اس کے برعکس فتویٰ دیا ہے ۔

ثالثاً ۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ طلاق میں نیت کو دخل ہے اور تین بار جدا جدا لفظ طلاق کہہ کر بھی دینے والے کی نیت اگر ایک ہی طلاق دینے کی تھی تو بقول مفتی صاحب وہ ایک ہی طلاق واقع ہوگی مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب لوگوں نے تینوں سے مراد تین طلاقیں دینا ہی مراد لیا تو طلاق دینے والے کی منشاء کے ماتحت شریعت بھی بدل گئی ہے' یہ ایک ایسی بات ہے جس میں حضرت مفتی صاحب نے ہماری تائید کی ہے کیونکہ کوئی بھی حنفی بریلوی یا دیوبندی اس کا قائل نہیں بلکہ تمام کے نزدیک طلاقیں تین ہی واقع ہونگی ۔

یک دم دی گئیں تین طلاقوں میں ہم نوے فی صد ایسی امثلہ پیش کر سکتے ہیں جس میں ان کی مراد صرف ایک طلاق دینا ہوتی ہے تین طلاقوں کا تصور تو ان کے وہم وخیال میں بھی نہیں ہوتا اور جب وہ اپنے علماء کرام سے رابطہ قائم کرتے ہیں تو تب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہی آن میں اپنے اوپر حرام کرلیا ہے تب اسے علماء بریلی حلالے جیسی لعنت کا مشورہ دیتے ہیں آخر علماء بریلویہ حلالے جیسی لعنت کا فتویٰ دینے سے پہلے اس سے قسماً وحلفاً یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ تو نے جب اپنی بیوی کو یہ کہا تھا 'میں نے تجھے طلاق دی' دی 'دی' تو ان الفاظ سے تیری کیا مراد تھی تین یا ایک طلاق دینے کا یا تجھے طلاق کے سلسلہ میں حکم شریعت کا کوئی علم ہی نہیں تھا' راقم الحروف بآواز بلند یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر علمائے بریلویہ اس طرح سوالات کریں تو نوے فیصد کیسوں کی طلاق محض ایک رجعی طلاق قرار پائے اور کئی لوگ حلالے جیسی بے غیرتی سے چھوٹ جائیں ان کی اجڑی ہوئی دنیا دوبارہ آباد ہو جائے ان کا جیون ساتھی انہیں مل جائے بچے مامتا کی گود سے محروم نہ ہوں' اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ پہلے جیسے لوگ صادق نہیں رہے اور ہر طلاق دینے والا اپنا گھر آباد کرنے کی غرض سے جھوٹ موٹ یہی کہے گا کہ میری مراد صرف ایک ہی طلاق دینا تھی تو جواباً عرض ہے کہ جب عہد رسالت میں طلاق دینے والے کی نیت کا اعتبار ہوتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ آج اس کا اعتبار کلی طور پر ختم ہوجائے ؟ کیا اس زمانے کا ہر فرد بشر کذاب ودجال ہے اور اہل تقوی اور اہل خشیت الٰہی روئے زمین سے یکسر ناپیدا اور فنا ہو گئے ہیں؟

رابعاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں آخری دوطلاقوں سے پہلی طلاق کی تائید کرنا ہے اور لوگوں کی بات پہ اعتماد کر کے انہیں ایک رجعی طلاق قرار دیا جاتا تھا' متن حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ الفاظ صاف موجود ہیں ۔

من تعجل اناة الله فى الطلاق الزمناه اياه

شرح معانی الاثار ص ۳۶ ج ۲ .

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو کوئی معاملہ طلاق کے اندر اللہ تعالیٰ کی عنایت فرمودہ مہلت سے روگردانی کرتے ہوئے عجلت سے ساری طلاقیں بیک وقت دے دیگا تو ہم اس کی ان طلاقوں کو اس پر لازم کر دیں گے ۔

اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم عجلت کی متعدد طلاقوں کو متعدد او رمغلظہ نہیں سمجھتے تھے' ورنہ الزمنا ایاہ' ہم ان کو ان پر چسپاں کر دیں گے' کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ تو اس وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ دینے والے نے تین کی نیت سے طلاقیں دی ہوں اور اس سے پہلے ان کو لازم نہ سمجھا جاتا رہا ہو' خود حضرت مفتی صاحب کو اقرار ہے کہ' جو کوئی بغیر نیت کے بھی ایک دم تین طلاقیں دیتا تو ایک مانی جاتی تھی' کہ اس وقت غالب حال یہی تھا' بلفظہ

جاء الباطل ص ۴۶۳ ج ۱

تنبیہ

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے تیسرا اعتراض ذکر کیا ہے جس کی ضروری تفصیل تنبیہ کے زیر عنوان گزر چکی ہے اور مزید آگے آ رہی ہے تیسرے کے بعد مفتی صاحب نے اھل حدیث کی طرف سے چوتھا اعتراض یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں تین طلاقیں دی تھیں۔مگر رسول اللہ ﷺ نے رجوع کرا دیا اگر یکدم دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہوتیں تو رجوع ناممکن تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے' تین طلاقوں کی روایت ضعیف ہے اور صحیح حدیث کے مخالف بھی' جس میں صرف ایک طلاق کا ذکر ہے جاء الباطل ص ۴۶۵ ج ۱۔

ہمیں اعتراف ہے کہ قصہ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں مروی صحیح حدیث میں صرف ایک ہی طلاق کا ذکر ہے' اور جن میں طلاقوں کا ذکر ہے وہ روایات ضعیف ہیں مگر ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑھتا ہے کہ مفتی صاحب نے غلط بیانی سے کام لیکر عوام کو اھل حدیث کے اصلی دلائل کے بجائے ادھر ادھر سے روایات اکٹھی کر کے قارئین کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ اھل حدیث کے پاس کوئی وزنی دلیل موجود نہیں' حالانکہ ان کی بجائے اھل حدیث کی طرف سے حسب ذیل صحیح احادیث پیش کی جاتیں رہی ہیں۔

دوسری حدیث

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

اخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امراته ثلاث تطليقات جميعا فقال غضباناً ثم قال ايلعب بكتاب الله و انابين اظهر كم حتى قام رجل و قال يا رسول الله ﷺ الا اقتل ' السنن للنسائي ص ۸۹ ج ۲ .

خبر دی گئی رسول اللہ ﷺ کو کسی شخص کی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی ہیں یہ سن کر نبی ﷺ کھڑے ہو گئے اور غصے میں فرمانے لگے' کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیل ہو رہا ہے؟ جب کہ میں ان میں موجود ہوں یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے اللہ کے نبی ﷺ میں اس کو قتل کر ڈالوں (نسائی رقم الحدیث ۳۴۳۰) اس حدیث کے متعلق علامہ ترکمانی حنفی جیسے معتبر مقلد فرماتے ہیں۔

وقد وورد فی هذا الباب حديث صحيح صريح فاخرج النسائی فی باب الثلاثة المجموعه ومافيه من التغليظ بسند صحيح عن محمود بن لبيد ' الجوهر النقی ص ۳۳۳ ج ۷ .

یعنی بیک وقت طلاق ثلاثہ کی ممانعت میں حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ کی صحیح وصریح حدیث بسند صحیح سنن نسائی شریف میں پائی جاتی ہے۔

تیسری حدیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

طلق ركانة بن عبد يزيد ' اخو نبی مطلب امراته ثلاث فی مجلس واحد 'فحزن عليها زنا شديداً 'قال ' فساله رسول الله ﷺ كيف طلقتها ؟قال طلقطها ثلاثا ' قال فقال فی مجلس واحد قال نعم ' قال فانما تلك واحدة فارجعها ان شئت ' قال فرجعها فكان ابن عباس يری انما الطلاق عند كل طهر'

مسند امام احمدص ۲۶۵ ج ۱ بهيقی ص ۳۳۹ ج ۷'وابو يعلی ص ۶۵ ج ۳ .

یعنی رکانہ بن عبد یزید ,, جو کہ مطلب کے بھائی تھے'' اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں پھر بہت زیادہ افسوس ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کس طرح تو نے طلاق دی ہے تو رکانہ نے عرض کی

کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں' تو آپ علیہ السلام نے پوچھا کیا ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں؟ تو رکانہ نے کہا' ہاں'

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ تو ایک ہی طلاق ہوئی اگر تو رجوع کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے پس رکانہ نے رجعت کر لی' پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ تحقیق تھی کہ طلاق الگ ہر ایک طہر میں ہونی چاہیئے۔

ایک مجلس کی طلاق ثلاثہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ

مذکورہ حدیث کے آخر میں عکرمہ کے بیان کردہ قول کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت بن عباس رضی اللہ عنہ حدیث رکانہ کے موافق ایک وقت کی تین طلاقوں کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے بلکہ اس سے بھی واضح ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ سنن ابی داود وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ۔

روی حمادبن زید عن ایوب عن عکرمة عن ابن عباس اذا قال انت طالق ثلاثا بضم واحد فهو واحده 'سنن ابی داود ص ۲۹۹ ج ۱

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت زبان و بیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالے تو وہ تین ایک ہی طلاق ہوگی۔

- حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند بخاری کی شرط پر ہے'

عون المعبود ص ۲۲۷ ج ۲.

امام عکرمہ کی طرح امام طاؤس بن کیسان یمانی اور زہری نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ نقل کیا ہے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ ایک رجعی طلاق ہوگی چنانچہ امام عبدالرزاق نے اپنی کتاب المصنف میں کہا ہے کہ۔

عن ابن جریج قال اخبرنی حسن بن مسلم عن ابن شهاب ان ابن عباس رضی الله عنه قال اذا طلق الرجل امراته ثلاثه ولم یجمع ' کن ثلاثه 'قال ' فاخبرت ذلک طاؤساً 'قال فاشهد ما کان ابن عباس یداهن الا واحدة ' مصنف عبدالرزاق

ص ۳۳۵ ج ٦ (رقم الحدیث ۱۱۰۷۷)
یعنی امام ابن شہاب الذھری نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص متفرق طہروں میں تینوں طلاقیں دینے کی بجائے صرف ایک وقت میں تینوں طلاقیں دے ڈالے وہ تین واقع ہوں گی امام زہری نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس فتویٰ کی خبر میں نے ان کے خاص شاگرد طاؤس کو دی تو انہوں نے گواہی دی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس روایت کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد خاص امام طاؤس کہتے تھے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک رجعی طلاق قرار دیتے تھے یہی فتویٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے امام عطاء بن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (جن کے حق میں امام ابو حنیفہ نے کہہ رکھا ہے کہ' مار آیت افضل من عطاء میں نے عطاء سے بڑھ کر کسی کو افضل نہیں دیکھا 'میزان ص ۳۸۰ ج ۲ او کتاب القراۃ ص ۱۳۴' فتاوی رضویہ ص ۲۲ ج ۲۔ کہ '

عن ابن جریج عن عطاء قال ان طلقت امراۃ ثلاثا ولم تجمع فانماھی واحدۃ بلغنی ذالک عن أبن عباس.

یعنی امام عطاء ابی رباح رحمتہ علیہ نے کہا کہ تم متفرق طہروں کی بجائے صرف ایک وقت میں اپنی بیوی کو طلاق ثلاثہ دے دو تو وہ صرف ایک رجعی طلاق واقع ہوگی مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ یہی فتویٰ دیتے تھے' مصنف عبد الرزاق ص ۳۳۵ ج ٦ رقم الحدیث ۱۱۰۷٦

ہمیں اس چیز کا اعتراف ہے کہ بعض روایات میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تینوں طلاقیں واقع ہو جانے کا بھی منقول ہے۔

چنانچہ امام عبدالرزاق فرماتے ہیں کہ۔

عن عمر حو بن شب اخبرنی عمروبن دینار ان طاؤساً اخبرہ قال دخلت علی ابن عباس رضی اللہ عنہ ومعہ مولاہ ابو الصھباء عن الرجل یطلق امراتہ ثلاثا جمیعھا فقال ابن عباس رضی اللہ عنہ کانوا یجعلونھا واحدۃ علی عھد رسول

الله ﷺ ابی بکر و رایة عمر الا اقلها حتی خطب عمر الناس فقال قد اکثر تمفی هذاالطلاق فمن شئیا فهو علی ماتکلم.

یعنی عمر و بن شب نے کہا کہ مجھے عمر و بن دینار نے خبر دی اور عمرو کو طاؤس نے خبر دی کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس وقت ان کے مولیٰ ابوصہباء ان کے ساتھ تھے' ابوصہباء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پوچھا کہ ایک شخص اگر تینوں طلاقوں کو بیک وقت دے ڈالے تو کیا حکم ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں او رفاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دور خلافت کے تھوڑے سے زمانہ تک ایک وقت کی تینوں طلاقوں کو صرف ایک قرار دیا جاتا تھا مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت کے تھوڑے عرصہ بعد خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگوں نے طلاق کے معاملہ میں بڑی زیادتی کر رکھی ہے لہذا اب جو شخص جس طرح کی طلاق دے گا وہ اسی طرح نافذ ہو گی' مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۳ ج ۶ ۔ رقم الحدیث ۱۱۳۳۸)

اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیک وقت دی گئی طلاق ثلاثہ کے متعلق دو باتیں بتلائیں ہیں ۔ ایک یہ کہ نبی ﷺ کی زندگی مبارکہ میں اور پوری مدت خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں اور ابتدائے عہد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں ایسی طلاقوں کو صرف ایک قرار دیا جاتا تھا' دوسری بات یہ کہ لوگوں کی بے راہ روی کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں تین قرار دینے لگے ۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے جو زیادہ قابل قبول ہو اس پر عمل کی بنیاد بناؤ' یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دونوں طرح کے فتاویٰ ملتے ہیں جب آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تعزیری حکم کو زیادہ قرین مصلحت سمجھتے تھے تو اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے' یہی ہمارا موقف ہے کہ جو لوگ اھل حدیث حضرات کے خلاف بڑے سرگرم رہا کرتے ہیں اور ذاتی ضرورت پڑنے پر اس قسم کے مسائل میں علماء اھل حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں او رمطلب نکل جانے پر پھر اھل حدیث کے خلاف خرافات میں سرگرم ہو جاتے ہیں' انہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تعزیری حکم کے مطابق فتویٰ دینا چاہیے ۔

تابعین کرامؒ کے فتاویٰ

فتویٰ امام عکرمہؒ

آپ خلافت راشدہ میں ۲۷ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشد تلامذہ سے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں ہی ان کو مسند درس و افتا پر بٹھادیا تھا۔

امام عکرمہ فرماتے ہیں کہ

قال لی ابن عباس رضی اللہ عنہ انطلق فافت بالناس و انا لک عون قال فقلت لہ لو ان ھذا الناس مثلھم مرتین لافتیتھم قال فانطلق فافتھم.

یعنی مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جا کر لوگوں کو فتویٰ دیا کرو اور میں تمہاری پشت پناہی کرتا رہوں گا، امام عکرمہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کہ لوگوں کی تعداد اس سے دوگنا بھی ہو تب بھی میں فتویٰ دیا کروں، تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جاؤ اور لوگوں کو فتاوٰی دیا کرو۔ بحوالہ تھذیب التھذیب ص ۲۶۵ ج ۷۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حین حیات میں آپ مفتی بن گئے تھے، کتب رجال میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا سال وفات ۶۸، ۶۹ھ لکھا ہوا ہے جس سے واضح ہے کہ ۶۸ ہجری سے قبل آپ بحکم ابن عباس رضی اللہ عنہ فتاوٰی نویسی شروع کر چکے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس دور میں فقط وہی مفتی ہوسکتا تھا جو قرآن و سنت اور اجتہاد میں بلند درجہ رکھتا ہوگا۔

امام شہر ابن حوشب کبیر تابعی فرماتے ہیں کہ امت اسلامیہ کا عکرمہ، حبر، (فقیہہ) ہے، امام عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ عکرمہ علم کے دریا و سمندر ہیں، امام سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ عکرمہ مجھ سے بھی زیادہ بڑا عالم ہے، امام عامر شعبیؒ فرماتے ہیں کہ علوم قرآن کا عکرمہ سے زیادہ واقف کوئی اور نہیں، امام قتادہ فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے سب سے زیادہ واقف عکرمہ ہیں، یہی بات امام ایوب سختیانی، ابن جریج، امام سفیان ثوری نے کہی ہے، تھذیب التھذیب ص ۲۶۵ ج ۷۔

یہی امام جلیل فرماتے ہیں کہ بیک وقت اور بیک کلمہ دی ہوئی طلاق ثلاثہ ایک رجعی طلاق ہوگی، ابو داؤد مع عون المعبود ص ۲۲۷ ج ۲۔

امام طاوس رحؒ کا فتویٰ

امام عکرمہ اس فتوی میں منفرد نہیں بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے خصوصی شاگردوں میں امام طاوس بھی یہی مؤقف و مذہب رکھتے تھے کہ طلاق صرف وہی واقع ہوگی جو حکم شرعی کے مطابق ایک طہر میں ایک عدد دی گئی ہو، یعنی ایک طہر میں ایک سے زیادہ دی ہوئی طلاقیں کالعدم ہو کر معنوی طور پر ایک پڑیں گی۔ اغاثۃ اللیفان ص ۷۵، ومصنف عبدالرزاق ص ۳۰۲ ج ۶۔

فتویٰ امام عطاء بن ابی رباح رحؒ

امام عبدالرزاق بیان کرتے ہیں کہ

عن ابن جریج عن عطاء قال ان طلقت امراۃ ثلاثا و لم تجمع، فانما هی واحدۃ بلغنی ذٰلک عن ابن عباس رضی اللہ عنه.

یعنی امام عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ اگر عورت کو متفرق طہروں کی بجائے صرف ایک وقت میں اپنی بیوی کو طلاق ثلاثہ دے دیں تو وہ صرف ایک رجعی طلاق واقع ہوگی، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی یہی فتویٰ دیتے تھے۔ مصنف عبدالرزاق ص ۳۳۵ ج ۶۔ (رقم الحدیث ۱۱۰۷۶)

یہ عطاء وہی ہیں جن کے بارے میں مبتدعین کے مقتدائے اعظم امام ابوحنیفہ رحؒ نے کہہ رکھا ہے کہ

مارأیت افضل من عطاء.

یعنی میں نے عطاء سے بڑھکر کسی کو افضل نہیں دیکھا۔ تھذیب التھذیب ص ۴۸ ج ۲، و میزان ص ۳۸۰ ج ۱، و کتاب القراۃ ص ۱۳۴۔

فتویٰ عطاء بن یسار رحؒ

موطا امام مالک باب طلاق البکر اور متعدد کتب حدیث میں ہے کہ

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے فتویٰ کے خلاف ان کی موجودگی میں امام عطاء بن یسار نے صراحت سے کہا کہ غیر مدخولہ کو ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں صرف ایک ہی ہوگی، موطا امام مالک ص ۵۲۱۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ امام عطاء بن یسار کبار تابعین عظام میں سے ہیں۔

فتویٰ جابر بن زیدؒ

امام ابن ابی شعیبہ نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ

امام قتادہ نے کہا کہ طاؤس، جابر بن زید، اور عطاء بن یسار کا یہی مذہب تھا کہ غیر مدخولہ کو دی ہوئی تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی۔

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۶ ج ۵۔

امام جابر بن زیدؒ کبار تابعین سے ہیں انکے حق میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ

انک من فقهاء البصرة.

آپ فقہاء بصرہ میں سے ہیں۔ تھذیب ص ۳۴ ج ۲۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر لوگ ان کی باتیں سنیں تو موصوف لوگوں کو کتاب اللہ کے علوم سے بھر دیں گے، ایضاً۔

فتویٰ عمرو بن دینارؒ

حافظ ابن حجر اور متعدد اہل علم امام ابن منذر کی تالیف، الاوسط، سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے معروف شاگرد امام عمرو بن دینار مکی تھے متوفی ۱۲۵ھ بھی ایک وقت کی طلاق ثلاثہ کو ایک ہی طلاق کہتے تھے۔

فتح الباری ص ۲۹۷ ج ۹، و اغاثۃ اللھفان ص ۱۷۶۔

واضح رہے کہ امام عمرو بن دینار صحابہ و تابعین کے زمانہ میں مرکز اسلام مکہ مکرمہ کے مفتی تھے، امام ابن نجیح نے کہا ہے کہ ہمارے یہاں عمرو بن دینار سے زیادہ کوئی اوراعلم وفقیہ نہیں تھا، تھذیب ص۲۹ ج ۸۔

فتویٰ خلاس بن عمروؒ

حافظ ابن قیم نے بشر بن ولید عن ابی یوسف کی سند سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں مؤقف اہلحدیث کی موافقت کرنے والے معروف تابعی خلاس بن عمرو ہجری بصری بھی ہیں۔ اغاثۃ اللھفان ص۱۷۶۔

دیگر تابعین عظام کے فتاویٰ

امام حسن بصری اور امام محمد بن اسحاق امام المغازی بھی مؤقف اہل حدیث کے قائل و فاعل تھے۔

دعویٰ اجماع حقیقت کے آئینہ میں

مبتدعین عوام الناس کو یہ کہہ کر مغالطہ دیتے ہیں کہ ایک مجلس و وقت میں دی ہوئی تین طلاقوں کے تین ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے، حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ ہے، شارحین حدیث اور مذھب پر لکھنے والے آئمہ کرام نے اس مسئلہ کو اختلافی تسلیم کیا ہے۔

اختصار کی بنا پر حوالہ جات پر ہی اکتفا کر رہے ہیں، ہاں اگر ضرورت پیش آئی اور ہم مجبور کر دیئے گئے تو، دین الحق، کی دوسری اشاعت میں آئمہ کی عبارات بھی نقل کر دیں گے، بہر حال اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) امام ابن رشدؒ قرطبی مولود ۵۲۰ھ و متوفی ۵۹۵ھ بدایۃ المجتھد ص۶۱ تا ۶۳ ج ۲،

(۲) امام تلمسانی ابراھیم بن یحییٰ مالکی متوفی ۶۳۳ھ، ارشاد الساری ص۱۲۷ ج ۸،

(۳) امام ابوعبداللہ محمد قرطبی متوفی ۶۷۲ھ، تفسیر قرطبی ص۱۲۹ ج ۳،

(۴) امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر ص۲۴۸ ج ۲،

(۵) امام ابوالولید ازدی متوفی ۶۰۶ھ ، بحوالہ اغاثۃ اللھفان ص۱۷۸، ۱۷۹،

(۶) امام ابوالحسن لخمی متوفی ۴۷۸ھ ، بحوالہ ایضاً ص ۱۷۶ تا ۱۷۷،

(۷) امام ابن ابی زید قیروانی متوفی ۳۹۸ھ، بحوالہ ایضاً ص ۱۷۶،

(۸) امام ابن تیمیہ، فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۸۶ ج ۳۳،

(۹) امام ابن قیم، اعلام الموقعین ص ۴۴ ج ۳،

(۱۰) امام ابوحیان اندلسی، تفسیر البحر المحیط ص ۱۹۲ ج ۱،

(۱۱) حافظ ابن حجر، فتح الباری باب من جوز طلاق الثلاث ص ۲۹۷ ج ۹،

(۱۲) علامہ عینی حنفی، عمدۃ القاری ص ۲۳۳ ج ۲۰،

(۱۳) امام نووی، شرح صحیح مسلم باب طلاق الثلاث ص ۴۷۷ ج ۱،

(۱۴) امام طحاوی حنفی، المولود ۲۲۹ و المتوفی شرح معانی الاثار ص ۳۵ ج ۲،

(۱۵) مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی، المولود ۱۲۶۴ المتوفی ۱۳۰۴ عمدۃ الرعایۃ ص ۶۳ ج ۲۔

ہمارے دور کے علماء عرب و عجم

یہ تو تھے علمائے سلف و خلف کے حوالے، جن میں ہر مکتب فکر کے محققین شامل ہیں، ان چند حوالوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ

عہد صحابہ کرام سے لیکر یہ مسئلہ مختلف فیہ چلا آرہا ہے، اوراس کے متعلق اجماع کا دعوی کرنا غلط ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے لیکر تابعین عظام میں بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے والے موجود تھے، اور ان کے بعد آئمہ و مجتہدین میں ایک گروہ اس کا قائل چلا آرہا ہے، بالخصوص ہر دور میں حق کے چراغ کو روشن کرنے والے اہل حدیث حضرات (جنہیں بعض نے ظاہر ین کے لقب سے ملقب کیا ہے) اسی کے قائل رہے ہیں۔

یہ بات مزید دلچسپی کا باعث ہے کہ موجودہ دور کے حنفی علماء نے بھی اس مسئلے کو نہ صرف اپنے غوروفکر کا موضوع بنایا ہے بلکہ اہل حدیث نقطہ نظر کی بھر پور تائید کی ہے، چنانچہ مصر کے نامور عالم علامہ عبدالرحمٰن الجزیری نے اپنی معروف کتاب، الفقہ علی مذاھب الاربعہ ص ۳۴۱ تا ۳۴۲ ج ۴، میں

اختلاف ذکر کرتے ہوئے برملا لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے۔

علامہ سید رشید رضا مصری مرحوم نے اپنی، تفسیر المنار ص۳۸۳ و ۳۸۷ (طبع ثانی ۱۳۵۰ھ) میں اور شیخ جمال الدین قاسمی مرحوم نے اپنی تالیف، الاستیناس لتصیح انکحۃ الناس، میں اہل حدیث مؤقف کی تائید وحمایت کی ہے۔

علمائے پاک و ہند

برصغیر پاک و ہند کے جن علماء نے اس موضوع پر اپنے نتائج مطالعہ وتحقیق پیش کئے ہیں ان میں علماء اہل حدیث کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مدیر ماہنامہ برہان، دھلی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، مولانا حامد علی صاحب سیکرٹری جماعت ہند، مولانا عروج احمد قادری، مدیر ماہنامہ زندگی، رامپور، مولانا شمس پیر زادہ، مولانا محفوظ الرحمٰن فاضل دیوبند ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے بعض درد مند حضرات نے زیر بحث مسئلہ کے موضوع پر ایک سیمینار (۴ تا ۶ نومبر ۱۹۷۳ء) احمد آباد میں منعقد کروایا، جس میں مذکورہ حضرات اور اہل حدیث علماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے شرکت کی، مجلس مذاکرہ میں حصہ لینے والے حضرات کی خدمت میں حسب ذیل سوالنامہ روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے اپنے مقالات مرتب کرسکیں اور اپنے نقطہ نظر کو مدلل طور پر پیش کرنے کے ساتھ ان سوالات کے جوابات بھی دے سکیں۔

(۱) کیا محض طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرانے سے یعنی بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق، کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں جبکہ طلاق دینے والا کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

(۲) کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے، لفظ، تین کی صراحت کے ساتھ لیکن وہ کہتا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین کا لفظ جب تک استعمال نہ کیا جائے طلاق واقع ہی نہیں، اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک؟

(۳) کیا ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مغلظ ہونے پر امت کا اجماع ہے؟ اگر

نہیں تو ان علماء اور فقہاء کے نام تحریر فرمائیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیتے ہیں۔

(۴) آپ کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلے کا کیا حل ہے؟ اسے ایک شمار کیا جانا چاہیے یا تین؟۔

مذکورہ مذاکرہ میں شرکت کرنے والے آٹھ حضرات میں سے سات علماء کرام نے مقالے مرتب کئے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مقالہ تو نہیں پڑھا تھا، البتہ صدارتی کلمات میں مجلس میں پڑھے گئے مقالات پر جامع تبصرہ فرمایا اور زیر بحث مسئلہ کو امت مرحومہ میں مختلف فیہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے مناسب حل پر زور دیا، اور علماء کرام کو توسیع پیدا کرنے کی تلقین کی، ان میں صرف مولانا عروج احمد قادری صاحب نے اپنے مقالے میں حنفی نقطہ نظر پیش کیا تاہم انہوں نے بھی مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ایک معتدل راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، باقی حضرات نے اس مسئلے میں ایک تو اجماع کے دعوے کی نفی کی ہے اور صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے ہی اختلافی چلا آرہا ہے، اور دوسرے انہوں نے مسئلے کا وہی حل پیش کیا ہے، جس کے اہل حدیث قائل ہیں کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کیا جائے، مزید برآں اس نقطہ نظر کی حمایت میں انہوں نے قرآن وسنت اور کتب فقہ سے ایسے ٹھوس دلائل پیش کئے ہیں جس کے بعد فقہی جمود پر اصرار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں رہتی، جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

سیمینار کی پوری کاروائی مقالات اور ان پر اعتراضات کے جوابات یہ سب ایک کتابی شکل میں، ایک مجلس کی تین طلاقیں قرآن وسنت کی روشنی میں، کے عنوان سے چھپ گئے ہیں۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا فتویٰ

اس کتاب کے ایک مقالے میں (جو مولانا محفوظ الحق قاسمی کا ہے) مولانا کفایت اللہ دہلوی کا ایک فتویٰ بھی درج ہے، کسی سائل نے اسی طلاق ثلاثہ کے متعلق دریافت کیا تھا، سائل کے گاؤں میں ایک واقعہ ایسا ہوا تھا کہ ایک حنفی شخص نے تین طلاق دینے کے بعد کسی اہل حدیث عالم سے فتویٰ پوچھ کر رجوع کرلیا، اب گاؤں کے لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا، مفتی صاحب مرحوم نے

حسب ذیل جواب دیا،

ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذھب جمھور علماء کا ہے اور آئمہ اربعہ اس پر متفق ہیں، جمھور علماء اور آئمہ ازبعہ کے علاوہ بعض علماء اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک رجعی طلاق ہوتی ہے اور یہ مذھب اہلحدیث حضرات نے بھی اختیار کیا ہے، اور حضرت ابن عباس اور، طاؤس وعکرمہ، اور ابن اسحاق، سے منقول ہے، پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور نہ مستحق خراج عن مسجد ہے، ہاں حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور

اس پر عمل کرنا باعتبار فتوی ناجائز تھا، لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہوا ہو تو قابل درگزر ہے۔ اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۶ شعبان ۱۳۵۰ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۳۱ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ مدرستہ مینیہ دہلی۔

کفایت المفتی ص۳۶۱ ج۶، طبع مکتبہ حقانیہ ملتان۔

ایک اور فتوی

اس مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک اور فتوی حسب ذیل ہے

اور بعض سلف صالحین اور علمائے متقدمین میں سے اس کے بھی قائل ہیں اگر چہ آئمہ اربعہ میں یہ بعض نہیں ہیں لہذا جن مولوی صاحب نے مفتی اہل حدیث پر جو فتوی دیا ہے یہ غلط ہے اور مفتی اہل حدیث پر اس اختلاف کی بنا پر کفرو مقاطعہ و اخراج از مسجد کا فتوی غیر صحیح ہے، بوجہ شدید ضرورت اور خوف مفاسد اگر طلاق دینے والا ان بعض علماء کے قول پر عمل کرے گا جن کے نزدیک اس واقعہ مرقومہ میں ایک ہی طلاق ہوتی ہے تو وہ خارج از مذھب حنفی نہ ہوگا کیونکہ فقہائے حنفیہ نے بوجہ شدت ضرورت کے دوسرے امام کے قول پر عمل کر لینے کو جائز لکھا ہے،

دستخط، حبیب المرسلین عفی عنہ، مہر دار الافتاء مدرسہ امینیہ دہلی،

ایک مجلس کی تین طلاق ۳۰، تا ۳۱ و فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۵۸ ج ۲،

پیر کرم شاہ صاحب بریلوی کا فتوی

اس مسئلہ پر پاکستان کے ایک معروف سجادہ نشین بریلوی عالم جسٹس پیر کرم شاہ از ہری نے ایک کتابچہ، دعوت فکر و نظر، کے عنوان سے شائع کیا تھا، جس سے ان کا مقصود علمائے احناف کو اس معاملے میں تقلیدی جمود سے ہٹ کر خالص قرآن و سنت کی روشنی میں غور و فکر کی دعوت دینا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا، قرآن و حدیث کے مطابق ہے، اپنے اس کتابچہ میں انہوں نے اس مسلک کی پرزور حمایت کی ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

چنانچہ موصوف دونوں کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے کتاب کے بالکل آخر میں فرماتے ہیں کہ مسئلے کے سارے پہلو آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عقلی اور نقلی دلیلیں اور ان پر ہر طرح کی رد و قدح بھی آپ نے ملاحظہ فرمالی، اب آپ خود اس کے متعلق فیصلہ فرما سکتے ہیں، اس ناچیز کی ناقص رائے میں تو ان حالات میں علماء مصر اور علمائے ازہر کے فتوی (یعنی بیک وقت تین طلاقوں کا ایک رجعی طلاق ماننا) کے مطابق عمل کرنا ارجح ہے۔

دعوت فکر و نظر مندرجہ ایک مجلس کی تین طلاق ص ۲۴۸،

طبع مکتبہ نعمانی اردو بازار لاہور ۱۹۷۹ء۔

مفتی صاحب کی پہلی دلیل

فرماتے ہیں کہ رب تعالی فرماتا ہے کہ

الطلاق مرتان فامساک بمعرف اوتسریح باحسان.

پھر فرماتا ہے

فان طلقها فلاتحل له، (الآیه)

اس سے معلوم ہوا کہ دو طلاقوں تک رجوع کا حق ہے، تین میں نہیں اور مرتان کے اطلاق سے

معلوم ہوا کہ الگ الگ طلاقیں دینا شرط نہیں جس کے بغیر طلاقیں واقع ہی نہ ہوں خواہ ایک دم دے یا الگ الگ حکم یہ ہی ہوگا، چنانچہ تفسیر صاوی میں اسی آیت کے ماتحت ہے کہ اگر تین طلاقیں دیں تو واقع ہوجائیں گی خواہ ایک دم یا الگ الگ، عورت حلال نہ رہے گی۔ جاء الباطل ص۴۵۶ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب قرآنی آیات کو غلط نقل کرنے میں بے دردی کی حد تک بے لگام کیوں تھے، بمعروف، سے حرف واؤ کو اڑا دیا ہے۔

ثانیاً۔ اس آیت کو یک دم دی گئی تین طلاقوں کے مؤثر ہونے پر، مفتی صاحب کا پیش کرنا جہالت محض ہے کیونکہ یہاں مرتان کے لفظ سے علیحدہ اور متفرق اوقات میں طلاق دینا مراد ہے جیسا کہ اس آیت کا شان نزول اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے، حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رجلا قال لامراته لا أطلقک ابدا قالت و کیف ذلک،قال اطلق حتی اذا دنا اجلک راجعتک فاتت رسول اللہ ﷺ فذکرت ذلک له فانزل اللہ عذوجل الطلاق مرتان.

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ نہ میں تجھے بساؤں گا اور نہ ہی طلاق دوں گا، اس کی بیوی نے پوچھا کیسے؟ تو اس نے کہا کہ طلاق دے دوں گا اور مدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا کروں گا، یونہی کرتا چلا جاؤں گا، وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اپنا (دکھ) بیان کرنے لگی تو تب یہ آیت، الطلاق مرتان، کی اللہ عزوجل نے نازل فرمائی، ابن ابی حاتم بحوالہ تفسیر ابن کثیر ص۲۷۱ ج۱۔

آیت مذکورہ کا یہی شان نزول مولوی نعیم الدین حنفی بریلوی نے، خزائن العرفان ص۵۴ میں، پیر کرم شاہ بھیروی حنفی بریلوی نے، ضیاء القران ص۱۵۷ ج۱ میں اور اسی کے قریب قریب مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی نے، تبیان القرآن ص۸۵۵ ج۱ میں بیان فرمایا ہے۔

قرآن کے ان الفاظ کا شان نزول بتا رہا ہے کہ یہاں مرتان سے مراد مختلف اوقات میں دی گئی طلاقیں ہیں مگر ہمارے مفتی صاحب سینہ زوری سے اسے ایک دم دی گئی طلاقوں کے بارے باور

کرا رہے ہیں۔

ثالثاً۔ مرتان کا لغوی معنی بھی یہی ہے کہ کسی کام کو دو متفرق ومختلف اوقات میں کیا گیا ہو۔ ارشاد ربانی ہے

یا یھا الذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلٰث مرٰتٍ من قبل صلوٰۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ و من بعد صلوٰۃ العشاءِ ثلٰث عورٰتٍ لکم لیس علیکم ولا علیھم جناح بعدھن طوّفون علیکم بعضکم علیٰ بعض کذٰلک یبین اللہ لکم الاٰیٰت واللہ علیم حکیم۔ (سورۃ النور آیت نمبر ۵۸)

ترجمہ۔ مومنو! تمہارے غلام لونڈیاں اور جو بچے تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں، نماز صبح سے پہلے، اور گرمی کی دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تین اوقات تمہارے پردہ کے ہیں ان کے (آگے) پیچھے (دوسرے وقتوں میں) نہ تم پر کچھ گناہ نہ ان پر کہ کام کاج کیلئے ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہو، اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔ (۲۴-۵۸)

اس آیت فرقان کو بخوبی ملاحظہ کیجئے کہ اس میں، مرات، کا لفظ متفرق مختلف اوقات کیلئے مستعمل ہوا ہے، اسی طرح سورۃ التوبہ آیت ۱۰۱ و ۱۲۶، بنی اسرائیل آیت نمبر۴، میں انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہی معنی لغت عرب کی امہات الکتب میں لکھا ہے، اسی کو ہی مفسرین کرام نے اختیار کیا ہے، چنانچہ علامہ ابوبکر جصاص حنفی آیت، الطلاق مرتان، کے تحت فرماتے ہیں کہ

تضمنت الامر بایقاع الاثنتین فی مرتین فمن اوقع الا ثنتین فی مرۃ فھو مخالف لحکمھا.

یعنی آیت، الطلاق مرتان، دوطلاق کو دو مرتبہ واقع کرنے کے امر کو شامل ہے تو جس شخص نے دو طلاقوں کو ایک دم ایک ہی طہر میں دے دیا اس نے حکم قرآنی کی مخالفت کی، احکام القرآن ص۳۸۰ ج۱۔

علامہ سندھی حنفی مرحوم فرماتے ہیں کہ

قوله تعالى الطلاق مرتان الىٰ قوله ولا تتخذوا ايٰت الله هذواً، فان معناه الطليق الشرعي تطليقة بعد تطليقة على التفريق دون الجمع والا رسال مرة واحدة ولم يرد بالمرتين التثنية و مثله قوله تعالى ثم ارجع البصر كرتين اى كرة بعد كرة لاكرتين اثنتين.

یعنی آیت،الطلاق مرتان، کا مطلب یہ ہے کہ شرعی متفرق طور پر ایک طلاق کے بعد دوسری طلاق ہونی چاہیئے نہ کہ ایک ہی بار اکٹھا، مرتین، سے مراد تثنیہ نہیں ہے، جیسا کہ آیت ثم ارجع البصر ،میں ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ نظر اٹھا کر دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، حاشیہ سندھی علی النسائی ص۸۱ ج۲۔ طبع انصاری دھلی، والتعلیقات السلفیہ ص۸۹ ج۲۔

مولوی اشرف علی صاحب مرحوم دیوبندی کے استاذ شیخ محمد تھانوی فرماتے ہیں کہ

اٰن قوله تعالىٰ الطلاق مرتان معناه مرة بعد مرة فالتطليق الشرعي على التفريق دون الجمع والارسال.

یعنی آیت، الطلاق مرتان، کا مطلب یہ ہے کہ ایک طلاق کے بعد دوسری طلاق دی جائے اس لئے کہ شرعی طلاق وہ ہے جو متفرق طور پر متفرق طہروں میں دی جائے نہ کہ ایکدم دی گئی، حاشیہ نسائی ص۲۹ ج۲۔

علامہ آلوسی حنفی فرماتے ہیں کہ، مرتان کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاقیں بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، الطلاق طلاقان، سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہوسکتی تھی، مگر مرتان ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دے دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاقیں دی جائیں، روح المعانی بحوالہ معارف القرآن ص ۵۰۵ ج۱ طبع دہلی سن۱۹۹۸ء۔

الغرض، مرتان، کا لفظ مغایرت چاہتا ہے مگر ہمارے مفتی صاحب سینہ زوری سے اسے ایکدم

دی گئی طلاقوں پر بھی لاگو کرتے ہیں، جو کہ شان نزول کے علاوہ قرآن میں معنوی تحریف بھی ہے۔

مفتی صاحب کی دوسری دلیل

رب تعالی فرماتا ہے

ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لاتدری لعل الله یحدث بعد ذلک امراً.

یعنی جوکوئی اللہ کی حدیں توڑے کہ ایک دم تین طلاقیں دیدے تو اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، جاء الباطل ص ۴۵۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب چونکہ بدعت پسند پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل میں قرآن و حدیث کا احترام نہ تھا، وہ قرآن کے الفاظ میں حک و اضافہ کرتے ہوئے کوئی شرم و حیا محسوس نہ کرتے تھے، یہاں پر حضرت جی نے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے اپنی طرف سے متن قرآن میں ان الفاظ کا ترجمہ داخل کیا ہے کہ، ایک دم تین طلاقیں دیدے تو اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، یقین جانیئے قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ہو یہ مفتی صاحب جی کی اپنی ذاتی اختراع ہے پھر اسے بنیاد بنا کر مبتدعین کا حکیم الامت لکھتا ہے کہ

اگر اس سے طلاق ایک واقع ہوتی تو ظالم کیسے ہوتا، جاء الباطل ص ۴۵۷۔

گویا مفتی جی کے نزدیک وہ ظالم اس بنا پر ہے کہ اس نے ایک دم میں تین طلاقیں دے دیں، جو حقیقت میں واقع بھی ہوگئیں۔

الغرض مفتی جی کو اس بے ایمانی پر خفت و شرمندگی کی بجائے اصرار بھی ہے، ہماری طرف سے پوری دنیا کے منکرین سنت کو کھلا چیلنج ہے کہ وہ اپنے بقلم خود حکیم الامت کے ترجمہ قرآن کی صحت کسی مسلّم و معتبر مفسر سے ثابت کریں، ورنہ یاد رکھئے کہ جس کو آپ حکیم الامت کا لقب دیتے ہیں وہ جاہل مطلق اور مرض الامت ہے، اسے مفتی کہنا لفظ مفتی کی توہین ہے، یہ مفتی کے بجائے متفنی تھا، جو قرآن کا غلط معنی کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتا تھا۔

ثانیاً۔ اب آیئے مفتی صاحب کی پیش کردہ آیت کا معنی و مفہوم معلوم کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ

یا یھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن و احصوا العدة واتقوا اللہ ربکم لاتخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینةٍ و تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ لاتدری لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امراً.(سورۃ الطلاق آیت نمبر ۱)

اے پیغمبر ﷺ (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اللہ تعالی سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرو (نہ تو تم ہی) ان کو (ایام عدت میں) ان کو گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو نکال دینا چاہیے) اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا، (اے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم کہ شاید اللہ تعالی اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے۔(۶۵-۱)

الفاظ قرآن کو مکرر ملاحظہ کریں اور ان پر تدبر وفکر کریں کہ کن الفاظ کا یہ معنی ہے کہ تین طلاقیں دی گئیں واقع بھی ہوجاتی ہیں، یہاں تو عورتوں کو عدت میں طلاق دینے اور دوران عدت گھر میں رکھنے کا حکم ہے اور عورتوں کو بھی تعلیم دی جارہی ہے کہ ان مردوں کے گھروں میں ہی قیام کریں اس فرمان کا مقصود یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہیں گے تو ممکن ہے کہ کوئی اصلاح کی صورت نکل آئے ہاں مرد کو ایک صورت میں گھر سے عورت کو نکال باہر کرنے کی اجازت بھی دی گئی کہ جب عورت کسی امر فاحش کا ارتکاب کرے، تو گویا افہام وتفہیم کی جو راہ تھی اسے خود ہی عورت نے خواہش کا مرتکب ہوکر ضائع کرلیا ہے۔

الغرض اس آیت کریم میں اللہ تعالی نے چار حدود بیان فرمائی ہیں،

(۱) عورت کو اگر طلاق دینی ہے تو عدت کو ملحوظ رکھ کر دیں

(۲) دوران عدت عورت کو گھر سے نہ نکالنے کی۔

(۳) عورت خود بھی خاوند کے گھر سے عدت کے دوران نہ نکلے۔

(۴) ہاں اگر کوئی شرعی مجبوری ہو تو تب اسے گھر سے نکالا جاسکتا ہے۔

مبتدعین کا دعوی یہ ہے کہ پہلی حد سے،ظلم نفسہ، کا تعلق ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں بلکہ

مذکورہ چاروں حدود سے اس کا گہرا ربط ہے، اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ لفظ، حدود، واحد نہیں بلکہ جمع ہے، مگر ہمارے مفتی صاحب فقط اسی سے ہی جوڑ کر اس سے تین طلاقیں ثابت کر رہے ہیں۔

ثالثاً۔ فقد ظلم نفسہ، کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اس نے اگر طلاق بغیر عدت کے دیکر گناہ کیا ہے، تو اب اس کا گناہ شریعت و دین میں اس کیلئے وبال جان بن جائے اور فی الواقع یک دم دی گئی تین طلاقوں کو ہم نافذ بھی مان لیں، بلکہ اس کا تعلق حدود الٰہی کو توڑنے سے ہے یعنی اس نے شریعت کے اصول و ضابطے کو توڑ کر اپنے نفس پر ظلم و زیادتی کی ہے، مگر ہمارے مہربان مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے توڑنے سے اس کے حق میں اصول و دستور اور شریعت کا قانون بھی بن گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے جی ظلم کو دستور و قانون باور کرانا آپ جیسے مفتیوں کا ہی کام ہے، ورنہ دین میں ظلم قانون نہیں بنتا، کیونکہ پھر شریعت کو ظالم ماننا پڑے گا حالانکہ دین رحمت ہوتا ہے نہ کہ لعنت، بلکہ انسان کے خلاف شریعت، فعل کو دین الٰہی نفس پر ظلم سے تعبیر کرتا ہے کہ اس نے فلاں برا فعل کر کے یا فلاں جرم کا مرتکب ہو کر کسی کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنے نفس پر ہی ظلم کیا ہے کہ کل قیامت کے روز اسے اس کا بدلہ ملے گا جو اسے حدود الٰہی کے توڑنے کے جرم میں جنت سے محروم کر دے گا، مگر مبتدعین کا باوا ہی نرالا ہے کہ اپنے نفس پر ظلم سے یک دم دی گئی تین طلاقوں کے نافذ ہونے کا اثبات کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی تیسری دلیل

فرماتے ہیں، بیہقی اور طبرانی میں سوید ابن غفلۃ سے روایت ہے کہ حضرت امام حسن ابن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی عائشہ خشعمیہ کو ایک دم تین طلاقیں دے دیں، بعد میں خبر ملی کہ وہ امام حسن کے فراق میں بہت روتی ہیں، تو آپ بھی رو پڑے اور فرمانے لگے کہ اگر میں اپنے والد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو الگ الگ یا ایکدم تین طلاقیں دیدے تو وہ عورت بغیر حلالہ اسے جائز نہیں، تو میں ضرور رجوع کر لیتا۔

جاء الباطل ص ۴۵۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً اس کی سند میں عمرو بن ابی قیس سے روایت کرنے والا سلمہ بن فضل راوی ہے (السنن الکبریٰ للبیھقی ص۳۳۶ ج۷ وسنن دارقطنی ص۳۰ ج۴ و طبرانی کبیر ص۹۱ ج۳ (رقم الحدیث ۲۷۵۷)، اور یہ متکلم فیہ راوی ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

صدوق کثیر الخطا، یعنی سچا تو ہے لیکن کثرت سے غلطیاں کرتا ہے، تقریب ص۹۸، سلمہ سے روایت کرنے والا، محمد بن حمید الرازی ہے۔ اور یہ متروک و کذاب ہے، امام ابو زرعہ امام صالح جزرۃ، امام ابن خراش نے اسے کذاب کہا ہے اور امام بخاری نے، فیہ نظر) سے اس پر کلام کیا ہے، میزان ص۵۳۰ ج۳، وتھذیب ص۱۳۱ ج۹۔

ثانیاً۔ بیھقی نے ایک دوسری سند کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اس کی سند میں عمرو بن شمر الجعفی راوی کذاب و دجال ہے، میزان ص۲۶۸، ج۳۔

جس روایت کی سند میں ایک ضعیف دوسرا کذاب و متروک ہو اس کے باطل و مردود ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

ہمارے معاصر مولوی غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی اس روایت کے سلسلہ میں بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کہ اس حدیث کو طبرانی دوسری سند سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان دونوں کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث کے راوی صحیح کے ہیں۔ شرح صحیح مسلم ص۱۰۴۳ ج۳۔

آیئے متن روایت ملاحظہ کریں:

متع الحسن بن علی رضی الله عنه امرا تین بعشرین ألفاً و زفاق من عسل فقالت احدهما و أراها حنفية، طبرانی کبیر ص۲۷ ج۳ (۲۵۶۱) و مصنف عبدالرزاق ص۷۳ ج۷ (۱۲۲۵۷)

متع، کا معنیٰ ہوتا ہے، فائدہ اٹھانا، متعہ کرنا، امراتین، امراۃ (عورت) کی تشنیہ ہے) عشرین ألفا، کا معنیٰ ہوتا ہے، بیس ہزار (درھم) فقرہ آپ خود بنالیں، اور سعیدی کی عقل سلیم کا ماتم کریں۔

ہم سے پوچھتے ہوں تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس میں سفیان ثوریؒ کی تدلیس ہے، امام ثوری کے مدلس ہونے کی بحوالہ صراحت، دین الحق ص۱۴۱ ج۱ میں دیکھئے، مزید یہ کہ اس روایت کا تعلق

ہی سرے سے طلاق ثلاثہ سے نہیں۔ یہ سعیدی صاحب کی زیادتی اور خلط مبحث کی بدترین مثال ہے۔

مفتی صاحب کی چوتھی دلیل

سنن کبریٰ بیہقی میں حبیب بن ابی ثابت کی روایت سے ہے

قال جاء رجل الیٰ علی رضی الله عنه فقال طلقت امراتی الفا قال ثلث تحرمها علیک و اقسم سائر هن بین نساء ک، السنن الکبریٰ للبیهقی ص ۳۳۵ ج ۷.

یعنی ایک شخص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر بولا کہ میں نے اپنی بیوی کو ھزار طلاقیں دی ہیں، فرمایا کہ تین طلاقوں نے اسے تجھ پر حرام کردیا، باقی طلاقیں اپنی اور بیویوں کو بانٹ دے، یعنی وہ لغو ہیں ظاہر ہے کہ اس سائل نے یہ ہزار طلاقیں مہینوں میں تو نہ دی ہوں گی ورنہ ۸۲ سال ۲ مہینے اسی میں صرف ہو جاتے، ایک دم ہی دی تھیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تینوں جائز رکھیں، جاء الباطل ص ۴۵۷ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب نے، واقسم سائرھا بین نسائک، کا صحیح معنی کرکے آخر میں تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھا گئے ہیں کہ، یعنی وہ لغو ہیں، حالانکہ متن روایت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو اس مفہوم کا قرینہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ کا یہی مفہوم ہے کہ تین طلاقوں سے تو تمھاری بیوی بائنہ ہوگئی، اور باقی نو سو ستانوے طلاقیں تم اپنی دوسری بیویوں پر تقسیم کردو۔

ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات محض غصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمائی تھی، ورنہ اس مؤقف پر انکی کسی نے موافقت نہیں کی، لیکن افسوس کہ حضرت مفتی صاحب نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے چال چلی کہ، یعنی لغو ہیں، کے الفاظ کو متن روایت کے ترجمہ میں داخل کردیا تاکہ کوئی بریلوی یہ سوال ہی نہ کرسکے کہ حضرت جی آخر کیا وجہ ہے کہ قول مرتضوی کو تم حجت بنا رہے ہو اور خصم پر بطور برہان نقل کررہے ہو، یہ تو خود تمہارے مذھب و مؤقف کے خلاف ہے،

کیونکہ تم تین سے زیادہ طلاقوں کو لغو قرار دیتے ہو اور بقایا عورتوں پر طلاق واقع ہونے کے قائل ہی نہیں۔

اس اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے مفتی صاحب نے یہ مخلص تلاش کیا کہ ترجمہ ہی اس انداز سے کرو کہ عوام الناس متن روایت کا ہی یہ مفہوم خیال کریں تا کہ اعتراض تک نوبت ہی نہ آئے۔

ثانیاً۔ جب مفتی صاحب اور دیگر مبتدعین، ۹ سو ستاون طلاقوں کو اس وجہ سے لغو قرار دیتے ہیں کہ یہ طلاقیں بے موقع و بے محل ہیں اور حضرت علی کا یہ قول نصوص کے خلاف ہونے کے سبب نا قابل اعتبار ہے، اگر یہی اصول دیگر صحابہ کرام بلکہ خود علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے آدھے فتویٰ کی بجائے پورے فتوی پر بھی جاری کیا جائے اور کہا جائے کہ چونکہ موقع و محل صرف ایک ہی طلاق کا تھا، لہذا ایک ہی واقع ہوئی ہے، تو بھلا یہ اقدام کس طرح درست نہ ہوگا۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب نے آخری الفاظ غلط نقل کیئے ہیں، درست الفاظ، واقسم سائرھا بین نسائک، بیھقی ص ۳۳۵ ج ۷، ومصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۱ ج ۵، اور بعض روایات میں، وسائرھن اقسمھن بین نسائک، سنن دارقطنی ص ۲۱ ج ۴، کے ہیں، مگر مفتی صاحب نے بیھقی سے دیکھ کر بھی متن روایت کو صحیح نقل نہیں کیا، اصل میں ہیرا پھیری کرنا مفتی صاحب کی عادت بن چکی تھی، مثل ہے چور چوری سے گیا مگر ہیرا پھیری سے نہ گیا۔

رابعاً۔ مذکورہ روایت میں ایک راوی مبھم ہے کیونکہ حبیب بن ابی ثابت اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے درمیان کا واسطہ ساقط ہے کہ حبیب نے، عن بعض اصحابہ، کہہ کر روایت نقل کی ہے، اور مبھم کی عدالت ثابت کرنا مبتدعین کا فرض ہے، مگر مبتدعین پر یہ ادھار ہی رہے گا، انشاء اللہ۔

خامساً۔ حبیب بن ابی ثابت سے روایت کرنیوالے سلیمان بن مھران الاعمش ہے اور یہ مدلس ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

وكان يدلس وصفه بذلك الكرابيسي والنسائي والدارقطني وغيرهم.

یعنی الاعمش کی تدلیس کی صراحت امام کرابیسی امام نسائی امام دارقطنی وغیرہ نے کی ہے، طبقات المدلسین ص ۳۳۔

حافظ ابن حجر نے، تقریب ص۱۰۳ میں ان کی تدلیس کی صراحت کی ہے، اور زیر بحث روایت سماع کی صراحت کے بغیر معنعن مروی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مزید ثبوت

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بیہقی میں ہے،

عن جعفر ابن محمد عن ابیه عن علی رضی الله عنه قال لاتحل له حتی تنکح زوجاً غیره، السنن الکبری للبهیقی ص۳۳۵ ج۷.

یعنی امام جعفر صادق اپنے جد امجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو ایک دم تین طلاقیں دے تو بیوی بغیر حلالہ حلال نہیں، اس کی تائید بیہقی کی اس روایت سے ہوتی ہے جو اس مقام پر ابی یعلی سے مروی ہے کہ،

عن علی رضی الله عنه فیمن طلق امراته ثلثا قبل ان یدخل بها قال لا تحل له حتی تنکح زوجاً غیره، جاء الباطل ص۴۵۸ ج ۱.

الجواب

اولاً۔ قارئین کرام ہم آپ کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ مفتی صاحب کی پیش کردہ پہلی روایت کی سند کو بغور ملاحظہ کریں اس میں امام جعفر بن محمد، عن ابیہ، کہہ کر اپنے والد کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں مگر ہمارے مفتی صاحب اس قدر سطحی معلومات رکھتے تھے کہ وہ اسے امام جعفر کی طرف نسبت کرتے ہیں، اسی طرح دوسری روایت کو مفتی صاحب، ابی یعلی، راوی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں حالانکہ راوی، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ہے السنن الکبریٰ ص۳۳۴ ج۷۔

حقیقت یہ ہے کہ بدعت ایسی بری اور منحوس چیز ہے جو انسان کو خبطی بنا کر علم وفہم سے کورا کر دیتی ہے، اور مفتی صاحب جیسے حکیم الامت کو بھی، ابن ابی لیلیٰ، ابی یعلی، نظر آتا ہے اور، عن ابیہ، آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ثانیاً۔ مفتی صاحب نے روایت مذکورہ کو عدم علم یا مغالطہ کی غرض سے دو روایات بیان کیا ہے، حالانکہ یہ روایت فقط ایک ہی ہے، صرف سند کا فرق ہے، دراصل امام بیہقی نے مذکورہ واقعہ کو پہلے

مفصل بیان کیا ہے کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص ایسی عورت کو ایکدم تین طلاقیں دیدیتا ہے جس سے ابھی خلوت نہیں کی؟ تو آپ نے فرمایا کہ، لاتحل له، اس کیلئے وہ عورت حلال نہ رہی، اس کی سند میں امام فضل بن دکین ؒ سے آگے امام بیہقی نے، انا حاتم بن اسماعیل عن جعفر بن محمد عن ابیه، کہہ کر سند کا اختلاف بیان کیا تھا، مگر مفتی صاحب اسے الگ اور جدا روایت تصور کر بیٹھے ہیں، پھر اس کوڑھ پہ یہ کھاج کہ جس سند کو پیش کر کے امام بیہقی نے اختلاف روایت وسند بیان کیا تھا اسے مفتی صاحب اصل بیان کر رہے ہیں۔

اگر بقول مفتی صاحب ان کو دو الگ اور مستقل روایات تسلیم کیا جائے تو امام جعفر کی سند سے مروی روایت تو بے معنی ہو جاتی ہے، روایت کے اصل الفاظ مفتی صاحب کے پیش کردہ ہی ملاحظہ کریں،

قال لاتحل له حتی تنکح زوجا غیره.

یعنی جتنی دیر کسی اور مرد سے نکاح نہ ہو وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کب حلال نہ رہے گی، کیونکہ بہر حال اس سند کے ساتھ اس میں اس کی صراحت نہیں، اس اعتراض سے جان چھڑانے کی غرض سے مفتی صاحب نے یہ چال چلی کہ معنی روایت میں تصرف کرلیا کہ جب ایکدم میں تین طلاقیں دے الخ، اس بے ایمانی کی وجہ صرف یہی تھی کہ کوئی اناڑی یہ نہ جان لے کہ مفتی صاحب نے جو بعد میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی سند سے روایت بیان کی ہے، اس کا یہ اختصار ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ثالثاً۔ پھر مزید بے ایمانی یہ کی کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلی کی جب مفصل روایت کو نقل کیا تو اس کا معنی ہی چھوڑ دیا، آیئے پہلے بمع ترجمہ الفاظ روایت ملاحظہ کریں،

عن علی رضی الله عنه فیمن طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بها قال لاتحل له حتی تنکح زوجا غیره.

یعنی علی رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے اپنی بیوی غیر مدخولہ کو تین طلاقیں دے دیں تو آپ نے فرمایا کہ اس کیلئے وہ عورت حلال نہ رہی جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔

السنن الکبریٰ للبیھقی ص۳۳۴ ج ۷۔

اس روایت کو مکرر ملاحظہ کریں کہ اس کا زیر بحث مسئلہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، خود مبتدعین کے نزدیک اگر کسی نے اپنی غیر مدخولہ (جس سے شوہر نے وطی نہ کی ہو) بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس پر پہلی طلاق سے ہی بائن ہوکر اس پر حرام ہوگئی اور باقی دو طلاقیں لغو و بیکار ہوگئیں، چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں،

اس حدیث میں اس عورت کو طلاق دینا مراد ہے جس سے خلوت نہ ہوئی ہو اور واقعی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایکدم اس طرح دے کہ تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے، تو اول ہی واقع ہوگی اور اخیر دو طلاقیں لغو، بلفظہ جاء الباطل ص۴۶۲ ج۱۔ یہی فقہ حنفی کا متفق علیہ فتوی ہے جو ان کی متداول کتب فقہ میں لکھا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول میں مروی آخری دو طلاقوں کو خود مبتدعین لغو و بیکار جانتے ہیں، اور اس اعتراض سے جان چھڑانے کیلئے مفتی صاحب نے یہ مخلص تلاش کیا کہ متن روایت کا ترجمہ ہی سرے سے نہ کیا تا کہ عوام الناس روایت کے اصل محل کو نہ جان لیں اور کہیں وہ سوال ہی نہ کر دیں کہ حضرت مفتی صاحب جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتوی کو خود ہم ہی قبول نہیں کر رہے تو وہ مخالفین کو ہم کیسے حجت باور کرا رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھکر کون نادان و جاہل ہے کہ جس فتوی کو وہ خود تسلیم نہیں کرتا وہ مخالفین پر اتمام حجت کیلئے نقل کرے، امر واقعہ یہ ہے کہ مبتدعین کی تقلیدی گاڑی چلتی ہی اس طرح کی ہیرا پھیریوں سے ہے، پھر بدعات نے انہیں مزید گمراہ کردیا ہے جس سے یہ لوگ تقویٰ اور خشیت الٰہی سے بہت دور ہو چکے ہیں۔

مفتی صاحب کی پانچویں دلیل

بیھقی نے محمد بن ایاز بن کبیر سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے ایکدم تین طلاقیں دے دیں پھر اس کا خیال ہوا کہ اس سے دوبارہ نکاح کرے تو وہ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ان دونوں صحابیوں نے فرمایا کہ ہم

اس کے نکاح کی کوئی صورت نہیں دیکھتے جب تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، وہ بولا حضرت میں نے ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دی تھیں اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو کچھ تیرے قبضہ میں بچا کھچا تھا تونے اکٹھا ہی دے دیا، حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں،

فسئل ابا هريرة رضى الله عنه و عبدالله ابن عباس رضى الله عنه فقال لانرٰى ان تنكحها حتى تنكح زوجا غيرك قال انما كان طلاقي ايا ها واحدة فقال ابن عباس انك ارسلت من يدك ماكان لك من فضل، السنن الكبرىٰ جلد ۷ص ۳۳۵. جاء الباطل ص ۴۵۸ ج ۱.

الجواب

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ تحریر کرنا کہ سوال کرنے والے نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا تھا کہ میں نے ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دی تھیں، غلط بیانی ہے، کیونکہ متن روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ معنی ومفہوم ہو بلکہ روایت کے الفاظ محض اس قدر ہیں کہ،

قال طلق رجل امرأ ته ثلاثاً قبل ان يدخل بها.

یعنی ایک شخص نے اپنی غیر مدخولہ عورت کو تین طلاقیں دیدیں ہیں۔

السنن الکبریٰ للبیھقی ص۳۳۵ ج۷۔

الغرض روایت میں تین طلاقیں دینے کا تو ذکر ہے مگر اس میں تین طلاقیں دینے کی کیفیت مروی نہیں کہ دینے والے نے تجھے تین طلاقیں ہیں، کہا تھا یا تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، کہہ کر تین طلاقیں دیں تھیں، متن روایت میں بہرحال اس کا ذکر نہیں، لہذا مفتی صاحب کا بالجزم یہ کہنا کہ یکدم اس نے تین طلاقیں دی تھیں، کذب بیانی اور دغا بازی ہے۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ میں یہ بات صاف اور آئینہ کی طرح شفاف ہے کہ مذکورہ فتویٰ غیر مدخولہ عورت کے بارے میں ہے جس کا معاملہ مدخولہ عورت سے کئی صورتوں میں مختلف ہے اور بعض صورتوں میں خود مؤلف جاء الباطل کا تقلیدی مذہب ہمارے موقف کا حامی ہے (جس کی قدرے تفصیل پہلے عرض کردی گئی ہے) جس سے اصولی طور لازم آتا ہے کہ حنفی مذہب میں اسی اصول و

دستور سے مدخولہ اور غیر مدخولہ دونوں کوعلی الاطلاق بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں ایک رجعی طلاق ہونی چاہیئے۔

ثالثاً، پھر روایت کے الفاظ، فسال، کے ہیں، بیہقی ص۳۳۵ ج۴ لیکن مفتی صاحب نے حسب عادت، فسل، بنا دیا ہے۔

مفتی صاحب کی چھٹی دلیل

(۱) بیہقی میں سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں آپ نے فرمایا تین لے لو اور نو سو ستانوے چھوڑ دو، ص۳۳۷ ج۷۔

(۲) اسی بیہقی میں عبدالحمید ابن رافع سے بروایت عطاء ہے کہ کسی نے سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں، فرمایا تین لے لو اور ستانوے چھوڑ دو، ص۳۳۷ ج۷۔

(۳) بیہقی میں بروایت سعید بن جبیر ہے کہ سیدنا حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک دم تین طلاقیں دی تھیں کہ تجھ پر تیری بیوی حرام ہوگئی، ص۳۳۷ ج۷۔

(۴) بیہقی میں بروایت عمرو ابن دینار ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو ستاروں کے برابر طلاقیں دے اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا اس سے کہہ دو کہ تجھے برج جوزہ کا سر ہی کافی ہے خیال رہے کہ برج جوزہ کے سر پر تین ستارے ہیں، ص۳۳۷ ج۷، جاء الباطل ص۴۵۸ تا ۴۵۹، ملخصاً۔

الجواب

اولاً۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فتاویٰ میں اضطراب پایا جاتا ہے، کیونکہ کسی میں طلاقوں کا عدد، ہزار، کسی میں ستاروں کے برابر، کسی میں سو، اور کسی میں تین بیان ہوئی ہیں۔

ثانیاً۔ محمد بن ایاس عکرمہ مولیٰ ابن عباس، عطاء بن یسار، طاؤس بن کیسان، جابر بن زید اور

حسن بصری متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ غیر مدخولہ عورت کی تین طلاقوں کوایک طلاق بائن قرار دیتے تھے۔
السنن الکبریٰ للبیھقی ص ۳۵۵ ج ۷۔

اور غیر مدخولہ کے بارے میں ہم وضاحت کرآئے ہیں کہ اگر کوئی ایکدم تین طلاقیں دے ڈالے تو خود مفتی صاحب کے تقلیدی مذھب میں صرف ایک ہی واقع ہوتی ہے، بقایا لغو و بیکار ہیں۔

ثالثاً۔ سنن ابی داوٗد باب نسخ المراجعہ، میں عکرمہ کی روایت سے صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایکدم دی گئی تین طلاقوں کوایک ہی رجعی قرار دیتے تھے، سنن ابوداوٗد مع عون ص ۲۲۷ ج ۲)

(۲) امام زہری نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ نقل کیا ہے، مصنف عبدالرزاق ص ۳۳۵ ج ۶۔

(۳) یہی امام عطاء بن ابی رباح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، ایضاً ص ۳۳۵ ج ۶۔

(۴) امام ابو عیاض عمرو بن اسود نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی نقل کیا ہے، ایضاً ص ۳۳۵ ج ۶۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نصوص کے مطابق (ایکدم دی گئی تین طلاقوں کوایک رجعی طلاق قرار دینے) فتاوی بھی موجود ہیں لہذا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ان فتاویٰ کوقبول نہیں کیا جائے گا جو نصوص کے خلاف اور معارض ہیں۔

مفتی صاحب کی ساتویں دلیل

ابن ماجه، شروع لبواب الطلاق، باب من طلق ثلثا فی مجلس واحد، میں ہے کہ فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ مجھے میرے شوہر نے یمن جاتے وقت تین طلاقیں ایکدم دے دیں، ان تینوں کوحضور ﷺ نے جائز رکھا، جاء الباطل ص ۴۵۹ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ اس کی سند میں ایک راوی، اسحاق بن فروۃ، ہے، ابن ماجہ ص ۱۴۷، اسے امام ابو زرعہ امام نسائی امام دارقطنی امام برقانی نے، متروک الحدیث کہا ہے، امام بخاری کا کہنا ہے کہ محدثین نے اسے ترک کر دیا تھا، امام علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ منکر الحدیث ہے، امام ابن معین نے اسے ہیچ محض اور ضعیف و غیر ثقہ (اور ایک روایت میں کذاب) قرار دیا ہے، امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس کی روایات سے احتجاج نہ کیا جائے، امام ابن عدی کا کہنا کہ اس کی اسناد و متون میں اس کا کوئی متابع موجود نہیں، امام خلیلی نے سخت ضعیف کہا ہے اور اسے امام مالکؒ و شافعی نے ترک کر دیا تھا، امام بزار نے اس کی تضعیف کی ہے، ابن جارود، عقیلی، دولابی، ابوعرب، ساجی، اور ابن شاہین نے اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے، ابن حبان نے کہا ہے کہ اسناد کو الٹ پلٹ کر دیتا تھا، تہذیب التھذیب ص ۲۱۱ ج ۱۔

ثانیاً۔ صحیح حدیث اسکے برعکس ہے، جس میں وضاحت ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنھا کو ان کے خاوند نے متفرق و مختلف اوقات میں باقاعدہ شرعی طریقہ سے تین طلاقیں دی تھیں، چنانچہ خود حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنھا بیان فرماتی ہیں،

كنت عندابى عمرو بن حفص بن المغيرة و كان قد طلقنى تطليقعين ثم انه سارمع على بن ابى طالب الى اليمن حين بعثه رسول الله ﷺ اليه فبعث الى بتطليقتى الثالثة، الحديث.

یعنی میرے شوہر (حضرت) ابوعمرو بن حفص بن مغیرہ رضی اللہ عنہ مجھے دو طلاقیں دے چکے تھے کہ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حکم نبوی ﷺ کے مطابق آپ یمن چلے گئے تو انہوں نے یمن سے مجھے تیسری طلاق بھیج دی، الحدیث، مسند احمد ص ۴۱۳-۴۱۴ ج ۶۔

اس روایت میں پوری صراحت کے ساتھ یہ وضاحت ہے کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہ کو تین طلاقیں متفرق و مختلف اوقات میں دی گئیں تھیں اور آخری و تیسری طلاق موصوفہ کے شوہر نے یمن سے تحریری طور پر لکھ کر بھیجی تھی، اس کی تائید حسب ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے۔

امام عبیداللہ بن عبداللہؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان ابا عمرو بن خفص بن المغيرة خرج مع على بن ابى طالب الى اليمن

فارسل الیٰ امراته فاطمة بنت قیس رضی الله عنها بتطلیقة کانت بقیت من طلاقها.

یعنی حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنھا کے شوہر حضرت ابوعمرو بن حفص رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضی کے ساتھ یمن چلے گئے تو وہاں سے انہوں نے ایک آخری طلاق (فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنھا کو) بھیج دی تھی جو کہ باقی رہ گئی تھی، صحیح مسلم ص۴۸۴ ج۱، ومسند احمد ص۴۱۴ ج۱، وابو داؤد ص۳۱۲ ج۱، وعبدالرزاق ص۲۲ ج۷۔

اس صراحت سے مبتدعین کی اس دلیل کے پرخچے اڑ گئے۔

مفتی صاحب کی آٹھویں دلیل

حاکم، ابن ماجہ، ابوداؤد نے عبداللہ ابن علی ابن یزید ابن رکانہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے دادا رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی پھر وہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا اور عرض کیا کہ میں نے ایک کی نیت کی تھی حضور ﷺ نے فرمایا کہ کہ اللہ کی قسم تم نے ایک ہی کی نیت کی تھی، عرض کیا قسم ہے رب کی میں نے نہ نیت کی مگر ایک کی، پس حضرت ﷺ نے انکی بیوی کو ان پر واپس فرمادیا۔

مفتی صاحب وجہ استدلال میں فرماتے ہیں کہ،

اگر ایک دم تین طلاقوں سے ایک ہی واقع ہوتی ہے تو حضور ﷺ حضرت رکانہ سے اس کی نیت کی قسم کیوں لیتے، جاء الباطل ص۴۵۹ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ اسکی سند کا مدار، زبیر بن سعید نوفلی، پر ہے، اور یہ ضعیف ہے، امام علی بن مدینی نے اس کی تضعیف کی ہے، امام ابو احمد حاکم نے کہا ہے کہ، لیس بالقوی عندھم، یعنی یہ جملہ اہل علم کے نزدیک قوی نہیں، امام احمد نے اسے، لین، کہاہے، امام ابن معین نے (ایک روایت میں) اسے ضعیف کہا ہے، امام یحیٰی امام نسائی، امام ساجی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، امام ابو داؤد نے کہا ہے کہ اس کی روایت میں نکارۃ ہے، امام عجلی نے اس کی اس روایت کو منکر کہا ہے، تھذیب

ص ۳۱۵ ج ۳۔

امام ابن حزم نے متروک لکھا ہے (المحلی) امام عبدالحق نے روایت مذکورہ کو ساقط الاعتبار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ، الزبیر اضعفھم، یعنی زبیر تمام سند کے راویوں سے زیادہ ضعیف ہے، بحوالہ التعلیق المغنی ص ۳۵ ج ۴۔

ثانیاً۔ زبیر ضعیف ہونے کے علاوہ اسے بیان کرنے میں اضطراب کا شکار بھی ہوا ہے،

(۱) کہتا ہے کہ

عن عبدالله بن علی بن یزید بن رکانة حدثنی ابی عن جدی انه طلق امراته البتة، سنن دارمی ص ۲۱۶ ج ۲.

(۲) دوسری بار کہتا ہے کہ

عن عبدالله بن علی بن رکانة عن ابیه عن جده، دار قطنی ص ۳۴ ج ۴.

(۳) تیسری بار کہتا ہے

عن عبدالله بن علی بن السائب. دارقطنی ص ۳۵ ج ۴.

(۴) چوتھی بار کہتا ہے

عن محمد بن ادریس حدثنی عمی محمد بن علی عن ابن السائب ، ابوداود ص ۳۰۰ ج ۴.

یہی وجہ ہے کہ اس روایت کو محدثین کرام نے ضعیف ومعلول قرار دیا ہے، چنانچہ امام بخاری، علامہ ابن عبدالبر، حافظ ابن حجر اور علامہ ترکمانی حنفی نے اسے ضعیف ومعلول کہا ہے، التلخیص الحبیر ص ۲۱۳ ج ۳ والجوھر النقی ص ۳۲۹ ج ۷۔

امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ، **ابو عبید ترکه ناجیة و احمد جبن عنه**، یعنی امام ابو عبید قاسم بن سلام، نے اس حدیث کو قطعی طور پر متروک قرار دیا ہے اور امام احمد نے اس "ضعیف ہونے کے وجہ، سے اس کی روایت سے ہمت ہار دی، سنن ابن ماجہ ص ۱۴۹۔

علامہ زیلعی حنفی فرماتے ہیں،

قال عبدالحق فی، احکامه، فی اسناد هذا الحدیث عبدالله بن علی بن

السائب عن نافع بن عجير عن ركانه، والزبير ابن سعيد عن عبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن ابيه عن جده و كلهم ضعفاء والزبير اضعفهم وقال البخاری علی بن يزيد بن ركانه عن ابيه لم يصح حديثهٗ.

یعنی امام عبدالحق نے، احکام، میں کہا ہے کہ اس کی سند کے تمام راوی ضعیف ہیں اور ان سب سے زیادہ ضعیف زبیر بن سعید ہے، نصب الرایہ ص۳۳۷ ج۳۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا اس روایت سے استدلال دراصل مفہوم مخالف ہے جو کہ انکے تقلیدی مذہب میں حجت نہیں، جس کا اعتراف حنفی بریلوی علماء کو بھی ہے، دیکھئے شرح صحیح مسلم ص۸۴ ج۴، للمولوی غلام رسول سعیدی بریلوی۔

چنانچہ علامہ ماردینی حنفی نے اس حدیث سے استدلال کرنیوالے غیر احناف کا رد اسی اصول سے کرتے ہوئے لکھا ہے۔

هذا الحديث ضعفوه كذا قال صاحب التمهيدوعلى تقدير صحته لا نعلم ماذا كان عليه السلام يريد ان يقول له لو قال اردت الثلاث.

یعنی یہ حدیث اول تو ضعیف ہے، اور اگر بالفرض اس کی صحت کو تسلیم بھی کرلیا جائے، تو یہ معلوم نہیں کہ نبی ﷺ کیا ارادہ رکھتے تھے، جب آپ علیہ السلام سے حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ یہ کہتے کہ میں نے تین طلاقیں ہی دی ہیں،

الجوہر النقی ص۳۲۹ ج۷۔

ملحوظ

واضح رہے کہ تین طلاقوں کی نیت سے دی ہوئی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو صرف ایک رجعی قرار دینے کی صراحت حدیث نبوی میں موجود ہے، لہذا علامہ ابن ترکمانی کا یہ کہنا کہ،

لانعلم ماذاكان يريد ان يقول له لوقال اردت الثلاث.

یعنی حکم نبوی کیا ہوتا، ہمارے نزدیک صرف علامہ موصوف یا ان جیسے دیگر مقلدین کا اپنا ذاتی خیال اپنی معلومات کی بنیاد پر ہے۔

المعود الی المقصود

ہماری اس مجمل بات کی تفصیل یہ ہے کہ طلاق کیلئے استعمال ہونے والے الفاظ صریحہ میں طلاق دینے والے کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ عموم الفاظ کا ہے، چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ،

ثلاث جدهن جد وهذلهن جدالنكاح والطلاق والرجعة.

ابو داود ص۲۹۸ ج۱، و ترمذی مع تحفه ص۲۱۵ ج۲، و ابن ماجه ص۱۴۸، و دارقطنی ص۱۸ ج۴، ومستدرک حاکم ص۱۹۷ ج۲.

جبکہ از روئے شریعت، طلاق البتہ، طلاق صریح کی قسم سے ہے، کیونکہ دور نبوی میں طلاق البتہ کالفظ طلاق ثلاثہ کیلئے بولا جاتا تھا، اور یہ ثابت ہے کہ ایک وقت کی طلاق ثلاثہ یا بلفظ دیگر طلاق البتہ کو شریعت میں ایک رجعی طلاق قرار دیا گیا ہے، اس لئے رکانہ والی زیر بحث حدیث کو اگر بالفرض صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ کہنا کہ اگر رکانہ یہ کہتے کہ طلاق البتہ سے میری نیت تین طلاقیں تھیں، تو جواب نبوی کیا ہوتا، صحیح نہیں، کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جواب نبوی معلوم ہے کہ خواہ کسی بھی نیت سے طلاق البتہ و طلاق ثلاثہ دی گئیں ہوتیں تو ایک رجعی ہوتی، بہر حال مؤلف جاء الباطل کے مذھب اور علامہ ماردینی کے مذکورہ قول کے موافق حدیث رکانہ کو شرعاً تین طلاقیں قرار دینا ثابت نہیں ہوتا۔

رابعاً۔ اگر اس کا یہی مفہوم نکالا جائے کہ طلاق دینے والے کی نیت محض مذاق و ہنسی ہو، طلاق کا ارادہ و نیت نہ ہو، فقط یوں ہی بطور مذاق طلاق البتہ کا لفظ کہہ دیا ہو، تو یہ طلاق بالکل واقع نہ ہو، کیونکہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہ تھی، مگر چاروں تقلیدی مذاھب متفقہ طور پر حدیث البتہ کے اس مفہوم کو غیر معتبر جان کر اس کے خلاف عمل پیرا ہیں، تو پھر اس کا یہ مفہوم نکالنا کہ اگر تین کی نیت ہو تو تین واقع ہوں گی، کیونکر جائز و درست ہوگا۔

خامساً۔ اس حدیث کا مفتی صاحب بلکہ چاروں تقلیدی مذاھب کے مطابق ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر طلاق دینے والے کی نیت ایک یا دو رجعی طلاقیں ہوں، تو ایک یا دو رجعی ہی ہوں گی، اور اگر طلاق کی نیت نہ ہو تو طلاق واقع ہی نہ ہوگی، لیکن مالکی و حنبلی مذھب میں تین طلاقیں واقع ہوں گی، اور حنفی مذھب میں اگر طلاق البتہ تین کی نیت سے دی گئی تو تین واقع ہوں گی، اور اگر تین کی

نیت سے نہیں دی گئی تو بہرصورت ایک طلاق بائن ہوگی، خواہ طلاق دینے والے کی نیت ایک یا دو طلاق رجعی یا بائن کی ہی ہو، یا سرے سے طلاق کی نیت سے دی ہی نہ ہو، طلاق بائن بہر حال ہو جائیگی، اور طلاق دینے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا اور شافعی مذھب میں نیت کے مطابق ایک یا دو رجعی یا بائن یا تین طلاقیں ہوں گی لیکن اگر نیت طلاق کی نہ تھی، تو طلاق بائن ہوگی۔ اوجز المسالک ص۳۲۹ تا ۳۳۰ ج۴، و۳۹۳ تا ۳۹۷۔

سادساً۔ بقول امام شافعیؒ اس حدیث کا ایک مفہوم مخالف یہ بھی ہے کہ ایک دم تین طلاقیں دینا بلا کراھت مباح و حلال ہیں، لیکن مفتی صاحب بلکہ باقی تینوں تقلیدی مذاھب اس مفہوم مخالف کے منکر ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ امام شافعی کا بیان کردہ مفہوم مخالف تو صحیح نہ ہو مگر احناف کا بیان کردہ درست تسلیم کرلیا جائے، کیا انصاف کا یہی میزان ہے۔

سابعاً۔ امام احمد بن حنبلؒ کا کہنا ہے کہ رکانہ کی حدیث البتہ ناقابل اعتبار ہونے کے ساتھ یکدم دی گئی طلاق ثلاثہ والی حدیث کے منافی و مخالف نہیں ہے کیونکہ اہل مدینہ ایک مجلس کی طلاق کو طلاق البتہ کے نام سے بھی موسوم کرتے تھے۔

فتاوی ابن تیمیہ ص۸۶ ج۳۳، اعلام الموقعین ص۱۰۸ ج۲ مترجم۔

امام ابن ماجہ اور حدیث البتہ

حضرت مفتی فرماتے ہیں کہ، امام ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ، مااشرف ھذا الحدیث، یہ حدیث کیا ہی شریف الاسناد ہے، جاء الباطل ص۴۵۹ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ یہ قول امام ابن ماجہ کا قطعاً نہیں، یہ مفتی صاحب کا وہم اور علم حدیث سے کم آگاہی کا نتیجہ ہے، بلکہ اس قول کو امام ابن ماجہ نے، ابوالحسن طنافسی سے نقل کیا ہے، انکے الفاظ ہیں،

قال محمد بن ماجه سمعت اباالحسن علی بن محمد الطنافسی یقول ما اشرف هذا الحدیث، ابن ماجه(۲۰۵۱)

(امام) محمد بن ماجہؒ کہتے ہیں کہ ابوالحسن (طنافسی) سے سنا وہ فرماتے تھے یہ حدیث کتنی

عمدہ ہے۔

(مترجم سنن ابن ماجہ ص۵۷۰ ج۱ ترجمہ از مولوی عبدالحکیم خاں بریلوی)

مگر حضرت مفتی صاحب ان الفاظ کو امام ابن ماجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ثانیاً۔ امام ابن ماجہ نے اس کے بعد حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کر کے اس روایت کو ضعیف قرار دیا تھا، جسے مفتی صاحب بے ڈکار ہضم کر گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس قوم کو ھدایت عطا فرمائے اور اس طرح کی ہیرا پھیریاں کرنے سے انہیں بچائے اور عوام الناس کو ان کی عیاریوں سے محفوظ رکھے، آمین یا الٰہ العلمین۔

ثالثاً۔ مفتی صاحب کا، ما اشرف ھذا الحدیث، کا یہ معنی کرنا کہ، یہ حدیث کیا ہی شریف الاسناد ہے، غلط بیانی ہے، کیونکہ اصول حدیث کی کسی کتاب میں بھی یہ معنی موجود نہیں، حقیقت یہ ہے کہ امام طنافسی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت کتنی شاندار اور عمدہ ہے کہ جو بھی اسے دلیل و حجت بنائے گا اس کے خلاف یہی حدیث دوسرے پہلو سے رد بلیغ بن جائے گی، جیسا کہ قارئین کرام پہلے پڑھ آئے ہیں کہ اس کو دلیل و حجت بنانے والے بھی اس پر عامل نہیں کیونکہ اس کا مفاد یہ ہے کہ اگر طلاق دینے والے نے بلانیت طلاق البتہ دے دی تو طلاق واقع نہ ہوگی مگر کسی شخص نے بھی اس حدیث سے نکلنے والے مسئلہ پر عمل نہیں کیا، تو اس چیز کو ملحوظ رکھ کر امام طنافسی نے یہ بات کہی کہ یہ حدیث کتنی عمدہ ہے کہ اسے دلیل بنانے والے بھی اس کے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے، اور اعتراضات کا شکار ہوں گے، مقصد یہ تھا کہ یہ روایت دلیل کے لائق نہیں کیونکہ اگر ایک پہلو سے دلیل بن رہی ہے تو دوسرے پہلو سے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہی ہے، معلوم نہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے ادھیڑ عمر میں بھی ان الفاظ کا صحیح مطلب کیوں نہیں سمجھا۔

مفتی صاحب کی نویں دلیل

بیھقی نے بسام صریفی سے روایت کی ہے کہ جعفر ابن محمد فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو نادانی سے یا جان بوجھ کر تین طلاقیں دیدے وہ عورت اس پر حرام ہو جائیگی، اسی بیھقی نے مسلمہ ابن جعفر احمد سے روایت کی کہ میں نے امام جعفر ابن محمد رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ یہ

فرماتے ہیں کہ جوکوئی ایکدم تین طلاقیں دے تو ایک رجعی ہی واقع ہوگی؟ فرمایا معاذاللہ ہم نے یہ کبھی نہ کہا اس کی تین طلاقیں ہی ہوں گی، بحوالہ روح المعانی، جاء الباطل ص۴۶۰ ج۱۔

الجواب

امام جعفر صادقِ اتباع التابعین سے ہیں، اگر ان کے قول کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آئمہ اربعہ کی طرح ان کا بھی یہی مؤقف تھا، مگر کسی مسلمان کلمہ گو اور بزرگ کے قول سے قرآن وحدیث کی واضح نصوص کو رد نہیں کیا جاسکتا، گو وہ ہمارے اسلاف ہیں مگر دلیل قرآن وحدیث سے ہی لی جائے گی، اور اس کے بالمقابل بڑی سے بڑی بزرگ ہستی کے اقوال کو بھی لائق بنانا درست نہیں، یہی حنفی بریلوی علماء کا مؤقف و مذہب ہے، دیکھئے دین الحق ص۴۴۱ ج۱۔

ثانیاً۔ روایت مذکورہ کی سند میں، مسلمہ بن جعفر الاحمسی ہے، بیھقی ص۳۴۰ ج۷، مگر مفتی صاحب، الاحمسی، کواحمد فرماتے ہیں۔

ثالثاً۔ الاحمسی کے نیچے کا راوی، محمد بن عبدالرحمٰن، ہے جو کہ ضعیف ومتروک ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے، دین الحق ص۳۸۲ ج۱، جبکہ دوسری سند میں بسام (بن عبداللہ) صیر فی راوی ہے جو کہ شیعہ ہے اسے ابن عقدہ اور طوسی نے رجال شیعہ میں ذکر کیا ہے، تھذیب ص۳۸۰ ج۱، تفصیل کیلئے، تنقیح المقال ص۱۶۸ ج۱، دیکھئے۔

اور شیعہ کی روایت مفتی صاحب کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے، جاء الباطل ص۶۸ ج۲، گو ہم اس کی اسناد سے کئی اور راوی بھی متکلم فیہ دکھا سکتے ہیں مگر مبتدعین کو جب ان کا دل پسند جواب مل گیا تو اور کسی کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مفتی صاحب کی دسویں دلیل

مسلم شریف کتاب الطلاق باب الطلاق الثلث، میں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ ایکدم تین طلاقیں تین ہی ہوں گی، اس حدیث کی شرح نووی میں ہے کہ صحابہ کرام کا اجماع اس پر ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کبھی غلط بات پر اجماع نہیں کر سکتے، جاء الباطل ص۴۶۰ ج۱۔

الجواب

اولاً۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فتوی پر ہی اگر تعصب سے الگ ہو کر غور کر لیا جائے تو مسئلے کا حل نکل آتا ہے، ان کے فتوی کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ۔

عن ابن عباس قال کان الطلاق علی عهد رسول الله ﷺ و ابی بکرو سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلو فی امر کانت لهم فیه اناة فلو امضیناه علیهم فامضاه علیهم.

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس معاملے میں لوگوں کو سوچ و بچار سے کام لینا چاہیئے تھا، اس میں وہ جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں، لہذا ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں، چنانچہ آپ نے اس کو نافذ کر دیا،

صحیح مسلم ص ۴۷۸ ج ۱۔

اس حدیث کو مفتی صاحب ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کرنے کے ثبوت میں پیش کررہے ہیں، اور دعوی یہ کیا جارہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہوگیا تھا۔

لیکن حدیث کے پورے الفاظ کو نقل ہی نہیں کیا اور کاٹ چھانٹ کر انہوں نے جو الفاظ درج کیئے ہیں، انکا معنی بھی خیر سے چھوڑ دیا ہے۔

ہم مفتی صاحب کی اس مجبوری سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر پوری حدیث نقل کر کے اس کا معنی کر دیا تو ایک اناڑی بھی جان جائے گا کہ خود عہد رسالت مآب ﷺ اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پوری مدت خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک امت مرحومہ کا تعامل یہی تھا کہ تین طلاقوں کو ایک رجعی طلاق شمار کیا جاتا تھا، اس کیلیئے مفتی صاحب نے جوڑ توڑ سے یہ مخلص تلاش کیا کہ حدیث کے الفاظ کو قطع و برید کے ساتھ پیش کیا، پھر بریلویوں کے ستم شعار مفتی اعظم اور حکیم الامت نے درج کردہ الفاظ کا بھی معنی کرنے کی زحمت نہ کی۔

انصاف شرط ہے کہ امت مرحومہ کا وہ تعامل زیادہ صحیح ہے جو آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی

مبارکہ اور خلافت صدیقی کی پوری مدت اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دو سالوں تک رہا، یا وہ جس کا آغاز آنحضرت ﷺ کی وفات کے پانچ سال بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شروع ہوا۔

ثانیاً۔ اگر مبتدعین یہ کہیں کہ عہد رسالت اور دور صدیقی، کے خلاف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیوں حکم نافذ فرمایا؟ تو گزارش ہے کہ اسی حدیث میں اس کی وجہ بیان کر دی گئی ہے کہ لوگ کثرت سے طلاقیں دینے لگ گئے تھے جبکہ شریعت نے اس میں انتہائی غور و فکر اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید کی ہے، لیکن جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ طلاق کے معاملے میں اس احتیاط سے کام نہیں لیتے جو شریعت کا منشا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خیال میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا نفاذ کر دیا جائے، تاکہ اس سخت اقدام سے لوگوں کو کچھ تنبیہ ہو اور کثرت سے بیک وقت تین طلاقیں دینے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہو، یہ گو ایک تعزیری اور تہدیدی اقدام تھا، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا۔

ہمارے اس مؤقف کی تائید علامہ قہستانی حنفی کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

انه كان في الصدر الاول اذا ارسل الثلاث جملة لم يحكم الا بوقوع واحدة الىٰ زمن عمر ثم حكم بوقوع الثلاث سياسة لكثرته من الناس.

یعنی ایک وقت میں دی ہوئیں تین طلاقیں ابتدا اسلام سے لیکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع تک ایک ہی شمار کی جاتی تھی، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کے کثرت فعل پر نظر کی تو تین کے واقع ہونے کا حکم از روئے سیاست جاری کرایا، بحوالہ طحطاوی علی درمختار ص۱۰۵ ج۲، یہی بات فقہ حنفی کی معتبر کتب، جامع الرموز ص۳۲۱ اور مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر ص۳۲۸ وغیرہ میں بھی درج ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ تعزیری اور اجتہادی تھا جس کو دین و شریعت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، بالخصوص جب کہ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا۔

خلفائے راشدین کے نافذ کردہ قوانین کی امثلہ

اولاً۔ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا محض قانون نافذ کرنا ہی صحابہ کرام کا اجماع ثابت کرتا ہے، درست نہیں کیونکہ جن الفاظ سے مبتدعین کے مفتی اعظم کا استدلال ہے، ان سے پہلے کی عبارت اس طرح ہے کہ،

، کانت الطلاق علی عهد رسول الله ﷺ وابی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، مسلم ص ۴۷۸ ج ۱.

ان الفاظ کا واضح مفاد یہ ہے کہ دور نبوی وصدیقی اور ابتدائی عہد فاروقی میں ایک وقت کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا،مگر حیرت ہے کہ حضرت مفتی صاحب کو یہ اجماع تو نظر نہیں آرہا جو نبی ﷺ کی زندگی طیبہ میں ہوا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پوری مدت خلافت میں اس پر مسلسل عمل رہا یہاں تک عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی دو تین سال تک اسی سنت نبوی اور اجماع امت پر عمل رہا؟ مگر کمال ہے کہ مفتی صاحب کا ایک کو تو قابل عمل قرار دینا اور دوسرے کو متروک العمل کہنا بذات خود ان کے علمی و عملی تضاد کا مظہر ہے۔

ثانیاً۔ موقع کی مناسبت سے ہم یہاں ایسی مثالوں کا ذکر کرنا بھی چاہتے ہیں جن کا زیر بحث مسئلہ سے بہت گہرا تعلق ہے، وہ یہ کہ چند ایسی امثلہ کی ہم نشان دہی کروا رہے ہیں، جو کہ خلفائے راشدین کے قانون نافذ کرنے کے باوجود مفتی صاحب اور انکے ہم مشرب تقلیدی حضرات ان پر عمل نہیں کرتے۔

(۱) حج تمتع کی مثال

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

تمتعنا علی عهد رسول الله ﷺ و نزل القرآن قال رجل (ای عمر بن خطاب رضی الله عنه) برأيه ماشاء.

یعنی نبی ﷺ کے زمانہ مبارکہ اور خلافت صدیقی میں ہم حج تمتع کیا کرتے تھے اور قرآن کریم بھی اس سلسلہ میں نازل ہوا پھر بعد میں ایک شخص نے (عمر فاروق رضی اللہ عنہ قسطلانی بحوالہ حاشیہ

بخاری) اپنی رائے سے حج تمتع پر پابندی لگادی، بخاری ص۲۱۳ ج۱، ومسلم ص۴۰۳ ج۱۔

اس قانون کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دور خلافت میں نافذ رکھا، جیسا کہ مروان بن الحکم (بخاری ص۲۱۲ ج۱) اور عبداللہ بن شقیق (مسلم ص۴۰۱ ج۱) بیان کرتے ہیں، تمام اہل علم کا مقلدین سمیت اس بات پر اتفاق ہے کہ گو حضرات خلفائے راشدین نے اس سے منع فرمایا لیکن حج تمتع کرنا جائز ہے کیونکہ دور نبوی وصدیقی میں اسے جائز سمجھا جاتا تھا، اس لئے خلفاء کی لگائی ہوئی پابندی کو حجت تسلیم نہیں کیا گیا، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں اسی معنی ومفہوم کی روایت کو حجت باور کرایا جاتا ہے اور منکرین کو دین کا باغی قرار دیا جاتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۲) سفر حج میں قصر نماز کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

صليت مع النبی ﷺ بمنىٰ ركعتين و ابی بكر و عمرو مع عثمان صدراً من امارته (و فی رواية ثمان سنين من خلافت عثمان) ثم اتمها عثمان.

یعنی میں نے نبی ﷺ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں، اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی چھ سال یا آٹھ سال تک انکی اقتدا میں دو رکعتیں پڑھیں مگر بعد میں انہوں نے اپنی خلافت کے آخری سالوں میں دو رکعتوں کی بجائے پوری نماز پڑھنے لگے۔

بخاری ص۱۴۷ ج۱، ومسلم ص۲۴۳ ج۱، ونسائی ص۱۷۰ ج۱۔

اس حدیث کا واضح مفاد یہ ہے کہ دور نبوی وصدیقی وفاروقی اور ابتدائی عہد عثمانی میں حج کے موقع پر منیٰ میں نماز کو قصر کیا جاتا تھا، مگر بعد میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پوری نماز پڑھنا شروع کردی تھی، اس حدیث کی بنا پر تمام اہل تقلید (بشمول حنفیہ) یہ مانتے ہیں کہ چونکہ عہد نبوی و صدیقی وفاروقی اور ابتدائے عہد عثمانی میں قصر کی جاتی تھی، اس لئے اس موقع پر قصر کرنی ہی افضل و اولیٰ اور راہ استقامت ہے، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسی معنی ومفہوم پر عمل کرنے کے باوجود حنفی طلاق کے بارے میں مروی اسی معنی ومفہوم کی حدیث کو متروک العمل قرار دیکر تضاد کے شکار ہیں۔

(۳) بیک وقت ہزار طلاقیں دینے کی مثال

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک وقت میں ہزار طلاقیں دے دے، تو اس کی وہ بیوی تین طلاقوں کی وجہ سے حرام ہو جائے گی، اور باقی طلاقیں وہ شخص اپنی دیگر بیویوں پر تقسیم کردے، گویا حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا واضح مفاد یہ ہے کہ اسکی باقی عورتیں بھی مطلقہ ہو کر حرام ہو جائیں گی بشرطیکہ اس کے عقد میں اور بیویاں بھی ہوں،

مفتی صاحب کے اصول کے موافق خلیفہ راشد کا یہ فرمان امت کا اجماعی فیصلہ قرار پاتا ہے۔ مگر حنفی اس اجماع کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۴) مفقود الخبر شوہر کی مثال

امام سعید بن میبّب بیان کرتے ہیں کہ

ان عمر بن الخطاب رضی الله عنه قال ایماامراة فقدت زوجها فلم یدر این هو فانها تنظر اربع سنین ثم تعتد اربعة اشهر و عشرا ثم تحل.

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جس کا شوہر گم ہو جائے ، وہ عورت چار سال انتظار کرنے کے بعد چار مہینے دس دن کی عدت گزار کر دوسری شادی کر لے، موطا امام مالک ص۵۲۳، وبیھقی ص۴۴۵ ج ۷۔

یہی فتویٰ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ہے، بیھقی ص۴۴۵ ج ۷۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ مفقود الخبر شوہر کی بیوی کے بارے میں حکم فاروقی وعثمانی چار سال انتظار کے بعد عدت گزار کر دوسری شادی کر لینے کا ہے، ظاہر ہے کہ مفتی صاجب کے اصول سے مذکورہ حکم فاروقی وعثمانی امت کا اجماعی مسئلہ ہے مگر افسوس کہ حنفیہ اس اصول سے انحراف کر کے بقول مفتی صاحب اجماع امت کے منکر ہیں۔ کیونکہ فقہ حنفی کے مطابق مفقود الخبر خاوند والی عورت اپنے خاوند کی پیدائش سے لیکر ایک سو بیس سال عمر ہونے تک انتظار کرے گی اور جب خاوند کی عمر ایک سو بیس سال ہو جائے گی تو پھر وہ عدت گزارے گی (قدری ص۱۵۵)

(۵) مروجہ نکاح حلالہ کی مثال

متعدد کتب حدیث میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے،

ابوداود (۲۰۷۶-۲۰۷۷) و ابن ماجه(۱۹۳۴-۱۹۳۶) و ترمذی (۱۱۱۹-۱۱۲۰) و مسند احمد (۳۲۳/۲) و بیهقی (۲۰۸/۷) و مستدرک حاکم (۱۹۸/۲-۱۹۹) و دارقطنی (۲۵۱/۳) و ابن ابی شیبه(۲۹۵/۴).

جب کہ خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں کہ

لااوتی بمحلل ولا محلل له الا رجمتهما.

یعنی میں حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو رجم کردوں گا،

ابن ابی شیبہ (۲۹۴/۴ ق ۲) و مصنف عبدالرزاق ص ۲۶۵ ج ۶ (۱۰۷۷۷)

اس روایت کا صاف مطلب یہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حلالہ کو زنا قرار دیتے تھے، مفتی صاحب کے اصول کے موافق یہ حکم فاروقی بھی امت کا اجماع ہے مگر حنفیہ مروجہ حلالہ کے قائل ہیں اور اپنے ہی بنائے ہوئے اصول سے انحراف کرکے انہوں نے اجماع امت کا انکار کر کے سبیل المومنین کو ترک کر دیا ہے۔

(۶) حالت احرام میں نکاح کی مثال

حالت احرام میں نکاح کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر منع فرمایا ہے، صحیح مسلم ص ۴۵۳ ج ۱، اور امام داؤد بن حصین ؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان اباغطفان بن طریف المری اخبره ان اباه طریفا تزوج امراة وهو محرم فرد عمر بن الخطاب نکاحه.

یعنی ابو غطفان مری کہتے ہیں کہ میرے باپ طریف نے حالت احرام میں ایک عورت سے نکاح کرلیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس نکاح کو مردود قرار دیا، موطا امام مالک ص ۳۶۱۔ اس صحیح اثر کا بھی یہ مفاد ہے کہ اس مسئلہ پر بھی دور فاروقی میں امت کا اجماع ہوگیا تھا، مگر

مفتی صاحب کے فقہی مذہب کے مطابق محرم آدمی اور مرحمہ عورت حالت احرام میں نکاح کر سکتے ہیں۔ (قدوری ص۱۶۲) کتنے افسوس کی بات ہے کہ احناف نے اپنے اصول سے انحراف کرتے ہوئے امت کے اس اجماع کو بھی توڑ دیا ہے۔

(۷) نکاح بلا ولی کے مثال

عکرمہ بن خالد بیان کرتے ہیں کہ

جمعت الطريق ركبا فجعلت امراة منهم ثيب امرها الى رجل من العوام غير وليها فانكحها رجلاً، قال فجلد عمر الناكح والمنكح و فرق بينها.

یعنی ایک سفر میں ایک عورت ثیبہ (ایسی شادی شدہ خاتون جو وطی کے بعد بیوہ یا مطلقہ ہوگئی ہو) نے ولی کی اجازت کے بغیر ایک شخص کے ذریعہ نکاح کر لیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نکاح کرنے اور کرانے والے دونوں کو کوڑے لگائے اور نکاح کو باطل قرار دیتے ہوئے دونوں کے درمیان تفریق کروادی،

مصنف ابن ابی شیبہ ص۱۳۲ج۴ق۲)۔ مصنف عبدالرزاق ص۱۹۹ج۶ (۱۰۴۸۶) و دار قطنی ۲۲۵ج۳ و بیھقی ص۱۱۱ ج۲۔

اسی طرح خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایسے نکاح کو باطل قرار دے کر نکاح کرنے والے کو سزا دیتے تھے، ایضاً۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے اس جاری کردہ قانون و دستور پر مفتی صاحب کے اصول کے موافق امت کا اجماع منعقد ہوگیا ہے، لیکن یہاں اپنے اصول کے مطابق اجماع امت کی مخالفت کی ہے کہ عورت خواہ منکوحہ ہو یا باکرہ البتہ بالغ ہونا ضروری ہے، ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرسکتی ہے (قدوری ص۱۶۲)، حالانکہ مذکورہ اجماع کے علاوہ اس پر تو احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں۔

(۸) مدت رضاعت کی مثال

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ

والو الدٰت یرضعن اولا دھن حولین کاملین. (الایہ بقرہ ۲۳۳)

اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس۔ (احمد رضا) ۲-۲۳۳)

اور خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حکم وفتوی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ،

سمعت عمر رضی اللہ عنہ یقول لارضاع الا فی الحولین فی الصغر.

یعنی میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے کہ رضاعت نہیں مگر مھد کے دو سال میں، بیہقی ص۴۶۲ ج ۷۔

مفتی صاحب کے اصول کے مطابق اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے مگر احناف کے نزدیک مدت رضاعت اڑھائی سال ہے (قدوری ص۱۶۹) جس سے واضح ہے کہ حنفیہ نے مدت رضاعت کو اڑھائی سال قرار دیکر امت کے اس اجماع کی بھی مخالفت کی ہے۔

(۹) طلاق غلام کی مثال

امام عبداللہ بن عتبہؒ بیان کرتے ہیں کہ

عن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ انہ قال ینکح العبد امرا تین(ھذا خطاء والصواب امراۃ) و یطلق تطلیقتین و تعتد الامۃ حیضتین فان لم تکن تحیض فشھرین او شھرا و نصفاً.

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر غلام عورت سے نکاح کرے پھر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو صرف دو طلاقیں دینے کا اختیار رکھتا ہے، اس کے بعد تیسری طلاق کا اختیار نہیں اور باندی کی عدت دو طہر ہے اگر حیض نہ آتا ہو تو تب ڈیڑھ دو ماہ اس کی عدت ہے، السنن الکبریٰ للبیھقی ص۴۲۵ ج ۷۔

حافظ ابن حجر نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، التلخیص الحبیر ص۲۳۳ ج ۳۔

یہی مؤقف وفتوی سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تھا، چنانچہ امام سلیمان بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان نفیعا مکاتبا کان لام سلمة زوج النبی ﷺ او عبدا کانت تحته امرأة حرة فطلقها اثنتین ثم اراد ان یرا جعها فامره ازواج النبی ﷺ ان یأتی عثمان بن عفان فیسئله عن ذلک فلقیه عند الدرج اٰخذاً بید زید بن ثابت فسالها فابتدراه جمیعا فقال حرمت علیک حرمت علیک.

یعنی ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنھا کے ایک مکاتب غلام نفیع نے اپنی ایک حرہ بیوی کو دو طلاقیں دینے کے بعد رجوع کرنا چاہا مگر امہات المومنین رضی اللہ عنھم نے کہا کہ پہلے جاکر امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھ لو، چنانچہ نفیع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا (مقام) درج پر ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوال مذکورہ کے جواب میں دونوں نے کہا کہ تمھاری یہ بیوی تجھ پر حرام ہوگئی ہے اب تم اس سے رجوع نہیں کر سکتے

موطا امام مالک ص ۵۲۳ و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۸۳ ج ۵۔

ان دونوں صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ غلام کو صرف دو مرتبہ ہی طلاق دینے کا حق ہے، اور اس پر مفتی صاحب کے اصول کے مطابق امت کا اجماع ہو چکا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حنفیہ نے اپنے بنائے ہوئے اصول کی مخالفت کر کے اجماع امت کو توڑ دیا ہے کہ اگر غلام کی عورت حرہ ہوتو اس کی تین طلاقیں ہونگیں (ھدایہ ص ۳۵۹ اولین)

(۱۰) عدت خلع کی مثال

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

عدة المختلعة حیضة، یعنی خلع کی عدت فقط ایک حیض ہے،

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۱۴ ج ۵، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس فیصلہ میں میں

نے نبی ﷺ کی حدیث کی پیروی کی ہے، سنن ابن ماجہ ص ۱۴۹۔

الغرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہی فتوی تھا کہ عدت خلع ایک حیض ہے، اور اس کے موافق حدیث صحیح صریح بھی مروی ہے اور قرآن کے سیاق و سباق کا بھی یہی مفاد ہے، اور مفتی صاحب کے اصول کے موافق خلافت عثانی میں اس پر امت کا اجماع بھی ہوگیا ہے، لیکن کس قدر ستم کی بات ہے کہ حنفیہ نے اپنے بنائے اصول اجماع کی مخالفت کرتے ہوئے خلع کی عدت تین حیض قرار دی ہے۔

(۱۱) زبردستی طلاق کی مثال

متعدد معتبر روایات سے مروی ہے کہ اگر شوہر سے زبردستی طلاق حاصل کی گئی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس طلاق کو کالعدم اور غیر واقع مانتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۱ ج ۵، وسنن سعید بن منصور ص ۲۷۱ ج ۱ و المحلی بالاثار ص ۴۶۳ ج ۹۔

ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق اس پر بھی امت کا اجماع ہو چکا ہے، لیکن ان خلفائے راشدین کے حکم و فتوی اور قانون و دستور کے باوجود حنفیہ نے ایسی طلاق کے واقع ہوجانیکا فتوی دیکر اس کی مخالفت کی ہے۔

(۱۲) بدمست آدمی کی طلاق

مختلف اور معتبر سندوں سے مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حالت نشہ میں دی ہوئی طلاق کو غیر واقع مانتے تھے، ابن ابی شیبہ ص ۳۹ ج ۵، اسی پر ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فتوی تھا، ایضاً، مفتی صاحب کے اصول کے ماتحت یہ بھی اجماع امت ہے مگر احناف نے ایسی طلاق کے واقع ہوجانیکا فتوی صادر کرکے اجماع امت کی مخالفت کی ہے۔

(۱۳) نکاح سے پہلے طلاق کی مثال

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۳) حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ (۴) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۵) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ (۶) حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ (۷) حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ (۸) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (۹) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے متعدد و مختلف اسناد و الفاظ سے فرمان نبوی مروی ہے کہ نکاح سے پہلے دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

ابو داود ص۱۵۳ ج۱، و ترمذی مع تحفہ ص۲۱۳ ج۲، و ابن ماجہ ص۱۴۸، و دارقطنی ص۱۴ ج۴، و بیہقی ص۳۱۸ ج۷، مصنف عبدالرزاق (۱۳۸۹۹)، و حاکم ص۲۰۵-۲۰۴ ج۲، و شرح السنہ ص۱۹۸ ج۹، و نصب الرایہ ص۲۳۱ ج۳، و درمنثور ص۲۰۸ ج۵، و التلخیص الحبیر ص۲۱۰ ج۳، و مسند احمد ص۲۷۶ ج۶، و ابن ابی شیبہ ص۴۹ ج۵، و طبرانی کبیر ص۲۸ ج۱۱، و مجمع الزوائد ص۱۸۷، ۳۳۴ ج۴،

یہی حکم وفتوی حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا ہے، ترمذی مع تحفہ ص۲۱۴ ج۲،

مفتی صاحب کے دستور و اصول کے مطابق یہاں بھی امت کا اجماع ہی ہے مگر حنفیہ کے نزدیک نکاح سے پہلے دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، انصاف شرط ہے کیا حنفیہ نے یہاں پر اجماع امت کی مخالفت کی ہے کہ نہیں۔

(۱۴) ہدم طلاق کی مثال

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۲) حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ (۳) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (۴) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ (۵) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ (۶) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۷) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۸) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (۱۰) اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام سے صراحت و ضاحت سے مروی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی عورت منکوحہ کو ایک یا دو عدد طلاقیں دی تھیں اور وہ عورت عدت گزار کر کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی ہے لیکن قدرت و اتفاقاً اس کا دوسرا شوہر فوت ہوجاتا ہے یا طلاق دے دیتا ہے، اب اس عورت نے دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح شرعی کر لیا تو اب یہ ماننا پڑھے گا کہ اس کے پہلے خاوند کو فقط ایک ہی

طلاق کا حق حاصل ہے،

ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ ج ۵، والسنن الکبریٰ للبیھقی ص ۳۶۴ تا ۳۶۵ ج ۷۔

ظاہر ہے کہ مؤلف جاء الباطل کے اصول کے موافق یہ امت مرحومہ کا اجماع ہے، لیکن کتنے ستم کی بات ہے کہ حنفیہ کے نزدیک ایسے مرد کو از سر نو تینوں طلاقوں کا حق حاصل ہے،

(۱۵) ایلاء کی مثال

امام سعید بن میسبؒ بیان کرتے ہیں کہ

ان عمر بن الخطاب رضی الله عنه كان يقول اذا مضت اربعة أشهر فهی تطليقة وهی املک بردها مادامت فی عدتها.

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مدت ایلاء ختم ہو جائے تو ایلاء شدہ عورت پر رجعی طلاق واقع ہو جائے گی،

سنن دارقطنی ص ۶۳ ج ۴۔

مولانا محمد شمس الحق محدث عظیم آبادیؒ بیان کرتے ہیں کہ

قاضی اسماعیلؒ نے، الاحکام، میں سعید بن جبیرؒ کے طریق سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ

مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والے سے مطالبہ رجوع یا مطالبہ طلاق کیا جائے گا، التعلیق المغنی علی السنن دارقطنی ص ۶۳ ج ۴۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اثر کا مطلب یہ ہے کہ مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والے شوہر سے بذریعہ سرکاری فرمان یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ

ایلاء سے رجوع کرلو یا پھر طلاق دے دو، اس موقع پر اگر شوہر رجوع نہ کرے تو اسے طلاق دینی پڑے گی اور اس کی دی ہوئی یہ طلاق رجعی ہوگی۔

یہی مؤقف حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا ہے، چنانچہ عمر بن سلمہ اور عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ

عن علی فی الایلاء، قال، یوقف بعد الاربعة، فاما ان یفی وأما ان یطلق.

یعنی حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مدت ایلاء گزرنے پر ایلاء کرنے والا شوہر یا تو رجوع کرے یا طلاق دے،

سنن دارقطنی ص۶۱ ج۴، ومعنی فی المصنف ابن ابی شیبہ ص۱۳۱ ج۵۔

حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان قرآن کریم کے سیاق وسباق کے بالکل مطابق ہے، اور یہ معلوم ہے کہ عدالتی فیصلہ جات میں ان کا مقام بہت بلند ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی و حاکم بنا کر بھیجا تو ان کے حق میں توفیق قضاء کی دعا کی تھی۔

ابوداؤد ص۱۴۸ ج۲، وابن ماجہ ص۱۶۸، ومسند احمد ص۸۳ ج۱، وبیھقی ص۶۷ ج۱، ومستدرک حاکم ص۹۳ ج۴۔

عام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے آپ کو امت کا سب سے بڑا اور عمدہ قاضی کہا ہے، ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کا مذکورہ فیصلہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق پوری امت کا اجماعی فیصلہ ہے مگر اس کے برعکس مؤلف جاء الباطل کے تقلیدی مذہب میں مدت ایلاء گزرنے پر خود بخود طلاق بائن پڑ جائے گی اور شوہر کو رجوع کا حق نہیں رہے گا۔ (قدوری ۱۷۹)

(۱۶) حد چوری کی مثال

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ زیادہ سے زیادہ تین درھم اور بعض روایات میں پانچ درھم کی قیمت والی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ ص۴۷۰ ج۹، وعبدالرزاق ص۲۳۶ ج۱۰، وبیھقی ص۲۵۹ ج۸۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اترج (لیموں) کی چوری پر ہاتھ کاٹ دیتے تھے، جبکہ اترج کی قیمت ربع دینار (تین درھم) کے برابر تھی،

مصنف ابن ابی شیبہ ص۴۷۲ ج۹، وعبدالرزاق ص۲۳۷ ج۱۰، وبیھقی ص۲۵۵ ج۸۔

ربع دینار پر ہاتھ کاٹنے کا فتوی خلیفہ راشد حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، ابن ابی شیبہ ص۴۷۰ ج۹، وعبدالرزاق ص۲۳۷ ج۱۰، وبیھقی ص۲۶۰ ج۸۔

خلفائے راشدین کا مذکورہ فتوی حدیث نبوی علیہ السلام کے عین مطابق ہے، کیونکہ بہت سی صحیح احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چوتھائی دینار (تین درھم) کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا،

صحیح بخاری ص۱۰۰۴ ج۲، ومسلم ص۶۳ ج۲۔

مفتی صاحب کے اصول سے یہ مسئلہ بھی اجماعی ہے مگر احناف نے اس مسئلہ میں بھی خلفائے راشدین کے حکم وفتوی کیخلاف عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ کم از کم دس درھم یا ایک دینار کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائیگا۔ ھدایہ ص۵۳۷ اولین)

(۱۷) سزائے لوطی کی مثال

امام ابی حصینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کے موقع پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ چار اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے کسی مسلمان کا خون جائز ہوا کرتا ہے،

(۱) قتل کرنا (۲) شادی کے بعد زنا کرنا (۳) مرتد ہونا (۴) لونڈے بازی کرنا، مصنف ابن ابی شیبہ ص۴۱۴ ج۹، نصب الرایہ ص۳۴۲ ج۳۔

یہی فتوی سیدنا علی مرتضی کا ہے، مصنف ابن ابی شیبہ ص۵۳۰ ج۹، وبیھقی ص۲۳۲ ج۸، مگر حنفیہ نے مذکورہ فتاوی عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی ہے، کہ لوطی پر حد نہیں تعزیر ہے ھدایہ اولین ص۵۱۶) حالانکہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

(۱۸) بٹائی پر کھیتی کی مثال

متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ

رسول اللہ و نے خود مزارعہ کا معاملہ کیا اور آپ علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر خلفائے راشدین کے زمانہ تک اور بعد میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور تمام تابعین عظام اور عامۃ المسلمین میں مزارعہ کا رواج عام رہا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، اور تمام خلفائے راشدین نے اسے اپنے اپنے دور خلافت میں برقرار و جاری رکھا۔

صحیح بخاری ص۳۱۳ ج۱، (باب المزارعۃ) اور ابن ابی شیبہ ص۳۳۷ تا ۳۴۴ ج۶۔ میں صراحت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، نیز جملہ مھاجرین و انصار بذات خود مزارعہ کرتے تھے، ظاہر ہے کہ مفتی صاحب کے اصول کے موافق اس پر امت مرحومہ کا اجماع ہوچکا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک مزارعہ فاسد ہے۔ (البحر الرائق ص۱۵۹ ج۸)

(۱۹) مسئلہ وقف کی مثال

کتب احادیث میں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حکم نبوی کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اپنی جائدادیں دینی امور کیلئے وقف کر دی تھیں، اس سلسلہ میں، ہلال الرائی، حنفی کی ایک کتاب الوقف بھی ہے مگر امام ابو حنیفہ وقف کو جائزنہیں مانتے حالانکہ حنفی حضرات (بشمول بریلوی مکتب فکر) کے عام دینی مدارس اوقاف ہی کی آمدنی سے عموماً چلتے ہیں۔

(۲۰) گوہ کے گوشت کی مثال

احادیث نبویہ میں گوہ کا گوشت کھانے کی اجازت موجود ہے اسی کے مطابق عام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا عمل بھی تھا، حتی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ

میرے نزدیک گوہ کا گوشت مرغ سے زیادہ پسندیدہ ہے،

مصنف ابن ابی شیبہ ص۸۴ ج۸۔

مزید کہا کرتے تھے کہ کاش ہر سوراخ میں دو عدد گوہ ہوا کریں تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ کھا سکیں، ایضاً ص۸۳ ج۸۔

آپ سے یہ مروی ہے کہ

ان اللہ لینفع بالضب فانہ لطعام عامۃ الرعاء و لو کان عندی لطعمت منہ.

یعنی اللہ تعالی نے گوہ کا گوشت نفع بخش بنا رکھا ہے اس کا گوشت عام چرواہوں کی غذا ہے اگر وہ مجھے ملے تو میں بھی اس سے کھاؤں۔

ابن ابی شیبہ ص۸۳ ج۸، و بیھقی ص۳۲۴ ج۹۔

عصمۃ بن ربعی فرماتے ہیں کہ

قد منا علی عمر نحن اناس سمان حسنة هيئتنا، قال فقال ماطعامكم؟ قلنا الضباب قال فقال عمر ،ويجزيكم؟ قلنا، نعم، فقال وددت ان مع كل ضب مثلة.

یعنی ہم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو ہمارے جسم بھر پور،اور شکل و صورت اچھی تھی، اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ بھلا کیا چیزیں کھایا کرتے ہو کہ اس طرح تندرست اور اچھی شکل وصورت والے ہو؟ تو ہم نے جواب دیا کہ ہم لوگ گوہ کا گوشت کھایا کرتے ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گوہ کا گوشت کیا تمہیں کفایت کرتا ہے اور اس سے غذا کا کام پورا ہو جاتا ہے؟ ہم نے کہا جی ہاں! اس پر آپ نے فرمایا کاش دنیا میں پا ئی جانے والی گوہ کی مقدار دوگنا ہو جائے،

مصنف ابن ابی شیبہ ص۸۵ ج۸۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گوہ کا گوشت حلال و مباح سمجھتے تھے، مگر حنفی مذھب میں اس کے خلاف گوہ کے گوشت کو ممنوع و مکروہ کہا گیا ہے (قدوری ص۲۲۰ وھدایہ ص۴۴۷ ج۴۔

تلک عشرین کاملۃ

اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جس میں مفتی صاحب کے تقلیدی مذھب نے خلفائے راشدین کے حکم و فیصلہ کے خلاف فتوی دیا ہے، مگر اختصار کی وجہ سے انہیں بیس امثلہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

کیا جمھور کی مخالفت گمراہی ہے؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

جمھور علماء خصوصاً چاروں اماموں کا یہی مذھب ہے کہ ایکدم تین طلاقیں دینے سے تین ہی

واقع ہونگی اس کی مخالفت امت مسلمہ کی مخالفت ہے جو گمراہی ہے، جاء الباطل ص ۴۶۰ ج ۱۔

مزید فرماتے ہیں کہ

ایکدم دی ہوئی تین طلاقوں سے ایک ہی واقع ہوتی ہے، یہ سوائے ابن تیمیہ حنبلی کے اور کسی نے بھی نہیں کہا ہے اور ابن تیمیہ کی خود اس مذھب کے اماموں نے تردید کردی، علماء فرماتے ہیں کہ ابن تیمیہ گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے، جاء الباطل ص ۴۵۵ ج ۱۔

الجواب

اولاً۔ پہلے تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ ایکدم تین طلاقوں کو ایک قرار دینے میں امام ابن تیمیہ منفرد نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے دلائل کے علاوہ ایک جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنھم تابعین عظام اور فقہائے دین امام ابن تیمیہ کے ساتھ ہیں۔

ثانیاً۔ امام ابن تیمیہ کو گمراہ و بے دین کہنے والے خود جاہل اور دینی علوم سے کورے چٹے ہیں جو ایک مومن و موحد کی تکفیر کر کے بموجب فرمان نبوی مکفر کی طرف کفر لوٹ گیا ہے، حنفی علماء سے معذرت سے عرض ہے کہ معاصرانہ چشمک سے کون محفوظ رہا ہے اگر اعتبار نہ ہو تو، تاریخ بغداد کی جلد ۱۳، میں امام ابو حنیفہ کے متعلق ان کے معاصرین کی آراء کو پڑھ لیجئے گا۔

ثالثاً۔ اصول فقہ حنفیہ میں صاف لکھا ہے کہ دلائل شرعی چار ہیں (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) اجماع امت (۴) قیاس شرعی، اس سے واضح ہے کہ احناف کے نزدیک بھی جمھور کوئی شرعی دلیل نہیں، مگر افسوس کہ مفتی صاحب جان بوجھ کر غلط بیانی کرتے ہوئے کوئی شرم و عار محسوس نہیں کر رہے کہ جمھور کو بھی دلیل شرعی باور کرا رہے ہیں پھر دلیل بھی ایسی کہ جس کے مخالف کو گمراہ باور کرا رہے ہیں۔

ہم نو نقد نہ تیرا ادھار کے تحت یہاں پر چند ایسے مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں جو فقہ حنفی کے جمھور امت کیخلاف ہیں، امید ہے کہ اس آئینہ میں علمائے بریلویہ اپنا منہ دیکھ کر مناسب اظہار خیال فرمائیں گے، ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

(۱) جانور کو ادھار لینا

حضرت ابی رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ استسلف من رجل بكرا.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے جوان اونٹ ادھار لیا۔

صحیح مسلم ص ۳۰، ج ۲ و مشکوٰۃ ص ۲۵۱، و نسائی ص ۲۱۹ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جانور کو ادھار لیا جاسکتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک جانور کو ادھار لینا جائز نہیں (قدوری ۰۰)، حالانکہ امت مرحومہ کے جمھور علماء کا فتوی جواز کا ہے، امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں،

مذهب الشافعي و مالك وجماهير العلماء من السلف والخلف انه يجوز قرض جميع الحيوان و مذهب ابى حنيفة انه لايجوز قرض من الحيوان و هذا الاحاديث ترد عليهم، ملخصاً شرح صحيح مسلم. ص ۳۰ ج ۲،

ملا علی القاری حنفی مشکوٰۃ کی شرح میں تحریر کرتے ہیں کہ

وفيه جواز اقراض الحيوانات كلها وهو مذهب مالك والشافعي وجماهير العلماء من الخلف و السلف و مذهب ابى حنيفهة انه لايجوز والا حاديث الصحيحة ترد عليه، مرقاة ص ۹۹ ج ۶.

خلاصہ ان عبارات کا یہ ہے کہ

یعنی امام شافعی امام مالک اور جمھور علماء سلف و خلف کا یہ مذھب ہے کہ تمام جانوروں کو ادھار لینا جائز ہے، لیکن امام ابو حنیفہ کا یہ مؤقف ہے کہ جانوروں میں سے کسی کا بھی ادھار لینا جائز نہیں اور یہ احادیث صحیحہ ان کے مؤقف و مذھب کی تردید کرتی ہیں۔

یہی بات علامہ شوکانی نے، نیل الاوطار ص ۲۴۴ ج ۵ میں کہی ہے۔

(۲) جانور کو کمی و بیشی سے فروخت کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

جاء عبد فبایع النبی ﷺ علی الھجرۃ و لم یشعرانه عبد فجاء سیده یریده فقال له النبی ﷺ بعنیه فاشتراه بعبدین اسودین ثم لم یبایع احداً بعدهٗ حتی یساله اعبد ھو.

یعنی ایک غلام نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ علیہ السلام کے ہاتھ پر ہجرت کی بیعت کی، اور آپ ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ یہ غلام ہے، پھر اس کا مالک آیا جس کی خواہش تھی کہ وہ اسے لے جائے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اسے میرے ہاتھ فروخت کردے، چنانچہ آپ علیہ السلام نے دو کالے غلام دیکر اسے خرید لیا اس کے بعد آپ ﷺ کسی سے بیعت نہ لیتے تھے جب تک یہ معلوم نہ کر لیتے کہ یہ غلام ہے (یا آزاد) صحیح مسلم ص۳۰ ج۲، و نسائی ص۲۲۰ ج۲، و ترمذی مع تحفہ ص۲۳۹ ج۲۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں،

(۱) نبی ﷺ عالم الغیب نہ تھے جس کی وجہ سے آپنے غلام کو آزاد جان کر اسکی بیعت قبول فرمائی اور بعد میں دریافت کر کے بیعت لیتے رہے۔

(۲) کسی جاندار کو کمی و بیشی کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا ہے، کسی جانور کو کمی و بیشی سے فروخت کرنے کے جواز کا مذہب و مؤقف جمہور امت کا ہے مگر امام ابو حنیفہ نے اس کی مخالفت کی ہے، امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں،

فان باع عبدا بعبدین او بعیرا بعیرین الی اجل فمذھب الشافعی والجمھور جوازه وقال ابو حنیفة والکوفیون لایجوز.

یعنی اگر ایک غلام کو دو غلاموں کے عوض یا ایک اونٹ کو دو انٹوں کے بدلے، مدت مقرر کر کے فروخت کرے، تو امام شافعی اور جمھور علماء کے نزدیک جائز ہے اور امام ابو حنیفہ اور کوفی علماء کے نزدیک ناجائز ہے، شرح صحیح مسلم ص۳۱ ج۲۔

(۳) مال کی تیسرے حصہ سے زیادہ کی وصیت کرنا

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

عادنی رسول الله ﷺ فی حجة الوداع من وجع اشفیت منه علی الموت قلت یا رسول الله ﷺ بلغ بی ماتری من الوجع وانا ذومال ولا یرثنی الا ابنة لی واحدة افا تصدق بثلثی مالی قال لا،قلت افا تصدق بشطره قال لا الثلث و الثلث کثیر .الحدیث

یعنی رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر میری عیادت کیلئے تشریف لائے، اور میں ایسی درد میں مبتلا تھا کہ موت کے قریب ہوگیا تھا، میں نے عرض کی کہ مجھے جیسا درد ہے وہ آپ علیہ السلام جانتے ہیں، اور میں مال دار آدمی ہوں جبکہ میرا وارث سوائے ایک بیٹی کے اور کوئی نہیں ہے،

تو کیا میں اپنا دو تہائی مال خیرات کردوں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں! میں نے عرض کی آدھا خیرات کردوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، صرف تیسرا حصہ ہی صدقہ کر دو اور یہی کافی ہے۔

بخاری ص۱۷۳ ج۱، وص۳۸۳ وص۵۶۰ وص۶۶۲ وص۸۰۶ وص۸۴۵ وص۸۴۶ وص۹۴۳ و ص۹۹۷ صحیح مسلم ص۳۹ ج۲۔ واللفظ لہ۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت کرنی جائز نہیں، مگر حنفیہ کے نزدیک اگر وارث نہ ہو تو تب تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت کرنی جائز ہے، حالانکہ یہ مؤقف جمہور امت کے خلاف ہے، امام نووی فرماتے ہیں

فمذهبنا و مذهب الجمهور انه لایصح وصیته فیمازاد علی الثلث و جوزه ابو حنیفة و اصحابه.

یعنی ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تیسرے حصہ مال سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں، جبکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اس کو جائز بتاتے ہیں،

شرح صحیح مسلم ص۳۹ ج۲ حافظ ابن حجر نے، فتح الباری ص۲۸۴ ج۵ میں اور علامہ شوکانی نے، نیل الاوطار ص۴۲ ج۶۔ میں یہی مؤقف جمہور کا بیان کرکے حنیفہ کو ان کا مخالف لکھا ہے۔

(۴) آقا لونڈی پر حد قائم کرسکتا ہے

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ سئل عن الامة اذا زنت ولم تحصن قال ان زنت فاجلدوها ثم ان زنت فاجلدوها ثم ان زنت فاجلدوها ثم بیعوها ولو بضفیر.

یعنی رسول اللہ ﷺ سے اس باندی کے متعلق سوال ہوا جو کہ محضہ نہیں، اور زنا کرے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، پھر اسے فروخت کردو خواہ قیمت میں ایک رسی ہی آئے، بخاری ص۱۰۱۱ ج۲، ومسلم ص۷۰ ج۲، وموطا امام مالک ص۶۸۷، ومسند احمد ص۱۱۷ ج۴، وبیھقی ص۲۴۳ ج۸، وابو دوٗد (۴۴۶۹) یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آقا اپنی لونڈی پر حد قائم کرسکتا ہے،اور یہ جمہور علماء کا مذھب ہے، چنانچہ ملا علی القاری الحنفی امام نووی سے نقل کرتے ہیں، کہ

فیه دلیل علی ان السید یقیم الحد علیهما (ای الاماء والعبد) و هذا مذهبنا و مذهب مالک و احمد و جماهیر العلماء ومن الصحابة و التابعین فمن بعدهم وقال ابو حنیفة لیس له ذلک.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ آقا اپنے غلام اور لونڈی پر حد قائم کرے اور یہی مذھب ہمارا، امام مالک، امام احمد، اور جمھور علماء صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے علماء کرام کا ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک آقا اپنی لونڈی پر حد قائم کرنے کا مجاز نہیں ملخصاً، مرقاۃ ص۱۳۸ ج۷۔

نوٹ۔ امام نووی کی عبارت شرح مسلم ص۷۰ ج۲، میں دیکھی جاسکتی ہے، مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی فرماتے ہیں کہ

اذا زنت فاجلدوها ظاهر الحدیث ان الخطاب الی الملاک فیفید جواز اقامة السید علی عبده وامته الحدوبه قال مالک والشافعی و احمد و الجمهور من الصحابة و التابعین و من بعدهم خلافا للحنفیة.

یعنی جب زنا کرے تو کوڑے لگاؤ، ان الفاظ میں ظاہراً لونڈی کے آقا کو خطاب ہے اور یہ الفاظ اس چیز کا فائدہ دیتے ہیں کہ آقا اپنے غلام اور لونڈی پر حد قائم کرے، اور یہ قول ہے امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمھور صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے علماء کا ہے حنفیہ کے خلاف،

التعلیق الممجد ص ۳۰۹۔

(۲) گھر میں اعتکاف

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے کہ

ولا تباشروهن و انتم عكفون فى المسٰجد. (البقره ۱۸۷)

اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو۔ (ترجمہ احمد رضا خاں)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد شرط ہے اور اس سلسلہ میں صحیح حدیث مرفوع بھی مروی ہے کہ

ولا اعتكاف الا فى مسجد جامع، یعنی اعتکاف نہیں مگر مسجد میں،

سنن ابو داؤد ص ۳۳۵ ج ۱، وسنن دار قطنی ص ۲۰۱ ج ۲، وبیھقی ص ۳۱۵ ج ۴۔

لیکن اس کے برعکس حنفیہ کا مؤقف یہ ہے کہ عورت گھر میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے، اور یہ جمھور امت کے تعامل کے خلاف ہے،

امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

وهذا الذى ذكرنا من اختصاصه بالمسجد وانه لايصح فى غيره هو مذهب مالك و الشافعى و احمد و الجمهور سواء الرجل والمرأة و قال ابو حنيفة يصح اعتكاف المرأة فى مسجد بيتها و هو المواضع المهياء من بيتها لصلوتها قال ولا يجوز للرجل فى مسجد بيته.

یعنی جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد ضروری ہے اور مسجد کے علاوہ اور کسی جگہ اعتکاف صحیح نہیں، یہ مذھب ہے امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمھور علماء کا ہے، معتکف

خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ان سب کے خلاف امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ عورت کیلئے گھر کی مسجد میں اعتکاف بیٹھنا درست ہے، لیکن مرد کیلئے جائز نہیں اور گھر کی مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جسے نماز کیلئے تیار کیا گیا ہو،

شرح صحیح مسلم ص۳۷۱ ج۱۔

• مولانا فخر الحسن حنفی دیو بندی نے بھی، حاشیہ سنن ابی داؤد ص۳۳۵ ج۱، میں اس عبارت کو نقل کر کے اقرار کیا ہے کہ جمھور علماء کا یہی مذھب و مؤقف ہے کہ اعتکاف کیلئے مسجد جامع شرط ہے معتکف خواہ مرد ہو یا عورت۔

(۷) اشعار بدن

حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ

فتلت قلائد بدن النبی ﷺ بیدی ثم قلدھا و اشعرھا واھداھا وما حرم علیه شی کانَ احل له.

یعنی نبی ﷺ کے اونٹوں کیلئے میں نے اپنے ہاتھ سے ہار بٹے پھر آپ علیہ السلام نے ان کے گلوں میں ڈالے، ان کو زخمی کیا اور ان کو ھدی بنا کر مکہ کی طرف بھیجا، آپ علیہ السلام پر کوئی چیز حرام نہ ہوئی جو آپ کیلئے حلال کی گئی تھی،

بخاری ص۲۳۰ ج۱، ومسلم ص۴۲۵ ج۱۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

صلی رسول الله ﷺ الظھر بذی الحلیفة ثم دعا بناقته فاشعرھا فی صفحة سنا مھا الایمن و سلت الدم و قلدھا نعلین ثم رکب راحلته فلما استوت به علی البیداء اھل الحج.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ذی الحلیفہ میں ظہر کی نماز پڑھی پھر اپنی اونٹنی منگوائی اس کے دائیں کوہان کے کنارے پر زخم کیا، اس کا خون صاف کیا اور دو جوتوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا پھر اس پر سوار ہوئے جب وہ آپ علیہ السلام کو مقام بیداء میں لے آئی تو آپ نے حج کی لبیک کہی،

صحیح مسلم ص ۴۰۷ ج ۱۔

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ اشعار بدن (اونٹ کو زخمی کرنا) سنت خیر الانام ﷺ ہے، اور جمھور امت اس کو مسنون جان کر اس پر عامل ہے مگر امام ابو حنیفہ اس کو بدعت کہتے ہیں۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ

ففی هذا الحديث استحباب الاشعار والتقليد فی الهدٰيا من الابل و بهذا قال جماهير العلماء من السلف و الخلف و قال ابو حنيفة الا شعار بدعة لانه مثلة وهذا يخالف الاحاديث الصحيحة المشهورة فی الاشعار.

یعنی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اشعار اور قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کی گردنوں میں جوتوں کا ہار ڈالنا مستحب ہے اور یہ جمھور علماء سلف و خلف کا مؤقف ہے لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اشعار بدعت ہے کیونکہ یہ مثلہ کی ایک قسم ہے، شرح صحیح مسلم ص ۴۰۷ ج ۱۔

اس طرح حافظ ابن حجر نے، فتح الباری ص ۴۲۸ ج ۳، میں اشعار بدن کو جمھور کا مذھب بتا کر ابوحنیفہ سے اس کے خلاف نقل کیا ہے۔

(۸) کافر حرمین شریفین میں جا سکتا ہے

یایھاالذین اٰمنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا، الایہ. سورۃ توبہ آیت ۲۸.

اے ایمان والوں مشرک نرے ناپاک ہیں تو اس برس کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔ (احمد رضا خان)۔

یہ آیت قرآنی اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی مشرک حرمین شریفین میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہ مذہب جمھور علمائے اسلام کا ہے، اس بارے میں صحیح حدیث مرفوع بھی مروی ہے چنانچہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ۔

بعثنی ابو بکر رضی اللہ عنہ فی الحجة التی امرہ النبی ﷺ علیھا قبل حجة الوداع یوم النحرفی رھط امرہ ان یوذن فی الناس الا لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوفن بالبیت عریان، بخاری ص ۲۲۰ ج ۱ ومسلم ص ۴۳۵ ج ۱ و بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۲۷ باب دخول مکة و الطواف. واللفظ لہ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حج کے موقعہ پر جس میں انکو نبی ﷺ نے امیر بنا کر بھیجا تھا اور یہ حجۃ الوادع کے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے، مجھے قربانی کے دن ایک جماعت میں بھیجا کہ اس بات کا اعلان کرو کہ خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگا خانہ کعبہ کا طواف کرے (انتھی)

لیکن قرآن کی آیت حدیث نبوی اور جمھور امت کے برعکس امام صاحب کا قول ہے کہ ذمی حرم میں داخل ہو سکتا ہے امام نووی جمھور کا مسلک بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

فلا یجوز تمکین کافرمن دخولہ بحال فان دخلہ فی خفیة وجب اخراجہ فان مات و دفن فیہ نبش و اخرج مالم یتغیر ھذا مذھب الشافعی و جماھیر الفقھاء وجوز ابوحنیفة دخولھم الحرم.

شرح صحیح مسلم ص ۴۳ ج ۲.

کسی حالت میں بھی کافر کو حرم میں داخل ہونے کے قابل بنانا جائز نہیں اگر وہ خفیہ طریقہ سے داخل ہو جائے تو اس کا اخراج واجب ہے اگر وہ داخل ہونے کے بعد (حدود حرم میں) مرجائے اور وہیں دفن کر دیا گیا ہو تو اس کی قبر کو اکھاڑ کر نکال دیا جائے بشرط کہ لاش متغیر نہ ہوئی ہو یہ امام شافعی اور جمہور علماء کا مذھب ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے حرم میں کفار کا داخلہ جائز قرار دیا ہے۔

(۹) خونِ مسلم کی بے قدری

حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ

الا لا يقتل المؤمن بكافر. الحديث

یعنی خبردار مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے گا۔

ابو داؤد ص ۲۶۷ ج ۲، و مسند امام احمد ص ۱۲۲ ج ۱، ونسائی ص ۲۳۶ ج ۲، ابن ماجہ ص ۱۹۵، و ترمذی مع تحفہ ص ۳۱۲ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے اور یہ مسلک ہے جمہور فقہاء اسلام کا لیکن حنفیہ نے اس میں حدیث نبوی اور جمہور کی مخالفت کی ہے،

چنانچہ امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

وقد يستدل به اصحاب ابی حنيفة فی قولهم يقتل المسلم بالذمی و يقتل الحربالعبد و جمهور العلماء علی خلافه منهم مالک والشافعی والليث وا حمد. شرح صحيح مسلم ص ۵۹ و ۶۰ ج ۲.

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

واما ترک قتل المسلم بالكافر فاخذبه الجمهور.......... وخالف الحنفية فقالوا يقتل المسلم بالذمی. فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۱۲.

ان عبارات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا امام ابوحنیفہ کا کہنا ہے کہ ذمی کے بدلہ میں مومن قتل کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) ایک گواہی اور قسم سے فیصلہ کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ قضی بیمین و شاهد.

یعنی رسول اللہ نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کیا۔

مسلم ص۷۴ج۲، و بیہقی ص۱۶۷ج۱۰، و ابوداؤد ص۱۵۲ج۲۔

نوٹ۔ یہ حدیث تقریباً بیس صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مروی ہے، جیسا کہ علامہ ابن جوزی نے ''التحقیق'' میں ان کو ذکر کیا ہے،

تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ ص۱۲۶ج۳۔

الغرض ان احادیث صحیحہ کا واضح مفاد یہ ہے کہ اگر مدعی اثبات دعوی پر دو گواہ پیش نہ کر سکے تو ایک قسم اور گواہی پر دعوی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور یہ مذہب جمہور علمائے اسلام کا ہے جیسا کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ،

قال ابو حنيفة والكوفيون.......... لا يحكم بشاهد و يمين فی شئی من الاحكام وقال جمهور علماء الاسلام من الصحابة و التابعين و من بعد هم من علماء الامصار يقضی بشاهد و يمين المدعی فی الاموال وما يقصد به الا موال وبه قال ابو بكر الصديق و علی و عمر بن عبدالعزيزو مالك والشافعی واحمد و فقهاء المدينةو سائر علماء الحجاز و معظم علماء الامصار.

امام ابوحنیفہ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء نے کہا ہے کہ ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ فیصلہ نہ کیا جائے لیکن جمھور علماء اسلام صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے علماء امصار کا مسلک یہ ہے کہ مالی معاملات یا جن سے اموال مقصود ہوں ان میں ایک گواہ اور مدعی کی قسم سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے اس مؤقف کے قائل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام مالکؒ شافعیؒ امام احمدؒ اور فقہائے مدینہ اور حجاز کے تمام علماء بلکہ اردگرد کے علماء کی ایک بڑی جماعت شامل ہے، شرح صحیح مسلم ص۷۴ج۲۔

علامہ ابن عبدالبر موطاامام مالک کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

و ممن روی عنه القضاء باليمين مع الشاهد منصوصامن الصحابة، ابو بكر رضی الله عنه، و عثمان رضی الله عنه و علی رضی الله عنه و ابی بن كعب رضی الله عنه و عبدالله بن عمر،وان كان فی الا سانيد عنهم ضعف فانا لم نذكرهم علی سبيل الحجة لان الحجةقد لزمت بالسنة الثابتة ولا تحتاج السنة الیٰ من يتا بعهالان من خالفها محجوج بهاولم يات عن احدمن الصحابة انه انكر اليمين مع الشاهد بل جاء عنهم القول به و علی القول به جمهور التابعين بالمدينة سعيد بن المسيب و وابوسلمة بن عبدالرحمن و،القاسم بن محمد وعروة و سالم و ابو بكر بن عبدالرحمن و عبيدالله بن عبدالله و خارجة بن زيد و سلمان بن يسار و علی بن حسين و ابو جعفر محمد بن علی و ابو الزناد و عمر بن عبدالعزيز، و به قال مالک و اصحابه و الشافعی و اتباعه و احمد بن حنبل و اسحاق بن راهوية و ابو ثور و داؤد بن علی و جماعته اهل الاثر هوالذی لايجوز عندی خلافه التواتر الاثار به عن النبی ﷺ و عمل اهل المدينة به قرنا بعد قرن،

التهميد لما فی الموطامن المعانی والا سانيد ص ۱۵۳ تا۱۵۴ ج ۲.

اور جن سے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کرنا مروی ہے ان میں حضرت ابو بکرصدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمرفاروق، رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، شامل ہیں، اگر چہ ان میں بعض کی اسناد میں ضعف ہے لیکن ہم نے ان کو بطور دلیل نقل نہیں کیا کیونکہ دلیل تو سنت ثابتہ ہے اور وہ (سنت) کسی کی متابعت کی محتاج نہیں کیونکہ جس نے بھی اس کی مخالفت کی ہے وہ دلیل و حجت سے مغلوب ہے، اور کسی ایک بھی صحابی سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس نے قضا بالیمین سے انکار کیا ہو بلکہ تمام صحابہ سے اس کے موافق ہی قول منقول ہے اور یہی قول ہے مدینہ طیبہ کے جمھور تابعین کا جن میں سے امام سعید بن میسّب ،امام ابوسلمہ عبدالرحمٰن، امام قاسم بن محمد، امام عروہ بن الزبیر، امام سالم،

امام ابو بکر بن عبدالرحمٰن، امام عبید اللہ بن عبداللہ، امام خارجہ بن زید امام سالم، امام سلمان بن یسار، امام علی بن حسین، امام ابو جعفر، امام ابو زناد، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز، رحمھم اللہ اجمعین وغیرہ ہیں اور یہی کہا ہے امام مالک اور ان کے تلامذہ امام شافعی اور ان کے متبعین نے امام احمد بن حنبل امام اسحاق بن راھویہ امام ابوعبیدہ امام ابو ثور امام داؤد بن علی اور جماعت اہل حدیث نے، اور میرے نزدیک اس کی مخالفت جائز نہیں نبی علیہ السلام سے متواتر آثار اور عمل اہل مدینہ اور قرن بعد قرن عامۃ المسلمین کے عمل کی وجہ سے۔

علامہ محمد بن اسماعیل امیر محدث یمنی بلوغ المرام کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

والحديث دليل على أنه يثبت القضاء بشاهدو يمين واليه ذهب جما هير من الصحابة و التابعين وغير هم وهومذهب فقهاء المدينة السبعة والهادوية و مالك و الشافعي. سبل السلام ص ۱۴۸۲ ج۴.

یعنی یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ ایک گواہ اور قسم سے دعوی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اوراس طرف جمھور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم تابعین عظام گئے ہیں اور یہی مذہب ہے مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ اور ھادویہ اور امام مالک و شافعی کا (انتھی)

(۱۱) کیا کتے کے جوٹھے برتن کو تین بار دھونا ہی کافی ہے؟

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ قال اذا شرب الكلب في إناء احدكم فليغسله سبعاً. بخاری ص ۲۹ ج ۱، و مسلم ص ۱۳۷ ج ۱، و موطا امام مالک ص ۲۲، و بیهقی ص ۲۴۰ ج ۱.

مفتی صاحب نے اس حدیث کا حسب ذیل معنی کیا ہے کہ

فرمایا نبی علیہ السلام نے کہ جب برتن میں کتا چاٹ جائے تو سات بار دھویا جائے۔ جاء الباطل ص ۲۲۳ ج ۲۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کتے کے جوٹھے برتن کو سات بار دھونا ضروری ہے اور جمھور علماء اسلام کا یہ مذھب ہے چنانچہ علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

و فيه وجوب غسل نجاسة ولوغ الكلب سبع مرات و هذا مذهبنا و مذهب مالك و احمد و الجماهير و قال ابو حنيفة يكفي غسله ثلٰث مرات. شرح مسلم ص۱۳۷ ج۱.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ کتے کے جوٹھے برتن کو سات بار دھونا واجب ہے اور یہ مذھب ہمارا ہے اور امام مالک امام احمد اور جمھور کا، لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا ہی کافی ہے (انتھی)

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ

فاما اكثر اهل علم من الصحابة والتابعين و من بعدهم من فقهاء المسلمين فانهم يقولون ان الانا يغسل من ولوغ الكلب سبع مرات بالماء و ممن روى ذلك عنه بالطرق الصحاح ابو هريرة رضى الله عنه و ابن عباس رضى الله عنه و عروة بن الزبير و محمد بن سيرين و طاوس و عمرو ابن دينار و به قال مالك والا وزاعي والشافعي و احمد و اسحاق و ابو ثور و ابو عبيد و داؤد.

التمهيد لما في الموطا من المعاني والا سانيد ص۲۶۸ ج۱۸ .

زیادہ اہل علم صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے فقہاء اسلام کا یہ کہنا ہے کہ جب برتن سے کتا چاٹ جائے تو اسے سات بار دھونا چاہیے اور جن میں سے صحیح سند کے ساتھ یہ فتویٰ منقول ہے ان میں سے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور امام محمد بن سیرین امام طاؤس امام عمروبن دینارؒ اور یہی کہا ہے امام مالکؒ امام اوزاعیؒ امام شافعیؒ امام احمدؒ امام اسحاقؒ، امام ابو ثورؒ امام ابو عبیدہ اور امام داؤدؒ وغیرہ نے (انتھی)۔

(۱۲) نکاح کے بغیر بیوی

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ حاکم کا فیصلہ ظاہر و باطن نافذ ہوجاتا ہے مثال کے طور پر اگر زینب نے بکر پر جھوٹا دعوی دائر کردیا کہ اس نے میرے ساتھ شادی کی تھی اور اس پر جھوٹی گواہی بھی ہوگئی اور بظاہر گواہی کو دیکھ کر قاضی نے زینب کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اب اس عورت کو اس مرد کے ساتھ رہنا سہنا اور جماع کرنا جائز ہے چنانچہ ھدایہ میں ہے کہ

من ادعت عليه امراة انه تزوجها و اقامت بينة فجعلها القاضى امراته ولم يكن تزوجها وسعها المقام معه وان تدعه يجا معها.

هداية مع شرح فتح القدير ص ۱۵۴ ج ۳.

یعنی کسی عورت نے کسی مرد پر یہ دعوی کیا کہ اس نے اس سے نکاح کیا ہے اور گواہ بھی گزار دیئے جج نے فیصلہ دے دیا کہ یہ اس مرد کی عورت ہے اگر واقع میں بھی نکاح نہیں ہوا، تاہم اس عورت کو اس مرد کے ساتھ رہنا سہنا اور اس سے جماع کرنا جائز اور درست ہے۔ (انتھی)

یہ مسئلہ بھی قرآن و حدیث کے علاوہ جمھور علماء اسلام کے مؤقف کے برعکس ہے چنانچہ امام نووی شرح صحیح مسلم ص ۷۵ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ

وفى هذا الحديث دلالة لمذهب مالك والشافعى واحمد و جماهير علماء الاسلام و فقهاء الا مصار من الصحابة و التابعين فمن بعد هم ان حكم الحاكم لايحل الباطن حراما و قال ابو حنيفة يحل الحاكم الفروج.

اس حدیث میں امام شافعی امام مالک امام احمد اور جمھور علماء اسلام اور فقہاء امصار جن میں سے صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد میں آنے والے لوگوں کے مذھب کی دلیل ہے کہ حاکم (قاضی و جج) کا فیصلہ باطناً (حقیقت میں) کسی حرام چیز کو حلال نہیں کرتا ہے لیکن امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ حاکم کا فیصلہ شرمگاہوں کو بھی حلال کردیتا ہے (انتھی)

جمھور کا یہی مذھب حافظ ابن حجر نے فتح الباری ص ۱۴۹ ج ۱۳ میں بیان کیا ہے۔

جمھور علماء کی مخالفت کے علاوہ یہ تو صحیح حدیث نبوی کے بھی خلاف ہے چنانچہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنھا راویہ ہیں کہ

عن رسول الله ﷺ انه سمع خصومة بباب حجرته فخرج اليهم فقال انما انا

بشر وانه یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انه قدصدق و اقضی له بذلک فمن قضیت له بحق مسلم فانما ھی قطعة من النار فلیا خذھا او فلیتر کھا.

بخاری ص ۳۳۲ ج ا و ص ۱۰۶۴ ج ۲، و مسلم ص ۷۵ ج ۲.

نبی ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑنے کی آواز سنی تو آپ علیہ السلام باہر تشریف لے گئے اور فرمایا میں بھی بشر ہوں میرے پاس ایک مقدمہ آتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے تم میں سے کسی کی تقریر دوسرے سے عمدہ ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ سچا ہے اس کے موافق فیصلہ کر دیتا ہوں پھر جس کسی کو میں ظاہری روداد پر بھروسا کر کے دوسرے مسلمان کا حق دلا دوں وہ اس کو لے! یا چھوڑ دے (اسے اختیار ہے) میں اسے درحقیقت جہنم کا ایک ٹکڑا دلا رہا ہوں (انتھی)

اس حدیث سے تین باتیں واضح ہیں،

اولاً۔ قاضی کا فیصلہ کسی حرام چیز کو حلال نہیں کر دیتا ورنہ نبی ﷺ یہ نہ فرماتے کہ میرے فیصلہ کے بعد جو اسے ملتا ہے وہ جہنم کا ٹکڑا ہے۔

ثانیاً۔ نبی ﷺ نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔

ثالثاً۔ آپ علیہ السلام عالم الغیب اور ما کان و ما یکون کا علم نہیں رکھتے تھے۔

(۱۳) بیع اختیار کا مسئلہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال النبی ﷺ ان المتبایعین بالخیار فی بیعھما مالم یتفرقا، الحدیث، بخاری ص ۲۸۳ ج ا، و مسلم ص ۶ ج ۲.

نبی ﷺ نے فرمایا کہ بائع و مشتری جب تک جدا نہ ہوں اپنی بیع میں اختیار رکھتے ہیں۔ (انتھی)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بائع و مشتری کو جدا ہونے سے پہلے فسخ کا اختیار ہے اور یہ مذھب جمھور علماء اسلام کا ہے جب کہ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ زبان کے ساتھ محض قول و اقرار ہو

جانے کے بعد نسخ کا اختیار نہیں رہتا چنانچہ علامہ نووی شرح صحیح ص۶ ج۲ میں فرماتے ہیں کہ

هذا الحديث دليل لثبوت خيار المجلس لكل واحد من المتبايعين بعد انعقاد البيع حتى يتفرقا من ذلك المجلس بابدانهما و بهذا قال جماهير العلماء من الصحابة والتابعين و من بعد هم و ممن قال به على بن ابى طالب و ابن عمر و ابن عباس و ابو هريرة وابو برزة الاسلمى رضى الله عنهم وطاوس و سعيد بن المسيب و عطاء و شريح القاضى والحسن البصرى والشعبى والزهرى والاوزاعى وابن ابى ذئب و سفيان بن عيينةوالشافعى وابن المبارك و على بن المدينى و احمد بن حنبل و اسحاق بن راهويه وابو ثور والبخارى و سائر المحدثين و اٰخرون الى عن قال و قال ابو حنيفة لايثبت خيار المجلس.

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بائع ومشتری کو اپنی بیع منسوخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں، جمھور علماء صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے اہل علم کا یہی مذھب ہے اور اس مذھب کے قائلین میں سے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ابو برزہ رضی اللہ عنہ (تابعین سے) امام طاؤس امام سعیدؒ بن میبّب امام عطاء قاضی شریحؒ امام حسن، بصری امام شعبی امام زھری امام اوزاعیؒ امام ابن ابی ذئبؒ امام سفیانؒ امام شافعیؒ امام عبداللہ بن المبارکؒ امام علی مدینی امام احمد بن حنبلؒ امام اسحاق بن راھویہؒ امام ابو ثورؒ اور امام بخاریؒ ان کے علاوہ تمام محدثین وغیرھم ہیں جبکہ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ کا کہنا ہے کہ بیع میں خیار ثابت نہیں ہے۔

امام ابن عبدالبر نے اس سے چند نام زیادہ شمار کیئے ہیں،

امام عبداللہ بن حسنؒ امام ابو عیینہ امام داؤدؒ امام طبریؒ امام معمرؒ امام مسلمؒ بن خالد زنجیؒ امام یحیٰ بن قطانؒ امام عبدالرحمٰن بن مھدیؒ وغیرہ، التمھید لما فی الموطا من المعانی والا سانید ص۱۵ ج۱۴۔

(۱۴) سنت الفجر کے بعد گفتگو

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتیں ہیں کہ

كان النبی ﷺ اذا صلی رکعتی الفجر فان کنت مستیقظة حدثنی الحدیث
بخاری ص ۱۵۵ ج ۱، و مسلم ص ۲۵۵ ج ۱. واللفظ للمسلم،
یعنی نبی ﷺ جب سنت الفجر ادا فرمالیتے تو اگر میں جاگتی ہوتی تو مجھ سے باتیں کرتے۔
الحدیث

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سنت الفجر کے بعد انسان گفتگو کر سکتا ہے اور یہ مذھب جمھور علماء اسلام کا ہے چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ

فیه دلیل علی اباحة الکلام بعد سنة الفجر وھو مذھبنا و مذھب مالک و الجمھور وکرھه الکوفیون، (المنھاج شرح صحیح مسلم بن حجاج ص ۲۵۵ ج ۱).

اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت الفجر کے بعد کلام کرنا جائز ہے اور یہ مذھب ہمارا امام مالک اور جمھور علماء اسلام کا ہے جبکہ کوفیوں کا کہنا ہے کہ کلام کرنا مکروہ ہے۔

(۱۵) نماز صبح میں اگر سورج طلوع ہوگیا

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

قال رسول الله ﷺ اذا ادرک احدکم سجدة من صلوة العصر قبل ان تغرب الشمس فلیتم صلاته واذا ادرک سجدة من صلوة الصبح قبل ان تطلع الشمس فلیتم صلاته. بخاری ص ۷۹ ج ۱، و مسلم ص ۲۲۱ ج ۱.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز عصر کی ایک رکعت سورج غروب ہونے سے پہلے پالی وہ (نماز عصر) کو پورا کرے اور جس نے صبح کی نماز میں ایک رکعت سورج طلوع ہونے سے پہلے پالی وہ (صبح کی نماز) پوری کرے۔ (انتھی)

یہ حدیث اس بات کی دلیل واضح ہے کہ اگر صبح کی نماز پڑھتے ہوئے سورج طلوع ہوجائے تو نمازی بقیہ نماز پوری کر لے اور اس کی نماز ہوجائے گی مگر حنفی فقہ میں کہا گیا ہے کہ اگر نماز کی حالت میں سورج طلوع ہوا تو نماز باطل ہوجائے گی اسکا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے پھر سب سے افسوسناک

بات تو یہ ہے کہ حنفی مذکورہ حدیث کے نصف حصے پر ایمان و یقین رکھتے ہیں کہ اگر ایک رکعت نماز عصر ادا کی تھی کہ سورج غروب ہوگیا تو اب نمازی اپنی نماز کو پورا کرے اوراس کی نماز ہوجائے گی! مگر حدیث کے اگلے حصہ پر تقلیدی آری چلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر صبح کی نماز میں سورج طلوع ہوگیا تو نماز باطل ہوجائے گی! یہ مؤقف مذکورہ حدیث کی مخالفت کو ہی مستلزم نہیں بلکہ جمہور امت مرحومہ کے خلاف بھی ہے چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

ھذا دلیل صریح فی ان من صلی رکعة من الصبح او العصر ثم خرج الوقت قبل سلامه لاتبطل صلاته بل یتمها وھی صحیحة و ھذا مجمع علیه فی العصر واما فی الصبح فقال به مالک و الشافعی و احمد و العلماء کافة الا ابا حنیفة رضی الله عنه فانه قال تبطل صلاة الصبح بطلوع الشمس فیها لانه دخل وقت النھی عن الصلوٰة بخلاف غروب الشمس و الحدیث حجة علیه. شرح مسلم ص ۲۲۲ ج ۱.

اس حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ میں دلیل ہے کہ جس نے صبح وعصر کی نماز سے ایک رکعت پڑھ لی تھی کہ پھر نماز کا وقت ختم ہوگیا نمازی کے سلام پھیرنے سے پہلے تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی بلکہ وہ اپنی نماز کو پورا کرلے اور یہی بات درست ہے، اور نماز عصر کے باطل نہ ہونے پر علماء کا اجماع ہے لیکن صبح کی نماز کے متعلق امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل اور دیگر تمام علماء نے کہاہے کہ نماز ہوجائے گی مگر امام ابو حنیفہؒ (اللہ تعالی ان سے راضی ہو) کا کہنا ہے کہ صبح کی نماز باطل ہوجائے گی سورج طلوع ہونے کی وجہ سے کیونکہ نماز کا ممنوع وقت داخل ہوگیا ہے، بخلاف نماز عصر کے، اور یہ حدیث ان پر حجت ہے۔ (انتھی)

مولانا عبیداللہ رحمانیؒ فرماتے ہیں کہ

والحدیث یدل علی أن من أدرک رکعة من صلاة الصبح قبل طلوع الشمس فقد ادرک صلاة الصبح ولا تبطل بطلوعها کما أن من أدرک رکعة من صلاة العصر قبل غروب الشمس فقد أدرک صلاة العصر ولا تبطل بغروبها، و به قال

مالک و الشافعي و احمد و اسحاق، و هوالحق و خالف ابو حنيفة هذا الحديث، فقال، من طلعت عليه الشمس و هوفی صلاة الصبح بطلت صلاته و احتج فی ذلک بالا حاديث الواردة فی النهی عن الصلوة عند طلوع الشمس، وأجيب عنه بان أحاديث النهی عامة تشمل ذوات الأسباب المتقدمة وغيره ذوات الأسباب من النوافل و الفرائض، و حديث أبی هريرة رضی الله عنه هذا خاص ليس فيه الاذكر صلاة ذات سبب متقدم فتحمل احاديث النهی علی مالا سبب له من النوافل جمعا بين الحديثين فان المجمع بالتخصيص أولی من ادعاء النسخ قاله الحافظ. (مرعاة المفاتيح ص ۳۰۹ ج ۲)

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے نماز صبح کی ایک رکعت پالی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اس نے نماز صبح کو پالیا اور سورج طلوع ہونے سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی جس طرح نماز عصر کی ایک رکعت اگر کسی نے پالی سورج غروب ہونے سے پہلے تو اس نے نماز عصر کو پالیا اور سورج غروب ہونے سے اس کی نماز باطل نہ ہوگی، اور یہی کہا ہے امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمدؒ امام اسحاقؒ نے اور یہی حق ہے اور امام ابوحنیفہ نے مخالفت کی ہے اس حدیث کی اور کہا ہے کہ کسی نمازی پر اس حالت میں سورج طلوع ہوا کہ وہ نماز میں تھا تو اس کی نماز باطل ہوگئی، اس میں انہوں نے احتجاج کیا ہے ان احادیث سے جن میں سورج طلوع ہوتے وقت نماز سے منع کیا گیا ہے اور انہیں جواب دیا گیا ہے کہ

منع کی احادیث عام ہیں جو کہ مشتمل ہیں کسی سبب اور غیر سبب سے نوافل و فرائض پر، لیکن حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ خاص ہے جس میں سبب کا ذکر ہے لہذا منع کی احادیث کو اس امر پر محمول کریں گے جس میں بلاوجہ نوافل پڑھنے کی ممانعت کا ذکر ہے دونوں احادیث میں موافقت کیلئے کیونکہ نسخ کی بجائے تخصیص اولی ہے جیسا کہ حافظ نے کہا ہے۔ (انتھی)

(۱۶) نماز استسقاء کی مشروعیت سے انکار

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان النبی ﷺ خرج الی المصلی فاستسقی فاستقبل القبلة و قلب رداء ہ وصلی رکعتین. بخاری ص ۱۳۷ ج ۱، و مسلم ص ۲۹۲ ج ۱.

یعنی نبی ﷺ طلب بارش کیلئے لوگوں کے ساتھ عید گاہ کی طرف گئے وہاں آپ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور چادر کو پلٹا اور دو رکعات نماز پڑھی۔ انتھی۔

امام بخاری نے مزید یہ الفاظ بھی روایت کیئے ہیں کہ جھر فیھما بالقراۃ۔

بخاری ص ۱۳۹ ج ۱۔

یعنی نبی ﷺ نے ان دونوں رکعات میں قراۃ بلند آواز سے کہی تھی۔

یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ طلب بارش کیلئے نماز پڑھنا سنت سے ثابت ہے لیکن امام ابو حنیفہ کا قول ہے استسقاء میں نماز نہیں ہے چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ

اما ابو حنیفةؒ فکان لایری فی الاستسقاء صلوۃ.

موطا امام محمد ص ۱۵۸.

یعنی امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ استسقاء میں نماز نہیں ہے۔

جبکہ یہ مذھب جمہور کے خلاف ہے امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ

واختلفوا فی الصلوٰۃ فی الا ستسقاء فقال ابو حنیفة لیس فی الاستسقاء صلاۃ و لکن یخرج الامام ویدعو............ و قال مالک و الشافعی و ابو یوسف و محمد و سائر فقهاء الامصار صلاۃ الاستسقاء سنة. التمهید لمافی الموطا من المعانی والاسانید ص ۱۷۲ ج ۱۷.

نماز استسقاء میں اختلاف کیا گیا ہے کہا امام ابو حنیفہؒ نے کہ استسقاء میں نماز نہیں البتہ امام باہر نکلے اور دعا کرے جبکہ امام مالکؒ امام شافعیؒ قاضی ابو یوسف امام محمد اور تمام فقہاء امصار نے کہا ہے کہ استسقاء کی نماز (پڑھنا) سنت ہے (انتھی)

مولانا عبیداللہ رحمانیؒ فرماتے ہیں کہ

فیه دلیل علی ان الصلاۃ فی الاستسقاء فی جماعة فی حالة البروز سنة و به

قال مالک و الشافعی و احمد والجمهور وھو قول ابی یوسف و محمد. مرعاة المفاتیح ص ۱۷۰ ج ۵.

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ صحرا میں جماعت کے ساتھ نماز استسقاء سنت ہے یہی امام مالک امام شافعی امام احمد اور جمہور علماء نے کہا ہے اور یہی قول ہے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

وقال سائرالعلماء من السلف والخلف الصحابة والتابعون فمن بعدھم تسن له الصلوة ولم یخالف فیه الاابو حنیفة،

شرح مسلم ص ۲۹۲ ج ۱.

تمام علماء سلف و خلف صحابہ کرام تابعین عظام اور ان کے بعد پیدا ہونے والے کہتے ہیں کہ استسقاء کی نماز مسنون ہے اس میں کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے امام ابوحنیفہؒ کے۔ (انتھی)

(۱۷) اگر نماز میں ایک رکعت زیادہ ادا کرلی جائے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

صلی النبی ﷺ الظهر خمسا فقالوا ازید فی الصلوۃقال وما ذاک قالوا صلیت خمسا قال فثنی رجله وسجد سجدتین.

بخاری ص ۵۸ ج ۱، و مسلم ص ۲۱۲ ج ۱.

نبی ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی پانچ رکعت، تو صحابہ کرام نے کہا کیا نماز میں زیادتی کی گئی ہے؟ تو آپؐ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا سبب ہے، تو صحابہ کرام نے کہا کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی ہے یہ سن کر آپ نے اپنے پاؤں موڑے (قبلہ کی طرف) اور (سہو کے) دو سجدے کیئے (انتھی)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر چوتھی رکعت پر تشھد نہ بیٹھا جائے اور انسان غلطی سے پانچویں رکعت شروع کردے تو اس کی نماز درست ہے البتہ سجدہ سہو اس پر لازم ہے اور یہ جمہور علماء کا مذھب ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک اگر پانچویں رکعت غلطی سے پڑھی گئی تو اس کی نماز باطل ہوگئی،

چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

فیه دلیل لمذهب مالک و الشافعي و احمد و الجمهور من السلف و الخلف ان من زاد فی صلوته رکعة ناسیالم تبطل صلوته............... و قال ابو حنیفة............ اذا زاد رکعة ساهیا بطلت صلوته و لزمه اعادتها. شرح مسلم ص ۲۱۲ ج ۱.

اس حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں دلیل ہے امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل اور جمھور علماء سلف و خلف کی مذھب کی کہ اگر بھول کر ایک رکعت زیادہ پڑھ لی جائے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی لیکن امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ اگر بھول کر ایک رکعت زیادہ پڑھی گئی تو اس کی نماز باطل ہوگئی اور اس پرلازم ہے کہ نماز کو لوٹائے۔ انتھی)

مولانا عبیداللہ محدثؒ مبارک پوری فرماتے ہیں کہ

ذهب الجمهور مالک والشافعي و احمد و اسحاق ابن راهویه وغیرهم الیٰ أنه اذا صلی الظهر خمسا فصلاته جائزة و سجد سجد تی السهو،وان لم یجلس فی الرابعة،والحدیث حجة لهم.

مرعاة ص ۲۰۴ ج ۳.

یعنی امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمدؒ بن حنبل امام اسحاقؒ اور جمھور علماء اسلام اس طرف گئے ہیں کہ اگر نمازی نے ظہر کی پانچ رکعت پڑھ لیں تو اس کی نماز درست ہے البتہ سجدہ سہو کریگا اگر چہ وہ چوتھی رکعت میں تشھد نہ بیٹھا ہو۔ (انتھی)

پھر لطف کی بات تو یہ ہے کہ حنفی اس حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نصف حصے پر تو ایمان لاتے ہیں اورنصف اول پر تقلیدی ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حدیث مذکورہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ کو جب سلام پھیرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے یاد دہانی کرائی کہ آپ نے چار کی بجائے پانچ رکعات پڑھی ہیں تو آپ علیہ السلام نے سجدہ سہو کیا ہے لہذا بھول کا سجدہ سلام پھیرنے کے بعد ہی کرنا چاہیے پھر مزید اپنی طرف سے متن حدیث میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتے ہیں کہ سجدہ سہو کے بعد

دوبارہ تشھد پڑھا جائے پھر سلام پھیرا جائے، حالانکہ سلام پھیر کر پھر تشھد پڑھکر سلام پھرنے کا ذکر مذکورہ حدیث میں بالکل نہیں۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی حدیث کو ترک کردیا گیا ہے جس پر جمھور امت کا تعامل تھا پھر مطلب برآری کیلئے جس حصے کو قبول کیا ہے اس میں بھی قوم موسیٰ کو مات کرگئے ہیں، حدیث کامفہوم واضح ہے کہ اگر امام نے چار کی بجائے پانچ رکعات پڑھا دی اور مقتدیوں نے سلام پھیرنے کے بعد بتایا تو امام قبلہ رخ ہوکر سجدہ سہو کرے، یہ چیز محض احتمال نہیں بلکہ اس امر کا اتفاق تو راقم الحروف کوبھی ایک آدھ بار ہوا ہے۔ وکفی باللہ شھیدا۔

(۱۸) مردہ مچھلی کا حکم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

غزونا جيش الخبط و امرعلينا ابو عبيدة فجعنا جو عا شديدا فالقى البحر حوتا ميتا لم نرمثله يقال له العنبر فاكلنا منه نصف شهر، فاخذ ابو عبيدة عظما من عظامه، فمر الراكب تحته، فلما قدمنا المدينة ذكرنا للنبيﷺ فقال، كلوا رزقا اخرجه الله، اطعمونا ان كان معكم منه، قال فارسلنا الىٰ رسول الله ﷺ منه فاكله. بخارى و مسلم بحواله مصابيح السنة ص ۱۳۴ ج ۳.

میں نے جیش خبط کے ساتھ جہاد کیا ہم پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر مقرر کیئے گئے تھے ہم کو سخت بھوک لگی سمندر نے ایک مردہ مچھلی باہر پھینکی ہم نے اس کی مانند کبھی مچھلی نہ دیکھی تھی اس کوعنبر کہا جاتا تھا، ہم نصف مہینہ تک اسے کھاتے رہے، ابو عبیدہ نے اسکی ایک ہڈی پکڑی، اونٹ سوار اس کے نیچے سے گزر گیا، جب ہم واپس آئے، تو رسول اللہ ﷺ سے ہم نے اس بات کا ذکر کیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ کھاؤ وہ اللہ تعالی نے تمھاری طرف رزق بھیجا ہے، اور اگر اس میں سے کچھ تمھارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس سے کچھ بھیجا تو آپ علیہ السلام نے اس مچھلی کو کھایا۔ بخاری ص ۶۲۶ ج ۲، ومسلم ص ۱۴۸ ج ۲۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مچھلی دریا میں بلا سبب مرجائے اس کا کھانا حلال ہے جبکہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کا کھانا حرام ہے، یہ مؤقف بھی جمہور امت کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں کہ

واما السمک الطافی وھو الذی یموت فی البحر بلا سبب فمذھبنا اباحته و به قال جماھیر العلماء من الصحابة فمن بعدھم وقال ابو حنیفةلایحل، المنھاج شرح مسلم ص۱۴۸ ج۲.

ایسی مچھلی جو دریا میں بلا سبب مرجائے اسکے بارہ میں ہمارا مذھب یہ ہے کہ اس کا کھانا مباح ہے اور جمھور علماء صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے اسی کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے وہ حلال نہیں۔ انتھیٰ)

(۱۹) کتے کو فروخت کرنا

حضرت ابی مسعود انصاری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ نھی عن ثمن الکلب و مھر البغی و حلوان الکاھن.

بخاری ص۲۹۸ ج۱، و مسلم ص۱۹ ج۲، و موطا امام مالک ص۵۹۴.

رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت زانیہ کی خرچی اور کاھن کی اجرت سے منع کیا ہے۔ (انتھیٰ)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کتے کی فروخت جائز نہیں اور یہ جمھور علماء اسلام کا مذھب ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ کتے کی فروخت کو جائز بتاتے ہیں چنانچہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ

واما النھی عن ثمن الکلب و کونه من شر الکسب و کونه خبیثا فیدل علی تحریم بیعه وانه لایصح بیعه ولا یحل ثمنه ولا قیمته علی متلفه.............. و بھذا قال جماھیر العلماء منھم ابو ھریرة رضی الله عنه والحسن البصری و ربیعة والاوزاعی و الحکم و حماد و الشافعی و احمد و داؤد وابن المنذر و غیر ھم وقال ابو حنیفة یصح بیع الکلاب التی فیھا منفعة. شرح مسلم ص۱۹ ج۲.

یعنی کتے کی قیمت وصول کرنے کی ممانعت اس کام کے بدترین فعل میں سے ہونا اور کتے کا

ایک خبیث جانور ہونا،اس کی فروخت کی حرمت پر دلالت کرتا ہے لہذا اس کا فروخت کرنا جائز نہیں اور نہ اس کی قیمت (وصول کی ہوئی استعمال میں لانا) حلال ہے اور نہ اس کی قیمت فروخت کرنے والے کیلئے جائز ہے جمھور علماء کا یہی مذھب ہے جن میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ حسن بصری امام ربیعہ امام اوزاعی امام حکم امام حماد امام شافعی امام احمد بن حنبل امام داوٗد امام ابن منذر وغیرہ شامل ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ جن کتوں سے فائدہ حاصل ہو ان کی فروخت جائز ہے۔ (انتھی)۔حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ،

وظاهر النهی تحریم بیعه وهوعام فی کل کلب معلماکان اوغیره .... وبذالک قال الجمهور، فتح الباری ص ۳۳۸ ج ۴.

اس حدیث سے ظاہراً ہر کتے کے فروخت کی نفی ثابت ہوتی ہے اگر چہ وہ سدھارا ہوا ہو یا نہ اور یہ مذھب ہے جمھور علماء اسلام کا (انتھی)۔

ملا علی القاری حنفی شرح مشکوٰۃ میں علامہ طیبی سے نقل کرتے ہوئے اس پر سکوت کرتے ہیں کہ واقعی بات درست ہے کہ

الجمهور علی انه لایصح بیعه،

مرعاۃ ص ۳۸ ج ۶،

یعنی جمھور اس مذھب پر ہیں کہ کتے کی بیع درست نہیں۔

(۲۰) عیدین کے دن روزہ رکھنا

امام ابی عبید مولی ازھرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں عید کے دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز عید پڑھنے کیلئے حاضر ہوا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھا کر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا

هذان یومان نهیٰ رسول اللهﷺ عن صیا مهما یوم فطر کم من صیامکم والیوم الآخرتاکلون فیه من نسککم.

بخاری ص ۲۶۷ ج ۱، و مسلم ص ۳۶۰ ج ۱

ان دونوں ایام (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) میں رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے ایک تو روزہ کھولنے کا دن اور دوسرا اپنی قربانی کھانے کا۔ (انتھی)

اس حدیث کا یہ تقاضا ہے کہ عیدین کے ایام میں روزہ رکھنا منع ہے اور اس دن روزہ عبادت نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی وجہ سے معصیت ہے ظاہر ہے کہ اگر کوئی عید کے دن میں روزہ رکھنے کی جان بوجھ کر نذر مانتا ہے تو اس کی یہ نذر معصیت ہے اور معصیت میں نذر کے ایفاء سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے،

لانذر فی معصیة الله. مسلم كتاب النذر باب لاوفاء النذر.

لیکن امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ اگر کوئی قصداً بھی عید کے دن روزہ کی نذر مانے تو تب بھی روزہ کی قضاء لازم آئے گی اور یہ مسئلہ جمہور علماء اسلام کے مخالف ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

و فی الحدیث تحریم صوم یومی العید.................. وهو بالاجماع و اختلفوا فیمن قد صام یوم عید فعن ابی حنیفة ینعقد و خالفه الجمهور فلونذر صوم یوم قدوم زید فقد یوم العید فالاکثر لا ینعقد النذر و عن الحنیفة ینعقد و یلزمه القضاء.

فتح الباری شرح صحیح بخاری ص ۱۹۴ ج ۴.

اس حدیث میں عید کے دن روزہ رکھنے کی حرمت ہے اور اس پر اجماع ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو امام ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ اس کا روزہ ہوگیا اور اس میں انہوں نے جمھور کی مخالفت کی ہے اور اگر (کسی نے) نذر مانی کہ جس دن زید گھر آیا تو میں اس دن روزہ رکھوں گا اور زید عید کے دن آیا تو اکثر علماء کے نزدیک ایسے شخص پر قضاء لازم نہیں آئے گی لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر قضاء لازم ہے۔ (انتھی)

علامہ نووی شرح صحیح مسلم ص ۳۶۰ ج ۱ میں فرماتے ہیں کہ

وقد اجمع العلماء علی تحریم صوم هذین الیومین بکل حال سواء صامهما عن نذر اوتطوع اوکفارة او غیر ذلک ولونذر صومهما متعمدا بعینهما قال



الشافعي والجمهور لاينعقد نذره ولا يلزمه قضاء هما و قال ابو حنيفة ينعقد ويلزمه قضاء هما قال فان صامهما اجزاه و خالف الناس كلهم في ذلك.

اور تحقیق عیدین کے دن روزہ رکھنے کی حرمت پر علماء کا اجماع ہے، تمام حالتوں میں اگرچہ روزہ نذر کا ہو یا نفلی یا کفارہ کا یا کسی اور وجہ سے، اور اگر کسی نے جان بوجھ کر عیدین کے روزہ کی نذر مانی تو امام شافعی اور جمھور علماء کے نزدیک ان کی قضاء لازم نہیں آتی لیکن امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ اس کی قضاء لازم آئے گی (اور انہوں نے مزید یہ کہا ہے کہ) اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہ اس کو کفایت کرے گا اور اس میں انہوں نے تمام لوگوں کی مخالفت کی ہے۔ (انتھی)

اس اکثری مذھب کا اقرار تو معروف حنفی بزرگ ملا علی قاری نے بھی شرح مشکوٰۃ ص۲۹۳ ج۴، میں کیا ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء بریلویہ

یہ بیس امثلہ ہم نے سرسری طور پر پیش کردی ہیں ہم اس سلسلہ میں صدھا مسائل پیش کرسکتے ہیں جن میں احناف نے جمھور امت سے مخالفت کی ہے اور قرآن و حدیث کے واضح دلائل بھی جمھور کے ساتھ ہیں، اگر مفتی صاحب کے اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ جمھور کی مخالفت گمراہی و بے دینی کا راستہ ہے کیونکہ انہوں نے اسی دلیل سے امام ابن تیمیہ کو گمراہ و بے دین قرار دیا ہے کہ انہوں نے جمھور کی مخالفت کی ہے!

انصاف شرط ہے کہ آیا مذکورہ مسائل میں حنفیہ نے جمھور کی مخالفت کرکے بقول مفتی صاحب گمراہی و بے دینی کا راستہ منتخب کیا ہے؟ یا جمھور کی مخالفت کے باوجود راہ ھدیت پر ہیں؟۔

برائیوں کی جڑ نجد یا عراق

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اسی جماعت (اہل الحدیث) کی پیشین گوئی خود حضور انور ﷺ نے کی تھی کہ نجد کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

یخرج منها قرن الشیطان.

وہاں سے ایک شیطانی فرقہ نکلے گا۔ جاء الباطل ص۲۶۴ ج۲۔

الجواب

جواب سے قبل ہم اس جگہ اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بریلویت نے اکابر سے لیکر اصاغر تک صرف ایک ہی لفظ کو لیکر اس حدیث نبوی کا ایسا مفہوم بگاڑا ہے کہ یہودیوں کے بھی کان کتر ڈالے ہیں جب اس گروہ کے علماء کی یہ حالت ہے تو عوام تو پہلے ہی گئے گزرے ہوتے ہیں(ان کے پڑھانے سے آگے چلتے ہیں اور انہوں نے مسائل میں تحقیق کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں اگر کبھی زحمت گوارہ کر ہی لیں تو پھر ان کے مولوی مسئلہ بتاتے ہوئے جو جو ہیرا پھیریاں کرتے ہیں وہ علماء کی شان نہیں! حالانکہ تحقیق کرنا کروالینا ہمیشہ کسی اصول کے تحت ہونی چاہئے ورنہ نتیجہ کبھی صحیح نہیں نکل سکتا بلکہ ویسا ہی نکلے گا جو ایک کہاوت کی رو سے چار اندھوں کا نکلا تھا کہتے ہیں چار اندھے تھے ان کو ہاتھی دیکھنے کا شوق ہوا جس پر انہوں نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ جب کبھی گاؤں میں ہاتھی آئے تو ہمیں بھی بتانا ہم نے دیکھنا ہے ہاتھی کس طرح کا ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی ہاتھی آیا تو بتانے والے نے انہیں خبر دی اور وہ چاروں ہاتھی دیکھنے کیلئے باہر نکل آئے اور ٹٹولتے ہوئے ہاتھی کے پاس پہنچے ان میں سے ایک کا ہاتھ ہاتھی کے پیٹ پر پڑا، دوسرے کا ہاتھ ہاتھی کی ٹانگ پر پڑا، تیسرے کا سونڈ پر اور چوتھے کا کان پر،اور انہیں کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولتے رہے جب وہ دیکھ بھال کر واپس اپنے ڈیرے پہ گئے تو کسی کے پوچھنے پر حافظ صاحب ہاتھی کس طرح کا ہوتا ہے؟ پہلا نابینا بولا کہ بس موٹا چوڑا چکلا جسم ہی جسم ہوتا ہے دوسرا کہنے لگا نہیں یہ جھوٹ کہتا ہے بلکہ ہاتھی تو ایک موٹے اور اونچے ستون کی طرح ہوتا ہے تیسرا بولا یہ دونوں جھوٹے ہیں ہاتھی ایک نرم نرم گاؤں دم گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے، چوتھے نے چلا کر کہا معلوم ہوتا ہے ان سب کو غلطی لگی ہے

کیونکہ ہاتھی تو ایک پتلے اور چوڑے پنکھے (دستی) کی طرح ہوتا ہے۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ ہی ہے مگر اس سے ایک سبق ضرور ملتا ہے اور وہ یہ کہ جب تک چشم بصیرت سے باقاعدہ اصول کے تحت کسی چیز کی پرکھ نہ کی جائے تو نتیجہ غلط نکلتا ہے بس یہ ضروری ہے کہ ہم حدیث ''قرن الشیطان'' کے متعلق کسی درست اصول کے مطابق تحقیقات کریں، سو واضح ہو کہ اس حدیث میں دو باتیں تشریح طلب ہیں اول یہ کہ نجد سے کونسا نجد مراد ہے کیونکہ نجد بہت زیادہ ہیں دوم یہ کہ اس وقت وہ کونسا گروہ ہے جو قرن الشیطان ہے، ان دونوں باتوں کی تحقیق ضد اور تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ملاحظہ کیجئے، واللہ یھدی من یشاء۔

تعداد نجود

ملک عرب میں نجد کے نام سے جو جو علاقہ جات معروف ہیں انکی مختصر فہرست علامہ زبیدی نے تاج العروس شرح قاموس کی دوسری جلد ص۵۱۱ میں اور علامہ حموی نے معجم البلدان ص۲۶۵ ج۱۹، میں دی ہے جو کہ حسب ذیل ہے۔

(۱) نجد الوز (۲) نجد أجا (۳) نجد برق (۴) نجد خال (۵) نجد الشری (٦) نجد عضر (۷) نجد العقاب (۸) نجد کبکب (۹) نجد مریع (۱۰) نجد الیمن (۱۱) نجد العراق (۱۲) نجد الحجاز.

جب نجد نام کے متعدد مقامات ہیں اور عراق و یمن دونوں علاقوں میں پائے جاتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس نجد کی تلاش کی جائے جس کو زبان رسالت ﷺ نے (قرن الشیطان) کہا ہے تاکہ پیشگوئی کا ظہور پورے طور پر سمجھ میں آسکے، جب ہم اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ نجد عراق ہی وہ سرزمین ہے جسے نبی رحمت حضرت محمد ﷺ نے مراد لیا ہے آیئے اس دعوے کا ثبوت بھی دیکھیں۔

قرن الشیطان کونسا نجد ہے؟

اس سوال کے جواب کیلئے سب سے اول ہم حدیث نبوی کو ہی لیتے ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے دعا فرمائی کہ

اللهم بارک لنا فی شامنا اللهم بارک لنا فی یمننا قالوا یا رسول الله ﷺ و فی نجدنا قال اللهم بارک لنا فی شامنا اللهم بارک لنا فی یمننا قالوا یارسول الله ﷺ و فی نجدنا فاظنه قال فی الثالثة هناک الزلازل والفتن و بها یطلع قرن الشیطان. بخاری ص ۱۰۵۱ ج ۲.

یعنی اے اللہ ہمارے لئے شام میں برکت دے، اے اللہ ہمارے لئے یمن میں برکت دے، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے نجد میں (بھی برکت کی دعا کیجئے) آپؐ نے پھر دعا فرمائی، اے اللہ ہمارے لئے شام میں برکت دے ہمارے لئے یمن میں برکت دے، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے پھر عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اور ہمارے نجد میں (بھی برکت کی دعا کیجئے) (راوی ابن عمر) نے کہا میرا خیال ہے کہ تیسری مرتبہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے جواب میں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہیں سے شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا۔ انتھی)

حضرت امام بخاریؒ اس حدیث کو ''الفتن قبل المشرق'' کے عنوان کے تحت لاکر حدیث میں موجود لفظ ''و فی نجدنا'' کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ نجد سے مراد اس جگہ کونسی سر زمین ہے، اس تشریح کیلئے امام بخاری ایک اور حدیث لائے ہیں کہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

انه سمع رسول الله ﷺ وهو مستقبل المشرق یقول الاان الفتنة هٰهنا من حیث یطلع قرن الشیطان. بخاری ص ۱۰۵۰

یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مشرق کی طرف منہ کر کے یہ کہتے ہوئے سنا کہ خبردار بے شک فتنہ یہاں سے نکلے گا جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے۔ (انتھی)

اس حدیث نے بات صاف کردی کہ نبی ﷺ نے پیشگوئی فرماتے ہوئے مشرق کی طرف اشارہ کرتے فرمایا تھے کہ قرن شیطان اس طرف ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید العرب والعجم

حضرت محمد مصطفی ﷺ نے کب اور کس جگہ کھڑے ہو کر مشرق کی طرف اشارہ کیا تھا سو اس کی تشریح کیلئے امام بخاری ایک تیسری حدیث امام سالمؒ کے واسطے سے لائے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں کہ

انه قام الی جنب المنبر. بخاری ص ۱۰۵۰ ج ۲.

یعنی نبی ﷺ نے یہ بات منبر کی ایک جانب کھڑے ہو کر کہی تھی۔

اس حدیث سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ میں مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ قرن الشیطان اس طرف سے نکلے گا اور مدینہ طیبہ سے عین مشرق کی طرف نجد عراق ہے جو کہ اہل الرائے کا مرکز ہے۔ چنانچہ علامہ محمد طاہر فتنی حنفی اس حدیث کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے نجد شیطان کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ

هو اسم خاص لما دون الحجاز ممایلی العراق،

یعنی یہ ایک خاص جگہ کا نام ہے جو حجاز کے علاوہ عراق کے ساتھ ملتی ہے، مجمع بحار الانوار ص ۶۸۰ ج ۴۔

مزید وضاحت

(۱) حضرت حسن رحمۃ اللہ راوی ہیں کہ

قال رسول اللهﷺ اللهم! بارک لنا فی مدینتنا إللهم! بارک لنا فی شامنا اللهم! بارک لنا فی يمننا، فقال له رجل، يارسول اللهﷺ فالعراق! فان فيها ميرتنا و فيها حاجتنا، فسكت، ثم اعاد عليه فسكت، فقال: بها يطلع قرنا الشيطان و هنالک الزلازل و الفتن.

کنز العمال ص ۷۷ ج ۱۴. رقم الحدیث ۳۸۲۷۳)

یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے دعا کی اے اللہ ہمارے مدینہ کو ہمارے لئے برکت والا بنا اے اللہ ہمارے شام میں ہمارے لیئے برکت عطاء فرما! اے اللہ ہمارے یمن کو ہمارے لیئے بابرکت بنا، ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق کیلئے بھی دعا فرمایئے کیونکہ وہاں سے ہمارے لئے گندم اور دیگر ضروریات کا سامان مہیا ہوتا ہے، آپ ﷺ خاموش رہے، اس نے یہ دیکھ کر پھر

گزارش کی، آپ ﷺ پھر خاموش رہے، پھر فرمایا کہ وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا وہاں زلزلے اور فتنے برپا ہوں گے (یعنی میں اس کے کیلئے کیسے دعا کروں وہ تو زلزلوں اور فتنوں کی سرزمین ہے)۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ

صلی رسول الله ﷺ صلاة الفجر ثم انفتل فاقبل علی القوم فقال، اللهم بارک لنا فی مدینتناو بارک لنا فی مدنا و صاعنا، اللهم! بارک لنا فی حرمنا و بارک لنا فی شامنا و يمننا، فقال رجل، و العراق يارسول الله ﷺ! فسکت، ثم اعاد، فقال، اللهم! بارک لنافی مدينتنا و بارک لنا فی مدنا و صاعنا اللهم! بارک لنا فی حرمنا و بارک لنا فی شامنا و يمننا، فقال رجل، والعراق يا رسول الله فسکت ثم اعاد فقال الهم بارک لنا فی مدينتنا و بارک لنا فی مدنا و صاعنا، اللهم! بارک فی حرمنا و بارک لنا فی شامنا و يمننا، فقال رجل، و العراق يارسول الله ﷺ! قال من ثم يطلع قرن الشيطان و تهيج الفتن. ايضاً ص ١٧ ج ١٤. (رقم الحديث ٣٨٢٢٨)

رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز ادا فرمانے کے بعد متقدیوں کی طرف منہ کر کے دعا فرمائی، اے اللہ ہمارے واسطے مدینہ میں برکت دے، اور ہمارے مد اور صاع میں برکت دے، اے اللہ حرم میں ہمارے لئے برکت دے، شام اور یمن میں برکت دے، ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی برکت کی دعا کیجئے) آپ ﷺ خاموش رہے، پھر فرمایا اے اللہ ہمارے مدینہ میں ہمارے لیئے برکت دے، ہمارے مد اور صاع میں ہمارے لئے برکت دے اے اللہ ہمارے حرم میں ہمارے لئے برکت دے، شام اور یمن میں ہمارے لئے برکت دے، (اس پر) ایک آدمی نے گزارش کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی بھی برکت کی دعا کیجئے) تو نبی ﷺ خاموش رہے، پھر دعا فرمائی اے اللہ ہمارے لیئے مدینہ میں برکت دے اور ہمارے مد اور صاع میں برکت دے اے اللہ ہمارے حرم میں ہمارے لئے برکت دے اور ہمارے شام اور یمن میں برکت دے (اس پر پھر) ایک آدمی نے گزارش کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ عراق (کیلئے بھی

برکت کی دعا کیجئے) تو نبی ﷺ نے فرمایا (میں وہاں کیلئے کیسے دعا کروں) جبکہ وہاں شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا اور فتنے فساد جوش ماریں گے۔ (انتھی)

اس حدیث کو مکرر ملاحظہ کیجئے یہ کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں بلکہ اپنی تفسیر آپ کر رہی ہے کیونکہ یہاں نجد کی بجائے صاف عراق کا لفظ موجود ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ بخاری کی روایت میں جو نجد کا لفظ آیا ہے اس سے مراد نجد عراق ہے نجد یمن جس کو آج کل نجد سعودیہ کہتے ہیں وہ مراد نہیں یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو باب الفتن قبل المشرق کے تحت لاکر اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ یہاں نجد سے وہ نجد مراد ہے جو مدینہ سے جانب مشرق ہے اور سب جانتے ہیں کہ مدینہ سے مشرق کی جانب عراق ہے جس میں بصرہ وکوفہ جیسے شہر آباد ہیں جو کہ اہل الرائے کے مرکز اور فتنوں کی سرزمین ہے۔

تاریخ کی شہادت

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والا عجمی تھا۔

(۲) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد کا فتنہ عراق ہی سے اٹھ کر مصر تک پھیلا۔

(۳) جنگ جمل وصفین اسی سرزمین عراق پر ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ قیمتی خون بہا جس کی تلافی رہتی دنیا تک نہ ہوسکے گی اور وہ پاک نفوس ان جنگوں میں کام آئے جن کی مثال دنیا کبھی پیش نہیں کر سکے گی۔

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں شہید ہوئے۔

(۵) خوارج، اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا، جبریہ اور قدریہ نے بھی یہیں سے جنم لیا، اسلام کے دیگر فرقوں مثلاً جہمیہ کا فتنہ جس کا موجد جہم بن صفوان تھا عراق سے نکلا، معتزلہ نے بھی یہیں سے سر نکالا جس کی وجہ سے بے شمار فقہاء ومحدثین کو ناقابل برداشت اذتیں سہنا پڑیں، اعتزال کے بانی مبانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبید بھی عراقی تھے۔

(۶) جگر گوشہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا قافلہ یہیں فرات کے کنارے لٹا۔

(۷) شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا یہیں عراق کی پیداوار ہے۔

(۸) حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئی۔

(۹) مختار بن ابو عبید نے دعوی نبوت عراق سے ہی کیا۔

(۱۰) ترک وتا تار کی غارت گریوں کے نتائج (جنہوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت اور عرب و خلافت عربی کا تار تار الگ کردیا) یہیں رونما ہوئے

(۱۱) حتی کہ جنگ عظیم میں واحد اسلامی طاقت کیساتھ غداری کے نتائج بھی اولاً یہیں ظاہر ہوئے اور اسی کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوئے۔

(۱۲) ماضی قریب میں عبدالکریم قاسم کا فتنہ بھی عراق سے نکلا۔

(۱۳) ماضی قریب میں بہایت اور بابیت نے یہیں سے جنم لیا اور اسی کی بگڑی ہوئی صورت قادیانیت ہمارے سامنے ہے۔

(۱۴) عراق ایران جنگ جس نے تمام مسلمانوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جس کے دور رس نتائج نکل رہے ہیں اور صدر صدام کا تازہ فتنہ کویت پر قبضہ جس نے عالم اسلام کو تباہ کردیا ہے، یہ تمام فتنے عراق سے ہی نکلے ہیں۔

(۱۵) اور آخر میں دجال بھی اسی سرزمین سے نکلے گا۔

(مستفاد از سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۳۸۹ و تاریخ اسلام مؤلفہ معین الدین ندوی)

ان تمام تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عراق ہی قرن الشیطان اور زلازل وفتن کی سرزمین ہے۔

حدیث نبوی کے مطابق مشرق سے دس سے زیادہ بڑے بڑے فتنے کھڑے ہونگے تفصیل آپکے سامنے ہے آپ نے ملاحظہ کیا کہ اللہ کے رسول برحق حضرت محمد مصطفی ﷺ کی یہ پیشگوئی کس قدر حقیقت وسچائی پر مبنی ہے، اس کے برعکس نجد سعود سے آج تک کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہوا، بلکہ بنوتمیم کے ایک مومن کامل نے فتنہ پروروں اور ملت فروشوں کا قلع قمع کرتے ہوئے توحید وسنت کے پیغام سے قبر پرستوں کو ننگا کر دیا، ولایت کے نام سے قبروں کو مال تجارت بننے سے منع کر دیا، طریقت کے نام سے ملت فروشی کو ختم کردیا، جب مشرکین کے کاروبار ماند پڑھ گئے، تو اس مرد حق کو اس قدر بدنام کیا گیا ''الامان والحفیظ'' مگر دنیا نے دیکھا کہ اس کی دعوت نجد سے نکل کر حجاز وتہامہ یمن وشام

تک عام ہوگئی، اور اسی کی دعوت و جہاد ہی کے نتیجہ میں حرمین شریفین کو انکا پرانا وقار مل سکا اور ان کی حقیقی حرمت و عزت بحال ہوسکی۔

آہ رحمت کو زحمت کہنے والے تجدید و احیائے دین کو فتنہ بتانے والے کبھی اپنے گریبانوں میں منہ ڈالتے تو پرانی تاریخ کو دیکھتے شریف حسین کے زمانہ کے حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ خاص مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں حالات انتہائی مخدوش نظم و ضبط کا فقدان اور خطرات کے بادل ہروقت سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے راستے میں حاجیوں کے قتل تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی اور یہ راستہ اس قدر پر خطر اور اندوہ گین تھا کہ حاجی مسلح قافلوں کی صورت میں اپنے کو خطرات سے محفوظ نہیں پاتے تھے آج سے ساٹھ سال پیشتر کی تاریخ حاجیوں پر ظلم و زیادتیوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے، پاک و ہند کے نامور تاریخ دان مولانا عبدالرحمٰن شوق امرتسری حنفی لکھتے ہیں کہ

حجاز کے حکمران کو شریف مکہ کہتے تھے لیکن وہ ملکی انتظام کے قیام و انصرام میں ناکام رہا لوٹ مار کی گرم بازاری تھی بدوی ڈاکوؤں نے حاجیوں پر چیرہ دستی کر کے ناک میں دم کر رکھا تھا حکومت ترکی یہ سب کچھ کانوں سے سنتی اور آنکھوں سے دیکھتی تھی لیکن جب کبھی وہ شریف کی سرکوبی کا ارادہ کرتی وہی احترام و پاکیزگی کا خیال اس کا دامن تھام لیتا اس رواداری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۵ء میں شریف حسین نے بغاوت کا علم بلند کر دیا جس کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا کہ حجاز میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں ۱۹۱۶ء میں شریف کی تقریب تاج پوشی سنائی گئی اور اسے خلعت ملوکیت سے سرفراز کیا گیا ۱۹۱۸ء میں تسخیر عرب پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اس کے بعد حجاز میں شریفی حکومت کا شادیانہ اقتدار پورے زور سے بجنے لگا ۱۹۱۹ء میں معاہدہ سیورے نے ترکی کا تختہ الٹ دیا تو شریف کے گھر ساغر اطمینان میں زہر گھولتے رہے مگر جنگ عظیم سے پائی ہوئی قوت کی پھونکیں بغاوت کے ان شعلوں کو گل کرتی رہیں، بدویوں کی پیدا کی ہوئی شورش کا مقابلہ تو وہ آسانی سے کرتا رہا لیکن نجد و یمن کی مخالفانہ بساط آرائی کے آگے اس کی بازی مات ہوگئی اور ۱۹۲۴ء میں سلطان ابن سعود نے شریف کے ایوان حکومت کو پیوند زمین کر دیا۔

تاریخ اسلام ص ۸۷۶ حصہ پنجم، سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ملک الحجاز بنتے ہی ملک کے

گوشے گوشے میں امن و آسائش کا مینہ برسا دیا ایضاً ص۸۷۹ حصہ پنجم۔

عراق حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ

دخل ابلیس العراق فقضی فیه حاجته ثم دخل الشام فطر دوه ثم دخل مصر فباض فیها و فرخ و بسط عبقریه، طبرانی کبیر ص۲۶۲ ج۱۲، (رقم الحدیث ۱۳۲۹۰) وطبرانی اوسط ص۱۲۲ ج۷ (رقم الحدیث۶۴۲۷) کنز العمال. ص۱۳۸ ج۱۲ (رقم الحدیث ۳۵۱۵۴) و درمنثور ص۱۱۲ ج۳.

شیطان عراق میں داخل ہوا تو وہاں اپنی ضرورت پوری کی پھر شام گیا تو وہاں کے لوگوں نے اسے بھگا دیا پھر مصر گیا اور وہاں خوب انڈے بچے دیے اور وہاں خوب مزے سے رہ بسا۔ انتھی)

علامہ ھیثمی فرماتے ہیں کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، البتہ اس کی سند میں انقطاع ہے کیونکہ یعقوب کی ابن عمر سے ملاقات وسماع ثابت نہیں۔

مجمع الزوائد ص۶۳ ج۱۰ باب فی ماجاء فضل الشام۔

راقم عرض کرتا ہے کہ گو یہ روایت منقطع ہے مگر فرقہ بریلویہ کے نزدیک منقطع حجت ہے، چنانچہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی لکھتا ہے کہ

ہمارے نزدیک مرسل ہر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند متصل نہ ہو اور اس کے اقسام میں فرق کرنا اور ان کے جدا جدا نام مرسل و منقطع و مقطوع و معضل رکھنا یہ محدثین کی ایک نری اصطلاح ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس میں کتنی صورتیں ہوتی ہیں، رہا حکم وہ ہمارے نزدیک ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ثقہ اگر کوئی حدیث مرسل لائے تو مقبول ہے،

کفل الفقیه الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم، مندرجه فتاویٰ رضویه ص۱۷۴ ج۷.

خاں صاحب کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ وہ منقطع کو مرسل کی ایک قسم قرار دیتے تھے۔ اور اگر بیان کرنے والا ثقہ ہو تو وہ مقبول ہوتی ہے جب کہ امام یعقوب بن عتبہ ثقہ ہیں، تھذیب

ص۳۹۲ج۱۱،

الغرض یہ روایت فرقہ بریلویہ کے گرو کے نزدیک صحیح و معتبر ہے، آیئے اس سلسلہ میں دوسری حدیث ملاحظہ کریں،

امام یسیر بن عمروؒ بیان فرماتے ہیں کہ

دخلت علی سهل بن حنیف فقلت،حدثنی ماسمعت من رسول الله ﷺ؟ قال، فی الحروریة؟ قال احدثک ماسمعت لاأزیدک علیه سمعت رسول الله ﷺ یذکر قوما یخرجون من ههنا، واشاربیده نحو العراق یقرأن القرآن لایجاوز حنا جرهم، یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة، قلت هل ذکر لهم علامة؟ قال هذا ماسمعت لاایزیدک علیه.

مسند امام احمد ص ۴۸٦ ج ۳، و تهذیب مسند ص ۳٦ ج ۴.

میں حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے عرض کی کہ مجھ سے وہ بیان کیجئے جو آپ نے نبی ﷺ سے سنا ہے انہوں نے کہا کہ (شاید تم) حرویہ (کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو) سو ان کے (متعلق) میں تم سے اپنی طرف سے بڑھائے بغیر بتاتا ہوں کہ میں نے سنا آپ ﷺ ایک قوم کا تذکرہ کررہے تھے جو ادھر سے نکلے گی یہ کہہ کر آپ نے عراق کی طرف اشارہ کیا (اور فرمایا کہ) جو قرآن پڑھیں گے ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے کمان سے تیر (راوی حدیث یسیر) کہتے ہیں کہ میں نے کہا کیا نبی ﷺ نے ان کی کچھ نشانی بھی بتائی ہے وہ (سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ) بولے میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ انتھی۔

معلوم ہوا کہ، یقرؤن القرآن لایجاوز تراقیھم، سے جو اہل بدعت حضرات جماعت اہل الحدیث کو مطعون کرتے ہیں وہ سرا سر جھوٹ فریب اور ان کی مکاری و عیاری ہے اور اس کے مصداق ان کے عراقی بھائی خوارج ہیں اور اہل الحدیث کی بجائے اہل بدعت اس حدیث کے مصداق ہیں کیونکہ انکا تعلق عراق کے شہر کوفہ سے ہے۔

بصورت تسلیم

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نجد قرن الشیطان اور،ھناک الزلازل و الفتن، سے مراد وہی نجد ہے جسے آج نجد سعود کہا جاتا ہے، جس سے توحید کی دعوت پھیلی اور حرمین شریفین میں امن و امان قائم ہوا، کیا اتنی سے بات سے ہی دعوت توحید و سنت دینے والے یکسر غلط ٹھہریں گے اور ان کو گمراہ اور نا قابل اعتبار ثابت کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ نجد کے رہنے والے ہیں؟

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب بہت غور طلب ہے کہ آیا کہ کسی شخص کو زمین بھی مقدس و محترم بناتی ہے؟ یا کہ انسان کو اس کے اعمال ہی محترم و مقدس بناتے ہیں؟ جب اس کے جواب کیلئے ہم قرآن پاک میں غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

یایھاالناس انا خلقنکم من ذکر وانثی و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعار فوا ان اکرمکم عنداللہ اتقکم. الایہ) پ۲۶ سورۃ الحجرات آیت ۱۳.

اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے (احمد رضا)

اس آیت کریم نے بات صاف کر دی کہ انسان کی شخصیت محترم و مقدس ہونے میں کسی علاقہ و زمین کا دخل نہیں ہوتا بلکہ شرافت کیلئے عمل صالحہ کی ضرورت ہے سید العرب و العجم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے خود ایک صحابی کے سوال کرنے پر ارشاد فرمایا ہے کہ

من اکرم الناس؟ قال اتقاھم. بخاری ص۴۷۳ ج۱ کتاب الانبیاء باب واتخذاللہ ابراھیم خلیلا و مسلم ص۲۶۸ ج۲ فی الفضائل باب من فضائل یوسف)عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں پرہیز گار لوگ سب سے زیادہ مرتبہ والے ہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ کسی جگہ کے مقدس ہونے سے وہاں کا مقیم بھی مقدس و محترم بن جاتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ابو جہل اور ابو لہب امیہ بن خلف وغیرہ کفار مکہ بھی مقدس و محترم

تھے(نعوذ باللہ) کیونکہ ارض حرم روز اول سے ہی پاکیزہ و مبارک اور عزت والی جگہ ہے، ارشاد ہوتا ہے

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبرکا و ھدی للعلمین. پ ۴ آل عمران آیت ۹۶.

بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہانوں کا راہنما۔ (احمد رضا خاں)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان ظالم کافروں نے اس مقدس زمین میں سب سے زیادہ مقدس شخص کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا مگر خود ان کافروں کو مکہ کی شرافت محترم نہ بناسکی پھر جب نبی علیہ السلام نے مدینہ طیبہ میں قدم مبارک رکھا تو یہ زمین ارض مقدس کہلائی (جیسا کہ حدیث نبوی میں اس کی صراحت ہے) مگر عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اور اس کا گروہ اسی مدینہ کے باشندہ تھے لیکن مدینہ ان کے لئے تقدس کی ضمانت نہ ہوسکا، حرمین شرفین کی عزت و حرمت سے نعوذ باللہ انکار مقصود نہیں، بتانا یہ ہے کہ صرف حرمین کی حرمت اس کے باشندوں کو شرافت کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مصر و شام نص قرآنی سے ارض مقدس ہیں المسجد الاقصا الذی برکنا حولہ۔ الایہ بنی اسرائیل آیت ا۔

یعنی مسجد اقصیٰ جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی ہے۔

مگر اس کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کو علی الطلاق شرف تقدس کا سٹیفکیٹ نہیں دیا جاسکتا کہ اسی ارض مقدس میں یہود جیسی مغضوب وملعون قوم آباد ہے اور مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کر رہی ہے۔

جس طرح کوئی زمین اپنی عظمت و حرمت کے باوجود کسی قوم یا شخص کو عظمت و حرمت عطا نہیں کرسکتی اسی طرح کوئی قوم یا شخص کسی مغضوب و مقہور جگہ پر رہنے سے غلط نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر نجدی موحدین یا ان کو اچھا جاننے والوں کو صرف اس وجہ سے گمراہ و بے دین ٹھہرایا جاتا ہے کہ وہ نجد سے تعلق رکھتے ہیں سر سرا دھوکہ ہے اگر یہ اصول درست تسلیم کر لیا جائے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ و مقلدین پر بھی عراقی ہونے کی وجہ سے اسی قسم کا

فتویٰ لگایا جا سکتا ہے مگر ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ اصول ہی لچر ہے اور اس کا قائل قرآن و حدیث سے محض نابلد ہے کیونکہ ایک نجدی کو تو خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے جنت کی خوش خبری دی ہے چنانچہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ

جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ من اهل نجد ثائر الراس نسمع دوی صوته ولانفقه مایقول حتیٰ دنا من رسول اللہ ﷺ فاذا هویسأل عن الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ خمس صلوات فی الیوم و اللیلة فقال هل علی غیرهن فقال لا الا ان تطوع قال رسول اللہ ﷺ و صیام شهر رمضان فقال هل علی غیره قال لا الا اتطوع قال وذکر له رسول اللہ ﷺ الزکوة فقال هل علی غیرها فقال لاالا ان تطوع قال فادبر الرجل وهو یقول واللہ لاازید علی هذا ولا انقص منه فقال رسول اللہ ﷺ افلح الرجل ان صدق. بخاری و مسلم بحواله مشکوة ص ۱۳.

ایک آدمی نجد کا رہنا والا رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جس کے سر کے بال پراگندہ تھے اس کی آواز میں گنگناہٹ تھی ہم سنتے تھے لیکن سمجھتے نہ تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب آگیا ناگہاں وہ اسلام کے متعلق پوچھ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں دن رات میں، اس نے کہا انکے علاوہ بھی کچھ مجھ پر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں مگر یہ کہ تو نفل پڑھے، نبی ﷺ نے فرمایا کہ اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا، اس نے کہا ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے، نبی ﷺ نے کہا کہ نہیں مگر یہ کہ تو نفلی روزے رکھے، اور رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کا ذکر کیا، اس نے کہا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلی صدقہ کرے۔

(راوی حدیث حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اس آدمی نے پیٹھ پھیری اور وہ کہتے جارہا تھا اللہ تعالی کی قسم ہے کہ میں اس پر زیادہ نہ کروں گا اور نہ کم کروں گا (یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے کہا) اس نے فلاح پائی اگر سچا ہے۔

بخاری ص ۱۱ ج ۱ و مسلم ص ۳۰ ج ۱

وہ لوگ جو صرف لفظ نجدی کو دیکھ کر ہی آگ بگولہ ہوجاتے ہیں وہ ذرہ ٹھنڈے دل سے غور

کریں کہ ایک نجدی کو نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اس دنیا میں ہی جنت کی بشارت سنائی ہے۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی ﷺ کی پیشگوئی اس نجد کے متعلق ہے (جس سے شیخ محمد بن عبدالوھاب کا تعلق ہے) تو تب بھی اس پیشگوئی میں ہر فرد بشر داخل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک خاص گروہ ہے جو دین میں فتنہ اور بدعات کا مرتکب ہوگا جس سے کوئی ایسا فعل قبیح سرزد ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہوگی اور امت اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوھاب کا دامن ان تمام چیزوں سے پاک ہے اور کوئی مائی کا لال شیخ کا کوئی ایسا عقیدہ ثابت نہیں کر سکتا جو کہ غیر اسلامی ہو، یہاں چونکہ چنانچہ اور فلاں علامہ صاحب نے یوں لکھا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے، سے بات نہیں بنے گی بلکہ یہاں علماء آل سعود کی لکھی ہوئی کتب سے دلائل کے نقل کرنے کی ضرورت ہے، کہنے کو تو شیطان رشدی ملعون نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو کیا کچھ نہیں کہا، مگر مثل ہے، چاند پر تھوکنے والے کے منہ میں آتا ہے۔

محمد بن عبدالوھاب تاریخ کے آئینہ میں

(۱) اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ شیخ محمد بن عبدالوھابؒ کی ذات کو ان کی دعوت کی وجہ سے بدنام کیا گیا ہے اس لئے اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ محمد بن عبدالوھاب کی دعوت نجدی نہیں بلکہ شامی ہے کیونکہ ان کی زندگی میں جو انقلاب اور جذبہ جہاد پیدا ہوا ہے وہ امام ابن تیمیہؒ دمشقی اور ان کے شاگرد امام ابن قیمؒ کی کتب کے مطالعہ سے پیدا ہوا ورنہ وہ خود تو پہلے بہت سے خرافات اور زمانہ کے رسم و رواج میں گرفتار تھے اور جس حدیث کی بنیاد پر محمد بن عبدالوھاب کو مطعون کیا جاتا ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شام مبارک جگہ ہے اور اس کیلئے نبی ﷺ نے دعا فرمائی ہے کہ، اللھم بارک لنا فی شامنا، اے اللہ ہمارے شام میں برکت ڈال۔

(۲) شیخ محمد بن عبدالوھاب خاندان بنوتمیم کے چشم و چراغ تھے اور اس قبیلہ کی حدیث نبوی سے عظمت ثابت ہے چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

لا ازال احب بنی تمیم بعد ثلث سمعته من رسول اللہ ﷺ یقولها فیه هم

اشد امتی علی الدجال و کانت فیهم سبیّة عند عائشة فقال اعتقیها فانها من ولد اسمعیل و جاء ت صدقاتهم فقال هذه صدقات قوم اوقومی. صحیح بخاری ص۶۲۶ ج۲. ومسلم ص۳۰۷ ج۲، و اللفظ له.

یعنی میں بنی تمیم سے اس وقت سے برابر محبت کرنے لگا جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان کی تین باتیں سنیں آپ ﷺ فرماتے تھے کہ

بنی تمیم میری ساری امت میں دجال کے بڑے مخالف ہوں گے (جب وہ خبیث نکلے گا) اور ایسا ہوا کہ بنی تمیم کی ایک عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے پاس قید تھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے آزاد کردے کیونکہ بنی تمیم حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے ہیں، بنی تمیم کی زکوٰۃ آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا میری قوم کی زکوٰۃ ہے۔ (انتھیٰ)

مسلمانو! ذرا غور کیجئے گا جس قوم کی تعریف اللہ تعالی کے رسول برحق حضرت محمد مصطفی ﷺ کریں ان کی بہادری دجال کے بالمقابل ایمانی قوت کی پیشگوئی فرمائیں ان کو اپنی قوم قرار دیں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم انہیں محبوب رکھیں، آہ آج انہیں بے دین وگمراہ کہا جاتا اور وہ بھی صرف بے بنیاد اور جھوٹی افواہوں کے نتیجہ میں جنہیں صرف انگریز اور اس کے چمچوں نے اپنے پیٹ کی خاطر ایجاد کررکھا ہے۔

تعلیم القرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ

تصویر کا پہلا رخ

حضرت سعد بن سھل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، کہنے لگی اے اللہ کے رسول ﷺ میں اس لئے آئی ہوں کہ میں اپنے کو آپ علیہ السلام کو بخش دوں، آپ علیہ السلام جس طرح چاہیں مجھ میں تصرف کریں، آپ علیہ السلام نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

جب عورت نے دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، تو وہ بیٹھ گئی، دریں حالت ایک صحابی کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر آپ کو اس عورت کی خواہش نہیں ہے، تو مجھ سے نکاح کر دیجئے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے پاس (حق مہر) دینے کو کچھ ہے، اس نے کہا کہ اللہ کی قسم میرے پاس (حق مہر) دینے کو کچھ نہیں ہے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے عزیز و اقارب کے پاس جا اور کچھ (ادھار ہی) لے آ، وہ گیا اور خالی ہاتھ پلٹا، کہنے لگا اللہ کی قسم ہے کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملا، آپ نے فرمایا کہ جا دیکھ بھال اور نہیں تو لوہے کی ایک انگوٹھی ہی سہی، وہ دوبارہ گیا پھر لوٹ کر آیا، کہنے لگا اے اللہ کے رسول ﷺ، اللہ تعالی کی قسم! مجھے لوہے کی ایک انگوٹھی بھی نہ مل سکی، البتہ یہ تہ بند (جو میں نے پہن رکھا ہے اس کو حق مہر میں دیتا ہوں) حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کے پاس چادر بھی نہ تھی (بلکہ لنگی تھی) کہنے لگا یہی لنگی آدھی پھاڑ کر اس عورت کو مہر میں دیتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لنگی کیا کام آئے گی، اگر عورت پہنے تو تو ننگا رہے گا اور اگر تو پہنے گا تو عورت ننگی رہے گی، یہ بات سن کر وہ صحابی بھی بیٹھ گیا، دیر تک خاموش و ناامید ہو کر بیٹھا رہا، بالآخر وہ اٹھ کر چل دیا، جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ وہ جا رہا ہے تو آپ علیہ السلام نے حکم دیا، اسے بلایا گیا جب وہ حاضر ہوا تو آپ علیہ السلام نے کہا کہ

ماذا معک من القرآن؟ قال، معی سورة کذا وسورة کذا و سورة کذا وعدها قال اتقرؤهن عن ظهر قلبک؟ قال نعم، قال اذهب فقد ملکتکها بما معک من

القرآن.

تجھے کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ کہنے لگا جی ہاں فلاں فلاں سورت یاد ہے، کئی سورتیں اس نے شمار کی، آپ علیہ السلام نے فرمایا ان کو یاد سے پڑھ سکتا ہے؟ کہنے لگا جی ہاں، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جامیں نے یہ عورت اس قرآن (کی تعلیم) کے بدلے میں تیرے نام نکاح میں دی، جو تجھ کو یاد ہے۔

بخاری ص ۷۵۲ ج ۲ کتاب فضائل القرآن باب القرأة عن ظهر القلب. و مسلم ص ۴۵۷ ج ۱،

یہ حدیث اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن کو حق مہر قرار دیکر اس صحابی کا نکاح کیا ہے۔

اور حق مہر کا تعلق دنیا کے مال و دولت سے ہے، مگر آنحضرت ﷺ نے مجبور و فقیر کو تعلیم قرآن پر نکاح کر دیا ہے، اور یہ اجرت ہی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ تعلیم القرآن پر محتاج کو اجرت لینی جائز ہے۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتیں ہیں کہ

لما استخلف ابوبكر الصديق قال لقدعلم قومي ان حرفتي لم تكن تعجزعن مؤنة اهلي وشغلت بامر المسلمين فسيا كل آل ابو بكر من هذا المال و يحترف للمسلمين فيه.

یعنی جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کی کفالت سے عاجز نہیں، لیکن اب میں مسلمانوں کے ملکی نظام کو سنبھالنے میں مشغول ہوگیا ہوں، تو اب ابو بکر کی اولاد اس مال سے کھائے گی اور ابو بکر مسلمانوں کے دینی اور ملکی امور سرانجام دے گا، صحیح بخاری ص ۲۷۸ ج ۱۔

علامہ ذیلعی حنفی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو خط لکھا کہ وہ تعلیم قرآن پر معلمین کو اجرت دیں،

نصب الرایہ ص ۱۳۷ ج ۴۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر کوئی شخص تعلیم قرآن، خطابت و امامت اور دیگر دینی امور کی انجام دہی کی وجہ سے کوئی کاروبار یا ملازمت نہ کر سکتا ہو، اور اس کی مالی حالت بھی کمزور ہو، جس سے اس کے گھر کا گزارہ نہ ہوتا ہو، تو وہ وظیفہ لے سکتا ہے اس کیلئے یہ جائز و مباح ہے،

جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے محتاج و فقیر کا نکاح تعلیم قرآن کو حق مہر قرار دیکر پڑھا دیا تھا۔

اسی طرح جو لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح دینی امور میں اس حد تک مصروف ہوتے ہیں وہ کوئی دنیا کا پیشہ کر کے اپنی آل و اولاد کا پیٹ نہیں پال سکتے تو ان کے لئے گزارے کے مطابق وظیفہ لینا جائز و مباح ہے، لیکن تدریس و خطابت و امامت اور وعظ کو ایک پیشہ بنا کر جو حضرات دنیا کی دولت اکٹھی کرتے ہیں، جائدادیں پیدا کرتے ہیں، اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ بہرحال ناجائز و حرام ہے۔

ہمارے زمانہ میں ایک مزید بد رسم چل پڑی ہے کہ بعض جہال چند تقاریر کو رٹ کر وعظ کو پیشہ بنا لیتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔

اسی طرح وہ جاہل جو خطابت و امامت کو ایک کاروبار سمجھ کر پیش امام بن بیٹھتے ہیں، حالانکہ وہ دینی علوم تو کجا سادہ قرآن بھی پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہ بھی ناجائز ہے۔

جائز صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی شخص فی الواقع عالم دین ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ محتاج بھی ہو تو اسے وظیفہ لینا جائز ہے، خواہ تدریس ہو، امامت و خطابت ہو، خواہ کوئی اور دینی امور ہو، لیکن یہ بہرحال کسی کیلئے بھی جائز نہیں کہ وہ اسے بطور کاروبار کرے اور اس کو ذریعہ معاش بنا کر مال و دولت جمع کرے۔

خلاصہ یہ کہ جس قدر بھی ممکن ہو، تعلیم پر اجرت لینے سے اعراض کرے اگر بوجہ مجبوری لے بھی تو فقط گزارے تک لے سکتا ہے، اس سے زائد بہرحال ناجائز ہے۔

تنبیہ

ہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو دلیل اس لئے نہیں بنایا کہ وہ دم کے متعلق ہے،

اجرت تعلیم کے بارے میں نہیں، امام بخاری کی تبویب بخاری سے بھی ان کا اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

عدم جواز کے قائل حضرات جو دلائل پیش کرتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

میں بعض اہل صفہ کو قرآن مجید کی تعلیم اور لکھنا سکھاتا تھا، ان میں سے ایک نے مجھے ایک کمان تحفہ میں دی، میں نے سوچا کہ یہ مال نہیں ہے اور میں اس سے اللہ کی راہ میں تیر اندازی کروں گا، میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کے متعلق عرض کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

ان کنت تحب ان تطوق طوقا من نار فا قبلها،

یعنی اگر تجھے گلے میں آگ کا طوق ڈالنا پسند ہے، تو اسے قبول کرلے۔

سنن ابی داوٗد مع عون ص۲۷۶ ج۳، و ابن ماجہ (۲۱۵۷) و مسند احمد ص۳۱۵ ج۵، و بیہقی ۱۲۵ ج۶۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں، الاسود بن ثعلبہ راوی مجہول ہے، اس کی دوسری سند بھی ہے جس میں، بقیہ ولید راوی ضعیف ہے،

المحلی بالاثار ص۲۱ ج۷، مسئلہ نمبر ۱۳۰۷۔

(۲) حضرت عبدالرحمان بن شبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اقرأوا القرآن ولا تاکلوا بہ، ولا تستکثروا بہ، ولا تجفوا عنہ ولا تغلوا فیہ .

یعنی قرآن پڑھو اور اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ، اس سے کثرت حاصل کرو اور نہ ہی مال جمع کرو اور نہ ہی اس میں غلو کرو۔

مسند احمد ص۴۲۸ ج۳، و معجم طبرانی الاوسط ص۲۷۲ ج۳، (۲۵۹۵) وابن ابی شیبہ ص۴۰۰ ج۲۔ واللفظ لا بن ابی شیبہ۔

اس کی سند میں، یحیٰی بن ابی کثیر راوی مدلس ہے، اس کی تدلیس کی صراحت امام نسائی، بحوالہ طبقات المدلسین ص۳۶، اور حافظ ابن حجر نے کی ہے، تقریب ص۳۷۸، اور زیر بحث روایت میں

سماع کی صراحت نہیں۔

(تنبیہ اول)

راقم کے پاس جو مسند احمد کا نسخہ ہے، اس میں یحییٰ بن ابی نمیر ہے، رقم الحدیث (۱۵۱۰۳) جو غالبًا، کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ یہی روایت حافظ زیلعی نے، نصب الرایۃ ص۱۳۶ ج۴، میں مسند احمد سے بمع سند نقل کی ہے اور، یحییٰ بن ابی کثیر، نقل کیا ہے، اسی طرح طبرانی، ابن ابی شیبہ،اور المحلی لا بن حزم ص۲۰ ج ۷، میں ابن ابی کثیر ہی ہے۔

تنبیہ ثانی

ابن ابی شیبہ، میں کتابت کی غلطی سے،عبدالرحمٰن، کی بجائے عبداللہ بن شبل ، ہے۔

تنبیہ ثالث

امام ابن حزم نے، المحلی ص۲۱ ج ۷، میں اس روایت کا یہ جواب تحریر کیا ہے کہ اس کی سند میں، ابو راشد الحبرانی، راوی مجھول ہے، ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں کیونکہ ابو راشد، ثقہ ہے،تقریب ص۴۰۵۔

(۳) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک شخص کو قرآن سکھاتا تھا، اس نے مجھے ایک کمان تحفہ بھیجی اس کا ذکر میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

ان اخذ تھا اخذت قوسامن نار فردد تھا.

اگر تو نے یہ کمان لی تو آگ کی ایک کمان لی، یہ سن کر میں نے اس کو کمان واپس کر دی، ابن ماجہ (۲۱۵۸) و بیھقی ص۱۲۵و ۱۲۶ ج۶۔

اس کی سند میں انقطاع ہے، کیونکہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرنے والے راوی، عطیہ بن قیس الکلاعی، کی ان سے ملاقات وسماع ثابت نہیں۔

جیسا کہ بوصیری نے، الزوائد ص۱۳۴ ج ۲، میں علامہ العلائی کے حوالے سے صراحت کی ہے، دوسرا راوی، الکلاعی، کا شاگرد، عبدالرحمٰن بن سلم، مجھول ہے،تقریب ص۲۰۲۔

(۴) حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

من قرأ القرآن يتأكل به الناس جاء اليوم القيامة و وجهه عظم ليس عليه لحم.

یعنی جس نے قرآن کو اس لئے پڑھا تا کہ لوگوں سے دنیا کا مال کھائے تو وہ قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا۔

شعب الایمان للبیہقی ص۵۳۳ ج۲ (رقم الحدیث ۲۶۲۵)

اس کی سند میں علی بن قادم راوی ہے، جس کو امام یحییٰ بن معین اور امام احمد اور دارقطنی نے ضعیف کہا ہے، العلل المتناھیۃ ص۱۱۰ ج۱۔

ہمارے معاصر غلام رسول سعیدی حنفی بریلوی نے اس روایت کو بیہقی کی سنن الکبریٰ ص۵۳۳ ج۲، کی طرف منسوب کیا ہے، شرح صحیح مسلم ص۱۰۴۴ ج۷۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی شاگرد سے طرق حدیث جمع کرواتے رہے ہیں، اور اس نے، بیہقی، کی طرف منسوب کیا ہوگا، اور سعیدی صاحب نے مغالطہ سے، السنن، کا نام تحریر کر دیا ہوگا، واللہ اعلم۔

(۵) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

من اخذ قوسا علی تعلیم القرآن قلدہ اللّٰہ قوسا من نار

یعنی جس نے تعلیم قرآن پر ایک کمان بھی وصول کی اللہ تعالی اس کو آگ کا قلادہ پہنائے گا، سنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۲۶ ج۶۔

امام بیہقی فرماتے ہیں یہ روایت ضعیف ہے۔ امام دحیم فرماتے ہیں اس روایت کا کوئی اصل نہیں (بیہقی ص۱۲۶ ج۶)

(۶) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

من قرأ القرآن فلیسال اللہ بہ فانہ سیجئی اقوام یقرؤن القرآن یسالون بہ الناس.

یعنی جو شخص قرآن کو پڑھے (اور جب آیات رحمت پر سے گزرے تو) اس کے ساتھ اللہ تعالی سے سوال کرے، عنقریب ایسی اقوام آئیں گی جو قرآن کو پڑھیں گی اور اس سے لوگوں سے سوال کریں گے۔

ترمذی مع تحفۃ ص۵۵ ج۴، ومسند احمد ص۴۳۲،۴۳۳، ۴۳۶، ۴۳۹، ۴۴۵، وطبرانی کبیر ص۱۶۶ ج۱۸۔

ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے، لیکن حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے حسن بصری ہیں، جو صحابہ کرام سے بہت زیادہ مرسل بیان کرتے ہیں اور مدلس ہیں۔ تقریب ص۶۹، اور جب تک سماع کی تصریح نہ ہو قابل حجت نہیں۔

اور حسن کے شاگرد، خیثمۃ بن ابی خیثمۃ، لین الحدیث، ہیں، تقریب ص۹۵۔

الغرض یہ روایت بھی ضعیف ہے۔

راہ اعتدال

مذکورہ احادیث میں بلاشبہ اکثر ضعیف ہیں، لیکن حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ہے امام بیہقی نے بلاوجہ اس کو ضعیف کہا ہے، علامہ شوکانی نے اسے علی شرط مسلم کہا ہے، نیل الاوطار ص۳۰۴ ج۵، اور، ماردینی نے، جید، قرار دیا ہے، الجوھر النقی ص۱۲۶ ج۶، اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے،

سلسلہ احادیث الصحیحہ (۲۵۶-۲۶۰) بحوالہ ارواالغلیل ص۳۱۷ ج۵۔

اس طرح حضرت عبادہ کی حدیث بھی، حسن درجہ سے کم نہیں، بلاشبہ اس کی سند میں، اسود بن ثعلبہ مجھول ہے مگر اس کی دوسری سند بھی ہے، جو حسن درجہ کی ہے، واضح رہے کہ بقیہ بن ولید صدوق ہے، ضعیف نہیں، ہاں البتہ مدلس ہے، لیکن یہاں اس نے سماع کی صراحت کی ہے۔

اور بقایا روایات شواہد کی وجہ سے حسن درجہ کی ہیں، لہٰذا علی الاطلاق ان روایات کو ضعیف کہنا قطعاً درست نہیں۔

ان احادیث کا صحیح محل

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ محتاج ومعذور اس سے الگ ہے، کیونکہ اگر ان احادیث کو علی الاطلاق ممانعت پر محمول کریں، تو دین کا نظام ختم ہو کر رہ جائے گا، اور نشر و اشاعت، اسی طرح دعوت وتبلیغ کا وجود بھی جاتا رہے گا، اور تعلیم قرآن کیلئے مستقل کوئی مدرس ملنا بھی مشکل سے مشکل تر

ہو جائے گا۔

ان چیزوں کو ہی ملحوظ رکھ کر متاخرین فقہاء احناف نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) علامہ سرخسی حنفی، المبسوط ص۳۷ ج۱۶، طبع دارلمعرفۃ بیروت ۱۳۹۸ھ

(۲) علامہ مرغینانی حنفی، ھدایہ اخیرین ص۳۰۳ طبع ملتان

(۳) علامہ بابرتی حنفی، عنایہ علی ہامش فتح القدیر ص۴۰، ۴۱ ج۸، طبع سکھر

(۴) علامہ خوارزمی حنفی، کفایہ علی حاشیہ فتح القدیر ص۴۱ ج۸

(۵) ملا نظام الدین حنفی، فتاویٰ عالم گیری ص۴۴۸ ج۴

(۶) ابن عابدین، رسائل ابن عابدین ص۱۲۶ ج۲ طبع سہیل اکیڈمی

(۷) علامہ کردری، فتاویٰ بزازیہ علی حاشیہ عالم گیری ص۳۷ ج۵

(۸) علامہ زیلعی، تبیین الحقائق ص۱۲۵ ج۵، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان

(۹) ملا علی القاری، شرح النقایہ ص۱۱۴ ج۲، طبع کراچی

(۱۰) عبدالحق محدث دھلوی، اشعۃ اللمعات ص۱۱ ج۳

تلک عشرۃ کاملۃ

آخر میں ہم مبتدعین کے مجدد ملت مولوی احمد رضا خاں کا فتویٰ پیش کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

سائل پر شرعاً کوئی الزام نہیں، اور جو کچھ اسے ماہوار مل جاتا ہے، حلال طیب ہے، اور کیفیت مذکورہ سوال اسکے نہایت صبر و استقلال وطلب وجہ حلال وخوف مولیٰ ذوالجلال پر دال ہے، جزاء اللہ تعالی خیرا، بلکہ اگر وہ سب پڑھنے والوں سے اپنا ماہوار مقرر کرلے جب بھی جائز ہے اور مذھب مفتی بہ پر اصلا مضائقہ نہیں،

فی حاشیۃ البحر الرائق للعلامۃ خیرالدین الرملی کتاب الوقف المفتی بہ جواز الاخذا ستحساناً علی تعلیم القرآن الخ، و مثلہ فی کثیر من الکتب.

معترض کا اعتراض محض بے جا ہے اور اس کا یہ کہنا کہ للہ سمجھ کر بھی دیتے ہیں، جب بھی حرام ہے، شریعت مطہرہ پر کھلا ہوا افترا ہے، اگر پڑھنے والوں نے اتنے تنگدست استاد کی لوجہ اللہ خدمت کی، کیا گناہ ہوا، اور استاد کو اس کا لینا کیونکر حرام ٹھہرا، یہ محض جہالت و تعصب ہے، .... خیر اگر وہ حدیث ہی مانگیں تو خاص صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ

ان احق ما اخذتم علیه اجراً کتاب الله،

یعنی قرآن مجید سب چیزوں سے زیادہ اس کا لائق ہے کہ تم اس پر اجرت لو۔

ملخصاً، فتاویٰ رضویہ ص ۱۳۴ ج ۸، طبع کراچی۔

تم الجزء الثانی من دین الحق

ویلیه الجزاء الثالث، اوله باب التقلید۔

کتبه ابوصهیب محمد داؤد ارشد

کوٹلی ورکاں، نارنگ منڈی، شیخوپورہ

☆☆☆☆☆☆☆

ہماری مطبوعات آپکے علمی ذوق کی ترجمان

